بانی: مولوی حافظ محمد عبدالرحمٰن سہیل سنہاروی
یادگار: مولوی محمد زین العابدین اختر سنہاروی

ترقی پسند ادب کا ترجمان

ماہنامہ سہیل گیا

شمارہ: ۱
جلد: ۳۶

جنوری ۱۹۸۴ء

چیف ایڈیٹر: مسعود منظر سنہاروی
ایڈیٹر: جمیل منظر سنہاروی

بدل اشتراک
[illegible]

مجلسِ مشاورت

- ادریس سنہاروی
- ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
- ڈاکٹر قمر رئیس
- اصغر علی انجینیئر
- سالک لکھنوی
- شاہد احمد شعیب

معاونین:

شکیل احمد جمالی
عبدالقیوم ابدالی

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ
ماہنامہ سہیل
ریلوے سائیڈ روڈ، گیا

فہرست

بھیج گیا

نمود

بہار اُردو اکاڈمی ـــ گہرے کھائی میں

پروفیسر کلیم الدین احمد کے انتقال سے بہار اُردو اکاڈمی کی ایک اہم نشست خالی ہو گئی۔ بلاشبہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حالیہ برسوں میں بہار اردو اکاڈمی کو اتنی بڑی شخصیت میسر نہ آ سکے گی۔ یہ اہم شخصیت بہار اُردو اکاڈمی کے لئے مفید تھی یا نہیں؟ یہ الگ بحث ہے، جس پر میں ابھی بحث نہیں کرنے جا رہا ہوں۔ ابھی زیرِ غور مسئلہ یہ ہے کہ اس اہم جگہ پر ایسی شخصیت کو لایا جائے جس سے بہار اُردو اکاڈمی کا کام حسن و خوبی انجام پا سکے۔ سیاسی بازیگروں نے اپنے اپنے مہروں کو میدان میں اُتار دیا ہے اور تگ و دو شروع ہو گئی ہے۔ اخباروں میں مراسلہ بازی کے ذریعے اپنے کو اُجاگر کرنے کی جد و جہد بھی تیز تر ہے۔ وزیروں کے یہاں سفارشوں کی بھرمار ہو رہی ہے۔ اور بڑا سے بڑا مکار اور عیار اپنے کو اس فریم میں فٹ کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور یہ تعجب نہیں کہ کوئی بے علم اور بے ادب انسان اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو جائے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ شاہ مشتاق احمد صاحب بہار اُردو اکیڈمی کے سکریٹری تھے۔ بہار کا علمی و ادبی حلقہ خوش تھا۔ اُردو زور و شور سے جاری تھا، غریب طلبا کی ضرورتیں پوری ہو رہی تھی۔ بہار کے جریدے کسی نہ کسی شکل میں امداد حاصل کرتے تھے۔ جمشید پور کے فساد میں برباد اور لٹے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کو بہت بڑے پیمانے پر اکاڈمی کی تحویل سے موٹی موٹی رقمیں دی گئیں۔ بہار کی اُردو لائبریریاں اچھی خاصی رقمیں حاصل کرتی تھیں۔ اکاڈمی کی طرف سے زبان و ادب نام سے ایک ماہنامہ بھی علمی و ادبی حلقوں سے خراج حاصل کر رہا تھا۔ پندرہ روزہ خبرنامہ کے ذریعے اکاڈمی کی کارگزاری بتائی جانے لگی تھیں۔ اُردو عوام کو اسی پندرہ روزہ کے ذریعے ہدایات بھی جاری کئے جاتے تھے کہ یکایک بہار اُردو اکاڈمی میں زلزلہ سا آ گیا یعنی شاہ مشتاق صاحب کی تین سالہ مدت ختم ہو گئی اور ہر اُردو داں یہ توقع کر رہا تھا کہ شاہ صاحب کی مدت بڑھا دی جائیگی اور اُردو کام ویسے ہی جاری رہے گا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ سیاسی بازیگروں کی چالیں کامیاب ہو گئیں اور اس جگہ پر ایک ایسا نااہل، لاعلم اور بے ادب انسان آ گیا جس نے ان سارے قلعوں کو مسمار کر دیا جسے شاہ صاحب نے محنتوں سے تعمیر کیا تھا۔ ماہنامہ "زبان و ادب" بند ہو گیا۔ پندرہ روزہ خبرنامہ دم توڑ دیا۔ اکاڈمی کی طرف سے کتابیں شائع ہونی بند ہو گئیں۔ امدادی رقمیں مختصر سے مختصر ہو گئیں۔ لائبریریوں کی امدادی رقمیں قلیل سے قلیل تر ہو گئیں اور وہ سب کچھ ہو گیا جسے نہ ہونا چاہیئے تھا۔ اب بہار اُردو اکیڈمی کے یہ بارہ لاکھ روپے کہاں جا رہے ہیں کسی کو کوئی خبر نہیں۔

ان حالات میں بہار اُردو کی اس خالی نشست کے لئے اہمیت حاصل ہے یوں تو اس خالی نشست کے لئے سلسلہ کے ذریعے بہت سے نام آ رہے ہیں جن میں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، کلام حیدری، حسن نعیم، شہاب دسنوی، ڈاکٹر ستارہ انصاری، عبدالمغنی اور ڈاکٹر نجم الہدیٰ کے نام سرِفہرست ہیں۔
ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کشمیر یونیورسٹی میں صدر شعبہ اُردو ہیں، بہار سروس کمیشن کی چیرمین شپ کو ٹھوکر مار چکے ہیں۔

انہیں گذشتہ سال آؤٹ کیا گیا تھا۔ پروفیسر مغنی نام نہاد انجمن ترقی اردو بہار کے صدر ہیں۔ مرکزی انجمن، ریاستی حکومت اور بہار کے اردو عوام سے لاکھوں لاکھ وصول کر رہے ہیں۔ اس لئے بہار اردو اکاڈمی شاید ان کے لئے مناسب جگہ نہ ہوسکے۔ ڈاکٹر نجم الہدیٰ بھی مدراس یونیورسیٹی میں شعبۂ اردو و فارسی کے صدر ہیں اس لئے وہ بھی اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ جناب شہاب دسنوی اس جگہ کے لئے مناسب شخصیت ہوسکتے ہیں لیکن ان کی عمر شاید اب انہیں اس بات کی اجازت نہ دے۔ ایسی حالت میں کلام حیدری اور حسن نعیم اس جگہ کے لئے مناسب افراد ہیں۔ بہار اردو اکاڈمی اگر ان دونوں حضرات کی خدمات حاصل کرے تو اکاڈمی کے کاموں میں چار چاند لگ سکتے ہیں۔ اس کے لئے بہار اردو اکاڈمی کو تنظیم نو کی ضرورت ہوگی اور بہار کے اردو عوام کو اس بات کے لئے پر زور آواز بلند کرنی چاہیئے کہ اکاڈمی کی تنظیم نو کی جائے اور نئے سرے سے ممبران کا انتخاب ہو، ایماندار، محنتی اور مخلص حضرات سے اکاڈمی کو پر کیا جائے۔ خوشامد پسند، جاہ پرست، کینہ پرور اور مطلبی لوگوں کو برخواست کیا جائے۔ تب ہی اردو اکاڈمی کا کام صحیح طور پر انجام پاسکتا ہے اور اردو کا بھلا ہوسکتا ہے۔

جمیل منظر شمشادوی

مارکسزم اور مذہب

اصغر علی انجینیر

آئرن کالج۔ سیکنڈ فلور۔ ہم تقا راستہ۔ شانتا کروز۔ بمبئی ۵۵

آج ہندوستان اور تیسری دنیا کے ممالک میں احیاءِ مذہب کی نئی لہر آئی ہوئی ہے۔ سیاست میں کسی نہ کسی شکل میں مذہب کا عمل دخل بڑھتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ بائیں بازو کے حکمرانوں کو مذہب کے متعلق ایک طرف دوبارہ سوچنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور دوسری طرف انھیں اپنے رویے میں تبدیلی کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ اور خود عالم اسلام میں اساسیت کی لہر آنے کے بعد کمیونزم پر خاص طور پر حملے کئے جا رہے ہیں۔ اور اس نظریے کو مذہب دشمن قرار دے کر اس پر بڑے سخت حملے کئے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے دونوں طرف سے مذہب کے متعلق جو موقف اختیار کیا جا رہا ہے وہ نظریاتی کم اور سیاسی زیادہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سیاسی اغراض سے ہٹ کر نظریاتی اعتبار سے اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ مذہب اور مارکسزم میں کتنا ٹکراؤ ہے۔ اور کیا یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اور کیا ان میں قطعاً کوئی ہم آہنگی (Compatibility) نہیں پائی جاتی؟

ان سوالوں کا جواب سیدھے اثبات یا نفی میں دینا میرے خیال سے چیزوں کو سہل ترین (Oversimplify) کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان چیزوں کو صحیح تناظر میں دیکھا جائے اور متعلقہ تمام عوامل کو سامنے رکھ کر ان کا تجزیہ کیا جائے۔ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اس کا تجزیہ کرتے وقت ہم نظریاتی وابستگی اور سیاسی ضروریات کے تحت اختیار کئے گئے موقف میں فرق کریں۔ ہمیں اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ اس بحث میں مارکسزم کے مقابلے میں ہم مذہب کو ایک عمومی قسم (General Category) کے طور پر نہیں رکھ سکتے کیونکہ مختلف مذاہب میں بڑے بنیادی اختلافات ہیں اور یہ مذاہب آپس میں ہم آہنگ نہیں ہیں۔ مثلاً عیسائیت اور اسلام کی بنیاد خدا اور پیغمبری پر ہے کے تصور پر ہے جب کہ بدھ دھرم اور جین دھرم میں خدا کے تصور کو یا تو کوئی اہمیت نہیں دی گئی ہے یا اس کے وجود سے ہی انکار کیا گیا ہے۔ اور فلسفیانہ سطح پر یہ اختلاف بڑا بنیادی اختلاف ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ کمیونزم میں چونکہ خدا کے وجود سے انکار کیا جاتا ہے اس لئے مذہب سے اس کا بنیادی ٹکراؤ ہے۔ لیکن بدھ مذہب اور جین مذہب، مذہب ہونے کے باوجود خدا کے وجود سے انکار کرتے ہیں یا اس کے متعلق خاموشی اختیار کرتے ہیں اور اس معنی میں کمیونزم اور بدھ مت اور جین دھرم میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مارکسزم کے مقابلے میں مذہب ایک عمومی (General Category) کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

علم الادراک (Epistemology) اور علم الحقیقت (Ontology) کی سطح پر بھی مذہب پر بڑا بنیادی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور یہ اختلاف صرف بین المذاہب ہی نہیں ہے ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں میں بھی ہے اور اتنا ہی بنیادی ہے۔ مثلاً اسلام میں معتزلہ

اور اشاعرہ میں خدا کے تصور اور صفات سے متعلق بڑے بنیادی اختلافات ہیں۔ اسی طرح مارکسزم کی بھی کئی مختلف تعبیریں ہیں اور مارکسی دانشوروں میں کئی فلسفیانہ اختلافات ہیں مثلاً لوکاچ نے مارکسزم کی تعبیر میں لینن سے اختلاف کیا اور کہا کہ لینن نے مارکسزم کو اینگلس کے زیر اثر ثنویت کا رنگ دے دیا ہے۔ لوکاچ نے مادی جدلیات (DIALECTICAL MATERIALISM) کی اصطلاح کی جگہ اپنی کتاب HISTORY AND CLASS CONSCIOUSNESS میں مارکسی جدلیات کی اصطلاح استعمال کی اور لوکاچ کے اپروچ کا یہ اختلاف بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مارکس کا اپنا مذہب کی طرف رویہ کیا تھا۔ کیا وہ مذہب کو اپنی تحریروں میں بالکل رد کرتا ہے یا اس کی کسی خاص معنی میں تنقید کرتا ہے۔ یہاں ہمیں یہ بات بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ مارکس کے پیشِ نظر عیسائیت اور چرچ کا انتظام تھا۔ یہ بات یورپ کے کسی طالب علم سے پوشیدہ نہیں ہے کہ چرچ دورِ وسطیٰ میں نہ صرف طاقت ور مفاد پرستوں سے جڑا ہوا تھا بلکہ خود حکمرانی کرتا تھا۔ اور استحصال کا ذمہ دار تھا۔ مارکس اور اینگلز نے مذہب کے متعلق جو کچھ بھی لکھا ہے اس بات کے پیشِ نظر لکھا ہے۔ اسی لئے مارکس اور اینگلز کی تحریروں میں ہمیں عیسائیت کی عام مذمت نظر نہیں آتی۔ اس کے برخلاف اینگلز نے عیسائیت کے دورِ اول کی تاریخ والے اپنے مضمون میں، اس دور کے عیسائی مذہب کو غلاموں اور محنت کش غریب کسانوں کی احتجاجی تحریک قرار دیا ہے۔ اس مضمون کے شروعات میں ہی اینگلس نے صاف لفظوں میں لکھا ہے:۔

"THIS 'SOCIALISM' DID NOT FACT AS FAR AS IT WAS POSSIBLE AT THE TIME, EXIST AND EVEN BECAME DOMINANT — IN CHRISTIANITY."

اینگلس نے اپنے اس مضمون میں یہ بھی دکھایا ہے کہ سلطنتِ روما سے اتحاد کے بعد عیسائیت کی صورت تبدیل ہو گئی اور یہ محنت کش طبقوں کے انقلابی احتجاج سے، جس کا سارا زور شدید انتقام پر تھا "محبت کا مذہب" بن گیا اور اب "اپنے دشمن سے بھی پیار کرو، جو تمہیں گالی دے اس کے حق میں دعا کرو" جیسے وعظ کئے جانے لگے تاکہ احتجاج اور انتقام کے جذبے کو ختم کر کے جاگیردارانہ نظام کو قائم رکھا جا سکے۔

اسی طرح اینگلس اپنے ایک دوسرے مضمون "جرمنی میں کسانوں کی جنگ" میں مارٹن لوتھر کے ایک ساتھی منذیر کو کسانوں کی بغاوت میں ان کا ساتھ دینے کی وجہ سے انقلابی مذہبی پیشوا قرار دیتا ہے اور لکھتا ہے:

منذیر نے (کسانوں کی) یونین بنانے کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس کے وعظ زیادہ جارحانہ اور انقلابی ہوتے گئے۔ وہ شہزادوں اور شرفا کے خلاف اتنی ہی شدت سے گرجتا، جتنی شدت سے وہ مذہبی پیشواؤں پر حملہ کرتا۔"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب کا مارکس اور اینگلز کے یہاں کوئی اکہرا یا میکانکی تصور نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر پروپیگنڈا کی سطح پر سمجھ لیا گیا ہے۔ مارکس کے رویے کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کے طریقہ کو (METHODOLOGY) اچھی طرح سمجھیں۔ مارکس ایک ماہر سماجیات بھی تھا اور فلسفی بھی۔ ماہر سماجیات (SOCIALOGIST) کی حیثیت سے وہ ہر سماجی مظہر (SOCIAL PHENOMENON) کو تجربیت (EMPIRICISM) کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور فلسفی ہونے کی حیثیت سے جدلیات کی روشنی میں۔ مارکس کا مذہب کی طرف ایک رویہ سماجیاتی ہے اور دوسرا فلسفیانہ۔ پہلے ہم اس کے سماجیاتی رویے پر تبصرہ کریں گے۔

مارکس کا ایک جملہ بہت مشہور ہو گیا ہے کہ "مذہب عوام کے لئے افیون ہے۔" در اصل یہ جملہ مذہب سے متعلق ایک بڑے ہی طاقت ور پیراگراف کا آخری جملہ ہے۔ جس میں مارکس مذہب کے سماجیاتی پہلو سے بحث کرتا ہے۔ اس جملے کا سیاق

مفہوم سمجھنے کے لئے اس سے پہلے پیراگراف کو پڑھنا ضروری ہے
اس لئے ہم اس پیراگراف کو بیان پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں
مارکس Contribution to the critique of Hegel's philosophy of law میں مذہب
پر سماجیاتی اعتبار سے تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

Religious distress is at the same time the expression of real distress and also the protest against real distress. Religion is the sigh of the oppressed creature, the heart of a heartless world, just as it is the spirit of spiritless conditions. It is the opium of the people.

"مذہبی رنج و غم در اصل حقیقی رنج و غم کا اظہار ہے اور اس حقیقی درد و الم کے خلاف احتجاج بھی۔ مذہب مظلوم مخلوق کی آہ ہے، بے درد دنیا کا دل ہے جس طرح سے کہ یہ بے روح حالات کی روح ہے۔ یہ لوگوں کے لئے افیون ہے۔"

سماجیاتی سطح پر بات بڑی صاف ہے۔ وہ لوگ جو ظلم کا شکار ہیں، استحصال کے مارے ہوئے ہیں، اس سنگدل اور بے روح دنیا میں زندہ رہنے کے لئے کوئی سہارا ڈھونڈ رہے ہیں۔ ایک روح اور دل تلاش کرتے ہیں۔ اور مذہب ان کے لئے ایک سہارا، یہ دل اور یہ روح بن جاتا ہے۔ اور چونکہ یہ مظلوم اور مجبور مخلوق اپنے حالات کو تبدیل کرنے کے بجائے مذہب کو سہارا بنا کر انھیں برداشت کر لیتی ہے۔ یہ اس معنی میں اس کے لئے افیون بن جاتا ہے۔ اس بات کی وضاحت آگے آنے والے پیراگراف سے ہو جاتی ہے۔ مارکس لکھتا ہے:

To abolish religion as the illusory happiness the people is to demand their real happiness. The demand to give up illusions about the existing state of affairs is the demand to give up illusions. The criticism of religion is therefore in embryo the criticism of the vale of tears, the halo of which is religion.

یعنی کہ مذہب کو لوگوں کی فریب دینے والی خوشی کے طور پر ختم کرنا ان کی حقیقی خوشی قائم کرنے کی مانگ کرنا ہے۔ در اصل ان حالات سے متعلق وہم و فریب ختم کر دینے کی مانگ کرنا ہے جن کے لئے فریب خیال کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے مذہب کی تنقید در اصل آنسوؤں کی اس وادی کی ابتدائی تنقید ہے جس کا ہالہ مذہب ہے۔

یہ مارکس کا مذہب کی طرف سماجیاتی اپروچ ہے۔ عوام کی حقیقی خوشی کے لئے فریب دہ خوشی کو ختم کرنا ضروری ہے۔ لیکن اگر مذہب ایسا نظریہ دیتا ہے جو فریب دہ خوشی پیدا کرنے والا نہیں بلکہ حقیقی خوشی پیدا کرنے والا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ایسے مذہبی نظریے کی بھی تنقید کی جائے۔ مذہب اگر status quo سے سمجھوتہ کرنا سکھاتا ہے، ظالمانہ نظام کو قابل قبول بنانے کے لئے محض آخرت کا خوش آئند تصور پیش کرتا ہے، عوام کی انقلابی اور باغیانہ قوتوں کو مفلوج کرتا ہے۔ ظالم اگر ایک طمانچہ مارے تو دوسرا گال پیش کرنے کی تلقین کرتا ہے، حکمران طبقہ اگر ظلم کرتا ہے تو اسے محض خدا کا امتحان تصور کر کے صبر کی تعلیم دیتا ہے، مزاحمت کا ڈر دکھا کر اگر موجودہ نظام کو قبول کر لینے کے لئے آمادہ کرتا ہے تو بیشک ایسا مذہب عوام کے لئے افیون ہے۔ خواب آور ہے۔ اور ایسے مذہب کی تنقید ظالمانہ نظام کی تنقید ہے۔ حکمران طبقے کے استحصال کی تنقید ہے اور ایسی تنقید نہایت ضروری ہے تاکہ ہم سماج میں ایک عادلانہ [illegible] جس کی بنیاد قرآن کریم کے الفاظ میں عدل و احسان" پر ہو

قائم کرسکیں۔

اگر مذہب ہمیں موجودہ استحصال کرنے والے نظام کے خلاف لڑنے کا نظریہ عطا کرتا ہے۔ ہمیں محنت کش، کمزور اور مظلوم طبقوں کی حمایت پر آمادہ کرتا ہے (جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم مستضعفین یعنی کمزوروں پر احسان کرنا چاہتے ہیں۔ اور انھیں اس زمین کا لیڈر اور وارث بنانا چاہتے ہیں)، ظلم و جبر سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے ان کے خلاف لڑنے کا حوصلہ دیتا ہو تو یہ مذہب ہرگز اس زمرے میں نہیں آتا جس کی مذمت مارکس کرتا ہے۔ اور ہمیں تاریخ میں ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں کہ مذہب نے مجبور اور مظلوم عوام کو لڑنے اور حق اور انصاف کے لئے جدوجہد کرنے کا حوصلہ دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ روس میں جب انقلاب آیا تو کئی مذہبی شخصیتیں اس سے متاثر ہوئیں۔ ان میں مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا حسرت موہانی اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے تو کمیونسٹ مینی فیسٹو کا اردو میں ترجمہ کیا جو مولانا آزاد کے الہلال میں شائع ہوا۔ یہ ترجمہ نہایت سلیس زبان میں ہوا ہے اور اسے اردو ترجمے کا بہترین نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ ان محترم ہستیوں کے سامنے اسلام کی انقلابی تعلیمات تھیں اور وہ مذہب کو محض رسموں کا (RITUALS) پلندہ تصور نہیں کرتے تھے نہ ان کا مذہب کا تصور آخرۃ محدود تھا۔ وہ اس دنیا میں بھی عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے وہ کمیونزم سے گھبرا کر بھاگتے نہیں تھے نہ اس کی عام علماء کی طرح خدا کو نہ ماننے کا بہانا بنا کر مذمت ہی کرتے تھے۔ احرار لیڈر چودھری افضل حق نے تو یہاں تک لکھا کہ:

> مسلمانوں کو سوشلسٹ سے نفرت نہیں ہونی چاہیے اگر وہ خدا کا قائل نہیں۔۔۔۔ ملتی دین سے پوچھو منکر مشرک سے بہر حال بہتر ہے۔ سالکِ سلوک کے اوّل منزل تو نفی ہی ہے۔

الا اللہ کی قدر و منزلت کی معنویت پر غور کرو۔ صوفی مدتوں لا الٰہ کی ضربیں دل پر لگاتا ہے پھر الا اللہ کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ اسی طرح زمانہ راہ و رسم منزل سے واقف سالک کی طرح اشتراکی مدرس کو نفی کا درس دینا ہے تاکہ ما سوا اللہ کا وہم دل سے دور ہو اور الا اللہ کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔"

چونکہ status quo کے خلاف جنگ میں احرار شریک تھے۔ اس لئے انھیں کمیونزم سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ وہ تو کمیونزم کے الحاد سے بھی نہیں ڈرتے تھے حالانکہ کون نہیں جانتا کہ احرار بڑے مذہبی لوگ تھے اور ان میں سے اکثر پائے کے عالم تھے۔ وہ اصل الحاد کی آڑ میں کمیونزم پر وہ حملہ کرتے تھے جو موجودہ نظام سے مستفید ہوتے ہیں اور اسے کسی قیمت پر بھی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

اب ہم مذہب پر فلسفیانہ زاویۂ نظر سے اختصار کے ساتھ بحث کریں گے۔ ظاہر ہے فلسفیانہ بحث مابعد الطبیعیاتی بحث ہوتی ہے۔ سماجیاتی علوم اور طبیعیاتی علوم (Social Sciences and Physical Sciences) میں علم حاصل کرنے کا ذریعہ حسی ادراکات (Sensual perception) ہوتے ہیں۔ لیکن حسی ادراکات سے ہمیں محض خارجی کائنات اور مادی دنیا کا علم حاصل ہوتا ہے۔ سماجیاتی اور طبعی علوم میں ان حسی ادراکات اور ان سے حاصل شدہ اطلاعات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور قرآن مجید میں بھی ان علوم کی ترقی کے لئے خارجی کائنات پر غور و خوض کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور اس پر زور بھی دیا گیا ہے۔ لیکن علم محض سماجیاتی اور طبعی میدانوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ اس خارجی کائنات سے پرے ایک دنیائے معانی اور روحانی بھی ہے اور اس کا علم وجدانی ہوتا ہے، حسی نہیں۔ خارجی کائنات کا حسی علم حاصل کر لینا ضروری ہے مگر کافی نہیں۔ کیونکہ انسان کے لئے ایک بنیادی سوال کائنات سے معنوی اور روحانی رشتہ پیدا کرنے کا بھی ہے۔ وہ کن اقدار کو قبول کرتا ہے اور کن اقدار کی حدود میں رہ کر وہ اپنی زندگی کو کیا روحانی شکل دیتا ہے۔ یہ میدان دراصل فلسفیانہ اور مذہب کا میدان ہے۔

ظاہر ہے انسان نے ہر دور میں وجدانی علم کے ذریعے ان سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ طبعی علوم کی طرح جس کا دار و مدار خارجی ادراکات پر ہوتا ہے۔ وجدانی علم میں اتفاق رائے کی گنجائش کم ہوتی ہے۔ ہر انسان اور ہر قوم اپنی طبع زاد صلاحیتوں (فطرت) کے مطابق ان سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کرتی ہے۔ اور اس طرح اپنا ایک راستہ تلاش کر لیتی ہے جسے ہم اس کا مذہب کہہ سکتے ہیں۔

قرآن مجید میں اسی بات کی طرف سورۂ مائدہ میں ایک آیت میں بڑا خوبصورت اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۖ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ...... یعنی کہ ہم نے تم میں سے ہر ایک قوم کے لئے ایک راستہ اور ایک طریقہ مقرر کر دیا ہے اگر ہم چاہتے تو تمہیں ایک ہی امت بنا دیتے لیکن جو اس نے (احکامات) تم کو دیئے ہیں اس میں وہ تمہاری آزمائش کرنا چاہتا ہے پس نیک کاموں میں سبقت لے جاؤ۔

مندرجہ بالا آیت سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ہر قوم کا اپنا راستہ اور اپنا طریقہ ہے جو بنیادی قدروں کی حدود میں رہ کر وہ تلاش کر لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو ایک ہی امت نہیں بنایا اور ہر ایک کو اپنے جینئس کے مطابق اپنا معنوی اور روحانی راستہ تلاش کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا اور اسی میں ان کی آزمائش ہے اور اصل چیز نیک اور بھلے کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانا ہے۔ کون کہتا ہے اسلام میں کثرت (pluralism) کی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن مجید (pluralism) کو انسانیت کی آزمائش قرار دیتا ہے۔

تاکہ وہ مذہب دوسرے کے روحانی طریقوں کو برداشت کرنا سیکھے اور مادی سوالوں پر آپس میں تنازعہ نہ کرے۔

عام آدمی خدا کا تصور عام طور پر بشری شکل (ANTHR-OPOLOGICAL FIX) میں کرتا ہے۔ لیکن فلسفیانہ بحث میں خدا کا تصور اس سے پرے ایک دوسری سطح پر ہوتا ہے جو اعلیٰ اور ارفع ہوتی ہے۔ اسلام میں بھی فلسفیانہ نظریات سے قریب فرقے جیسے معتزلہ اور اسماعیلیہ وغیرہ نفی صفات اور تنزیہ کے قائل ہیں۔ ہندو مذہب میں بھی اس سطح پر خدا کو نرگن کہا گیا ہے۔ اس معنی میں خدا کی ذات تخلیقی اور قدری قوت (CREATIVE ELAN AND VALUE ELAN) کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بہرحال جو بھی صورت ہو انسان کائنات کی تخلیق کا راز جاننے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں وہ کائنات یا اس کی پُراسرار تخلیقی قوت سے (جس کا تصور وہ اپنی سمجھ اور صلاحیت کے مطابق کرتا ہے) ایک روحانی اور معنوی رشتہ جوڑنا چاہتا ہے۔ یہ رشتہ وہ چند مقررہ رسوم کے مطابق عبادت کے ذریعے جوڑتا ہے یا کسی اور شکل میں۔

اس معنیٰ میں مذہب اور کمیونزم کا کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ مارکس کی تصنیفات میں ہمیں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جو اس فلسفیانہ معنیٰ میں مذہب پر حملہ تصور کیا جائے۔ اس روحانی میدان میں چند حدود اور اقدار کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے، ہر شخص وسیع تر معنیٰ میں تخلیقی قوت سے اپنا رشتہ اپنے خاص طریقے سے جوڑنے کے لئے آزاد ہے اور اس معنیٰ میں وہ کمیونزم کے سماجی اور معاشی نظریات سے کہیں نہیں ٹکراتا۔ دراصل ایسی مثبت قدروں (POSITIVE VALUES) سے گہری جذباتی وابستگی جو کائنات کی تخلیقی قوتوں کو آگے بڑھانے والی ہوں THEISM کی ایک شکل ہے اور ان منفی قدروں کو اختیار کرنا جو کائنات کو تباہی کی طرف لیجانے والی ہوں ATHEISM (الحاد) ہے۔ اگر خدا کے تصور کو ان وسیع ترین معنیٰ میں لیا جائے تو مادے کو خارجی اور ازلی ماننے والا بھی منکر نہیں کہلائے گا۔ اسی لئے بعض بندگانِ دین نے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، مادی جدلیات کو اپنے اسلامی عقائد کے خلاف نہیں سمجھا۔

ڈاکٹر راج بہادر سود

فراق گورکھپوری ــــ حیات اور شاعری

فراق ۲۸ اگست ۱۸۹۶ء کو شہر گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ اور یہیں کی علمی اور ادبی فضا میں ان کی نشوونما ہوئی۔ ابتدا ہی سے حسن کے رگھوپتی سہائے کے جمالیاتی احساس کا یہ عالم تھا کہ ان کی ماں کے کہنے کے مطابق وہ کسی بد اطوار اور بدصورت مرد اور عورت کی گود میں نہیں جاتے تھے۔

اردو شعر یوں کہئے کہ فراق کی گھٹی میں پڑا تھا۔ ان کے والد بزرگوار منشی گورکھ پرشاد عبرت بھی اپنے زمانے کے بڑے شاعر تھے۔ ان کی مصنفہ مثنوی "حسن فطرت" اور "مسدس" "نشو و نمائے ہند" اور بہت سی دوسری نظمیں خواجہ الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد جیسے جید علماء کو متوجہ کر چکی تھی۔ جب مولانا حسرت موہانی کو عبرت کا یہ شعر فراق نے سنایا:

زمانے کی گردش سے چارہ نہیں ہے
زمانہ ہمارا تمہارا نہیں ہے

تو حسرت نے کہا "یہ شاعری نہیں الہام ہے"۔

فراق نے زندگی کی دھوپ زیادہ جھیلی چھاؤں کچھ کم ہی ان کے حصے میں آئی۔ ابتدائے عمری میں ان کی شادی دھوکے سے کسی نے ایسی لڑکی سے کرا دی جو ان کے لئے بنی ہی نہ تھی۔

ع ۔ ہم ایک دوسرے کے واسطے بنے ہی نہ تھے

اور ع یہ اداس اداس بجھی بجھی کوئی زندگی ہے فراق کی

یا پھر یہ شعر:

اور ایسے میں بھی بیاہا گیا مجھے کس سے
جو بن نہ سکتی تھی میری شریک حیات

فراق کی ازدواجی زندگی کس حد تک غمناک اور المناک تھی کچھ اس مصرعے سے اندازہ ہو سکتا ہے۔

ع۔ میں چلتی پھرتی چتا بن گیا جوانی کی

مصرعے پر غور فرمائیے۔ چلتی پھرتی لاش نہیں ہے بلکہ جلتی ہوئی شعلے بھڑکتے ہوئے جوانی کی "چتا" ہے۔ "چتا" کے لفظ نے سارے کرب و سوز کی شدت کو پیکر بخش دیا۔

فراق کی شادی کسی معنی میں "خانہ آبادی" نہ تھی گھر میں انہیں کوئی آسودگی میسر نہ تھی۔ اور شادی کے بعد ان کی نیند اڑ گئی۔ کئی سال بھر تک وہ "بے خوابی" کا شکار رہے۔ لگتا ہے ازدواجی زندگی کے کرب اور راتوں کی بے خوابی نے فراق کو "راتوں" سے وابستہ اور "راتوں" پر فریفتہ سا کر دیا۔ فراق کی شاعری میں رات گویا ان کی ہمراز ہے۔

تاریکیاں چمک گئیں آواز درد سے
میری غزل سے رات کی زلفیں سنور گئیں

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم
جو تیرے ہجر میں گذری وہ رات رات ہوئی

یا اپنی نظم "پچھلا پہر" میں کہتے ہیں:

کس خیال میں ہے غرق چاندنی کی چمک
ہوائیں نیند کے کھیتوں میں جیسے آتی ہوں

حیات و موت میں سرگوشیاں سی ہوتی ہیں
کروڑوں سال کے جاگے ستارے نم دیدہ
سیاہ گیسوؤں کے سانپ نیم خوابیدہ
یہ پچھلی رات یہ رگ رگ میں نرم نرم کسک

رات پر ان کی بے شمار نظمیں اور اشعار رات سے ان کی دلبستگی کے غماز ہیں۔ جون سنہ ۱۹۲۲ء میں لکھی ہوئی ان کی طویل نظم "آدھی رات کو" کا آخری ٹکڑا اوپر پیش کیا گیا ہے۔

زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل
وہ رات ہے کوئی ذرہ بھی محوِ خواب نہیں

آج آنکھوں میں کاٹ لے شبِ ہجر
زندگی پڑی ہے سو لینا

جیسے صبر آزما حالات میں بھی، رگھوپتی سہائے، جو ابھی فراق نہیں بنے تھے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کا امتحان امتیازی نشانات سے پاس کرتے ہیں۔ اپنے انتہائی ذہین ہم مکتبوں سے وہ نشانات میں آگے نہ بھی ہوں تو معلومات میں بہت آگے ہوتے۔ اساتذہ کے چہیتے تھے۔ جب فراق نے شعر کہنے شروع کئے تو ان کے ابتدائی کلام کے نمونے کچھ یوں تھے۔

دل دکھے روئے ہیں شاید اس جگہ اے کوئے یار
خاک کا اتنا چمک جانا ذرا دشوار تھا

ایک تو گھر کے دم گھونٹ دینے والے ماحول سے فراق تنگ تھے۔ دوسرے پہلی بڑی جنگ کے دوران ہندستان کی بھٹی گرم ہو رہی تھی۔ ادھر جنگ ختم ہوئی اور ادھر آزادی کی تحریک نئی طاقت سے ابھر آئی۔ فراق بھی اس لڑائی میں کود پڑے۔ پرنس آف ویلز کا دورہ تھا اور بائیکاٹ کی تحریک تھی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں یوپی کی ساری کی ساری صوبائی کانگریس کمیٹی کے ساتھ فراق بھی دھر لئے گئے۔ جیل ہی میں مقدمہ چلا اور ڈیڑھ سال کی سزا دے کر آگرہ جیل بھیج دئے گئے۔

جیل میں پُرلطف مشاعرہ ہوتا تھا۔ فراق کا ایک مقطع یہ ہے۔

اہلِ زنداں کی یہ محفل ہے ثبوت اس کا فراق
کہ بکھر کر بھی یہ شیرازہ پریشاں نہ ہوا

فراق جیل ہی میں تھے کہ ان کے چھوٹے بھائی ترپراری سرن کا تپ دق میں انتقال ہو گیا۔ فراق نے جیل ہی میں مرثیہ کہا:

ایک سناٹے کا عالم ہے در و دیوار پہ
شامِ زنداں اب ہوئی تو شامِ زنداں ہائے
گھر کو میں کیا منہ دکھاؤں گا رہا ہو کر فراق
میں اسیر اور ان کے یہ حال پریشاں ہائے ہائے

فراق کی زندگی میں یہ اور ایسے کئی المیوں نے انھیں بس نچوڑ کر رکھ دیا۔ ازدواجی زندگی جیسی کچھ تھی، تھی ہی المناک۔ پھر دو دو جوان بھائیوں کا انتقال، جوان بیٹی کا داغِ فرقت دے جانا، ایک خبط الحواس بیٹے کا عین جوانی میں خودکشی کر لینا۔ ان سبھی اذیتوں نے فراق کو موم کی طرح نرم بنا دیا تھا۔

جیل سے سنہ ۱۹۲۲ء میں رہا ہونے کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے رگھوپتی سہائے کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا انڈر سکریٹری بنا لیا اور وہ خود جنرل سکریٹری تھے۔

اس کے بعد غالباً سنہ ۱۹۳۰ء میں فراق الہ آباد یونیورسٹی سے جو ان کی قدیم درسگاہ تھی، انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے۔

ابھی فراق آگرہ جیل ہی میں تھے کہ نیاز فتح پوری کے مشہور رسالے "نگار" کا پہلا شمارہ انھیں ملا۔ اور اس میں فانی کی وہ مشہور غزل چھپی تھی، جس کا مطلع یہ تھا۔

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

بس فراق رات بھر اسی غزل پر سر دھنتے رہے اور اسی طرز میں خود انہوں نے غزل کہہ ڈالی۔

...شرانہ بھول گیا

...نے کی باتیں بھی نہ سمجھانے کی
...زندگی ڈھلتی ہوئی نیند ہے دیوانے کی
...کہتے کہتے یو پھٹنے لگی اور وہ بھی حسب حال رہا۔
اجلے اجلے سے کفن میں سحر ہجر فراق
ایک تصویر ہوں میں رات کے کٹ جانے کی

فراق نے نظمیں بھی کہی ہیں، رباعیاں بھی لیکن
...زل کے وہ امامول میں گنے جاتے ہیں۔ چار دوسرے
...یں حسرت۔ اصغر۔ جگر۔ اور فانی
محمد حسن عسکری نے دسمبر ۱۹۴۰ء میں لکھے ہوئے
اپنے ایک مضمون " اردو کی عشقیہ شاعری میں لکھا تھا
" تو حیرت ہو جاتا ہوں کہ ہمارے دیکھتے ہی
دیکھتے اردو شاعری کیا سے کیا ہوتی جا رہی ہے"
اردو شاعری کو کیا سے کیا "کرنے" میں فراق کو بہت
...امقام حاصل ہے۔ مصحفی کا ایک مشہور شعر ہے:
دل لے گیا ہے میرا وہ سیم تن چرا کر
شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چرا کر
اسی واردات کو فراق نے جو بیان کیا تو "کیا
سے کیا" ہو گیا۔
سمٹ سمٹ سی گئی ہے فضائے بے پایاں
بدن چرائے وہ جس دم ادھر سے گذرے ہے۔
سالک نے کہا تھا:
تنگ دستی اگر نہ ہو سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے
[illegible] جب فراق نے یوں کہا تو بات کیا سے کیا ہو گئی:
[illegible] مفلسی ہو تو کتنی حسین ہے دنیا
جب محمد حسن عسکری نے کہا تھا:
فراق صاحب کے شعروں میں اکثر محبوب کے حسن کا بیان
... کی اصطلاحوں میں پیدا ہو جاتا ہے "
[illegible] اردو
[illegible] "کیا سے کیا" ہو جاتے
[illegible]

فراق کے پاس عشق کی وسعت اور اس کے ابعاد کو
سمجھنے کے لئے ذرا تفصیلی بحث کی ضرورت ہے۔
فراق کی غزل کی جان رومانیت اور جمالیات پرستی
ہے۔ فراق نے اس راستے اردو شاعری کو بہت بلندیوں
تک پہنچایا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ فراق، غالب، یا اقبال
کی طرح فلسفہ کی ان سرحدوں تک نہیں پہنچ پاتے
لیکن احتشام حسین نے فراق کے طرز فکر کو جمالیاتی سریت
سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس طرح فراق سنگیت کی سرحد
کو چھو لیتے ہیں۔
اے جان بہار تجھ پہ پڑتی ہے جب آنکھ
سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں
اردو شاعری کے ساتھ ساتھ "عشق" نے
بھی ارتقا کی کئی منازل طے کی ہیں۔ مولانا حالی نے
جب غزل میں ابتذال دیکھا، جب دلہن سے زیادہ جہیز
پر توجہ دی جاتی تھی، جب آرائش ہی سب کچھ تھی اور معنے کچھ
نہیں تھے، جب محبت کو محض کثیف جسمانی حیثیت سے
دیکھا جاتا تھا اور معاملہ بندی کو اس کی اسفل ترین شکل
میں پیش کیا جاتا تھا جو صرف جذبات کو مشتعل کرنے
کے لئے کشتہ و معجون کا کام کرتی تھی، تو اپنی معرکۃ الآرا
تصنیف " مقدمہ شعر و شاعری میں اس کی خوب خبر لی۔
پھر اس عشق کو حسرت نے پرانی پاکیزگی لوٹا دی۔
معشوق کو معتبری اور عاشق کو رکھ رکھاؤ عطا کیا۔
حسرت موہانی نے خاص طور پر اس بات کو واضح کیا کہ
ادب میں عشق کا ذکر کوئی جرم نہیں لیکن اس کے لئے
ذہنی خلوص اور پاکیزگی ضروری ہے۔ ادب میں جنسی جذبات
کا اظہار ہو سکتا ہے لیکن "ارتکاب" ادب کے زمرے میں
نہیں آتا۔ ادب "میں جنس کے [illegible] کی حد ہے کہ اس
سے پڑھنے والے میں جنسی ہیجان پیدا نہ ہو سکے
[illegible]
عشق و محبت پر [illegible]
کے ساتھ [illegible] اقبال کے پاس عشق

عاشق کے ہاتھ میں کمند بن جاتا ہے۔ اور اس میں ذات
برادری کی تسخیر کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

ع- بڑھاں کمند آور اسے ہمت مردانہ

صدق خلیل بھی ہے عشق
صبر حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں
بدر و حنین بھی ہے عشق

فراق نے بھی اپنے مضمون "غزل کی ماہیت و حیثیت" میں کہا ہے کہ:

"جنسیت کے اندھے طوفان کو توازن بخشنا یعنی تہذیب جنسیت تاریخ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔"

یا پھر

"جنسیت جب داخلی اور خارجی تحریکوں سے عشق بن جاتی ہے تو اس عشق کے لامحدود امکانات کی طرف اس عشق کے ذریعے سے تعمیر انسانیت کی طرف غزل اشارہ کرتی ہے۔ عشق کا پہلا محرک محبوب کی شخصیت ہے۔ پھر یہی عشق حیات و کائنات سے ایک ایسا والہانہ لگاؤ پیدا کر دیتا ہے کہ جنسیت کے حدود سے گذر کر عشق ایک ہمہ گیر حقیقت بن جاتا ہے۔"

فراق نے اپنے شعری مجموعے "مشعل" (مطبوعہ ۱۹۳۶ء) میں اپنی شاعری کے بارے میں یہ کہا ہے:

"اگر میں اپنے آپ کو محض کسی پیکر حسن و جمال کا سچا اور پرخلوص عاشق سمجھوں تو میں کھلے سے اپنی عزت نہیں کر سکوں گا۔ لیکن اگر میں اپنے متعلق یہ محسوس کر سکوں کہ مجھے کائنات کی گوناگوں حقیقتوں اور انسانی زندگی کے اہم پہلوؤں سے دلچسپی ہے۔ ایسی دلچسپی جو محض میرے شعور کی نہیں بلکہ میرے وجدان کی گہرائیوں میں

کار گر ہو تو البتہ میں احساس اہانت و احساس کمتری سے بچ سکوں گا۔ جنسیت اگر وسیع آفاقی معیار سے ہم آہنگ ہو تب تو وہ ایک قابل قدر جذبہ ہے اور ایسی جنسیت کی تحریک سے قابل قدر عشقیہ شاعری جنم لے سکتی ہے۔"

اور یہ بھی کہا:

"جنسیت محض جنسیت سے مکمل نہیں ہوتی آفاق اپنی خارجیت اور داخلیت کے ساتھ جب جنسیت میں سما جاتی ہے جب کہیں پُر عظمت عشقیہ شاعری کی لے جنم لیتی ہے۔"

زمانہ چھین سکے گا نہ میری فطرت سے
مری صفا میرے تحت الشعور کی عصمت

یہی "تحت الشعور کی عصمت" وہ ہتھیار ہے جس سے فراق اس نقطۂ اتصال کو پا لیتے ہیں جو انسان اور کائنات کے درمیان نامعلوم طریقے پر موجود ہے۔

فراق کے پاس عشق کے لئے ابعاد ہیں کہتے ہیں

"غزل کے نغموں میں بہ یک وقت ہم اپنی جبلتوں اور ارتقائے حیات و تہذیب سے حاصل شدہ کیفیتوں، لطافتوں اور صلاحیتوں کی جھنکار سنتے ہیں۔"

اور تو اسے غزل میں ہمارے تحت الشعور کی "تہ در تہ جھنکاریں" سنائی دیتی ہیں۔

یہ شعور، تحت الشعور اور لاشعور کی تہ در تہ جھنکاریں کیا ہیں؟ یہی تو ہمارے تجربوں، ہماری آرزوؤں، تمناؤں، ناآسودہ ارمانوں اور ایک خوش آیند مستقبل کے حسین تصورات کے نقوش ہیں۔ "عشق" جو غزل کا جذباتی مرکز ہے وہ فراق کے پاس وسیع ابعاد اختیار کر لیتا ہے اور "شعور، تحت الشعور اور لاشعور کا ربط باہمی" بن جاتا ہے۔

فراق نے اردو، ہندی، سنسکرت اور انگریزی ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ فراق نے سنسکرت لٹریچر کا راست اور نمائر مطالعہ نہ کیا ہو۔ اور اُن

روایات تک۔ وہ ہندی شاعروں کبیر، جائسی، تلسی، میرا، اور سورداس کے گہرے مطالعہ کے ذریعے پہنچے ہوں۔ انگریزی ادب کا استاد ہونے کے ناطے انھوں نے کلاسیکی اور جدید سبھی انگریزی ادب و دبستانوں سے اکتساب فیض کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کا کہنا ہے کہ فراق کو کیٹس اور ورڈز ورتھ کے نظام اقدار سے بہت دور نہیں۔"

فراق نے اردو اساتذہ کو تو گھول کر پی لیا تھا خاص طور پر مومن اور مصحفی سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ جمالیات پرستی، جسمانیت میں روحانیت کی تلاش اور حسن کو مذہب اور عشق کو ایمان بنا لینا، فراق کو اگر ایک طرف آسکر وائلڈ سے ملا ہے تو یہ دوسری طرف قدیم ہندی ادب کے روایات کا فیض ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے ایک مضمون "فراق کا طرز احساس" میں اس بات کو یوں کہا ہے:

"فراق ہندستانی ہیں اور اردو شاعری کی روایت کے باشعور وارث اس لئے فراق کے کلام میں یہ رچاؤ ایک طرف ہند و آرٹ سے آیا جس میں پیکر تراشی "مادی کثافت کی مدد سے روحانی لطافت پیدا کرنے کی کوشش روا۔ کا جزو بن چکا ہے اور دوسری طرف اردو کے شعری ورثے سے جس میں داخلیت، سپردگی اور لہجے کی نرمی کو درجۂ امتیاز حاصل رہا ہے۔"

جے دیو، ودیاپتی، اور سورداس ان سبھی نے کرشن کو بھگوان کے روپ میں بھگتوں کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ انسان کے روپ میں دیکھا۔ عشق اور محبت کو اس کے مادی، ارضی اور جسمانی شکل میں دیکھا ہے یہاں اشیا جسمانی اور لمسیاتی ہے۔ کوئی ماورائی چیز نہیں۔

غزل کو حسرت نے لذت کوشی کے ادنیٰ جذبات اور ان کے اظہار سے رہا کیا اور فراق نے عشق سے "غم ذات" کو "غم کائنات" سے جوڑنے کے لئے رابطے کا کام لیا۔

ایڈورڈ اسپرینگر نے ٹھیک کہا تھا۔ اگر انسان میں عشق کا احساس نہ ہو تو اسے پتہ بھی نہ چلے کہ نصب العین بھی کوئی چیز ہے۔ اور جب نصب العین ہی نظروں سے اوجھل رہے تو جدحیات کو نہ سمت حاصل ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کا کوئی منصب و مقصد ہو سکتا ہے۔

جس طرح جواہر لال نہرو نے ہندوستانی قوم آزادی کی تحریک کو محض قدیم ہندو مذہبی طاقتوں میں محصور نہ رکھا بلکہ اسے اس شکنجے سے آزاد کیا، اور قدیم ہندستانی تاریخی و تہذیبی روایات کو نئے معنی و سائنٹفک انداز سے آراستہ کیا اور ہندستان کے ایک عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے ٹکراؤ کو نمایاں کر کے ہماری آزادی کی تحریک کو عالمی مخالف سامراج تحریکوں اور انسانی سماج کو استحصال کی لعنتوں سے نجات دلانے کے لئے سوشلسٹ نظام کی جدوجہد سے لا جوڑا یہی کارنامہ فراق نے اردو ادب کے میدان میں انجام دیا۔ خود ان کے الفاظ یہ ہیں:

"میرے وجدان پر عمر بھر ہندستان کے قدیم ترین اور پاکیزہ ترین ادب اور دیگر فنون لطیفہ و نظریہ زندگی کا گہرے سے گہرا اثر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تاریخ ہند کے دور بہ دور بہترین ادب اور دیگر فنی کارناموں، عہد مغلیہ کے بہترین ہندی شاعری ہندستان کے سنگیت اور ہندستان کے اس مزاج کا بھی گہرے سے گہرا اثر رہا ہے جسے ہندستان نے اپنی رنگا رنگ تاریخ میں جنم دیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بہترین فارسی اور اردو شاعری، انگریزی کے بہترین نثر و نظم کا ادب، فلسفہ، اشتراکیت کی فکر قدیم و جدید یورپ کے ثقافتی خزانوں اور کارناموں [illegible] بھی میری غزل پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔"

یوں کہئے فراق اردو شعر و ادب کے جواہر لال نہرو ہیں۔ فراق کے نقادوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ فراق کا بڑا کارنامہ انگریزی شاعری کے بعض اہم رجحانات اور رویوں کو اپنانا اور فروغ دینا ہے۔ انگریزی شعری جمالیات کو اردو کے قالب میں ڈھالنے والے وہ اردو کے اولین ممتاز شاعر

سرسید احمد خاں کے دور میں انگریزی تعلیم کے زیر اثر اردو ادب کا ایک طرح سے نشاۃ ثانیہ ہوا تھا۔ حالی اور نذیر احمد نے انگریزی ترقی پسند رجحانات سے اکتساب کرنے پر زور دیا تھا اور ورڈز ورتھ کے طرز فکر کی پرچھائیاں حالی کے "مقدمہ شعر و شاعری" میں ملتی ہیں

فراق اسی رجحان کو اور آگے لے جاتے ہیں اور اردو شعر کو نئے میلانوں اور میلانات سے آگاہ کرتے ہیں

ڈاکٹر قمر رئیس نے کہا ہے:

"فراق نے دور جدید میں اردو غزل کے امکانات
اور اردو شاعری کی روایت کے تسلسل
پر زور دیا"

فراق کے نزدیک تسلسل ادب کا آئین ہے۔ اور شاعری آواز باز گشت کا ایک سلسلہ ہے۔

لیکن یہ "تسلسل" کوئی مسطح اور مستقیم سلسلہ نہیں ہے۔ یہ ارتقا کے منازل کو طے کرتا ہوا سلسلہ ہے ہر حال کو "اپنے ماضی" سے آگے بھی ہونا چاہئے اور ارفع بھی۔ ادب کا ارتقا سماج کے ارتقا کا عکس بھی ہے اور نقیب بھی کسی دور کا ادب اگر اپنے دور کے نقش دکھاتا ہے تو اس سے آگے بڑھنے کی بھی بشارت دیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جو شاعری میں پیمبری کی شان پیدا کرتا ہے۔ روایت اور بغاوت کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ جہاں وقت جہد حیات میں ایک کوتاہی اور ایک رکاوٹ بن جاتا ہے وہیں بغاوت کی روایت بھی جنم لیتی ہے۔ یہ ارتقا جدلیاتی ترجمان ہے۔

فراق نے رباعیاں بھی کہی ہیں۔ اور ان کی رباعیوں کے دو دور ہیں۔ کوئی ۶۰، ۷۰ رباعیاں وہ ہیں جو فراق نے ۱۹۲۹ء کے آس پاس آسی غازی پوری کے انداز میں کہی تھیں۔ رنگ کچھ یہ ہے:

بچھڑے ہم دوست سے مقدر پھوٹے
ڈر ہے غم ہجر میں نہ ہمت چھوٹے
وہ کٹ چلے شام غم وہ ٹپکے آنسو
وہ صبح ہوئی وہ دیکھو تارے ٹوٹے

پھر بہت برسوں تک فراق نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ لیکن ۴۶-۱۹۴۵ء میں فراق نے کوئی ساڑھے تین سو رباعیاں کہہ ڈالیں۔ ان رباعیوں کا مجموعہ "روپ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

جھرمٹ میں گلوں کے جیسے جگنو چمکے
شفاف صدف میں جیسے موتی دمکے
اوشا کا سہاگ مسکراہٹ کی یہ لو
گھونگھٹ سے شفق کے جیسے تارا جھمکے

لہرائی ہوئی شفق میں اوشا کا یہ روپ
یہ نرم دمک مکھڑے کی پیچ و پیچ ہے الوپ
ترا ابھی اڑا اڑا سا آنچل زرتار
گھونگھٹ سے وہ چھنتی ہوئی رخساروں کی دھوپ

"روپ" کی رباعیوں کا رنگ بالکل الگ ہے۔ یہاں ہندی شاعری کا شرنگار رس ہے اور اردو شاعری کا نرم لہجہ ہے۔ تت سم الفاظ کا کھل کر استعمال کیا ہے۔ لیکن زبان میں نہ اجنبیت محسوس ہوتی ہے اور نہ سختی۔ یہاں فراق نے ہندو دیو مالا سے مضامین لئے ہیں اور ایک ہندو حسینہ ان کا موضوع ہے۔ ہندی الفاظ کے انتخاب نے رباعی کو یوں جاندار بنا دیا ہے کہ وہ اپنے ماحول سے پوری طرح ہم آہنگ ہو گئی ہے۔ مصنف نے بھی اس بات کا خیال نہ رکھا جب وہ رام چندر کے بن باس جانے سے پہلے اپنے باپ سے رخصت ہونے کا بیان کرتے ہیں:

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
نام اور خدا کا نام لے کر باپ سے رخصت ہو، اس میں اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی کیا بیاں مل جائیں گی جہاں ہندو عورت کے منہ سے ایسی دعائیں کہلوائی جاتی ہیں جو مسلم بی بیاں ہی کہہ سکتی ہیں۔

فراق کی "روپ" کی رباعیاں ان معنوں میں اردو ادب میں اضافہ ہیں کہ وہ اردو پڑھنے والوں کو اس فضا سے اس کے اپنے اصلی رنگ میں روشناس کرواتے ہیں۔ اور ان کی عظمت اس میں ہے کہ وہ پھر بھی ہندی کی چوپائیاں نہیں کہلائیں گی۔

تنقید کے میدان میں بھی فراق کا اپنا مقام ہے "اردو کی عشقیہ شاعری" "غزل کی ماہیت و ہیئت" اور ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "انداز" ان کے اس مقام کی نشاندہی کرتے ہیں۔

فراق نے تیسری دہائی کے اواخر میں اردو شاعری پر انگریزی میں تنقیدی مضامین لکھے۔ غالب پر ایک رسالہ "ایسٹ اینڈ ویسٹ" میں شائع ہوا تھا۔

پھر حیوں گورکھپوری سے میل جول بڑھا اور تنقیدی ذوق چمک اٹھا۔ "تنقیدی مضامین لکھتے رہے اس کے بعد نیاز فتح پوری سے تعارف ہوا اور قربت بڑھی تو ذوق تنقید اور بھی نکھرا۔ پھر کیا تھا؟ کوئی سات آٹھ سو صفحات پر مشتمل مضامین اکٹھے ہو گئے۔ فراق کی تنقید تاثراتی تنقید کے زمرے میں آتی ہے۔ یہاں انگریزی تنقید کا فراق پر کافی اثر ہے۔ اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعے "انداز" کے پیش لفظ میں فراق کہتے ہیں:

"مجھے اردو شعر کو اس طرح سمجھنے اور سمجھانے میں بڑا لطف آتا ہے جس طرح یورپین نقاد یورپین شعراء کو سمجھے اور سمجھا سکے ہیں۔ اس طرح ہمارے ادب کا شعری تجربہ زیادہ گہرا ہو سکتا ہے اور اس کی قیمت بڑھ سکتی ہے۔"

اور پھر کہا:

"میری رائے میں نقاد کو یہ کرنا چاہیے کہ تنقید پڑھنے والے میں بیک وقت ایک ہیجان اور آسودگی پیدا کر دے۔ اسی کے ساتھ ساتھ حیات کے مسائل و کائنات اور انسانی کلچر کے اجزاء و عناصر کو اپنی تنقید میں سمو دے۔"

اور یہ بھی:

"تنقید محض رائے دینا یا میکانکی طور پر زبان اور فن سے متعلق خارجی امور کی فہرست مرتب کرنا نہیں ہے بلکہ شاعری کے وجدانی شعور کے بھید کھولنا ہے۔ ناقد کو احساسات اور تعبیریں پیش کرنا چاہئیں نہ کہ رائیں۔"

فراق نہ صرف ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہیں بلکہ اس کے ایک رہنما رہے ہیں۔ جنگ و امن، آزادی ویت نام کی جد و جہد، عالمی انقلابی تحریکیں۔ کوئی موضوع نہیں جس پر فراق نے اعلیٰ درجے کے شعر نہ کہے ہوں۔

فراق کو اس عذاب کا بھرپور احساس ہے جس کا آج سرمایہ داری نظام میں انسان شکار ہے لیکن جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے "عذاب کا ایک جمالیاتی احساس بھی ممکن ہے" اس احساس میں گل کی چھیڑ پنہاں ہیں۔ مطالعہ اور تعمیری امکانات ہیں" فراق نے اپنے مجموعے "روح کائنات" کے دیباچے میں جون ۱۹۴۵ء میں وہ بات بتا دیا جو انھیں ترقی پسندی نہیں بلکہ بڑ شعراء کی صف اول میں لا کھڑا کرتا ہے۔ کہتے ہیں:

"مصائب کے جمالیاتی احساس میں انقلاب چھپے ہیں نہ کہ مصائب کے صحافتی احساس میں۔"

فراق اس "جمالیاتی احساس" کے شاعر ہیں۔ عشق کی جمالیات سے لے کر انقلاب کی جمالیات تک فراق کی شاعری کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اخبار سہیل، گیا

بہار میں ۲۰ نکاتی پروگرام

بہار میں عوام خاص کر کمزور طبقے کے لوگوں کی حالت سدھارنے کے مقصد سے وزیر اعظم کے ۲۰ نکاتی پروگرام کو پوری مستعدی سے لاگو کیا جا رہا ہے۔ یہاں کچھ خاص علاقوں میں کئے گئے کاموں کی مختصر روداد پیش کی جا رہی ہے۔

۱۔ انوسوچت ذات / انوسوچت جن جاتی سے متعلق ڈیولپمنٹ کا کام ۸۴-۱۹۸۳ء میں (اکتوبر ۸۳ء تک) انوسوچت جاتی کے ۳۲۹ خاندانوں کو اور انوسوچت جن جاتی کے ۵۶، ملا خاندانوں کو غریبی ریکھا پار کرنے میں مدد دی گئی۔ یہ ٹارگیٹ کی ۱۰.۲ فیصد کامیابی ہے۔

۲۔ گاؤں میں پینے کے پانی کی سپلائی: چالو مالی سال میں اکتوبر ۸۳ء تک ۱۳۵۶ سمسیا گرست گاؤں کے لئے پینے کے پانی کی سپلائی کا انتظام کیا جا چکا ہے۔ جس سے ۳۰.۸ فیصد ٹارگیٹ پورا ہوا ہے۔

۳۔ بے مکان لوگوں کے لئے مکان کی جگہ: ۸۴-۱۹۸۳ء میں اکتوبر تک ۱۱۳۰۸ بے مکان خاندانوں کو مکان کے لئے جگہ دی گئی ہے جو متعین ٹارگیٹ کا ۲.۹۴ فیصد ہے۔ ابھی تک کل ۴۰۵۰۰۹ مکان کی جگہ تقسیم کی گئی ہے جس میں ۲۴۱۱۸ جگہ انوسوچت ذاتوں میں اور ۴۳۲۶ جگہ انوسوچت جن جاتوں کے بیچ تقسیم کیا گیا۔

۴۔ پیڑ لگاؤ پروگرام: ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۱ کروڑ ۴۰ لاکھ پیڑ لگانے کا ٹارگیٹ رکھا گیا جو اکتوبر ۱۹۸۳ء کے آخر تک پورا ہو چکا ہے۔ یہ کامیابی بہار کے علاوہ دوسرے سات صوبوں کو حاصل ہے۔

۵۔ بائیو گیس: یہ نہایت ہی اہم پروگرام ہے جس پر صوبائی حکومت کے ذریعہ عمل کیا جا رہا ہے۔ اس جانب ٹارگیٹ کا ۹۰ فیصد سے زیادہ حاصل کرنے والے دو صوبوں (کرناٹک اور ہماچل پردیش) کے علاوہ بہار ہی ایک ایسا صوبہ ہے جس نے ۹۲ فیصد کی کامیابی حاصل کی ہے۔

۶۔ سمیکت گرامین ڈیولپمنٹ اور راشٹریہ گرامین یوجنا پروگرام: سمیکت گرامین وکاس پروگرام کے تحت ۳،۶۲،۳۵۴ خاندانوں کو فائدہ حاصل ہوا ہے۔ جس میں انوسوچت ذات کے ۱،۰۰،۵۰۰ اور انوسوچت جن جاتی کے ۳۴،۷۸۶ خاندان شامل ہیں۔ اس جانب کئے گئے کاموں کے لئے اس صوبے کی کافی عزت افزائی کی گئی ہے۔ (۷) کمزور طبقہ کے لوگوں کے لئے گرامین آواس پروگرام: موجودہ مالی سال میں اس پروگرام کو آگے بڑھایا گیا ہے جس کے تحت ستمبر ۱۹۸۳ء تک کی چھ ماہی کے لئے حاصل ۴۰.۳۲ فیصد کامیابی کے خلاف اکتوبر ۸۳ء تک ٹارگیٹ ۳۵.۰۷ فیصد پورا کر لیا گیا۔ (۸) بجلی کی پیداوار اور گاؤں میں بجلی: موجودہ مالی سال میں اکتوبر ماہ تک ۳۴۵ گاؤں کا بجلی کرن ہوا اور ۲،۷۷۳ پمپنگ سیٹوں کو بجلی دی گئی۔ اسی تعداد میں ۹۶۰ ہریجن بستیوں کو بھی بجلی لائن دیا گیا ہے۔ (۹) تلہن اور دلہن کی پیداوار میں اضافہ: اس پروگرام کے تحت ۸۴-۱۹۸۳ء کے لئے ۵.۰۳ لاکھ ٹن کی پیداوار کا ٹارگیٹ رکھا گیا ہے [illegible] لاکھ ہیکٹیر میں مکمل بونگ کی اور ۱.۰۷ لاکھ ہیکٹیر میں ارہر، باجرہ وغیرہ کی خریف فصل لگائی گئی ہے۔ [illegible] دوسرے پروگراموں کو بھی برابر اہمیت دیا جا رہا ہے اور صوبے کے وزیر اعلیٰ شری چندر شیکھر سنگھ [illegible] ٹارگیٹ کو کامیابی تک پہنچانے میں مصروف ہیں۔

اصغر علی انجینئر

قرآن کی روشنی میں I

نوٹ: جناب اصغر علی انجینئر کا یہ مضمون ستمبر کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ لیکن طباعت کی خرابی کی وجہ کر بالکل ہی پڑھا نہیں جا سکتا۔ اس لئے قارئین سے معذرت کے ساتھ یہ مضمون دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ (ایڈیٹر)

ہم آج سورۂ بقرہ کی چند ابتدائی آیتوں پر روشنی ڈالیں گے۔ یہ آیتیں کئی معنی میں اہم ہیں۔ پہلے ہم یہ آیتیں پیش کریں گے اور ان کے لفظی معنی۔

الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۝ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ

یہ کتاب، کچھ شک نہیں اس کتاب میں یہ راہ دکھلاتی ہے ڈرنے والوں کو جو کہ غیب پر یقین رکھتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور جو ہم نے انہیں روزی دی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور وہ لوگ جو تجھ پر اور تجھ سے قبل جو کچھ نازل ہوا ایمان لاتے ہیں اور آخرت کو یقینی جانتے ہیں وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی فلاح حاصل کرنے والے ہیں۔ جو لوگ کافر ہو گئے انہیں آپ ڈرائیں یا نہ ڈرائیں برابر ہے، وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے عذاب عظیم ہے۔

اب ہم ان آیتوں کی تشریح کریں گے۔

قرآن کریم حکمت کی کتاب ہے۔ بظاہر سیدھے سادے الفاظ میں بھی انسانی نفسیات کے گہرے نکات بیان ہو جاتے ہیں اور ان الفاظ [illegible] معنویت ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا ہے کہ [illegible] ان کی [illegible] سے انکار کرتا ہے۔ [illegible]

کے اعتماد پر یقینی طور سے اسے لینے کا نام ایمان ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایمان کے لئے اعتماد اور دلی یقین دونوں ضروری ہیں۔ اسی لئے اس لفظ کا اطلاق عام طور پر مشاہدے اور محسوسات پر نہیں ہوتا۔ اسی لئے اصل اہمیت ایمان بالغیب کی ہوتی ہے۔ جو شخص ہمیں غیب سے متعلق بتاتا ہے (یہاں مراد غیب کی تفصیلی خبر نہیں بلکہ نفسِ غیب ہے) اس پر اعتماد کرنا اور غیب پر دلی یقین کرنا ایمان بالغیب کہلائے گا۔

یہاں دوسرا لفظ غیب ہے۔ غیابت در اصل کنوئیں کی گہرائی یا میدان کی انتہا جس میں آدمی نظر سے اوجھل ہو جائے کو کہتے ہیں اور اسی لئے غیب اُسے کہیں گے جو نظروں سے اوجھل ہو اور آج ہمارے محسوسات کی دسترس سے پرے ہو۔ گویا ایسی باتوں پر دل سے یقین کرنا جو آج ہمارے محسوسات سے پرے ہو۔ گویا ایسی باتوں پر دل سے یقین کرنا جو آج ہمارے محسوسات سے پرے ہیں۔ ایمان بالغیب کہلائے گا۔ تھیالوجی کی زبان میں غیب سے مراد ان باتوں سے ہے جن کا علم ہمیں صرف انبیا کرام علیہم السلام کے ارشادات و اخبارات کی وجہ سے ہی ہوا ہے جیسے مرنے کے بعد عذاب و ثواب، جنت و دوزخ اور جزا و سزائے اخروی کی کیفیت اور عالمِ آخرت کی واردات وغیرہ۔

آج کے سماجی علوم کی زبان میں غیب اسے بھی کہا جائے گا جو آگے چل کر وقوع پذیر ہوگا اور جسے ہم مستقبل میں ہی اپنے محسوسات کے دائرے میں لا سکیں گے۔ یعنی آج جو بات بالقوۃ ہے اور ہمارے مشاہدے سے پرے ہے وہ کل بالفعل وجود میں آئے گی اور ہم اسے اپنے حواس سے محسوس کر پائیں گے۔ ظاہر ہے انسان روشن مستقبل کی امید میں ہی اطمینان قلب کے ساتھ جی سکتا ہے اور اسی مستقبل کے لئے جد و جہد کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ اگر اسے اس بات کا یقین نہ ہو کہ وہ اپنی جد و جہد کے ذریعے خوش آئند زندگی اور صحت مند معاشرے کی تشکیل کر سکتا ہے اور یہ کہ اس کی جد و جہد میں خوش آئند مستقبل کے بے پناہ امکانات ہیں، وہ جد و جہد کرنے پر ہی آمادہ نہیں ہوگا۔ کوئی بھی بامعنی عمل کرانے کے لئے انسانی نفسیات کا یہ نکتہ سمجھنا بے حد ضروری ہے۔

اس اعتبار سے بھی قرآن مجید میں ایمان بالغیب پر زور دیا گیا ہے اور اسے متقین کی ایک ایک ضروری شرط قرار دیا گیا ہے۔ برائی سے بچنے کا خوف اسے ہدایت کی ضرورت محسوس کرائے گا اور اس ہدایت کو وہ بامعنی عمل اور جد و جہد کی صورت اسی وقت دے سکتا ہے جب اسے مستقبل کی زندگی کے بے پناہ تخلیقی امکانات کا دل سے یقین ہو۔ اسی لئے ایک متقی شخص کے لئے ایمان بالغیب ایک ضروری وصف قرار پاتا ہے۔ ہدایت وہی ہے جو ایک بامعنی اور صحت مند معاشرہ قائم کرنے میں مدد دے اور برائی کا خوف پیدا کرے اور ہدایت پر عمل اسی وقت ممکن ہے جب مستقبل میں ایسے معاشرے کے امکانات پر یقین کامل ہو۔ اس معنی میں بھی ایمان بالغیب کی اہمیت ظاہر ہے۔

دوسرا وصف متقین کا اقامت صلوٰۃ قرار دیا گیا ہے۔ تھیالوجی کی زبان میں صلوٰۃ نماز، دعا، استغفار، بزرگی بیان کرنا، پاکی بیان کرنا اور تبریک و تمجید کو کہتے ہیں۔ مختلف امتوں میں اس کے مختلف طریقے رائج ہیں اور اسلام میں اس کا طریقہ قرآن و سنت کی روشنی میں مقرر کیا گیا ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں ہے۔ ہم صلوٰۃ کے دوسرے نکات کو بھی پانا چاہتے ہیں۔ بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ صلوٰۃ کی اصل صلا ہے جس کے معنی آگ ہے اور کہا جاتا ہے [illegible]

[illegible] کے ان الفاظ میں سمائے ہوئے ہیں۔ اپنے دور کے تجربات، تعلقات اور تحقیقات کی روشنی میں سمجھنا ضروری ہے۔ ہر دور میں علوم ایک خاص مرحلے میں داخل ہوئے ہیں اور اس مرحلے میں علمی زبان کا ایک [illegible] (۱۵۰۴) پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے رموز و نکات کو اس مرحلے میں اس محاورے میں اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے اور اس کی تجدید اس کی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے ہمارے دور میں بھی علمی زبان کا ایک محاورہ ہے اور اگر جدید نسل کو قرآن مجید کے ان رموز و نکات سے واقف کرانا ہے تو جدید سائنس کی تھیالوجی کی زبان سے بھی کام لینا پڑے گا۔ آج کے دور کی روایتی سماجی علوم کی زبان بھی استعمال کرنا پڑے گی۔

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تھیالوجی کی اس زبان کی آج کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس کی اپنی جگہ بہت مسلم ہے اور اسے ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان رموز و نکات کو آج کے علم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ اس مختصر تمہید کے ساتھ اب ہم مندرجہ بالا آیات کی تشریح کرتے ہیں۔

اوپر کی آیت میں قرآن مجید کو ایک ایسی کتاب بتایا گیا ہے جو متقین کے لئے ہدایت کی کتاب ہے۔ عام طور پر مفسرین نے اس بات کی تشریح کی ہے کہ اسے متقین کے لئے ہدایت کی کتاب کیوں قرار دیا گیا جبکہ ہدایت ان کے لئے لازم آتی ہے جو گمراہ ہوں۔ ہم آج اس بات کو نفسیات کے موجودہ علم کی روشنی میں اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ تھیالوجی کی زبان میں عام طور پر متقی اُسے کہتے ہیں جو اللہ سے ڈرتا ہے اور ان باتوں پر عمل کرتا ہے جن کی اُسے ہدایت کی گئی ہے۔ اور اُن سے احتراز کرتا ہے جن سے اُسے منع کیا گیا ہے۔ امام راغب مفردات میں تقویٰ کے اصل معنے نفس کو خوف کی چیز سے بچانا بتاتے ہیں اور پھر مجازاً خوف بول کر تقویٰ اور تقویٰ بول کر خوف بھی مراد لیا جاتا ہے۔

اس لئے عربی زبان میں تقویٰ کے رائج معنی دراصل نفس کو کسی بھی خوف کی بات سے بچانا ہوا یعنی متقی وہ ہوگا جو اپنے نفس کو خوف کی چیز سے بچائے رکھنے کی کوشش کرے۔ اگر ہم اب ایسے نفسیات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں تو پہلے یہ سمجھنا ہوگا کہ انسان کس چیز سے خوف کھاتا ہے اور جس بات سے وہ خائف ہوتا ہے اس سے بچنے کے لئے کیا کرتا ہے، کون سی تدابیر اختیار کرتا ہے۔ ظاہر ہے انسان پر اس چیز سے خوف زدہ رہے گا جو اُسے نقصان پہنچانے والی ہو لیکن اکثر یہ بھی ہوتا ہے۔ اور اس کی جانب بھی قرآن مجید میں اکثر جگہ پر اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ اسے خود علم نہیں ہوتا کہ کن باتوں سے اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ایک عام آدمی اس کے لئے ہدایت کا محتاج ہوتا ہے۔ اور اللہ کی کتاب انسان کو یہ ہدایت عطا کرتی ہے کہ اس کے لئے کون سی باتیں مفید ہیں اور کون سی باتیں نقصان دہ ہیں تاکہ مؤخر الذکر باتوں سے وہ بچ سکے یعنی یہ کتاب انہیں کے لئے باعث ہدایت ہوگی جن میں برائی سے بچنے کے لئے نفسیاتی طور پر آمادگی کا مادہ ہو، اپنے نفس اور سماج کو نقصان پہنچانے والی باتوں سے بچے اور ان سے خوف زدہ رہنے کی تیاری ہو۔ اس بات کو آگے آنے والی آیتوں میں اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ جن پر ہم روشنی ڈالیں گے۔

جو متقی ہیں ان سے متعلق آگے کی آیت میں تین باتیں بتائی گئی ہیں (۱) وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ (۲) [illegible] قائم کرتے ہیں اور (۳) اللہ نے جو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ تھیالوجی کی زبان میں متقی کے اوصاف کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے۔ ہم سماجی علوم کی زبان میں اس پر کچھ روشنی ڈالیں پہلے وضاحت میں ایمان اور غیب یہ دو اہم لفظ استعمال [illegible] ہیں۔ لغوی اعتبار سے کسی کی بات کا [illegible]

بچے نفس سے دور کیا۔ آگ ظاہر ہے نقصان پہنچانے والی شئے ہے اور اس معنی میں ہم کہہ سکتے ہیں
کہ صلوٰۃ اُسے کہیں گے جو انسان کے نفس کو برائی کی آگ سے بچائے۔ (قرآن مجید میں یہی کہا گیا ہے
کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ یعنی نماز ہر قسم کی برائی سے بچاتی ہے) صلوٰۃ کا
ایک اور پہلو بزرگی بیان کرنا اور خالق کائنات کی تمجید کرنا۔ علامہ انور شاہ کشمیری تحریر فرماتے ہیں " ہر وہ عبادت
جس میں مخلوق کی طرف سے خالق کی عظمت اور اپنی بیچارگی و خشیت کا اظہار ہو تو اسے صلوٰۃ کہیں گے۔"
اس معنی میں صلوٰۃ نفس کی اس کیفیت کو کہیں گے جس میں ایک طرف تمام برائیوں اور منکر سے
بچنے کا عزم ہو اور دوسری طرف اس وسیع و عریض کائنات اور اس کے خالق کے مقابلے میں اپنے عجز کا احساس
ہو۔ آئن سٹائن جیسے مشہور و معروف سائنسداں اس موخرالذکر جذبے کو SENSE OF AWE کہتا ہے۔
انگریزی میں AWE اس کیفیت کو کہتے ہیں جو کسی عظیم اور جلیل القدر ہستی کی موجودگی میں پیدا ہو اور جس
میں احترام، قدردانی، مدح اور خوف کے جذبات شامل ہوں۔ ظاہر ہے اگر کسی انسان کے نفس میں یہ
کیفیت قائم رہے تو وہ جہاں اپنے حاصلات پر فخر کرے گا وہاں وہ اپنے حدود کو بھی ہرگز نظر انداز نہیں
کرسکے گا اور اس طرح وہ اپنی شخصیت میں اعتدال اور توازن قائم رکھ سکے گا۔ اور اس کے حاصلات
کی سمت بھی ان حدود میں رہے گی جو معروف کی حدود ہیں اور جسے قرآن مجید کی زبان میں حدود اللہ بھی
کہا گیا ہے۔

تیسری صفت متقین کی جو بیان کی گئی ہے وہ ہے وَمِمَّا رَزَقۡنٰھُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ یعنی ہم نے انہیں
جو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یہاں یہ الفاظ مِمَّا رَزَقۡنٰھُمۡ بڑے اہم ہیں۔ یہ بات یہاں
جتائی جا رہی ہے کہ جو بھی مال و متاع تم نے حاصل کیا ہے وہ اس پورے نظام کا نتیجہ ہے جو ہم نے پیدا کیا
ہے۔ یہ محض کسی ایک فرد یا چھوٹے سے گروہ کی کوششوں کا ہی نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس میں قدرت کا پورا
اجتماعی نظام بھی شامل ہے۔ زمین، بارش، مختلف قسم کی دھاتیں (جن سے صنعتی اشیاء تیار ہوتی ہیں)
تیل وغیرہ وغیرہ۔ اسی لئے مال و متاع پیدا کرنے میں جہاں انفرادی محنت کا دخل ہے وہاں پورے اجتماعی نظام
کا بھی۔ اس لئے اگر کچھ مال و متاع کسی فرد کے قبضے میں ہے تو وہ اسے خدا کی امانت تصور کرکے اس طرح
خرچ کرتا ہے کہ کوئی دوسرا فرد سماج میں اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے کیونکہ اگر مال و
دولت اگر چند افراد کے ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ جائے تو اجتماعی نظام میں خلل پیدا ہو جائے گا۔ اور یہ
خلل ظاہر ہے ایک برائی ہے اور ہر متقی کو برائی کا خوف ہونا چاہیے۔ اسی لئے متقین کے لئے اجتماعی نظام
کو برائی سے بچائے رکھنے کے لئے خرچ کرتے رہنا بہت ضروری ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ متقین کے لئے یہ
تینوں وصف کتنے ضروری ہیں جو مندرجہ بالا آیت میں بیان کئے گئے ہیں۔

آگے چل کر کہا گیا ہے کہ اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنۡ رَّبِّہِمۡ ٭ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ کہ
وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہدایت
کی راہ انہیں باتوں پر عمل کرنے میں ہے جو اوپر بیان کی گئیں اور انہی باتوں پر عمل کرکے انسان کامیابی حاصل
کرسکتا ہے۔

باقی آیتوں کی تشریح ہم انشاء اللہ آئندہ مضمون میں کریں گے۔

خواجہ احمد عباس
گزیبا ۱۲۔ چرچ یارڈ روڈ، بمبئی

تین مائیں ایک بچہ

بچہ ایک تھا ...... چار یا پانچ برس کا ہوگا — خوبصورت تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ مگر ان آنکھوں میں دنیا بھر کا غم بھرا ہوا تھا۔ جیسے ایک بڑے گمبھیر فلاسفر کو پاکٹ سائز بنا دیا گیا ہو۔ جسم بھی لاغر تھا۔ جو تعجب کی بات نہیں تھی کیونکہ وہ بچپن ہی سے ایک بھکارن کے یہاں پلا تھا۔ جو اسے نہ دودھ ہی دے سکتی تھی نہ انڈا۔ نہ کوئی وٹامن۔ نہ پروٹین۔ نہ مچھلی نہ چکن۔

بچے کا مقدمہ سارے ملک میں مشہور تھا۔ ٹیلی ویژن پر جن بھکاری اور لاوارث بچوں کی تصویریں آئی تھیں ان میں یہ بچہ بھی تھا۔ سارے ملک میں ایک ہمدردی اور شفقت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جب بچے نے اپنی توتلی زبان میں کہا تھا "میری ماں بھگوان کے پاس چلی گئی ہے۔"

ان ٹیلی ویژن دیکھنے والوں میں دو خوشحال بڑے خاندانوں کی عورتیں بھی تھیں بچے کو دیکھتے ہی ان کی ممتا ابل پڑی۔ ایک بمبئی میں تھی۔ ایک دہلی میں۔ لیکن دونوں نے فوراً کہا، "یہ تو میرا بچہ ہے۔" اگرچہ ایک نے کہا: "یہ تو میرا بچہ گوپال ہے۔" اور دوسری نے کہا: "یہ تو میرا بچہ حامد ہے۔"

جو بمبئی میں تھیں وہ مسز لکشمی جے سوریہ تھیں۔ جو اصل میں ویزاگ پٹنم کی رہنے والی تھیں۔ مگر اب چند سال سے بمبئی میں مقیم تھیں کیونکہ ان کے شوہر مسٹر جے سوریہ پہلے جہاز بنانے والی کمپنی میں انجینئر تھے۔ پہلے وہ وزیر آباد یا گورنمنٹ کے ملازم تھے اور شپ یارڈ میں کام کرتے تھے وہاں سے ایک پرائیویٹ فرم کو لاکھوں کا فائدہ پہنچانے کے الزام میں SUSPEND کیے گئے اور اسی پرائیویٹ فرم نے ان کو بڑی تنخواہ پر ملازم رکھ لیا۔ ایک بڑی امپورٹڈ فلیٹ کار اور سمندر کے کنارے سجا سجایا فلیٹ مفت۔

اب وہ پہلے سے زیادہ ٹھاٹ باٹ سے رہنے لگے تھے۔ گھر میں ہر قسم کا اعلیٰ سامان تھا۔ جاپانی گڑیاں اپنے شیشے کے گھروں میں سے اپنی مردہ نیلی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ پلاسٹک کے پھول گلدانوں میں سجے تھے جن میں سے نہ بو آتی تھی نہ باس نہ ہی پانی دینے کی ضرورت تھی۔ لیکن دیکھنے میں بالکل اصل لگتے تھے۔ لیکن جب کبھی گھر میں پارٹی ہوتی تھی تو مسز لکشمی جے سوریہ ان کے پتوں پر پانی چھڑک دیتی تھیں اور پھولوں پر سینٹ کی پچکاری سے سینٹ چھڑک دیتی تھیں۔ گھر میں بس ایک ہی چیز کی کمی تھی وہ ایک بچہ تھا۔

مسز لکشمی جے سوریہ نے جیسے ہی بڑی بڑی افسردہ آنکھوں والے بھکاری بچے کو دیکھا اور ان کو یقین ہو گیا کہ یہ ان کا ہی کھویا ہوا "گوپال" ہے۔ وہ بچے پر اپنا حق ثابت کرنے کے لئے اپنے شوہر کے تمام رسوخ استعمال کرنے کے لئے تیار ہو گئیں۔

ادھر دہلی میں ان کی ہی عمر کی بیگم شہناز مرزا نے جب بچے کو دیکھا جن کے شوہر کی ساری جائداد دلی اور لکھنؤ میں بکھری پڑی ہوئی تھی۔ کیونکہ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ شاہی خاندان سے ہیں۔ اصل میں وہ شاہی خاندان سے آزردہ بیگم

ان کے پکڑ دادا، پکڑ دادا بادشاہ سلامت کے حقہ بردار ضرور تھے جو حقے کی آواز کی مناسبت سے گڑگڑ بیگ کہلاتے تھے اور اسی لئے محل کے ماحول سے اور محل کی زبان سے اچھی طرح واقف تھے۔ غدر کے بعد جب بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو رنگون جلاوطن کیا گیا تو ان کے حقہ بردار نے کھلم کھلا انگریزوں کا ساتھ دیا اور بادشاہ کے بہت سے خزانے انگریزوں کے سامنے ظاہر کر دیئے۔ جس کے انعام میں انگریزوں نے بہت سی شاہی جائیداد ان کے نام کر دی اور اعلان کر دیا کہ شہزادہ "گڑگڑ بیگ" سے حقے کی بو آتی تھی اس لئے انھیں گل گل بیگ بنا دیا گیا تھا) گل گل بیگ ان اصل شہزادوں میں سے ایک ہیں جو آخر وقت تک برطانوی گورنمنٹ کے وفادار رہے۔ غرض اب کہ صاحب جائیداد ہو گئے تھے انھوں نے اور ان کے بیٹوں پوتوں نے اس جائیداد کو سوا سو برس میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ نئی دہلی بننے کا اعلان ہوتے ہی انگریز افسروں کے اشارے پر انھوں نے زمین کے بہت سے ٹکڑے خرید لئے۔ اب وہاں اونچی اونچی بلڈنگیں بن گئی تھیں۔ "مرزا ٹیرس" "مغل پیلس ہوٹل" اور "حویلی اپارٹمنٹس"۔ چند عمارتیں تھیں جو یا تو مرزا مغل بیگ کی اپنی تھیں یا جن میں ان کا بڑا حصہ تھا۔

ان کا اپنا گھر "گل گل محل" (جو انھوں نے اپنے جد امجد کے نام پر رکھا تھا) ایک فرانسیسی آرکیٹکٹ نے مغل اسٹائل میں تعمیر کیا تھا۔ اس لئے اس میں مغل نفاست اور نزاکت کے ساتھ یوروپین FUNCTION ALISM کا امتزاج تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھنے میں مغل پیلس لگتا تھا لیکن اندر اسٹین لیس اسٹیل اور شیشے سے کام لے کر بیڈ روم، ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، باتھ روم وغیرہ بنائے گئے تھے۔ اس گھر میں بھی بس ایک ہی کمی تھی۔ مرزا مغل بیگ کا کوئی جانشین نہیں تھا۔ ایک بچہ تھا جو گورنیس کی غفلت سے یا اس کے مجرمانہ تغافل سے
[illegible]

روپے تو بچے کو ڈھونڈنے میں ہی لگا دئے تھے لیکن وہ نہ ملا تھا۔ یہاں تک کہ پانچ سال بعد جب ایک دن وہ جم خانہ کلب میں برج کھیل رہے تھے اور بیگم صاحبہ گھر میں ٹیلی وژن دیکھ رہی تھیں۔ ان کے گھر سے [illegible] بیگم شہناز! تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ جب ہم کلب میں کھیل رہے ہوں تو ٹیلی فون نہ کیا کرو۔ یہاں ہزاروں کی بازی لگی ہوئی ہے۔"

مگر شہناز بیگم کا جواب پا کر وہ اچھل پڑے میں رہ گئے۔ "بھاڑ میں جائے تمہاری ہزاروں کی بازی۔ ہمارا شہزادہ مل گیا ہے۔"

"ہمارا شہزادہ مل گیا ہے؟ کہاں ملا؟"

"بمبئی میں ہے۔ وہاں تمہیں جانا پڑے گا۔ اسے لانے کے لئے پولیس کمشنر کے نام ایک لیٹر آف اتھارٹی لے لینا۔"

اگلے دن سویرے ہی وہ ہوائی جہاز سے بمبئی پہنچ گئے۔

یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایک اور ماں نے دعوا کیا ہے کہ بچہ اس کا ہے۔ وہ لوگ بھی بڑے ذی اثر معلوم ہوتے ہیں۔ کسی شپنگ کمپنی میں انجینئر ہیں۔
معاملہ کورٹ میں پہنچا۔

مسز لکشمی جے سوریہ کو بلایا گیا۔
"آپ کا نام" سرکاری وکیل نے پوچھا۔
"مسز لکشمی جے سوریہ۔"
"آپ کا دھرم؟"
"ہندو برہمن"
"معاف کیجئے گا۔ آپ شادی شدہ ہیں؟"
"جی کیا مطلب؟ میرے شوہر مسٹر جے سوریہ ہیں۔ شپنگ انجینئر۔"
"صرف جو بات پوچھی جائے [illegible] بتائیے کتنے سال ہوئے ہیں آپ کی شادی کو؟"
"[illegible]

"ٹھیک ٹھیک بتائیے۔"
"ٹھیک یاد نہیں۔ کوئی چار پانچ برس ہوئے ہوں گے۔"
"اپنی شادی کی تاریخ آپ کو یاد نہیں؟"
"جی تاریخ تو یاد ہے۔ ۱۰ جون کے دن ہماری شادی ہوئی تھی میناکشی مندر میں۔"
"میں صرف تاریخ اور سن پوچھ رہا ہوں۔ کہاں ہوئی تھی یہ میں نے ابھی نہیں پوچھا ہے ...... کس سن میں آپ کی شادی ہوئی تھی وہ آپ کو یاد نہیں؟"
"ہاں سن یاد نہیں ہے۔"
"اگر ۱۹۶۶ء میں آپ کی شادی ہوئی تھی تو کیا یہ کہنا غلط ہوگا کہ شادی سے پہلے ہی آپ ماں بن چکی تھیں۔"
"جی نہیں۔ ہماری شادی ۱۹۶۵ء میں ہوئی ہوگی۔"
"ہاں اگر ۱۹۶۵ء میں ہوئی ہے تو ٹھیک ہے۔ مگر آپ کو تو یاد نہیں۔ کیا میناکشی مندر میں کوئی ریکارڈ رہتا ہے شادیوں کا؟"
"جی نہیں۔ میرے خیال میں تو ریکارڈ نہیں رہتا۔"
"کیا اسی لئے آپ نے میناکشی مندر چنا تھا اپنی شادی کے لئے۔ میناکشی مندر ہے کہاں؟"
"مدورا۔"
"اتنی دور آپ گئیں جبکہ اتنا بڑا مندر خود ڈیگ پٹنم میں موجود ہے؟ خیر یہ کیسے ہوا؟ کہ چھ مہینے بعد ہی آپ کا بچہ کھو گیا۔"
"جی وہ گودی میں سے گر بھاگ گئی تھی۔ مجھے یاد ہے اچھی طرح سے نیوی یارڈ لانچ ہو رہا تھا اس وقت کو۔ جب ہم [illegible] وہ بچے سمیت غائب تھی۔"
"آپ نے پولیس میں رپورٹ کی تھی۔ وہ تو ریکارڈ میں ہونی چاہئے۔"
"جی نہیں۔ رپورٹ شاید نہیں کی تھی۔"

"اس شک اس میں بدنامی ہوتی۔"
"بدنامی کیوں ہوتی؟"
"کیونکہ بچہ ذرا جلدی ہو گیا تھا [illegible] مجھے ڈاکٹر صاحب نے۔"
"کون سے ڈاکٹر صاحب؟"
"ڈاکٹر...... نام تو یاد نہیں۔"
"شادی کی تاریخ آپ کو یاد نہیں [illegible] دودھ پلایا تھا آپ نے؟"
"دودھ تو آج کل کوئی نہیں پلاتا۔"
"یقین ہے آپ کو؟ اگر میں لاکھوں [illegible] بلا کر یہی سوال پوچھوں کہ انھوں نے اپنے بچے کو [illegible] یا نہیں؟"
"وہ معمولی عورتیں ہوں گی۔ میرا مطلب [illegible] لیڈیز میں کوئی دودھ نہیں پلاتی۔"
"سوسائٹی لیڈیز سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"
"لیڈیز جو ہائی سوسائٹی [illegible]۔"
"ہائی سوسائٹی کا مطلب؟"
"جو لوگ امیر ہیں۔ خوشحال ہیں جن کے شوہر بڑی پوزیشن رکھتے ہیں۔"
"اچھا تو آپ کے شوہر کو بلانا پڑے گا۔"
مسٹر جے سوریا کو گواہوں کے کٹہرے میں بٹھا لیا گیا
"آپ کا نام؟"
"رما کانت جے سوریہ۔"
"کتنے عرصے سے آپ گولڈن شپنگ کمپنی میں ہیں؟"
"کوئی تین برس سے۔"
"اس سے پہلے کہاں تھے؟"
"وزیاگ پٹنم شپنگ یارڈ میں انجینئر تھا۔"
"کیا تنخواہ ملتی تھی؟"
"وہاں دو ہزار ماہوار۔"
"یعنی اب زیادہ ملتی ہے؟"
"جی ہاں۔"

چھوڑ دیا۔

"کتنی ملتی ہے؟"

"چار ہزار روپے ماہوار فلیٹ اور فری کار الاؤنڈ ہیں۔"

"یعنی چھ ہزار کے قریب ہوں گے۔ جی ہاں آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں مگر انکم ٹیکس چار ہزار پر ہی دیتا ہوں۔"

"ڈریگ پیٹنم آپ نے کیوں چھوڑا۔"

"بمبئی سے بہتر آفر آگئی تھی۔"

"کوئی اور وجہ نہیں تھی؟"

"جی ایک انکوائری ہوئی تھی۔ اس میں کچھ غلط فہمیاں تھیں۔"

"ان کی بنا پر آپ کو SUSPEND کیا گیا؟"

"ہاں آپ کہہ سکتے ہیں۔ دراصل میں خود بھی RESIGN کرنے کی سوچ رہا تھا۔"

"مگر پھر بھی آپ کو SUSPEND کیا گیا؟ سچ سچ بتائیے۔"

"جی ...... ہاں۔"

"کس کمپنی کا نام لیا گیا تھا اس انکوائری میں جس کی بنا پر آپ کو معطل کیا گیا؟"

"یاد نہیں۔ میں نے کہا نہیں کہ وہ غلط فہمیوں کی بنا پر تھا۔"

"میں یاد دلاتا ہوں آپ کو۔ کیا گولڈن سپننگ کمپنی کا نام لیا گیا تھا اس انکوائری میں۔"

"جی شاید۔"

"شاید نہیں۔ ٹھیک ٹھیک بتائیے ورنہ مجھے کورٹ سے کہہ کر گورنمنٹ کا ریکارڈ منگوانا پڑے گا یا عینا کتنی تمسیل کی طرح وہاں بھی ریکارڈ نہیں رکھے جاتے کہئے گولڈن سپننگ کمپنی ہی تھی یا نہیں؟"

"جی ہاں شاید گولڈن سپننگ کمپنی ہی تھی؟"

"شاید نہیں یقیناً۔"

مجسٹریٹ نے وتحمل سے پوچھا: "آپ ان سوال سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

"جناب والا میں مسٹر جے سوریہ کا کیریکٹر دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ ماں باپ بننے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ بس ایک سوال اور ہے۔ مسٹر جے سوریہ آپ نے اپنی بیوی کے خلاف پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں درج کرائی؟"

مسٹر جے سوریہ اس سوال کے لئے تیار نہیں تھے۔ بوکھلا گئے۔ "جی وہ بات یہ تھی کہ ....." پھر رک گئے۔

"ہاں ہاں بات کیا تھی؟"

"میں اس کو PROVOKE نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"یعنی وہ ایسی باتیں جانتی تھی جو آپ کے کیریئر کو تباہ کر سکتی تھیں۔"

"جی ہاں یہی سمجھئے۔"

"کیا آپ کے اس گولڈن سے کچھ خاص قسم کے تعلقات تھے؟"

"جی نہیں۔"

"ٹھیک ٹھیک بتائیے ورنہ آپ کو CONTEMPT OF COURT میں بھی دھرا جا سکتا ہے۔"

"جی ہاں یہی سمجھئے۔"

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ وہ آپ کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اگر آپ پولیس میں رپورٹ کرتے تو وہ بات باہر جاتی۔"

"مسٹر جے سوریہ کا رنگ اڑ گیا۔

"جی ہاں یہی سمجھئے۔"

"مطلب یہ کہ آپ نے اپنے بچے کو قربان کر دیا اپنے کیریئر کی خاطر" اس وقت آپ کا خیال ہوگا کہ دوسرا بچہ ہو جائے گا۔ مگر آپ کے کوئی دوسری اولاد نہیں ہوئی۔"

"نہیں۔"

"یہ آپ کو قدرت کی طرف سے سزا ملی ہے۔ مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

اب نواب مغل مرزا اور دلدار بیگم کی باری تھی۔ پہلے بیگم صاحبہ عدالت کے سامنے پیش ہوئیں

"آپ کا نام ؟"

"مسز عرشانہ بیگم مغل مرزا۔"

"عمر کیا ہے ؟"

"عورتوں کی عمر نہیں پوچھا کرتے۔ یہ بیڈ مینرز کہلاتا ہے۔"

"بیگم صاحبہ یہ عدالت ہے۔ یہاں آپ کی سوسائٹی کے مینرز نہیں چلتے۔ ٹھیک ٹھیک بتائیے کیا عمر ہے ؟"

"کوئی پینتیس چھتیس کی ہوگی۔"

"اگر میں کہوں کہ آپ کی عمر پینتالیس سال کی ہے تو آپ کیا کہیں گی ؟"

"یہی کہوں گی کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں چالیس سے ایک برس بھی زیادہ نہیں ہوں۔"

"تھینک یو۔ میں بھی یہی جاننا چاہتا تھا ..... آپ کی شادی مرزا صاحب سے کس عمر میں ہوئی ؟"

"جب میں تیس برس کی تھی۔"

"آپ کے شوہر کتنے سال کے تھے ؟"

"وہ کوئی ساٹھ برس کے ہوں گے۔"

"یہ آپ کی پہلی شادی تھی ؟"

"جی ...... نہیں" بیگم صاحبہ نے دھیمے سے کہا "یہ میری دوسری شادی تھی۔"

"آپ کوئی بچہ بھی ساتھ لائی تھیں ؟"

"جی ہاں ایک لڑکا۔"

"کیا عمر ہے اس کی اب ؟"

"ماشاء اللہ اٹھارہ برس میں ہے۔"

"وہ کیا کرتا ہے ؟"

"اپنے بابا کا ہاتھ بٹاتا ہے ان کے بزنس میں۔"

"تنخواہ کیا ملتی ہے ؟"

"تنخواہ کیوں ملتی ؟ برابر کا پارٹنر ہے اپنے باپ کا۔"

"مگر مرزا صاحب اس کے باپ تو نہیں ہیں ؟"

"اب تو وہی ہیں اور کسی باپ کو وہ جانتا بھی نہیں۔"

"آپ کے پہلے شوہر کیا کرتے تھے ؟"

"اس سے آپ کو کیا لینا ہے ؟"

مجسٹریٹ نے تنبیہ کی کہ وکیل صاحب کے سوالوں کے صاف صاف جواب دیں۔

"ان کی ہوٹل کی بزنس تھی۔"

"ہوٹل کی بزنس۔ کیا نام تھا ان کے ہوٹل کا ؟"

"ان کے ہوٹل کا .... ان کے ہوٹل کا نام ... ... دراصل وہ ان کا ہوٹل نہیں تھا۔ وہ پارٹنرشپ میں چلاتے تھے۔"

"ان کا پارٹنر کون تھا ؟"

"ان کے پارٹنر تھے مرزا افضل بیگ۔"

"یعنی آپ کے موجودہ شوہر ؟"

"جی ہاں"

"تو شاید آپ کی ملاقات مرزا صاحب سے پہلے سے ہوگا ؟"

"اس ہوٹل میں تو آتے جاتے ملاقات ہو ہی جاتی تھی۔"

"اگر میں کہوں کہ آپ کے پہلے شوہر آپ کے موجودہ شوہر کے پارٹنر نہیں تھے بلکہ ملازم تھے تو کیا یہ غلط ہوگا ؟"

بیگم صاحبہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ بولیں

"جی ہاں۔ آپ ایسا بھی کہہ سکتے ہیں۔ دراصل وہ ایک قسم کے مینیجر تھے۔"

"ٹھیک طرح سے یاد کیجئے ..... مینیجر تھے یا نان بائی تھے ؟"

"تو کیا ہوا ؟ مسلمانوں میں ذات پات نہیں چلتی۔ ان کے ہاتھ میں ہنر تھا۔"

"وہ تو ظاہر ہے۔ تھمے میاں کی نان کی شہرت تو بمبئی تک پہنچ چکی تھی۔ جب ان کے انتقال کی خبر پڑھی تو ہم کو بھی افسوس ہوا تھا۔ یہ حادثہ کیسے ہوا ؟"

"اللہ کی مرضی۔ نان نکال رہے تھے ایک دن

تندور میں جا گرے۔"

"اس روز پہلی رپورٹ جو پولیس میں دی گئی تھی اس میں لکھا ہے کہ کسی نے انھیں پیچھے سے دھکا دیا تھا۔"

بیگم صاحبہ اپنے سابق شوہر کی موت کے ذکر کو برداشت نہ کر سکیں۔ آبدیدہ ہو گئیں اور عطر خانے معطر ایک فرانسیسی لیس کا رومال نکال کر آنسو پونچھنے پڑے۔

"معاف کیجئے۔ بیگم صاحبہ کبھی کبھی عدالت میں بڑے تکلیف دہ سوال کرنے پڑتے ہیں۔ مگر دہلی کی عدالت میں یہ معاملہ کافی دنوں تک کھنچا تھا۔ مرزا صاحب کو بھی عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔"

"جی ہاں مالک کی حیثیت سے گواہی دینی پڑی تھی انھیں۔"

وکیل نے ذرا سخت لہجہ اختیار کیا۔ "گواہ کی حیثیت سے نہیں ملزم کی حیثیت سے۔"

اس کی نگاہ اب نواب مغل مرزا پر گئی جو گھبرا کر اپنی کرسی سے اٹھ رہے تھے۔ "نواب صاحب تشریف رکھئے۔ ابھی آپ سے بھی چند سوال کرنے ہیں۔"

مرزا صاحب نے بھی اپنی جیب سے ایک سفید رومال نکالا اور اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھنے لگے۔

اب نواب مرزا مغل کو گواہوں کے کٹہرے میں پیش کیا گیا۔

"آپ کا نام؟"

"آپ جیسے نہیں جانتے؟"

"پھر بھی آپ کی زبان سے آپ کا نام جاننا چاہتا ہوں۔"

"نواب مغل مرزا دہلوی۔"

"یہ مغل مرزا عجیب نام معلوم ہوتا ہے۔"

"ممکن ہے آپ کو عجیب نام معلوم ہوتا ہو۔ آپ کتنے اور مرزاؤں کو جانتے ہیں؟"

"میں تو ایک ہی مرزا کو جانتا ہوں۔ مرزا اسد اللہ خان غالب۔ ان کو آپ بھی جانتے ہوں گے۔"

"غالب کو کون نہیں جانتا؟"

"اس لئے کہ غالب شاعر تھے۔ کوئی حقہ بردار نہیں تھے۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ کے جد امجد کا نام کیا تھا جو بادشاہ کے رنگون جلا وطن ہونے کے بعد دہلی میں ترقی کی منزلیں طے کر رہے تھے؟"

"مرزا آگل گل بیگ۔"

"کہ ایک گل تو ہم سمجھے۔ گل کے معنی گلاب کے پھول کے بھی تو ہوتے ہیں اور وہ گل بھی ہوتا ہے جو حقہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔"

"حقہ سے اس کیس کا کیا تعلق ہے؟"

"حقہ سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا کہ تندور سے ہے جہاں روٹیاں اور نان سینکی جاتی ہیں۔ اور جس میں کسی وقت انسان کو پھینک دیا جائے تو منٹوں میں اس کا بھی کباب بن جاتا ہے۔"

نواب صاحب دہلی میں بڑی اونچی سوسائٹی میں گھومتے تھے۔ عہدیداروں کے ساتھ تاش کھیلتے تھے۔ اسی رعب کو اس وقت استعمال کر کے انھوں نے مجسٹریٹ سے کہا: "یور آنر۔ اپنے وکیل کو سمجھائیے۔ سنبھل کے سوال جواب کرے ورنہ ...."

"ورنہ کیا ہوگا؟" وکیل نے جلدی سے کہا۔ "اس کا بھی کباب بنا دیا جائے گا۔" اور پھر اس نے مجسٹریٹ سے کہا: "یور آنر۔ میں جو الفاظ استعمال کر رہا ہوں یہ دہلی کی پہلی عدالت کی رپورٹ میں موجود ہیں۔ اگرچہ سیشن کورٹ نے مرزا صاحب کو BENEFIT OF DOUBT دیتے ہوئے رہا کر دیا۔ صرف BENEFIT OF DOUBT مگر DOUBT OF DOUBT کو رد نہیں کیا گیا۔"

یہ سب سن کر نواب صاحب جھینپ گئے۔

وکیل نے اب ترپ کا پتہ نکالا۔ "آپ کے تان پائی کا حادثہ کس سال میں ہوا تھا؟"

"ستاون ستمبر میں۔"

"شاید اپریل کا مہینہ تھا؟"

"شاید" نواب صاحب نے اقرار کیا۔

"اور پہلی مئی کو آپ کی شادی خانہ آبادی مرحوم تان پائی کی خوبصورت بیوہ سے ہو گئی اور صرف پانچ مہینے بعد ان کی گود میں ایک بچہ کھیلنے لگا۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ پہلے بھی شادی شدہ تھیں۔"

"مگر دہلی کی عدالت میں یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ قتل [illegible] سے کچھ مہینے پہلے سے شہناز بیگم کے تعلقات اپنے شوہر کے ساتھ منقطع ہو چکے تھے۔"

نواب صاحب کو پسینا آ گیا تھا۔ وہ اپنی جیب سے ایک سفید رومال نکالا اور اپنی پیشانی پونچھنے لگے۔

"معاف کیجئے نواب صاحب کہ مجھے بعض ذاتی سوال بھی پوچھنے پڑے۔ اب آپ تشریف رکھ سکتے ہیں۔ ...... اب میں بیگم صاحبہ کو پھر تکلیف دوں گا"

بیگم صاحبہ پھر گواہوں کے کٹہرے میں پیش ہوئیں۔

"بیگم صاحبہ۔ آپ کا کہنا ہے کہ یہ بچہ آپ کا کھویا ہوا بیٹا ہے۔"

"جی ہاں ...... مگر ......"

"مجھے شک ہے آپ کو؟ آپ کا بچہ کیسے اور کب کھو گیا؟"

"کوئی آٹھ مہینے کا ہوگا اس وقت وہ۔ یہ نومبر [illegible] کی بات ہے۔ اس کی گورنس مس ولیم حسب معمول اس کو پرام میں بٹھا کر پارک میں لے گئی تھیں وہاں انہیں کی ایک بنچ پر وہ بیٹھ گئیں اور پرام اپنے قریب [illegible] ان کی آنکھ لگ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو پرام [illegible] ...... [illegible]

تو میں نے پولیس کو فون کیا۔ نواب صاحب کو کلب میں فون کیا۔ وہ پولیس افسروں کو ساتھ لیکر آئے۔ انھوں نے مجھ سے اور نواب صاحب سے پوچھا کہ آپ کو کس پر شبہ ہے؟ ہم نے کہا کہ بچہ کڈنیپ تو کیا جا سکتا ہے مگر یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ خدا نے کھیلنے کے ایک کھلونا دیا تھا شاید اب واپس لے لیا۔"

"کتنے عرصے کھیلی تھیں اس کھلونے سے آپ؟"

"کوئی وقت مقرر تھوڑا ہی تھا جب وقت ملتا تھا میں نرسری میں ہو آتی تھی۔"

"تو بچے کا زیادہ تر وقت مس ولیم کے پاس ہی گزرتا تھا۔"

"مس ولیم کہاں ہیں؟"

"وہ انگلینڈ واپس چلی گئی ہیں۔"

"بس اب مجھے کوئی سوال نہیں کرنا۔"

بیگم صاحبہ اپنی اونچی ایڑی کے جوتوں کو کھٹ کھٹاتی ہوئی واپس چلی گئیں۔

"اب حضور فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ کون سی ماں اس بچے کی جائز حقدار ہے۔" وکیل یہ کہہ ہی رہا تھا کہ باہر سے کچھ ہنگامے کی آوازیں آئیں اور اگلے لمحے ایک عورت جو شکل و صورت سے بھکارن لگتی تھی اور شاید پاگل بھی، میلی پھٹی ہوئی ساری پہنے عدالت میں بھیڑ کو چیرتی ہوئی آئی۔ "حضور ہماری ارج بھی سن لیں۔ یہ بچہ ہمارا ہے۔ پولیس نے جبر دستی ہم سے چھین لیا اور کہا کہ تو چرا کر لائی ہے۔"

"تم کچھ بیان دینا چاہتی ہو تو گواہوں کے کٹہرے میں آؤ اور کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔" وکیل نے اس سے کہا اور پھر مجسٹریٹ سے "جناب والا۔ اب تک تو دو مائیں تھیں اب تین ہو گئی ہیں۔ اب آپ کو فیصلہ کرنا ہے۔ میں اس سے بھی سوال کرتا ہوں۔

"اپنا نام بتاؤ۔"

"بھکارن [illegible] بچپن سے [illegible]"

بھاڑ میں گیا

"تمہارا دھرم، ذات کیا ہے؟"
"بچپن - دھرم پیار روٹی کا ٹکڑا ہے اور جات سے بھکارن ہوں۔"
"بچہ تمہارے پاس کیسے آیا؟"
"بچہ جیسے آتا ہے، بچہ ویسے ہی آیا..... میرے پیٹ سے نکلا۔"
"کیا تمہاری شادی ہوئی ہے؟"
"حضور بھکارنوں کے شادی بیاہ کہاں ہوتے ہیں؟ ..... مگر ایک بڑا خوبصورت سا صاحب ایک رات میرے پاس آیا۔ نشے میں دھت تھا۔ کہنے لگا بھکارن تجھے کیا چاہئے۔ میں نے کہا۔ ایک بچہ۔ کہنے لگا ایک بچہ۔ روپیا پیسا کچھ نہیں چاہئے۔ ساڑی بھی نہیں چاہئے؟ میں نے کہا صاحب۔ نہیں مجھے تو بس ایک بچہ چاہئے۔ کیونکہ بچے کے بنا مجھے لگتا ہے کہ میں ادھوری ہوں۔"
"تم نے اس صاحب سے کتنا روپیہ لیا؟"
"روپیا کیوں لیتی تو مہینے بعد میں اندر سے پوری ہو گئی۔ ہر ناری عورت بچہ جننے کے بعد ہی پوری ہوتی ہے..... ورنہ تو اس کا جیون ہی ادھورا ہوتا ہے۔"
"وہ صاحب تمہیں پھر ملا؟"
"نہیں صاحب۔ میں نے اس سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کی وہ تو مجھے پہچانے گا بھی نہیں۔ مگر میں پھر بھی اس کی آبھاری ہوں۔ کیونکہ اس کے کارن میں پوری ہو گئی۔ ماں ہو گئی۔"
"کہاں ہے تمہارا بچہ؟" وکیل نے ڈرامائی انداز میں سوال کیا۔
"وہ ہے" بھکارن چلائی' ادھر اشارہ کرتے کرتے ہوئے جانے پھٹے کپڑے پہنے بچہ کورٹ میں بیٹھا ہوا سب باتیں سن رہا تھا۔
جرح ختم ہو گئی تھی۔
وکیل نے مقدمہ کا خلاصہ سناتے ہوئے کہا: "جناب عالی یہ مقدمہ کنگ سولومن کے انصاف کی یاد دلاتا ہے۔ وہاں تو دو مائیں تھیں جو دونوں ایک بچے کی ماں بننے کا دعویٰ کر رہی تھیں۔ یہاں تین مائیں ہیں جن میں سے ہر ایک کا کہنا ہے کہ بچہ اس کا ہے۔ ایک بمبئی کے بڑے انجینئر کی بیوی ہے۔ ایک دہلی کے رئیس اعظم کی بیگم ہے ایک بھکارن ہے۔ کنگ سولومن نے تو انصاف یہ کیا تھا کہ دونوں ماؤں سے کہا تھا کہ بچے کو تلوار سے آدھا آدھا کر کے دونوں کو آدھا آدھا دے دیا جائے گا جس نے اس ظالمانہ انصاف سے بچے کی جان کی خاطر انکار کر دیا وہی اس کی اصلی ماں قرار دی گئی۔ لیکن ہم اس بچے کے تین ٹکڑے کرنے کو بھی نہیں کہہ سکتے اس لئے کوئی اور فیصلہ کرنا پڑے گا جو میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔"
مجسٹریٹ نے کہا: "ہم سب حیوان کی اولاد ہیں۔ جتنا چھوٹا بچہ ہوگا اتنا ہی وہ جانوروں کے قریب ہوگا۔ بچھڑا ہو یا ہرن کا بچہ وہ اپنی ماں کو سونگھ سکتا ہے۔ اس لئے اس مقدمے کا فیصلہ بھی اس بچے کی ناک کرے گی۔" پھر بچے سے مخاطب ہو کر کہا: "بچے یہ تینوں عورتیں کہہ رہی ہیں کہ وہ تمہاری ماں ہیں۔ تم ان کے پاس جاؤ۔ ان میں سے ہر ایک کو سونگھو اور جو تمہاری ماں ہے اس کو پہچان لو۔"
بچہ پہلے مسز جے سوریہ کے پاس گیا۔ "مائی چائلڈ" انھوں نے کہا اور اسے اپنے گلے لگا لیا۔ ان کی چھاتی سے اور ان کی ساڑی سے بچے کو ایکسائیز فرانسیسی سینٹ کی خوشبو آئی۔
"نہیں"۔ اس نے کہا۔
پھر وہ بیگم منظور مرزا کے پاس گیا۔ انھوں نے اسے اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔ ان کی پوشاک اور ان کے سارے بدن سے عطر حنا کی خوشبو آئی۔ یہ خوشبو بھی بچے کے لئے غیر مانوس تھی۔ وہ ان سے بھی الگ ہو گیا۔
"نہیں" اس نے پھر کہا۔
پھر وہ بھکارن کی طرف گیا۔ بھکارن نے اس ڈر کے مارے اسے گلے نہیں لگایا کہ اس کے میلے

چہرے اور پسینے کے چھینٹے آ رہے تھے۔ لیکن بچے کی ٹافی کے ٹکڑے بکھر پڑے۔ اس لئے کہ بھکارن کے بدن سے پسینے کی بدبو کے علاوہ ماں کی ممتا کی سوندھی سوندھی خوشبو بھی آ رہی تھی۔

"ماں" اس نے کہا اور دوڑ کر بھکارن کے گلے لگ گیا۔

بھکارن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

سرکاری وکیل کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے مجسٹریٹ نے عینک کو رومال سے صاف کرنے کے بہانے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھ لئے۔ کیونکہ انصاف کی دیوی تو اندھی ہوتی ہے۔ اس کی آنکھ میں نہ نظر ہوتی ہے نہ آنسو۔

محترم انکم ٹیکس دہندگان!

قومی بچت ڈائریکٹریٹ کی جانب سے سالِ نو کی مبارکباد قبول کریں!

مالی سال کے خاتمہ پر اس لئے اپنے انکم ٹیکس کا حساب فوراً کریں اور اگر آپ کو انکم ٹیکس فاضل لگ رہا ہے تو آئیے۔ ڈاک گھر سیونگ سرٹیفکیٹ چھٹے اور ساتویں ایشو میں رقم لگا کر انکم ٹیکس کا بوجھ ہلکا کیجئے۔

مالی سال ۸۴-۱۹۸۳ء ——— یعنی

ٹیکس لگانے کے سال ۸۵-۱۹۸۴ء سے

انکم ٹیکس کی کٹوتی کے لئے ۴۰ ہزار روپے تک کی بچت پر

اور کم سے کم ۲۰ ہزار ۲ سو روپے کی چھوٹ منظور ہے

پہلے ۶ ہزار روپے پر ۱۰۰ فیصد (سو) فیصد

۶ ہزار روپے

دوسرے ۶ ہزار روپے پر ۵۰ فیصد

۳ ہزار روپے

بقیہ ۲۸ ہزار روپے پر ۴۰ فیصد

۱۱ ہزار دو سو روپے

کل ۴۰ ہزار روپے کی بچت کرنے پر ۲۰ ہزار ۲ سو روپے کی یکمشت رقم آپ کو کم کر دیئے جائیں گے ڈاک گھر کے (چھٹے اور ساتویں ایشو) نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ پر بھی چھوٹ لاگو ہے۔

چھٹے ایشو میں چھٹے برس پر آپ کی اصل رقم دوگنا سے کچھ زیادہ ہو جاتا ہے اور سود کی شرح قریب۔ قریب ۱۲٪ ہے ہر چھ ماہ پر ۱۲ فیصد کی شرح سے قابل ادائیگی ہے۔ اگر آپ چالیس فیصد انکم ٹیکس دے رہے ہیں تو انکم ٹیکس اور سرچارج میں بالترتیب ۸۰۰۰ روپے اور ۱۰۱۰ روپے کی کمی یعنی کل ۹۰۱۰ روپے کی کمی انکم ٹیکس میں ہو جاتی ہے۔ ۴۰ ہزار روپے کی رقم ابھی جس پر آگے سود کی شکل میں کم سے کم ۴ ہزار ۸ سو روپے قابل ادائیگی ہے، انکم ٹیکس سے آزاد ہے۔ کیونکہ ۷۰۰۰ روپے تک کا سود انکم ٹیکس سے آزاد ہے۔ اس کے فاضل، لازمی جمع میں بھی کم رقم لگے گی کیونکہ آپ کی قابلِ ٹیکس کل آمدنی ہی کم مقرر کی جائیگی۔

اس لئے جلدی کیجئے

نیشنل سیونگ (چھٹے اور ساتویں ایشو) سرٹیفکیٹ میں ۴۰ ہزار روپے تک کی رقم لگا کر جلد انکم ٹیکس کے بوجھ کو ہلکا کیجئے

اپنی جمع رقم کو دوگنا کر لیجئے

یا

ہر ماہ سود کا فائدہ حاصل کرتے رہئے۔ یہ بچت سرٹیفکیٹ ہر ڈاک گھر میں ملتے ہیں۔ ساتویں ایشو میں اگر لگاتار چھ ماہ ہر ماہ برابر۔ برابر رقم لگائی جائے تو آپ کا ماہانہ ۱۲ فیصد سود کی شکل میں پنشن جیسا ہی فائدہ ہوتا رہے گا۔

اس لئے آپ ۷ سال تک لگاتار کچھ طے شدہ رقم ہر ماہ نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ پر چھٹے ایشو کے لگاتے رہیں گے تو چھ برسوں کے بعد ... ویں مہینے سے آپ کو اتنے ہی روپے پنشن کی شکل میں ملتے رہیں گے۔ اگر دوگنا ہوئی رقم کی نصف رقم آپ اپنے پاس رکھ لیں تو نصف رقم پھر چھٹے ایشو میں لگا دیں۔

قومی بچت ڈائریکٹریٹ (محکمۂ مالیات)

بہار کے ذریعہ جاری [illegible]

نسیم سلیم ترکی

ایک کہانی

جب میں اس گھر میں داخل ہوئی تو وہ اپنے کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا سامنے کی دیوار پر نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا میرے آنے کی اُسے خبر ہو گئی تھی لیکن اس نے کوئی پرواہ نہ کی۔ پاس رکھی ہوئی کرسی پر میں بیٹھ گئی اس نے میری طرف دیکھا بھی نہیں میں یہی سوچ رہی تھی کہ کیا میں غلط وقت پر آ گئی ہوں اس سے پہلے جب میں آتی تھی تو وہ بڑھ کر میرا خیر مقدم کرتا اور مجھے بیٹھنے کو کہتا —— آج نہ جانے اس کو کیا ہو گیا ہے کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا ——

"تم غور سے دیوار کی طرف کیا دیکھ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں" اس کا جواب تھا۔ پھر وہ نیچے دیکھنے لگا۔ اس کی بے پرواہی اس بے حسی پر مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اس سے دریافت کیا۔

"کیا مجھے دیکھ کر بھی [illegible]"

"وہ دیکھو" [illegible] دیوار کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جب میں نے دیوار کی جانب نظریں کیں [illegible]

"ہاں اسے غور سے دیکھو" وہ اطمینان سے بولا اس کے اس حکم سے مجھے اکتاہٹ ہوئی پھر بھی میں نے دیوار پر نظریں جما دیں میں نے دیکھا کہ چھپکلی بھاگی اور دیوار پر بیٹھی ہوئی مکھی کو دبوچ لیا۔ میں چپ چاپ بیٹھی اس منظر کو دیکھ رہی تھی کہ تب تک اس نے مجھے جھنجھوڑ دیا "کچھ دیکھا تم نے؟" اس نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں نے دیکھ لیا" میں نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا اسے بھی دیکھو" اس نے دیوار پر لگے ہوئے کیلنڈر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ کیلنڈر کمرے کی دوسری دیوار پر لٹکا ہوا تھا کیلنڈر کے صفحے پر ایک بہت بڑا غار تھا جس کے اندر بیٹھا ہوا ایک شخص گوشت کے ٹکڑے کو دانتوں سے نوچ رہا تھا اس کے ارد گرد پتھروں کے بنے اوزار لکڑی کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے [illegible] میں [illegible] اور دم [illegible] انسان کو دیکھ رہا تھا تصویر بڑی رنگین [illegible]

[illegible]

"[illegible] نے [illegible] تصویر کی جانب [illegible]

[illegible] کی جانب اشارہ کرتے ہوئے [illegible]

"اس کو بھی دیکھو۔"

مجھے سخت بوریت محسوس ہو رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں میں اس سے انکار نہیں کر سکتی تھی جب میں نے چھت کی طرف دیکھنا شروع کیا، چھت میں چڑیوں کا ایک گھونسلہ تھا دو تین چڑیاں ایک چھوٹی چڑیا کو پھدک پھدک کر مار رہی تھیں۔ پاس ہی دوسری چڑیا اپنے سوراخ سے آدھا منہ نکالے دیکھ رہی تھی چھوٹی چڑیا مار کھاتے کھاتے زمین پر گر پڑی پھر جلد ہی اڑ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں چپ ہو گئی میں نے اس سے دبے الفاظ میں اس سے پوچھا ——

"تم چھت پکی کیوں نہیں کرا لیتے کچی چھت ہونے کی وجہ سے پرندوں نے جگہ جگہ اپنا گھونسلہ بنا لیا ہے"——

"کیا پکی چھت پر پرندے نہیں آتے" اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

پھر وہ خاموش ہو گیا۔ میری نظریں کمرے کا جائزہ لینے لگیں کمرہ میں جگہ جگہ کوڑا کرکٹ زمین پر اخبارات اور کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس کمرے کا نقشہ پریشان سا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر ادھر ادھر مکڑی کا جالا زمین پر سگریٹ کے جلے ہوئے ٹکڑے اور مونگ پھلی کے چھلکے پڑے ہوئے۔ ہر چیز پر گرد کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا

"لاؤ —— میں تمہارے کمرے کی صفائی کر دوں"

"نہیں — نہیں — بیٹھو — بیٹھو۔ میں تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہتا"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا اور خود کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں اکیلی بیٹھی اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ آج سے پندرہ سال پہلے وہ میرا [illegible] کا ہم جماعت تھا شکل و صورت بھی اچھی تھی اپنے جسم اور لباس کا بڑا خیال کرتا تھا طبیعت

[illegible]
تھیں جن میں — میں بھی تھی۔ اب نہ جانے اس کو کیا ہو گیا کہ اس نے اپنے آپ کو برباد کر دیا ہے۔ میں اسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ دفعتاً وہ واپس آ گیا اب اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی اس نے دو خالی پیالیاں میرے سامنے رکھ دیں ایک پیالی کو اوپر تک بھر دیا۔ دوسری پیالی میں ایک چمچ چائے ڈالی تیسری پیالی بھر کر اپنے منہ سے لگا لی اور مجھ سے چائے پینے کا اشارہ کیا۔ میں بھی چائے پینے لگی جب میری چائے ختم ہو گئی تو اس نے مجھ سے دریافت کیا ——

"چائے کیسی تھی"

"مزہ آ گیا بڑی اچھی تھی" میں نے آہستہ سے کہا۔

"دوسری پیالی والی کیوں نہیں پی؟" اس نے سوال کیا۔

"یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ چائے کے قطرے تو پئے نہیں جاتے"

"ٹھیک کہتی ہو — ذرا اس جالے کی طرف دیکھو"

"اس کو کیا دیکھوں یہ مکڑی کا جالا ہے جس کے اندر ایک چھوٹی سی سمٹی ہوئی مکڑی بیٹھی ہوئی ہے اور پاس بیٹھی ہوئی موٹی چھپکلی اسے دیکھ رہی ہے، اس کے علاوہ اور کیا ہے میں بتا دوں اس کام کو تمہیں نہیں آئی تھی۔ میں تو اس لئے آئی تھی کہ تم سے ملاقات ہوئے کافی دن ہو چکے تھے، سوچا تمہاری خیر خیریت اور تم ہو کہ اپنے کمرے کی فلم دکھا رہے ہو۔ در اصل تمہیں کتابوں نے خراب کر دیا ہے۔ چھوڑو ایسی بے تکی باتیں کچھ اور باتیں کرو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ شادی کیوں نہیں کرتے؟"

"تم نے اوپر تک چائے سے بھری ہوئی پیالی تو پی لی قطروں والی پیالی کو ہاتھ نہیں لگایا"

"تم ادھر ادھر کی باتیں کر کے اصل موضوع کو ٹالتا

[illegible] حقیقت یہ ہے کہ تم نے بہت کچھ پڑھ لیا ہے لیکن
[illegible] سے نا مرد کبھی کیا ہے [illegible] کی عبادت
نہیں سمجھ سکے
" درست [illegible] میں [illegible] دیکھنا چاہتا ہوں "
" یقیناً آپ کمرے کی دیواروں کو دیکھتے رہتے ہو یہ
دیوار [illegible] چھوٹی چھوٹی باتیں کرو اپنے
اور [illegible] باہر اپنے اطراف
میں نظریں دوڑا کر دیکھو کیا ہو رہا ہے تمہارے
سامنے [illegible] اکثر بڑے بڑے عہدوں
پر پہنچے ہیں وہ کوٹھی اور بنگلوں کے مالک بن گئے
اگر تمہاری جیسی سوچ ہوتی تو کیا وہ اس حیثیت کے
مالک ہوتے ؟ "

میری یہ باتیں سن کر وہ گم سم ہو گیا کافی دیر
خاموش رہنے کے بعد اٹھ کر اس نے کمرے کا [illegible] بجھا
دیا کمرے میں تاریکی پھیل گئی اس اندھیرے سے
مجھے سخت گھبراہٹ محسوس ہونے لگی، ایک انجانا
خوف مجھ پر سوار ہو گیا ایسا لگا کہ کوئی میرا گلا
دبا رہا ہو اس خوف سے میرا بدن تھر تھرانے لگا
چند لمحوں کے بعد اس نے پھر چراغ روشن کر دیا اور
مسکراتے ہوئے پوچھا —
" آپ کیوں ڈر گئے "
" نہیں تو [illegible] میں نے جھوٹ سے کام لیتے ہوئے کہا۔
اس نے ایک قہقہہ لگایا جب اس کی ہنسی
رک گئی تو اس نے کہا بقول تمہارے اگر یہ فلم ہے
تو اس فلم کے سب ٹکڑوں کو جب یکجا کر دو گی تو
ایک کہانی بن جائے گی ۔

[illegible]
حسن شاہی
[illegible] پٹنہ

بے رحم پتھر

"ڈاکٹر! یہ بچہ خدا کی عظیم تخلیق انسان ہے، جس کی جان بچانے کی کوشش کرنا آپ لوگوں کا فرض ہے......"

انگریز نوجوان نے ڈاکٹروں کو مخاطب کر کے کہا اور بچے کی طرف تشویش سے دیکھنے لگا۔ بچہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔

بچے کا کوئی وارث نہ تھا۔ شاید کوئی ماں اُسے جنم دے کر پرلوک سدھار گئی تھی۔ یا وہ کسی بدترین گناہ کا نتیجہ تھا۔ اور عبادت گاہ کے پھاٹک کے سامنے ڈال دیا گیا تھا۔ شاید اس خیال سے کہ خدا کے نیک بندوں میں کسی کی نظر اُس پر پڑے گی۔ اور اُسے ایک نئی زندگی مل جائے گی۔ لیکن خدا کے نیک بندے اُس کی عبادت میں بہت زیادہ مصروف تھے۔ اُن کی نظریں بچے پر نہ پڑیں۔ اور نہ اُن کے کانوں میں اُس کی بے جذب اور معصوم چیخ سنائی دی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ [illegible] پڑا [illegible] تھا۔ اور اس کی [illegible] عبادت میں مسلسل خلل ڈال رہی تھی۔ قریب سے گذرنے والے ہزاروں انسانوں کی نظر بھی اس بچے پر نہ پڑی۔ شاید انہیں اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ ایک لمحہ کے لئے رک کر ہڈیوں کے اس پنجر پر نگاہ ڈال سکیں۔ وہ کان رکھتے ہوئے بھی بہرے اور آنکھ رکھتے ہوئے بھی اندھے تھے۔ لیکن انگریز نوجوان نے جب یہ دردناک منظر دیکھا تو تلملا کر رہ گیا۔ اُس کے ضمیر نے اُسے جھنجھوڑا۔ اور وہ رنگ و نسل اور مذہب کی زنجیروں کو توڑ کر آگے بڑھا۔ اور بچے کے بالکل قریب پہنچا۔ پھر جھک کر اُسے اپنی گود میں اٹھا لیا۔ اور اسپتال کی طرف چل پڑا۔ اسپتال میں پہنچ کر اس نے ڈاکٹروں کی [illegible] کی کہ بچے کا معائنہ اور علاج کیا جائے۔ لیکن کوئی ڈاکٹر اس کے لئے تیار نہ تھا۔ انگریز نوجوان بار بار ڈاکٹروں کو ان کا فرض یاد دلا رہا تھا۔ لیکن ڈاکٹر سیاسی گفتگو میں مشغول تھے کبھی کبھی کوئی ڈاکٹر حقارت کی نظر [illegible] دیکھتا تھا۔ پھر [illegible] گپ میں مشغول ہو جاتا تھا۔

"یہ بچہ تمہارا [illegible]......" ایک ڈاکٹر نے یوں ہی پوچھا۔ انگریز نوجوان جلدی جلدی ساری بات کہہ گیا۔ پھر [illegible]

"لیکن آپ لوگوں کو اس سے کیا مطلب ہونا چاہئے......"

[illegible] ڈاکٹر حیرت سے اُس کا منہ دیکھنے لگے۔

"[illegible]......" انگریز نوجوان [illegible] ہوئے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "[illegible] سانس [illegible]

[illegible] ...... اب [illegible] انکار کر ......

ایک ڈاکٹر انگریز نوجوان پر برس پڑا۔ وہ جیب سا ... [illegible]
میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ ابا آ نہیں کی کراہیں ... [illegible]
ڈاکٹروں کے بے ہنگم قہقہوں کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ بہت دیر بعد ایک ڈاکٹر [illegible] باہر
انگریز نوجوان کا دل دھک سے ہو گیا۔ ڈاکٹر نے اسے اخلاق سے بلایا ____ اور بہت
روکھے اور سخت لہجے میں بولا ____

"دیکھو! زندہ کسی مردہ کو لا کر ہمارا وقت ضائع یا برباد مت کرنا .... اور یہاں سے لاش جلدی اٹھا کر لے جاؤ......"

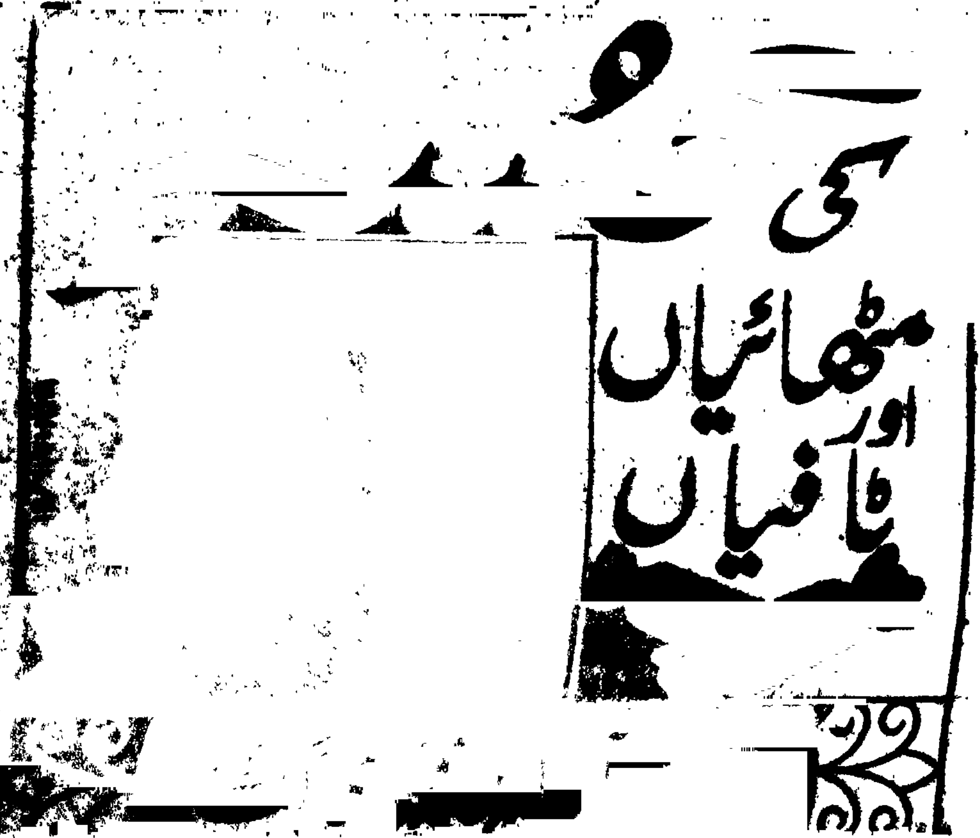
"سوری ڈاکٹر......" انگریز نوجوان کا چہرہ درد و غم میں ڈوب گیا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرہ میں داخل ہوا۔ مردہ بچے کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا۔ اور کمرہ سے روتا ہوا اسپتال سے باہر نکل گیا۔

وہ سوچ رہا تھا ......

یہ ڈاکٹر نہیں، انسان نہیں، بے حس پتھر ہیں! ○○

(غیر مطبوعہ و غیر نشریہ)



غوث محمد غوثی — ایک تعارف

شہریار [illegible]
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

علی گڑھ کے شعراء میں غوث محمد غوثی کہنہ مشق اور سینیئر شاعر کی حیثیت سے ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وہ ایک طویل مدت سے اس کارزار کے سپاہی ہیں اور خارج اور داخل سے سوا وشیدائی سے اور اظہار کے تنزل سے مکمل ہوش و گوش کے ساتھ نبرد آزما ہیں۔

روایتی شعرا میں کبھی (اگرچہ خال خال ہی مگر) ایسی شخصیتیں مل جاتی ہیں جو خود کو مکمل طور پر قدامت کے چھاپے کا ثبت تسلیم تو کرتی ہیں لیکن نئے رنگ و آہنگ، نئی آواز، نئے لہجے، نئے موضوع کو پرکھنے اور برتنے بغیر کسی تکلف یا تعارف کے اظہار رائے کرنے میں پرہیز نہیں کرتیں اور کسی حد تک اپنی سوچ میں کبھی اس نئی خوشبو کو راہ پانے دیتی ہیں۔ غوثی نوری کی شخصیت کو بھی ایسی شخصیتوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

ان کی شاعری میں تہذیب و اخلاق کے ٹوٹتے ہوئے رشتوں کا نیا درد (جو زیادہ شدید ہے) اور نئے معاشرے کی بالکل نئی الجھنوں کا (جو پہلے سے کہیں زیادہ بھیانک ہیں) اور اک کرب آج کل جدت و روایت کے امتزاج کی نشاندہی تو ہر شاعر کے یہاں کی جاسکتی ہے اور کی جاتی ہے چاہے وہ جدید ہو یا روایت پرست ہو مگر غور سے دیکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ایسا صرف شاعری کی خارجی سرحد تک ہوا ہے۔ سوچ میں بھی یہ عنصر شامل ہوا ایسا کم دیکھنے میں آتا ہے۔ غوث محمد غوثی کے یہاں سوچ کا اپنے عہد سے جڑا ہونا ہی ان کی شاعری کی اپنی امتیازی کیفیت ہے۔

یہاں یہ سمجھ لیں گا کہ خواہ وہ اپنی زبان اور اسلوب کو نیا پیرہن نہ پہنا سکے ہوں یاد رہنا چاہیے کہ یہاں مگر زبان و بیان کی نزاکتوں سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ اور استعارات اور تشبیہات کا استعمال برائے تخلیق سطح پر کرتے ہیں۔

شعر کہنے کے ساتھ ساتھ شعر پڑھنا بھی ایک فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ غوث محمد غوثی کے پڑھنے کا انداز بہت ... ان کی ... استعمال کئے ہوئے الفاظ کی نشست و ساخت ... کو اس قدر واضح کر دیتا ہے کہ سامع کو شعر ... حاصل ہوتا ہے۔ ... ہے۔

[illegible] میں تھا
تو میں نے دیکھا تو میں نے سمجھا
سکھا دیا دیکھنا سمجھنا
تو میں نے دیکھا تو میں نے سمجھا

غبارِ حالات کا سبب تھا
کہ آپ کو بھی نہ جان پایا
غبارِ حالات سے جو نکلا
تو میں نے دیکھا تو میں نے سمجھا

نہ پرسشِ غم نہ ذائقۂ شوق
ہے یہ نہیں کچھ کسی کا کوئی
ہوا ابھر کر انجمن میں تنہا
تو میں نے دیکھا تو میں نے سمجھا

پہاڑ جیسے مرے ارادے
کوئی تو ہے جس نے توڑ ڈالے
شکست نے بارہا جھنجھوڑا
تو میں نے دیکھا تو میں نے سمجھا

تجمل آئینہ میں کھو کر
تجمل آئینہ سمو کر
نقاب اٹھایا کہ حق تھا میرا
تو میں نے دیکھا تو میں نے سمجھا

چڑھا ہے کیوں رنگ میرے
تو کیا وہ سب [illegible]
گزر گیا جب ہوا کا جھونکا
تو میں نے دیکھا تو میں نے سمجھا

میں کم نظر کم دماغ ٹھہرا
نہ جان پایا مذاقِ جلوہ
بلند [illegible] سلام آیا
تو میں نے دیکھا تو میں نے سمجھا

اک آرزو تھی کہ خود کو دیکھوں
بھلا میں کیسا ہوں اور کیا ہوں
حضور کو آئینہ بنایا

تو میں نے دیکھا تو میں نے سمجھا
مرا [illegible] دامن تہی ہے [illegible]
مجھ میں ہے جو کمی ہے [illegible]
شعورِ [illegible] وا ہی تھا [illegible]
تو میں نے دیکھا تو میں نے سمجھا

نہ ہوتے شاد آئینِ گلستاں دیکھنے والے
فسانہ بھی اگر پڑھ لیتے عنواں دیکھنے والے
وہاں تسکینِ ذوقِ [illegible] کا ذکر کیا یارو
جہاں بجلی میں بعض گلستاں دیکھنے والے

ہلاکت خیز ایجادوں پہ دنیا فخر کرتی ہے
کہاں ہیں ارتقائے نوعِ انساں دیکھنے والے

جو ممکن ہو تم اپنے ہاتھ کی ریکھا کو مٹا ڈالو
کہ ہم ہیں تو کسی خوابِ پریشاں دیکھنے والے

یہ شغلے ہیں یہ در ہیں یہ ترے اجداد کے گھر ہیں
ادھر آ کتبۂ دیوارِ زنداں دیکھنے والے

طلوعِ آفتابِ آگہی کیا خاک دیکھیں گے
حقارت سے مرا چاکِ گریباں دیکھنے والے

مری طرزِ جہادِ زندگانی کا [illegible]
[illegible] پہ عزلتاں دیکھنے والے

تو پھر کیسی نظر [illegible] ظلمات [illegible]
جو خود کو دیکھ لیں [illegible] دیکھنے والے

شکستِ خودی [illegible]
[illegible] دیکھیں گے پھر بھی [illegible] دیکھنے والے

[illegible] ہے
[illegible] وحدت میں [illegible] ہے

ترا تبسم لب پہ آئے [illegible] کے وقت
جنھیں نہیں یہ تری پسند [illegible] ہے

ہوا سے کرتا ہے باتیں تری مہک پاکر
ترے غزالِ جنوں میں بلا کا دم خم ہے

خوشا کہ وہ ہیں مرے روبرو [illegible]
نہ ہے کہ آج مری آرزو مجسم ہے

یہ رنگ و نور یہ خوشبو یہ کیف سامانی
حریم ناز ہے یا عالموں کا عالم ہے

انا پسند انا کے نشے میں بھول گئے
یہ فیصلہ وہ ہو کہ جسکے ضمیر میں خم ہے

تو کیوں چراغ تمنا کا میں محافظ ہوں
جب آنکھ [illegible] نہیں [illegible] کسے یہ غم ہے

مرا مزاج ہے یاروں پہ وار دوں خود کو
مرا وجود بھی انگشتری کا نیلم ہے

وہاں وہاں نظر آتی ہے بزم فن [illegible]
یہاں چراغ زیادہ ہیں روشنی کم ہے

[illegible] ہے

[illegible] وہ پری ! پھر کسی شیشے کی تمنا ہو
جانے اب کون ہوا سنگ ملامت کا شکار
جانے اب زلف پہ دنیا کیسے لے آئی ہے
میکدہ رقص گہہ برق تجلی تھا مگر
میکدے پر بھی تعصب کی گھٹا چھائی ہے
شوخی غم نے مری چھاپ لگا دی ان پر
اب میں جی بھر کے ہنسوں گا مری بن آئی ہے

[illegible] چہرے ہے سب آئینہ
[illegible] پھر ایسی ہی [illegible] ہے

زیب دیتا ہے انہیں حاشیہ آرا ہونا
ہم پہ لوگوں کا بڑا قرض شناسائی ہے

کاش ان کو کبھی کوئی خلعتِ کردار ملے
[illegible] تبلیغ جنہیں [illegible] پہ لے آئی ہے

بادۂ نرگسِ مخمور مبارک فوقی
لیکن اب پی کے بہکنا تری رسوائی ہے

کیا حسنِ آگہی تھا میں گویا نشے میں تھا
جوہر بڑے غضب کا ترے آئینے میں تھا

کیسی بہار کیسی تھکن اب بھی سوچ لے
حالِ درخت کل [illegible] ترے مرتبے میں تھا

گذرا [illegible] نشیب و فراز میں
گویا ازل سے تا بہ ابد پالنے میں تھا

میں بے ضمیر ہو کے کسی کا نہ بن سکا
لوگوں سے اختلاف اسی مسئلے میں تھا

میرا جنوں مذاق بنا بھی تو کیا ہوا
میں تو انہیں کے بس میں انہیں کے کہے میں تھا

ہاں پھر سنا وہ آیتِ کیف و سرورِ قرب
ہاں اے نگارِ زیست میں کس مرحلے میں تھا

میرے سفر کی سمت جہاں بھی غلط ہوئی
دیوار بن کے خود وہ مرے راستے میں تھا

[illegible] ہوائیں دوش پہ جھکولے لیے پھریں
خوشبو کی طرح کوئی مرے حافظے میں تھا

فوقی سوا قرب [illegible] تجسس ہو چھوڑا
جو کچھ تھا دسترس کا بھرم [illegible] تھا

خود ناز دکھا تجھ میں کتنا جوہر ہے
مرا خلوص بھی دریا نہیں سمندر ہے

یقینِ ذات مکمل نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہاں پہ علم خود جہل کے برابر ہے

یہ کہہ رہی ہے محبت کی آنچ دو اسکو
پگھل گیا تو وہ شیشہ ہے ورنہ پتھر ہے

خلا نورد کو یارو فرازِ منزل کیا
کہ اب تو اس کا ہر اک پر بجائے شہپر ہے

عداوتوں کو فنا کر دیا محبت سے
مجاہدے میں محبت ہی اپنا خنجر ہے

ثبوتِ بیعتِ پیرِ حرم یہ ہے تو ہی
کہ آج تک کفِ دستِ رسا معطر ہے

مجھے ضرورتِ غازہ نہیں کہ چہرے پر
مرے ضمیر کا جو رنگ ہے اجاگر ہے

وہ سامنے ہوں تو آئینہ ہی نہ شکستہ ہو
کہ دیکھنے کا مزہ [illegible] ہے

ستارۂ سحر آثار ہے جو اے فوقی
غبارِ بستہ [illegible] اس کا پیش منظر ہے



هندو پاک کے مشہور و معروف شاعر و نقاد

جناب علی سردار جعفری کی ۷۰ ویں سالگرہ کے موقع پر

ھردلعزیز ماھنامہ "سہیل" گیا کی عظیم پیشکش

علی سردار جعفری — فن اور شخصیت نمبر

عنقریب منظرِ عام پر آرہا ہے

جس میں ہندوستان کے چوٹی کے قلمکاروں کی تخلیقات شائع ہو رہی ہیں۔

ماہنامہ "سہیل" ریلوے سائیڈ

صفحات: ۳۰۰ قیمت: ۳۰ روپیہ طباعت: عکسی

ہندو پاک کے مشہور و معروف افسانہ نگار اور صحافی

کلام حیدری کی ادبی خدمات کا اعتراف

کلام حیدری فن اور شخصیت نمبر

ھردلعزیز ماھنامہ "سہیل" گیا کی پیشکش

جس میں:
ہندوستان کے چوٹی کے قلمکاروں کی تخلیقات شائع ہو رہی ہیں۔

خوبصورت کتابت اور عکسی طباعت سے مزین

[illegible] میں منظرِ عام پر آرہا ہے

صفحات: ۳۰۰

قیمت: ۳۰ روپیے

ماہنامہ سہیل، ریلوے سائیڈ روڈ، گیا

شہرِ خیال

تازہ شمارہ ملا ہے۔ کلیم الدین صاحب تو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ پتہ نہیں یہ شمارہ ان کی نظر سے گزرا یا نہیں۔ سید محمد محسن صاحب سے "مثنوی" غزل نیم وحشی صنفِ سخن" میں "عشق" کی بحث غور طلب ہے اور اس سے کئی مقامات روشن ہوں گے۔ ظہیر احمد صاحب کا مضمون بھی دلچسپ ہے۔ غزل کی بے ربطی ہی اس کی جان ہے۔ اسے حسن و خوبی واضح کیا ہے [illegible] سید محمد محسن کے [illegible] اور مضامین "کلیم الدین احمد کی تلاش میں" اور "نقیباتِ کلیم" اپنی افادیت کے لحاظ سے بہت اچھے ہوں۔ ان میں ذاتیات کو بھی شامل کیا گیا ہے اور مرحوم کے اطوار و عادات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر ممکن ہے کچھ جبینیں پُرشکن ہوں لیکن جو بات کہی گئی ہے، وہ اپنی جگہ ہے۔ آج نہیں تو کل کلیم الدین احمد صاحب کی شخصیت پر قلم اٹھاتے وقت یہ باتیں سامنے آئیں گی۔

حسن [illegible] سکندر پوری

مکرمی تسلیم!

"صحیفہ" کی اشاعت کے وقت سے میں اس کا مستقل مطالعہ کرتا ہوں۔ منظومات، غزلیات اور مضامین کافی معیاری ہوتے ہیں اور کبھی کبھی کوئی خاص نمبر قسم کے بھی۔ [illegible] صاحب کا [illegible] [illegible] گزرا۔ [illegible] سے پڑھا [illegible] پیش کیا ہے لیکن کچھ [illegible] ہے۔ [illegible] غالب اور براؤننگ کا [illegible] "آسودگی" اور [illegible]

[illegible]

[illegible] غالب کا زمانہ [illegible]

اُمید کی خوشی ہے اور بے شک بہت خوب ہے جب کہ غالب کو جینے کی بھی امید نہیں۔ غالب کے ہاں وہ دولت اس کو اپنے اوپر وقت پر یہاں تک کہ فرشتوں اور خدا پر ہنسنے کا سلسلہ عطا کیا ہے۔ براؤننگ [illegible] ہنسنے کا ہے ہی نہیں۔ اُمید کہ [illegible] پر [illegible] زندگی اس کا وقت مضبوط ہے لہذا وہ [illegible] میں [illegible] ہے۔ غالب فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہے اور یہ میرا آپ کا سب کا فسانہ ہے۔

واردات قلبی، اور حادثاتِ زمانہ نے غالب کو ایک ایسا شاعر بنا دیا جو بیک وقت شوخ، سنجیدہ، بے نیاز، مجاہد، صوفیانہ، عامیانہ، حسن پرست اور انسان نواز ہے۔ یہ سب باتیں بے چارے براؤننگ میں کہاں؟

انگریزی ادب میں اچھے کلام کی خوبی یہ مانی جاتی ہے کہ وہ قاری یا سامع کو ٹرانسپورٹ Transport کرے جو عالم شاعر نے تخلیق کیا ہو اسے وہاں پہونچا دے، انہماک سے بے نیاز کر دے۔ مجھے اس خصوصیت کی مثال کہیں ملے تو غالب کے اشعار ہیں۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

اس کے بعد کہنا [illegible] ہے کہ [illegible] چاہتا ہے کہ تصورِ جاناں کیے ہوئے بیٹھے رہیں [illegible] سودا [illegible]

ڈاکٹر ظہیر حسینی

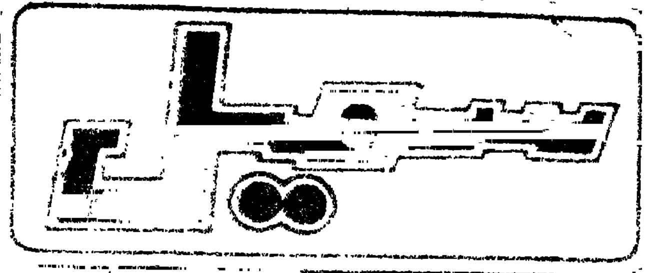
Regd. No. Gay,-4 Reg. with the R. N. PAT R. N.3520/57

46 YEAR OF PUBLICATION

THE SOHAIL MONTHLY River Side Road, Gaya.



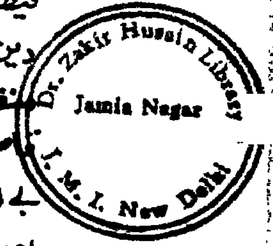
مارچ ۱۹۸۴ء



اس شمارہ میں:۔

پاکستان کے سلسلے میں جمیل منظر سنبھاروی کے قلم سے اداریہ "خطرناک تصویر" ○ ہندوستانی اسلام اور اصلاحی تحریکوں سے متعلق ملک کے ممتاز اور نامور دانشور اصغر علی انجینئر کا مدلل اور بھرپور مضمون "ہندوستانی اسلام اور اصلاحی تحریکیں"۔ ○ پاکستان کی مشہور و معروف افسانہ نگار سلطان جمیل نسیم کی تجرباتی کہانی "ویران دیواریں" انداز بیان کے دلکش رنگ و روپ میں ○ ہندوستان کے مشہور و معروف اور ترقی پسند افسانہ نگار شفق کی علامتی کہانی "صور اسرافیل" ○ فضل امام ملک کی تجرباتی کہانی "ٹکڑا ٹکڑا" ○ انیس احمد خاں کا انشائیہ "قصہ ایک باتیں ھزار" ○ انیس جلالی کی ایک طویل نظم "پریشانی" رفیقان اھل دانش کے نام" ○ فضا ابن فیضی۔ سید رونق رضا۔ مصطفیٰ مومن۔ سکندر عرفی دین محمد درد۔ جمیل قریشی اور خالد قمر کی نئی منظومات کا معیاری انتخاب ○ ڈاکٹر محمد ہاشمی۔ قاضی محی الدین اور سید احمد قادری کا بے باک اور بے لاگ تبصرہ ○ سید اختر الاسلام۔ پرمیل رومانی اور اسھلال غزالی شہر خیال میں ○

قیمت:۔ ۱/۵۰ روپے



بانی: مولوی حافظ محمد عبدالرحمن بسمل سنسہاروی
بیادگار: مولوی محمد زین العابدین آحمر سنسہاروی

ترقی پسند ادب کا ترجمان

ماہنامہ
سہیل
گیا

شمارہ: ۲
جلد: ۳۶

فروری ۱۹۸۴ء

چیف ایڈیٹر: مسعود منظر سنسہاروی
ایڈیٹر: جمیل منظر سنسہاروی

مجلس مشاورت

- ادریس سنسہاروی
- ڈاکٹر تاراچرن رستوگی
- ڈاکٹر قمر رئیس
- اصغر علی انجینیر
- سالک لکھنوی
- شاہد احمد شعیب

معاونین:

شکیل احمد جمالی

▲

عبدالقیوم ابدالی

بدل اشتراک

فی شمارہ:	ایک روپیہ پچاس پیسے
سالانہ:	۱۸ روپے
لائف ممبری:	۱۱۰۰ روپے

خط وکتابت و ترسیل زر کا پتہ
ماہنامہ سہیل ریور سائیڈ روڈ گیا

فہرست

شذرہ

خطرناک تصویر

پاکستان کے فوجی تاناشاہ جنرل ضیاء کا دعویٰ ہے کہ ان کا ملک "آزاد دنیا کا قلعہ" ہے۔ امریکی اخبار "ہیرالڈ" کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں ضیاء نے یہ دعویٰ کیا ہے۔ اس کا کچھ حصہ پاکستانی روزنامے "جنگ" میں بھی شائع ہوا ہے۔ اسی انٹرویو میں ضیاء نے یہ بھی بڑی صاف گوئی سے کہہ دیا ہے کہ ان کا یہ "آزاد دنیا کا قلعہ" کس کے مفاد کی حفاظت کرتا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ پاکستان کی حکومت مغربی ایشیا کے ملکوں میں، فارس کی کھاڑی میں اور آس پڑوس کے علاقوں میں امریکہ کے خاص فوجی مفاد کی حفاظت کر رہا ہے!

ظاہر ہے کہ ضیاء کا "آزاد دنیا کا قلعہ" صحیح معنوں میں امریکی سامراج واد کا قلعہ ہے۔ انہیں اس بات پر فخر ہے کہ پاکستان کے دس ہزار فوجی سعودی عرب میں امریکہ کے فوجی مفاد کی حفاظت کر رہے ہیں۔ انہیں اپنے فوجی افسروں پر ناز ہے جو مغربی ایشیا کے مختلف ملکوں میں فوجی صلاح کار بن کر امریکی مفاد کی حفاظت میں لگے ہیں۔ جنرل ضیاء کو اس بات کی کوئی فکر نہیں ہے کہ امریکی اس دلالی کے بدلے میں پانچ ایف-۱۶ لڑاکو جہاز دیتا ہے یا پندرہ۔ وہ تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ امریکہ کو پاکستان کی حفاظت کی گارنٹی کرنی ہوگی۔ یہ تمام باتیں ضیاء نے اسی انٹرویو میں کہی ہیں۔ مطلب صاف ہے۔ جس پاکستان کو ضیاء آزاد دنیا کا قلعہ کہتے ہیں وہ حقیقت میں امریکہ کا غلام بنتا جا رہا ہے۔ اپنے ملک کو امریکہ کے حوالے کر کے جنرل ضیاء حقیقت میں پاکستان کی آزادی کو امریکی سامراج واد کے ہاتھوں گروی رکھ رہے ہیں۔ امریکہ کے اشارے پر ناچنے والا دھر فوجی تاناشاہ ایسی گتا لکھ رہا ہے۔ بے شک یہ پاکستان کے عوام کو طے کرنا ہے کہ وہ اس بے عزتی کی حالت کو کب تک برداشت کریں گے ———— لیکن ہندوستان کے لوگ بے فکر نہیں رہ سکتے۔ امریکہ ضیاء کے اسٹاک میں جدید سے جدید ہتھیاروں کا انبار لگاتا جا رہا ہے۔ اس سے ہندوستان کی آزادی پر خطرہ بڑھا ہے۔ اب خود ضیاء کہہ رہے ہیں کہ امریکہ کو صرف ہتھیار بھجوانے کا نہیں بلکہ پاکستان کی حفاظت کی گارنٹی کرنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں ملکوں کے بیچ کوئی فوجی معاہدہ ہو چکا ہے یا ہونے والا ہے۔

مشہور امریکی صحافی جیک اینڈرسن نے حال ہی میں پردہ فاش کیا ہے کہ پاکستان [illegible] نے اپنے ہوائی اڈوں کو امریکی فوجی جہازوں کے استعمال کے لئے اجازت دے دی ہے۔ دونوں ملکوں کے بیچ [illegible] کا سمجھوتہ ہو چکا ہے۔ تبھی امریکی فوجیوں کے ذریعے ضیاء کے نجی حفاظتی دستوں کی ٹریننگ دیا جا رہا ہے۔ اس صورت حال میں ضیاء کا یہ انٹرویو ہمارے ملک کے لئے بہت خطرناک تصویر پیش کرتا ہے۔ ریگن حکومت کے ذریعے دنیا کے پیمانے پر کی جا رہی حملہ آور تیاری میں پاکستان کو کافی بڑی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ یہ ہمارے ملک کے لئے فکر کی بات ہے۔ عوام کو

ہندوستانی اسلام اور اصلاحی تحریکیں

ایک انتقادی جائزہ

اصغر علی انجینیر

اسلام اور ہندوستان کا تعلق قدیم بھی ہے گہرا بھی۔ جنوبی ہند میں مالابار علاقے سے عربوں کا رشتہ اسلامی عہد سے قبل سے تھا۔ عرب تاجر اکثر یہاں آیا کرتے تھے اور طلوع اسلام کے ساتھ ہی عربوں نے جنوبی ہند کے اس علاقے میں تبلیغ شروع کر دی تھی۔ شمالی ہندوستان میں آٹھویں صدی کے اختتام تک اسلام سندھ اور پنجاب میں علاقے میں پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام اور ہندوستان کا تعلق بہت قدیم ہے۔ یہ تعلق بہت گہرا بھی رہا ہے۔ اسلام جس کی جڑیں ہندوستان میں جو آٹھویں صدی سے پھیلنا شروع ہوئی تھیں۔ تیرھویں اور چودھویں صدی تک بہت مضبوط ہو گئی تھیں۔ ابن بطوطہ نے جو محمد تغلق کے عہد میں (۱۳۵۱ - ۱۳۲۵) ہندوستان آیا۔ اپنے سفرنامے میں دہلی کو عالم اسلام کا سب سے عظیم شہر قرار دیا ہے۔ دہلی کی حیثیت اس دور میں قاہرہ، دمشق اور بغداد سے بھی بڑھ کر تھی کیونکہ ابن بطوطہ نے یہ بات ان تمام شہروں کی سیاحت کے بعد لکھی تھی۔ چنگیزی حملوں سے تنگ آکر وسطی ایشیا سے لاکھوں لوگ ہندوستان میں پناہ گزین ہونے چلے آئے تھے اور اس میں اس دور کے بڑے بڑے دانشور اور صوفیا بھی شامل تھے۔ ہندوستان ... ایک بڑا مرکز بنتا جا رہا تھا۔

ملتان اور دہلی جیسے شہروں میں علما اور صوفیا اور شعرا حضرات کی کثیر تعداد پائی جاتی تھی۔ ملتان میں تو شیخ بہاء الدین زکریا کی مشہور خانقاہ تھی۔ شیخ بہاء الدین کا انتقال ۱۲۶۹ء میں ہوا تھا جہاں دور دور کے علاقوں سے صوفیا اور شعرا کھنچے چلے آتے تھے۔ مشہور صوفی شاعر عراقی (متوفی ۱۲۸۳ء) بھی اسی خانقاہ کی پیداوار تھے۔ ان صوفیا نے ہندوستان کے عوام میں اسلام پھیلانے کی کامیاب کوشش کی۔ اس معاملے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ صوفیا علما سے زیادہ کامیاب رہے۔ علما کا زور ہمیشہ کتابی مذہب " (BOOK MEN OF RELIGION) پر رہا۔ جب کہ صوفیا کا زور عوامی مذہب " (FOLK MEN OF RELIGION) پر تھا۔ مذہب کی جانب اپروچ کا یہ فرق بڑا اہم ہے۔ خاص کر اگر کسی مذہب یا نظریے کی تبلیغ عوام میں کی جا رہی ہو۔

کتابی مذہب میں زور ماورائی سوالات (ماورائی مرکب) (TRANS CENDENTAL COMPLEX) اور شرعی قوانین پر ہوتا ہے۔ جب کہ عوامی مذہب میں زور عملی پہلوؤں (PRAGMATIC COMPLEX) پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عوامی مذہب میں توہمات، مقامی رسوم اور عقائد شامل ہوتے ہیں جو کتابی مذہب دکھتا ہے۔ اور مابعد الطبیعات سے متعلق مسائل پر زور ہوتا ہے۔ عملاً کتابی مذہب پر زور دینے والے ... سے متصادم ہوتی ہے وہ ان کے خلاف نبرد آزما ہو جاتے ہیں۔ صوفیا ان کے برخلاف عوامی مذہب کا نہ صرف احترام کرتے ہیں بلکہ ان کے بعض عناصر کو اپنا لیتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی عوام ...

بنیاد پھیل گیا
مذاہب انسان دوستی کا شعور ثبوت دیتے ہیں۔ چنانچہ
مشہور ہے کہ صوفی حمید الدین ناگوری (متوفی ۱۲۷۴ء)
نے اپنے شہر کے ہندوؤں کے جذبات کا احترام کرتے
ہوئے گوشت کھانا ترک کر دیا تھا۔ خواجہ حسن نظامی
نے اپنی کتاب فاطمی دعوتِ اسلام میں خاص طور سے
گجرات کے صوفیا کا تذکرہ کیا ہے۔ جنہوں نے عوامی رسوم
کو اختیار کر کے اسلام کو مقبول عام بنایا۔

وحدت الوجود کا عقیدہ عوامی سطح پر اسی انسان
دوستی اور عوام دوستی کا علمبردار رہا ہے۔ اور بالآخر
یہ وحدت ادیان کی طرف لے جاتا ہے۔ صوفیا نے ہندو
مذہب کی مقدس کتب اور مذہبی تصورات کا احترام
کرنا اپنا فرض سمجھا اور قرآن مجید کی آیتوں مثلاً
وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (سورہ رعد آیۃ ۷) یعنی ہر قوم کے
لئے ہادی مقرر کیا گیا ہے۔ یا اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا
نَذِيْرٌ ۝ (سورہ فاطر آیت ۲۴) کوئی امت ایسی
نہیں جس میں کوئی نذیر (یعنی انجام کار سے ڈرانے
والا) نہ گزرا ہو۔ وغیرہ سے احترام مذاہب کا ثبوت
پیش کیا ہے۔ سترہویں صدی کے ایک صوفی حسین
منیر خاں نے بھگوت گیتا کی مراٹھی میں تفسیر لکھی جو
"منہر حسینی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ ہمیں "سفینۂ خوشگو"
سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بیدل جو مشہور صوفی شاعر
تھے، ہندو فلسفہ میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اور انہیں
مہابھارت زبانی یاد تھی۔ شیخ کلیم اللہ دہلوی اپنے
مرید شیخ نظام الدین اورنگ آبادی کے نام اپنے رسالے
میں صلح کل کے اصول پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ
ہر مذہب و قوم کے افراد پر خانقاہ کے دروازے کھلے
رکھنا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ سماجی معاملات
میں برابری کا سلوک کرنا۔

لیکن علما جو مذہب کی طرف کتابی رویہ اختیار
کئے ہوئے تھے۔ صوفیا کے صلح کل اور وحدت الوجود
کے نظریات سے نالاں رہتے تھے۔ ان کے نزدیک ہر وہ
شخص کافر اور قابلِ ملامت سمجھا جاتا تھا جو ان کے کتابی
مذہب کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو۔ مذہب ان کے نزدیک زندہ
اور حرکت پذیر قوت نہیں بلکہ محض ظاہری شرعی ضابطہ
کا نام رہ گیا تھا۔ عوام میں صوفیا اپنے رویہ کی وجہ سے خاصے
مقبول ہوئے تھے اور ان کے آستانوں پر لاکھوں لوگ
اپنا سر جھکاتے تھے۔ علما میں صوفیا کی طرف سے رشک
کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ صوفیا کی مقبولیت کی ایک اور
وجہ تھی اور وہ یہ کہ وہ شہنشاہ و سلاطین کے
جابرانہ نظام (اسٹابلشمنٹ) سے عموماً اپنے کو دور رکھتے
تھے جبکہ علما (سوا دامنی) اقتدار کی ہوس سے اکثر آلودہ
رہتا تھا۔ علما سلاطین کے درباروں سے وابستہ ہو کر
اقتدار تو حاصل کر لیتے تھے۔ لیکن عوام میں مقبولیت
حاصل کرنے سے قاصر تھے۔

جب بھی صوفیا کی مقبولیت بڑھی، علما نے مذہب
کو آلودگیوں سے پاک کرنے کی نام کی تحریک چلائی۔ وحدت
ادیان کے لئے اکبر کی کوششوں کو ملا عبد القادر بدایونی
نے ہمیشہ معاندانہ نظروں سے دیکھا۔ جہانگیر کے زمانے میں
حضرت مجدد الف ثانی نے مذہب کی اصلاح کا بیڑا
اٹھایا۔ شیخ احمد سرہندی نے خاص طور سے نظریۂ وحدت
الوجود کی مخالفت کی اور اس کی جگہ وحدت الشہود کا نظریہ
پیش کیا۔ شیخ احمد سرہندی صوفیا کے صلح کل اور دیگر
ادیان کے ساتھ برابری کے سلوک کے مخالف تھے۔ ان کے
نزدیک وحدت کا نظریہ اس رویے کی بنیاد تھا، اسی
لئے اس کے مقابلے میں انہوں نے وحدت الشہود کا نظریہ
پیش کیا۔ اور شریعت کے تقدم پر زور دیا۔ انھوں نے
مجدد ہونے کا دعویٰ کیا اور مذہب کی اصلاح و تجدید
کی تحریک چلائی۔ لیکن یہ اصلاحی تحریک، اگر عوام دشمن
نہیں تو عوام دوست بھی قرار نہیں دی جا سکتی۔ اس
تحریک میں صوفیا کے برخلاف ہندو مسلم تفریق پر زور تھا۔
مذہب کی اصلاح کے لئے شیخ سرہندی نے مختلف علما
اور اپنے دور کے منتخب افراد کو سینکڑوں کی تعداد میں
خطوط لکھے۔ اور ان خطوط میں اتباعِ سنت پر زور
دیا۔ انھوں نے اپنے کئی شاگردوں کو سارے ہندوستان

[illegible] "سنت" اور "شریعت" کی طرف [illegible]

[illegible]

[illegible] اصلاحی تحریک کے
[illegible] مذہب پرست طبقے
[illegible] سیاست سے اپنا
[illegible] بعض امراء ان کی
[illegible] ہوتی ہے۔ ایسی
تحریکوں کو اپنی اقتدار کی جنگ کا آلۂ کار بنا لیتے
ہیں۔ اکبر کے دربار میں بھی ابو الفضل اور فیضی کے بڑھتے
ہوئے رسوخ کی مخالفت کے لئے ان کے حریف امراء نے
نظریے کی مخالفت ملا عبد القادر بدایونی جیسے علماء کی
تھی۔ شیخ سرہندی کی تحریک میں بھی جہانگیری دربار کے امراء
شریک تھے۔ [illegible] اس تحریک کے سلسلے میں ایک خاص بات
قابل ذکر ہے۔ یہ تحریک بالکل ہی رسمی معنی میں شریعت اور
سنت کے اتباع پر زور دیتی ہے۔ ابتدائی دور کے اسلام
میں جاگیردارانہ نظام کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں تھی۔
بلکہ اس دور میں زمین کی ملکیت کے تصور میں بھی سخت
اختلاف تھا۔ حضرت عمرؓ نے بعض صحابہ کی اس بات
سے قطعی انکار کر دیا تھا کہ مفتوحہ ممالک کی اراضی کو
دوسرے مال غنیمت کی طرح انکی ملکیت قرار دیا جائے
اور ان میں تقسیم کر دی جائے۔ حضرت عمرؓ نے مجلس شوریٰ
میں زمینوں کی ملکیت کے سلسلے میں جو تقریر کی تھی وہ ہماری
توجہ چاہتی ہے:

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس زمین کو آپ
[illegible] تقسیم کر دوں اور بعد والوں کو ایسی
حالت میں چھوڑ دوں کہ ان کو اس میں کچھ
نہ مل سکے۔ کیا آپ لوگوں کا یہ مقصد ہے کہ ان
کی [illegible] میں سمٹ کر رہ جائے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہوگی؟

اسلامی [illegible] معیشت تک پہنچ کر [illegible] اپنے [illegible]
[illegible] گئے۔

جاگیردارانہ نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا [illegible]
لکھتے ہیں:

"اس کے بعد زمین داری اور جاگیرداری نے یہاں
تک ترقی پائی کہ اللہ کی زمین جو سب میں
مشترک تھی اور جس کے مساوات سے
سب حقدار تھے، زمینداروں اور جاگیر
داروں کے ایک محدود طبقے میں سمٹ کر رہ گئی
اور کاشتکاروں کا طبقہ جبر و تشدد کے شکنجے
میں جکڑا ہوا ہر قسم کے وحشیانہ مظالم برداشت
کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ان کے لئے نہ آزادی کا
جیسے حقوق باقی رہے اور نہ دنیا کے ابتدائی
حقوق بلکہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں اور علمی
استعدادوں کو چھوڑ کر زرعی غلام میں تبدیل
ہو گیا۔"

ڈاکٹر فضل الرحمن جاگیردارانہ معاشرے کے متعلق
لکھتے ہیں:

"معاشرے کی ایک شکل کی ایک بٹائی پر دینے
کے سلسلے میں پیدا ہوئی ہے۔ زمین داری
اور جاگیرداری نے مسلمانوں کے معاشرے
کو جس طرح کھوکھلا کیا ہے اس کے پیش نظر
اس احادیث کا بغور مطالعہ اور زیادہ
ضروری ہے۔ موطا امام مالک، صحیح بخاری،
صحیح مسلم اور صحاح کی تمام کتابوں میں زمین
کو بٹائی پر دینے (یعنی مزارعہ یا محاقلہ)
[illegible] اٹھانے (یعنی کرایہ ارضی
نقدی صورت میں زمین کا کرایہ لینا) کی صریح مما
نعت ہے۔ صحاح کی ان تمام کتابوں میں اس کی
ممانعت کے لئے مستقل باب "النهي عن كراء الأرض"
"النهي عن المخابرة والمحاقلة" وغیرہ کے
عنوانات سے مستقل ابواب ان احادیث پر

مشتمل ہیں.... معاملات میں مساقات کی ایسی صورتیں ہیں جہاں ان احادیث کی شہرت اس قدر حد تواتر کے قریب پہنچ گئی ہو۔ یہ تغیر الفاظ وعبارت ان تمام احادیث کا اصل صحیح مسلم کی حدیث کے الفاظ میں یہ ہے کہ حدثنا ابن نمیر حدثنا ابی حدثنا عبدالملک عن عطاء عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کانت لہ ارض فلیزرعها فان لم یستطع ان یزرعها وعجز عنها فلیمنحها اخاها المسلم ولا یؤاجرها ایاہ (صحیح مسلم کتاب البیوع باب کراء الارض) یعنی حضرت جابر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے پاس زمین ہو اسے چاہیئے کہ کاشت کرے۔ اگر وہ کاشت نہیں کر سکتا اور اس کی (پیداوار) کاشت پر قادر نہ ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ زمین (یا زمین کا وہ حصہ) اپنے بھائی مسلمان کو ہبہ کر دے یا عاریۃً دے دے۔ اور اس کی اجرت (کسی شکل میں) نہ لے۔"

محولہ بالا اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام میں جاگیرداری کے لئے قطعاً کوئی جواز نہیں ہے اور مغلیہ سلطنت کی بنیاد ہی جاگیردارانہ نظام پر تھی جس میں زمین پر غاصبانہ قبضہ ہوتا ہے لیکن شیخ احمد سرہندی اپنی اصلاحی تحریک میں جاگیردارانہ نظام پر کہیں چوٹ نہیں کرتے، محض فقہ، سنت اور اتباع شرع کی رسمی معنے میں بات کرتے ہیں جس کا اصل مقصد نظریۂ وحدت الوجود کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ بادشاہ وقت جہانگیر کی حکومت کو بھی محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ حاکم وقت کی نافرمانی نہ ہو۔ چنانچہ ان کے عقیدت مند مہابت خاں کو ہدایت لکھ کر بھیجی کہ وہ بادشاہ کی فرماں برداری کرے اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جس سے ملک میں [illegible] اس بات سے ظاہر ہے کہ شیخ احمد سرہندی [illegible] یا جاگیردارانہ نظام کو اپنی اصلاحی تحریک کو [illegible] کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اتباع سنت سے ان کی مراد محض [illegible] ما بعد الطبیعاتی عقائد کی اصلاح اور صوفیانہ عقائد کی تجزیہ کرنا تھا۔ قرآن مجید میں ظلم و استحصال کے خلاف جہاد کرنے پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا (سورۂ حج آیت ٣٩) جن لوگوں پر ظلم کیا گیا ہے انہیں لڑنے کی اجازت دی گئی ہے یا فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا (٦:٤٥) ظلم کرنے والی قوم کی جڑ ہی کاٹ دی جاتی ہے یا فَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ (٢٢-٤٥) ہم نے کتنی ہی ایسی بستیاں ہلاک کر ڈالیں جن کے لوگ ظالم تھے۔ غرض کہ قرآن مجید میں کئی ایسی آیتیں ہیں جن میں ظلم و استحصال کی اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے والوں (مترفین) کی سخت لفظوں میں مذمت کی گئی ہے۔ اور جاگیردارانہ معاشرے میں یہ سب خرابیاں موجود تھیں۔ اس کے باوجود بھی مجدد الف ثانی کے یہاں اس معاشرے کی مذمت کہیں نظر نہیں آتی۔

اس کے بعد اہم اصلاحی تحریک شاہ ولی اللہؒ کی ہے۔ شاہ ولی اللہ کا دور مغلیہ حکومت کے زوال کا دور تھا۔ معاشرے میں زوال بنیادی خرابیوں کی وجہ سے شروع ہوتا ہے اور ان خرابیوں کی نشاندہی کرنا ریفارمر کا اولین فرض ہوتا ہے۔ دراصل مغلیہ عہد کے جاگیردارانہ معاشرے میں اورنگ زیب کے زمانے سے بحران ہو چلا تھا۔ منصبوں اور جاگیروں کے لئے زمینیں کم ہوتی جا رہی تھیں اور ادھر [illegible] جیسے نئے نئے منصبداروں کے منصبوں [illegible] میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، ادھر زمین کی طرف [illegible] سرکاری خزانے پر تقابلی [illegible]

[illegible]

…معاشی بحران پیدا کردیا تھا جس سے نمٹنے کے لئے بڑے
…بیدار اور باشعور حکمرانوں کی ضرورت تھی لیکن بدقسمتی
…سے اورنگ زیب کے بعد مغل حکمران ایک سے بڑھ کر
…ایک نکمے نکلے اور اپنا زیادہ تر وقت عیش و عشرت
…میں بسر کرنے لگے۔ بنیادی اصلاحات کی طرف سے بھی غفلت
…برتی گئی اور جاگیردارانہ معاشرے کا معاشی بحران بڑھتا
…گیا۔ مرکزی حکومت کمزور ہوئی تو صوبائی حکومتیں
…خود مختار ہونے لگیں اور دربار کے امراء ایک دوسرے کے
…خلاف سازشیں کرنے لگے اسی کمزوری نے مرہٹوں
…کے حوصلے بھی بڑھائے اور اب وہ دہلی تک حملہ کرنے کی
…جرأت کرنے لگے۔

یہ تھا شاہ ولی اللہ کی تحریک کا پس منظر۔ اس
…میں شک نہیں کہ شاہ صاحب کی بڑی گہری نظر تھی اور
…ان کی نگاہیں اپنے معاشرے کی خرابیوں کا جائزہ لے رہی
…تھیں۔ آپ کی معرکۃ الآرا کتاب حجۃ اللہ البالغہ
…اس کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر اشرف لکھتے ہیں:

دراصل شاہ ولی اللہ کی فکر میں جو چیز تھی با عظمت
اور دلچسپ ہے وہ ہندوستانی اسلامی معاشرے کے
مسئلہ کا شدید احساس اور اس کے اسباب کا تجزیہ
ہے۔ شاہ صاحب ہمارے پہلے مفکر ہیں جنہوں نے
امراء کی فضول خرچی اور عیش پرستی کے علاوہ کسان اور
مزدور طبقہ کی بے چینی اور مغلیہ حکومت کے غیر مسلم (مثلاً
راجپوت) طبقوں کی بد اعتمادی کا اندازہ کیا۔ خود مسلم
معاشرے کی اندرونی کیفیتوں کا (مثلاً شیعہ سنی
نزاع یا شریعت و طریقت کے آئے دن کے جھگڑے)
شاہ صاحب کو خوب علم تھا۔ اور غزالی کی طرح شاہ صاحب
بھی محسوس کرتے تھے کہ "قرآن اور حدیث" کی روشنی میں
اسلام کی سچی تعلیمات کو دوبارہ پیش کرنے کی ضرورت
ہے ـــــ لیکن شاہ صاحب بھی کوئی جاگیرداری نظام
پیش کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ
شاہ صاحب کا ذہن تجزیاتی بھی تھا اور ترکیبی بھی ـــ
(SYNTHETIC) اور ان کی تصانیف میں ایک تازگی

تھا اور پھیلا تھا لیکن ان کی تھیالوجی جاگیردارانہ نظام کو توڑ کر نیا نظام پیدا کرنے والی ذہن کی بنیاد اسلامی نظام پر ہوتی جو ہر اعتبار سے جاگیرداری کا مخالف تھا پیش کرنے اور پیش کیا گیا۔ انقلابی تھیالوجی نہیں تھی۔ شاہ ولی اللہ کا مقابلہ ہم سولہویں صدی کے عیسائی تھیالوجین ٹامس منذیر (THOMAS MONZER) سے بھی نہیں کر سکتے۔ اینگلز نے اسے پہلا THOLOGIAN OF REVOLUTION کہا ہے۔ اینگلز اسے زبردست انقلابی شخصیت مانتے ہوئے اس کے متعلق کہتا ہے

"وہ (یعنی منذیر) اپنے زمانے کے سماجی اور سیاسی رشتوں سے بہت آگے تھا۔ اتنا ہی جتنی اس کی تھیالوجی اس کے عہد کے مذہبی تصورات سے آگے تھی۔ منذیر کے وعظ بڑے انقلابی اور جنگجویانہ ہوتے تھے۔ وہ شہزادوں اور جاگیرداروں کے خلاف پورے زور و شور سے گرجتا، اعلیٰ درجہ کی اشتعال انگیز تصویر کشی کرتا اور اس کے برخلاف سماجی جمہوری مساوات کا نظریہ پیش کرتا۔ اس نے یکے بعد دیگرے کئی انقلابی پرچے شائع کئے اور ہر سمت میں اپنے سفیر روانہ کئے۔ اور خود آلشٹیٹ (ALLSTEDT) میں کسانوں کی یونین بنائی۔"

لیکن ہمیں شاہ ولی اللہ کے یہاں اپنے دور کے ظالمانہ اور استحصالی نظام کے خلاف ایسی کوئی انقلابی کوشش نظر نہیں آتی نہ ہی وہ کوئی متبادل نظام ہی پیش کر پاتے ہیں۔ البتہ موجودہ نظام کی اصلاح کی مزید کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں:

"اگر کسی قوم میں تمدن کی مسلسل کوشش جاری رہے تو اس کی صنعت و حرفت اعلیٰ کمال پر پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر حکمراں طبقہ آرام و آسائش اور زینت و تفاخر کی زندگی کو اپنا شعار بنا لے تو اس کا بوجھ قوم کے کارکن طبقے پر اتنا بڑھ جائے گا کہ سوسائٹی کا اکثر حصہ حیوانوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگا۔ انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت برباد ہو جاتے ہیں جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے۔ اس وقت وہ گدھوں اور بیلوں کی طرح روٹی کمانے کے لئے کام کریں گے۔ جب انسانیت پر ایسی مصیبت نازل ہوتی ہے تو خدا تعالیٰ انسانیت کو اس سے نجات دلانے کے لئے کوئی راستہ ضرور الہام کرتا ہے۔ یعنی ضروری ہے کہ قدرت الٰہیہ انقلاب کے سامان پیدا کرتی قوم کے سر سے ناجائز حکومت کا بوجھ اتار دے۔"

لیکن شاہ صاحب نے ایسی ناجائز حکومت کا بوجھ سر سے اتار پھینکنے کے لئے کوئی باقاعدہ اور منظم کوشش نہیں کی۔ اس کے برخلاف انھوں نے ایسی ناکارہ حکومت کو بچانے کے لئے خارجی طاقتوں سے مدد لینا چاہا۔ احمد شاہ ابدالی سے فوج کشی کی اپیل کی۔ چنانچہ احمد شاہ ابدالی کو لکھتے ہیں:

"بخدا می پناہیم از آنکہ پستہ نادر شاہ بعمل آید کہ مسلمانان را زیر و زبر ساخت و مرہٹہ و جٹ را سالم و قائم گذاشت رفت از آں باز دولت کفار قوت یافت و جنود اسلام از ہم پاشید و سلطنت دہلی بمنزلہ لعب صبیان گذشتہ"

اس طرح اپنی اصلاحات میں شاہ صاحب جاگیرداری نظام پر چوٹ نہیں کرتے بلکہ اس کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ بادشاہ، وزیر، امرا کے نام اپنے خط میں حسب ذیل تجاویز پیش کرتے ہیں:

"اول یہ کہ خالصہ (بادشاہ کی ذاتی جاگیریں) کو کم نہ ہونے دیں بلکہ زیادہ کرنا چاہئے کیونکہ آمد

سلطنت میں ضعف کا سبب خالصہ کی
کمی اور خزانے کی قلت ہوا کرتی ہے۔
دوم یہ ہے کہ جاگیر عطا کرنا بڑے بڑے
امرا کے لئے مخصوص ہو۔ چھوٹے چھوٹے
منصب داروں کو نقد دینا چاہیئے جیسا
کہ عہد شاہجہان میں قاعدہ تھا، اس لئے
کہ چھوٹے منصب دار جاگیروں پر قابو
نہیں پاتے۔"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ صاحب جاگیردارانہ
نظام کے ڈھانچے میں عدل و انصاف پر زور دینا
چاہتے ہیں۔ اس اپروچ کو اس طرح کے حالات کے
پیش نظر ایک عملی حکمت عملی کے طور پر حق بجانب
قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ ایک متبادل
نظری نظام جو انقلابی اصولوں پر قائم ہو پیش نہ کرنے
کی ذمہ داری سے شاہ صاحب کو بری الذمہ قرار
نہیں دیا جا سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ
صاحب کے دور کے حالات نہایت پیچیدہ تھے اور
اور کوئی ایک مخصوص طریقہ کار اختیار کرنا مشکل کام
تھا۔ لیکن ایسے نازک دور میں جب عوام چاروں طرف
سے حکمرانوں اور امرا کے ریشہ دوانیوں کے شکار
ہوں اور حملہ آوروں کی لوٹ کھسوٹ سے تنگ ہوں،
جاگیردارانہ نظام اور زوال پذیر ہو، شاہ ولی
اللہ جیسا صاحب نظر یقیناً کم از کم نظری اعتبار
سے انقلابی متبادل بھی پیش کر سکتا تھا۔ لیکن یہ
حقیقت ہے کہ شاہ صاحب خود نظری اعتبار سے
جاگیردارانہ نظام کے اثرات سے مکمل طور پر آزاد
نہ ہو سکے اور اسی ڈھانچے میں رہ کر حل تلاش کرتا
رہے۔ دوسرے لفظوں میں کسی قسم کی انقلابی پیش
رفت شاہ صاحب کے بنیادی نظریات سے ٹکراتی
تھی۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تیسری عہد ساز اصلاحی
تحریک سرسید کی تحریک تھی۔ اس تحریک کا جائزہ
لیا، اس کا تجزیہ کرنا یہاں ہمارا مقصد نہیں ہے۔ ہم
مختصراً اتنا ہی کہنا چاہیں گے کہ اس تحریک کا مقصد
ہندوستانی مسلمانوں کو خصوصاً ان کے حکمراں طبقے
کو ہندوستانی افق پر ابھرتے ہوئے نئے سیاسی و سماجی
نظام سے توافق پیدا کرنے کے لئے ذہنی طور پر آمادہ
کرنا تھا۔ اور یہ ذہنی آمادگی اور صلاحیت مغربی تعلیم
کے حصول سے ہی پیدا کی جا سکتی تھی۔ اور اسی پر
سرسید احمد خاں نے زور دیا۔ ان حالات میں
جدید تعلیم سے لیس ہو کر ہی مسلمان اپنی بقا کا
سامان کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کی تحریک
ان کٹھن حالات میں احیاء مذہب سے ہٹ کر جدید
قدروں کو سینے سے لگا کر ان میں بقا کی صلاحیت
پیدا کرتی ہے۔ (حالانکہ بچپن سے سرسید شاہ
ولی اللہ کے اسکول میں پروان چڑھے تھے)۔

لیکن سرسید کی یہ تحریک اپنی تمام خوبیوں
کے باوجود اپنے کچھ حدود رکھتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ
قدروں کے اعتبار سے وہ نظریاتی بنا پر جاگیردارانہ
نظام کے خلاف جاتی تھی۔ لیکن اس کا اپنا طبقاتی
کردار تھا۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (ایم۔اے۔او)
کے طالب علم زیادہ تر جاگیردار گھرانوں سے تعلق
رکھتے تھے اور جدید تعلیم سے لیس ہو کر یہ طلباء
برطانوی حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے
تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس تحریک کا اپنا طبقاتی کردار
تھا۔ اس کا مقصد عام مسلمانوں کے نچلے طبقوں مثلاً
غریب، بے زمین کسان، شہری کاریگر، مزدور اور دوسرے
اجلاف طبقوں کو شامل کرنا (یہ کر سکتے تھے) کو علمی فیض پہونچانا
اور نئے نظام کی لیڈرشپ کے لئے تیار کرنا نہیں تھا
بلکہ ان ہی اعلیٰ طبقوں کی چاکری کو اپنا فرض منصبی سمجھ
کر کام کرتے رہنے پر آمادہ کرنا تھا۔

سرسید نے ایک ایسے مدرسے میں جہاں نچلے طبقے
کے مسلمان بچوں کو دینی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم
کا پروگرام بنایا تھا تقریر کرتے ہوئے اس کی مخالفت (

ہی لفظوں میں کی تھی :۔

"آپ نے اپنے ایڈریس میں کہا ہے کہ ہم کو دوسری قوموں کے علوم پڑھانے میں عذر نہیں ہے شاید اس فقرے سے انگریزی پڑھانے کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے مگر میں کہتا ہوں کہ ایسے مدرسے میں جیسا کہ آپ کا مدرسہ ہے انگریزی پڑھانے کا خیال ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہماری قوم میں انگریزی زبان اور انگریزی تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ ہماری قوم کے سرداروں اور شریفوں کو لازم ہے کہ اپنی اولاد کو انگریزی علوم کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم دیں۔ بہ حیثیت اور جس درجے کے یہ لڑکے ہیں ان کو انگریزی پڑھانے کا کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہونے کا۔ ان کا اسی قدیم طریقہ تعلیم میں مشغول رکھنا ان کے حق میں اور ملک کے حق میں زیادہ تر مفید ہے۔

مناسب حال یہ ہے کہ آپ ایسی کوشش کریں کہ ان لڑکوں کو کچھ لکھنا پڑھنا آجائے اور ضروری کارروائی کے موافق حساب کتاب آجائے۔ اور ایسے چھوٹے چھوٹے رسالے ان کو پڑھائے جائیں جن سے نماز، روزے، کے ضروری مسائل جو روزمرہ پیش آنے والے ہیں اور مسلمانی مذہب کے سیدھے سادے عقائد ان کو معلوم ہو جائیں"

اس تقریر سے سرسید احمد خاں کا طبقاتی میلان بالکل ظاہر ہے۔ سرسید کے نزدیک جدید اور اعلیٰ تعلیم کے مستحق محض مسلمانوں کے اوپری طبقے تھے جن کو وہ "سرداروں اور شریفوں" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ نچلے طبقوں کے لیے محض سیدھے سادے مسلمانی عقائد اور نماز روزے کی تعلیم کافی تھی۔ ان کے لئے یہ کافی تھا کہ وہ اپنے آبائی پیشوں کو اپنائے رہیں اور محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے رہیں۔ یہ صرف شرفا اور سرداروں کے بچوں کو لازم تھا کہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوں۔ دوسرے یہ کہ سرسید تو جدید اور سائنسی اقدار پر زور دیتے ہیں اور مذہب کو جدید سائنسی روشنی میں سمجھانے کی کوشش کرتے تھے اس سے کمزور اور نچلے طبقوں کو مشکل ہی سے دلچسپی ہو سکتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں عام مسلمانوں کو مغربیت اور جدیدیت WESTERNISATION AND MODERNISATION کی تحریک سے اتنی وابستگی نہیں ہو سکتی جتنی اپنی روٹی اور بقا کی جدوجہد سے۔ سرسید کی تحریک جدیدیت کی تحریک تھی۔ جس سے محض اوپری طبقوں کو دلچسپی ہو سکتی تھی۔

جدیدیت اگر ایسی معروضی اقدار کا نام ہے جن کی عمومیت پر معاشی اور سماجی ترقی کا انحصار ہے، تو اس کا فیض عام ہونا چاہیئے۔ لیکن سرمایہ داری کے ڈھانچے میں رہ کر جدیدیت کا اپنا ایک طبقاتی کردار بن جاتا ہے جس کا میلان محض اوپری طبقوں تک محدود رہتا ہے۔ اور نچلے طبقے کا مقدر رنج اور محنت کشی اور غیر فطری توہمات بن کر رہ جاتا ہے

سرسید کی تحریک بھی اپنا فیض اوپری طبقوں تک محدود رکھنا چاہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے نچلے طبقے علماء کے زیر اثر رہے اور مسلم لیڈرشپ نے انہیں دورِ جدید کی روشن خیالی سے مستفیض ہونے دیا نہ ہی انہیں استحصال کرنے والے آقاؤں کے خلاف جدوجہد کرنے کے لئے اکسایا۔ آج جدید ہندوستان میں مسلمانوں کی زبوں حالی کی ایک حد تک ذمہ داری ان مسلم لیڈروں پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مندرجہ بالا تینوں اصلاحی تحریکیں عام مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کی بجائے استحصال کرنے والے اوپری طبقوں کے مفادات کی محافظ تھیں۔

قوت کو ابھارا جائے جو عوام کے لئے استحصال اور آجرانہ غلامی سے نجات کا باعث بن سکے۔ آج لاطینی امریکہ میں عیسائی مذہب میں تھیالوجی آف لبریشن (نجات بخشنے والی الہیات) پر زور دیا جا رہا ہے اور کچھ پادری مسلح ہو کر عوامی جدوجہد میں شریک ہو رہے ہیں تاکہ انہیں ایک طرف امریکن امپیریلزم سے اور دوسری طرف اندرونِ ملک استحصال کرنے والے سرمایہ دار اور نیم جاگیردارانہ طبقوں سے آزاد کیا جا سکے اور پرانے نظام کو ختم کر کے ایک نیا مبنی بر انصاف اور صالح نظام قائم کیا جا سکے۔ تیسری دنیا کے ملکوں میں آج کرسچین چیریٹی اور کنگ ڈم آف گاڈ کا تصور بدلا جا رہا ہے۔ چیریٹی کے روایتی تصور کی جگہ عادلانہ تقسیم (DISTRIBUTIVE JUSTICE) کا تصور لے رہا ہے۔ اور اب زور اس بات پر ہے کہ کنگڈم آف گاڈ (خدائی حکومت) یہیں اس دنیا میں قائم کی جانی چاہیئے۔

اسلام میں تھیالوجی آف لبریشن پیدا کرنے کی زبردست گنجائش ہے۔ عادلانہ تقسیم دولت پر قرآن میں بار بار زور دیا گیا ہے۔ قرآن میں ان کی مذمت کی گئی ہے جو دولت جمع کرتے ہیں۔ اور اسے بار بار گنتے ہیں۔ قرآن مجید میں سونا چاندی جمع کرنے والوں کو بھی عذاب الیم کی خبر دی گئی ہے۔ ظلم اور استحصال کی بار بار مذمت کی گئی ہے۔ اقبال کے لفظوں میں چیست قرآن "خواجہ را پیغام مرگ" لیکن اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے شاعرانہ رومانیت کے دائرے سے باہر نکال کر اس کی باقاعدہ انقلابی تعبیر کی جائے اور تھیالوجی آف لبریشن پیدا کی جائے۔ اسلام تو کمزور طبقوں کو قیادت دینے کے حق میں ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ: ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلهم ائمة ونجعلهم الوارثین ۰ یعنی ہم کمزور کئے گئے طبقوں پر احسان کرنا اور انہیں زمین کا وارث اور لیڈر بنانا چاہتے ہیں۔ اس سے کھل کر کمزور اور مظلوم طبقوں کی حمایت اور کیا کی جا سکتی ہے لیکن افسوس کی بات ہے کہ اسلام کو اکثر علماء نے آج تک اسٹابلشمنٹ کا حصہ بنا کر رکھ دیا اور اس کی انقلابی قوت کو مفلوج بنا دیا۔ تھیالوجی آف لبریشن جس کی تفصیلات میں ہم یہاں جانا نہیں چاہتے۔ دنیا کے تمام مظلوموں اور کچلے ہوئے عوام کی حمایت اور ان کی آزادی پر زور دیتے ہوئے تمام ترقی پسند طاقتوں کا ساتھ دے گی۔ اور ایسی ہی تحریک اسلام کی اصل روح کو قائم کرتے ہوئے انسانیت کے لئے نجات کا باعث بن سکے گی۔ ✤ ✤ ✤ ✤

بہار میں ۲۰ نکاتی پروگرام

بہار میں عوام خاص کر کمزور طبقے کے لوگوں کی حالت سدھارنے کے مقصد سے وزیر اعظم کے ۲۰ نکاتی پروگرام کو پوری مستعدی سے عمل کیا جا رہا ہے۔ یہاں کچھ خاص علاقوں میں کئے گئے کاموں کی مختصر روداد پیش کی جا رہی ہے۔

۱۔ انوسوچیت ذات / انوسوچیت جن ذاتی سے متعلق وکاس کا کام :- ۱۹۸۳-۸۴ء میں (اکتوبر ۸۳ء تک) انوسوچیت ذاتی کے ۹۳۲۸ خاندانوں کو اور انوسوچیت جن ذاتی کے ۳۷۵۶ خاندانوں کو غریبی ریکھا پار کرنے میں مدد دی گئی۔ یہ ٹارگیٹ کی ۱۰۲.۸ فیصد کامیابی ہے۔

۲۔ گاؤں میں پینے کے پانی کی سپلائی : چالو مالی سال میں اکتوبر ۸۳ء تک ۱۳۵۶ اسمیا گرست گاؤں کے لئے پینے کے پانی کی سپلائی کا انتظام کیا جا چکا ہے۔ جس سے ۴۳.۰۰ فیصد ٹارگیٹ پورا ہوا ہے۔

۳۔ بے مکان لوگوں کے لئے مکان کی جگہ :- ۱۹۸۳-۸۴ء میں اکتوبر تک ۸۱۱۳ بے مکان خاندانوں کو مکان کی جگہ دی گئی جو متعین ٹارگیٹ کا ۴۹.۲ فیصد ہے۔ ابھی تک کل ۴۹۰۸۰۵ مکان کی جگہ تقسیم کی گئی جس میں ۲۴۱۱۸ جگہ انوسوچیت ذاتوں میں اور ۴۳۲۶ جگہ انوسوچیت ذاتوں کے بیچ کی گئی ہے۔

۴۔ پیڑ لگاؤ پروگرام :- ۱۹۸۳-۸۴ء میں ۱۰ کروڑ ۴۰ لاکھ پیڑ لگائے گئے ٹارگیٹ رکھا گیا جو اکتوبر ۸۳ء کے آخر تک پورا ہو چکا ہے۔ یہ کامیابی بہار کے علاوہ دوسرے سات صوبوں کو حاصل ہے۔

۵۔ بائیو گیس :- یہ نہایت ہی اہم پروگرام ہے جس پر صوبائی حکومت کے ذریعے عمل کیا جا رہا ہے۔ اس جانب ٹارگیٹ کا ۹۰ فیصد سے زیادہ حاصل کرنے والے دو صوبوں (کرناٹک اور ہماچل پردیش) کے علاوہ بہار ہی ایک ایسا صوبہ ہے جس نے ۹۲ فیصد کامیابی حاصل کیا ہے۔

۶۔ سمیکت گرامین وکاس اور راشٹریہ گرامین یوجن پروگرام :- سمیکت گرامین وکاس پروگرام کے تحت ۳,۶۲,۳۵۴ خاندانوں کو فائدہ حاصل ہوا ہے۔ جس میں انوسوچیت ذات کے ۱,۰۰,۵۸۸ اور انوسوچیت جن ذاتی کے ۳۴,۷۸۶ خاندان شامل ہیں۔ اس جانب کئے گئے کاموں کے لئے اس صوبے کی کافی عزت افزائی کی گئی ہے۔

۷۔ کمزور طبقہ کے لوگوں کے لئے گرامین وکاس پروگرام :- موجودہ مالی سال میں اس پروگرام کو آگے بڑھایا گیا ہے جس کے تحت ستمبر ۱۹۸۳ء تک کی چھ ماہی کے لئے حاصل ۳۲.۴ فیصد کامیابی کے خلاف اکتوبر ۸۳ء تک ٹارگیٹ کا ۳۵.۰۰ فیصد پورا کیا گیا۔

۸۔ بجلی کی پیداوار اور گاؤں میں بجلی : موجودہ مالی سال میں اکتوبر ۸۳ تک ۵۴۳ گاؤں کا بجلی کرن ہوا۔ اور ۲۷۷۴ پمپنگ سیٹوں کو بجلی دی گئی۔ اسی دوران ۲۶۸ ہریجن بستیوں کو بھی بجلی لائن دیا گیا ہے۔

۹۔ دلہن کی پیداوار میں اضافہ : اس پروگرام کے تحت ۱۹۸۳-۸۴ء کے لئے ۵۳.۰۸ لاکھ ٹن کی پیداوار ٹارگیٹ رکھا گیا ہے۔ ۲۷.۳۰ لاکھ ہیکٹر میں گرما مونگ کی اور ۱۰.۷۰ لاکھ ہیکٹر میں ارہر، اڑد وغیرہ کی ربیع فصل لگائی گئی ہے۔

اس پروگرام کے دوسرے نکتوں کو بھی برابر اہمیت دیا جا رہا ہے اور صوبے کے وزیر اعلیٰ شری چندر شیکھر سنگھ کے ترقی پسند رہنمائی میں برابر ٹارگیٹ کو کامیابی تک پہونچانے میں مصروف ہیں۔

बि० स० मु० 379—ले (ल-300)/83—84

انیس جیلانی

پریشانی

رفیقانِ اہلِ دانش کے نام

وطن کی مٹی کا ذرّہ ذرّہ
وطن کی خاک و فضا کا پالا
میں آج اپنے وطن کی حالت پہ ہوں پریشان

یہ کیوں ہر وقت تیز نشتر چبھے ہوئے ہیں
مہیب اندیشے دل میں گھر کرتے جا رہے ہیں
یہ کیسے فتنے ابل رہے ہیں ؟
یہ کیسے طوفان اٹھ رہے ہیں !
وطن کے اندر
یہ کون دشمن ہیں گھات میں جو لگے ہوئے ہیں !
مرے وطن کا ہر ایک گوشہ
تمام کینہ پرور شرارتوں کا ہے ایک میدانِ آزمائش
کہیں وطن کی یہ شیرازہ بندی بکھر نہ جائے
کہ آج حالت یہ ہو گئی ہے
وہ فتنہ انگیزی کرنے والے
کہیں وہ کرسی نشیں ملیں گے
قریب ہی صاحبانِ مسند کے
کہیں مخالف صفوں میں جھنڈا لئے کھڑے ہیں۔
مگر ہے ان کا بس ایک فریضہ
کہ عمل کو پورا وہ کر رہے ہیں
وہ لفظ و لہجے زہر آلود تیر برسا رہے ہیں۔
کسی کو کم تر کسی کو برتر بتا رہے ہیں۔

تمام شعبوں میں زندگی کے
رجعت پرستی کا ایسا غلبہ سا ہو گیا ہے
عجیب شکلیں بدل بدل کر
ہزار جامے پہن پہن کر
غلیظ مدعیں بکھر کر یہ بلائیں
وطن کو نرغے میں لے رہی ہیں۔
اسی لئے تو آج میں اپنے وطن کی حالت پہ ہوں پریشان

ذرا یہ دیکھو وطن میں ہر سو
وہ فرقہ بندی کی یورشیں ہیں۔
عصبیت کی ظلمتیں ہیں۔
کہیں عقیدت کے نام پر کی گئی ہے صف بندی
کہیں پہ کوئی ملا حسد کی ہی مفاد اپنا سمجھ رہا ہے
دھرم پدھ کی کھینچ ہو گئی ہے کہیں ملا ہیں
نزولِ ظلمت، فروغِ رجعت، نمودِ طاقت
جو انتشار و نزاع کی سب علامتیں ہیں
اسی سبب سے میں آج اپنی ... حالت پہ ہوں پریشان

مگر رفیقو !
کہ تم ہو نباضِ عصرِ حاضر
تمہیں سے کہتا ہوں حالتِ دردِ دل میں اپنی
سنو ذرا غور سے مری بھی

اگر یہ کہہ دوں تو کیا غلط ہے
تمہاری حکمت و فلسفہ بھی حصار میں ہے
تمہاری ہمت، تمہاری جرأت، تمہاری حکمت
تمہاری دانش کی آج ہے سخت آزمائش۔
مرے رفیقو!
مجھے یقیں ہے، میں جانتا ہوں،
تمہاری نظروں سے سارے پردے اُٹھے ہوئے ہیں
تمہیں ہے ادراکِ رازہائے درونِ پردہ
تمہیں ہے معلوم حیاتِ رفتہ کی اصلیت بھی
تمہاری دانش، تمہاری فکر و نظر کے آگے
دبیز ماضی کی ساری پرتیں اُلٹ گئی ہیں
وہی تمہاری
تمام کون و مکاں کے رازوں کو جان لینے کی جہدِ پیہم
کہ جس نے پاسے تمام اسرار ارتقا کے
تمہیں ہے معلوم
کہ ایک عرصہ دراز پہلے
یہ آدمی جب حقیقتوں سے ناآشنا تھا
حقیقتوں کی وہ روشنی کو نہ پا سکا تھا
وہیں تو تم
اور اندھی عقیدتوں کا جنم ہوا تھا
جو عقل و فکرِ انساں کو ظلمتوں سے ڈرا رہی تھیں
ہر ایک طاقت سے خوف کھا کر
شعورِ انساں پہ پستیوں کی
وہ سخت مہریں لگا رہی تھیں
گذر چکے ہیں قرن بھی کتنے
مگر یہ طرفہ تماشہ دیکھو،
وہی ہیں مہرِ پا ابھی تلک جو تمام فتنے جگا رہی ہیں
جو آمریت کی ساری شکلیں میں بھی ہیں کارفرما
جو آدمی کو حقیر سمجھیں
جو نسل و رنگت کو برتری دیں
وہی تو ہیں جو جہل کی فسادِ

ابھی تلک خونِ انساں بہا رہی ہیں۔
جو دورِ ماضی کی ظلمتوں میں چھپی ہوئی تھیں
جہالتوں میں جو پل رہی تھیں
جو ظلمتوں میں پنپ رہی تھیں
وہی تو ہیں
جو ایسی خونخوار ہو چکی ہیں
کہ نسلِ آدم کو ختم کرنے کو آخری حل بتا رہی ہیں
مگر یہ سب کچھ
ہے عصرِ حاضر کی کل حقیقت کا ایک حصہ
مرے رفیقو!
مجھے ہے معلوم
کہ تم نے حسن و جمالِ ہستی کو پا لیا ہے
کہ آنے والے دنوں کے نقشے
تمہاری سنگینِ جبیں سے تیار ہو رہے ہیں
ازل سے پوشیدہ تھا سرورِ حیاتِ انساں
تمہاری حکمت و فلسفہ نے سراغ اس کا بھی پا لیا ہے
یہیں سے انساں کی رگوں میں
تو کیسا مچلا ہے خونِ تازہ
برابری کا، محبتوں کا، مسرتوں کا
مرے رفیقو!
یہی تو لمحاتِ فکریہ ہیں!
مرے وطن پر
کیوں بڑھتے جاتے ہیں ظلمتوں کے یہ گہرے سائے؟
مرے وطن پہ وہ دورِ ماضی سے آنے والی بلاؤں کا یہ نزول کیا ہے؟
اور ان کی یلغار بڑھ رہی ہے
کیوں ان کی یورش میں ہے اضافہ؟
کہ جیسے
ہر ایک انساں مرے وطن کا
ہو آج ان کی کڑی جکڑ میں؟
مرے وطن میں
وہ شاونیت کی شکل میں ہے تمہاری فکر و نظر کی دشمن

[illegible] ہو گیا
جو سانس فکر کی دھار کو کند کر دے
[illegible] وطن پہ اس بلا کے ہزار [illegible] ہیں
وہ فرزندوں کو حقارتوں کی [illegible] ہے
[illegible]
[illegible] وطن کی حالت پہ ہوں پریشاں
مرے رفیقو !
مجھے یقیں ہے، میں جانتا ہوں
تمہاری فکر و نظر کی بے حد ہیں تیز دھاریں
تمہاری حکمت، طریقِ کارِ جدالِ جنگی
تمام دشمن کی فتنہ گری کو کاٹ دیں گے
تمام اندھی جہالتوں کے سحر کو بھی
وہ توڑ دیں گے۔
وہ ماضیوں کے سرابِ رنگیں
تخیلی تحریر
وہ برتری کے تمام افسوں
[illegible]
[illegible] دھوئیں سراب۔
تمام سوداگرانِ مرگِ انبوہ
تمہاری ہستی، تمہاری حکمت، تمہاری جرأت سے ڈر رہے ہیں
یہ سب بلائیں لرز رہی ہیں۔
وہ جانتے ہیں تمہارے دم سے ہی موت اُن کی۔
مرے رفیقو !
یہ زر [illegible]،
جو محنتوں کا [illegible] خوں کر کے [illegible] طاقتوں کا دیوتا ہے
تمہارے نور سے
وہ اپنے خوابوں کی پوری تعبیر چاہتا ہے
مگر رفیقو !
یہ اُس کی چاہت نئی نہیں ہے
تمہارا اُس سے یہ جنگ کوئی نئی نہیں ہے۔
نہیں وہ سمجھے گا [illegible]
دشمن ہی رہا [illegible] انسانی

یہ جانتے ہیں سب کہ مرے رفیقو !
مگر یہ [illegible] سمجھ لو کہ تمہاری منزل نہیں ہے آساں
اسی لئے [illegible] ہے اے رفیقو !
کہ مستعد ہو کے تم بھی اپنے
وہ سارے فکر و نظر کے ہتھیار تیز کر لو
تمہیں ہر ایک سے ہے لڑ لینا
کہ ان بلاؤں میں ایک بھی گر رہے گی باقی
وہ جنگ ہوگی مگر ادھوری
بہت سے ملکوں کے تجربے نے بتا دیا ہے
یہ ایک لغزش بہت ہی بھیانک ہوئی ہے ثابت
جو پھیر دیگی تمہارے سارے کئے پہ پانی
اُدھر وہ دیکھو،
مرے رفیقو !
تمہارے دشمن، وطن کے دشمن، تمام انسانیت کے دشمن
وہ کیسی یلغار کر چکے ہیں
وہ جنگ کا آغاز کر چکے ہیں۔
مرے رفیقو !
وطن کی خاطر
تمام محنت کشوں کی خاطر، غرضیکہ انسانیت کی خاطر
غرضیکہ انسانیت کی خاطر،
کمر کو کس لو
بلا رہا ہے وہ جنگ کا میداں
کہ تم بھی اپنی صفوں کو لے کر
وطن کے دشمن سے جنگ کر دو۔
مجھے بھی پاؤ گے ایک سپاہی انہیں صفوں میں
اسی لئے تو
میں آج بے حد وطن کی حالت پہ ہوں پریشاں۔

گیا

غزلیں

مری شکستہ آئینے کا ٹکڑا بھیج دینا
مجھ کو مری لا حاصلی کا بھیج دینا

بہت نازاں ہیں اپنی خوابناکی پر وہ آنکھیں
انھیں اک دن تہِ سنگ تماشا بھیج دینا

در و دیوار کی ویرانیاں کم ہو چلی ہیں
ہمارے پاس بھی کچھ وحشتِ صحرا بھیج دینا

ہمیں آتا ہے کر لینا اندھیروں میں گزارا
اسی کو اب ہماری چشمِ بینا بھیج دینا

نئی دانش تو نازل ہو چکی ہے اس کے اوپر
مجھے اب کوئی بوسیدہ صحیفہ بھیج دینا

اسی کو شیشۂ زنگار آمادہ مبارک
مری خاطر کوئی پتھر کا چہرا بھیج دینا

جو کم شیوہ ہیں کیا جانیں بھلا ترسیل و ابلاغ
ہمارے نام یہ سارا تقاضا بھیج دینا

ذرا چھو لے تو وہ بھی لفظ ہونے کا مزا دیکھ
کبھی اس کو سرِ دہلیزِ معنی بھیج دینا

پڑے ہیں دور کے بیمار خانے میں فضاؔ کو
[illegible] نو کا مسیحا بھیج دینا

اس آسمان کو بھی زمیں پر اتار لے
لے اپنا سارا غصہ ہمیں پر اتار لے

گو ہر نفس ہے جادۂ تشکیک کا سفر
اچھا ہے خود کو سطحِ یقیں پر اتار لے

اب اس سے آگے دیکھ ہوا کا پڑاؤ ہے
محمل سے بوئے گل کو یہیں پر اتار لے

میں تجھ کو کھل رہا ہوں تو اچھا یہی سہی
جا اپنے سر کا بوجھ کہیں پر اتار لے

کب ہاتھ کی گرفت میں آتے ہیں حرف و صوت
یہ سارے نقش لوحِ جبیں پر اتار لے

ہستی کو اپنی گردِ تعلق سے پاک رکھ
اس آئینے میں زنگ یہیں پر مت اتار لے

ہو گی مری شناخت سے پیدا تری شناخت
تو خود کو مجھ سے خاک نشیں پر مت اتار لے

میں ہوں ترے وجود کا اثبات اے خدا
اس حرفِ تر کو عرشِ بریں پر اتار لے

فضا ابن فیضی

سیّد ندیم رضا

سورج کی طرح ہے کبھی پتھر کی طرح ہے
تیری ادا میری [illegible] ہے
خاشاک کی مانند کبھی سنگ کی صورت
یہ زیست کبھی نادار کے ابجر کی طرح ہے
حالات کی لہروں پہ بھنور کی لکیریں
انسان کا چہرہ کبھی سمندر کی طرح ہے
جذبات میں پنہاں ہے [illegible]
حالات کی دیوار پہ ٹھوکر کی طرح ہے
یادوں کا گزرتا ہوا یہ قافلہ دل سے
صحرا میں کسی شام کے منظر کی طرح ہے

○

مصطفیٰ مومن

آسمانوں سے گلستاں میں اترنے والا
وادیِ [illegible] خیاباں میں اترنے والا
جانے کیا راز تھا کیوں اتنا کرم اس نے کیا
کیا بتاؤں کہ رگِ جاں میں اترنے والا
ایک دن مجھ کو بھی آہستہ سے لے ڈوبے گا
ناؤ کی گود سے طوفاں میں اترنے والا
کاش! مجھ پر کبھی برس جاتا وہ آنکھوں سے گہر
ابر کی طرح بیاباں میں اترنے والا
مہرباں کتنا تھا وہ قطرۂ شبنم کی طرح
برگِ گل سے مرے داماں میں اترنے والا

○

سکندر عرفان

فکر و فن اور خیالات پہ تنقید کرو
ہو سکے تو مرے جذبات پہ تنقید کرو
تلخیِ شامِ جدائی پہ [illegible]
شوخیِ گردشِ حالات پہ تنقید کرو
زہرِ احساس [illegible] کا
مسکراتے ہوئے لمحات پہ تنقید کرو
جس کی قسمت میں نہیں صبحِ مسرت کا گزر
غم میں ڈوبی ہوئی اس رات پہ تنقید کرو
سچ کو جو زہر سمجھتا ہے [illegible]
اس کے بکھرے ہوئے لمحات پہ تنقید کرو

○

غزلیں

دین محمد درد

وقت نے بدلی ہے کروٹ زخمِ دل تازہ ہوا
زندگی کی تلخیوں کا جب کبھی اندازہ ہوا
کیا ہوا گر ذوقِ سماعت کیا ہوا میرا خلوص
میں نے دی اس کو صدا تو یہ کبھی آوازہ ہوا
جب کسی مہ رخ کا آنچل بام پر لہرا گیا
تب کہیں تخیل کا مجھ پہ دروازہ ہوا
بعد مرنے کے ہمیں جو خود ہی بھگتنا پڑا
کاروبارِ زندگی میں ایسا خمیازہ ہوا
اب تلک دل نے سہے ہیں درد و غم اس قدر
مدتوں کی ڈوبی سانسوں کا شیرازہ ہوا

○

جمیل قریشی

اپنے گھر سے جو کبھی وہ شبِ وعدہ نکلے
چاند اوڑھے ہوئے بادل کا لبادہ نکلے
زہر کا ذائقہ [illegible] مجھ کو زباں پر اپنی
جز مرے کون سرِ محفلِ اعدا نکلے
وقت تھم جائے ہوا مہکا کے پاگل ہو جائے
وہ پہن کر بھی اگر [illegible] سادہ نکلے
جس نے ہونٹوں پہ سجالی تھی تبسم کی لکیر
ہم کبھی دل میں لیے مرنے کا ارادہ نکلے
تم نے دیکھا ہی کہاں اس کا سراپا [illegible]
وہ تو تخیل کی حد سے بھی زیادہ نکلے

○

خالد [illegible]

(بحوالہ شاد باری کے لئے)

تیری آنکھوں میں یہ پھیلا ہوا کاجل کیسے
آج برسات تو برسا ہے یہ بادل کیسے
تو تو کہتا تھا کوئی درد کا رشتہ [illegible]
اب نظر آتی ہیں پلکیں تری بوجھل کیسے
تم تو آ جاتے تھے [illegible]
[illegible] کل کیسے
[illegible]
آج یہ [illegible] کیسے
[illegible]
[illegible] کیسے

○

سلطان جمیل نسیم

ویران دیواریں

فائر کی آواز سنتے ہی اس نے پر تولے اور اڑ گیا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ خالی دیوار نے مجھ پر قہقہوں کے ہنٹر برسا دیئے ہیں۔ میں دیوار کی ویرانی کے درد سے چیخنے لگا۔ اس کو آوازیں دینے لگا۔ اپنی صفائی پیش کرنے لگا کہ اس کو بتانے لگا کہ یہ فائر اس کے لئے نہیں تھا۔ میں نے تو دشمن کو نشانہ بنایا تھا لیکن اس نے ایک وحشی اور ایسا دہشت زدہ ہو کر اڑا کہ پلٹ کے دیکھا بھی نہیں۔

ایک دن ...... بس اتفاق سے اس پر میری نظر پڑ گئی تھی۔ دیکھتے ہی اس کی صورت دل میں اتر گئی۔ اتنا حسین تھا کہ اس کے بیٹھنے سے دیوار میں سجاوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ دیوار کس کی ہے۔ اس کے پیچھے کون رہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ بس وہ دیوار بھی مجھے اسی لئے دکھائی دی کہ وہ بیٹھا تھا۔ میں اس کو دیکھ کر ایسا دیوانہ ہوا کہ سب کچھ بھول گیا۔ ہر وقت ایک ہی خیال رہنے لگا کہ کسی طرح وہ میری دیوار پر آن بیٹھے۔

ایسا سفید بے داغ ...... ایسا خوبصورت پنچھی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ سچ تو یہ کہ اپنی مصروفیتوں میں ایسے حسن کا خیال تک دل میں نہ آیا تھا۔ میں تو ہر لمحہ اپنے دشمن کو زک پہنچانے اور زیر کرنے کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ بندوق اور بارود میں ہر وقت گھرے رہنے کے باعث میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ دنیا میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن کو دیکھنے سے سکون مل سکتا ہے اور جس کے بیٹھنے سے دیوار سج کر سکتی ہے۔

اسے ایک اجنبی دیوار پر بیٹھے دیکھ کر مجھے یہ فکر لگی کہ کسی طرح وہ اب میری دیوار پر بھی آن بیٹھے۔ میں نے بارود کا کھیل بند کیا۔ بندوق کو ایک طرف ڈالا۔ اپنی دیوار کو پودوں اور پھولوں سے سجایا۔ طرح طرح کا دانہ ڈالا کہ کسی سبب تو وہ میری دیوار پر چلا آئے۔ مجھے خبر نہیں کہ میری اس دیوانگی پر میرے ساتھیوں نے کتنی ناک بھوں چڑھائی ...... کیسی باتیں بنائیں ...... کیا کیا طعنے دیئے۔ مجھے تو بس ایک ہی بات کا سودا تھا، ایک ہی خیال کی سودا دا اوڑھ کر بیٹھ گیا کہ بس وہ میری دیوار پر آن بیٹھے۔ پھر آس پاس والے میری دیوار دیکھیں اور رشک کریں۔

جب سے میں نے اسے دیکھا ہے اس وقت سے یہ معلوم ہوا کہ لوگ اونچی دیوار کی پہچان یہ بھی بتاتے کہ اس پر پنچھی پکھیرو بیٹھتے ہیں ...... اس کو دیکھنے سے پہلے تو دیوار کی مضبوطی میرے پیش نظر تھی کہ دشمن کسی صورت بھی ڈھا نہ سکے ...... مگر اب ...... مجھے ...... مجھے اپنی یہ خواہش دیوار پر پنچھی نظر آنے لگی کہ وہاں جب تک دودھ کا دھویا سفید پرندہ موجود نہ ہو اس وقت تک دیوار کی بلندی واضح ہو سکتی ہے نہ اس کے خوبصورت ہونے کا احساس پیدا ہو سکتا ہے اور نہ وہ دوسروں پر برتری تسلیم کر سکتی ہے۔ اس کے خیال میں گم ہوئے مجھے کتنا عرصہ گزر گیا۔

...... میری دیوار نے موسموں کی کتنی چادریں بدلیں۔
میرے دشمن نے کتنی تیاریاں کیں میری بندوق نے کتنا زنگ کھایا...... مجھے خبر نہیں ..... مجھے تو وہ دن یاد ہے جب خواہشوں کے پردے ہٹا کے خوشیوں کا سورج طلوع ہوا اور تعبیروں کی دھوپ پھیلی اور میں نے اس کو اپنی دیوار پر بیٹھا دیکھا۔

بہت دن تک میں اس کی آمد کا جشن مناتا رہا۔
میرے کچھ ساتھیوں نے اظہار مسرت کے لئے ہوائی فائر کئے تو میں نے ان کو جھڑک دیا اور کہا کہ اگر ان آوازوں سے پریشان ہو کر وہ اڑ گیا تو دیوار پھر سونی ہو جائے گی۔ خوشیوں کا اظہار کرنا ہے تو گیت گاؤ ...... رقص کرو ...... محفلیں سجاؤ ...... پھول سمیٹو ...... خوشبو پھیلاؤ۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس کو دیکھنے سے جی نہیں بھرتا تھا۔ ہر وقت یہ احساس رہتا کہ جیسے زمانے بھر کی دولت حاصل ہو گئی ہے۔ ایک دن جب میں ایسی ہی طمانیت کے احساس کو آنکھوں سے دل میں اتار رہا تھا کہ مجھے کسی نے خبر دی کہ دشمن کا ایک قافلہ دیوار کے پاس سے گزرنے والا ہے۔ خدا معلوم وہ کون سی قاتل ساعت تھی کہ میں اس طرح چونک پڑا۔ جیسے نیند سے بیدار ہوا ہوں ..... سوئی ہوئی دشمنی جاگ اٹھی۔ میں نے ...... بندوق اٹھائی ...... میگزین بھرا ...... نشانہ بنا لیا اور پہلا فائر داغ دیا۔

دشمن کا کوئی آدمی ہلاک ہوا یا زخمی .... مجھے خبر نہیں ..... مجھے تو صرف اتنی خبر ہوئی کہ فائر کی آواز سنتے ہی اس نے پر تولے اور اڑ گیا۔

دیوار کی ویرانی دیکھ کر میرے سینے میں چھپا وسے کے بگولے اٹھنے لگے۔ اس کے اڑنے کا دکھ مجھ پر ایسا چھایا کہ میں یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ دشمن بچ نکلا۔ میری آنکھیں اس کا تعاقب کرتی رہیں ...... جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے دوربین لگا کر دیکھا۔ مجھے ایک دھچکہ سا لگا۔ وہ میرے دشمن کی دیوار پر بیٹھا تھا۔

میرے غصے کی انتہا نہ رہی۔ دشمن کی دیوار آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔ میں نے وسل بجائی۔

اسٹینشن

فارورڈ مارچ

جب ہم دشمن کی دیوار کے پاس پہنچے اور جنگ کا بگل بجایا تو تب بھی وہ خاموش بیٹھا ہمیں تکتا رہا۔
جب ذہن کے گوشے سے یہ خیال ابھر کر اس کے بیٹھنے کی وجہ سے دشمن کی دیوار بھی اچھی لگ رہی ہے تو میں نے محض اس کو اڑانے کے لئے پہلا فائر کیا۔

وہ منقار زیر پر کئے بیٹھا رہا۔

میں نے دوسرا فائر کیا۔

اس نے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا پھر بے نیازی سے پر کو بدلنے لگا۔

میں نے تیسرا فائر کیا۔

وہ پھر بھی نہیں اڑا۔

پھر میں نے اپنے دشمن کو للکارا۔ اس کی جانب بھی خاموشی بولتی رہی۔

تب میں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ اس دیوار کو ڈھا دو
دیوار میں شگاف پڑ گیا اور اینٹیں دشمن پر گرنے لگیں مگر وہ اسی بے نیازی کے ساتھ بیٹھا رہا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ میرے فائر سے بدک کر میری دیوار سے اڑنے والا ...... اتنی گھن گرج ہونے کے باوجود اب تک دشمن کی دیوار پر بیٹھا ہے۔

پھر مسلسل بندوقیں چلتی رہیں۔ توپیں داغی جاتی رہیں۔ بم پھٹتے رہیں دیوار میں شگاف پر شگاف پڑتے رہے مگر وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

دھماکے اور بڑھے ...... دشمن مرا ...... ہو کر چیخنے لگا۔ اس کی عورتیں گریہ کرنے لگیں بچے چیخنے لگے مگر وہ اپنے سکوت میں گم ...... سارے شور سے بے پروا اپنے خوبصورت پروں کو [illegible]

اس کا اطمینان ہی میرے اضطراب کا سبب بن گیا۔

مجھے اس وقت اپنے دشمن کو ختم کر دینے سے زیادہ بے چینی تھی کہ وہ اس دیوار سے اٹھ جائے مگر وہ ایسا جم کر بیٹھا تھا کہ میری بندوقوں، توپوں، بموں اور بارودی دھماکوں سے کوئی اثر نہ ہو رہا تھا۔ دشمن کے زخمی ہونے والے لوگوں کی کراہیں، فریادیں اور ماتم کی صدائیں اس کو چونکا ... نہ رہی تھیں۔ گرتی ہوئی دیوار کی دھول، پھیلتی ہوئی آگ کا دھواں بھی اُسے ہراساں نہیں کر رہا تھا۔

اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی موجودگی کے باعث اتنے شگاف پڑنے کے باوجود دشمن کی دیوار کا حسن جوں کا توں برقرار تھا اور یہی بات میرے اشتعال کے لئے کافی تھی۔

جنون کی دھند میرے دماغ میں پھیلتی جا رہی تھی، غصے کا دھواں میرے سینے میں بڑھتا جا رہا تھا، پھر مجھے دشمن کی حیرت ناک خاموشی بھی اپنی بندوق کی نال پر بیٹھی ایسے لگ رہی تھی جیسے وہ اس ساری ہوتی ہوئی دیوار پر ...... بیٹھا تھا۔

دیوار ڈھے گئی مگر وہ اس کے ملبے کے ڈھیر پر بیٹھا رہا۔

اب مجھے اس کے ساتھ اپنے دشمن کی خاموشی بھی کھلنے لگی کہ وہ کس حکمت عملی سے کام لے رہا ہے کہ دیوار گرنے کے باوجود اپنے اتنے سارے لوگوں کے مرنے اور زخمی ہونے پر بھی خاموش ہے کہیں اس کی خاموشی بھی بم کی طرح نہ پھٹ پڑے اس لئے میں نے حکم دیا کہ اس خاموشی کو بھی ریزہ ریزہ کر دو۔

اس سے قبل کہ میرے حکم کی تعمیل ہو۔ دشمن کی جانب سے بندوق کا پہلا دھماکہ ہوا۔ گولی میری طرف آئی۔ میں نے اپنے بازو سے آگ جیسے نکلتے ہوئے خون کو دوسرے ہاتھ سے دبا یا اور اس ملبے کی جانب نگاہ اٹھائی جہاں سے گولی آئی تھی کہ میرے زخم کی کسک خوشی بن کر میرے وجود میں پھیلتی چلی گئی۔

وہ دشمن کی دیوار سے بھی اٹھ گیا تھا۔

٭ ٭ ٭

شفق

صُورِ اسرافیل

آفتاب سوا نیزے پر اُتر آیا تھا۔

زمین تانبے کی ہوگئی تھی۔ ہوا کے تیز جھکڑوں میں چنگاریاں سی اُڑ رہی تھیں۔ پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے اور سارے کان صورِ اسرافیل کے منتظر تھے۔

میں سارا دن کی طرح دیپا، گرمی سے بچنے کے لئے اس نے زمین پر چٹائی بچھائی تھی اور میری مستقل نگرانی سے تھک کر چٹائی پر بائیں کروٹ سو گئی تھی۔ میں نے محتاط نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ دھیرے دھیرے کنڈی سرکائی، ایک ایک انچ کر کے کواڑ اتنا کھولا کہ اس سے گذر جاؤں، باہر نکل پھر اسی طرح کواڑ بند کیا اور تیزی سے گلیاں عبور کرنے لگا۔

میں سمجھا تھا اس سفر میں، میں اکیلا ہوں مگر گھروں کے دروازوں پر کوئی نہ کوئی موجود تھا۔ میں نے ان سے کچھ نہیں کہا، انہوں نے بھی کچھ نہیں پوچھا۔ وہ چپ چاپ میرے ساتھ ہو لئے۔ گلیاں، سڑکیں اور شاہراہیں، باغ، بازار اور عمارتیں سب جانی پہچانی تھیں مگر نہ جانے کیوں انجان معلوم ہو رہی تھیں، ہم ایک ایک چیز کو حیرت اور تجسس سے دیکھ رہے تھے۔ پھر آبادی ختم ہو گئی اور ہم فصیلِ شہر سے باہر نکل آئے۔

تم نے کچھ محسوس کیا ——— ؟ ہم سفر چلتے چلتے رک گیا۔

ہم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

ہمارے قد بڑھ رہے ہیں۔ کچھ دیر پہلے فصیل کے اس پتھر تک [illegible] تھے اور اب کتنا [illegible] ہو گئے ہیں۔

ہم نے غور سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ گھروں سے نکلے کتنی دیر گذری تھی [illegible] کیسے بڑھ [illegible]

بڑھتے رہے، یہ کتنا مناسب نہیں کہ رات ہونے سے پہلے ہمیں یہاں سے کہیں دور نکل جانا ہے۔ نہ جانے کب صورِ اسرافیل پھونک دیا جائے۔ اور پہاڑ روئی کے گالے بن کر اُڑنے لگیں۔

غیر ارادی طور پر ہمارے قدم اٹھ گئے کہ ابھی ہم خطروں کی حدود میں تھے۔ محافظوں سے کوئی اندیشہ نہ تھا مگر کیا پتہ کب ان کی نیت بدل جائے اور پھر ہم یہاں سے جا نہ سکیں یا جا کر واپس نہ آسکیں۔ مگر یہ کیسا واقعہ کہ ہمارے قد بڑھ رہے ہیں ہجرت کا نشان بن جائے گا، اپنی انفرادیت کا تو سارا بکھیڑا ہے ورنہ کیا ضرورت تھی کہ ماں کو بے خبر، میں چھوڑ کر گھروں سے باہر نکلا جاتا۔

ماں کی آنکھ کھلے گی تو کتنی پریشان ہوگی؟ طرح طرح کے اندیشوں میں وہ پہلے ہی سے مبتلا ہے اسی لئے تو ہفتوں سے مسلسل جاگ کر نگرانی کرتی رہی کہ ایسے خون آشام موسم میں گھر سے باہر نہ نکل جاؤں۔

ایک دوسرے سے نظریں ملیں تو پچھتاوے کا احساس پیروں میں بیڑیاں ڈالنے لگا اور ممکن تھا کہ ہم رک ہی جاتے تب ہی وہ چیخ پڑا۔ پاگل مت بنو، آگے بڑھو، ممتا تو باؤلی ہوتی ہے وہ نہیں سمجھتی کہ مستقبل پر اس کا کیا اثر پڑے گا، ہمارا کوئی گھونسلا نہیں، ہم نے کوئی لائحہ عمل بھی مرتب نہیں کیا ہے مگر کیا ہم دریا کے [illegible] کے حال نہیں جانتے؟

سورج سروں سے گذر کر شانوں پر آگیا تھا۔ ہم لوگ تھک گئے تھے۔ اور چنگاریاں اڑتی جا رہی تھیں، سڑک ختم ہوئی تو ٹیڑھے میڑھے راستوں کا سفر، پتھریلی زمین، سر پر [illegible] ببول کے جنگل اور پُر فریب ریگزار ... ہم چلتے ہی رہے کہ جانا ہی مقدر تھا، تھکن اور پیاس سے [illegible] اب

رکنا چاہیے کہ ہم وہاں سے بہت دور نکل آئے ہیں۔

مگر کیا یہاں محفوظ ہیں ؟

محفوظ تو کھنڈروں میں بھی نہ تھے ورنہ اس صحرا نوردی کی ضرورت کیوں ہوتی۔

بالآخر اس سکوت نے ہمیں محصور کر لیا۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم درخت سے ٹوٹا ہوا پتا بن گئے ہیں۔ کبھی پیڑ سے ٹیک لگا کر سمجھتے ہیں کہ اب یہیں جم جائیں گے۔ بوڑھا درخت بارش کے بعد بھی جاتے ہیں۔ تب طوفان کا موسم آتا ہے ہم اکھڑ جاتے ہیں۔ آخر کوئی زمین قبول ہمیں کیوں نہیں کرتی۔ میں کسی سے مخاطب نہیں تھا، سوچ لفظوں میں منہ سے جھڑ رہی تھی۔ ماں اکیلی ہوگی اور صور اسرافیل ضرور پھونکا جائیگا۔ میرا کیا قصور تھا۔ ماں کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا ہمارا۔ ماں پر فرار کو ہجرت کہنا محض ذہن کو بہلانا ہے۔

دوستو! اب تو رات ہو گئی۔ ہم سفر کہنے لگا، کل کا سورج نکلنے دو۔ تھکا ہوا ذہن فرار کی طرف مائل ہوتا ہے، آج کی رات سلامتی سے گزر جانے دو۔ صبح سوچیں گے کہ کیا کریں ؟

کسی نے اس کی تائید یا تردید نہیں کی۔ گھنے درخت کے سائے میں ہاتھ کی تکیہ لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور پھر سو گئے کہ ان کے خراٹے رات کے پُر ہول سناٹے میں عجیب رنگ بھر رہے تھے۔

یہاں کیا ہے ؟ میں نے افسردگی سے سوچا۔ گھپ اندھیرا، ویرانہ اور تھکن سے تھکے ماندے لوگ، یہ کس طرح طوفان کو روکیں گے ؟ کہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ ہتھیار نہ قوت ارادی۔ ماں میرے چلے آنے سے کتنی پریشان ہوگی۔ میری سلامتی کی دعائیں اس کے لبوں پر ہونگی۔ اور وحشت زدہ نظریں مجھے چاروں طرف ڈھونڈ رہی ہونگی۔ اب کون ہے جسے وہ اپنا کہہ سکے گی۔ کون اس کی حفاظت کرے گا۔ مجھے لوٹ جانا چاہیے ورنہ یہ دکھ مجھے چین نہ لینے دے گا کہ میں ماں کو مصیبتوں میں چھوڑ آیا تھا۔

میں نے ہم سفروں پر نظر ڈالی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ سب محو خواب تھے۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا، کسی نے مجھے نہیں روکا تو میں نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ اندھیرا گھپ تھا [illegible] اور کسی درندے کی چیخ سے ویرانہ [illegible] جنگل کا سناٹا [illegible]۔

۔۔۔ موت سے کیا ڈرنا کہ وہ گھات میں ہے۔ جلد منزل پر پہنچا۔ جنگل ختم ہوا تو تاروں کی چھاؤں میں خوشگوار لرزتے ہوئے جسم کی لرزش کم ہوئی اور کیفیت نظر آنے لگی۔ تو میری رفتار تیز ہوگئی۔ پھر شہر کے والے وہاں بڑی چہل پہل تھی۔ لوگ چیخ رہے تھے ناچ رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ اور اللہ کا شکر ادا کیا جا رہا تھا۔ ۔۔۔ میرے اندر جشن منانے کی خواہش شروع ہو گئی۔ میری رفتار دوڑنے کی حد تک تیز ہو گئی۔ ساری پیشین گوئیاں سچ ہو گئی تھیں۔ کاش صبح ہونے سے پہلے میں اپنے گھر پہنچ جاؤں۔ شہر ویران بنا ہو کچھ بھی کا نہ ہو۔ میں ماں کے قدموں پر سر رکھ کر اپنے فرار کی معافی مانگ لوں، پھر جو ہونا ہو ہو جائے کم از کم دل پر بوجھ تو نہ ہوگا۔

جب فصیل شہر نظر آئی تو میں دوڑنے لگا۔ محافظوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی مگر وہ بے فکری سے سو رہے تھے۔ دوڑتے قدموں کی چاپ پر وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگے۔ ان کے ہاتھ ہتھیار کی طرف بڑھے اور کرخت آواز نے مجھے خبردار کیا۔

میں دوست ہوں، مجھے پہچانو، میں اجنبی نہیں اسی شہر کا باشندہ ہوں۔ نادانی میں ماں کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ جشن شروع ہو چکا ہے۔ مجھے جانے دو۔ ماں پریشان ہوگی۔

مگر ان کے چہرے پتھرا گئے تھے۔ تم اندر نہیں جا سکتے۔

نہیں ایسا ظلم مت کرو۔ مجھے ماں کے پاس جانے دو۔ میں نے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔ تم نہیں جانتے میرے نہ جانے سے کتنا بڑا نقصان ہوگا۔

انہوں نے مجھے بے دردی سے دھکیل دیا۔ کہہ دیا گیا کہ تم اندر نہیں جا سکتے۔ پھر بہت سے مشتعل قدموں کی آواز پر وہ سب چونک کر سامنے دیکھنے لگے۔ میرے ہم سفر دوڑتے چلے آرہے تھے۔

یہاں کیوں کھڑے ہو؟ اندر چلو، صور اسرافیل پھونکا جا چکا ہے۔

صور اسرافیل پھونکا جا چکا ۔۔۔ میں نے چکرا کے میرے سر کو مضبوطی سے تھاما۔ فضا میں ہر طرف [illegible] ہوں گے۔ میری قاحبت جل رہی ہوگی [illegible] ۔۔۔۔۔ [illegible]

ہم سفروں سے الگ ہو گئے تھے۔ میں نے اچانک چھلانگ لگائی اور شہر کے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ نہ جانے کتنی برچھیوں کی انیاں میرے جسم میں اتر گئیں۔ درد کی ایک تیز لہر اٹھی۔ میں لڑکھڑا کر اٹھا اور پھر کٹی شہتیر کی طرح ڈھیر ہو گیا۔

دوبارہ آنکھیں کھلیں تو میرے چاروں طرف خون ہی خون تھا۔ زخموں میں ٹیس تھی۔ پیاس سے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ کچھ دیر تک سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کون ہوں، کہاں ہوں؟ پھر شہر جانے والے راستے پر نظر پڑی تو ذہن میں جھماکا ہوا اور میں نے جلدی سے اٹھ کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ مگر مجھ سے اٹھا نہ گیا تو میں چوپائے کی طرح رینگنے لگا۔

چند گھنٹوں میں شہر بدل گیا تھا یا مجھے سب کچھ بدلا بدلا نظر آ رہا تھا۔ سڑکیں ویران، مکانات خالی، دکانیں بند۔ لوگ کہاں چلے گئے؟ کون لے گیا؟ میری ماں کہاں ہو گی، کیسی ہو گی۔ میری رفتار تیز ہو گئی، گھٹنوں کی کھال ادھڑ گئی تھی۔ ہتھیلیوں کا گوشت جھانکنے لگا تھا۔ اور کنکر تیز نشتر لگا رہے تھے۔ قوتِ مدافعت جواب دے رہی تھی۔ مگر مجھے یقین تھا اگر میں پہنچ گیا تو پھر شہر کے دل تک پہنچ سکوں گا۔ اور جنت مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ہو گی۔

گلیاں سنسان پڑی تھیں، مگر اب گلیاں کہاں تھیں، میدان ہے۔ پھر نیم کا درخت نظر آیا، اسی کے پاس میرا گھر تھا۔ میری ماں رہتی ہے۔ سامنے چھوٹا سا میدان جہاں میں بچپن میں کھیلا کرتا تھا۔ میں نے آخری جدوجہد کی اور نیزوں کی قطار سے گزر کر گھر کی طرف بڑھا۔ بڑی میدان میں بکھرے [illegible] کسی خدا والے خواب نے ان کی پتلیاں ساکت کر دی تھیں۔

ماں دروازہ کھولو۔ میں چیخا، مگر باہر کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ میں نے باہر لٹکی ہوئی زنجیر کو کھینچ کر [illegible]
[illegible]

ماں دروازہ کھولو ... میں آ گیا ہوں ...... ماں [illegible]

جب [illegible] گیا تھا۔ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ ماں مجھے معاف کر دو۔ دیکھو تمہارے [illegible] کیا حالت ہو گئی ہے [illegible]

آنچل میں چھپا لو ماں۔ میرے سر پہ ہاتھ رکھ دو تاکہ سکون سے مر سکوں۔ ماں تم سن رہی ہو۔ دروازہ کھولو۔۔۔

میں کچھ دیر دروازہ کھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر دروازہ کہاں ہے؟ کمرہ اور دالان کہاں ہے؟ صرف چوکھٹ ہے اور پھر میدان...... ماں ضرور پڑوسیوں کے ساتھ ہو گی۔

میں نے واپسی کے لئے پھر ہتھیلیاں زمین پر رکھیں تو ایک سلگتی ہوئی لکڑی ہتھیلی میں چبھ گئی۔ درد کی ایک تیز لہر پھریری کی طرح پھیل گئی اور میرا سر جھکتے جھکتے زمین سے چپک گیا۔ پھیلتا ہوا اندھیرا تیزی سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے جسم کی ساری طاقت یکجا کر کے سر اٹھانے کی کوشش کی۔ تب ہی ایک تیز سیٹی کی آواز سنائی دی اور میرے پاؤں زمین سے اکھڑ گئے۔

میں تیزی سے اندھیری سرنگ میں گرتا جا رہا تھا۔ کوئی احساس نہیں، جذبہ نہیں، بوجھ نہیں، سب کچھ کتنا ہلکا ہو گیا تھا۔ پھر اندھیری سرنگ ختم ہوئی اور میں چکا چوند روشنی میں نہا گیا۔

میں نے آنکھیں کھولیں تو ماں کا ہیولا روشنی سے گزر رہا تھا۔ ○○

فضل امام ملک

ٹکڑا ٹکڑا

اور آکاش آج مر گیا۔ مجھے اُس کی موت پر کوئی تعجب نہیں کیونکہ اُسے آج نہیں تو کل مرنا ہی تھا اور سچ تو یہ بھی ہے کہ مجھے اُس کی موت پر کوئی غم نہیں ہو رہا تھا بلکہ ایک عجیب سی خوشی ہو رہی تھی...... مجھے تو اس کی موت پر آنسو بہانا چاہئے تھا کیونکہ وہ سب سے پیارا دوست تھا لیکن اس کی موت کا کوئی غم نہیں تھا...... ویسے کاندھے پر اپنی زندہ لاش کو اٹھائے پھرنے سے بہتر تو یہی ہے انسان کے کہ وہ ہمیشہ کیلئے آنکھیں بند کرلے...... اور ویسے بھی [illegible]...... ٹکڑوں میں مرا ہے — لمحوں میں ٹوٹا ہے...... پہلے بھی وہ کئی بار شہر میں مل چکا (وہ اب مرا) لیکن اندر کا انسان تو کب کا مر چکا تھا.... کئی بار مرا تھا...... قسطوں میں مرا تھا......

وہ میرا دوست تھا...... لیکن شاید میں غلط کہہ گیا...... میں اس کا دوست تھا لیکن شاید میں غلط کہہ گیا...... میں اس کا دوست تھا لیکن یہ بھی غلط...... میں اس کا دوست کہاں تھا ...؟ میں نے دوستی کا ناٹک رچایا تھا...... جس نے تو قدم قدم پر اُسے فریب دیا ہے...... لیکن آج اُس کی موت کے بعد مجھے اُس سے ہمدردی ہے...... ایک سچی ہمدردی ٹھیک ویسی ہی جیسی ایک سچے دوست کو دوسرے سے ہوتی ہے......

سمجھ میں نہیں آرہا ہے اُس کے مرنے کی داستان کہاں سے شروع کروں...... اگر سچ پوچھا جائے تو آکاش کی کہانی ہمارے آج کے بھارت کی کہانی ہے جو آکاش کی طرح ہی ٹکڑے ٹکڑے مر رہی ہے...... آکاش کا جنم ہی ایک موت تھا...... اگر موت نہ ہوتی تو وہ اُس گھر میں پیدا ہی کیوں ہوتا جہاں پہلے ہی سے چار بچے تھے اور جنہیں روٹی کے بدلے لات اور گالیاں ملتیں...... دھکا کھا کر اور گالیاں پی پی کر آکاش نے بچپن سے جوانی تک کا سفر طے کیا تھا...... اور اس بیچ وہ کئی بار مرا...... اسکول میں...... گھر میں... ...... گاؤں میں...... الگوں کے ہاتھوں مرا...... خود اپنے ہاتھوں مرا لیکن اُس کا کوئی جواب نہیں تھا...... دھار دار اور پھر مسکرا کے زندہ ہوا تھا۔ آگے کوئی [illegible]...... بچپن میں ماشاء اللہ...... اسکول تک کا سفر بھی طے کیا اس کے مجھے اس کا پتہ [illegible] نے کبھی اس کے بارے میں کچھ پوچھا تھا ...... لیکن مجھے موت تک کے سفر کے بارے میں [illegible]...... بچپن سے اسکول...... اسکول سے کالج...... یونیورسٹی...... ڈگریاں...... ڈگریوں کا بوجھ اپنے کاندھے پر لاد کر نوکری کی تلاش میں بھٹکتا...... جس کی تلاش ہی تو زندگی کی قسمت ہے [illegible]...... آکاش کی بھی قسمت آئی تھی۔

آکاش کا بچہ [illegible] تھا اور میں [illegible] اپنے اور دوستی کا کھیل

چپکا یا اور اس کا دوست بن بیٹھا ...... کیونکہ میں نے اسے اپنے اکیڈمک کیریئر کا سیڑھی سمجھا تھا ——
ویسے بعد میں میں نے اس دوستی کو اور بھی مضبوط کر لیا کیونکہ آکاش کی ایک جوان سندر بہن بھی تھی اور میں شروع سے
کم عورتوں کے معاملے میں بڑا ہی کمزور ہوں ——— دوسرے لفظوں میں عورت میری سب سے بڑی کمزوری ہے
...... اسے آپ چاہے جو بھی کہہ لیں ——— مجھے گالیاں بھی دے رہے ہوں گے آپ لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں
ہے کیونکہ میں سچ مچ بہت ہی کمینہ آدمی ہوں میں اس کا اقرار اس لئے کر رہا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آدمی
برائی ہی اچھائی کی سب سے بڑی پہچان ہے اور آدمی جو سب سے بڑا کمینہ ہو وہ سب سے زیادہ شریف ہے ......
اور میں بھی ان میں سے ایک ہوں ...... کیا کروں میں نے تو آج تک لوگوں سے دوستی ہی اس لئے کی ہے کہ ان
کے گھر جوان بہن ہوتی ہیں اور ایسا اس لئے کہ میں نہیں جانتا کہ بہن کا درد کیا ہوتا ہے کیونکہ خوش قسمتی سے میری
کوئی بہن ہی نہیں ...... نا اپنی نا پرائی ...... ویسے پرائی کو میں اپنی بہن بنانا ہی نہیں کیونکہ عورت میری
سب سے بڑی کمزوری ہے۔

میں بھٹک گیا، دوسری جانب میں تو آپ سے آکاش کی باتیں کر رہا تھا جو مر گیا ہے ...... آکاش
کالج کا ہونہار طالب علم تھا کالج سے یونیورسٹی تک کا سفر میں نے اس کے ساتھ طے کیا تھا ——— اور
اس بار وہ ہر بار ...... اور وہ کئی بار مرا ...... کبھی وائس چانسلر کی بیٹی کے ہاتھوں ...... کبھی پرنسپل کی بیوی کے ہاتھوں
——— کبھی کوئی نہ رہ سکا اس کا مقابل ہوتا تو کبھی کسی بڑے افسر کا سمبندھی ...... آکاش جو اپنی قابلیت
میں سب سے آگے ہوتا امتحان کے رزلٹ میں اس کا نمبر ان سب کے پیچھے ہوتا ...... ڈگری لینے کے بعد وہ مہینوں
نوکری کی تلاش میں بھٹکتا رہا ...... اور اس بیچ ایک اور حادثہ ہوا ...... اس کی بہن کنواری
ہی میں ماں بننے والی تھی ...... اور آکاش کی بہن نے اس بچے کا باپ مجھے بتایا تھا ...... لیکن بھلا
بوجھ مصیبت کون گلے لگاتا۔ میں نے اس کی بہن کے اس الزام کو ماننے سے انکار کر دیا ...... آکاش کو میری
دوستی پر بھروسہ تھا ...... وہ مجھ پر شک بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ آکاش نہیں جانتا کہ
میں سچ مچ اس کے ناجائز بھانجے کا باپ ہوں ...... اور میرے انکار کے بعد اس کی بہن نے آتم ہتیا
...... آکاش کی موت ایک بار یہاں بھی ہوئی تھی لیکن سارے غموں کی طرح اس نے یہ غم بھی برداشت کر
لیا تھا ———

اور مہینوں بھٹکنے کے بعد آکاش کو معمولی سو روپے کی نوکری ملی۔ یہ نوکری میں نے اسے دلائی۔
احسان میں نے اس لئے اس پر کیا تھا کیونکہ آکاش ایک لڑکی سے پیار کرتا تھا اور میں اس لڑکی کو
چاہتا تھا جو بعد میں میں نے پا بھی لیا تھا ——— اپنی محبوبہ سے دھوکہ کھانے کے بعد وہ پھر سے
کر جی اٹھا اور ٹوٹا تو وہ اس دن بھی تھا جب اس کے ایک دوست نے چند روپے بچ سکنے کے لئے اسے سر بازار
کیا جبکہ آکاش کے اس کے پاس اب بھی سیکڑوں روپے قرض کے طور پر اس پر اتیاں کے لاکر میں ڈپازٹ
——— آکاش نے کچھ نہیں کہا تھا اسے مسکرا کر یہ رسوائی بھی سہہ گیا تھا ......
اور آکاش تب بھی مرا تھا جب اس کے مکان مالک نے اسے گھر سے بے گھر کر دیا۔ اور اس کے ساتھ
اس کی بیوی کو بھی ...... آکاش چپ چاپ اپنی عزت لٹتا دیکھتا رہا تھا ایسی بات نہیں
وہ چیخا چلایا تھا ...... اس نے بھرپور مزاحمت کی تھی لیکن مکان مالک کے چمچوں نے [illegible]

[illegible] ہو چکا تھا ... جب یہ شیشہ ٹوٹا ... [illegible]

اور ... ایک ... [illegible] ... [illegible]

... کہ اس نے ... [illegible] آکاش ... [illegible]

... زندگی کے ... پہلے آیا —— وہ ٹھیک ہسپتال لے جایا گیا .... [illegible]

...... اور جب اس کے دوست کو ہوش آیا تو اُس نے آکاش پر خون کرنے کا الزام لگا دیا ...... لوگوں نے [illegible]ش کے لئے قسمیں کھائیں لیکن اُن کی ایک نہ سنی گئی۔ آکاش نے بس ایک نظر اپنے دوست پر ڈالی تھی —— [illegible] اُس کی آنکھوں میں عجیب جاپ [illegible] گھورتا رہا تھا پھر اپنے جرم کا اقرار کر لیا اور جیل چلا گیا۔ آکاش سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ میں نے پکڑنے میں اس کے لئے [illegible] جانتا ہوں کہ آکاش ایسا نہیں [illegible] سکتا —— وہ بے قصور ہے۔ لیکن —— ؟ اور جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں [illegible] ایک دن وہ بیچ بچا کر مر گیا اور ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ایک سکون بھری مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر [illegible] بھی کر دی تھی۔

آکاش مر گیا —— کیا سچ مچ —— ؟ ابھی میں زندہ ہوں تو آکاش کیسے مر سکتا ہے —— کاش تو آکاش کسی نہ کسی روپ میں زندہ ہے اور مرتا ہے —— ہاں ہو سکتا ہے اُس کا نام بدل گیا —— لیکن سوال اس آکاش کے بغیر ہے —— دوسرا یہ ہے ؟ اس نے خودکشی کی تھی تنگ آ کر —— یا پھر اُس کا قتل کیا گیا —— ؟ آپ کہیں گے کہ آکاش کا قتل کیا گیا تو پھر ایک سوال کروں گا کہ اس کا قتل کس نے کیا .... میں نے .... آپ نے ...... جیل کی تنگ کوٹھریوں نے —— یا پھر اُس کی موت کی وجہ ہندوستان میں پیدا ہونا نہیں —— مجھے اس سوال جواب چاہئے کیونکہ آج آکاش میرا دوست مر گیا ہے —— اور ابھی ڈھیروں آکاش یہاں روز مر رہے [illegible] ——

لیکن اس سے بڑا ایک سوال اور بھی ہے کیا آکاش کے قاتلوں کو پتہ لگانے کے بعد سزا دی جائے گی —— آکاش کی موت کے ذمہ دار لوگوں کو کس طرح کی سزا دی جائے گی ....: پرم ویر چکر —— پدم شری یا .... ؟ اور ان سب سوالوں کا جواب سب سے بڑا سوال ہے —— ؟ اب کون دے گا —— ؟

انیس احمد خان

قصہ ایک یا تین ہزار

گندہ ریستوران ——— ادھر ننگا بچہ اور اس بچے نے جیسے ہی گرم گرم چائے کی پیالی ان سفید پوش کے سامنے رکھی ویسے ہی چائے چھپاک سے اس دس سال سے بھی کم عمر والے معصوم کے منہ پہ آکر پڑی اور ایک بجے وہاں بیٹھے تمام لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگی اور وہ نوکر تھا بچہ آنکھ میں بھر گئی چائے کو پونچھ پونچھ کر کچھ صاف بچنے اور کچھ صاف دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ریستوران کا مالک گاہک کے پاس پہنچا۔ گاہک دماغ میں غصے کی مقدار ضرورت سے زیادہ بھر جانے کی وجہ سے سوچنے سمجھنے سے بالکل معذور ہو چکا تھا اور فقط چیخوں سے ہی کام لے رہا تھا، بولا "تمہارے اس بدتمیز بیرے نے میری پینٹ پر چائے گرادی ہے۔"

اتنا سنتے ہی ہوٹل مالک نے بھرا الکاہل جیسے تھل تھل کرتے جسم کا پورا وزن بالشت بھر کی ہتھیلی میں بھر کر اس چھوکرے کے منہ پہ جڑ دیا اور بچہ بجائے اپنے منہ دھونے کے گندے کپ پلیٹ دھونے میں محو ہو گیا۔

سین نمبر ۲

آئی۔ ٹی۔ او کا گنجان چوراہا شام کا یہ پانچ ساڑھے پانچ کا وقت، لوگ دفتروں کے پنجروں سے باہر نکل کر شہر میں استقلال کرتے بچوں اور بیویوں سے ملنے کے لئے اڑے چلے جا رہے ہیں۔ اچانک لال بتی ہوتی ہے اور ٹریفک رک جاتا ہے۔

اسی وقت سڑک کے کنارے بیٹھا پانچ سال کا بچہ ہاتھوں میں تقریباً اپنے وزن کے برابر اخبار اٹھائے "ایوننگ نیوز" کی صدا بلند کرتا ہوا کسی بھی لمحہ زناٹے سے چل پڑنے والے کاروں، اسکوٹروں، موٹر سائیکلوں اور بسوں کے اس ہجوم کے بیچ میں گھس پڑتا ہے۔

تبھی بس میں بیٹھے ایک موصوف چیخ کر پکارتے ہیں "ابے او" "ایوننگ نیوز" بچہ کاروں اور اسکوٹروں کے بیچ سے پھدکتا ہوا ایک ہاتھ کا اخبار اور پورا گٹھر سنبھالے اور دوسرے ہاتھ سے ایک روپیہ نکال کر بس کی طرف بڑھتا ہے تبھی ہری بتی ہو جاتی ہے۔ بچہ بس سے چند قدم کے فاصلے پہ پہنچ جاتا ہے۔ اس کے چہرے پہ مایوسی کی جھلک دکھتی ہے کیونکہ آج ابھی تک اس کا ایک اخبار بھی نہیں بکا ہے۔ وہ اپنی کم عمری کی وجہ سے اپنے سے زیادہ عمر والوں سے کمپٹیشن نہیں کر پاتا ہے۔ جو کہ اس سے کہیں بڑے بڑے قدم رکھ کر اس کار سے اس کار میں اس بس سے اس بس میں کتنا فٹافٹ اخبار بیچ لیتے ہیں۔ بچہ اپنی پوری طاقت سے دوڑتا ہے اور آخر کار بس کی اس کھڑکی میں پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جہاں وہ موصوف جنہوں نے اسے آواز دی تھی اخبار لینے کے لئے ہاتھ نکالے بیٹھے ہیں

بچے نے اچھل کر ان کے ہاتھ میں اخبار تھما دیا۔ انھوں نے ۳۵ پیسے بچے کی طرف اچھال دئے۔ اچھل کر آتے ہوئے پیسے بچے کی چھوٹی سی ہتھیلی میں نہیں سمائے اور چھٹک کر سڑک پر بکھر گئے۔ اسی لمحہ پیچھے سے ایک اسکوٹر نے بریک چرچرائے۔ لیکن اس نے رکنے سے پہلے ہی اٹھانے کے لئے جھکے بچے کو ایک زوردار ٹکر دے دی۔

بچہ اس وقت تک پیسے اٹھا چکا تھا۔ اپنی ایک مٹھی میں پیسے بھینچے اور سینے سے اخبار چپکائے ٹکر سے پیدا ہونے والی چوٹ اور اسکوٹر والے کی گالیوں کو نظر انداز کرتا ہوا سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر آواز لگانے لگا "ایوننگ نیوز"

سین نمبر ۳

ایک نئی منزل عمارت اپنی بناوٹ کے آخری مرحلے میں ہے اس میں استعمال ہونے والے ملبے کے ڈھیر کے پاس سال بھر کا مٹی میلا بچہ کھیل رہا ہے۔ اچانک ایک قیمتی سی امپورٹیڈ کار احاطے میں داخل ہوتی ہے۔ کار چلانے والے کی نگاہ عمارت کی بلندی پر اٹک جاتی ہے اور اس مٹی میلے بچے کا جسم قیمتی کار کے پہیوں کا [illegible] ہوا میں ایک چیخ بلند ہوتی ہے، ساتھ ہی ایک مریل سی مزدورن کے ہاتھوں سے اینٹوں بھری ٹوکری زمین پر گر جاتی ہے وہ بدحواس سی جب تک اپنے بچے کے قریب پہنچتی ہے تب تک پچھلا پہیہ بھی معصوم جسم کے اوپر سے گزر جاتا ہے۔

کار ایک دھچکے کے ساتھ رکتی ہے اور عورت دھڑام سے گوشت کے لوتھڑے پر گر کر بین کرنے لگتی ہے۔ کار کا دروازہ کھلتا ہے اس میں سے ایک شاندار آدمی نکلتا ہے جو کہ سو فیصدی اس عمارت کا مالک ہے۔ سیکورٹی گارڈ کو بلا کر حکم دیتا ہے "اس عورت کو فوراً باہر کر دو۔" مزدور جو کہ کام کرتے کرتے کچھ دیر کے لئے ٹھٹکے تھے دوبارہ اپنے اپنے کام میں جٹ جاتے ہیں، ان سب کو شام کو روٹی جو کھانی ہے۔

آدھے گھنٹے تک چیخوں، سسکیوں اور آنسوؤں کے ساتھ رونے کے بعد اس عورت نے بوجھا ڈھونے کے لئے زمین پر رکھی چادر کی تہیں کھول کر اپنے بچے کی لاش پر ڈال دی اور پاس میں لگے نل پر جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔

اسی وقت پاس کھڑا ایک آوارہ کتا لپک کے لاش کے قریب آکر اسے سونگھتا ہے اور سڑاپ سڑاپ کرکے زمین پر بکھرا خون چاٹنے لگتا ہے۔ عورت پھر سے اپنے کام میں جٹ جاتی ہے۔ کیونکہ اسے بھی تو پیٹ بھرنا ہے.........

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے کتاب کی دو جلد کا آنا ضروری ہے)

- مبصر: قاضی محی الدین
- نام کتاب: آدھی مسکراہٹ
- مصنف: شین مظفر پوری
- صفحات: ۲۷۲
- ناشر: شین مظفر پوری، مراد پور، پٹنہ ۴
- قیمت: اٹھارہ روپے

جناب شین مظفر پوری کی "آدھی مسکراہٹ" کے صفحہ نمبر پانچ پر ان کی مرقومہ (بطور دیباچہ) "خود نوشت" ہی سے ان کی فنی صلاحیت کا پتہ چل جاتا ہے۔ کتاب میں کل پندرہ طویل "حیاتیے" شامل ہیں۔ طنز و مزاح، انشائیے، خاکے یا کہانیوں کی بجائے میں حیاتیہ کا لفظ اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ موصوف نے ایسا متنوع ادب پارہ پیش کیا ہے، جس کا نام تجویز کرنے میں خود انھیں دقت پیش آئی ہے۔ میں نے بھی اسی شش و پنج میں الجھ کر یہی ایک نام رکھ دیا ہے۔ اب قارئین ہی کتاب کو دوبارہ پڑھ کر فیصلہ کر لیں گے کہ اسی صنف ادب کا کیا نام ہونا چاہیے۔

بہر حال! فاضل مصنف نے یہ پندرہ تحریریں ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۷ء کے دوران لکھی ہیں۔ (عمر کے اعتبار سے مصنف کی عمر کا یہ دور حقیقتاً ادبی کارنامہ انجام دینے کا ہی دور تھا) ان میں سے آٹھ حیاتیے واقعی یعنی نصف سے بہتر کے موضوع پر ہیں۔ بقیہ حیاتیے ایسے مختلف موضوعات پر محیط ہیں جو تعمیر زندگی کے اہم ترین گوشوں کو جدید طریقے سے اجاگر کرتے ہیں۔ دراصل کتاب میں حیات انسانی کی اعلیٰ قدر کا نمایاں SYMBOL سامنے رکھا گیا ہے۔ اسلوب اور فن تحریر میں اس قدر جدت اور زندگی بخش علامات موجود ہیں جن کی مثال اردو ادب میں خال خال ملے گی۔

طنز و مزاح کے موضوع پر دوسرے فنکاروں کے شہ پاروں میں جو لطافتیں پائی جاتی ہیں، ان تمام خوبیوں کے علاوہ شین صاحب کے یہاں ایک زبردست خوبی کا اضافہ ملتا ہے۔ اور وہ اضافہ ہے ان کی ہر بات اور ہر مسئلے پر آدھی مسکراہٹ کا حسن طریقے سے برتنا۔ وہ بات کہتے کہتے اپنی آدھی مسکراہٹ کا نیا دریغ تخرج کرتے ہیں اور بقیہ آدھی کو مکمل کرنے کے لئے قاری کا حق سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں تاکہ کتاب پڑھتے پڑھتے قاری یہ محسوس کرتا چلے کہ اس تخلیق میں اس کا بھی برابر کا حصہ ہے۔ شروع سے آخر تک اس جمالیاتی حسن کو تمام تر باریکیوں کے ساتھ برقرار رکھنا ہی بذات خود ایک زبردست فنی مہارت ہے۔

موضوعات کی جاذبیت، دلنوازی اور فصاحت کی چستی سے تحریر سدا بہار ہو کر رہ گئی ہے۔ مثال کے طور پر چند عنوانات، جیسے کہ واقف کر بخار آیا۔ زاغ کی چونچ میں انگور، بیمار مسیحا، سیاسی بچے، پولیٹیکل واقف، حاصل مشاعرہ اور سکنڈ ہینڈ والمعنیٰ وغیرہ۔ جن لوگوں کی ازدواجی زندگی میں اکثر نوک جھونک کی وجہ سے شب تاریک بھی جاری ہے، ان لوگوں کے لئے اس کتاب کا مشترکہ مطالعہ ایسا ہوگا، جیسے شدید لو کے عالم میں اچانک پُروائی ہواؤں کے جھونکے آجائیں۔

ہر موضوع اپنی جگہ مکمل ہے۔ پڑھنے والا بھی گمان کرنے لگا کہ وہ اپنی ہی آپ بیتی پڑھ رہا ہے جس نے پڑھا کہ یہ کہ دوران مطالعہ لبوں پر مسکراہٹ کا رقص کرتا نا شرط ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ پوری کتاب کے ہر جملے میں آدھی مسکراہٹ اس طرح رچی ہوئی ہے جیسے کسی حسین دوشیزہ کے نظر تاب ملبوسات ایک طرف اور اس کا دلفریب جسم ایک طرف۔ صرف ایک بات میری سمجھ سے باہر ہے! کتاب کے آغاز میں کلام الٰہی کی سورۃ الخلق کی ابتدائی پانچ آیات مع ترجمہ استعمال کی گئی ہیں اب تک غور کرنے کے بعد صرف اس نتیجے پر میں پہنچ پایا ہوں کہ آج کا اردو ادب، اردو کا قلم یا ذہن رائج الوقت تیزی سے عربی زبان کی جانب مائل ہے۔ کہیں یہ پندرہویں صدی ہجری کا اثر تو نہیں؟

نوٹ: جناب حافظ دہلوی نے اس کتاب کے ناز مطالعے کے بعد بطور تبصرہ برائے اشاعت دو اشعار دیئے ہیں۔ اشعار مندرجہ ذیل ہیں جنہیں ہنسی کا جھونکا، نیم عریاں تبسم کہتے ہیں

وہی انگڑائیاں ہیں ان کی آدھی مسکراہٹ کی
جنہیں سب ادھ کھلی کلیاں سمجھتے ہیں گلستاں میں
وہی پرچھائیاں ہیں ان کی آدھی مسکراہٹ کی

- رسالہ کا نام : ماہنامہ "مریخ"
- شمارہ : پہلا، اکتوبر ۸۳ء
- مدیر : عبد المغنی
- صفحات : ۴۸
- قیمت : دو روپئے
- ناشر : فخر الدین عارفی
- پتہ : لیڈی امام ہاؤس پنجم کوٹھی سید پٹنہ ۶
- مبصر : سید احمد قادری

رسالے آئے دن نکلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہ اردو زبان وادب کے قارئین اور شائقین کے لئے نہ نیا اور نہ تجربہ، اس کے لوگ عادی ہو چکے ہیں۔ بلکہ بعض رسالے جب کئی کئی سال مسلسل اور پابندی کے ساتھ نکلتے رہتے ہیں تو خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوتی ہے۔

رسالہ "مریخ" پہلی بار جنوری ۸۲ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ تو اس کے مزاج اور معیار کو دیکھتے ہوئے لوگوں نے بے حد پسند کیا تھا، لیکن جب دسمبر ۸۲ء میں بند ہو گیا لوگ افسوس کر کے رہ گئے کہ ایک اچھے رسالہ کی اشاعت کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ خاص طور پر اس رسالے نے پرویز شاہدی کا نمبر نکال کر دھوم مچا دی تھی۔ اس لئے ایسے اہم معیاری رسالہ کے بند ہونے کا افسوس فطری تھا۔ اور آہستہ آہستہ لوگ بھول بھی گئے۔

لیکن اچانک بغیر شور و ہنگامہ کے اکتوبر ۸۳ء میں "حلقۂ ادب" جو انجمن ترقی اردو بہار کا ادبی شعبہ ہے، کے ترجمان کے طور پر "مریخ" کا پہلا شمارہ شاندار کتابت، طباعت منظر عام پر آیا ہے۔

"مریخ" کے اس شمارہ کے ابتدائی صفحات پر "سطور" کے تحت عبد المغنی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، انہیں پڑھنے کے بعد اطمینان اور مسرت کا احساس ہوتا ہے "جدیدیت" جس نے اردو زبان و ادب کو فائدہ نقصان زیادہ پہنچایا ہے کی نفی کی ہے اور ایک صحت مند اور معیاری ادب کو پیش کرنے کی کوشش کا یقین دلایا ہے، جس سے قارئین کا اردو ادب سے رشتہ استوار ہوگا ساتھ ہی ساتھ اردو زبان و ادب کو فائدہ بھی پہنچے

"مریخ" کے پہلے شمارہ کو دیکھنے کے بعد یہ امید جا سکتی ہے کہ اس کا معیار مزید بلند ہوگا اور اردو دنیا میں جو جمود طاری ہے، وہ ٹوٹے گا اور ساتھ ہی ساتھ صحت مند ادب کے لئے مشغل راہ بنے

"مریخ" کے دوبارہ اجراء پر ادارہ "مریخ"، انجمن ترقی اردو بہار اور حلقۂ ادب بہار کے کارکنان

[illegible]

کتاب کا نام: عکس در عکس (شعری مجموعہ)
فن کار: خالد رحیم
قیمت: ۲۵ روپے
ناشر و تقسیم کار: خالد رحیم بخشی بازار۔ کٹک (اڑیسہ)

عکس در عکس، اڑیسہ کے مقبول شاعر جناب خالد رحیم کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ دراصل اسے خالد رحیم کی غزلوں کا مجموعہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ کیوں کہ مشمولات میں ایک نظم کے علاوہ تمام تر غزلیں ہی غزلیں ہیں۔ جن میں چند آزاد غزلیں بھی شامل ہیں۔

عہد حاضر کے مسائل کی پیچیدگی سماجی اور تہذیبی قدروں کی شکست۔ رجعت اور سارے ملک میں بے سمت سیاسی بازیگری کے منفی اثرات ——

یہ سارے حقائق ایسے ہیں جن سے نئی نسل کے احساس اور باشعور فن کاروں کا متاثر ہونا ضروری ناگزیر ہے۔ مگر یہ صورت حال نئی نسل کے گمراہ کن ہونے کے امکانات بھی پیدا کر سکتی ہے اور ہمارے ادب میں ایسے نوجوانوں کی تعداد کم نہیں ہے تاہم اس تاریکی میں بھی ایسے شعلے لرز اٹھتے ہیں جن سے فضا منور ہو جاتی ہے۔ میری مراد نئی نسل کے ان فنکاروں سے ہے۔ جن کے یہاں شاعری کا حسن عصری آگہی اور مشیت فن کے ساتھ مربوط نظر آتا ہے۔ خالد رحیم کا شمار ایسے ہی ہوشمند اور باشعور فن کاروں میں ہوگا۔ ان کی غزلوں میں لب و لہجہ کی شائستگی کے ساتھ فکر کی ندرت اور زندگی کے مسائل کو صحیح تناظر میں سمجھنے کی کوشش نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ غزل میں "واسطہ" کی اہمیت بہت ہوتی ہے اور بڑی واسطے سے کچھ کہنا بڑا ہی کٹھن معاملہ ہے مگر خالد رحیم نے غزل کی لطافت و نزاکت کو مجروح کیے بغیر جو کچھ بھی کہنا چاہا ہے۔ بڑے موثر اور کامیاب طریقے سے کہا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

قدم قدم پہ اجالوں کی رکھ گیا بنیاد!
اندھیری رات میں وہ ماہتاب جیسا تھا

اب کے باغوں میں ترے جسم کی خوشبو ہے اسیر
پھول کے ساتھ ترا ذکر برابر ہوگا

جسم جو سورج کے ادب میں آر
دھوپ پھیلے غروب شب ٹوٹے

ان اشعار میں احساس کی جو نازکی اور شگفتگی ہے۔ اور طرز اظہار کی جو رعنائی ہے وہ خالد رحیم کی شاعری کے امکانات کا پتہ دیتی ہے۔ مجموعہ میں جناب کرامت علی کرامت کا ایک طویل پیش لفظ شامل ہے جو خالد رحیم کے کلام کا ایک متوازن مگر دیانتدارانہ تجزیہ ہے۔ مجموعہ دیدہ زیب ہے اور اس لحاظ سے



شہرِ خیال

محترمی تسلیم! مختلف اخبارات ورسائل میں اداریہ اور قارئین کے خطوط کے لیے مختلف عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ میں نے ہندوستانی، پاکستانی اخبارات ورسائل سے ایسے عنوانات کا جائزہ لیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ماہنامہ سہیل میں مجھے اداریہ کے لیے "حرفِ اوّل" اور قارئین کے خطوط کے لیے "شہرِ خیال" عنوانات ملے۔ دونوں عنوانات سے آپ کی علمیت، ادبیت اور ذہنی اختراع کا تعارف ملتا ہے۔ اسی لیے ایک استفسار آپ کے پیش نظر کر رہا ہوں تاکہ آپ یا آپ کے قارئین اس پر اپنی رائے ظاہر کریں۔ جلالؔ لکھنوی لکھنؤ اسکول کے آخری شاعر تھے۔ ان کے چند شعر غور طلب ہیں:

سارے ارمان ہوئے کشتہ یہ دھر بنگے ہیں
اب سبھا دل سے کوئی پوچھے کہ بھلے چنگے ہیں

آ لے معشوق کی کہتے ہیں وفا سن سن کر
یہ حکایات ہیں، افسانے ہیں دھر بنگے ہیں

رنگ لائے ہیں غضب دیدۂ خوں بار یہاں
ہم نے کپڑے بھی دکھائے کو ترے رنگے ہیں

مرضِ عشق سے صحت ہوئی مرتے ہی جلالؔ
اب تو ہم فضلِ الٰہی سے بھلے چنگے ہیں

ان اشعار میں "دھر بنگے" کی وضاحت کے ساتھ ساتھ رنگے پر بھی قارئین اپنے خیالات کا اظہار کریں تاکہ پھر ملتوبات سے کے مصداق فکر ودانش کے نئے چراغ جلائے جا سکیں۔

مخلص: سید اختر الاسلام۔ میرٹھ (یوپی)

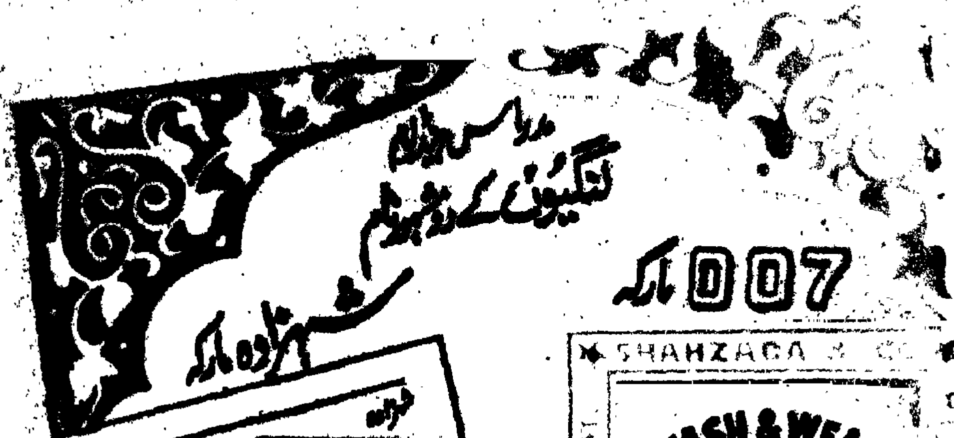
محترم حبیب صاحب! آداب۔ سہیل کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ بہت ہی جاندار اور معیاری رسالہ ہے۔ امید ہے کہ آپ جیسے قابل، ایماندار اور کہنہ مشق صحافی اور ادیب اس کا معیار برقرار رکھیں گے۔ گیا سے یہ رسالہ نکال کر آپ ایک اہم کام انجام دے رہے ہیں۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔ تازہ شمارہ میں اصغر علی صاحب کا فیض پر لکھا ہوا مضمون پسند آیا۔ اس کے علاوہ پریم وار برٹنی (مرحوم)، علیم صبا نویدی اور منوہر لال ہادی کی تازہ تخلیقات کافی جاندار ہیں۔ پروفیسر عالم خوندمیری کے انتقال سے اردو ادب میں ایک نہ پُر ہونے والا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ کشمیر یونیورسٹی میں وہ میرے استاد رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے میری کتاب "جدید اردو شاعری" کا دیباچہ بھی تحریر کیا ہے۔ آپ چاہیں تو ان پر بھی ایک مضمون بھجوا سکتا ہوں۔

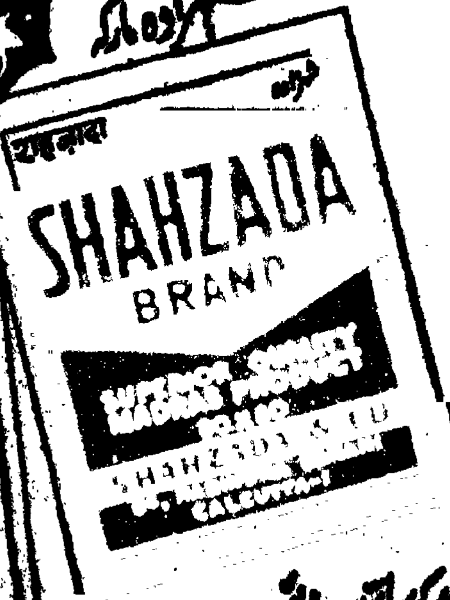
آپ کا: پریمی رومانی۔ کشمیر۔

محترمی: "سہیل" یہاں کافی مقبول ہے۔ قریب قریب ہر بک اسٹال پر مل جاتا ہے۔ نومبر کا شمارہ نظروں کے سامنے ہے۔ نظم و غزل کے علاوہ کہانیاں و مضامین بھی پسند آئے۔ مگر اصغر علی انجینئر صاحب کا فیض احمد فیض کے سلسلہ میں یہ کہنا کہ "فیض کی شاعری میں فکری عظمت کا پہلو نظر نہیں آتا۔" کم سے کم میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں۔ غالبؔ ہوں یا اقبالؔ، ساحرؔ ہوں یا فیضؔ سب اپنے اپنے وقت اور حالات کے ترجمان ہیں۔

میرے لائق کوئی خدمت؟

خیر اندیش: الہلال غزالی۔ دربھنگہ

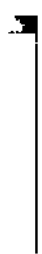

شہزادہ مارکہ
007 مارکہ


SHAHZADA
BRAND
CALCUTTA


SHAHZADA
WASH & WEAR
007
FAST COLOUR







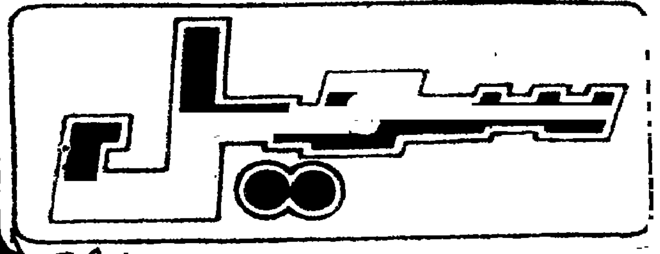


YEAR OF PUBLICATION

SOHAIL MONTHLY River Side Road, Gaya.



اپریل ۸۴ء



ایک شمارہ ڈاکٹر علیم اللہ حالی کے نام

- ملک کے مشہور و معروف ادیب اور مشہور صحافی [illegible] کی [illegible] میں ہوئے قتل کی مذمت میں جمیل منظر سنبھاروی کے قلم سے خصوصی اداریہ [illegible] بھیس میں شیطانی طاقت
- ڈاکٹر علیم اللہ حالی سے ایک ادبی ملاقات — جمیل منظر سنبھاروی
- [illegible]
- [illegible] — ڈاکٹر [illegible]
- علیم اللہ حالی کا تنقیدی نظریہ — ڈاکٹر عاشق ہرگانوی
- علیم اللہ حالی کا فکری آہنگ — ڈاکٹر نسیم احمد ہنوی
- علیم اللہ حالی کی شخصیت پر ملک کی مشہور و معروف ادیبہ قمر جہاں کا بھرپور [illegible] «علیم اللہ حالی یادوں کے آئینہ میں»
- علیم اللہ حالی کی نظمیں — [illegible] قیصر زماں
- شگفتہ لہجے کا شاعر علیم اللہ حالی — زین رامش
- علیم اللہ حالی کی شاعری — [illegible] وارثی اورنگ آبادی
- ملک کے مشہور و معروف نقاد اور افسانہ نگار [illegible] احمد قادری کا علیم اللہ حالی کی کتاب پر بے باک اور بے لاگ تبصرہ
- انتخاب کلام — ڈاکٹر علیم اللہ حالی



قیمت: ۳ روپیے

بانی: مولانا حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنسہاروی ▲ یادگار: مولوی محمد زین العابدین ام سنسہاروی

ترقی پسند ادب کا ترجمان

ماہنامہ سُہیل
گیا

اپریل ۱۹۸۴ء

شمارہ: ۴ ○ جلد: ۴۶

بدلِ اشتراک

فی شمارہ: ـــــــ ۳ روپے
سالانہ: ـــــــ ۱۰ روپے
لائف ممبری: ـــــــ ۱۱۰ روپے

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ: ـــ ماہنامہ سہیل۔ ریور سائڈ روڈ گیا

فہرس

خصوصی اداریہ

رحمانی بھیس میں شیطانی طاقت

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ شرارِ بولہبی سے جب بھی چراغِ مصطفوی ستیزہ کار ہوا ہے تو ظلم کے شعلے ایک بار نئے سرے سے بھڑکے ہیں۔ مذہب جو درسِ انسانیت اور اخوت و مؤانست کا وسیلہ بن کر آیا تھا جنونی اور شیطانی وسوسوں کے زیرِ اثر یہ کام ایسے بیدردی اور عبرت ناک واقعات پیدا کر دیتا ہے کہ انسان کا یقین متزلزل ہونے لگتا ہے ـــــ اصغر علی انجینیر کو کون نہیں جانتا کہ انہوں نے اسلامی نظریہ حیات کی عالمانہ اور بصیرت افروز تعبیرات پیش کی ہیں، انہوں نے اسلامیات کی وقت طلب، تحقیق کے میدان میں اپنی کارگذاریوں سے بیشمار لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ انہوں نے مذہب اسلام کے ان اصولوں کی وضاحت کی ہے جن سے ہماری حیات اجتماعی میں اخلاقی قدریں قائم ہو سکتی ہیں، انہوں نے اسلام کی سادگی، کیفیت، فضاء، مخصوص حالات اور ادوار میں اس کی انطباقی خصوصیات، ایک صالح، متوازن اور پائیدار معاشرہ کی تشکیل میں اس کے اصول اقتصادیات کی ایسی توضیحات پیش کی ہیں جنہوں نے ان بدلتے ہوئے حالات میں مذہبی اقدار کی استقامت کی فضا پیدا کر دی ہے ـــــ لیکن ان کا قصور یہ ہے کہ یہ نسبی حیثیت سے ایسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو مذہب کے نام پر اجارہ داری، استحصال، زر پرستی، تحکم اور جابرانہ رویہ کی قائل ہے، اور یہ خامیاں تو مختلف مذہبی گروہوں میں موجود ہیں۔ اصغر علی انجینیر کا تعلق بوہرہ جماعت سے ہے، گھر کے بھیدی کی طرح وہ اس جماعت کی تنظیم کی اخلاقی اور انسانی خامیوں سے واقف ہیں ـــــ اور اسی لئے اصلاح پسند بوہرہ جماعت کو انکی حمایت حاصل ہے ـــــ سیدنا اور ان کے مریدوں کی جماعت کے افراد آئے دن اصغر علی انجینیر کی اصلاح پسند تحریک کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ یہ مخالفت اگر علمی سطح پر ہو تو گوارہ کی جا سکتی ہے مگر اس جماعت کے ذہنی دیوالیہ پن کی کھلی ہوئی علامت یہ ہے کہ اس نے کئی بار جناب انجینیر پر قاتلانہ حملے کرائے۔ بوہرہ جماعت کی رجعت پرست طاقت نے سوفیصد شیطانی رویہ اختیار کر لیا ہے، اور جہاں جہاں سے ان کے خلاف آواز بلند ہوتی ہے یا جہاں جہاں اصلاح پسندی کی روشنی دکھائی دیتی ہے سیدنا کے افراد اس آواز کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں، اس روشنی کو بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ متعدد افراد پر ظلم کیا گیا، عورتوں کو بے دردی سے پیٹا گیا، اصغر علی انجینیر پر قاتلانہ حملہ تین بار کیا گیا، ابھی ابھی قاہرہ کی مسجد میں گھس کر جناب انجینیر کو سیدنا کے غنڈوں نے

جس سفاکی اور بے رحمی سے زد و کوب کیا وہ جنون اور درندگی کی ایک کریہہ مثال ہے۔ ہر بار حملہ کے خلاف رپورٹ درج کرائی جاتی ہے۔ ہر بار اخبارات داد رسی کرتے ہیں لیکن حکومت کی مشینری خاموش رہتی ہے، اس خاموشی کے پس پردہ کیا راز ہے؟ وہ کون سا سنہرا جادو ہے جو ارباب حکومت کو چپ کر دیتا ہے اور ایسے انسانیت سوز مظالم ڈھانے والوں کے خلاف کوئی اقدام کرنے نہیں دیتا ـــــ یہ سب تو راز کی باتیں ہیں، یہ اور بات ہے کہ یہ راز طشت از بام ہوا جاتا ہے۔

ہم حکومت کے ارباب، عام مسلمانوں اور انصاف پسند بوہروں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ آخر ظلم کے اس سلسلہ کے خلاف وہ کیا کر رہے ہیں، اگر ان مظالم کو نہ روکا گیا اور اس جنون کو قرار واقعی سزا نہ دی گئی تو پھر ایک دن ظلم حد سے سوا ہو جائیگا اور انسانیت کی تمام قدریں تہس نہس ہو جائینگی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مذہب کے نام پر اجارہ داری، استحصال، زرپرستی اور ظلم و جبر کرنے والے ان رہنماؤں کو یہ بتایا جائے کہ ایسے اعمال کا انجام کار کیا ہوتا ہے۔ جب تک اس سیلاب ظلم کو نہ روکا جائیگا اس وقت تک انسانیت، اسلام، صلح و آشتی اور الفت کی کوئی فضا پیدا نہ ہو سکے گی ـــــ

نوو

علیم اللہ حالی ــــــ

جدید اردو شاعروں کی صف میں ایک نمایاں نام ہے علم نو پر
علیم اللہ حالی کے ساتھ نئی نسل کی گمشدگی کی باتیں کی جاتی ہیں،
مگر ــــــ علیم اللہ حالی ــــــ عام روش سے الگ ہٹ
کر، زندگی کی ہمہ جہتی کو صحیح تناظر میں سمجھ کر اپنی تخلیقات
کے ذریعے حقائق کو بے نقاب کرنے والے ایک ایسے فنکار کا نام ہے جس
نے منفی لہروں کے بیچ صالح قدروں کی اہمیت کو سمجھا ہے اور ترقی
پسند رویوں کو محسوس کیا ہے ــــــ ان کی تحریریں ان مسائل
کی جانب بھی اشارہ کرتی ہیں، جہاں افراد کے رشتے ٹوٹتے نہیں
ہیں ــــــ بلکہ آپس میں ایک دوسرے سے منسلک ہو کر
اجتماعی منزلوں کی نشاندھی کرتے ہیں۔

ہمیں اعتراف بھی ہے اور انفعال بھی کہ ہم اس دھالی کی نہایت
اہم فنکار کو جس عزم اور حوصلہ، جس محنت اور جس خلوص کے ساتھ
عقیدت کا نذرانہ پیش کرنا چاہتے تھے، اس طرح نہیں پیش کر سکے۔
ــــــ محدود وسائل کی وجہ سے ہم حسب حوصلہ جب بھی کچھ
کرنا چاہتے ہیں تو ہماری بے بضاعتی ہمارا ہاتھ روک لیتی ہے۔

ہم اس نمبر کی خامیوں کے لئے اپنے قارئین اور علیم اللہ حالی سے
معذرت خواہ ہیں۔

ہمیں قارئین کی رائے کا انتظار رہے گا۔

جمیل منظر سنسہاروی

علیم اللہ حالی سے

ایک ادبی ملاقات

جمیل منظر

ایڈیٹر ماہنامہ سہیل، گیا

ج۔م: آپکی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟ آپ کے آباو اجداد بہار کے کس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں؟ آپکی تعلیم و تربیت کہاں ہوئی؟

ع۔ح: کئی پشتوں سے میرے آباو اجداد ریاست بہار کے ضلع مونگیر کی ایک ہری بھری بستی مشکی پور میں رہتے آئے ہیں۔ مشکی پور اب نئی تقسیم کے بعد کھگڑیا ضلع کا حصہ ہے۔ میرے دادا جان حاجی حافظ قاری اور حکیم تھے۔ ان کا پورا نام سید ابوالصالح عبداللہ تھا وہ اپنے عہد کے مشہور و معروف شاعر بھی تھے۔ اور حافظ مشکی پوری کے نام سے جانے جاتے تھے۔ وہ ایک نواحی علاقہ قادر آباد سے آکر مشکی پور میں بس گئے تھے۔ زمینداری کا دور تھا، اقتصادی خوشحالی تھی۔ اس لئے دادا جان قبلہ ہمہ وقت علمی و ادبی کتب کے مطالعہ اور شعری شاعری میں منہمک تھے۔ میرے والد حضرت سید احمد مرحوم نے زمینداری کے زوال اور خوشحالی کے وداع کو بھانپ لیا تھا۔ اس لئے حصول تعلیم کے جدید نظریوں کے قائل تھے حسب ضرورت حصول تعلیم کے بعد انھوں نے فوج میں ملازمت کرلی۔ ملازمت کے دوران انھیں قسطنطنیہ، مسوپوٹامیہ اور بیرون ملک کے متعدد حصوں میں سفر کرنے کا موقع ملا۔ لیکن دادی جان مرحومہ کے اصرار پر انھیں ملازمت سے استعفٰی دے کر گھر واپس آجانا پڑا۔ انھوں نے کئی طرح کے کاروبار بھی شروع کئے۔ انگریزی کی غیر معمولی صلاحیت کی وجہ سے متعدد زمینداری کے Estates کی پیچیدہ ذمہ داریاں بھی سنبھال لیں۔ اسی سلسلے سے کبھی انہیں بھاگلپور میں رہنا پڑا، کبھی کٹیہار میں اور کبھی پورنیہ میں۔ میری پیدائش بھاگلپور میں ہوئی۔ کٹیہار اور پورنیہ میں تعلیم کا سلسلہ رہا۔ پورنیہ سیٹی اسکول کے بعد ضلع اسکول پورنیہ سے میٹریکولیشن کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن سے کامیاب ہوا۔ آئی اے اور بی اے پورنیہ کالج سے مکمل کیا۔ بی اے میں اردو آنرس میں بھاگلپور یونیورسیٹی میں اول آنے کے علاوہ تمام مضامین میں مجموعی طور پر اوّل آنے کی وجہ سے ۲ طلائی تمغے حاصل کئے۔

ج۔م: کیا آپ کے خاندان میں پہلے سے شاعری کی روایت رہی ہے؟

ع۔ح: میں نے عرض کیا نا کہ دادا جان قبلہ حافظ مشکی پوری
اپنے دور کے معروف شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ میں
ان سے کچھ زیادہ فیض یاب نہیں ہو سکا۔ لیکن
مجھے اتنا یاد ہے کہ وہ اپنی طرف سے چھوٹی چھوٹی
نظمیں بچوں کی بھی لکھ کر دیا کرتے تھے۔ مجھ سے نثری
کہانیاں اور شعری مجموعے پڑھوا کر سنتے تھے۔ میری
والدہ کو بھی شعر و سخن کا ذوق تھا اور کبھی کبھار کچھ
اشعار کہہ لیا کرتی تھیں۔ میرے نام کے ساتھ دادا
جان نے میری پیدائش کے بعد تخلص جوڑ کر گویا یہ
پیشین گوئی کر دی تھی کہ مجھے شاعری کرنی ہے۔

ج۔م: خاندانی شعری ماحول اور روایت کے علاوہ وہ
کیا مخصوص واقعات و حادثات ہیں جو آپ
کی شاعری کے لئے محرک ہوئے؟

ع۔ح: یہ سوال میرے لئے حد درجہ پریشان کن ہے۔
شاعری کی تحریک جن واقعات و حادثات سے
ہوتی ہے وہ بسا اوقات نجی ہوتے ہیں۔ خارجی
طور پر ان کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہوتی لیکن
حساس اور باشعور فرد کے لئے یہ بالکل ذاتی
باتیں جو عام نگاہوں میں کتنی ہی غیر اہم ہوں
اپنی جگہ پر اہمیت رکھتی ہیں۔ حادثاتِ دیدہ
دل کا ایک سلسلہ داخلی شعری جذبوں کو ابھارنے
اور اظہار کرنے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ اب
ان کردہ و ناکردہ گناہوں (جن کو گناہ کہتے
ہوئے اب بھی ارتکابِ جرم کا احساس ہوتا ہے)
کی یاد کیوں دلاتے ہیں۔ انہیں میرے ساتھ دفن
ہونے دیجئے۔ کچھ اور پوچھئے!

ج۔م: آپ نے کن اساتذہ سے مشورۂ سخن لیا ہے؟

ع۔ح: استادی اور شاگردی کی قدیم روش کی طرح
میں نے باقاعدہ کسی کو اپنا کلام دکھلا کر اصلاحات
تو نہیں لیں لیکن اسکول میں طالب علمی کے زمانہ
میں جناب وفا ملک پوری کے ذوقِ شعری نے مجھے
حد درجہ متاثر کیا۔ وہ خوش گو و خوش گلو شاعر ہیں۔
اسکول کے زمانہ سے مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔
میرے شعری ذوق کو بروئے کار لانے میں انکا اثر
سب سے زیادہ ہے۔ جب پٹنہ یونیورسیٹی میں ایم۔اے
کی تعلیم حاصل کر رہا تھا تو استادی علامہ جمیل
مظہری کو چند تخلیقات بطور اصلاح دی تھیں۔
مگر میں نے یہ محسوس کر لیا کہ ان کے اندازِ فکر اور اسلوب
اظہار کو میرا رجحانِ طبع قائم نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا پہلی
بار کے بعد میں نے یہ جسارت ہی نہیں کی۔

ج۔م: ترقی پسند ادبی تحریک کے بارے میں آپ کا کیا تاثر
ہے؟

ع۔ح: جب میں نے شعری و تخلیقی شعور سنبھالا تو ترقی پسند
تحریک ڈھلان سے نیچے اتر رہی تھی۔ لیکن اس
تحریک کے اہدازِ یں کو کچھ زیادہ وقت نہیں گذرا
تھا اس لئے ادبی فضا تب بھی اس تحریک کی آنچ
سے گرم تھی۔
ترقی پسند ادبی تحریک کے کارنامے اب بھی روشن
ہیں۔ اس تحریک کے تحت جو تخلیقات اور نگارشات
سامنے آئی ہیں۔ وہ معیار و مقدار دونوں اعتبار

سے قابلِ رشک ہے۔ لیکن ادوارِ ماقبل کی طرح اس تحریک
کے تحت بھی ایسی تخلیقات پیش ہوئی ہیں جو فیشن
اور فارم کے تحت آتی ہیں۔ ترقی پسند تحریک فطری
تبدیلیوں کے طفیل سامنے آئی تھی۔ سماجی، تہذیبی
اقتصادی، علمی اور سائنسی تغیرات اور ترقیات
نے حقائق کی دریافت کے نئے زاویے پیدا
کر دیئے تھے۔ لیکن جن لوگوں نے ترقی اور تبدیلی
کے لامتناہی تسلسل کو نہیں سمجھا انھوں نے اس
تحریک کو چند مقاصد میں محدود کر دیا تھا۔ نئے
حالات اور نئے موضوعات پیدا کرتے ہیں۔ انسانی
معاشرہ جس قدر پھیلتا جائے گا اسی قدر اس
میں موضوعات کا تنوع ہوگا۔ سماج سے ادب کا رشتہ
اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب ہم سماج کی
تبدیلیوں کا برابر ساتھ دیتے ہیں۔ اسی لئے میں
ترقی پسندی کے مہر بند تصور کا قائل نہیں۔

ج۔م: کیا ترقی پسند ادب کے نظریات آپکو مطمئن کرتے
ہیں؟

ع۔ح: ترقی پسندی ایک ایسا نظریہ ہے جو ہر اس ادیب
و شاعر کو محبوب ہونا چاہیئے جو زندگی اور ادب
کے رشتہ کو سمجھتا ہے، جو زندگی کی تبدیلیوں اور
ترقیوں پر یقین رکھتا ہے۔ جو ادب کو انسان کا
سچے واردات اور واقعات کا پرتو مانتا ہے۔
ترقی پسندی کے نظریے کا نفاذ جامد و ساکت
اور ٹھہرے اور ٹھٹھرے ہوئے اصول کا ریا موضوع
[illegible] معاشرہ [illegible] ادب کا رشتہ

ابھرا نہیں ہوتا۔
کچھ رشتے براہِ راست ہوتے ہیں، کچھ بالواسطہ
کچھ رشتے متعین اور متشکل ہوتے ہیں اور کچھ حد درجہ
لطیف۔ زندگی سے ہمیں یہ سارے رابطے قائم
رکھنے ہوں گے۔ اور اسی کو صحیح معنوں میں ترقی پسند
نظریہ کہا جا سکتا ہے۔

ج۔م: جدیدیت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ع۔ح: جدیدیت کو میں ترقی پسندی کا ضمیمہ سمجھتا ہوں
یہ کام تو در اصل ترقی پسندی کا ہے کہ وہ ہمیں
انسانی معاشرہ کی بوقلمونی، ہر آن ہونے والی تبدیلی
اور خارجی و داخلی پہلوؤں کا مکمل عرفان بخش دے
لیکن جدیدیت ان لطیف داخلی کیفیات کی
آگہی دینے کی کوشش کرتی ہے جو زیادہ تر پیچیدہ
عمل اور رد عمل کے نتیجے میں محسوس ہوتی ہیں۔ یہ تو کام

بھی ترقی پسندی کے دائرۂ کار میں ہونا چاہیے۔ اگر جدیدیت محض ٹھہراؤ، تنہائی کی بات کرتی ہے، جماعت اور فرد کے رشتے کی نئی جہتیں تلاش کرتی ہے۔ نئے صنعتی نظام اور شہر کاری کے نتائج پر غور کرتی ہے۔ اور پرانے ہیولوں کو نئی شکلوں میں دیکھتی ہے ——— تو پھر یہ سارے کام ترقی پسندانہ ہیں اور کسی ترقی پسند کو ان مسائل اور مباحث سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اگر جدیدیت محض ایک ردِّ عمل ہے ترقی پسندی کا تو پھر اس کے منفی اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جس طرح ترقی پسند تحریک کو سمجھنے اور سمجھانے میں غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں یا کچھ لوگوں نے چند مخصوص انسانی مسائل کی پیش کش کو ہی ترقی پسندی سمجھ لیا ——— ٹھیک اسی طرح اس کی ضد میں "جدیدیت" کو بھی دوستوں اور دشمنوں نے مسخ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ سچی جدیدیت یا سنجیدہ جدیدیت کو میں ترقی پسندی کی کاٹ قرار نہیں دیتا۔ لیکن اس کو کیا کیجیے گا کہ اپنی الگ IDENTITY بنانے کی دھن میں بہت سے جدیدیوں نے اپنے ناک نقشے تک بگاڑ لئے ہیں۔ انھوں نے جدیدیت کے مظاہرے میں ایسی غیر فنکارانہ روش اپنائی کہ توبہ ہی بھلی۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایسی سطحی جدیدیت خود بخود دم توڑ دیتی ہے اور دیکھتے دیکھتے صالح اور فکر انگیز جدیدیت سامنے آ رہی ہے جو ترقی پسندی سے آگے بڑھ کر گلے مل رہی ہے۔

ح م: کیا جدیدیت کا رجحان زندہ رہ سکتا ہے؟

غ ح: رجحانات خارجی حالات کی پیداوار ہیں اور ہم آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ حالات کبھی ایک جیسے نہیں رہتے۔ دریائے حیات میں ہر آن نئے تموجات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ان کے اثر سے زندگی کے تمام شعبوں اور ہمارے عمل اور ردِّ عمل کے تمام نقوش پر نئی لہریں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ یہ عمل متواتر اور مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ لیکن بسا اوقات تغیرات کی لہریں اتنی خفیف ہوتی ہیں کہ ان کا مشاہدہ دشوار ہو جاتا ہے۔ جدیدیت کا رجحان آزادی کے بعد کے نئے معاشرتی، سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی و تہذیبی تغیرات کی دین ہے۔ نئے صنعتی نظام کی آمد، شہر کاری، قدیم روایات کے مقابلے میں نئی روایات کا جنم، آبادی کی کثرت، دیہی اور فطری زندگی سے ہماری دوری، اقتصادی کشاکش، زندگی کے معمولی مسائل کے لئے بے پناہ تگ و دو، بیروزگاری اور مستقبل کی طرف سے بے اطمینانی۔ غرض بہت سے عوامل ہیں جو آزادی کے بعد زیادہ نمایاں ہو کر ہماری حیاتِ اجتماعی پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ عالمی مسائل اور مختلف ممالک کے مابین سرحدی کشاکش، نئے اسلحوں کی ایجاد اور ان کی پیداوار و تقسیم نے ایسے حالات پیدا کر دیے جن کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تغیرات کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جائے گی۔

ایسے حالات میں رجحان میں تبدیلی کا پیدا ہونا فطری بات ہے۔ رجحانات اپنی تبدیلیوں اور تغیرات کے ساتھ زندہ رہتے ہیں۔ جس شے کو آپ جدید یا نیا رجحان کہتے ہیں یہ بھی دراصل ماقبل کے رجحانات کی بدلی ہوئی شکل ہے۔

ج۔م: آپ نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی لکھی ہیں، کیا آپ ان دونوں میں یکساں طور پر اپنی تخلیقیت کا اظہار کر سکے ہیں؟

ع۔ح: یہ فیصلہ تو قارئین کریں گے کہ میں نے کس صنفِ ادب میں اپنی بہتر تخلیقیت کا اظہار کیا ہے۔ ویسے تخلیقی عمل کے دوران میں نے اکثر یہ محسوس کیا ہے کہ غزل ہماری سابقہ تہذیبی روایات سے گہرے طور پر وابستہ ہے۔ اس میں غیر محسوس طور پر بھی ان موضوعات کی پیشکش ہو جاتی ہے جن کا تعلق ہماری روایات سے ہے۔ غزل تو ایک مخصوص مشرقی کلچر کی روشنی میں پڑھا جانا چاہیئے اور اسی طرح اس کے جوہر کھل کر سامنے آ سکتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ غالب نے ایک جگہ یہ کہا ہے کہ ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

غالب نے اس کے باوجود غزل میں نئے امکانات پیدا کئے ہیں۔ غزل میں لفظے

اشعار کی تخلیق کے لئے نہایت لطیف صناعی درکار ہے۔ اس کے علاوہ اردو شعرا نے جب سے لیکر آج تک میدانِ سخن میں اتنی محنت اور عرق ریزی، لطافت و نزاکت اور رفعت و وسعت کا مظاہرہ کیا ہے کہ کبھی کبھی میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ یہ صنف ایک Saturation point تک پہنچ چکی ہے۔ بایں ہمہ ہنوز غزل میں دلکش

اور منفرد اشعار پیدا ہوجاتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً
یہ ہے کہ غزل کے اشعار میں لہجہ اور الفاظ کی تہہ داری
اور نیرنگی کی کئی معنوی جہت پیدا ہوتی ہے۔ اور
اس تہہ داری اور نیرنگی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔
غزل اور محبوب کی خصوصیات ملتی جلتی ہیں۔ کسی
نے کہا ہے کہ " بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست"
محبوب کی کون کون سی ادا اپنی طرف کھینچتی ہے
اس کا تجزیہ ممکن نہیں اور یہ کہ کون سی ادا کس
وقت کس عالم میں پہونچا دیتی ہے اسے محسوس کیا
جا سکتا ہے بتایا نہیں جا سکتا۔ غزل کے حسن
کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہے ؎

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

غزل کا یہ حسن لمحہ دو لمحہ کے لئے ہمیں تعجب کی منزل
سے گذار کر ایک سرمدی مسرت کی طرف لے جاتا ہے۔ غزل
کے اشعار میں نظم کے مقابلہ میں اثر خیزی کی رفتار
حد درجہ تیزی ہوتی ہے۔ نظم ذرا ٹھہر کر تھوڑے سے
وقفے کے بعد تاثرات کی دنیا تک پہونچاتی ہے۔ نظم
و غزل کے تاثرات کے عرفان کا مسئلہ قاری کے ذوق
و رجحان سے جڑا ہوا ہے۔ بہر کیف! میں اپنے
بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نظم لکھتے وقت
زیادہ دلچسپی، انہماک اور دریافت کی منزل
میں رہتا ہوں۔

ج م: صنفی حیثیت سے غزل اور نظم میں آپ کس صنف کو
شعری اظہار کے لئے بہتر سمجھتے ہیں؟

ع۔ح: ابھی ابھی آپ کے گذشتہ سوال کے جواب میں
نے جو باتیں عرض کی ہیں۔ اُن سے آپ کے اس سوال
کا جواب مترشح ہو جاتا ہے۔ یہ معاملہ تو شاعر کے
ذوق و رجحان کا ہے کہ وہ کس صنف میں اپنے
محسوسات و مشاہدات کا اظہار کرتا ہے۔ اگر آپ
ذوق و غالب اور آتش و آرزو سے نظم گوئی کے
طالب ہوں یا انیس، جوش اور اختر شیرانی و
نازش پرتاپ گڑھی سے غزلوں کے طلب گار
ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک زبردستی کی بات
ہوگی۔ غزل ایجاز و اختصار اور علامت و
اشارت کا فن ہے۔ اس کے مقابلہ میں نظم میں
اظہار کی وسعت، تفصیل اور مشاہدہ کی ترتیب
کے جوہر ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں ان دونوں اصناف
سخن میں اعلیٰ فنی نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ غزل کی
صنف کا تعلق براہِ راست فارسی شاعری سے
ہے۔ آج جب ہم اردو شعر و ادب کو عالمی ادب
کے سامنے رکھ دیتے ہیں تو صنفِ غزل کچھ اجنبی
سی معلوم ہوتی ہے۔ جب ہم دوسری ترقی یافتہ
زبانوں میں لکھے گئے مشہور رزمیوں یا عظیم شعری
کارناموں کے مقابلے میں اردو شاعری کے سرمایہ کو
دیکھتے ہیں تو اکثر و بیشتر اپنی بے بضاعتی کا احساس
ہونے لگتا ہے۔ بعض حضرات غزل کو موردِ الزام
قرار دیتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ اردو میں غزل
کی مقبولیت نے ہمیں عظیم شعری کارناموں کی
تخلیق کی طرف متوجہ ہونے نہیں دیا، لیکن

مسئلہ کو اس طرح Simplify کرکے حقیقت
تک نہیں پہونچا سکتا۔ اردو دوسری ترقی یافتہ
زبانوں کے مقابلہ میں ابھی کم عمر ہے، پھر یہ ہے کہ
کس زبان میں پیش کردہ تخلیقات کو اس اجتماعی
مزاج، جغرافیائی عوامل اور تاریخی نشیب و فراز کو
الگ کرکے دیکھا نہیں جا سکتا جن کے تحت اس
زبان کے استعمال کرنے والوں کا ایک مخصوص
تہذیبی مزاج مرتب ہوتا ہے۔ ان سبھوں کے
بعد لیکن سب سے اہم یہ امر ہے کہ کیا خود غزل میں
حسن اور عظمت کی دو چند صفات موجود نہیں
ہیں۔ شعر و ادب کا اعلیٰ ترین مقصد و منصب یہ
ہے کہ ہم انسانی نفسیات کے گوناگوں اور متنوع
راستوں سے ہوکر فلسفۂ حیات کی گہرائیوں میں اتر
سکیں۔ کیا غزل کے بہترین نمونے اس سفر میں
ہماری رہنمائی نہیں کرتے؟ بہر کیف! یہ ایک لمبی
بحث ہے، اس میں ابھی ہم لوگ نہ الجھیں تو اچھا
ہے۔

ج م: جدید دور میں اردو غزل میں ایک نئی آواز ابھری
ہے اور یہ بڑی دلکش ہے۔ اس کے بارے میں آپکا
کیا خیال ہے؟

ع ح: اس سے کس کافر کو انکار ہو سکتا ہے کہ دورِ جدید
کی غزلوں میں موضوعات اور لب و لہجہ کے لحاظ سے
تنوع، وسعت، اور دلکشی کے عناصر پیدا ہو گئے ہیں۔
غزل کے اس احیائی دور کا آغاز ناصر کاظمی کی شاعری
سے ہوتا ہے۔ آج غزل عصری احساسات کی بہترین
ترجمان بن چکی ہے۔ نئے علائم و اشارات نے
غزل میں تازگی اور شگفتگی پیدا کر دی۔ اس طرح
اس صنف میں نئے امکانات ابھر کر سامنے آتے
ہیں۔ غزل کا مستقبل زیادہ روشن اور تابناک
ہو گیا ہے۔

ج م: اور ہاں آزاد غزل کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات
ہیں؟

ع ح: یہ سوال میرے لئے حد درجہ پریشان کن ہے۔ میں
اب تک آزاد غزل کے سلسلہ میں خاموش ہی رہنا
چاہتا تھا لیکن آپ نے یہ بحث چھیڑ دی ہے تو میں اظہار
خیال کے لئے مجبور ہو گیا ہوں۔ صنفِ غزل کو ایک
مخصوص معاشرتی پس منظر (جسے آپ مشرقی ماحول
کا پس منظر بھی کہہ سکتے ہیں) میں دیکھنا اور سمجھنا ہوگا۔
غزل اپنی ہیئت، غنائی خصوصیت، الفاظ و تراکیب
اور تلمیحات و اشارات کے لحاظ سے اپنے ماضی
قریب ہی نہیں ماضی بعید سے جڑی ہوئی ہے۔ نئے
حالات و مسائل کی پیش کش کے مواقع پر بھی
غزل ماضی سے اپنا رشتہ نہیں توڑتی۔ غزل کا صوتی
نظام، الفاظ و تراکیب سے اوپر اٹھ کر خود تفہیم و آگہی
کی ایک کائنات پیدا کرتا ہے ـــــ یہ وابستہ
ہے اس جمالیاتی کائنات سے جو کسی تہذیب کا
ورثہ ہوتی ہے۔ آزاد غزل کی تحریک اس جمالیاتی
کائنات، صوتی آہنگ اور غنائی نظام کی
شکست کی کوشش ہے جس سے اردو غزل
کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ آزاد غزل

اپنے اچھے اثرات پیدا نہیں کرسکی ہے۔ اور اب تک ہمارے عام غزل گو حضرات کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرپائی ہے۔ گذشتہ پندرہ برسوں میں شعر و ادب میں موضوعاتی اور ہیئتی تجربات کا سلسلہ تیز تر ہوگیا ہے۔ تجربہ جب تک تجربہ کی منزل میں ہو خام صورتحال میں ہوتا ہے۔ آزاد غزل کا تجربہ کرنے والوں کو مخالف آوازوں کے ذریعے دبانا مناسب نہیں' جو لوگ اس تحریک میں پیش پیش ہیں ان پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس صنف میں ایسے نئے نمونے سامنے لائیں جو قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرسکیں۔

ع۔م: اردو افسانہ نگاری کی جدید روش آپ کو کس حد تک مطمئن کرتی ہے؟

ع۔ح: جدیدیت کو فیشن کے طور پر اپنانے والے لوگوں نے کہانی کے نام پر ایسی محیر العقول تحریریں پیش کی ہیں کہ انھیں کہانی کہتے ہوئے ایک جرم کا احساس ہوتا ہے۔ مہمل' ژولیدہ اور غیر دلکش نیز بے ربط واقعات اور انداز تحریر کے ذریعے گذشتہ دس پندرہ برسوں میں کہانی کی صنف کو مسخ کرنے کی سازش اب بے نقاب ہوچکی ہے قارئین نے ایسی تحریروں کو کوڑے دان میں پھینک دیا ہے اور ایسی تحریروں کا سلسلہ کم ہو رہا ہے جن میں عصری زندگی کے تلخ و شیریں کا انعکاس ہو' ہمارے افسانہ نگاروں نے قاری سے دوبارہ رشتہ جوڑنا شروع کردیا ہے۔ اور زندگی اور ادب کی معنویت کا نیا مفہوم سمجھ میں آنے لگا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے تحت افسانہ نگاری کی متعدد خوبصورت مثالیں سامنے آچکی تھیں۔ افسانہ کے فن کو پریم چند نے زندگی کے مسائل سے قریب کردیا تھا۔ پریم چند ایک مخصوص نقطۂ نظر کے مالک تھے۔ ان کی ترقی پسندی ایک مخصوص ڈھانچے اور دائرہ میں کام کررہی تھی لیکن یہ بات طے ہے کہ انھوں نے اس عہد کی تبدیلیوں اور نئی تغیرات کو فن کا روپ بخشنے کی کوشش کی۔ پریم چند کی پیروی میں جن افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ انھوں نے خارجی ماحول کی پیشکش پر زور دیا۔ لیکن اندھی تقلید یا تقلید محض سے اچھی تخلیقات سامنے نہیں آسکتیں۔ چنانچہ پریم چند کی روایت کو جیسے تیسے ڈھونے والوں نے کردار' واقعات' ماحول اور نتائج کے اعتبار سے تو اپنی کہانیوں کو پریم چند کی کہانیوں کے ڈھانچے پر ڈھال لیا۔ مگر یہ بھول گئے کہ اس روایت کی روح دراصل یہ تھی کہ ہم اپنے عہد کو سمجھیں اور اپنے فن کو تعمیری' فکری اور فلسفیانہ سطح تک پہونچائیں۔ انہی ترقی پسندی کے چکر میں پڑکر جدید افسانہ نگاروں نے موضوع اور اسلوب دونوں منزلوں میں فریب کھانے اور فریب دینے کی روش اپنالی ہے۔ میں منٹو کو جدید افسانہ نگاروں کا سرخیل سمجھتا ہوں۔ منٹو کی بیشتر کہانیاں اوسط معیار سے اوپر نہیں اٹھ سکیں۔ نفسیات' خصوصاً نفسیات جنس کے موضوع پر منٹو کی کہانیاں بھی میری نگاہ میں اونچے ادبی مرتبہ کی حامل نہیں ہیں۔ منٹو کی نفسیاتی

کہانیاں اس کی اپنی بگڑی ہوئی نفسیات کی
پہچان دیتی ہیں۔ میں منٹو کو افسانہ نگار سے
بہتر خاکہ نگار سمجھتا ہوں۔ خاکہ نگاری میں بلاشبہ
منٹو نے اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ جدیدیت
کے جراثیم کو پھیلانے میں احمد ہمیش کی "مکھی"
کو خاص طور پر دخل ہے۔ اس کے اتباع میں
افسانہ کے نام پر لایعنی، ژولیدہ، غیر دلکش،
اور مضحکہ خیز تحریریں پیش کرنے والے افراد
کو اب کوئی اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ یہ شعبدہ
بازی زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی تھی۔
افسانہ نگاری کی یہ روش اپنی پیدائش کے
وقت ہی مر چکی تھی۔ جدیدیت کے ایسے کھوکھلے
ذہن کے متوالے چونکہ بیان دونوں حیثیتوں سے
دیوالیہ تھے۔ دیکھتے دیکھتے چند برسوں میں نقش
نگار طاق نسیاں ہو گئے ہے

اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

ج.م: آپ کے خیال میں شاعری اور نثر میں کیا فرق ہے؟

ع.ح: شاعری اور نثر کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے
آپ نثر کی اعلیٰ ترین قسم یعنی ادبی یا تخلیقی نثر
کا تصور سامنے رکھئے۔ اسی طرح شاعری کو بھی
محض ہیئت تک محدود نہ کیجئے بلکہ اعلیٰ شعری
نمونے پیش نظر رکھئے۔ تخلیقی نثر اور شاعری
ان دونوں کے ذریعے تاثرات کا اظہار ہوتا ہے۔
شعری و نثری ہیئتوں کا روایتی فرق تو ہمیشہ
برقرار رہا ہے مگر اس امتیاز کو مٹایا نہیں
جا سکتا کہ شاعری میں لفظوں کا استعمال ایک
مخصوص آہنگ پیدا کرتا ہے۔ اس میں الفاظ
معنوی استعمال سے آگے بڑھ کر صوتی لہریں بناتے
ہیں۔ یہ صوتی نظام اور اتار چڑھاؤ شاعری
میں الفاظ کو متحرک بنا دیتا ہے۔ نثر میں یہ بات
پیدا نہیں ہو سکتی۔ نثری تخلیق بنیادی طور پر
بیانیہ ہوتی ہے۔ شاعری کا بھی ایک عنصر بیانیہ
ہوتا ہے۔ لیکن اس بیان میں علائم و اشارات
اور مخصوص لفظی کی خصوصیات اسے ممتاز بنا دیتی ہیں۔
آپ تو یہ جانتے ہیں کہ بہترین الفاظ کا استعمال
نثر (ادبی نثر) ہے اور بہترین الفاظ کا بہترین
استعمال شاعری ہے۔ یہ بات ایک قول کے طور
پر کہی گئی ہے۔ اس میں ایجاز و اختصار سے کام لیا
گیا ہے لیکن جب آپ اس غیر واضح قول کی تشریح
کریں گے تو "بہترین استعمال" کے ضمن میں وہ
ساری باتیں آجائیں گی جن کا ذکر میں نے
کیا ہے۔ اس کے علاوہ شعری اظہار میں فن کار
ایک معنوی خلیج پیدا کرتا ہے۔ قاری پر یہ ذمہ
داری ہوتی ہے کہ وہ اس معنوی خلیج کو پر کر لے
اور فن کار کے ذہن تک رسائی حاصل کر لے۔
اسی لئے شاعری کا قاری زیادہ ذہین اور
زیادہ حساس ہونا چاہیئے۔ شاعری اشارات
و علامات کی زبان میں جذبات و محسوسات
کی پیش کش کا نام ہے۔ اسی لئے ایلیٹ نے
ایک جگہ کہا ہے کہ:

we realise that poetry has primarily to do with the expression of feeling and emotion.

نثری شاعری کے مقابلے میں ٹھوس اور متعین
موضوعات پیش کرتی ہے، شاعری ہمیں ایک
ایسی دنیا میں لے جاتی ہے جہاں آس پاس
ایک غیر واضح دھند کی فضا ہوتی ہے۔ اس نیم
تاریک مگر مسحور کن فضا میں بہت دور موضوع
کا چراغ ٹمٹماتا رہتا ہے۔ اس کی نیم روشن
اور دھندلی شعاعیں چھن چھن کر ہمارے شعور
میں داخل ہوتی ہیں۔ ایلیٹ نے شیکسپیئر کی
منظومات کے سلسلے میں ایک جگہ لکھا ہے
کہ ان میں کوئی معنویت نہیں ہے۔ لیکن یہ کہنا
بھی بے معنی سی بات ہوگی کہ اس کی یہ منظومات
بے معنی ہیں۔ دراصل شاعری میں معنویت اور
بے معنویت میں واضح خط امتیاز نہیں کھینچا
جا سکتا ہے۔

ج م: بہار کے ادیب اور شاعر آج ہندوستان کے دوسرے
علاقوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر تخلیقات پیش
کر رہے ہیں۔ آپ کا خیال کیا ہے؟

ع ح ع: میں شعر و ادب کو صوبائی خانوں میں تقسیم
کرنے کا قائل نہیں۔ یو پی، دلی، پنجاب، بہار
بنگال، مہاراشٹر، کرناٹک، تامل ناڈو، اڑیسہ
اور کشمیر ہر جگہ ادبی سرگرمی موجود ہے۔ اچھے
اور خراب فن کار بھی ہر جگہ موجود ہیں، ہاں
یہ ضرور ہے کہ کسی خاص ریاست میں اردو کا
چلن زیادہ ہے تو وہاں تخلیق کار بھی تعداد میں
نسبتاً زیادہ ہیں۔ بہار کے مختلف علاقوں
میں اردو پڑھنے لکھنے والوں کی اچھی خاصی تعداد
رہی ہے۔ ریاستی حکومت کی لسانی پالیسی نے
بھی بہار میں اردو زبان کو ان زیادتیوں
سے بچائے رکھا ہے جو چند دوسری ریاستوں
میں نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں
اردو والے اس حد تک دبے دبے اور سہمے
سہمے نظر نہیں آتے۔ جہاں تک تخلیقی معیار کا
معاملہ ہے تو مجھے بہار میں کوئی امتیاز نظر
نہیں آتا۔ میں اردو کے مسئلہ میں صوبائیت
کا سخت مخالف ہوں۔ بہاریت، پنجابیت
دہلویت اور لکھنویت وغیرہ جیسے لفظوں
سے گھن آتی ہے۔ آج سے بہت قبل جب
اردو زبان ترقی کی ابتدائی منزلوں میں تھی تو
مختلف علاقوں کی زبان پر مقامیت کا اثر تھا،
رفتہ رفتہ یہ اثر زائل ہوتا گیا اور اب
ایک معیاری زبان ہر جگہ جاری و ساری ہے۔
پڑھا لکھا طبقہ مقامی اثرات سے آزاد ہو کر
گفتگو کرتا ہے اور فن کار اپنی تخلیقات بھی
اسی زبان میں پیش کرتے ہیں۔ بہار میں کچھ
لوگوں کو مقامی لہجہ اور لفظیات سے محبت ہے،
اور وہ شاہراہِ عام سے ہٹ کر اپنے مقامی

الفاظ کے رواج پر زور دیتے ہیں۔ میں سمجھتا
ہوں اس سلسلے میں زور زبردستی کی کوئی ضرورت
نہیں ہے۔ زبان میں اثر و نفوذ کا فطری عمل
ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اسے کوئی روک نہیں
سکتا۔ سچ پوچھئے تو میں شاعری میں دبستانِ
عظیم آباد یا دبستانِ بہار کی اصطلاح کو
بھی نامناسب سمجھتا ہوں۔

ہمارے یہاں ایم۔اے اُردو کے نصاب میں
"دبستانِ بہار کی شاعری" ایک خصوصی پرچہ
کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ یہ ایک بیکار
سی بات ہے۔ بہار کے اہم ترین شعرا ادبا
تو پوری اُردو دُنیا میں مقبول و محترم ہیں،
کچھ اہلِ قلم جنھیں کسی وجہ سے بہار کے باہر
پذیرائی نہیں مل سکی۔ انھیں ہم شاعری کے
عام پرچوں میں پڑھا سکتے ہیں اور ان کی تصنیفات
کو شاملِ نصاب کر سکتے ہیں۔ دبستان کے
لئے جس علاحدہ مزاجِ سخن کی ضرورت ہے
وہ شعرائے بہار میں پہلے بھی نہیں تھا۔ اس غلط
روش کو کوئی روکتا ہی نہیں۔

ع۔م: پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب کا تو انتقال
ہو چکا ہے۔ غزل کے سلسلے میں ان کی رائے کا
چرچا ہوتا رہا ہے، آپ ان سے کس حد تک
متفق ہیں؟

ع۔ح: غزل کے سلسلہ میں کلیم صاحب نے جن خیالات کا اظہار
کیا ہے وہ نئے نہیں، ان سے پہلے بھی غزل کے
بارے میں بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا ہے اور
کہیں نرم اور تعمیری لہجہ میں اور کہیں تیز و تند
انداز میں غزل سے بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے۔
کلیم صاحب نے انہیں خیالات کی توسیع کی ہے
اور انہیں علمی رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔
لیکن غزل کے توسط سے الطاف حسین حالی نے
جو باتیں کہی ہیں ان میں سنجیدگی بھی ہے اور
گہرائی بھی۔ کلیم صاحب ان سے آگے نہیں بڑھ
سکے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ غزل میں ہم اپنے وسیع
تجربات اور ہمہ گیر مشاہدات کو ربط کے ساتھ
پیش نہیں کر سکتے۔ لیکن اس مقصد کے لئے
تو ہمارے یہاں دوسری اصنافِ سخن موجود
ہیں۔ زندگی کے عمیق محسوسات جو ہمیں آن
واحد میں بھرپور طور پر متاثر کر دیتے ہیں،
غزل کے اشعار کی بنیاد ہیں، بسا اوقات ایک
مشاہدہ، تجربہ، تاثر یا احساس ایک ساعت
کے لئے شعلہ کی طرح پیدا ہوتا ہے اور ہمیں مضطرب
کر دیتا ہے، اگر غزل کا فارم نہ ہو تو ہم اسے
کیوں کر پیش کر سکتے ہیں، اب کہ غزل کا عرفان
دوسری زبانوں کے فنکاروں کو بھی ہو چکا
ہے۔ ان زبانوں میں بھی غزل نگاری کی
کوششیں کی جا رہی ہیں چنانچہ ہندی میں
متعدد غزل گو پیدا ہو چکے ہیں۔ چند سال
پہلے دشینت کمار کی غزلیں پڑھنے کا
موقع ملا تھا۔ ان میں نئی تازگی ہے مگر

غزل کی روح وہاں موجود ہے۔ انگریزی میں بھی
غزلیں لکھی جارہی ہیں۔ بایں ہمہ اس امر سے
انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شاعری کے ذریعے
جس گہرے، بسیط اور ہمہ گیر فلسفے تک ہمیں
رسائی حاصل کرنی ہے اس میں نظم خصوصاً
طویل تر نظم ہی ہماری بہتر رہنمائی کرسکتی ہے۔

ج۔م: اچھا یہ بتایئے کہ بہار میں اُردو زبان کو دی
گئیں مراعات سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

ع۔ح: اُردو کی بیچارگی کا اب یہ عالم ہے کہ ہم حقوق
کو مراعات کا نام دے رہے ہیں۔ جو کچھ ہم
سے چھین لیا گیا ہے ہم اس کی بازیافت
کرنا چاہتے ہیں۔ اب تک ہمارا حق ہمیں نہیں
مل سکا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ حکومتِ بہار
نے گذشتہ چند برسوں میں اُردو کے ساتھ نرم
رویہ اپنایا ہے لیکن آپ مسائل کا صحیح طور
پر جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ کام غلط
ڈھنگ سے ہورہا ہے۔ اُردو کو چند اضلاع
میں ثانوی زبان کا درجہ دیکر بس یہی تو
کیا گیا ہے کہ کچھ مترجمین، نائب مترجمین اور
کچھ ٹائپسٹ مقرر کردیئے گئے ہیں۔ اور کیا
ہوا ہے؟ بہار میں اُردو میڈیم سے
تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کی دشواریاں
ہنوز باقی ہیں۔ ٹکسٹ بک پبلیکیشنز کے ذریعے
دیر یا سویر سے اُردو کتابیں ترجمہ کرکے شائع
کو کردی جاتی ہیں لیکن کیا یہ بھی غور کیا گیا کہ
ان کتابوں کو خریدنے والوں اور پڑھنے
والوں کو کچھ فائدہ بھی ہوتا ہے۔ ایسے طلبا کے
لئے امتحانات کے سوالات بھی اُردو میں ہونے
چاہئیں۔ یہ نہیں ہوتا تو پھر طلبا اُردو کا رخ
کیوں کریں؟ اسکولوں میں ذریعہ تعلیم
ہندی، اور وہ بھی ٹھیٹھ ہندی، کتابوں کا
ترجمہ اُردو میں، سوالات ہندی میں،
اب آپ فرمایئے لڑکے ایسی کتابوں میں سر
کیوں کھپائیں گے؟ کیا اُردو کو مہلت
صرف چند اضلاع میں غلط انداز سے
سرکاری زبان کے طور پر اعلان کردینے سے
مل سکتی ہے؟ کیا حکومت یہ نہیں کرسکتی کہ
مختلف سرکاری اسامیوں کے لئے بھی بعض شعبہ جات
میں اُردو جاننے والوں کو اولیت دے۔
گورنمنٹ لائبریریز، رجسٹریشن ڈیپارٹمنٹ،
پی آر ڈی اور دوسرے شعبوں میں تو اس
کا نفاذ فوراً ہونا چاہیئے تھا، مگر یہ نہیں
ہوا ہے، اور نہ کوئی کرنا چاہتا ہے۔

خجلتِ تقصیر

علیم اللہ حالی
صدر شعبۂ اردو گیا کالج۔ گیا

غالب نے بڑی جوانمردی اور جرأت کے ساتھ زندگی کی ایک بڑی حقیقت کا اظہار یوں کیا ہے

> جب کرم رخصتِ گستاخی و بیباکی دے
> کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

مجھے غالب کا یہ شعر آج اس وقت یاد آرہا ہے جب برادرم جمیل منظر میرے سلسلہ میں ماہنامہ سہیل"
خصوصی اشاعت منظرِ عام پر لا رہے ہیں۔ اس تجویز کا اظہار انھوں نے پہلے بھی کئی بار کیا تھا مگر میں
شہ ان کی ہمت شکنی کرتا رہا۔ میں نے کئی بار سختی سے اس تجویز کی مخالفت کی۔ لیکن اس بار معاملہ اس
ل تک پہنچ گیا ہے کہ اگر میں انہیں روکتا تو یہ خفا ہو جاتے ——— اور میں جمیل منظر کو بہرحال
خفا نہیں کر سکتا، اوّل تو یہ کہ ان کی خفگی کے تصوّر سے ہی مجھے دکھ ہوتا ہے۔ دوم یہ کہ بفرضِ محال
نھیں خفا بھی کر دیا جائے تو مجھے اس کے انجام سے ڈر لگتا ہے۔ اتنے سلیم الطبع تو ہیں نہیں کہ میرے
نع کرنے پر اپنے اس پروگرام کو ملتوی کر دیتے۔ میری مزید چند مخالفت سے خفا ہو سکتے تھے۔ اور اس
الم میں اگر وہ مجھ سے خصوصی شمارہ شائع کرتے تو ہو نہ ہو شاہد احمد دہلوی کے ماہنامہ "ساقی" کے جوش
نمبر کا نقشہ سامنے آجاتا۔ اور وہ یقیناً اس ناخوشگوار واقعہ سے دوچار ہوتے۔ نمبر کی اشاعت سے مجھے
داشت کرنا پڑ رہا ہے) کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتا۔ اس لئے میں نے سپر انداختہ ہو جانے میں
ی اپنی عزت و عافیت سمجھی، یہ بات کسی حد تک صحیح ہے کہ جب محبوب خود مائلِ التفات ہو تو پھر
حساس گناہ ہی سب سے بڑا گناہ ہے۔ یہ سب جانتے ہوئے اپنے تظاہر اور نمائندگی کا احساس
میرے لئے خجلت کا باعث بن جاتا ہے۔ نہیں اور ہاں کی اس کشاکش کا یہ نتیجہ یہ ہوا کہ میں جمیل منظر
کے اصرار کے باوجود اس منصوبہ میں ان کے ساتھ کوئی خاص عملی تعاون نہیں کر سکا، اس کا افسوس
نہیں بھی ہے اور مجھے سبھی ہے۔ میری بے نیازی اور بے پروا طبیعت نے کبھی مجھے منصوبہ بند طریقے سے
کام کرنے نہیں دیا۔ متعدد شعری تخلیقات رسائل میں شائع ہوئیں، میں نے ان کے تراشے کبھی نہیں رکھے

ان رسائل کی فائلیں میرے پاس محفوظ نہیں رہ سکیں، جب مجموعہ کی ترتیب کا مسئلہ سامنے آیا تو پتہ چلا کہ متعدد تخلیقات نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو چکی ہیں۔ تنقیدی مضامین بھی جو کئی ایسے پرچوں میں چھپتے رہے میرے پاس محفوظ نہیں رہ سکے۔ کبھی کبھی اپنے مزاج کی اس لاابالی کیفیت پر غصہ آتا ہے مگر قہرِ درویش بر جانِ درویش، اب اس غصے سے کیا ہوتا ہے۔ پیشِ نظر خصوصی شمارہ کی تیاری کے لئے برادرم جمیل منظر نے مجھ سے میرا انتخابی شعری مجموعہ "سنگِ میل" طلب کیا، یہ میرے پاس موجود نہیں تھا۔ شعری مجموعہ "سفر جلتے دنوں کا" بھی نایاب تھا۔ تنقیدی مضامین کے مجموعہ "احتساب" کی بھی بڑی مشکلوں سے ایک جلد مل سکی۔ ظاہر ہے کہ اس دیوالیہ پن میں تو جمیل منظر کو نظیری کا شعر ؎

تو بہ خویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری
بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

پڑھ کر مجھ سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے تھا اور اس ارادہ کو ترک کر دینا چاہیے تھا۔ لیکن یہ دھن کے پورے اور کام کے پکے ہیں۔ کیسے کیسے انھوں نے ضروری مواد اکٹھا کر لئے، مجھے شعری تخلیقات کی نقلیں بنوا کر ان کے حوالہ کرنی پڑیں، ان کا پیہم اصرار نہیں ہوتا تو میں یہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

پتہ نہیں کیوں میرے ذہن میں یہ بات اب بھی جمی ہوئی ہے کہ کسی فن کار کی زندگی میں اس سے اظہارِ محبت کا یہ طریقہ کہ کوئی خصوصی شمارہ شائع کیا جائے یا جشن منایا جائے، کچھ زیادہ سودمند نہیں ہے۔ یہ کام بس مرگ ہونا چاہیئے، اسکی مختلف وجہیں ہیں ـــــ لیکن میں اس وقت اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ برادرم جمیل منظر نے دُنیا کے موجودہ رواج کے مطابق اپنی جس محبت کا اظہار کیا ہے اس کے لئے جذبۂ تشکر کا اظہار نہ کرنا بڑی کج خلقی کی بات ہوگی۔ انھوں نے ماہنامہ سہیل کے اس نمبر کے ذریعے مجھے زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے، خدا انہیں بھی زندہ رکھے، انھوں نے مجھے خوش کرنا چاہا ہے، خدا انھیں بھی خوش رکھے۔ میں نے چونکہ اس شمارہ کی تکمیل میں مرتب کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا ہے، اس لئے قدرتاً مجھے کسی کمی کی شکایت کا بھی حق نہیں رہا۔ میری بے پروائی نے مجھے یہ کہنے کے لائق بھی نہیں رکھا کہ ؎

چشمش بسوئے ما نگراں ناتمام کرد
ساقی بجام ریخت مے تا رسیدہ ما

علیم اللہ حالی کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ

اصغر علی انجینیر

پتہ: آئرن کاٹج۔ سکنڈ فلور۔ ۴ تھا راستہ۔ شانتا کروز۔ بمبئی ۵۵

آرٹ عموماً اور شاعری خصوصاً بڑی حد تک موضوعی اور داخلی عنصر لئے ہوئے ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم اس بات کو بھی مدنظر رکھیں کہ داخلی کیفیات خارجی حالات کی پیداوار ہوتی ہیں۔ چاہے یہ خارجی حالات سیدھے نیچر سے متعلق ہوں یا انسانی معاشرے سے، خارجی حالات سے مفر نہیں ہے۔ تو ہم آرٹ میں موضوع اور معروض کی جدلیات اور اس جدلیات سے پیدا ہونے والے تحرک کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ داخلی عنصر خارجی ماحول سے رشتہ پیدا کر کے ہی معنویت پیدا کرتا ہے۔ ہر عظیم فن پارے میں ہمیں اس رشتے کی گہرائی اور پیچیدگی کا احساس ہوتا ہے۔ اور جو فن پارہ اس رشتے کی معنویت (میری مراد تخلیقی معنویت سے ہے) کا ہمیں جتنا عرفان کرائے گا اس کی عظمت میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔

میں یہاں رشتے کی معنویت پر اس لئے زور دے رہا ہوں کیوں کہ کئی ادبی نقاد داخلیت یا خارجیت کی دو انتہاؤں کو فن کی معراج قرار دینے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ یا داخلیت یا خارجیت اور فن پاروں سے بحث کرتے ہوئے ہمیں اس بات کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ نیچر یا سماجی وحدت (Social entity) کئی [illegible] قوتوں کی جمعیت (ensemble) [illegible]

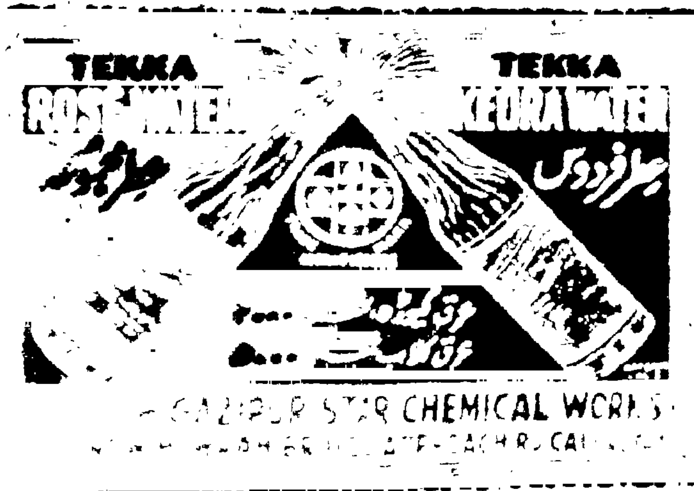
قوتیں جمود سے ابھر کر تناؤ پیدا کرتی رہتی ہیں اور اس عمل سے جہاں معروضی طور پر پیچیدگیاں بڑھتی ہیں، وہاں داخلی طور پر فن کار کے شعور کی گہرائیوں میں مختلف کیفیات پیدا ہوتی ہیں اور ان کیفیات کا شعوری اور عارفانہ اظہار فن پارے کو جنم دیتا ہے۔ اگر اس اظہار میں شعور یا عرفان کا عنصر، جو ظاہر ہے، خارجی عناصر کی پہچان سے تعلق رکھتا ہے، شامل نہ ہو تو فن پارہ محض سرور یا رنج و الم کی کیفیات کا اظہار بن کر رہ جائے گا۔ اوسط شاعری کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس میں شعور اور عرفان کا عنصر بھی شامل ہو اور اپنی تمام پیچیدگیوں کے ساتھ تو فن پارے میں اتنی ہی گہرائی اور تہہ داری پیدا ہو جائے گی۔

شاعری نیچر سے متاثر ہو کر بھی کی جا سکتی ہے اور سماجی حالات کی پیچیدگیوں میں الجھ کر بھی۔ یہ صحیح ہے کہ انسان نیچر کی توسیع (extension) ہے۔ لیکن معروضی سطح پر نیچر سے بھی اس کا رشتہ اتنا سادہ اور غیر پیچیدہ نہیں ہے جتنا ہم سمجھتے ہیں۔ نیچر بعض حالات میں حسن کا تاثر پیدا کر سکتا ہے اور بعض حالات میں وحشت اور خوف کا، بعض حالات [illegible]

بعض حالات میں تخریبی غصہ (Destructive rage) ۔ نیچر میں کوہسار اور آبشار کی حسین کیفیتیں ہی نہیں ہیں، سیلاب اور آتش فشاں کی تباہ کن طاقتیں بھی ہیں۔ نیچر شاعر سے قصیدے ہی نہیں مرثیے بھی لکھواتا ہے۔

سماج اور فرد کے رشتے تو پیچیدہ رہے ہی ہیں۔ رشتے کی یہ پیچیدگی قبائلی جیسے غیر طبقاتی اور تضادات سے بری سماج میں بھی پائی جاتی ہے۔ طبقاتی اور تضادات کے حامل سماج کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اگر یہ سماج ہندوستانی سماج کی طرح نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ ہو تو پیچیدگیاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ ایسے سماج میں جمود اور تبدیلی کی طاقتوں میں سخت تصادم کی آزمائش ہوتی ہے اور اس آزمائش سے گذرے بغیر اور اس کا صحیح عرفان کئے بغیر کوئی شاعر اچھی شاعری نہیں کر سکتا۔ آج تیسری دنیا میں جمود اور تبدیلی کی طاقتیں آپس میں ٹکرا کر ہمارے سماجی مسائل کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بنا رہی ہیں۔ اس کا نتیجہ سامراجی طاقتوں کی براہ راست اس عمل میں مداخلت سے خون ریز جنگوں اور انسان کش فسادات کی صورت میں بھی سامنے آرہا ہے۔ ایسے حالات میں شاعر کیا رویہ اختیار کرے؟ کیا وہ ماتم کناں تماشائی بن کر رنج و الم کا اظہار کرتا رہے یا ان حالات سے لڑنے والوں اور ...

خواب سجا کر ہنستے ہنستے موت کو گلے لگانے والوں کی قصیدہ خوانی کو اپنا شعار بنا لے؟ یہ صحیح ہے کہ ہر شاعر ایسے حالات میں اپنے اپنے نظریاتی موقف کے پیش نظر اپنا رویہ طے کرتا ہے۔ اور اسے ہی آخری حقیقت تصور کر لیتا ہے۔ لیکن سماجی تحرک (social dynamics) اور متضاد قوتوں کے تصادم سے پیدا ہونے والی نئی نئی پیچیدگیوں کا عرفان رکھنے والا شاعر یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ سماجی معاملات میں کوئی حقیقت آخری حقیقت نہیں ہوتی۔ وہ ان متصادم قوتوں اور ان سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی جتنی اہلیت پیدا کرے گا۔ اس کی شاعری میں اتنی ہی جان پڑتی جائے گی اور وہ اپنی شاعری کو قصیدے یا مرثیے کی انتہاؤں سے بچا کر نکال سکے گا۔ اس سے شاعری میں ابہام ضرور پیدا ہوگا۔ اور اچھی شاعری بغیر ابہام کے ممکن نہیں ہے۔ دراصل زندگی کا ابہام شاعری کے ابہام میں منعکس ہوتا ہے۔ فن اور زندگی واضح بیانی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ سیاسی، مذہبی اور اخلاقی نظریوں کی بات اور ہے۔ زندگی کی متصادم قوتیں ہر آویزش کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں۔ اور نظریات بھی آویزش کیا کرتے ہیں، زندگی کی پیچیدگیوں کا عرفان نہیں ...



کا سہارا ضرور لے سکتا ہے لیکن اسے Blinkers
نہیں بنا سکتا۔

اس تمہید کے ساتھ اب ہم علیم اللہ حالی کی نظموں
کی طرف آتے ہیں۔ اس وقت میرے پاس ان کی ۱۴ نظمیں
ہیں جو مختلف موضوعات پر ہیں۔ ان میں سے "آخری
الزام"، "یہ بھی سچ وہ بھی سچ"، "نشاں بھولی ہوئی منزل کا"،
"داستان"، "شکست حصار کے بعد"، "سرگذشت"
اور "اُلٹی لہروں کے بہاؤ میں" اچھی نظمیں کہی جا سکتی
ہیں۔ علیم اللہ حالی کی ان چودہ نظموں کو پڑھ کر یہ
احساس ہوتا ہے کہ ان کا رویہ زندگی کی طرف منفی نہیں
تو پُر امید بھی نہیں ہے۔ موہوم سا، مبہم سا رویہ
جس میں امید پر مایوسی حاوی ہے۔ مثلاً "نشاں بھولی
ہوئی منزل کا" زندگی کی پیچیدگیوں کو پکڑ میں لیتے
لیتے اچانک یوں مایوسی کے نوٹ پر ختم ہو جاتی ہے:

زنجیریں ہی زنجیریں
عقلمندو ـــــ جہاں پر ہو
وہیں رک کر دیکھو تم کہاں ہو

شاعر منزل کی تلاش میں نکلتا ہے مگر منزل کا فاصلہ
ہر آن اسے گردِ نامرادی میں لپیٹتا چلا جاتا ہے اور
"ترکِ سفر بھی تازہ صعوبتوں سے نکلنے کا وسیلہ" ہے۔
اور "فریبِ منزلِ جاناں کی دھندلی روشنی" "تازہ
بلاؤں کا بہاؤ" ہے۔ ویسے "منزل"، "مسرت"، "روشنی"،
"رشتے" سبھی موہوم و مہمل سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔"
یہ بات کچھ افسوسناک ہے کہ شاعر منزل، مسرت، روشنی
اور رشتے سبھی کو موہوم کے ساتھ مہمل بھی قرار دیتا ہے۔
موہوم کہنے میں جو معنویت پیدا ہو رہی تھی وہ مہمل
کہنے سے تباہ ہو گئی۔ "موہوم" کا ابہام "مہمل" کی
وضاحت نے نگل لیا۔ پہلا لفظ معنی روئیے کا تعین کر دیتا

ہے۔ "یہ بھی سچ وہ بھی سچ" کچھ اس سے زیادہ کامیاب
نظم ہے۔ شاعر اس بات کا شعور رکھتا ہے کہ:

روز و شب، ماہ و سال و صدی
ہم نے ان سب کی پہچان ہی چھوڑ دی
اور پھر یہ ہوا
رشتۂ صدق ٹکڑوں میں بٹتا گیا
وہ بھی سچ ہے جسے چھوڑ آئے ہیں ہم
یہ بھی سچ ہے جسے چھوڑ جائیں گے ہم

یہ بات بالکل سچ ہے ـــــ جسے Dogmatic
قسم کے نظریوں کے حامی ماننے سے انکار کرتے ہیں
کہ سچ نہ صرف اضافی ہے، ترکیبی ہے، بلکہ ہم میں سے
اکثر لوگوں کا جہاں تک تعلق ہے، ٹکڑوں میں بٹا ہوا
ہے اور ہم اپنے اپنے ٹکڑے کو مکمل سچائی سمجھ کر
فریب میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس نظم میں یہ بات
سادہ سے لفظوں میں بیان ہو گئی ہے۔ یہ سچ شاعر
کے نزدیک، اور حصوں کے علاوہ زمانوں میں بھی بٹ
ہوا ہے۔ زمانوں میں بٹا ہوا یہ سچ ماضی کو ہمارے لئے
طلائی دور بنا دیتا ہے اور مستقبل کو نظریاتی آدرش
کا حامل اور

"ہم کہ کل کے امیں
آج کو اپنی خاطر میں لاتے نہیں"

"آج" جو زندگی کی ٹھوس مگر پیچیدہ حقیقت ہے
ان بٹی ہوئی سچائیوں میں ہماری گرفت سے باہر ہی
رہتا ہے۔ ہم یا تو ماضی کے طلائی دور میں اپنے
تمام اوہام کے ساتھ جینا چاہتے ہیں یا کل کو سنوارنے
والے آدرشوں کے چکر میں آج کی زندگی کو عذاب
بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ نظم اسی نوٹ پر ختم ہو جاتی
ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم آدرشوں کی طرف

منفی رویہ اختیار کریں۔ آج کو سنوارنے کے لیے ہمیں
گوارا بنانے کے لئے آدرشوں کی ضرورت تو پڑتی ہی
ہے۔ البتہ کل کو سنوارنے پر اتنا زور نہ ہو کہ آج
گوارا بھی نہ رہے۔ کل تو تعالی حقیقت ہے تو
آج زندہ اور متحرک حقیقت ہے جس کو ہمیں
گوارا بنا کر جینا ہے۔ در اصل آج کی حقیقت اور
کل کے آدرش کے درمیان اتنا [illegible]
بنا رہنا چاہیے کہ جینا دوبھر نہ ہو اور تمنا و گوارا
رفتار کے ساتھ ہمیں آگے بڑھاتا بھی رہے جس
طرح کل کے آدرش پر زور دینے والے جینا دوبھر کر
دیتے ہیں۔ اسی طرح آج ہی میں جینے والے عیش کوشی
کے تمام سامان اپنے لیے فراہم کر کے دوسروں
کی زندگی تلخ بنا دیتے ہیں۔ یہ حکمران طبقوں کا
ہر دور میں رویہ ہوتا ہے۔

"داستان" زندگی کی حقیقت پر روشنی
ڈالنے کی شاعرانہ کوشش ہے۔ اس میں طائر
اور کہنہ عمارت کی علامتیں انسان اور خارجی دنیا
کے لئے بالترتیب استعمال ہوئی ہیں۔ نظم کا
ماحول بھی داستانوی ہے۔ جو ایک معنی میں [illegible]
کیفیت پیدا کرتا ہے۔

یہ طائر ———
جو ہر شام
کہنہ عمارت کے ٹوٹے کنگورے
پہ تا دیر
دن بھر کی سب داستان کہتا رہتا ہے
اور پھر
دلبرانہ کے کھسکتے قدم
اپنے خالق سے
اک شام کی بھیک اور مانگ کر
اس کہانی کے انجام کو جاننا چاہتے ہیں
——— وہ کہانی
جو بے بس پرندے کے اظہار سے
آج بھی دور ہے

اس نظم سے ایک معنی میں دنیا کی بے ثباتی
کا احساس پیدا ہوتا ہے اور دوسری طرف
ہماری فہم کے عجز کا۔ طائر ——— جو انسان کی
علامت ہے کیوں کہ وہ چند روز جی کر اس دنیا
سے اڑ جاتا ہے، کہنہ عمارت کے ٹوٹے کنگورے
پہ بیٹھ کر، جو قدیم دنیا میں انسان کے بنائے ہوئے
اپنے نظریاتی گوشے کی علامت ہے، زندگی کی
داستان سناتا رہتا ہے لیکن یہ داستان
پرندے سے بیان نہیں ہو پاتی۔ وہ محض اظہار
کے فریب میں مبتلا رہتا ہے۔ نظم میں ایک
بہت خوبصورت ٹکڑا ہے جو یوں بیان ہوا ہے:

جیسے یہ آواز ہی
اس کہن سالگی کا مداوا ہو
جیسے ——— یہی اس کی ساری شکستوں کا حاصل ہو

یہ صحیح ہے کہ ہر انسان خصوصاً وہ انسان
جو زندگی کی پیچ در پیچ حقیقت کو سمجھنا چاہتا ہے
وہ اپنے طور سے زندگی کی حقیقت کی داستان
اپنے نظریاتی کنگورے پر بیٹھ کر سناتا ہے اور
یہ داستان سناتے سناتے اڑ جاتا ہے۔ کتنے
انسان آج اپنے اپنے طور پر یہ داستان سنا
چکے ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم آج بھی

اس کے صحیح اظہار سے بہت دور ہیں۔ دراصل
داستان ہے ہی اتنی پیچیدہ کہ اسے کوئی
ایک انسان اپنے عہد کی بھی پوری داستان
نہیں سنا سکتا تھا اور حقیقت کا یہ عالم
ہے کہ ہر دور میں نئی نئی سچائیاں ابھرتی رہتی ہیں۔
اس نظم کی کوتاہی یہ ہے کہ یہ اس حقیقت کی
طرف اشارہ کرنے کے بجائے فہم اور عجز کے
اظہار پر زور دیتی ہے۔ زندگی کا ثبوت بدلتی
ہوئی حقیقتوں کی مسلسل تلاش ہے۔ غالب کیا
خوب کہتے ہیں ؎

وید حسرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

فہم و بیان کا عجز واماندگی کی نشانی ہے۔ یہ
صحیح ہے کہ زندگی کی حقیقت کسی ایک کے
فہم و بیان کی گرفت میں نہیں آتی لیکن یہ
بھی صحیح ہے کہ ہر عہد میں مختلف نکات ہمارے
سامنے آتے ہیں جو چند عظیم انسانوں کی
فکری کاوش کا نتیجہ ہوتے ہیں اور یہ نکات
ہمیں زندگی کے چند پہلوؤں کا گہرا عرفان عطا
کر جاتے ہیں۔

"شکستِ حصار کے بعد" ایک اچھی نظم
ہے جو انسانی زندگی کے ایک تاریخی ڈائیلیما کو
بیان کرتی ہے۔ انسان اگر نظریاتی حصار میں
بند ہو جاتا ہے تو حقیقت کی ہمہ گیریت
اس کی گرفت سے نکل جاتی ہے اور اگر وہ اس
حصار سے نکل کر پھیل جاتا ہے تو حقیقت کا
نقطۂ مرکز (فوکس) کھو بیٹھتا ہے جو ایقان و
عمل کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے:

اور پھر
اس نے خود اپنے ہاتھوں
جو دیوار چاروں طرف چن رکھی تھی
اسے توڑ ڈالا
تب وہ آزاد پانی تھا
سرمست پھیلا ہوا
چشمۂ بیکراں تھا
زمیں اس سے خوش تھی
فلک اس کی ہر بوند کا ملتجی تھا

لیکن اپنی یہ ادا اسے بہت تک نہیں بھائی اور اسے
یوں لگا:

جیسے وہ منتشر ہو کے گم ہو رہا ہے
وہ پھر چاہتا تھا کہ سمٹے
سمٹ کر فصیلوں کا پابند ہو کر رہے
اسے خود نگر ہونا ہی چاہیے تھا

آزادیٔ فکر انسان کو نظریاتی حصار سے باہر نکلنے
کے لئے اکساتی ہے اور بامقصد عمل کی آرزو
اسے نظریاتی پابندی کے لئے مجبور کرتی ہے اور ایک
باعمل مفکر کو تاحیات اس ڈائیلیما کا سامنا کرنا پڑتا
ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونا بڑا ہی مشکل کام ہے۔
اس ڈائیلیما کو بیان کر دینے کی حد تک علیم اللہ
حالی کی یہ نظم بڑی کامیاب نظم ہے۔ اس ڈائیلیما
"سرگزشت" میں شاعر آج کی زندگی یعنی
صنعتی تہذیب کی زندگی اور اس کے تضادات
کو بیان کرتا ہے۔ اسی لب و لہجے میں جو جدیدیت
نے ہمارے آج کے ادب کو دیا ہے۔ روزمرہ زندگی

کہ حقیقت کو شاعر یوں بیان کرتا ہے:

خود اپنے آپ کو بارِ گراں کی طرح گھر سے
دفتروں میں ڈھو کے لے جانا
تبسم زہر خنداں، قہقہہ نیزہ
خموشی ایک ریاکاری
تمام الفاظ کی وحشت بھری کردہ تعبیروں میں
اپنی ذات کو روپوش کر دینے کی کوشش
ہر اک گذرے ہوئے لمحے سے اُلفت — اور
موجودہ تضادوں سے رمیدہ

اس نظم میں آج کے صنعتی عہد کی حقیقت کی تلخیوں کو پیش کرنے کی کوشش تو ہے لیکن اسمیں بھی اور جدید نظموں کی طرح — محض مڈل کلاس دانشور کا نقطۂ نظر جھلکتا نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے حقیقت ہر عہد میں اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے لیکن شاعر کے حق میں یہ بات جاتی ہے کہ وہ تو اپنے تجرباتی صداقت کی بنیاد پر شعر کہتا ہے نظریاتی یا خیالی تصور پر نہیں۔ نظم کا یہ ٹکڑا:

تمام الفاظ کی وحشت بھری کردہ تعبیروں میں
اپنی ذات کو روپوش کر دینے کی کوشش

بڑی تلخ صداقت کا آئینہ دار ہے، یہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تلخ صداقت ہمارے دَور سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر دَور میں اسٹیبلشمنٹ سے وابستہ دانشوروں نے الفاظ کی انھیں کردہ تعبیروں میں اپنی ذات کو روپوش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان نظموں سے ایسا لگتا ہے کہ علیم اللہ حالی موجودہ حقیقتوں کی تلخیوں کو ایک حد تک کامیابی کے ساتھ اپنی نظموں میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن نئی ابھرتی ہوئی حقیقتوں کو گوارا بنانے کے کسی نظریے کے وہ قائل نظر نہیں آتے، شاید اس لئے کہ انسانی تاریخ میں ہر نظریہ کسی نہ کسی شکل میں اسٹیبلشمنٹ بن کر رحمت سے زیادہ عذاب کا باعث بنا ہے لیکن اگر مستقبل میں زندگی کو سنوارنے کا خواب، حقیقت کی طرف راجع ہو گیا تو........ شاید حقیقت پھر فریب دے جائیگی۔ ●●

علیم اللہ حالی کا تنقیدی نظریہ

مناظر عاشق ہرگانوی
مکان: ساڑھی، ضلع بھاگلپور (بہار)

تجزیاتی اور تاثراتی تنقید کی خوبیاں علیم اللہ حالی کی تنقید میں نمایاں ہیں۔ ویسے وہ حالی کی روایت کو بھی ابھار کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں تذکراتی تنقید بھی ہے۔ اور جدید ادب پر بھی ان کی گہری نگاہ ہے۔

حالی کی تنقید سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ضرورتوں، قدروں اور دلچسپیوں کو وہ زندگی کا تسلسل، تہذیب کا سلسلہ اور سماج کی حیات کا رشتہ عطا کرتے ہیں۔ ایک ادب پارہ مختلف مزاج رکھنے والوں کو مختلف تاثر دے سکتا ہے۔ اس کا سچا اظہار ہی اس کا صحیح تعین کر سکتا ہے۔ علیم اللہ حالی کے تاثرات و نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کی صداقت سے انکار کرنا ذرا مشکل ہے۔

صداقت کا جو مفہوم افلاطون اور ارسطو کے یہاں ملتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کی صداقت میں تاریخی حقیقت کی جامدیت اور کھردرا پن نہیں پایا جاتا بلکہ صداقت کا مطلب ان کے یہاں یہ ہے کہ چیزوں کو اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ بے ربط، غیر منظم اور غیر دلچسپ نہ ہوں۔ وہ صداقت کو اس طرح تنگ معنوں میں استعمال نہیں کرتے جس قدر عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ یہی وہ شاعرانہ صداقت جس کو الطاف حسین حالی نے مقدمہ میں شعر کے حوالہ دیتے ہوئے اصلیت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ممکن ہے حالی نے براہ راست ارسطو کی تحریر سے استفادہ کیا ہو مگر حالی نے اس کی تشریح میں جو کچھ کہا ہے وہ خود تشریح طلب اور مشکل ہے۔ ارسطو نے اس نکتہ کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے :۔

”قرین قیاس ناممکنات کو خلاف قیاس
امکانات پر ترجیح دینی چاہیئے“

یہی ارسطو کی شاعرانہ صداقت کا واضح معیار ہے۔

ارسطو کے نظریۂ تنقید کی اس شاعرانہ صداقت کو واضح کرتے ہوئے علیم اللہ حالی کہتے ہیں کہ وہ موجوداتِ عالم کی اضافی حقیقت کا قائل ہے۔ اس لئے اس کی نگاہ میں شاعری انھیں موجودات کی عکاسی کا نام ہے۔ شاعری کے سلسلہ میں اس کا تصور کچھ اور بھی ہمدردانہ رہا ہے۔ وہ یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ شاعر حقیقت میں فطرت کی تخلیق جدید ہے۔ شاعر فطرت کے حسن کو اپنے ذہن کے سانچے میں اتارتا ہے، وہ مشاہدہ کرتا

اور حب حسن کے مختلف اجزا مختلف سمتوں سے
ں کا چشم مشاہدہ میں آجاتے ہیں۔ تو وہ ان اجزا
سے ایک نیا مجسمہ تیار کرکے لوگوں کے سامنے پیش کرتا
ہے' اس طرح شاعر' ارسطو کے یہاں نہ صرف نقل
کی نقل کرنے کے الزام میں بری ہو جاتا ہے بلکہ اپنی خلاقانہ
صلاحیت کی وجہ سے ایک ارفع و اعلیٰ مقام بھی پاتا
ہے۔ جہاں تک خلاقانہ صلاحیت کی بات ہے غالب
کی خود انتقادی' کے سلسلے میں علیم اللہ حالی ... حسنات
... تے ہوئے کہتے ہیں کہ تعلی عرفانِ ذات یا خود شناسی یا
خود آگہی سے زیادہ ذہن کی اس پیچیدگی کو ظاہر کرتی
ہے جس کے تحت شاعر خارجی دنیا سے اپنے فکر و فن کی خاطر
خود داد نہ پاکر خود اپنی بارگاہ میں انصاف طلب ہوتا
ہے۔ اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس کی تخلیقی
صلاحیت اور اس کے مرتبے سے یا تو دنیا واقف نہیں ہوتی
یا اس علم کے باوجود دنیا اسے خراجِ عقیدت پیش
نہیں کرتی۔ دنیا کی اس تنگی چشمِ حسود کی تلافی کے لئے
شاعر اپنی ذات کے اندر سے ایک بہترین قاری پیدا
کر لیتا ہے۔ مگر یہ قاری ایسا ہوتا ہے جو سخن فہم ہو نہ ہو
غالب کا طرفدار ضرور ہوتا ہے۔ اور فن کار کی ذات
سے نکلا ہوا یہی فرد اس کی ستائش کرتا ہے۔ شاعرانہ
تعلی کے پسِ پردہ یہی نفسیات کام کرتی ہے۔ اس پیچیدہ
نفسیات کا مظاہرہ کم و بیش تمام بڑے شعرا نے کیا ہے۔
میر نے اپنے کلام کو "میرا فرمایا ہوا" بتایا اور آ
... قرار دیا۔ غالب نے بہ تکرار دنیا کو یہ
... مرتبہ دانی غالب

شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

عرفانِ ذات سے عرفانِ عشق تک نفسیات کا پیچیدہ
سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ ان نفسیاتی گتھیوں کو علیم اللہ حالی
نے میر کی مثنوی "خواب و خیال" میں سلجھانے کی کوشش
کی ہے۔ میر نے خود اپنے بارے میں ایک جگہ کہا ہے

یہ میر عشق پیشہ ایک آفتِ زماں ہے
پردے میں اپنے سارے مطلب ادا کرے ہے

جہاں تک عشق پیشہ ہونے کا سوال ہے تو شاعروں کے
لئے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ
جب تک کسی سے عشق نہ ہو اس وقت تک کوئی آدمی شاعر
نہیں ہوسکتا ہے۔ اس قول کو اگر بہت محدود انداز میں
دیکھا جائے تو اس کی تردید کے آثار ظاہر ہوسکتے ہیں مگر
جب اس کو قدرے وسیع معنی میں دیکھا جائے تو بات معقول
معلوم ہوتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ عشق کے مدارج اور
مراتب ہوتے ہیں۔ اس کے اقسام اور انواع ہوتے ہیں۔ اس
کی مختلف کیفیتیں اور متعدد ردِ عمل ہوتے ہیں۔ کبھی یہ ایک
محبت تصور کا نام ہے۔ کبھی ارتکازِ ذہن ہے کبھی یہ
سجدۂ مسلسل پر اکساتا ہے کبھی ایک جذبۂ والہانہ کی
تلقین کرتا ہے۔ کبھی حقیقت میں مجاز کی جلوہ آرائی دیکھتا
ہے کبھی مجاز میں حقیقت کی جھلکیاں پیش کرتا ہے کبھی
یہ ایک جذبۂ بے نام و بے ارادہ ہے، کبھی ایک حادثۂ دیدہ و
دل ہے۔ غرض اس عالمِ محدود میں عشق اپنی لامحدودیت
برقرار رکھنے کے لئے نہ جانے کتنے روپ اختیار کرتا ہے۔
شاعر کو فی الحقیقت کسی خاص فرد سے ذہنی رابطہ ہو یا نہ
ہو مگر اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ شاعر کے دل میں عشقیہ جذبات

و احساسات کا ہونا ضروری ہے۔

شاعر کے دل میں عشقیہ جذبات و احساسات کی بھی مختلف کیفیتیں ہوتی ہیں۔ ان کیفیتوں کو بیان کرتے وقت علیم اللہ حالی نے ان کے مراتب کو پیش نظر رکھا ہے۔ میر کے سلسلے میں وہ کہتے ہیں - میر کی شاعری میں عشق کے ایسے اظہارات ملتے ہیں جس سے انسان کے دل کا سوز، ساز، آرزو، جستجو سب کچھ سامنے آجاتا ہے۔ جذبات عشق کے یہی انوکھے اظہارات ہیں جن پر خود میر کو بھی ناز ہے اور وہ اپنے کو عشق پیشہ کے خطاب سے نوازتے ہیں ؎

اور شہریار کی شاعری کے بارے میں یہ رائے دیکھیے کہ شہریار کی شاعری میں بھی جذبہ کے رچاؤ کا حسن سب سے نمایاں طور پر ملتا ہے۔ کہیں کہیں تو ان کے جذبات کی شدت ان میں ایسی کیفیت پیدا کرتی ہے جسے آشفتہ سری کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ان کی شاعری میں والہانہ پن شورش اور بے ساختگی ایسی آشفتہ سری سے پیدا ہوتی ہے۔ ناکامی، اداسی، محرومی، شکست امید، احساس نفی، اور غم بے حال اگرچہ شہریار کی شاعری میں اساسی احساسات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے ہم ان کی شاعری کو محزونہ اداس اور مضمحل شاعری نہیں کہہ سکتے، اس میں ہمیں ایک بے چینی، ایک کرب مسلسل اور ایک تڑپ ملتی ہے۔

انسانی مسائل کو ادب کا خاص موضوع بنانے کے سلسلے میں "احتشام حسین کی تنقید نگاری" میں علیم اللہ حالی اپنے نظریات کی وضاحت پوری کرتے ہیں کہ انسانی مسائل و معاشرہ سے سچی اور مثبت دلچسپی اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب بقول احتشام حسین ہم فلسفہ مادیت کو قائل ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ کم ہی لوگوں نے اپنی تحریروں میں فلسفہ مادیت کو اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے کہ ایک عام ذہن اس سے متوحش ہوجاتا ہے۔ احتشام حسین نے اپنی تنقید میں جگہ جگہ اس فلسفہ مادیت کی صحیح تعبیر پیش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مادی حالات و حادثات جہاں ایک طرف معاشرہ کے عام افراد پر اثر انداز ہوتے ہیں، وہاں ادیب بھی ان سے متاثر ہوتا ہے۔ لیکن ادیب ہوں یا عام افراد، یہ سب خود بخود جدلیاتی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ انفعالی انداز میں ان تغیرات کو قبول نہیں کرتے بلکہ باشعور اور باصلاحیت طاقت کی طرح ان تغیراتی حالات کے مقابل ہوتے ہیں، کچھ انھیں اپنے انداز میں متاثر کرتے ہیں کچھ خود اس سانچے میں ڈھلتے ہیں۔ اس طرح مادی حالات ایک خاص ہیئت و مزاج اور رفتار کے ساتھ پورے معاشرہ کو آگے کی طرف لے جاتے ہیں۔ مادی حالات میں صحیح اثر و تاثیر کے لئے معاشرہ کے افراد خصوصاً ادیب کا باشعور ہونا ضروری ہے۔ جو لوگ فلسفہ مادیت کو نہیں مانتے وہ یا تو مادی حقائق سے روگردانی کرتے ہیں یا ادیب کو غیر ذی شعور اور غیر حساس سمجھتے ہیں۔ اور ایک طرح سے وہ ادب کے ذریعے عظیم قدروں کی حامل تخلیقات کے امکانات کی نفی کرتے ہیں۔

فن اور فنکار کے اٹوٹ رشتہ کی وضاحت کرتے ہوئے علیم اللہ حالی کہتے ہیں کہ [illegible]

کہ فن کار ایک فن پارہ کا خالق ہوتا ہے اور خالق و مخلوق میں کبھی نہ ختم ہونے والا تعلق ہوتا ہے۔ بلکہ اس حقیقت سے ذرا اور آگے بڑھ کر دیکھا جائے تو فن پارہ دراصل فن کار کی پوری ذات اور اس کی تمام صفات کو سامنے لا دیتا ہے۔ جیسا ہر فن پارے میں فن کار کا عکس دکھائی دیتا ہے جب کسی فن کار کی تخلیقات سامنے ہوتی ہیں تو اس کی شخصیت کے تمام پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ معنی ہیں کہ فن کی ذات سے ذات تک پہنچنے کے لئے اس کی تمام تخلیقات کا یکجا سامنے ہونا ضروری ہے۔ یہی نظریہ علیم اللہ حالی کے فن اور ان کی ناقدانہ بصیرت پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ اپنے ناقدانہ ذہن سے کام لیتے ہوئے وہ معیار متعین کرتے ہیں۔ اور اجتماعی و منفیت کا اندازہ کرتے ہوئے معیار و میزان عطا کرتے ہیں۔

معیار و میزان کے دائرے میں شخصیت اور اصناف کا تناسب۔ علیم اللہ حالی کے یہاں بہت ہی متوازن ہے۔ بسمل سنہاروی کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں۔ تاریخ گوئی اور قطعات نگاری کے بارے میں کہتے ہیں کہ تاریخ گوئی شاعر کی تخلیقی صلاحیت کا ایک اہم پیمانہ ہے۔ دوسری اصناف سخن میں قاری کو بہلانے میں اور اسے بالفاظ دیگر متاثر کر دینے کے بہت سے مواقع ہیں۔ مگر تاریخی قطعات میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ صرف کسی واقعے کے وقوع کو مصرعے میں سمو دینا بہت بڑا کمال نہیں ہے۔ بلکہ تاریخ کے مصرعے ایسے ہونے چاہئیں جن سے سالِ وقوع کے ساتھ ساتھ موضوع سے گہری دلچسپی اور ذاتی تاثرات ظاہر ہو جائیں۔ تاریخ گوئی میں سالِ وقوع کے علاوہ معنی خصوصیات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر اشارات و کنایات میں تلمیحات کے ذریعے اور لفظوں کو مخصوص معنی میں استعمال کرتے ہوئے سن واقعہ کے ساتھ ساتھ بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔

علی عباس حسینی اور ان کے فن پر تبصرہ دیکھئے۔ حسینی صاحب نے افسانہ نگاری کو تو خاص طور پر اپنی شخصیت کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور وہ

ڈاکٹر نسیم شہنوی

علیم اللہ حالی کا فکری آہنگ

نئی نسل کا انداز فکر ہمیشہ سے ان کے عصری تقاضوں کے مطابق رہا ہے۔ ان کا بیدار ذہن حساس دل اور ان کی رگوں میں بہتا ہوا تازہ دم خون کسی قسم کی نا انصافی اور ظلم و ستم کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتا ہے۔ مثلاً آزادی سے قبل نئی نسل کے فن کاروں کا لب و لہجہ ایجی ٹیشنل، انقلابی اور باغی رہا ہے۔ لیکن آزادی کے بعد مسائل کی نوعیت تبدیل ہوئی۔ چنانچہ اس دور کا نیا فن کار تیز لب و لہجہ کو ہرگز پسند نہیں کرتا ہے۔ ظلم و ستم اور نا انصافی کے خلاف طنزیہ طرز اختیار کیا ہے۔

۱۹۷۰ء کے بعد اردو شاعری خصوصاً غزل کا لب و لہجہ کافی بدلا ہے۔ نئے غزل نگار اس قسم کی روش اختیار کر رہے ہیں کہ جس میں ترقی پسندی اور جدیدیت کے حدود مٹ رہے ہیں۔ ان کی غزلوں کا لب و لہجہ سادہ اور سپاٹ ہونے کے باوجود دل کی گہرائیوں کو چھوتا اور ذہنوں کو جھنجھوڑتا ہے۔ اگرچہ نئی نسل کے کچھ فنکار نیا پن لانے کے جوش میں لغزش کر بیٹھتے ہیں اور بہت جلد ان کی فنکارانہ صلاحیت مجروح ہو جاتی ہے۔ چونکہ انفرادیت ایک تجربہ کار تخلیق کار ہی پیدا کر سکتا ہے۔ اس لئے نا تجربہ کاری اور ناپختگی کی وجہ سے کچھ لوگ اپنے راستے سے بھٹک جاتے ہیں اور ان کی تخلیق تنقید کا نشانہ بنتی ہے۔

جدید دنیا میں ظلم پسندی (SADISTIC) مظلومیت پسندی (MOSCHISTIC) اور عریاں پسندی (VOYEURISTIC) کے رجحانات تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور ان رجحانات سے نئی نسل کے فن کار متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ آج نئی نسل کے شعراء ان غیر انسانی رجحانات کے خلاف صف آرا ہیں۔

علیم اللہ حالی نئی نسل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ ہر طرح سے باخبر اور باصلاحیت شاعر ہیں۔ ان کی نگاہیں ان تمام مسائل پر ہیں جن سے آج کا انسان دوچار ہے۔ انھوں نے اپنے اظہار کا ذریعہ غزل کو بھی منتخب کیا ہے۔ جہاں تک ان کی غزلوں کے اشعار کا سوال ہے سب کے سب بڑے معنی خیز اور دل و دماغ پر دیرپا اثر چھوڑتے ہیں۔ ان کی چند غزلوں کے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انھوں نے غزل کے دامن کو محض گل و بوٹے اور چاند و ستاروں سے سجانے کے بجائے اسے احساس محرومی اور تلخیوں کے پھندے ٹانکے ہیں۔ انھیں دیر سے ان کے اشعار سے چاندنی کی ٹھنڈک اور دھوپ کی تپش محسوس ہوتی ہیں۔

نئی نسل کے غزل نگار اس ہنگامی دور کی ترجمانی بڑے ہی موثر انداز میں کر رہے ہیں۔ مثلاً آج انسان ایک دوسرے کے بہت قریب ہونے کے باوجود انفرادی طور پر تنہا محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ تنہائی، گھٹن اور کرب کا احساس اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ لوگ ایک قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور احساس کمتری ہی انسان کے وجود، اس کی شخصیت اور کردار کو مجروح کر دیتا ہے۔ ادھر

۱۹۷۰ء کے بعد کی غزلوں میں ان کیفیات کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ علیم اللہ حالی نے بھی یہ نفسیاتی کیفیات کیفیات بڑے موثر انداز میں پیش کئے ہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

مار ڈالا ہے یقینوں کے کرب نے مجھ کو وہ زیر گماں کچھ بھی نہ تھا

مجھے زیر تنہائیوں نے کیا میرے ساتھ یادوں کا لشکر نہ تھا

آج انسان نے اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کے لاکھوں چراغ روشن کردیے ہیں۔ چاند اس کے پیروں تلے آگیا ہے اور اب اس کی نگاہیں چاند سے بلند سیاروں پر ہیں لیکن ایک طرف تو اس کی یہ تمنائیں اور آرزوئیں پوری ہو رہی ہیں لیکن دوسری طرف وہ اندر سے کھوکھلا اور بے جان ہوتا چلا جارہا ہے اور لوگوں کے دلوں سے اپنائیت، خلوص اور وفاداری ختم ہوتی جارہی ہے۔ دراصل یہ ظاہرداری کا دور ہے اور ہر جگہ مصلحت پسندی کا دار دورہ ہے۔ ایسے میں ہر شخص سوالیہ نشان بنا ہوا ہے کس پر بھروسہ کیا جائے کس پر نہیں۔ علیم اللہ حالی نے ان حالات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے ؎

وہ میرا ہمسفر تو رہا سفر چلا تھا مگر ہجوم شہر میں لی راہ اور ہی اس نے

قریب آیا تو وہ کیسا اجنبی سا لگا جو دور سے نظر آتا تھا آشنا مجھ کو

وہ اپنے شہر میں پہچانتا مجھے بھی تو کیا کسی طرح یہ طلسم گماں تو ٹوٹا ہے



ابھر ابھر کے ڈوبتی لہروں کا اعتبار ہی کیا یہ کس سفر پہ چلا لے کے ناخدا مجھ کو

رس رہا ہے گر کوئی بھیگتا بھی نہیں تیرے خلوص میں یوں تو کوئی کمی ہے کہاں

آج جس تیزی سے سیاسی، معاشی اور سماجی قدریں تبدیل ہو رہی ہیں۔ ان سے نئی نسل کے فنکار بڑی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ مثلاً ابھی ایک شخص ایک پلیٹ فارم سے اپنے نظریات کی وضاحت کر رہا تھا تو کچھ ہی بعد دوسرے پلیٹ فارم سے اپنے سابقہ نظریات کی دھجیاں اڑاتا نظر آئے گا۔ ہر چہرے پر ایک نیا مکھوٹا (MASK) چڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ ان باتوں کو علیم اللہ حالی نے اپنی غزلوں میں بڑے والہانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ؎

کسی موڑ پر مل جاؤ تو گا حالی تجھ کو تو جہاں بھیڑ میں گم ہو کے بچھڑ جائے گا

چاندنی سڑکوں پہ آوارہ پھری بند گھروں میں ظلمتوں کا غم رہا

اگرچہ نئی نسل کے فنکار سیاسی بیشتر بازی اور ناانصافیوں کے خلاف کسی قسم کا انقلابی لب و لہجہ

اعتبار نہیں کرتے بلکہ اپنی بات اس انداز سے کہتے ہیں کہ لوگوں کو غور و فکر کے لئے سوالیہ نشان بنا دیتے ہیں مثلاً علیم اللہ حالی کہتے ہیں۔

سفر ہے دھند کا تو کوئی رہنما لے جا — مرا سکوت نہ ہو تو میری صدا لے جا

کچھ اور چاٹ لے صحرائے گمرہی کا نمک — جو آگیا ہے تو راہوں کا ذائقہ لے جا

دریا ہے تو گہرائی سے دے کوئی صدا بھی — دے ڈوبنے والوں کو تو کچھ اپنا پتہ بھی

ایک چیخ کا پتھر ہی سہی پھینک تو حالی — اب وقت کے سوئے ہوئے صحرا کو جگا بھی

علیم اللہ حالی کے یہاں پتھر، صحرا، دریا، دھند، دروازہ، صدا، پتہ، چاندنی اور سڑکوں جیسی بے شمار علامتیں استعمال کی گئی ہیں۔ اگرچہ یہ علامتیں نئی نہیں ہیں بلکہ ان کا استعمال خلیل الرحمن اعظمی سے لے کر نئی نسل کے شعراء تک مختلف پیرائے میں کیا جا رہا ہے۔ لیکن علیم نے بھی ان علامتوں کے استعمال میں اپنے پختہ ذہن کا ثبوت دیا ہے اور اپنی غزلوں میں انفرادی رنگ بھرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ علیم اللہ حالی اپنے تخلیقی سفر کے دوران اردو غزل کو خوب سے خوب تر بنائیں گے۔ کیونکہ ان کے یہاں ایک اچھے اور باصلاحیت شاعر کے تمام عناصر موجود ہیں۔

شمع جہاں

لیکچرار شعبۂ اردو، سندر وتی مہیلا کالج بھاگل پور

علیم اللہ حالی — یادوں کے آئینے میں

شخصی مضمون کا لکھنا اور وہ بھی ایسی شخصیت کو دائرہ قلم میں لانا جس سے لکھنے والے کا قریبی تعلق ہو۔ تلوار کی دھار سے گزرنے کے عمل سے کسی طرح کم خطرناک فعل نہیں ہے۔ آج میں اسی تیز دھار تلوار پر ننگے قدموں چلنے کا تجربہ کر رہی ہوں۔

ع
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

جناب علیم اللہ حالی میرے لئے صرف ایک ادبی نام نہیں۔ وہ رشتہ میں میرے بزرگ یعنی سگے ماموں ہیں، پھر میری ادبی زندگی کے آغاز میں استاد محترم کی حیثیت سے انہیں حاصل رہی ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ حالی صاحب نہ ہوتے تو شاید میں نے اردو کو اپنا مضمون خاص نہیں بنایا ہوتا۔ یہ انہیں کی ذات ہے جس نے میرے ذہن میں ادب کی شمع روشن کی اور مجھے اس راہ کا مسافر بنایا جس راہ پر چلتے ہوئے آج میں کبھی کبھی فخر بھی محسوس کرتی ہوں۔ اردو پڑھ کر یا اردو کی لیکچرار ہو کر میں — کبھی فخر بھی محسوس کرتی ہوں، اردو پڑھ کر یا اردو کی لیکچرار ہو کر میں نے کبھی شرمندگی محسوس نہیں کی۔ جیسا کہ عموماً ہوتا ہے بلکہ یہ مضمون میں نے ذوق و شوق سے اپنایا ہے۔ یہ زبردستی کا سودا نہیں ہے جس پر پچھتایا جائے — بہرکیف یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اب میں حالی صاحب کی شخصیت پر روشنی ڈالنے کی سعی کروں گی۔

حالی صاحب میرے قریبی رشتہ دار ہیں۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ان سے میری ملاقات پہلی بار ۱۹۶۲ء میں ہوئی۔ اس وقت میں دسویں جماعت کی طالب علم تھی اور وہ بی۔ اے کا امتحان دے چکے تھے۔ ہم لوگ پٹنہ میں مقیم تھے۔ حالی صاحب اپنے والدین کے ساتھ پورنیہ میں رہتے تھے۔ "اسد منزل" کبھی ایک بڑی شاندار سی عمارت تھی۔ اونچی اونچی منقش چھتیں، پرانی وضع کے بڑے بڑے دالان، نقش و دیوار رنگین ٹائیلس سے منور، اور عمارت کے چہار طرف دور دور تک ایک پرہیبت خموشی چھائی رہتی تھی۔ حالی کا یہ مسکن سننے میں آیا کہ اسد نام کے کسی راجہ کا محل تھا۔ عجلت میں وہ مکان بیچ کر پاکستان چلا گیا۔ میرے نانا مرحوم ڈاکٹر احمد صاحب نے اس سے یہ منزل خرید لی تھی۔ آپ شاید سوچ رہے ہوں گے کہ تذکرۂ حالی میں مکان کے تذکرے کی کیا ضرورت آ پڑی۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ حالی صاحب کی شخصیت کی نشو و نما میں اس پرانی وضع کی مخنجم عمارت کا بھی بہت دخل ہے۔ اگر فن کار کا فن اس کے ماحول اور معاشرہ کا آئینہ دار ہوتا ہے تو حالی کا فن بھی یقینی طور سے "اسد منزل" کے زوال پذیر ماحول و فضا اور پُرہیبت سناٹے کا رہین منت ہے۔

آپ نے علامہ اقبال کی نظم "جگنو" پڑھی ہوگی۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

اس نظم میں بیان کئے گئے مناظر کو میں نے جاگتی آنکھوں سے اسعد منزل کی خموش راتوں اور اداس شاموں میں دیکھا ہے۔
عالی صاحب کی نظمیں "میرا دیار غم زدہ"۔ ملگجی شام کی ایک نظم "آگ کی پیاس" وغیرہ کا اگر نفسیاتی مطالعہ کیا جائے تو اس ماحول و منظر کی ایک جھلک ضرور دیکھنے کو مل جائے گی جس میں ان کا بچپن اور شباب گذر رہا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

یہ میرا قریۂ ویراں، یہ مسکنِ غمگیں	عجیب کرب یہ حقائق کا رہ چکا ہے امیں
زوال عہد کہن کی کھلی ہوتی تصویر	تمام کہنگی و خستگی کے ہیں آثار
رمق رمق سے شکستہ جگہ جگہ سے فگار	ازل سے آج تلک ایسے حادثوں کا شکار
کہ جن کے بارِ الم سے نجات ہو دشوار	نہ جانے کتنے دلوں کی دھڑکن سمیٹے ہوئے
ہزاروں گرسنہ روحوں کا غم دبائے ہوئے	گزشتہ یادِ الم کی صلیب اٹھائے ہوئے
شفقتہ درد سے دن رات آہ بھرتا ہے	ملا ہے تیری فضاؤں سے جو مجھے اب تک

تری خوشی کے لئے سب نثار کرتا ہوں

(میرا دیارِ غم زدہ)

ایک خط میں بھی وہ "اسعد منزل" کی تعریف اس طرح کرتے ہیں :۔
"اصل یہ ہے کہ وہاں کے ماحول اور یہاں کی فضا میں بہت سی مغائرتیں ہیں، وہاں تنہائی پانے کے لئے اہتمام کرنا پڑتا تھا اور یہاں اکثر و بیشتر اکیلا رہتا ہوں، دل لگنے کے سامان اور واقف کتابیں ہوں تو لکھنے پڑھنے کے لئے اس سے اچھی جگہ مشکل ہی سے مل سکے گی لیکن نہ یہاں پہلی چیز میسر ہے نہ دوسری"
(یہ خط ۱۹۶۲ء میں اسعد منزل سے ہمیشہ ہم لوگوں کے پاس لکھا گیا تھا)
ایک حساس دل کا ان مناظر میں رہ کر شاعر نہ بننا قدرے تعجب کی بات تھی۔ عالی صاحب فطرتاً بہت حساس، نرم دل اور معصوم سیرت کے مالک ہیں۔ ان کو ان کے نصیب نے اداس کر دیا ہو یا نہیں لیکن اس میں شبہ نہیں بقول فانی مرحوم

مجھ کو مرے نصیب نے روز ازل یہ کیا دیا
دولتِ دو جہاں نہ دی اک دل مبتلا دیا

اور اس "دل مبتلا" نے حالی کو ہمیشہ پریشان رکھا۔ عمر کی اس منزل میں جبکہ ہوش وخرد کی آنکھیں بر طرح دل ہو جاتی ہیں کہ ہر فریب یسے پردا خود بخود اٹھنے لگتا ہے۔ حالی صاحب ابھی بھی بچے کی طرح معصوم نادان اور اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ہاتھوں سراپا آبگینہ نظر آتے ہیں۔ یہ آبگینہ ابھی بھی ذرا سی ٹھیس صہبا سے پگھل جاتی ہے۔ حالی دراصل بے حد حساس ہیں اور حساس آدمی ہمیشہ سوز و ناز میں جلتا رہتا۔ ہر لمحہ اور ہر موقع اس کے لئے ایک "نیا شوق اور نئی برق تجلی" کا حامل ہوتا ہے۔ اسے آپ حالی کی فطرت کی خوبی کہیں یا خامی کہ ان کے اندر ایسی ہوئی بجلیاں ہیں جو ہر لمحہ انہیں بیقرار اور مضطرب بنائے رکھتی ہیں۔ یہ سیمابیت ان کی سیرت کا ایک بہت اہم پہلو ہے جسے ہم کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کر سکتے ہیں

حالی صاحب اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے اور والدین کی سب سے پیاری اولاد تھے ان کی والدہ مرحومہ انہیں بے حد عزیز رکھتی تھیں اور بڑی عمر تک وہ ماں کی زبانی "ننھے" ہی کہلاتے رہے ہم لوگ بھی کبھی کبھی مذاقاً انہیں "ننھے ماموں" کہہ کر چھیڑتے تھے۔ صحت شروع سے ہی کمزور، مزاج میں تندی اور نزاکت بھی کافی۔ کھانے پینے میں بہت سست۔ کھانا خوش ہو کر یا پسند کے ساتھ شاید ہی کبھی کھاتے ہوں۔ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک وہ جو کھانے کے لئے جیتے ہیں اور دوسرے وہ جو جینے کے لئے کھاتے ہیں۔ حالی صاحب دوسری قسم میں آتے ہیں اس لئے صرف ضرورتاً کھاتے ہیں، شوقیہ نہیں غالباً یہی وجہ ہے کہ جوانی سے لے کر ابھی تک ان کی صحت کا ایک ہی انداز ہے ——— اپنے دل کو دکھ دینے کرنے میں انہیں ہمیشہ ہی لطف ملا ہے۔ اپنے پرائے ان کی اس عادت پر کڑھتے رہتے ہیں لیکن انہیں شاید اسی میں یک گونہ سکون ملتا ہے۔ اس خیال کی تائید میں میں ان کے ذاتی خطوط سے حوالے پیش کرنا چاہوں ملاحظہ ہو:-

" انتشار ذہنی کا جو تازہ سامان پیدا ہو گیا ہے اس سے تم بھی واقف ہو، کہنے والے کہتے ہیں اور تم نے بھی سنا ہو گا کہ :-

TIME IS THE BEST HEALER OF ALL SORROWS

لیکن میرا یہ معاملہ عجیب و غریب نکلا، امتداد زمانہ یہاں بالکل برعکس نتیجہ دکھلا رہا ہے۔ میں سمجھتا تھا چند دنوں کا کھٹکا ہے اور بس، کیا معلوم تھا یہ ایک روگ بن جائے گا مگر اس کے بعد بھی میں اس اقدام کا قائل نہیں جو بعض لوگوں کی نظر میں اس مسئلہ کا حل ہے۔"

" میں کل یہاں جسمانی حیثیت سے تو ضرور ہی بخیریت پہنچا لیکن ذہنی اور قلبی حیثیت سے منتشر اور مضطرب۔ میری جذباتی اور حد درجہ حساس طبیعت نے مجھے ہمیشہ ہی پریشان رکھا ہے۔ مگر یقین جانو کہ اس نوع کے آلام ہزار دشمن جان سہی لیکن مجھے یہ بھی عزیز ہیں۔"

ان کے شعری مجموعہ "سوز جلتے دنوں کا" شاید اسی آگ کی لپیٹ میں لکھا گیا ہے۔ اسی لئے میں اکثر مقامات پر جذبات و احساسات کی شعلگی قابل دید ہے۔ ——

نا پیمانہ جی لیا

شعر ہے وہ یادگار فسانہ حالی جی انسانہ جیا ہے ۔۔۔ جاگ کے پچھلی رات کو تم جو کرتے ہو تحریر

ایک پیچ کا پتھر ہی سہی پھینک تو دالی ۔۔۔ اب وقت کے سوتے ہوئے صحرا کو جگا بھی

جانے کتنی دور اس کی لہر مجھ کو لے گئی ۔۔۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ دریائے بے پایاں نہ تھا

اس کے رنگ و صورت کے جگنو تھے دامن میں لیے ۔۔۔ کھو کے سب کچھ آنے والا بھی تہی داماں نہ تھا

نظموں کے بعض حصوں میں بھی اس درد کی جھلک بڑی واضح شکل میں نمایاں ہوتی ہے مثلاً ؎

چراغ آرزو بجھا ، ایاغ رنگ رو گیا
وہ بام شکل یار [illegible] وہ نشیمن [illegible] گیا
امنگ وہ ولولہ وہ جوش جستجو گیا
متاع زندگی کو [illegible] میں بھی کہیں [illegible] گیا

(روشنی کا جھلیہ)

جوانی کی اس محبت میں [illegible] کا وار اتنا گہرا نہیں تھا لیکن دوسری محبت کا اثر بڑا دیرپا اور گہرا تھا ۔ اگر میں یہ کہوں کہ وہ ابھی بھی اس ستم جاں کو فراموش نہیں کر پائے ہیں تو شاید غلط نہ ہوگا ۔ یہ اور بات ہے کہ امتداد زمانہ نے اس وحشت کو بھسکا ضرور کر دیا ہے ۔ خدا کا شکر ہے ورنہ خدا نخواستہ حالی صاحب اپنا ذہنی توازن ہی کھو دیتے ۔ اُن کی رومانی زندگی وہ نرم حصہ ہے جس پر علیحدہ سے [illegible] مضمون لکھا جا سکتا ہے کیونکہ مستقل ہی جائیے [illegible] تجربات کے لئے ۔ اس مختصر مضمون میں تفصیل کی گنجائش کہاں ۔ مختصر یہ کہ ان کی رومانی زندگی کا حق [illegible] یہ ہے کہ ؎

محبت کے سیاہ دریا میں شعلۂ امید !
نہ جانے کون سے زندگی کے کنویں میں ہے روپوش
نہ تیری یاد سے [illegible] نہ تجھ سے وابستہ
کوئی رشتہ بھی تو آیا ان اداسیوں کا نام

(یہ نام اداسی)

یہاں میں ان کے ایک پرانے خط کا حوالہ دینا مناسب سمجھوں گی ۔ اس سے ان کی افتاد طبع کو سمجھنے میں مزید آسانی ہوگی

" لیکن میں نے حتی القدور فرائض کو اہمیت دی ہے اور اپنے آپ پر جبر ڈال کر فرض کی طرف اول توجہ دی ہے ۔ یہی سبب ہے کہ میں اسوقت تک اپنے تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھ سکا اور آئندہ بھی انشاء اللہ میں اپنے مطمح نظر تک پہنچ سکوں گا ۔ فرض اور محبت کے مرتبوں اور دونوں کی قدروں کا اندازہ نہ ہوتا تو نہ جانے میں کتنا عظیم الشان بے کار آدمی ہوتا ۔ تم دعا کرو کہ اعتدال و توازن کا یہ خیال مجھے ہمیشہ رہے تاکہ میں وہ کر سکوں جو کر سکتا ہوں "

(مورخہ ۱۴ اکتوبر [illegible] بمقام اسد منزل پورنیہ)

ہش کہ اُن کو کوئی بہترین ساتھی یا رہبر ملا ہوتا۔ اپنی ابتدائی زندگی میں انہیں بہتر رہبری بھی تھی۔ ان کی
یوہ محترمہ پھر تو تا علک، پوری صاحب کی ذات نے۔ ان کی جذباتیت اور تلون مزاجی کو صحیح راستہ دکھایا مگر
الدہ علمی کی زندگی ختم کرنے کے بعد جب حالی صاحب نے عملی زندگی میں قدم رکھا تو ایک ایسے خلا سے دوچار
ئے کہ جہاں رہبر اور چاہنے والے تو بہت ملے مگر علامہ جمیل مظہری صاحب کے الفاظ میں۔ ع

ایک بت بھی نہیں ایسا کہ خدا جس کو کہیں

لی صاحب کی شخصیت کو ضرورت تھی ایک ایسے ہی بت کی۔ مگر کسی نے انہیں صحیح طور سے نہیں سمجھا۔

گزشتہ سال جب وہ TEACHERS STRIKE کے موقع پر بھاگلپور سنٹرل جیل آئے تھے اور ایک
ی قلیل مدت میں مختلف کمیٹیوں کے ممبر بن گئے تو اُن کی اس حالت کو دیکھ کر مجھے غالب کا یہ شعر نہ جانے
یوں یاد آ گیا تھا۔ ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ن کے بہت سارے پروگرام اسی لئے ناکامیاب رہے کہ انہیں مردم شناسی نہیں آتی۔ اُن کے درمیان ہر
ت لوگوں کی بھیڑ رہتی ہے۔ سب اپنی اپنی غرض سے آتے ہیں لیکن حالی صاحب ان کی خاطر اپنی صحت،
یا وقت، اپنا ذہن سب کچھ برباد کرتے ہیں اور ——— بیشتر اوقات وہ کام نہیں کر پاتے جو ان کی دلی
موں کے مقابلہ میں زیادہ اہم اور ضروری ہیں۔ ——— دراصل مصلحت کیشی اور دور اندیشی یہ دو چیزیں
نہوں نے کبھی سیکھی ہی نہیں جو آج کے دور کے لئے ضروری ہیں۔

۱۹۶۲ء کی بات ہوگی انھوں نے ایم۔ اے کا امتحان دے دیا تھا۔ بعض کا بیان اُن کی بیئہ میں ہی تھیں
، جانتے تھے کہ کہاں ہیں؟ لیکن ہم لوگوں کے کہنے پر بھی وہ پیروی کو نہ گئے۔ انہیں شاید اپنی اصول پسندی
ر اعلیٰ صلاحیت پر غرور تھا لیکن جب رزلٹ شائع ہوا تو فرسٹ کلاس میں تیسری پوزیشن دیکھ کر اندر سے
کل ٹوٹ گئے۔ انہیں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ وقت کے تقاضے کیا ہیں؟ لیکن وقت کے تقاضے پر چلنا
ید اُن کے بس سے باہر کی بات ہے۔

وہ ہم لوگوں کے قریب تقریباً پانچ سال رہے۔ یہ عرصہ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۶ء پر محیط ہے۔ کسی شخصیت کی
شناخت کے لئے پانچ سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا ہے ——— میں حالی صاحب کے بارے میں جتنا کچھ جانتی ہوں
آج میری یہ جانکاری ہی میرے لئے معصیت ہو چکی ہے۔ مرزا غالب کے الفاظ میں بھی کچھ ویسی ہی دشواری
سوس کر رہی ہوں کہ۔ ع دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

ات دراصل یہ ہے کہ اس نوع کا مضمون لکھنے کے لئے شخصیت خاص سے گہری وابستگی کے ساتھ جو بے تعلقی
اپئے میں خود کو اس کا اہل نہیں پاتی مگر جب اٹھا ہی لیا ہے تو حتی الامکان میری خواہش اور کوشش یہی ہے کہ میں ہر
نس کے تعصبات اور جذباتیت سے علیحدہ ہو کر ان کی سیرت کا صحیح نقشہ پیش کروں۔ اس کے باوجود بھی مجھ سے
بھول چوک ہو جائے تو پھر آپ مجھے معاف کر دیں گے اور اگر نہیں کرنا چاہتے ہیں تو پھر جمیل منظر صاحب کو
پکڑیئے جنھوں نے مجھے اس جھمیلے میں الجھا دیا ہے اور خود دور کھڑے مسکرا رہے ہیں ———
ہاں تو میں نے آپ کو یہ بتایا تھا کہ حالی صاحب سے میری ملاقات پہلی بار ۱۹۶۲ء میں ہوئی تھی ———

ہم لوگ تمام بھائی بہنوں اور والدین کے ساتھ گرمی کی تعطیل گذارنے " اسد منزل " گئے ہوئے تھے۔ وہاں اس وقت نانا، نانی، خالہ، خالو، ماموں، ممانی، اور ان کے بچوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ ہر وقت ادب و شعر کی دلچسپ گفتگو ہوا کرتی تھی، خالو محترم فیاض صاحب کی نکتہ سنجیاں اور ان کے بلند بانگ قہقہے ہنوز یاد آتے ہیں۔ لیکن جس شخصیت نے ہم تمام بھائی بہنوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ چھوٹے ماموں یعنی حالی صاحب کی ہی شخصیت تھی۔ دبلا پتلا چھریرا جسم۔ میانہ قد۔ تیکھے نقوش، کھلتا ہوا رنگ اور سیاہ گھونگھر والے بال والی یہ شخصیت ہمارے والدین کے ساتھ ساتھ ہم تمام بھائی بہنوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ یہ ان کا ہی قول ہے " حقیقت یہ ہے کہ اخلاق کا بڑا حصہ انداز گفتگو اور طرز کلام و حسن گفتار سے بھی پیدا ہو جاتا ہے " اور ان کی سیرت خود ان خوبیوں کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت جلد غیروں کو بھی اپنا بنا لیتے ہیں۔ ان دنوں حالی صاحب بی۔ اے اردو آنرز کا امتحان دے کر رزلٹ کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کا رزلٹ ہم لوگوں کے سامنے ہی شائع ہوا۔ وہ بی۔ اے اردو آنرز میں اول آئے تھے۔ یہ بہت بڑی خوشی کی بات تھی۔ لیکن حالی صاحب اور ان کے گھر والوں نے اتنی بڑی خوشی کا استقبال بھی بڑے معمولی طریقہ سے کیا ——— ہم لوگوں کو قدرے حیرت ہوئی۔ کیونکہ ہمارے یہاں ایسے موقعوں پر کافی دھوم ہوتی تھی۔

میرے والد محترم جناب سید عطاء الحق مرحوم نے انہیں زبردستی اپنے ساتھ پٹنہ چلنے پر آمادہ کیا۔ ماں کی شدید محبت بیٹے کو نظر سے دور بھیجنے کے لئے کسی طرح رضامند نہیں تھی۔ لیکن میرے والد محترم کی ضد اور حالی صاحب کے شوق نے انہیں پٹنہ یونیورسٹی کا طالب علم بنا ہی چھوڑا۔ پٹنہ یونیورسٹی کا یہ BATCH بھی عجیب بہار BATCH تھا۔ علیم اللہ حالی۔ لطف الرحمن۔ علی حیدر ملک۔ قمر اعظم ہاشمی۔ ظفر اوگانوی صاحبان اور لڑکیوں میں عصمت آرا۔ اعجاز بانو صاحبہ وغیرہ۔ اسی سال کی پروردہ ہیں) وہ ہم لوگوں کے ساتھ قاضی پیلکا اور ٹر پٹنہ میں قیام پذیر ہو گئے۔ ان کی خوددار فطرت بہنوئی کے گھر رہنے سے انکار کرتی رہی لیکن والد محترم اور ہم لوگوں کی محبت نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ ہم لوگوں سے دور نہ ہوں۔ ان دنوں وہ شدید ذہنی کشاکش میں مبتلا رہتے تھے گھر کی یاد، مستقبل کا خیال، ان دونوں میں بہت دنوں تک کھینچا تانی ہوتی رہی۔ عام آدمی کی طرح وہ آسانی سے نئے ماحول سے مطابقت نہیں پیدا کر پاتے ہیں، ADJUSTMENT میں وقت لگا۔ لیکن جب ADJUST کر گئے تو پھر جو حالت تھی وہ انہیں کے الفاظ میں سنئے:۔

" میں سوچتا ہوں یہاں یہ عالم ہے تو پٹنہ کا کیا رنگ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں کی گرمی کا تصور کرکے ہی روح کانپ جاتی ہے۔ لیکن یقین جانو اس کے بعد بھی وہاں کے لئے دل لگا ہوا ہے۔ تم لوگوں کی محبتیں یاد آتی ہیں تو دل چاہتا ہے جلد واپس ہو جاؤں "

دوران تعلیم میں امتیازی نمبر لانے کے صلہ میں انہیں پٹنہ یونیورسٹی سے اسکالرشپ ملنے لگی۔ اس کے بعد انہوں نے قدرے راحت لی۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ ان کی شخصیت کبھی کسی کے لئے بار رہی ہو۔ حتی الامکان وہ سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں

اے اہل بزم جشن چراغاں منا تو لو
ہرچند اس میں میرے لہو کا دیا جلے

(علیم اللہ حالی)

وہ پڑھنے میں بڑے محنتی تھے۔ ایم۔ اے کے دوران ہی انھوں نے LAW میں بھی داخلہ لیا اور صبح سے
گئی رات تک اس طرح محنت کرتے کہ ہم لوگوں کو ان کی حالت پر افسوس آتا۔ عام بچوں کی طرح وہ گھر سے روپے
وغیرہ نہیں منگواتے تھے بلکہ اپنی کفالت خود کرنے کی کوشش کرتے۔ مالی حیثیت سے وہ ان دنوں بڑی اوسط زندگی
گذارتے تھے۔ عموماً ایک ہی پتلون اور شرٹ کو کئی کئی روز لگاتار پہنتے۔ پینٹ کی کریز بچا کر وہ تکیہ کے نیچے
بڑی احتیاط سے داب دیتے اور دوسرے روز پھر بڑے سلیقے سے اسے پہن لیتے۔ اس زمانے میں ان کے بستر
پر کتابوں کا انبار رہتا تھا۔ سرہانے۔ دائیں بازو۔ بائیں بازو۔ ہر طرف کتابیں ہی کتابیں اور انہیں کتابوں
کے درمیان وہ نیند بھی سو لیتے ——— کبھی موڈ شاعرانہ ہوتا تو پھر تمام رات کروٹیں بدلتے گذر جاتی۔
صبح دم آنکھیں گلابی ہیں اور چہرے پر غضب بیداری کا اضمحلال ——— شاعرانہ موڈ عموماً رات کے نصف
پہر ہی ہوتا۔ دوسروں کو تکلیف نہ ہو۔ اس خیال سے وہ لائٹ نہیں جلاتے اور اندھیرے میں ہی خستہ
حال کاغذ پر پنسل کی مدد سے اشعار منتقل کر لیتے۔ بعد میں پھر اسے سلیقے سے آراستہ کرتے ——— مجھے یہ خوش
نصیبی حاصل تھی کہ وہ سب سے پہلے اپنا تازہ کلام مجھے ہی سناتے۔ میں کچھ سمجھتی اور کچھ نہ سمجھتی لیکن بڑی متانت
سے "ہوں ہاں" کرتی جاتی۔ وہ بھی اس حقیقت سے واقف تھے اس لئے انھوں نے میرا نام "بز اخفش" رکھا تھا
اور پھر لطف لے لے کر "بز اخفش" کی کہانی مجھے سناتے۔ اس زمانے میں ان کی طبیعت میں مزاح کا عنصر بھی کافی
تھا۔ تحریر اور تقریر دونوں میں وہ پر لطف تھے۔ مثال دیکھئے :۔

"پتہ نہیں میرے گرم کپڑے آئے یا نہیں' ایسا نہ ہو کہ ایک دن خبر ملے کہ وصولیابی کی میعاد گزر چکی ہے
اور کپڑے نیلام پر چڑھ چکے ہیں۔"

(نجی خط سے)

مذہب کی طرف بھی اس وقت ان کا خصوصی رجحان تھا۔ نماز پنج گانہ بڑی پابندی سے ادا کرتے تھے۔
علی الصباح قرآن پاک کی تلاوت بھی چند ہی منٹ کے لئے ضرور ہوا کرتی۔ رمضان کے زمانے میں ناتوانی اور شدید
محنت کے باوجود روزہ رکھنا ضروری تھا۔ میں اپنی بات کی تائید میں انہیں کے خطوط سے حوالے پیش کرتی ہوں۔

" ابھی عشاء کی نماز پڑھ کر آیا تو تم سب بُری طرح یاد آگئیں۔ تو سچ سچ بتا دوں کہ نماز کے
دوران ہی میں تم لوگوں کی یاد آئی اور ٹالے نہیں ٹلی' مجبوراً اب قلم سنبھالا اور خط لکھنے بیٹھا ہوں۔"

ایک اور خط جو لکھنؤ سے ۲۸ نومبر ۱۹۶۲ء کو تحریر ہوا ہے اس میں اس طرح رقم طراز ہیں :۔

" پروگرام کے مطابق ہم لوگ (وفا ملک پوری صاحب اور حالی صاحب) لکھنؤ آگئے ہیں' علی عباس
حسینی صاحب کے یہاں مقیم ہیں اور ان کے ساتھ مختلف اہم شخصیتوں سے مل رہا ہوں۔ اب تک
موصوف کے علاوہ مولانا اختر علی تلہری۔ سیتیش بترا۔ رام لعل۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی۔
مسعود حسن رضوی۔ خیر بہرودی۔ اور مقبول احمد لاری وغیرہم سے ملاقات ہو چکی ہے۔ مختلف جگہ کوششیں
ہو رہی ہیں۔ یہ سب کچھ ہے مگر نہ جانے کیوں دل پر غم کی کیفیت چھائی ہے اس کا مداوا کیا ہے۔ کچھ سمجھ
میں نہیں آتا۔ میں اپنی بعض غلطی کر دینے سے بہت ڈرا ہوا ہوں' یہ میری فکر کم کر دیں گی ......
تم لوگ میرے سکونِ دل کے لئے نمازوں میں دعا کرو۔ مگر پہلے نماز پڑھو تو سہی ———"

پتہ نہیں آج ان عادتوں میں کتنی عادتیں ان میں موجود ہیں کیونکہ اب تو میں ان سے کافی دور ہوں اسی لئے تو میں نے
اس مضمون کا عنوان "حالی ——— یادوں کے آئینہ میں" رکھا ہے۔

دراصل حالی صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت پر ان کے گھریلو ماحول کا خاصا اثر تھا۔ ان کی والدہ اگر مذہبی عورت تھیں، شعر و شاعری کا بھی ذوق اُنس تھا اور بذلہ سنجی و لطیفہ گوئی میں بھی کمال رکھتی تھیں۔ طبیعت میں نفاست اور نزاکت غضب کی تھی۔ کیا مجال کہ کوئی ان کے بستر پر بیٹھ جائے۔ وہ بڑی خود دار، خود بیں اور خود نگر عورت تھیں، حالی صاحب اپنی ماں سے بڑے متاثر تھے۔ اپنے دادا مرحوم حافظ عبد اللہ مشکل پوری جو خود بھی اپنے وقت کے ایک اچھے شاعر اور حافظ قرآن تھے۔ گو ذہنی طور پر ان کا اثر رہا ہوگا۔ لیکن آہستہ آہستہ حالی کی سیرت میں تغیر رونما ہوتا گیا اور ایک لمحہ ان کی زندگی میں ایسا بھی آیا ہے جب وہ اختر الایمان کی طرح خود اپنے آپ سے یہ سوال کرتے نظر آتے ہیں۔ ع

وہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو — ؟

قصہ کا وہ معصوم نوجوان شہر کی بھیڑ میں اس طرح گم ہو گیا کہ اس کی شخصیت ریزہ ریزہ ہو گئی۔

میں ریزہ ریزہ وہ گزار ایسا ہوں
وہ انتشار نہیں ہے میرے لمحہ لمحہ آج (علیم اللہ حالی)

شخصیت کا یہ انتشار، یہ بکھراؤ، حالی کی زندگی کا ایک بہت بڑا المیہ ہے وہ آج ایک کامیاب، خوشحال زندگی گذار کر بھی شاید اندر سے مطمئن نہیں۔ ایک، لامعلوم تشنگی، ایک ان دیکھی خواہش ان کی شخصیت میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ ان کی زندگی بسا اوقات کسی ڈرامہ کا المیہ سین نظر آتی ہے۔

حالی کیا تھے، کیا ہیں یہ تو میں نے سنا دیا، مستقبل انہیں کیا بنائے گا اس کا فیصلہ تو مستقبل پر ہے۔ خدا کرے کہ ان کے خواب پورے ہو جائیں اور ہم اردو شعر و ادب کے ایک ہونہار شجر کو اچھی طرح پھلتے پھولتے دیکھ سکیں۔ آمین!

ختم کر رہی ہوں مگر اس احساس کے ساتھ کہ ؂

الفاظ تھک کے بیٹھ گئے راہ میں مگر
طے ہو سکا نہ آج بھی اظہار کا سفر

(علیم اللہ حالی)

علیم اللہ حالی کی نظمیں - ایک مطالعہ

ایم۔ قیصر زماں قیس

پیرا ڈائز لوج - تیواری ٹینک روڈ - رانچی ۱

سنہ ۱۹۶۰ء کے بعد ابھرنے والے شعرا میں
علیم اللہ حالی اپنا ایک منفرد لب و لہجہ رکھتے ہیں۔
ان کی نظموں میں خارجی زندگی کا ادراک بھی ہے اور
داخلی زندگی کے پیچیدہ مسائل بھی، اس کے ساتھ
تشکیکیہ محرکات بھی ہیں۔ انھوں نے روایت سے
استفادہ بھی کیا ہے اور اظہار کے نئے پیرائے کی
تلاش و جستجو بھی۔ ان کی نظموں میں نہ تنہا موضوع اور
طرز فکر کو اہمیت حاصل ہے، نہ ہی ہیئت کا
چونکا دینے والا تجربہ۔ چند نظمیں اکہری شاعری کا
نمونہ ہیں، جن میں حیات بے زاری کے جذبے اور خارجی
کائنات سے بے تعلقی کے احساس کو جلتے ہوئے لیکن
ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ تشکیک آمیز فکر رد
علیم اللہ حالی نے بطور تخلیقی رویہ استعمال کیا ہے
جیسا کہ ذیل کی نظموں میں دیکھا جا سکتا ہے:

...کیا ہے؟ وہاں کیا تھا؟
...الوں کا یہ سادہ ڈھب
...ہے بدلے ہوئے لہجے کو معنی دے نہیں سکتا
آواز گونج آتے آتے مری آواز کا رستہ نہیں ہے
سماعت ساحلوں کی مطمئن ہوتی نہیں ہے
میں خود کہتا ہوں خود سنتا ہوں
وہ سنتا ہے خود اپنی کہانی
(گہرائی سے ایک آواز)

تم بھی کتنے سادہ ہو کتنے نیک ہو
سارے بھولے اور انجولے غم کو
چھو لینے کی یہ خواہش بھی
کیا مہمل ہے کیسی خود فریب
آئینہ جھوٹا ہے اس کو توڑ دو
یہ طلسم خود فریبی توڑ دو
روز سطح آئینہ پر مسکرا کر ملنے والے
شخص کی باتوں پہ کب تک جاؤ گے
(نرگسیت)

اس قبیل کی بیشتر مختصر اور طویل نظمیں ان کے
vision کے جزو بن گئے ہیں،
جس کی وجہ سے نظموں میں خیالات بکھرے ہوئے
سے نہیں ہیں بلکہ نقطۂ عروج اور خاتمے کا
احساس بھی ہوتا ہے اور شاعر کی ذہنی پرچھائیاں

ایک دوسرے میں پیوست نظر آتی ہیں۔ شاعر ان
سجبوں کو پکڑنے میں ذہنی طور پر الجھتا ہوا نظر
نہیں آتا، کہیں کہیں ایسے ٹکڑے ضرور ملتے ہیں جن
میں شاعر کے ذہن میں کچھ پرچھائیاں ہیں جو آپس
میں ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو گئی ہیں۔ پھر بھی
شاعر نے اپنی بیشتر نظموں میں اس بات کی پوری
کوشش کی ہے کہ ان کی نظم کی زبان اور اس کا
ذخیرۂ الفاظ کے مناسبت سے متنوع ہو۔ اس
طرح کی نظموں میں شکستِ حصار، داستان
دوام، اور سرِ شام ہیں۔

یہ طائر ——
جو ہر شام
کہنہ عمارت کے ٹوٹے کنگورے
پہ تا دیر
دن بھر کی سب داستان کہتا رہتا ہے
—— اور عمارت ——
گئے گزرے لمحوں کی ساری مصیبت،
ہر ایک پل میں مسمار کرتی ہوئی ریزشوں کی صعوبت کا غم
بھول کر
ان صداؤں میں یوں ڈوب جاتی ہے
جیسے یہ آواز ہی
اس کہنہ سالگی کا مداوا ہو
جیسے — یہی اس کی ساری شکستوں کا حاصل ہو
دیوار و در سے کھسکتے قدم
اپنے خالق سے
اک شام کی بھیک اور مانگ کر
اس کہانی کے انجام کو جاننا چاہتے ہیں
—— وہ کہانی
جو بے بس پرندہ کے اظہار سے
آج بھی دور ہے (داستان)

اس نظم میں شاعر نے طائر کی زبانی وہ کہانی بیان
کی ہے جو ابتدائے آفرینش سے آج تک ایک معمہ
بنی ہوئی ہے، اور بے بس پرندہ بھی جس کے اظہار
سے قاصر ہے۔ یہ نظم Allegorical poetry
کا نمونہ ہے۔ اور طائر، انسان ہے۔ اس طرح کی
ایک دوسری نظم کا عنوان " نشان بھولی ہوئی منزل
کا " ہے۔ دونوں نظمیں فکر کی سطح پر ایک جیسی ہیں
وہاں طائر کو جسمی شکل عطا کی گئی ہے اور یہاں
شاعر خود بیان کرتا ہے۔ نظم کے پہلے اور آخری
ٹکڑے یوں ہیں:

نشان بھولی ہوئی منزل کا پہلے بھی تھا اب بھی ہے
مگر جس کا مقدر ہی سفر ہو
اور منزل کا پیارا نہ ملے
ہر آن گردِ نامرادی کی لپیٹ میں لیا جاتا ہو
سفر اس کے لئے رحمت ہو یا ترکِ سفر

یہاں کچھ بھی نہیں
منزل، مسرت، روشنی، رستہ

سبھی موہوم و مہمل سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں
زنجیریں ہی زنجیریں ہیں
عقلمندو! جہاں پر ہو
وہیں رک کر یہ دیکھو تم کہاں ہو'

شاعر بھولی ہوئی منزل کا نشان نہ پاکر تلاش سے عاجز ہے اور احساسِ نامرادی کی کیفیت میں کھو گیا ہے' شعر کی تفہیم دراصل احساس سے احساس کا مکالمہ ہے۔ ان کی نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی روح کا جو کرب ہے وہ ان کی نظموں میں نمایاں ہے۔ ہاں یہ کرب مختلف اوقات میں مختلف محرکات کے تحت الگ الگ لفظوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

لمحہ لمحہ بدلتے ہوئے وقت میں
کون کس کا ہے' کیا ہے' کیسے پوچھئے!
میں بھی' وہ بھی' سبھی
اپنے چہرے کی بنتی بگڑتی لکیروں کو پہچانتے ہی نہیں
آنے والی رتوں کے چلن جانتے ہی نہیں
روز و شب
اک اک پل میں مسمار ہوتی ہوئی
کہنہ دیوار و در
ریزشوں میں ہمیں دفن کرنے کی سازش میں مصروف ہیں
آنوش اپنے چہروں کو اب ہم چھپائیں کہاں
آج تک ہم وہیں ہیں' بتا بھی گئے' دکھائیں کہاں
وہ جو ہم نے شروع سفر
اپنی آنکھوں پہ اقتدار کا پردہ لیا
اور سب باہری منظروں سے کنارہ کیا
اور چلتے رہے
روز و شب' ماہ و سال رہ ہدی
ہم نے ان سب کی پہچان ہی چھوڑ دی
اور پھر یہ ہوا
رشتۂ صدق ٹکڑوں میں بٹتا گیا
وہ بھی سچ ہے' جسے چھوڑ آئے ہیں ہم
یہ بھی سچ ہے' جسے چھوڑ جائیں گے ہم
یعنی جو آج ہے
وہ بھی سچ ہے گذشتہ دنوں کی طرح
ہم کہ کل کے امیں
آج کو اپنی خاطر میں لاتے نہیں۔
(یہ بھی سچ وہ بھی سچ)

اس نظم میں شاعر نے اپنی دلی کیفیت کا اظہار کیا ہے وہ جس عہد جس دَور میں زندہ ہے اور جس دور کے بارے افسوں قصے سنتا آیا ہے۔ اسی کے بیچ اس کشمکش میں مبتلا نظر آتا ہے جسے بیگانگی یا لاحاصلی کہہ سکتے ہیں۔ یہ نظم ہم اپنے اندر مشاہدے اور تجربے کی آنچ کو سنبھال نہیں پائی ہے۔ شاعر آخر کس عذاب میں مبتلا ہے! آیا وہ اپنے حال سے مطمئن ہے یا ماضی سے اپنے آپ کو جڑا ہوا محسوس کرتا ہے؟ نظم "دوام" میں بھی تخلیقی آنچ پر کروٹیں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے' جس کا آخری ٹکڑا یہ ہے:

روزنی ایک جنگ کا منظر، ورنہ مگر انجام پرانا
آج مگر یہ زمزم شعاعیں
دیواروں سے داخل ہو کر
فتح کا اپنی جشن منا کر
ناچ رہی ہیں۔ (دوام)

علیم اللہ حالی نے اپنے شعری طریقۂ کار میں خارجی مشاہدات و تجربات کو بھی موضوع بنایا ہے اور داخلی واردات اور ذاتی کیفیات کو بھی اور یہ دونوں موضوعات مل کر جو تخلیقی پیکر اختیار کیا کرتے ہیں وہ اپنے رنگ و آہنگ اور تاثر کے اعتبار سے ایک جیسا ہے۔ ان کی نظموں میں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ شاعر نے خارجی مشاہدات و تجربات کو اس وقت نظم کے پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے جب وہ ان کے داخلی محسوسات اور شعری وجدان (poetic vision) وتخصیصات سے آمیز ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ ذاتی محسوسات اور تجربات کو جوں کا توں پیش کر دینے کے قائل نہیں بلکہ اسے خارجی تناظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں اور ان کی تقطیع اس طرح کرتے ہیں کہ ان میں ایک طرح کی معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی نظموں میں چند عنوانات یہ ہیں امکان، سرگذشت، الٹی لہروں کے بہاؤ میں، ہواؤں کا حصہ اور ہیستام۔

ان کی ایک نظم "آخری الزام" ہے جو انھوں نے سقوط پاکستان سے متاثر ہو کر کہی ہے:

عقیدے۔ گلیوں کے چند آوارہ مسخرے لونڈوں کی صورت
کھڑے ہوئے
اس غلیظ انبار پر مسکرا رہے ہیں
صحفِ اعلیٰ کہ جن کو صدیوں سے
ہم نے پاکیزگی کی اونچی بلندیوں پہ سجائے رکھا
اب خس و خاک ہو چکے ہیں
بڑے بزرگوں، قدیم بھیجے ہوئے خدائی
سفیروں نے بھائی چارگی، اخوت و آشتی
کہ جو کچھ سماوی تحفے عطا کئے تھے
وہ سبھی سب اب
تمام پاکیزہ رشتہ ناتوں کے ساتھ مل کر فنا ہوئے
تمام نقرے ــــ کہ جو
مقدس زبان میں برکتی تاثر کا دعویٰ رکھتے تھے
اب ہمارے ہی بھائیوں کے لہو میں ڈوبے ہوئے پڑے
کہا گیا تھا کہ
میری رسی کو اپنے ہاتھوں کی ساری طاقت سے تھام
ــــ ادھر وہ رسی جلی ہوئی ہے
ادھر وہ دست بریدہ فریاد کر رہے ہیں
یہ بند مٹھی بتا رہی ہے کہ اب بھی انکی ہتھیلی نہیں پڑی
یہاں بھی سورج ہے سر پہ رقصاں
یہاں بھی ہے آنسوؤں کی بارش
یہاں بھی بے مائیگی کا عالم
اب اور کوئی کس طرح الزام سر چھپانے کا اپنے سر لے

یہ نظم اپنے اندر بے پناہ تاثر اور جذبے کی کیفیت

رکھتی ہے، شاعر نے بے حد متاثر کن انداز میں ان کی شکست خوردگی اور بیچارگی کی تصویر کشی کی ہے، خدا سے شکوہ اور انسان کی معصومیت نظم میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ برصغیر کے بسنے والوں کو شاعر نے اخوت و آشتی کا پیغام دیا ہے۔ ترقی کے دور میں جب کہ انسان چاند کو چھونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اور اس قدر ہوش رکھنے کے باوجود مظلوموں کی آہ و بکا ہر روز سنائی دیتی ہے۔ بھائی بھائی کی گردن کو تلاش کرتا پھرتا ہے کیوں؟

ان کی نظموں کے مطالعہ کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی نظمیں ایک سچی اور پرخلوص شاعری کے نمونے ہیں تو دوسری طرف اپنے دور کے عمومی احساسات و ارتعاشات کی کامیاب مصوری بھی۔ انھوں نے صحافتی انداز کی خارجی شاعری سے ہٹ کر نہایت اور مؤثر انداز کی حامل نظمیں کہی ہیں، انہیں سماجی زندگی کی بصیرت حاصل کرنے اور اس بصیرت کو اپنے شعری ادراک کا جزو بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی مختصر اور طویل دونوں طرح کی نظموں میں یہ خصوصیت برتی ہے کہ

ان سے ایک راہ بھی

نظریں اندرون اور خطوط ہو سکے اور اسے اپنے دل کی آواز مل سکے جس کا قاری ہر سچے شاعر سے

توقع رکھتا ہے، دوسری طرف ان میں ذہنی وسعت اور بلاغت ہیں کہ وہ اپنے دور کی ہمہ گیر اور وسیع تر صداقتوں کا احاطہ کر سکے۔ اس کوشش میں ان کی نظمیں بہت حد تک کامیاب ہیں۔

شعر و ادب کے کھرے کھوٹے کی پرکھ صحیح معنوں میں وقت کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ اگر شاعر وقت کے چیلنج کو قبول کر کے اپنے شعری تخلیقات کو عصری حسیت اور عصری تقاضوں کے تناظر میں برتتا ہے تو اپنے ہم عصر شعرا میں اس کا لب و لہجہ منفرد ہو جاتا ہے۔ علیم اللہ حالی کی شعری روش اس بات کی غماز ہے کہ وہ وقت کے چیلنج کو قبول کریں گے ▲▲

شگفتہ لہجے کا شاعر ۔ علیم اللہ حالی

نبین رامش

معرفت پروفیسر حسین الحق، نیو کریم گنج، گیا

ساٹھ کے بعد اردو غزل نے ایک واضح موڑ لیا اور بلاشبہہ اپنے تمام خدوخال ابھار کر ایک نئے سفر پر روانہ ہوئی۔ وہ سفر جو ساٹھ سے ستر تک کا ہے۔ اردو غزل کو ہندوستان میں بہار کی مٹی کا دین رہا ہے۔ غالب کے عہد سے لیکر یگانہ کے عہد تک یہاں غزل اپنی ارتقائی شکل کے ساتھ اس رجحان شکل پر رواں دواں ہے جو اس صنف کو دنیا کی کسی بھی زبان کی کسی بھی مہتم بالشان شعری صنف کے مقابلے میں لاکر کھڑی کر سکتی ہے [illegible] موضوعوں سے شاد عظیم آبادی تک اور شاد سے جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی تک اور اجتبیٰ رضوی سے مظہر امام اور حسن نعیم سے لطف الرحمن، سلطان اختر ظہیر صدیقی، شمیم فاروقی اور علیم اللہ حالی سے شام رضوی اور عین تابش تک اردو غزل ایک وسیع اور رجحان ساز کائنات پیش کرتی ہے جس کے بغیر اردو غزل اور غزل کا دامن بھرا پرا نہیں کہا جا سکتا۔

علیم اللہ حالی جو ستر اور ستر کے بعد نمایاں ابھرنے والے شعری کارواں کی ایک شکل ہیں، نظم کے بھی ہیں اور غزل کے بھی۔ ان کی شاعرانہ پہچان ان کے لب و لہجے سے تعبیر ہے جو نہ پرانا ہے اور نہ نیا، جو نہ ترقی پسند ہے اور جو نہ غیر ترقی پسند۔ ان کی شاعری پرانے اور نئے کے اس گنگا جمنا سنگم پر بستی ہے جو کبھی واضح نظر آتا ہے اور کبھی غیر واضح۔ اور جو کبھی مظہر امام کی آواز سے ہم آہنگ نظر آتا ہے اور کبھی عمیق حنفی کی۔ اور شاید اسی بات کی طرف انہوں نے اپنے شعری مجموعے "سفر جلتے دنوں کا" کے پیش گفتار میں اشارہ کیا ہے کہ

"میری شاعری ہمیشہ میری گرفت سے باہر رہی ہے"

کمار پاشی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

"جن کے یہاں تخلیق برائے نام ہوتی ہے ان کے لئے بنے بنائے راستوں پر چلنا بہتر ہوتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ادب کے میدان میں ایسے لوگ فوری دوسروں کی توجہ حاصل کر لیتے ہیں اور وقتی طور پر تھوڑی بہت شہرت بھی بٹور لیتے ہیں لیکن جو شخص زرخیز ذہن کا ہوتا ہے بنے بنائے راستوں پر چلتے ہوئے دیر یا سویر اپنے سفر کے لیے کوئی ایسی پگڈنڈی ضرور بنا لیتا ہے جو اس کی علیحدہ راہ کو ظاہر کرتی ہے اور بالآخر اس کے

منفرد طرح شناخت نامہ بن جاتی ہے"۔

حالی نے اپنے بہت سارے ہمعصروں کی طرح
نئے رجحانات اور رستوں پر عمل کر کے بہت جلد اور بہت زیادہ
شہرت تو حاصل نہیں کی لیکن اپنے اس سفر میں انہوں
نے ایک کشادہ راستہ ضرور اختیار کر لیا جو ان کا خاص
کا ضامن ہے۔ اور یوں بھی ان کا فن سستی شہرت سے الگ
رہ کر ہمیشہ فن کی اعلیٰ قدروں کا حامل ہی نظر آیا ہے۔ حالی کے
ہمعصروں میں سلطان اختر غزل کے لیے پہچان ہو گئے ہیں
سے عبارت ہیں جو ایک کلاسیکی فضا پیدا کرتی ہیں ناظر اتی
ہے اور لطف الرحمٰن جو ذاتی طور پر مغربی فلاسفروں سے
قریب نظر آتے ہیں اپنی شاعری کا ڈانڈا اس الہامی اسلوب
سے ملاتے ہیں جو ہمیشہ نیا ہے۔ اور علیم اللہ حالی اس
کلا   اور جدت کو آمیز کر دیتے ہیں جس نے ستّر
کے بعد کی   اردو غزل کے لہجے کو توانائی بخشا ہے۔ ان
کی غزل اور نظم کا لہجہ اس لحاظ سے متوازن ہے کہ دو لہجوں
اضافتیں ان کے یہاں کسی کا تذکرہ کسی سے چھپتا نظر نہیں
آتا۔ ان کی غزلوں کے مضامین واقعی غزل کے مضامین ہیں جو
درد اور رومانیت کا توازن فرگونیٹری اور یکمر یہاں سے مسلسل
گزرتے ہوئے غلام ربانی تاباں اور ارشد کاکوی تک
آجاتے ہیں۔ ان کا لہجہ   ان تمام خوبیاں مگر ان بار
ان کو نہ کبھی کھو اپنے تھے رہنے کی کوشش کرتا ہے اور
یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی اس سادگی سے مطمئن ہیں
جیسا نہیں.........

یہ کیسا عجیب اور طفلانہ وعدہ تھا
جب میں نے اک دن تجھ سے
گرم تپتی دوپہر میں ——— کیا تھا۔

کہ جب بھی میں رات کو سونے لگوں گا تو خواب میں
تجھ کو اور صرف تجھ کو ہی دیکھوں گا
جو تیرے علاوہ کوئی اور خواب میں آگئی تو
میں جھٹ اپنی خوابیدہ آنکھوں کے دروازے کھولوں گا
——— اور نیند کے شہر سے بھاگ ہی جاؤں گا

(نظم "وعدہ")

تجربات کے اظہار پر مجبور رکھتا ہے' اور اس کے
سارے دن سگریٹ کے مرغولوں میں اور
رات بھر خوابوں کا قیدی تھا کرتی

لطیف تجربات سے
ہم گرے بھی تو انا کے غار میں
ٹوٹنے پر بھی ہمارا دم خم رہا

پر تپاک اور شاندار لہجے کی وساطت سے اپنے
شعری سرمائے کو نوازنے والے تجربات کو ہم سفر بناتا ہے۔
آج کی اردو غزلوں سے پرانی علامتیں مثلاً گل، بلبل،
انگبیں، صبا، زلف، اور صراحی وغیرہ جیسی علامتیں بہت
دور رہ گئی ہیں اور ان کی جگہ بے انتہا نئی اور تازہ علامتیں
سامنے آئی ہیں، ایسی تازہ علامتیں علیم اللہ حالی کی شاعری
میں گاہے گاہے بدرجہ اتم ملتی ہیں مثلاً پتھر، آگ، ہوا، شاخ،
دھواں، آئینہ، جلتا سگریٹ، رت، ریت، جنگل، چاند، طائر،
سورج، دھوپ، شام، دریا، ساحل اور تنہائی وغیرہ
اور ان علامتوں کے ذریعہ جدید حسیت کا کامیابی کے ساتھ
اظہار کرنے پر وہ قدرت رکھتے ہیں۔ علیم اللہ حالی کی سب سے
بڑی خوبی لہجے کی سادگی ہے جو مناظر کو ابھارنے اور ان مناظر
سے شاعری کو آراستہ کرنے اور اس آراستگی سے
ایک طلسمی فضا پیدا کرنے میں مدد کرتی ہے۔

اس شہر میں مجھے کوئی پہچانتا نہیں
تک تک کے دیکھتی ہے مجھے ہر نظر

میں اپنے گھر میں ہوں رات سے ٹوٹ کر
پکار کر نہ جگایا کسی نے باہر سے

در بند ہو تو گراں ہے دستک کی صدا بھی
دستک دینے والے کو تو کچھ اپنا پتہ بھی

لوٹ آئے شدتِ تنہائی سے ہم
شہر میں آواز دیتا تو کوئی

سائے اونچے گھر ہوا کی زد میں تھے
میرا ملبہ تھا جو مستحکم رہا

چاندنی سڑکوں پہ آوارہ پھری
بند کمروں میں خلوت کا غم رہا

چلچلاتی دھوپ کی گرمی سے بھر کر بے قرار
میرے کمرے کی کھلی کھڑکی سے گھس آئی ہوا

کھلی آنکھ میں تیلیوں کا تھا رقص
بڑھایا تھا تو کوئی پیکر نہ تھا

یہی صورت حال نظموں کے ساتھ ہے کہ یہ نظمیں بڑے ہلکے پھلکے انداز میں شروع ہوتی ہیں لیکن جیسے جیسے نظم آگے بڑھتی جاتی ہے ایک ایسی ارتقا کا احساس ہوتا ہے جس میں رنگ بھی اور آہنگ بھی

سبک یا گراں ہو
ہمیں تو بہرحال یہ بوجھ شانوں پہ دھرنا پڑیگا
چلو اس جگہ سے اب آگے چلیں ہم
یہاں جانے کتنے شب و روز

چھوری چھپے
وقت کی کہنہ دیوار کی
تنگ سوراخ سے
اپنے بڑھتے ہوئے
بالشتیوں کو تحقیر کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔

نظم "انفعال"

نظمیں پڑھتے پڑھتے قاری کا ذہن سا جاتا ہے کیونکہ آواز اچانک بہت گہری ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور فنکار وقت کا مناظر فنکار اپنی چیخوں سے مقدس معبودوں کی گونج بنتا ہوا محسوس ہوتا ہے اسے جانا فنکار بنتا ہے بعد اس کا فن

مری فطرت
خموشی کے مقدس معبودوں کی رتجگا ان گنت
کیلی ساعتیں
میرے نفس کی ہم نوا ہر غم سے واقف
تجھے اس شہر آئینہ صفت سے دور لے جائے
یہ سب چہرے
مرے پیر تو سبھی لیکن
یہ سب میرے لئے ناآشنا ہیں۔

از ہر پہلے سے پہلے

یہ وہ لہجے ہے جو اچھا نظم گوئی کی پہچان ہے اور اچھی شاعری کی خوبی۔ کیونکہ اس لہجے میں آج کے انسان کی صرف مجبوری ہی نہیں بلکہ اس کے موجودہ حالات کے تجزیہ عمل کی وضاحت ملتی ہے اسے اس کا بھی احساس ہے کہ تمام چہرے

کہ تمام چہرے اس کا اپنا پرتو ہیں، کیونکہ کم و بیش ہر
فرد ایک ہی تنہائی میں سلگ رہا ہے لیکن اس کے باوجود
ایک نا آشنائی ہے جو ان چہروں کا مقدر ہے اور سرمایہ
بھی۔ اور اسی لئے فنکار کو یہ خوف کھا رہا ہے کہ اگر نا آشنا
ؤں کے اس شہر میں کچھ دن اور ٹھہرا تو اس کی
اپنی پہچان بھی مشکل ہو جائیگی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے حالی غزل کو بھی اپنی اور نظم
کو بھی اور مندرجہ بالا باتوں کے آئینے میں ان کے یہاں
وہ تمام شاعرانہ خصوصیتیں موجود ہیں جو ان کی نظموں اور
غزلوں میں شاعری اور سچی شاعری کی ضمانت ہے۔

غزل کے چند بہت سلجھے اشعار ملاحظہ ہوں۔

- کچھ اور درد اٹھایا ہے آئینہ بن کر
  ابھر رہا ہوں میں تصویر خود نما بن کر
- نہ ڈوبنے میں کچھ اپنا قصور تھا حالی
  وہ بڑھ کے آیا تھا خود موج [illegible] بن کر
- الفاظ تھک کے بیٹھ گئے راہ میں مگر
  طے ہو سکا نہ آج بھی اظہار کا سفر
- قریب آیا تو وہ کیسا اجنبی سا لگا
  جو دور سے نظر آتا تھا آشنا کی طرح
- تو درد بن کے خود اپنا مجھے پتا دینا
  میں سو بھی جاؤں تو آنا مجھے جگا دینا

بہر طور ان کا لہجہ خوبصورت ہے اور فکر منظم اور اسلوب
نکھرا ہوا جس میں نیا پن ہے اور شگفتگی اور تازگی۔

- سب حرف تجلی [illegible] اظہار تجلی سے
  جب بھی ہوا اس کے قرب کے آثار تجلی سے

بات بہت پرانی ہے اور بار بار کہی جاتی لیکن بات
جس انداز میں کہی گئی ہے اور پورے شعر میں مجموعی
طور پر اس انداز کو نبھانے کی جو کیفیت ہے وہ
سورج کی طرح روشن ہے، اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ علیم
اللہ حالی اس قسم کے اشعار میں اچھی شاعری کے
اس مقام پر فائز ہیں جس کی بنیادی خوبیوں کا راز
لطافت، نرمی، شگفتگی میں پوشیدہ ہے۔

آخیر میں یہ عرض کرنا ضروری ہوگا کہ حالی اپنے
لہجے، اسلوب اور اظہار کی سادگی دھیما پن اور
شستگی کی بنا پر اپنے آپ کو اپنے ہمعصروں کے
درمیان ممتاز کرتے ہیں اور ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے بیچ
یا ۱۹۷۰ء کے بعد کی اردو غزل کے ارتقائی سفر میں
ان کے نام کی شمولیت اتنی ہی لازمی ہے جتنی پھولوں
کے ذکر میں ان کے رنگوں کی ۔ !!!

نصر غزالی ، دوگانوی
معرفت سید وجاہت حسین، سلطان گنج، پٹنہ-۶

علیم اللہ حالی کی شاعری — ایک مختصر مطالعہ

اردو کی جدید شاعری آوازوں کی بہتات اور احساسات کے تنوع کی شاعری ہے۔ ان حیثیتوں سے یہ اپنی ماقبل کی شاعری سے بآسانی الگ پہچانی جا سکتی ہے۔ جلوؤں کے اس ہجوم میں بسا اوقات قاری اور ناقد کی نگاہیں الجھ جاتی ہیں اور اکثر و بیشتر مقام کے تعین میں دشواری ہو جاتی ہے۔ جدید دور میں جماعت سازی اور رسائل بازی اور تشہیر کے ایسے طریقے بھی استعمال کئے جا رہے ہیں جن کی وجہ سے سچی اور جھوٹی شاعری کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں وقتی ہنگاموں اور اشتہار بازی کے خول سے ہٹ کر سنجیدگی اور ارتکاز کے ساتھ جو شعراء تخلیق میں مصروف ہیں انھیں خراج عقیدت پیش کرنا ہمارا اخلاقی و ادبی فرض ہے۔

علیم اللہ حالی نئی نسل کے ان فنکاروں میں ہیں جنھوں نے اپنے نقوش جریدۂ ادب پر ثبت کر دئے ہیں اور آج اپنے لہجے اور اپنی آواز کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ حالی جیسے خوبرو ہیں ویسی ہی ان کی شاعری بھی خوبرو ہے۔ ان کی شاعری کا آبگینہ تندئ صہبا سے پگھلا جاتا ہے۔ حالی صاحب پیش گفتار میں تحریر کرتے ہیں "شاعری ہمیشہ میری زندگی کی مخالف سمتوں میں سفر کرتی رہی۔ یہی نہیں بلکہ تھوڑی دیر کشتی کے بعد میں نے محسوس کیا کہ خود میرے سفر کا رخ بدل گیا۔ کعبہ میرے پیچھے ہو گیا اور کلیسا آگے ہو گیا۔" (۲) سے ظاہر ہوتا ہے کہ قسام ازل نے شاعری ان کی فطرت میں ودیعت کر دی ہے۔ شاعری ان کی سرشت میں ہے۔ ان کے رگ و پے میں ہے اس لئے ہر حیات سفر میں شاعری بچا کرتے کرتے مسلط ہوتی رہی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حالی فن کے ذریعہ فنکار تک رسائی کے طریقے سے منکر ہو کر اپنے متعلق یعنی ان کا فن، ان کی شخصیت کے مخالف دھارے میں رخ اختیار کرتا ہے۔ اسی لئے وہ شاعری کو سمجھنے کے لئے اسی قسم کا خیال پیش کرتے ہیں۔ "دراصل شاعری کو سمجھنے کے لئے نیم مجنونانہ نیم وحشیانہ بلکہ کسی حد تک احمقانہ کیفیت کا حامل ہونا ضروری ہے اور ظاہر ہے سنجیدہ، وضعدار اور عقل مند لوگ اس دشت میں بھٹکنے کی زحمت ہی کیوں کریں گے۔" یہ حالی صاحب کی اپنی رائے ہو سکتی ہے لیکن ناقد کے لئے یہ کس حد تک درست ہے۔ فن نقد اثبات میں جواب دینے سے قاصر ہے۔ شاعری کی کیفیت نیم مجنونانہ نیم وحشیانہ احمقانہ ہو سکتی ہے لیکن سخن فہمی کے لئے یہ قاعدہ کلیہ اس کے فہم و ادراک میں بے قاعدگی پیدا کر دیگا۔ ہاں سخن فہمی سے سخن سنجی کی سرحد تک پہنچ کر ان کیفیات کا حامل ہو جائے۔ تو کچھ اور بات ہے۔

بہر کیف حالی صاحب کے مجموعۂ کلام "سفر جلتے دنوں کا" میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ نظمیں پابند بھی اور آزاد بھی۔ ان کی غزلوں اور نظموں کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ علیم اللہ حالی کے یہاں عصری آگہی حسیت ان کے ساز و آواز میں حلول کر گئی ہے اور شاعری کے جذبات و احساسات کو ایک آہنگ اور لے عطا

کرتا ہے۔ یہاں ان کا جذبۂ اندرون بھی ملتا ہے اور جلیلؔ دنیا کے سفر کا مشاہدہ و تجربہ بھی۔ ان کی شاعری کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے مروجہ فن اور ہنر الہامیہ ادراک کو یکجا کر کے قلم زد کیا ہے۔ دیکھئے ایک غزل کے چند اشعار جس سے ان کی فکر و فن کی ایک ہلکی سی جھلک ظاہر ہو جاتی ہے۔

الفاظ تھک کے بیٹھ گئے راہ میں مگر — طے ہو سکا نہ آج بھی اظہار کا سفر
نیچے گرے نہ تھے کہ زمیں کھا گئی مجھے — اتنی بلندیوں پہ بنایا تھا اپنا گھر
اٹھنے لگی ہے اب بھی دیوار خاموشی — ملتی نہیں ہے اب تو زباں کو رہگزر

ایک عام تاثر جو حالی کی شاعری کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ حالی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں غزل ان کی خصوصی توجہ کے دائرہ سے باہر ہے لیکن ان کے مجموعہ کے مطالعہ کے بعد اس تاثر کی نوعیت میں فرق آجاتا ہے اور ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ نظموں کے سلسلہ میں شہرت کے حامل اس شاعر نے خوبصورت غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان کی غزلوں میں ایک طرف صنف غزل کے روایتی حسن کا رچاؤ ہے تو دوسری طرف جدید ذہن کی غمازی۔ جدیدیت کیا ہے یہ کس طرح شعر و ادب میں در آئی ہے؟؟ یہ مسائل خاصے بحث طلب ہیں۔ تفصیل سے در گزر کرتے ہوئے مجھے اس سلسلہ میں یہ کہنا ہے کہ جدت دراصل لفظوں کے نادر استعمال، ملائم کی ندرت اور لب و لہجہ کے انوکھے پن میں نہیں ہے بلکہ جدت شاعری میں نئی SERSIBITITIES کے اظہار کا نام ہے۔ یہ SENSIBLITY ہندی کے غزل گو شاعر دشینت کمار اور اردو کے باقی اور ظفر اقبال کے کھردرے لب و لہجہ اور اسلوب میں بھی بھرپور طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح علیم اللہ حالی کی شاعری میں جدت نئے احساسات کے انداز میں سامنے آتی ہے نئے اور خوبصورت الفاظ کی وضع بندی کو حالی نے جدت کے لئے لازمی تصور نہیں کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے حالی کے اس شعری رویہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

آگ ہے اسیر ہے یہ بے شعلگی — اپنے جلنے کا عجب عالم رہا

افلاک تصور کی بلندی سے اتارو — ممکن ہو تو اس شوخ کے کچھ نقش ابھارو

آؤ کہ اسی دل میں ہے اک وسعت آفاق — اے ذرۂ ناچیز کے پوشیدہ ستارو
آئینۂ ایام میں وہ نقش کہاں ہو — کچھ میں بھی تو جانوں مری پامال بہارو
اس تندی صہبائے محبت پہ نہ بھولو — چڑھتا ہوا سورج بھی اتر جائے گا یارو

میں ریزہ ریزہ سر رہ گزار پھیلا ہوں — وہ انتظار میں ہے میرے مجتمع ہونے

سبھی کچھ تھا منظر میں منظر نہ تھا — سمندر میں کودا سمندر نہ تھا

لرزنے لگا بے سبب جسم آب — مرے ہاتھ میں کوئی پتھر نہ تھا

نگاہوں کی بھیک ملی ہے کتاب سے — محروم ہو گئے ہیں بصیرت کی آب سے

نیم وحشی غزل کے یہ متفرق اشعار حالی کے فن و شخصیت دونوں کے آئینہ دار ہیں حالانکہ خود حالی صاحب کو اس سے اختلاف ہے کہ ان کے فن و شخصیت میں ہم آہنگی نہیں۔ یہ فنکار کا خیال ہے ناقدین پر اس کا اتباع لازمی نہیں۔ سالک فن نے سجادۂ غزل کو شراب بصیرت و آگاہی سے رنگین کر دیا ہے۔ یہ سلوک کی منزل بھی ہے اور جنون کا عالم بھی۔ یہ سلوک و جنون حالی صاحب کی غزلوں کو دو آتشہ بنائے دیتے ہیں۔ مندرجہ بالا اشعار اس کی آئینہ داری کرتے ہیں۔

اب آیئے ان کی نظموں پر۔ پابند نظموں کا جہاں تک سوال ہے اس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ یہ تمام نظمیں اچھی اور کامیاب کہی جا سکتی ہیں اور نظم نگاری میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ "گذرے دن کا میلا چادر"، "روشنی کی صلیب"، "بے نام اداسی"، "میرے دیار غم زدہ"، "آخری درد"، "رخصت کی"، "ٹھہرے ہوئے پانی کی سچائی"، "الوداع"، اپنے جلو میں نقش ہائے فکر و فن سموئے ہوئے ہیں۔ نظموں میں شاعر کا حسی تجربہ اور ذہنی فکر ابل پڑتا ہے۔ "روشنی کی صلیب" کا ابتدائی بند ملاحظہ ہو :۔

مجھے چراغ آرزو میں روشنی سی آ گئی — دیار دل کی تیرگی کدھر گئی! کدھر گئی؟
وہ تیرگی کہ جس میں میرا درد تھا چھپا ہوا — یہ ایک پل کی روشنی میں آج کیا سے کیا ہوا

"بے نام اداسی" کے آخری دو اشعار قابل توجہ ہیں :۔

لپٹ کر رہ گئی تاریک میں شعاع امید — نہ جانے کون سے اندھے کنویں میں ہے روپوش
نہ تیری یاد سے ہٹ کر نہ تجھ سے وابستہ — کوئی رکھے بھی تو کیا ان اداسیوں کا نام

"میرے دیار غم زدہ" کے یہ آخری اشعار بھی سن لیجئے :۔

مرا الم، مری افسردگی، مری قسمت — مری گھٹن کے تمنا کے جذبۂ بے تاب،
کبھی ملی جو مقدر میں ایک شعلۂ نشاط — کروں گا اس کو بھی تیری سیاہیوں پہ نثار

علیم اللہ حالی کی نظموں میں بالعموم ایک خود کلامی کی فضا پائی جاتی ہے۔ یہ خود کلامی تنہائی کے شدید تر احساس کا ایک غیر شعوری اظہار ہو سکتا ہے۔ ان کی نظموں "اجنبی اجنبی"، "راگ بے رنگ، دن کا"، [illegible] وغیرہ کا مطالعہ کیجئے تو یہ اندازہ مکمل ہو جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کو قدرت نے دل پر درد عطا کیا ہے اور ان کے معیار دل کے مطابق میراث غم و الم ملی ہے۔ یہ میراث غم و الم نشاط کرب بھی ہے اور سرور زندگی بھی۔ ہاں علیم اللہ حالی صاحب کے اس خیال کی صداقت پر گواہی دینی پڑتی ہے کہ ایسے اشعار [illegible] وحشی بن جایا جائے تو روح کی تسکین کا سامان آسانی سے ہو جاتا ہے لیکن ایسے عام [illegible] استعمال کرنے سے پرہیز کرنا بہتر ہے۔ اس [illegible] آزاد نظمیں بھی ہیں۔ آزاد نظموں کے بارے میں [illegible] آزاد فکر بھی آزاد خیالی بھی [illegible] آزاد اور [illegible] بھی آزاد ہے۔ آزادی بڑی چیز ہے لیکن بقول اقبال۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل — لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

فن کی پاسداری قابلِ تحسین عمل ہے لیکن اسے آزاد اسی حالت میں چھوڑا جا سکتا ہے کہ رطب و یابس نہ ہو جائے۔ بہرحال حالی کے یہاں ایسی بات نہیں ہے۔ اس میں آزاد نظمیں اچھی ہیں اور بے مثال ہیں۔ نظمیں "دو اجنبی اجنبی" ۔ "میرے نو مولود بیٹے کی پہلی سزا" "زلزلے کے بعد" "جزیرہ" "راگ بے رنگ دن کا" جدید نظم بھی قابل بلند مقام کی حامل ہیں۔

جدید دور کے شعری آہنگ کی تشکیل میں جن شعراء کی خدمات قابلِ ستائش ہیں۔ ان میں علیم اللہ حالی صاحب کا نام خاصا اہمیت رکھتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے ناموں کے توسیعی مطالعے پیش کئے جائیں تاکہ شعراء کی وہ نسل جو اب میدانِ سخن میں وارد ہو رہی ہے۔ اپنے ماقبل کے شعراء سے اچھے نقوش حاصل کر سکے۔



نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کیلئے کتاب کی دو جلد ضروری)

نام کتاب: "سفر جلتے دنوں کا" ▲ شاعر: علیم اللہ حالی ▲ صفحات: ۱۲۸ ▲ قیمت: ۲۰ روپے
سن اشاعت: ۱۹۸۷ء ▲ پتہ: فخرالدین ہاؤس۔ لنگر ٹولی۔ پٹنہ ۴

"سفر جلتے دنوں کا" کے شاعر علیم اللہ حالی کا نام اردو ادب خاص طور پر اردو شاعری میں ایک اہم اور معتبر ہے۔ انھوں نے اپنے گہرے مطالعے و مشاہدے کی روشنی میں فکر و فن کا جو نمونہ اپنی نظموں اور غزلوں میں پیش کیا ہے وہ [illegible] اپنے ہم عصر شعراء میں ایک اہم مقام عطا کرتا ہے

حالی نے نظم و غزل، دونوں ہی صنف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے اور ان کی نظموں اور غزلوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ دونوں ہی صنف شاعری میں نہ صرف کامیاب ہیں بلکہ ان کی بعض نظمیں اور غزلیں ایسی ہیں جو اردو شاعری میں یقینی طور پر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

علیم اللہ حالی نے اپنے اس مجموعہ کلام میں پیش گفتار کے تحت ایک جگہ لکھا ہے:

"شاعری کو سمجھنے کے لیے [illegible] بلکہ کسی حد تک [illegible] کیفیت کا حامل ہونا ضروری ہے۔"

میں حالی کی اس بات سے اصولی [illegible] کیفیت کی حد تک متفق ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی شاعر کی شاعری کو سمجھنے کے لیے قاری کو خود بھی ان کیفیات، تاثرات اور احساسات و جذبات میں ڈوبنا پڑے گا جن کیفیات، تاثرات اور احساسات و جذبات سے شاعر دوچار ہوا اور اس سے تحریک حاصل کر کے اس نے کوئی شعر، کوئی غزل یا کوئی نظم تخلیق کیا۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ جس شخص کے اندر شعر پڑھتے وقت کبھی کبھار بھی وہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی جن کیفیتوں سے شاعر گزرا ہے، وہ واقعی بدقسمت ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ایسے شخص کے لیے حالی کی شاعری نہیں ہے، جس کی بنا پر وہ "سفر جلتے دنوں کا" کے مطالعہ کے بعد ایک جگہ اسے یہ لکھنا پڑا کہ —

"[illegible] شعری مجموعہ کا حد تک حالی کی غزلیں بس [illegible] ہیں جن سے شعری مجموعہ کی ضخامت بڑھائی جاتی ہے اور بڑھائی گئی ہے۔"

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حالی نظم اور غزل دونوں کے ایک اہم اور معتبر اور منفرد شاعر ہیں [illegible] نے عصر حاضر کے انتشار و اختلال، تہذیبی قدروں کی شکست و ریخت، [illegible]

بے بسی، بے قدری اور ناآسودگی وغیرہ کو
شدت سے محسوس کیا ہے۔

حالی کی نظموں اور غزلوں میں جو تصویریں دیکھنے
کو ملتی ہیں وہ بے حد ہیبت ناک، دردناک اور
کربناک ہوتے ہوئے بھی حقیقی اور سچی ہیں۔ ان
کی صداقت سے انکار ممکن نہیں۔ حیات و کائنات
کے درد و غم اور جستجو و آرزو کو حالی نے بڑے
موثر اور فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

تہہ کے اندر جانے پر کیسا ہیجان اٹھا ہے
پانی ٹھہرے تو ہم دیکھیں کیا کیا موتی غرق تھا ہو
ٹوٹ پھوٹ کا سیلاب تھمے تو لمحہ بھر کو ہم بھی
ساکت پانی کا سپنا آنکھوں میں سر ماتھے کو چھوتا
ٹھہرے ہوئے پانی کی سچائی!

حالی کے اس مجموعۂ کلام میں اور بھی نئی نظمیں ہیں
مثلاً "فطرت کا مقدر، وعدہ، آخری درد، ایک
کہانی اور جزیرہ" وغیرہ مخصوص فکر کے ساتھ
ساتھ دعوت فکر بھی دیتی ہیں۔

نظموں کے ساتھ ساتھ حالی کی غزلیں بھی فکر و
فن کے لحاظ سے بے حد متاثر کرتی ہیں۔ چند اشعار
ملاحظہ ہوں۔

صفر ہے دھند کا تو کوئی رد نوا لے جا
میرا سکوت نہ ہو تو میری صدا لے جا

ٹوٹ آتے ہے وحشت تنہائی سے ہم
شہر میں اکثر دو کوئی

سارے درد سگریٹ کے مرغولوں میں بند
راستہ بھر خوابوں کا قید عنایت کر دی

ہم گرے بھی تو وقت کے غار میں
ٹوٹنے پر بھی دھیان دم خم رہا

حالی اپنے اشعار میں جہاں اپنے دل کے درد
و داغ کی باتیں کرتے ہیں، وہیں زندگی اور کائنات
میں رونما ہونے والے حادثات اور واقعات کو
اپنے مطالعے، مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں
پیش کرتے ہیں۔ جن میں متنوع رنگارنگی، تازگی، شگفتگی
اور گہری بصیرت اور بصارت کا خوبصورت انداز
بھی کارفرما نظر آتا ہے۔

"سورج نے ڈوبنا کا" کی کتابت، طباعت
اور سرورق بہتر ہے — قیمت بھی مناسب
ہے۔

▲ نام کتاب: احتساب
▲ مصنف: ڈاکٹر علیم اللہ حالی
▲ صفحات: ۱۴۲ ۔ قیمت: ۱۵ روپے
▲ سن اشاعت: ۱۹۸۰ء
▲ پتہ: فخرالدین ہاؤس، سنگر ٹولی، پٹنہ ۴

ڈاکٹر علیم اللہ حالی بنیادی طور پر شاعر ہیں
لیکن ان کا پیشہ کچھ ایسا ہے کہ انھیں اردو ادب کے
تمام اصناف پر تنقیدی نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔
اور پھر ان کا مطالعہ و مشاہدہ بھی بڑا وسیع ہے۔ اسلئے
شاعری کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً حالی تنقیدی مضامین

ہند و پاک کے رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں۔
ایسے ہی وقتاً فوقتاً لکھے گئے مضامین میں سے
مضامین کا انتخاب "احتساب" کے نام سے شائع
ہے۔

ابتدائیہ کے تحت حالی نے ایک جگہ لکھا ہے:۔
یہ مضامین مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے
ہیں۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ مختصر
مضامین ہیں اور جن موضوعات پر لکھے گئے
ان پر زیادہ بسیط و تفصیل کے ساتھ لکھا
جا سکتا ہے۔"

احتساب" میں ۲۲ مضامین شامل ہیں۔ ان میں "ندر
بن" "شہریار کی شاعری" اور "اردو کا نیا افسانہ
کے بعد" کے علاوہ جتنے بھی مضامین ہیں ان مضامین
موضوعات کے ساتھ انھوں نے پورا انصاف کیا ہے
مضامین ایسے ہیں جو کئی برس گذر جانے کے بعد
اہمیت رکھتے ہیں۔ اور چونکہ حالی نے مضامین
تحت کسی نظریہ یا ازم کی عینک نہیں لگائی ہے۔
ان کی باتوں میں صداقت کے ساتھ ساتھ ان
[illegible] ہے، وہ نمایاں طور پر ظاہر ہوتا
خاص طور پر "بوطیقا اور ارسطو کا نظریۂ تنقید"
غالب کی خود استفادی" — "کلام بسمل کا ایک
جائزہ" — "میر کی مثنوی خواب و خیال"
— احتشام حسین کی تنقید" — "یگانہ چنگیزی،
غالب" — "عیسیٰ فرتاب کی اردو شاعری" —
"تذکرہ حقیقت کی شاعری" — اور —
[illegible] اور ان کا فن" بڑے اہم اور فکر انگیز
معیار کے کارآمد اور معیاری مضامین ہیں۔
ان مضامین کا مطالعہ بتاتا ہے کہ حالی کی نگاہ اردو
ادب پر گہری ہے اور ان کا جو تنقیدی رویہ ہے وہ بڑا
مثبت اور پُر معنی ہے۔ حالی کا اسلوب خوبصورت ہے۔
جو فہم و ادراک میں معاون ثابت ہوتا ہے۔
حالی سے مستقبل میں بھی اچھے تنقیدی مضامین کی
توقع ہے۔
کتاب کی کتابت، طباعت وغیرہ گوارہ ہے۔
قیمت مناسب ہے۔



بقیہ
علیم احمد حالی کا تنقیدی نظریہ

اس سے کسی اصول حیات کی تبلیغ کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ
کسی ازم" کا پروپیگنڈہ نہیں کرتے، ان کی افسانہ نگاری
میں ہمیں زندگی کے اہم مسائل بھی نہیں ملتے۔ گرمی تار
اور کباب تصور بھی نہیں ہے اور نہ کوئی اعلیٰ عمیق فکر۔
لیکن اس کے باوجود ان کے افسانے بیحد مقبول ہیں، اس
کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ حسینی صاحب تمام زندگی
میں پیش ہونے والے واقعات کو افسانوں کا موضوع
بناتے ہیں۔ وہ اس بات کے حامی نہیں ہیں کہ آرٹ کا کام
حیرت فزائی ہے۔ وہ فن کو زندگی کی عام صورت حال
کی عکاسی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔
مسلیم اللہ حالی کی ایسی ہی غیر جانبداری سے ان
کی وسعت نظر اور تنقیدی بصیرت کو یہ کہا جا سکتا ہے
وہ تنقید کی غایت اور نقد و نظر کے مقصد سے بخوبی
واقف ہیں۔

بہار میں اقلیتی طبقہ کی فلاح و بہبود کے لئے
حکومت کے ذریعہ کئے گئے اقدامات

حکومت بہار ریاست کے اقلیتی طبقہ کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے پابند ہے۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی مؤثر قیادت میں ریاستی حکومت نے ایسی متعدد اسکیمیں لاگو کی ہیں جن سے اقلیتی طبقوں کو قومی زندگی کے دھارے سے منسلک کرنے میں خاطر خواہ مدد ملیگی۔ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینا، مدرسوں اور اردو اساتذہ کو سہولتیں فراہم کرنا، بنگلہ، پنجابی وغیرہ زبانوں کی ترویج کے لئے مختلف اکیڈمیوں کا قیام کرنا، نیز اردو روزناموں کے لئے ضروری بجلی پر نٹر مشین لگانے کے لئے رقم کا آدھا حصہ امداد کے طور پر دینے جیسے متعدد فلاحی کاموں کے علاوہ حکومت کے ذریعہ حال ہی میں درج ذیل فیصلے کئے گئے ہیں:

(الف) خصوصی فساد کش پولس فورس میں اقلیتی طبقے کے ۲۰ فیصد لوگوں کی تقرری کی جائے گی۔

(ب) اقلیتی طبقہ کے اقتصادی فروغ کے لئے حکومت کے ذریعے دس کروڑ روپئے کے مختص سرمایہ سے بہار ریاستی اقلیتی مالیاتی کارپوریشن کے لئے بطور حصص سرمایہ کے ایک کروڑ روپئے کی رقم کی منظوری دی ہے۔ یہ کارپوریشن تجارتی و معاشی مقاصد کے لئے ایسے مذہبی اقلیتی افراد کو جن کی سالانہ آمدنی ۶ ہزار روپیے سے زیادہ نہ ہوگی یا جنھیں زیادہ سے زیادہ ۵ ایکڑ تک ہی زمین ہوگی، آسان قسطوں میں قرض مہیا کریگی۔

ریاستی حکومت کے ذریعے ہریجنوں اور آدی باسیوں کی اقتصادی و سماجی ترقی کے لئے ایسے مالیاتی کارپوریشن کا قیام قبل ہی عمل میں لا چکی ہے۔

وزیر اعلیٰ مسٹر چندر شیکھر سنگھ کی مضبوط قیادت میں ریاستی حکومت اقلیتی طبقہ کو مکمل تحفظ فراہم کرانے کی پابند ہے۔

حکومت توقع کرتی ہے کہ تمام طبقے کے لوگ مستعدی کے ساتھ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور آپسی اتحاد کے ماحول کو بنائے رکھنے میں ہر ممکن تعاون دیں گے۔

ڈیپارٹمنٹ آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشن
کے ذریعہ جاری

IPRD-3462/Inf-27.1/83-84

یہ بھی سچ، وہ بھی سچ

لمحہ لمحہ بدلتے ہوئے وقت میں
کون کس کا ہے؟ کیا ہے؟ کسے پوچھیے؟
میں بھی، وہ بھی، سب بھی
اپنے چہروں کی بنتی بگڑتی لکیروں کو پہچانتے ہی نہیں
آنے والی رُتوں کے چلن جانتے ہی نہیں
روز و شب
ایک اک پل میں مسمار ہوتی ہوئی
کہنہ دیوار و در
ریزشوں میں ہمیں دفن کرنے کی
سازش میں مصروف ہے
آخرش اپنے چہروں کو اب ہم چھپائیں کہاں
آج تک ہم تو ہی ہیں، بتائیں کسے؟ آ دکھائیں کہاں!
وہ جو ہم نے شروعِ سفر
اپنی آنکھوں پہ ہاتھوں کا پردہ بُنا
اور سب باہری منظروں سے کنارہ کیا
اور چلتے رہے
روز و شب، ماہ و سال و صدی
ہم نے ان سب کی پہچان ہی چھوڑ دی
اور پھر یہ ہوا
رشتۂ صدق ٹکڑوں میں بٹتا گیا
وہ بھی سچ ہے جسے چھوڑ آئے ہیں ہم
یہ بھی سچ ہے جسے چھوڑ جائیں گے ہم
یعنی جو آج ہے
وہ بھی سچ ہے گذشتہ دنوں کی طرح
ہم کہ کل کے امیں
آج کو اپنی خاطر میں لاتے نہیں



گہرائی سے ایک آواز

یہاں کیا ہے؟ وہاں کیا تھا؟
سوالوں کا یہ سادہ ڈھب
مرے بدلے ہوئے لہجے کو معنی دے نہیں سکتا
مری آواز اوپر آتے آتے ——
—— مری آواز ہی رہتی نہیں ہے
سماعت ساحلوں کی مطمئن ہوتی نہیں ہے
میں خود کہتا ہوں، خود سنتا ہوں
وہ سنتا ہے خود اپنی کہانی



دوسری ساعت

تخ زدہ ٹھنڈی ہواؤں میں
ٹھٹھرتے جسم سے
جب میں نے کمرہ میں پہنچ کر
آگ روشن کی
تو وہ پہلی تمازت میں ملا
موسم گرما کی
پگھلی دوپہر میں
آگ اُگلتے راستوں سے کچھ پرے
اک گھنیرے پیڑ کے سایہ تلے
جب پہونچا
تو پہلی ساعتوں میں وہ مرے ہمراہ تھا
رات پہروں تک نہ تھا اسکا پتہ
ہاں مگر
جب نیند سے بوجھل پپوٹے
بند ہونے سے ذرا پہلے
فقط اک آن واحد کے لئے وا ہو گئے
میں نے دیکھا
وہ وہاں موجود تھا
وہ مرے افسردہ لمحوں میں
مرے چہرہ پہ غمناکی کی لہریں
دیکھ کر
کرب غم سے چور
ایک پل کے لئے آیا مگر
پھر آنکھ سے اوجھل ہوا
وہ مری عزلت، مری ہر اک صعوبت کا رفیق
وہ مرا ہمراز، میرا غم گسار
مجھ سے مل کر دور ہو جاتا ہے کیا
دوسری ساعت میں کھو جاتا ہے کیا

ـــ



الت

زرینہ زرینہ
اُترتی ہوئی شام جب
رات کی اوٹ میں
سب کی نظروں سے اوجھل ہوئی
رفتہ رفتہ
ٹہلتی ہوئی
نرم و آسودہ دریا کی گہرائیوں میں اُترنے لگی
صبح تک
تہہ میں بیٹھی ہوئی جل پری
وہ کہانی سُنانے لگی جو
کل ادھوری رہی
آج بھی جس کی تکمیل ممکن نہیں
وہ کہانی
جیسے روز و شب کی ہر اک آنے والی اکائی
نیا طول دیجے
وقت کی وسعتوں کا تمسخر اُڑاتی رہی
اور پھیلا ہوا وقت
اپنی بے معنویت پہ شرمندہ ہے

ہر فسانہ جسے ہم بیاں کر رہے ہیں
ایک بے انتہا داستاں
کی کوئی بیچ کی اک کڑی ہے
کوئی بات تازہ نہیں
کوئی واقعہ اجنبی اور انوکھا نہیں
کوئی شکل بھی ناشناسا نہیں
میرے دستِ احساس نے
جب کبھی کوئی نئی آشنائی
کو چھونے کی کوشش کی
ہر بار ہاتھوں میں
گزرے دنوں کے خد و خال تھے
بس وہی روز و شب اور مہ و سال تھے
سب نئے حادثے کہنہ تمثال تھے



داستان

یہ طائر ——
جو ہر شام
کہنہ عمارت کے ٹوٹے کنگورے
پہ تا دیر
دن بھر کی سب داستاں کہتا رہتا ہے
اور وہ عمارت
گئے گذرے لمحوں کی ساری مصیبت
ہر اک پل میں مسمار کرتی ہوئی ریزشوں کی صعوبت کا غم
بھول کر
ان صداؤں میں یوں ڈوب جاتی ہے
جیسے —— یہ آواز ہی
اس کہن سالگی کا مداوا ہو
جیسے —— یہی اس کی ساری شکستوں کا حاصل ہو
دیوار و در کے کھسکتے قدم
اپنے خالق سے
اک شام کی بھیک اور مانگ کر
اس کہانی کے انجام کو جاننا چاہتے ہیں
—— وہ کہانی
جو بے نام پرندہ کے اظہار سے
آج بھی دور ہے



دلش زندہ شد

دھوپ اتنی تیز ہے —— مجلس سے مقتل دور ہے
اتنی جلدی بھی ہے کیا
رات جب آئے گی
سب کچھ رفتہ رفتہ ظلمتوں کی گود میں چھپ جائے گا
دھول تھک کر سو رہے گی
دھوپ کا طوفان تھم جائے گا
راہیں سرد ہونگی
آج کا دن
باسی اخباروں کے مدفن میں فنا ہو جائے گا
آنے والی رات کا پچھلا پہر
اس کہانی کو انوکھے موڑ پر لے جائے گا
مرنے والے کو حیاتِ دائمی دے جائے گا
اپنے ہاتھوں میں لیے مشعل ابد تک
آنے والی ان گنت راتوں میں وہ
اس راستے سے آئے گا



سوال

اب کہ موسم ہمارے تمہارے لئے
زرد پتوں سوکھے خشک اور شاخوں سے
رخصت کا
غمگیں — مگر دلنشیں گیت گاتا ہوا آ گیا
ایک آندھی چلی — اور بس
وہ گھروندے جو ہم تم نے
اک دوسرے سے علیحدہ بنائے ہیں
اپنے حصاروں سے آزاد ہوں گے
یہ گڈا، یہ ننھا سپاہی، یہ گھوڑا
یہ دولہا
وہ گڑیا، وہ چڑیا، وہ گھوڑی
وہ دلہن
— مجھے تو نہیں ہے
تمہیں کیا یقیں ہے
کہ یہ زرد پتوں کے گرنے
جنوں خیز طوفاں کے اٹھنے
ہواؤں کے چلنے
— پہ یونہی رہیں گے؟
وہ دوری جو آج
اپنے اپنے گھروندوں میں ہے
کیا یہی فاصلہ کل بھی قائم رہے گا؟ □

نشاں بھولی ہوئی منزل کا

نشاں بھولی ہوئی منزل پہلے بھی تھا اب بھی ہے
مگر — جس کا مقدر ہی سفر ہو
— اور منزل کا برابر فاصلہ
ہر آن گردِ نامرادی کی لپیٹ میں لیتا جاتا ہو
سفر اس کے لئے رحمت ہے یا ترکِ سفر
تازہ صعوبت سے نکلنے کا وسیلہ ہے
نہ جانے کتنی مدت سے
ہم آنکھوں پر ہتھیلی رکھ کے
ان لفظوں کی جانب گامزن تھے
جہاں اپنی تھکن
دو چار لمحوں کے لئے آسودگی پاتی
مگر ہر راستہ تاریکیوں میں باری باری کھو گیا تھا
وہاں کچھ بھی نہ تھا
بس اک فریبِ منزلِ جاناں کی دھندلی روشنی تھی
جو پھر تازہ بلاووں کا بہانہ دے رہی تھی
یہاں کچھ بھی نہیں
منزل — مسرت — روشنی — رستہ
سبھی موہوم ذہنی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں
زنجیریں ہی زنجیریں
عقلمندو — جہاں پر ہو
وہیں رک کر یہ دیکھو تم کہاں ہو □



الفاظ تھک کے بیٹھ گئے راہ میں مگر
طے ہو سکا نہ آج بھی اظہار کا سفر

ترے نہ تھے تو صورتِ دریا بہت تھی
ڈوبے تو چیخ چیخ پڑا بحرِ پُرخطر

اس کی اڑان میں ہے وہی بانکپن ابھی
یوں کٹ چکے ہیں مرغِ تخیل کے بال و پر

نیچے گرے نہ تھے کہ زمیں کھا گئی مجھے
اتنی بلندیوں پہ بنایا تھا اپنا گھر

اس شہر میں مجھے کوئی پہچانتا نہیں
تک تک کے دیکھتی ہے مگر مجھ کو ہر نظر

اٹھنے لگی ہے اور بھی دیوارِ خامشی
ملتی نہیں ہے اب تو نواؤں کو رہ گزر

حائل خود اپنا شہرِ انا تابناک تھا
باہر حصارِ ذات سے ہم بھی ہیں بے خبر

▲



سمندروں کی ہوا مجھ کو لے گئی ہے کہاں
کہاں سے آ کے یہ شبنم برس رہی ہے کہاں

سمیٹ کیوں نہیں لیتا ہے میرے ذرّوں کو
مرے وجود کے صحرا کا مدعی ہے کہاں

برس رہا ہے مگر کوئی بھیگتا ہی نہیں
ترے خلوص میں یوں تو کوئی کمی ہے کہاں

وہ دشت دشت مرے ساتھ ساتھ چلتی رہی
پھر اس کے بعد وہ آواز کھو گئی ہے کہاں

تمام بحر پہ ساحل کی ریت چھائی ہے
ہوا چلی ہے کہاں دھول اڑ رہی ہے کہاں

ابھی سے کیا پسِ دیوارِ تاک میں رہیے
ابھی وہ شاخِ ثمر ور ادھر جھکی ہے کہاں

ہیں اک فریبِ بیان و صدا یہ نغمہ و شعر
جو بات کہنے کی ہے میں نے وہ کہی ہے کہاں

▲



جز ہجومِ بیکراں کچھ بھی نہ تھا
منظروں کے درمیاں کچھ بھی نہ تھا

ان درختوں نے بھی بدلا تھا لباس
اپنے ناموں کا نشاں کچھ بھی نہ تھا

بے سبب ہم ڈر گئے تھے راہ میں
ورنہ زیرِ آسماں کچھ بھی نہ تھا

ہم نے پھیلایا بہت دستِ صدا
تا بہ حدِ لامکاں کچھ بھی نہ تھا

مار ڈالا ہے یقیں کے کرب نے
مجھ کو وہ زہرِ گماں کچھ بھی نہ تھا

عمر بھر بس ہم ہی ہم حائل رہے
میرے ان کے درمیاں کچھ بھی نہ تھا

یا گئے لمحوں کے چلنے کی صدا
یا قریبِ صحنِ جاں کچھ بھی نہ تھا

▲

ناشناسی کا ہمیشہ غم رہا
آئینہ بھی اپنا نا محرم رہا

آگ ہے اس پر بے یہ بے شعلگی
اپنے جلنے کا عجب عالم رہا

عمارت اونچے گھر ہوا کی زد میں تھے
یرا ملبہ تھا جو مستحکم رہا

ں بھی سیلِ آرزو میں بہہ گیا
وہ بھی غرقِ گریۂ شبنم رہا

گرے بھی تو انا کے غار میں
اٹھنے پر بھی وہی دم خم رہا

یاندنی سڑکوں پہ آوارہ پھری
ند گھروں میں ظلمتوں کا غم رہا

ب ہے حالِ بے نیازی کا بھلا
ب کہاں احساسِ بیش و کم رہا

جدا کیا تو بہت ہی ہنسی خوشی اس نے
بدل دیا ہے اب انداز بے رخی اس نے

وہ رنگ رنگ اڑا خوشبوؤں میں پھیل گیا
جھٹک دیا ہے مرا دامنِ تہی اس نے

جسے سنا کے مجھے خوفِ سرزنش سا رہا
اسی کلام پہ بڑھ چڑھ کے داد دی اس نے

وہ میرے ساتھ شروعِ سفر چلا تھا مگر
ہجومِ شہر میں لی راہ اور ہی اس نے

ہوا ہوں جراتِ جرمِ وفا سے بھی محروم
سزا یہ دی کہ خطا میری بخش دی اس نے

اب اپنی کوئی صدا ہے نہ اپنا کوئی پتہ
پلا دیا ہے مجھے زہرِ آگہی اس نے

مآل میں بھی سمجھتا تھا رتجگوں کا عظیم
یہ اور بات دکھا دیں نئی جو کی اس نے

ورِ سکوت پہ حاوی بہت ہے شورِ صدا
بپا کیا ہے وہ طوفانِ خامشی اس نے

سبھی کچھ تھا منظر میں منظر نہ تھا
سمندر میں کودا سمندر نہ تھا

کھلی آنکھ میں تتلیوں کا تھا رقص
بڑھا ہاتھ تو کوئی پیکر نہ تھا

لرزنے لگے بے سبب جسم آب
مرے ہاتھ میں کوئی پتھر نہ تھا

ہوا آج عنقائے معنی شکار
کوئی میرے تیروں کی زد پہ نہ تھا

لگا کر گیا کون دروازہ پھر
اگر کوئی کمرہ کے باہر نہ تھا

مجھے زیرِ تنہائیوں نے کیا
مرے ساتھ یادوں کا لشکر نہ تھا

ہم اس سے جو بچھڑے تو سب کے ہوئے
کسی غیر کا گھر نہ تھا

دریا ہے تو گہرائی سے دے کوئی صدا بھی
دے ڈوبنے والوں کو تو کچھ اپنا پتا بھی

اے بحر پہ موجوں کی طرح دوڑنے والے
آ کر کبھی آغوش میں ساحل کے سما بھی

پہچان ہی جائینگے ترے ڈھونڈنے والے
دیوار انا پھاند کے ایک بار دِکھا بھی

کچھ تند تھیں اس سمت ہوائیں بھی ہوس کی
بوسیدہ تھا اس شوخ کا ملبوس حنا بھی

اِک چیخ کا پتھر ہی سہی پھینک تو جاتی
اب وقت کے سوئے ہوئے صحرا کو جگا بھی

بھرا ہے میری صداؤں سے دشت و صحرا آج
مری تلاش میں نکلے مرے شناسا آج

میں ریزہ ریزہ سرِ رہ گزار پھیلا ہوں
وہ انتظار میں ہے میرے لحہ لحہ آج

گرفت سخت نہ ہوتی جو انگلیوں کی مری
نکل چکا تھا کہیں ہاتھ سے تماشا آج

وہ اپنے شہر میں پہچانتا مجھے بھی تو کیا
کسی طرح یہ طلسم گماں تو ٹوٹا آج

میں اپنے ہاتھ کے پتھر نہ پھینکتا تو علیم
نگل چکا تھا مجھے بھی سکوتِ دریا آج

تُو درد بن کے خود اپنا مجھے پتا دینا
میں سو کبھی جاؤں تو آنا مجھے جگا دینا

جو ٹوٹ کر میں گروں بھی تو اس کے آنگن میں
ہوائے تند مجھے اس طرف جھکا دینا

تُو ایک بار تو چُن لے مجھے گہر کی طرح
پھر اس کے بعد سدا کے لئے بھلا دینا

جلا دیا تھا سرِ شام تو نے محفل میں
طلوعِ صبح سے پہلے مجھے بجھا دینا

عجیب زہرِ تعلق کا ہے مزا حالی
نہ بخشنا نہ کسی طرح کی سزا دینا



سفر ہے دھند کا تو کوئی رہنما لے جا
مرا سکوت نہ ہو تو مری صدا لے جا

ہر ایک سمت ہے دشتِ سکوت کی وسعت
بچا کے یہ روشِ حرفِ مدعا لے جا

میں زیرِ سنگ ابھی تیرگی میں [illegible] گا
تو اپنی رزم شعاعوں کا قافلہ لے جا

کچھ اور چاٹ لے صحرا نگری کا نمک
جو آ گیا ہے تو راہوں کا ذائقہ لے جا

بکھر کے چھوٹ نہ جاؤں تری گرفت سے کہیں
سنبھال کر مجھے اے موجِ خوش ادا لے جا





اس کا غم اپنی طلب چھین کے لے جائے گا
درد بن کر مری رگ رگ میں اتر آئے گا

ریگ زاروں سے پرے کھینچ رہا ہے کوئی
جانے کس دشت میں دریا تجھے بھٹکائے گا

کوئی پتھر کا نشاں رکھ کے جدا ہوں ہم تم
جانے یہ پیڑ کس آندھی میں اکھڑ جائے گا

ساتھ ہو جا کہ امنڈتی ہوئی لہریں ہیں قریب
جب اتر جائے گا دریا تجھے تڑپائے گا

میں اسی موڑ پہ مل جاؤں گا خالی تجھ سے
تو جہاں بھیڑ میں گم ہو کے بچھڑ جائے گا



بادلوں کے بیچ تھا میں بے سر و ساماں نہ تھا
تشنگی کا زہر پی لینا کوئی آساں نہ تھا

کیا قیامت خیز تھا دریا میں موجوں کا ہجوم
ساحلوں تک آتے آتے پھر کہیں طوفاں نہ تھا

جانے کتنی دور اس کی لہر مجھ کو لے گئی
میں سمجھتا تھا کہ وہ دریا ہے بے پایاں نہ تھا

ہر طرف پت جھڑ کی آوازوں کی چادر تن گئی
دشت میں میری صدا کا جسم بھی عریاں نہ تھا

اس کے رنگ و صوت کے جگنو تھے دامن میں علیم
کھو کے سب کچھ آنے والا بھی تہی داماں نہ تھا



○

گرنے لگوں جو میں تو سنبھلتا ہے آج بھی
وہ رکھ کے ایک فاصلہ چلتا ہے آج بھی

میں قرمزی قزح کے حصاروں میں ہوں اسیر
وہ لمحہ لمحہ رنگ بدلتا ہے آج بھی

سو بار ہو چکا ہے سرِ تمکنت قلم
لیکن قد اپنا سب سے نکلتا ہے آج بھی

اشعار کے نصیب میں ہے زہرِ تشنگی
یوں چشمۂ خیال ابلتا ہے آج بھی

اپنے لئے تو اس کی صدا راستہ بنی
تنہائیوں میں ساتھ وہ چلتا ہے آج بھی

چھپ چھپ کے سایہ کرتا ہے سر پہ مرے علیم
دن بھر مرے لئے کوئی جلتا ہے آج بھی

○

یہاں بھی ہو کوئی منزل تو پھرتا مجھ کو
کہاں اڑ کے چلا طائرِ انا مجھ کو

جھلس نہ جاؤں کہیں میں نوازشوں سے تری
کہ لگ رہا ہے یہ سایہ بھی اک سزا مجھ کو

جہاں چلوں وہی آواز ہے تعاقب میں
گرفت میں ہے لئے حلقۂ صدا مجھ کو

ابھرتی ڈوبتی لہروں کا اعتبار ہی کیا
یہ کس سفر پہ چلا لے کے ناخدا مجھ کو

وہ موج موج میں تھا اور میں لبِ ساحل
پکارتا ہے وہ ساحل سے ڈوبتا مجھ کو

قریب آیا تو وہ کیسا اجنبی سا لگا
جو دور سے نظر آتا تھا آشنا مجھ کو

○

ہجومِ یار ترا اور مرا ٹھکانا
اب اور چھوڑ بھی دے مجھ کو آز

مرے لئے ہے مری نامرادیوں کا
کہیں سے ڈھونڈھ بھی لے اب کوئی بہ

اسے بھی اپنے فسانہ کی یاد آجا
کہانی اپنی پھر اس طور سے سنا

تری شکست نے پہنچا دیا کہاں
حضورِ حسن بھی بھولا ہے سر جھکا

میں اپنے آپ میں تجھ کو سمیٹتا کیو
میں ایک لمحۂ محدود اک زمانہ

کوئی نہ دے پسِ دیوار جب صدا
قریبِ منزلِ جاناں ہی بیٹھ جا

○

دل ہے ارمانِ طلب لب پہ دعا لے جاتے
تم گئے تھے تو مرے پاس جو تھا لے جاتے

گل کے چہرہ پہ چلے مقتلِ یاراں کا لہو
اور ہم کیا تری محفل سے بتا لے جاتے

دشت و صحرا میں بھلا بوجھ اٹھاتے کیونکر
ہم ترے در سے کہاں بارِ وفا لے جاتے

ان کو ہر راہ پہ ملنے کا گماں باقی تھا
مجھ سے ملنے کا نشاں اور وہ کیا لے جاتے

○

مسافر کہاں جائے گا اس طرف
پلٹ آئے گا راستہ اس طر

سوالوں کے قیدی نہ ہم تھے نہ تم
نہ کہیں؟ اس طرف تھا نہ گیا؟ اِد

ادھر سنگِ تہمت ہر اک ہاتھ میں
کوئی جسم شیشہ نما اس طر

کرم تیرا ترکِ تعلق پہ بھی
کہاں مجھ کو لے جائے گا اس

بھٹک کر تری سمت آیا تھا میں
ملی منزلِ گمشدہ اس طر

کہانی ادھر بڑھ رہی تھی علیم!
مجھے خوف انجام کا اس طرف

○

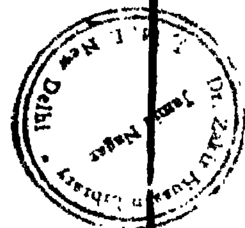
سیاحوں کی سیاحت کا مرکز بہار

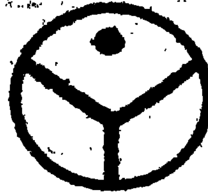
- پاٹلی پترا کے پرانے راج نگر، نالندہ کی مشہور یونیورسیٹی اور راجگیر کی خوبصورت دیواروں کا منظر، سہسرام میں شیر شاہ کا مقبرہ، ویشالی اور لوریا نند گڑھ کا اشوک لاٹ، بودھ گیا، دیوگھر، پارس ناتھ کے پرانے پرانے مندر اور پٹنہ سیٹی کے سکھ گردوارہ کو ضرور دیکھیں۔
- راجگیر کے گرم پانی کے جھرنے میں غسل کرنا اور چھوٹا ناگپور کے جھرنوں، خوبصورت پہاڑیوں، جھیلوں، اور جنگلوں کی قدرتی خوبصورتی کو دیکھنا نہ بھولیں۔
راجگیر میں آکاشی رجو مارگ سے رتناگیری پر تعمیر شدہ بین الاقوامی شانتی استوپ کا درشن بھی کریں۔
- جمشید پور، ہٹیا (رانچی)، سندری، دھنباد، پنچیت، میتھن، تلیا اور برونی کے مشہور و معروف صنعتی مرکزوں کا معائنہ کریں۔
- پٹنہ، راجگیر، گیا، رانچی، نیترہاٹ، ڈالٹین گنج، دیوگھر، اور مظفر پور میں ٹورسٹ بس اور اچھے کوالٹی کی آرام دہ موٹر گاڑیاں بھی مہیا ہیں۔
- راجگیر، بودھ، ویشالی، نیترہاٹ (پلاموں) دیوگھر، ڈالٹین گنج اور ہزاری باغ میں سیاحوں کے ٹھہرنے کے لئے آرام دہ اور اچھے مکانات کا انتظام ٹورسٹ ڈیپارٹمنٹ کے ذریعے کیا گیا ہے۔

دوسری معلومات کے لئے پٹنہ یا ان جگہوں کے ٹورسٹ انفارمیشن سنٹر سے رابطہ قائم کریں۔

ٹورسٹ ڈیپارٹمنٹ۔ پٹنہ

I.R.R.I. 346-D (Mf-271)/83-84





"اگر غریب کا لڑکا اسکول نہیں جا سکتا تو تعلیم کو خود اس کے پاس جانا چاہیے"

— سوامی ویویکانند

آج تعلیم جا رہی ہے غریبوں کے گھر

تعلیم بالغان کے ۲۹۶۰۳۱ مرکز صوبے کی ۱۳۷ پریوجناؤں میں ۱۱۶۰۶۰۸۰ ان پڑھ لوگوں کو تعلیم دی جا چکی ہے۔

- غریبوں اور پچھڑوں کے لئے حکومت نے خاص تعلیم بالغان پروگرام شروع کیا ہے۔
- سنٹرل ۲۸ ضلع جیلوں میں ۵۳ مرکز ۱۳۶۱ قیدیوں کو تعلیم دے رہے ہیں۔
- صوبے کے خاص خاص شہروں میں رکشہ چالکوں کے لئے خاص مرکز کھولے جا رہے ہیں۔
- ۵ ضلعوں کو ۹ پرکھنڈوں میں یونی سلف کی مدد سے ۵۰ بچوں کا حفاظتی مرکز قائم کئے گئے ہیں جو ماؤں کو بے فکر ہو کر تعلیم حاصل کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

ہمارا عہد ہے

- مارچ ۸۴ء تک ۵۰۰ ۱۸ نئے مرکز کھولنا۔
- مارچ ۸۴ء تک ۵.۵ لاکھ نئے لوگوں کو تعلیم بالغان پروگرام کے تحت تعلیم حاصل کرنے کے لئے شامل کرنا
- ۱۹۹۰ء تک ۱۰.۵ کروڑ لوگوں کو تعلیم دلانا۔

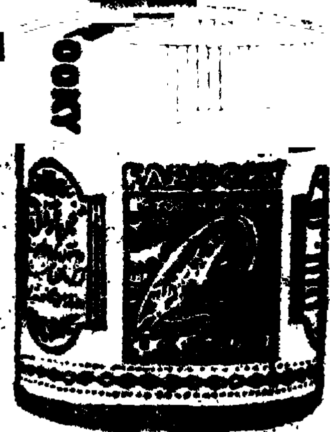
اب آپ سے چند سوال

- کیا آپ تعلیم یافتہ ہیں
- کیا آپ سمویدن شیل ہیں (کرناتی ہیں)۔
- کیا آپ ملک کی جاگتی ہوئی قوم ہیں
- کیا آپ اپنے بال بچوں کے لئے سکھی دیش کا خواب دیکھتے ہیں

تو کیا آپ کا فرض نہیں ہے کہ آپ سوچیں کہ اس بڑے نیشنل پروگرام میں آپ کی کیا مدد ہو سکتی ہے!

یہ بچی کس کی ہے؟





بچے کسی کے بھی ہوں ـــ تندرست اور مسکراتے ہوئے کتنے اچھے لگتے ہیں!!

منجن فاروق

Regd. No. Gay—4 Regd. with the R. N. Pat. R. No. 3520/57

46 YEARS OF PUBLICATION

THE SOHAIL MONTHLY, River Side Road, Gaya - 823001

سہیل

مئی ۱۹۸۴



ڈاکٹر اجمل اجملی

سنو کامگارو!

سنو کامگارو!
[illegible] کب تک
[illegible] کب تک
[illegible] اپنا ملک کی جاگیر کب تک
نہ بدلے گی دنیا کی تصویر کب تک
اٹھو کامگارو!

زمانے کی صورت بدلنے لگی ہے
ہوا انقلابوں کی چلنے لگی ہے
سحر بن کے یہ رات ڈھلنے لگی ہے
ندی ارتقا کی ابلنے لگی ہے
چلو کامگارو!

ملوں، دفتروں، کارخانوں سے نکلو
اندھیرے شکستہ مکانوں سے نکلو
بنو باغی نغمے زبانوں سے نکلو
اٹھو تیر بن کر کمانوں سے نکلو
اٹھو کامگارو!

اجالے کا ڈیرا قریب آچکا ہے
خوشی کا بسیرا قریب آچکا ہے
تمہارا سویرا قریب آچکا ہے
سنہرا سویرا قریب آچکا ہے
اٹھو کامگارو!

ابھی سرمایہ داری نئے جال لے کر
امیروں کے بندے نئی چال لے کر
نئی بوتلوں میں سڑا مال لے کر
اٹھے ہیں بہت سارے جنجال لے کر
سنو کامگارو!

کبھی جوش تم کو دلائیں گے یہ
کبھی بیچ میں دھرم لائیں گے یہ
خداؤں کو باہم لڑائیں گے یہ
مگر خون تمہارا بہائیں گے یہ
سنو کامگارو!

کہ اب تم کو دھوکے میں آنا نہیں ہے
لہو بھائیوں کا بہانا نہیں ہے
خود ہی اپنا گھر یوں جلانا نہیں ہے
اندھیروں سے اب لو لگانا نہیں ہے
اٹھو کامگارو!

اٹھو اپنے خوابوں کی جنت سنوارو
اٹھو چاند تارے زمیں پر اتارو
نصیبہ سنبھالو، مقدر نکھارو
پکارو زمانے کو بڑھ کر پکارو!
اٹھو کامگارو!

بانی: مولوی کاتب محمد عبدالرحمٰن سہیل سہسرامی

پیاسرسالہ

مولوی محمد زین الدین احمد سہسرامی

ترقی پسند ادب کا ترجمان

ماہنامہ سہیل گیا

مئی ۱۹۸۴ء

جلد ۴۶ ○ شمارہ ۵

چیف ایڈیٹر: مسعود منظر ○ ایڈیٹر: جمیل منظر سہسرامی

— معاونین —

شکیل احمد جمالی ○ عبدالقیوم ابدالی

— بدلِ اشتراک —

قیمت: ایک روپیہ ۵۰ پیسے

زرِ سالانہ: ۱۸ روپے

لائف ممبری: ۱۰۰ روپے

— خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ —

ماہنامہ سہیل۔ ریور سائیڈ روڈ۔ گیا

فہرس

نمونہ

بہار اردو اکاڈمی ــــ ایک اہم فیصلہ

بہار اردو اکاڈمی کے وائس چیرمین شپ کا آخر فیصلہ ہو ہی گیا۔ سید شہاب دسنوی وائس چیرمین بنا دیئے گئے۔ یہ ایک اہم فیصلہ تھا اس لئے اچھا ہی ہوا کہ حکومت نے کچھ تامل کے بعد ہی سہی لیکن کافی سوجھ بوجھ کے ساتھ فیصلہ کیا۔ دیر ہوئی تو ہوئی مگر اندھیر نہیں ہوا۔ سید شہاب دسنوی اس اہم عہدہ کے لئے نہایت ہی باصلاحیت موزوں ہیں۔ ہم نے اپنے ادارتی نوٹ مشمولہ شمارہ جنوری ۸۴ء میں ارباب حکومت کی توجہ اس پہلو کی طرف مبذول کرائی تھی کہ بہار اردو اکاڈمی کو نااہل، نکمے اور لوٹ کھسوٹ کرنے والے افراد سے بچا کر ایماندار، مستعد اور مفید کار نمایاں اشخاص سے وابستہ کیا جائے۔ گذشتہ برسوں میں اکاڈمی کی سطح پر مختلف افراد کو آزمایا جا چکا ہے، جو لوگ اکاڈمی کے کاموں کے لئے نااہل ثابت ہو چکے ہیں۔ ان سے اکاڈمی کو پاک کیا جائے۔ اور جن کی خدمات کا اعتراف ہوتا رہا ہے، انہیں مناسب ذمہ داری دی جائے۔ ہمارے پیش نظر بہار اردو اکاڈمی کے وائس چیرمین شپ کی خالی جگہ کو پر کرنا ہی اہم کام نہیں تھا بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اکاڈمی کے تمام عہدوں پر ضروری تبدیلیاں کی جائیں۔ اردو عوام اور خصوصاً بہار کے اہل قلم حضرات شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ حالیہ برسوں میں اکاڈمی کی کارکردگی میں گراوٹ آگئی ہے۔ مشاہیر اہل قلم، ادبا و شعرا اور صحافیوں میں اکاڈمی کے ارباب کے نامناسب رویہ نے بیزاری پیدا کردی ہے۔ عالم یہ ہے کہ اکاڈمی کے آفس کو سنبھالنے والے اہم عہدوں کے مالک یہ بھی نہیں جانتے کہ کسی اہل قلم کا دائرہ کار کیا ہے۔ کون کس اہمیت اور احترام کا حامل ہے۔ ہم نے [illegible] جنوری ۸۴ء کے اداریہ میں یہ لکھا تھا کہ جناب شاہ مشتاق احمد صاحب کے سکریٹری شپ کے عہد میں اکاڈمی اپنی بہترین کارکردگی ظاہر کر سکی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ موصوف نے فنکاروں اور صحافیوں کے ساتھ صحیح اور قابل تعریف سلوک قائم رکھا تھا۔ انہوں نے اکاڈمی کے انتظامیہ میں غیر معمولی بہتری لائی تھی۔ انھوں نے غیر جانبداری اور انصاف کو روا رکھا تھا۔ انھوں نے مختلف سب کمیٹیوں میں بہتر سے بہتر افراد سے تعاون حاصل کیا تھا۔ اور سب کمیٹیوں کے فیصلوں کا احترام کیا تھا۔ اکاڈمی کی سکریٹری شپ یا وائس چیرمین شپ ہی اکاڈمی کی بہتر کارکردگی کا واحد علاج نہیں ہے بلکہ مجلس عاملہ اور دوسری سب کمیٹیوں میں ذمہ دار اور اہل حضرات کی شمولیت کی اہمیت ہے۔ کچھ دن ہوئے گیا سے شائع ہونے والے ہفتہ وار "نمود" نے اپنی ایک اشاعت کو اکاڈمی کے مسائل کے لئے مخصوص کر دیا تھا اور اس شمارہ میں اکاڈمی کے سلسلے میں خدشات، امکانات اور توقعات کا ایک جائزہ پیش کیا تھا اسی شمارہ میں ڈاکٹر علیم اللہ حالی نے غیر جانبدارانہ اور غیر جذباتی انداز میں اکاڈمی کی اصلاح اور بہتری کے لئے مشورے پیش کئے تھے وہ مشورے تو واقعی اہم تھے مگر محض مشورے اکاڈمی کی تقدیر نہیں بدل سکتے جب تک حکومت اور ارباب اختیار اکاڈمی میں ایسے افراد کو نہ لائیں جو مختلف مشوروں کے پیش نظر اکاڈمی میں اہم اور بنیادی تبدیلیاں پیدا کریں، اس وقت تک یہ تمام مشورے نیک خواہشات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ سب سے پہلے تو مجلس عاملہ کی تشکیل میں سیاسی مداخلت کو روکا جائے۔ جس طرح سیاسی جماعت اور سیاسی تنظیموں کا سہارا لیکر مجلس عاملہ میں لوگ در آتے ہیں اس سے خود "اکاڈمی" لفظ کی تذلیل ہوتی ہے۔ مجلس عاملہ اور دوسری کمیٹیوں کے لئے سختی کے ساتھ ادبا، شعرا اور صحافی حضرات کو اہمیت دی جائے۔ اردو عوام، ادبا شعرا اور صحافی حضرات کے لئے یہ نیک فال ہے کہ اب بہار اردو اکاڈمی کے کل وقتی وائس چیرمین سید شہاب دسنوی ہوئے ہیں۔ موصوف اکاڈمی کو فعال بنانے کیلئے ضروری تبدیلی لانے کی کوشش کریں گے، ایسا ہمیں یقین ہے۔

جمیل منظر سکنھادوی

گاؤں میں سڑکوں کی تعمیر

راشٹریہ گرامین نیوجن پروگرام کے

تحت گاؤں میں

سڑکیں بنائی جا رہی ہیں۔

صوبائی حکومت کا لکشیہ ہے کہ مارچ ۱۹۸۵ء تک

راشٹریہ گرامین نیوجن پروگرام کے تحت ۷ ہزار کیلومیٹر

سڑکیں بنائی جائینگی۔



सू० जा० वा० नि० - 26 - स (सू-21) 84-85

قرآن کریم کی روشنی میں

اصغر علی انجینیر

پتہ: آنرت کالج، سکنڈ فلور، چوتھا راستہ، شانتاکروز (ایسٹ) بمبئی ۵۵

اس مضمون میں ہم سورۃ الشمس کی جو قرآن مجید کی اکانویں سورۃ ہے چند آیتوں کی تشریح کریں گے۔ یہ آیتیں یہ ہیں: وَنَفْسٍ وَمَا سَوّٰهَا ۝ فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا۔ ان آیتوں کے لفظی معنی اس طرح ہیں:

"اور نفس کی (قسم) اور اس کی جس نے اسے ٹھیک بنایا، درست بنایا اور پھر اس پر (جان پر) پرہیزگاری اور بدکاری (دونوں باتوں) کا الہام کیا۔ جس نے اپنے نفس کو پاک رکھا وہ اپنی مراد کو پہونچا اور جس نے اس کو خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا۔"

تو یہ ہوئے ان آیتوں کے لفظی معنی۔ یہ آیتیں اور باتوں کے علاوہ فلسفیانہ مباحث کے اعتبار سے بھی بڑی اہم ہیں۔ اس پہلو پر بھی ہم تھوڑی روشنی ڈالیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے انسان میں تقویٰ اور فجور دونوں کی صلاحیتیں پیدا کی ہیں اور یہ کہ جو تقویٰ کی طرف اپنے نفس کو مائل کرتا ہے خسارے میں نہیں۔ اسلامی تھیالوجی کے ابتدائی مراحل میں اس بات پر بڑی فلسفیانہ بحثیں ہوئی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نیکی اور بدی دونوں کا خالق ہے یا محض بدی کا۔ مختلف مکاتیب خیال نے مختلف نظریات پیش کئے۔ عموماً اشاعرہ کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ خیر و شر دونوں کا خالق ہے۔ قادر مطلق ہونے کی حیثیت سے وہ جہاں نیکی کی تخلیق کرنے پر قادر ہے وہاں بدی کی تخلیق پر بھی یکساں قدرت کا حامل ہے۔ اس کے برخلاف معتزلہ شر کی تخلیق کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کے قطعاً قائل نہیں تھے۔ معتزلہ تھیالوجی میں توحید اور عدل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور عدل اور شر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ عادل ہے اس لئے اس کی ذات سے شر کی تخلیق کو منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

یہ فلسفیانہ موشگافیاں ہیں جو اس دور میں اسلامی تھیالوجی کا حصہ بن کر رہ گئی تھیں۔ یہاں ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ ان فلسفیانہ موشگافیوں کی اسلامی تھیالوجی میں کیا اہمیت ہے اور کس کا موقف صحیح ہے کس کا غلط۔ اصل بات تو یہ ہے کہ دوسری صدی ہجری میں عالم اسلام میں فلسفے اور علم کلام کو بنیادی حیثیت حاصل ہو گئی تھی اور اسلامی تھیالوجی مختلف چیلنجوں کا سامنا کرتے ہوئے انہیں فلسفیانہ موشگافیوں کی فضا میں پروان چڑھی۔ اس لئے ہمیں ان مختلف مکاتیب فکر کو چاہے وہ اشاعرہ کا مکتب فکر ہو یا معتزلہ کا یا اسماعیلیوں اور اثنا عشریوں کا قطعی اور آخری نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اسکا مدعا۔

عقائد کی بحث سے ہٹ کر تاریخی اعتبار سے کرنا چاہیے۔
اسلامی تھیالوجی مختلف تشکیلی مراحل سے گزری ہے
جس کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔ یہ ہمارے اس مقالے
کا موضوع نہیں ہے۔

ان فلسفیانہ موشگافیوں سے ہٹ کر اگر ہم دیکھیں
تو اندازہ ہوگا کہ قرآن مجید بہت سادہ الفاظ میں
بڑی گہری باتیں کہہ جاتا ہے جس کی صداقت سے انکار کرنا
مشکل ہے۔ فلسفیانہ باریکیوں سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ
فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کی طبیعت میں خیر و شر کی
بالقوت صلاحیت پیدا کر دی ہے لیکن عملی طور پر اس
امکانی صلاحیت کو بالقوت سے بالفعل کرنا انسان کی
اپنی ذمے داری ہے۔ یہاں لفظ الہام استعمال ہوا ہے
جس کے معنی ہوتے ہیں جی میں ڈال دینا یا القا کر دینا۔
فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا یعنی ہم نے نفس انسانی
میں یا اس کی طبیعت میں فجور اور تقویٰ دونوں کو ہی بالقوۃ
ڈال دیا ہے اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ تقویٰ کو
بروئے کار لاتا ہے یا فسق و فجور کی طرف مائل ہوتا ہے۔

اس طرح خیر و شر کی تخلیق کی نہیں کہ انھیں بروئے
کار لانے کی پوری ذمے داری انسان پر عائد ہو جاتی
ہے۔ اس کی طبیعت میں ہر طرح کی potentialities
موجود ہیں۔ اب یہ اس کا کام ہے کہ وہ اس طرح عمل پذیر
ہو کہ اس کے افعال سے ایک صالح معاشرہ پیدا ہو [illegible]
اگلی آیت میں بہت صاف الفاظ میں یہ بات واضح
کر دی گئی کہ قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا۔ جو اپنے نفس کو زکی
بنائے گا وہ کامیاب ہوگا اور وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا
اور جو [illegible] ہو جائے گا (یعنی زوال کی طرف،
فسق و فجور کی طرف لیجائے گا) [illegible] ناکام رہے گا۔ آگے

واضح الفاظ کی روشنی میں دراصل خیر و شر کی تخلیق کی
ان موشگافیوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ جو آگے
چل کر اسلامی تھیالوجی کا اتنا اہم حصہ بن گئیں اور
جس کے نتیجے میں متنازعہ مکاتیب فکر وجود میں آئے۔
اگر اللہ تعالیٰ کو خیر و شر کا ذمے دار قرار دے
دیا جائے تو انسان مجبور محض بن کر رہ جاتا ہے۔
قرآن کی اسپرٹ اس کے بالکل خلاف ہے۔ جگہ جگہ قرآن
مجید میں انسان کو اپنے اعمال کا ذمے دار قرار
دیا ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان
اپنے اعمال کے انتخاب میں آزاد ہو۔

قرآن مجید نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ وَمَن
يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَن يَعْمَلْ
مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ یعنی جس نے ذرہ برابر
نیکی کی اس کا بدلہ اسے مل جائے گا اور جس نے ذرہ
برابر بدی کی اس کا بدلہ اسے مل جائے گا۔ اسی لیے
سورۂ شمس کی اوپر کی آیتوں میں بھی یہ بات واضح
کر دی گئی کہ انسان کے نفس میں فسق و فجور دونوں
بالقوت موجود ہیں لیکن ان کو عمل میں لانے کی ذمے
داری خود انسان پر ہے۔ نفسیات کی رو سے بھی اگر
ہم دیکھیں تو یہ بات ہم پر واضح ہو جاتی ہے۔ انسانی
طبیعت کا ایک ذخیرہ ہے جسے فرائڈ Id کہتا ہے
Id بے نام جبلی قوت کے ذخیرے کا نام ہے جن کو نہ
خیر کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے نہ شر کی طرف۔
جبلی قوت انسان کے لیے مفید بھی ثابت ہو سکتی
ہے اور نقصان دہ بھی۔ یہ اس بات پر منحصر ہوتا ہے
کہ انسان ان قوتوں کو کس بروئے کار لاتا ہے مثال
کے طور پر ان جبلی قوتوں میں بھوک اور جنس کی جبلی

ترین بھی مثالیں ہیں۔ بھوک انسان کو جسم کے صحت مند ارتقا کے لئے ضروری غذا کا احساس دلاتی ہے۔ اگر انسان صحیح مقدار میں اپنے جسم کو غذا مہیا کرے تو نہ صرف وہ کثرتِ غذا سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا شکار ہوگا بلکہ اپنے سماج میں ایسے کمزور طبقے پیدا کریگا جو غذا تک رسائی سے محروم رہیں گے اور بھوک اور بھوک سے محروم ہونے والی بیماریوں کا شکار ہوں گے۔ گویا پورا معاشرہ بے اعتدالی اور ناکامی کی طرف مائل ہو جائیگا۔

دوسری مثال ہم جنسی جبلت کی دے سکتے ہیں۔ انسان کی طبیعت میں یہ جبلت پائی جاتی ہے۔ اگر اس کا صحیح استعمال کیا جائیگا تو لذت کے ساتھ ساتھ مرد و عورت میں محبت کے جذبات پروان چڑھیں گے۔ اور انسانی نسل کی بقا کی ضمانت ہوگی۔ لیکن اگر اس جبلت کا غلط استعمال کیا جائے یا کثرت سے استعمال کیا جائے تو ایک طرف مرد اور عورت کے درمیان محبت کے بجائے ہوس کا رشتہ پیدا ہوگا جو ظاہر ہے غیر مستحکم (Unstable) رشتہ ہے اور دوسری طرف عورت محض ہوس کا شکار بن کر رہ جائے گی۔ اور اس کے انسانی احترام میں فرق آجائے گا۔

جبلی قوت انسانی نشو ونما اور اس کی بقا کی ضامن بھی ہو سکتی ہے اور اس کی تباہی کا باعث بھی۔ جبلی قوت کو، جس کو فرائڈ لبیڈو کہتا ہے، نہ ہم بذاتِ خیر سے منسوب کر سکتے ہیں نہ شر سے۔ بالقوۃ یہ دونوں ہی ہے لیکن انسان جب اسے عمل میں لاتا ہے تو یہ خیر و شر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جبلی قوت تو ایک وسیلہ ہے، وسیلہ نسل کی بقا اور ارتقا۔ اس میں روحانی ارتقا بھی شامل ہے اور مادی ارتقا بھی ـــــ کا بھی ضامن ہے۔ اور اس کی تباہی کا ذمہ دار بھی۔ اگر ان حدود میں رہ کر اسے استعمال کیا جائے جو انسان کے لئے مفید ہیں تو یقیناً انسان فاتح و کامران ہوگا اور اگر ان حدود سے تجاوز کیا جائے تو وہ خاک میں مل جائے گا۔ اپنے معاشرے کے ساتھ قَدْ اَفْلَحَ اور خَابَ کا یہی مفہوم ہے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید خیر و شر کی فلسفیانہ موشگافیوں میں الجھے بغیر انسانی فطرت کی بڑی گہری حقیقت کو اس طرح بیان کر دیتا ہے کہ بڑی آسانی سے واضح ہو جاتا ہے اور بات ذہن و فطرت کے مطابق ہو جاتی ہے۔ اس میں نہ اوہام کا [illegible] ہو جاتا ہے نہ مابعد الطبیعاتی۔ دوسرا اہم [illegible] انسان کی آزادی برقرار رہتی ہے۔ [illegible] جبر و قدر کی بحث میں بھٹکے ہوئے بغیر قرآن مجید انسانی آزادی کو مجروح نہیں ہونے دیتا۔ وہ فطری طور پر آزاد ہے بھلے ہی وہ اس آزادی کا غلط استعمال کرکے اپنی تباہی کو ہی دعوت کیوں نہ دے۔

یہاں مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو تباہی کے لئے یا شر کے لئے بے کم و کاست چھوڑ دیتا ہے۔ اس نے نہ صرف انسان کو بلکہ نیچر کی ہر شے کو ہدایت بھی طبیعت میں ہی ودیعت کی ہے۔ [illegible] قال ربنا الذی اعطیٰ کل شیءٍ خلقہ ثم ہدیٰ۔ یعنی اس نے ہر شے کو پیدا کرکے اس میں ہدایت ودیعت کردی یا اس میں ہدایت کی صلاحیت پیدا کر دی۔ یہاں تک انسانوں کا تعلق ہے نہ صرف یہ کہ انہیں عقلِ سلیم اور سوچنے سمجھنے کی قوت عطا کی بلکہ برگزیدہ

(بقیہ صفحہ ...)

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

غالب اور جدید ذہن

مرزا اسداللہ خاں غالب تو لگتا ہے آج کے ہمارے دور کے غزل گو ہیں۔ آج ان کے کلام سے ہم جس قدر متاثر ہوتے ہیں اسی قدر ان کے اپنے زمانے میں ان کی ناقدری بھی ہوئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں غالب کا جدید ذہن سے علاقہ پیدا ہوتا ہے اور "قدیم ذہن" سے تعلق انقطاع ہوتا ہے۔

اس کا راز کیا ہے؟

غالب ۱۷۹۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۹ء میں رحلت فرما گئے۔ غالب نے ساری عمر عسرت میں گذاری اور عشرت کا تصور ہی کیا کئے۔ یہ واضح رہے کہ جنگ پلاسی کے بعد انگریزوں کے پیر ہندوستان میں مضبوطی سے جم جانے کے کوئی ۹ سال بعد غالب پیدا ہوئے ہیں اور غالب کی ساری زندگی اسی دور کی روش میں گذری ہے جبکہ انگریز آ رہے ہیں اور مغل دور ختم ہو رہا ہے۔

لیکن انگریز آئے تو اپنے ساتھ اگر ایک طرف بے شمار تباہیوں کے سامان لیتے آئے تو دوسری طرف ایک نئی سرمایہ دار سماج کے نقوش بھی ان کے ہمراہ تھے۔

اس لحاظ سے غالب کا دور انتہائی پیچیدہ اور پر آشوب ہے۔ پرانی قدریں ٹوٹ رہی ہیں اور قدریں اپنی پرچھائیاں تو ڈال رہی ہیں لیکن کسی واضح اور خوش آیند مستقبل کا نقشہ نہیں پیش کر رہی ہیں۔

انگریزوں کی لائی ہوئی تباہی، معاشی ابتری، پرانے اقتصادی نظام کی شکست و ریخت نے جو کیفیات پیدا کر دی تھی جو پر آشوب حالات پیدا کر دئیے تھے ان کا مرثیہ تو نظیر اکبرآبادی کے پاس نہایت واضح طور پر مل جاتا ہے۔ اور نظیر کا دور ۱۷۳۵ء سے ۱۸۳۰ء تک کا زمانہ ہے۔

غالب اس کے بعد جوان ہوتے ہیں اور اصل غالب تو ۲۵ سال کی عمر میں ادبی محاذ پر ابھرتے ہیں اور یہ نظیر اکبرآبادی کے آخری دن ہیں۔

غالب ہی کے ایک ہم عصر انیس ہیں جن کا زمانہ ۱۸۰۲ء سے ۱۸۷۴ء تک ہے۔ یہ وہ دور ہے جبکہ انگریزی لائی ہوئی تباہی نے کارل مارکس کے الفاظ میں "ایک مخصوص افسردگی" A PARTICULAR MELANCHOLY پیدا کر دی تھی۔ اگر نظیر نے اس "افسردگی" کا مرثیہ کہا ہے تو انیس نے اس عالم افسردگی میں قوم کے کردار کو بچائے رکھنے کے لئے تاریخ کے عظیم اور ہمت دلانے والے واقعات کا سہارا لیا اور ان ہیروؤں کی قربانی کے تصورات عام کر کے ہمت اور کردار کو باقی رکھنے کی کوشش کی۔ انیس کے مرثیوں کا یہی ڈرامائی عنصر ایک تاریخی معجزہ سے کم نہیں۔

لیکن غالب نے کچھ اور کیا ہے جو ان دونوں سے قدرے الگ بھی ہے اور بہت کچھ ارفع بھی۔

غالب کے زمانے میں مغل شہنشاہیت دم توڑ رہی تھی۔ لیکن یہ ایک نئی شہنشاہیت تھی جس کے

خاص طور پر شمالی ہندستان کو بہت برسوں تک امن اور آسودگی کا گہوارہ بنا رکھا تھا اور ایک نئی تہذ
کچھ تہذیبی قدروں کو فروغ دیا تھا۔ جو معماری، فنون لطیفہ، پینٹنگ، شاعری، ادبی مزاج، انداز ذہن
مالیاتی نظام سبھی پر محیط تھیں۔
اور یہ قدریں ٹوٹ رہی تھیں۔

غالب کے پاس اس شکست و ریخت کا المیہ بھی ملتا ہے۔ غالب بہت دکھی نظر آتے ہیں۔ غالب
پاس حسرت اور زندگی کی کربناک تلخیوں کے باوجود مغلیہ وضع داری اور تہذیب کی پاسداری بدر
موجود ہے۔ وہ پالکی میں انگریز آفیسر سے ملنے جاتے ہیں لیکن جب افسر نے باہر آکر ان کا استقبال نہ
تو واپس ہو جاتے ہیں۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم — الٹے پھر آئے، در کعبہ اگر وا نہ ہوا
غالب کو کعبہ کا دروازہ بند دیکھیں تو الٹے پھر آئیں انگریز افسر کو وہ کس خاطر میں لاتے یہی "بندگی
"آزادی و خود بینی" وہ قدر ہے جو غالب کو اپنے دور سے دور اور ایک ایسے دور میں لے آتی ہے جو "آز
کو جزو ایمان سمجھتا ہے اور یہی چیز غالب کو آج مقبول بنا رہی ہے جب کہ ان کے اپنے دور میں حالات
کا توں رکھنے والوں، بگڑتے ہوئے ہی سہی موجود سے مفاہمت کر لینے والوں کو محفل میں اجنبی بنا دیتی ہ
یا رب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات — دے اور دل ان کو، جو نہ دے مجھ کو زبان اور
کہہ کر اس محفل سے لوٹ آتے ہیں۔

پروفیسر مجیب نے اپنی کتاب "غالب" میں ایک سوال کیا کہ آخر غالب پر سید احمد شہید اور شاہ
شہید کی اصلاحی تحریک کا اثر کیوں نہ پڑا؟ پھر انھوں نے ہی جواب دیا کہ غالب کے دور میں شاعری
سماج اور مذہب کے معاملات سے الگ رہنے کا اصل سبب یہ تھا کہ زندگی کا مختلف خانوں میں
تمام طور پر تقسیم کر لیا گیا تھا۔" (محمد مجیب "غالب" ص ۱۹)

لیکن یہ تجزیہ نہ صرف ناکافی ہے بلکہ اصل روح کو اپنی گرفت میں نہیں لیتا۔
ممکن ہے اس بات کو اقبال نے زیادہ بہتر طریقہ پر سمجھایا ہے۔ اقبال نے سنہ ۱۹۱۰ء میں اپنی ڈا
(STRAY REFLECTIONS) میں ایک موقع پر یوں کہا ہے:۔

"وہ (غالب) دراصل ان شاعروں میں سے ہیں جن کا ادراک اور تخیل کی بلندی انھیں عقید
اور ملت کے حدود سے بالاتر مقام عطا کرتی ہے۔"
(بحوالہ ڈاکٹر محمد رئیس) "تنقیدی تناظر۔ ص ۲۳"

غالب نے تصوف میں پناہ لی۔ وہ مسائل حیات کو سمجھنے اور مذہب کی ظاہر داریوں سے بچنے
فلسفۂ وحدت الوجود کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ مصلح قوم یا مجاہد ملت کا لبادہ اوڑھنے سے انکار کرتے ہو
وہ بیدل سے متاثر ہوتے ہوئے بھی بیدل کے تصوف سے جو ترک دنیا کی طرف لے جاتا تھ
کرتے ہیں۔ ان کے تصور تصوف کو بلند آہنگی "جراءت رندانہ" اور "شوق فضول" سے حاصل ہ
غالب کی یہی "دہریت" غالب کو جینئس ذہن کا برگزیدہ بناتی ہے۔ (یہاں میں "دہریت" کی اصطلا
کے معنی میں نہیں، بلکہ دنیا سے وابستگی اور موجودات عالم سے وابستگی کے معنوں میں استعمال کر

غالب ناموافق و نامساعد حالات دہر سے مفاہمت کے لئے تیار نہیں، ان کا فکر غم ضرور ہے لیکن غم انہیں ترک دنیا کی طرف نہیں لے جاتا۔ زندگی سے مایوس نہیں کرتا بلکہ "اچھے حالات" کے تصورات ان کے لئے نشاط کا سامان فراہم کر دیتے ہیں۔ ان کے پاس غم موجود کے ساتھ نشاط آرزو بھی ہے اور یہی غالب کو جدید ذہن سے ہم آہنگ کرتا ہے۔

اپنی فارسی مثنوی "ابر گہربار" میں غالب نے کائنات کو "آئینۂ آگہی" کہا ہے۔ کہتے ہیں کہ نہ محض یہ کہ انسان جس طرف بھی جائے "وہی وہ" نظر آتا ہے بلکہ یہ بھی بشارت دیتے ہیں کہ جس رخ کو انسان چاروں طرف موڑ رہا ہے وہ خود بھی "اسی" کی سمت ہے۔ یہاں وحدت الوجود کی حدوں کو وہ اتنی وسعت دیتے ہیں کہ وہ جو معرض تخلیق میں ہے وہ بھی اسی وحدت کا جزو بن جاتا ہے۔

یہاں پر غالب کچھ تو افلاطونی فکر سے متاثر نظر آتے ہیں۔ نو افلاطونی فلسفیوں نے حقیقت کی تاویل اس طرح کی تھی کہ حقیقت مطلق نور تو ہے لیکن وہ اپنے اظہار کے لئے مادے کا محتاج بھی ہے۔ حقیقت مطلق کو مادے کا محتاج قرار دینا، حقیقت مطلق کے مطلق العنان تصور سے انسانیت کو کچھ آگے لے جاتا ہے کہ وہ موجودات عالم کو بھی اہمیت دے۔ اور پھر ان سے اپنی آسودگی کے سامان مہیا کرے۔ جب غالب یہ کہتے ہیں

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

تو پتہ چلتا ہے کہ غالب "موجودات" کو بھی اہمیت دیتے ہیں اور ان کی "کثافت" کے بغیر "لطافت" تک پہنچ ممکن نہیں۔

یہ اگر ایک طرف تو افلاطونی فلسفیانہ خیالات کی پرچھائیاں ہیں تو دوسری طرف ان ہندو روایات کا پرتو بھی یہاں نظر آتا ہے جو سور داس، ودیاپتی اور چنڈی داس کی وہ رح جسمانی کثافت سے روحانی لطافت تک جا پہنچتے ہیں۔ کرشن کو ایک بھگت کی نظر سے بھگوان کے روپ میں نہیں بلکہ ایک محبوبہ گوپی کی آنکھوں سے ایک کھلنڈر عاشق مزاج انسان کی شکل میں دیکھتے ہیں اور اس راستے "حقیقت مطلق" تک پہنچنا چاہتے ہیں۔

پھر جب ان تصورات میں تاتاری پیگن ازم (کفر) کی آمیزش ہو جاتی ہے تو لذت طلبی کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو دیباچہ دیوان غالب مرتبہ سردار جعفری)۔

اس مقام پر پہنچ کر دو راستوں کا سامنا ہوتا ہے یا تو انسان دنیا کو ترک کر دے یا پھر اپنے توسن "لذت طلبی" کو مہمیز دے اور "دست شوق دراز کرے"۔

غالب کی یہی "لذت طلبی" اور یہی "شوق طلب" غالب کو آج کے ذہن سے قریب تر کرتی ہے۔

ع مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے — یا — بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

"جرأت رندانہ" کو شوق فضول سے جوڑ لیجے تو غالب نمودار ہوتے ہیں اور عصر حاضر سے بغلگیر ہو جاتے ہیں

اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں — شوق فضول و جرأت رندانہ چاہیے

غالب اپنے ایک خط میں جنت کی زندگی کو بور کر دینے والی یک رنگی سے اپنی نفرت کا یوں اظہار کرتے ہیں

"اقامت جاودانی ہے اور ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے"

پھر کہتے ہیں:

"شکر کا مزہ چکھ لینا اگر کبھی ہو گرفتہ پر کبھی نہ بیٹھنا، طاقت پرواز باقی نہ رہے گی۔"

غالب اس دنیا اور اس کی موجودات کی "رنگا رنگی" کے عاشق ہیں ان کی لذت طلبی انھیں کسی کا قیدی نہیں بنا سکتی وہ "طاقت پرواز" میں کمی دیکھنا نہیں چاہتے۔

غالب کی شاعری کی یہی حرکیت انھیں آج کے ذہن کو اپنی طرف کھینچتی ہے آج کا ذہن بھی مضطرب ہے۔ یک رنگی سے اداس ہو جاتا ہے۔ غالب کے پاس حرکت کے تصور کی سرشاری ہے۔ موج، طوفان، تلاطم، شعلہ، سیماب، برق، پرواز یہ سب اسی حرکیت کی علامات ہیں اور یہی حرکیت غالب کے جمالیاتی ذوق کا جزو ہے۔ اسی لئے غالب آج کے ذہن کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خون خلق — لرزے ہے موج مے تیری رفتار دیکھ کر

دیکھو تو دل فریبئ انداز نقش پا — موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

ہر قدم دورئ منزل ہے نمایاں مجھ سے — میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

غالب زمانے اور ماہ و سال کی پیمائش سورج کی گردش اور لیل و نہار کی تکرار سے نہیں بلکہ بجلیوں کی چمک اور تڑپ سے کرتے ہیں۔

رفتار عمر، قطع رہ اضطراب ہے — اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

یہ تڑپ، یہ اضطراب، اور یہ تیز رفتاری جدید ذہن کو چونکا دیتی ہے۔ اور غالب کی شاعری میں اسے اپنی تڑپ اور اپنے اضطراب کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ ظاہر ہے غالب کا یہ "آغاز جنون" اس زوال آمادہ سماج کی محفلوں کو نہیں گرما سکتا تھا۔ غالب کو اس "بے التفاتی" کا شکوہ بھی تھا اور یہ کہہ کر اپنے کو تسلی دے لیتے تھے

ہوں گرمئ نشاط تصور سے نغمہ سنج — میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

غالب کے پاس یہی "گرمئ نشاط تصور" کی نغمہ سنجی ہے۔ جو انھیں مضطرب رکھتی ہے لیکن وہ گلشن جس میں ان کی اس لئے کی قدر کی جا سکتی تھی کہ وہ ان کے اپنے زمانہ میں ابھی "نا آفریدہ" تھا۔

جب سماج کو بدلنے کا نہ شعور ہے اور نہ وہ طاقت ہی ابھی پیدا ہوئی ہے جو حالات کو بدلنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ ایسے میں "گرمئ نشاط تصور" ہی انسان کی پونجی بن جاتی ہے۔ اور زندگی کا سہارا۔ چنانچہ غالب اپنے ایک خط میں کہتے ہیں کہ "مفلسوں کا مدار حیات خیالات پر ہے" "تصور" "نا آفریدہ گلشنوں" سے گل چینی کرتا ہے۔ یہاں صرف ہمت پرواز ہے اور آگے بڑھتے جانے کا مستانہ عمل۔

مستانہ طے کروں ہوں رہ وادئ خیال — تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

سردار جعفری نے اپنے مرتبہ دیوان غالب کے دیباچے میں کہا ہے کہ ایک چیز اور ہے جو غالب کے مزاج کو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے ہندوستانی مزاج سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ غالب کے پاس ایک صحت مند تشکیک ہے وہ مرضیاتی تشکیک نہیں جو انسان کو اپنے مستقبل کا برشک کرنے اور منزل ہی پر شبہ کرنے پر مجبور کر دے اور اس طرح زندگی سے فرار اور موت سے ہم کنار

ہوئے تصورات کو جنم دے۔

موجود کے متعلق غالب کی تشکیک انھیں نئی نشاط انگیز منزلوں کے تصور کی طرف لے جاتی ہے۔ وہ تخیل کی کمند پھینک دینے کا حوصلہ ضرور رکھتے ہیں اور یہی حوصلہ انھیں آج کے انسان کے قریب کرتا ہے۔

غالب کو ترک نا موجودات سے "چھٹکارا" حاصل کرنے کے لئے کوئی راہ جلد نظر نہیں آتی۔ اور نہ ان کے زمانے میں یہ ممکن بھی تھا۔ لیکن وہ طنز کے ہتھیار کو استعمال کرتے ہیں۔ اور ان معنوں میں بعد کے دور کی طنز نگاری کے پیش رو بن جاتے ہیں۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے ۔۔۔ بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

یہاں آسمان علامت بن جاتا ہے ان تاریک سلطانوں کی جو سماج پر قابض ہیں اور داناؤں اور ہنرمندوں کا عرصۂ حیات تنگ کئے ہوئے ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے مضمون "غالب اور جدید ذہن" (ملاحظہ ہو ان کی کتاب "نظر سے بصیرت تک") میں ایک اور راز کا انکشاف کیا ہے جو غالب کو خود ان کے اپنے دور کے مقابلے میں جدید ذہن سے قریب کر دیتا ہے۔

"شاعری کا ارتقاء مذہبی فکر سے سیکولر فکر کی جانب ہوا ہے"۔ (ص ۹۲)

"سیکولر شاعری دنیوی زندگی کے زیادہ سے زیادہ پہلوؤں کا احاطہ کرنا چاہتی ہے"۔ (ص ۹۵)

جدید ذہن "رسوم و قیود" سے آزادی چاہتا ہے وہ آگے کی طرف بڑھنا چاہتا ہے۔ اور یہ اس کے پیروں کی زنجیریں بن جاتی ہیں۔ یہاں مذہب کے اصول نہیں بلکہ اس کے رسوم کے خلاف جدید ذہن بغاوت کرتا ہے۔

غالب کا اسلام پر عقیدہ راسخ تھا۔ لیکن انھوں نے اس بات کو کبھی نہیں چھپایا کہ وہ اس زمانے کی اصطلاح میں "مذہبی" نہیں تھے۔ وہ "دنیادار" تھے اور جانتے تھے پابند "رسوم و قیود" اس دنیا کو اپنے لئے سازگار نہیں بنا سکتا۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد ۔۔۔ سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

پروفیسر احتشام حسین نے اپنے مضمون "غالب کی بت شکنی" میں بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ :

"سب سے زیادہ جو بت انسان کو راہ میں حائل ہوتا ہے وہ آباو اجداد کی تقلید اور رسم و رواج کی پیروی ہے"۔

اور غالب نے اس "ذہنی غلامی" کے بت کو توڑا ہے۔ اور ان کی یہی "بت شکنی" انھیں جدید ذہن کا رہنما بنا دیتی ہے۔ غالب جانتے ہیں حضرت ابراہیم کی طرح ہر صاحب نظر اپنے بزرگوں سے ہٹ کر نئی راہ بناتا ہے۔ پرانے خیالات نئی زندگی کی تعبیر نہیں کر سکتے۔

یا من میاویز اے پسر، فرزند آذر را نگر ۔۔۔ ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں ۔۔۔ پابستگی رسم و رہ عام بہت ہے

یا پھر ع۔ لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں

غالب کے پاس سماجی ارتقا کا ایک مبہم سہی لیکن صحت مند تصور ہے۔ اور حسرت تعمیر کی تڑپ ان کے

سینے میں موجود ہے اور یہی چیز غالب کو عصر جدید کے انسان سے قریب کرتی ہے۔

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا ✧ وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

وہ اپنی آرزو میں خوش ہیں۔ شراب نہ بھی ہو تو انتظار ساغر سے سکون حاصل کر لیتے ہیں۔

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ ✧ اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

یہاں "شراب" اور "انتظار ساغر" علامتیں بن جاتی ہیں۔ جب زندگی کا کرب ناقابل برداشت ہو جائے اور "شراب" بھی دسترس سے باہر ہے تو پھر "انتظار ساغر" ہی زندگی کا سہارا بن جاتا ہے۔ اور یہ غالب ہیں جو آج کے ذہن کو زندگی سے بیزار ہو کر بیقرار ہو جانے سے بچا لیتے ہیں۔

ایک بات اور ہے جو غالب کو اپنے عہد کے دوسرے سربراہوں سے ممتاز کرتی ہے اور اپنے بعد کے دور کے نشاط ثانیہ کے رہنماؤں کا پیشرو بنا دیتی ہے۔

ایک طرف مغل بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ اور یہ قصر امارت کبھی بھی زمین دوز ہو سکتا ہے۔ غالب کو اس کا افسوس تو ہے ہی لیکن ساتھ ہی غالب کی دوربین نظر انگریزوں کے ساتھ ہی آنے والی سائنس اور صنعت کی ترقی کی دلاویز جھلک بھی دیکھ لی تھی۔ جب سرسید احمد خاں نے ابوالفضل کی آئین اکبری کی تصحیح کی اور غالب سے اس پر تقریظ لکھنے کی خواہش ظاہر کی تو غالب نے دوٹوک کہہ دیا کہ آنکھیں کھول کر صاحبان انگلستان کو دیکھو کہ یہ اپنی ہنرمندی میں اگلوں سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ انھوں نے ہوا اور موج کو بیکار کر کے آگ اور دھویں کی طاقت سے اپنی کشتیاں سمندر میں تیرا دی ہیں۔ یہ بغیر مضراب کے نغمے پیدا کر رہے ہیں اور ان کے جادو سے الفاظ چڑیوں کی طرح اڑتے ہیں ہوا میں آگ لگ جاتی ہے اور بغیر چراغ کے شہر روشن ہو جاتے ہیں۔ اس آئین کے سامنے باقی سارے آئین فرسودہ ہو چکے ہیں جب یہ نور کا خزانہ سامنے ہو تو ویرانے کھلیانوں سے خوشہ چینی کی کیا ضرورت ہے۔

غالب نے صرف اسی نئی تہذیب اور اس کی نئی دلاویزی ہی کو نہیں دیکھا بلکہ یہ بھی کہا کہ آئین اکبری کے اچھے ہونے میں کیا شبہ ہے۔ لیکن خوبی کی کوئی انتہا نہیں۔ خوب سے خوب کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

وہ اتنی سی بات غالب کو اپنے دور سے کم سے کم پون صدی آگے لے جا کر اس عہد میں پہنچا دیتی ہے جسے ہم نشاط ثانیہ کا دور کہتے ہیں۔

غزل میں انحطاط، طرز فکر سے زیادہ طرز اظہار پر اصرار، ضلع جگت، الفاظ کی ترتیب پر دھیان، زمانے میں غالب کی غزل گوئی غالب کو اس کے بعد کے دور کا شاعر بنا دیتی ہے جہاں غزل کی اصلاح ہوئی۔

مرزا رسوا (۱۸۵۸ء — ۱۹۳۱ء) جو اردو ادب کے نشاط ثانیہ کے ایک رہنما تھے اور جن کی ناول "شریف زادہ" متوسط طبقہ کے گھرانوں میں اخلاقی تہذیب کی ایک درسی کتاب کا درجہ رکھتی تھی — شاعری میں بھی تجدید و اصلاح کے خواہاں تھے۔ ۱۸۹۵ء میں لکھنؤ میں دائرہ ادبیہ کی بنیاد رکھنے والوں میں وہ نمایاں حیثیت رکھتے تھے اس کا مقصد غالب اور میر جیسے شعراء کے رنگ سخن کی تجدید و اشاعت کر کے لکھنؤ کی زوال آمادہ شاعری اور شعری مذاق کی اصلاح کرنا تھا۔" (ڈاکٹر قمر رئیس۔ "تنقیدی تناظر" "غالب اور جدید کلاسیکی غزل"۔ ص ۱۶)

ثاقب (۱۸۶۹ء — ۱۹۴۶ء) نے اپنا شعری مسلک غالب کا تخیل اور میر کی زبان قرار دیا۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنے محولہ بالا مضمون میں کہا ہے کہ ثاقب نے غزل کو بیسویں صدی کے تقاضوں اور ایک نئے جذباتی اور ذہنی آہنگ سے مانوس بنا کر اس کی تجدید میں حصہ لیا۔ اور اس مقام پر غالب ہی ثاقب کے ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔

وحید قریشی رقمطراز ہیں (محولہ بالا کتاب ص ۲۴) کہ "غالب کے فکری مزاج کو انھوں (اقبال) نے ایک فلسفیانہ ربط و ضبط سے روشناس کرایا۔ غزل کو "بازنان گفتن" کے دائرے سے نکالنے اور وسیع تر انسانی زندگی، ذہن اور جذبات کے ترجمان بنانے میں غالب نے اقبال کی مدد کی۔"

اقبال کا یہ شعر علامتیہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے۔

اگر مقصود کل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے میرے ہنگامہ ہائے نو بہ نو کی انتہا کیا ہے

نئی دنیا، نئے زمانے اور نئی زندگی کے سنگین تقاضوں کی تاب نہ لا کر بہت سے کلاسیکی اصناف ادب و فن نے دم توڑ دیا۔ لیکن غزل اور یخ بستہ سے گذر کر نہ صرف زندہ رہی بلکہ زمانے کے نئے تقاضوں کی ترجمانی کی اور ارتقا کی نئی سمتوں کی بشارت بھی دیتی رہی۔ غزل کو یہ راہ غالب ہی نے دکھائی تھی۔ اردو غزل کو اعلیٰ جہات نو کے بخشنے میں غالب کی روایات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں غالب جدید ذہن کے معمار اولین بن جاتے ہیں۔

یہی اس عالمگیر مقبولیت کا راز ہے جو آج ایک صدی کے بعد غالب کو میسر ہو رہا ہے۔



کشور ناہید

آدھے وجود کی پوری کہانی

جیسے کانٹوں پہ بچھے پتھروں کی سی ہستی
میرا پتھرائی آنکھوں والے چہروں پہ خود کیسے حاصل کرے
کہ یہاں خبریں بھی ہیں خبروں کے دھوئیں کا ذائقہ ہیں
دھوئیں سے دھل کر آنے والی قمیضوں پہ بیٹھے
آدھے جسم کو اس کا دوسرا آدھا وجود کون دلائے گا
تو اتنی تیغ اور گھر ہے
کہ شام کے پرندے بھی آشیانوں کو پلٹنے سے گریز کرتے ہیں
سرخ سورج مجبوری ہوا
تاریکی افق اور کالے کپڑے
ان میں سے کسی نے اپنی وصیت نہیں لکھی
خاموشی اور پتھروں کے درمیان چلتے ہوئے
سورج نے پوچھا
بارش کی خوشبو دینے والی ہوا
میرے گھر پیار کا موسم کیوں نہیں
بہت کر بھی اپنے تخلیقی اعتماد کو
پلٹ کر دیکھتی ہوں
اور ناحق چبائے جاتے
میری زبان دانتوں سے کٹ جاتی ہے
خاموشی اور پتھروں کے درمیان چلتے چلتے
اس کے پیچھے میں سورج غروب ہو چکا ہے
اور بھیڑ سا بچے پیروں مٹی کے پھول کھلنے دیتے

لفظوں میں چھپے لفظ

جیسے اُس نے مجھے اپنا، جانا اور پہچانا
کاش وہ میں لکھ سکتی
کاش میں بتا سکتی
کہ اس نے مجھے روشنی سے جدا ہوتے، اندھیرے میں بھی دیکھا ہے
اور اندھیرے کو بجھانے والی روشنی میں بھی مجھے پہچانا ہے
اس کی انگلیاں، اندھیرے، نیند
اور تمام خاموش زمین کو پہچانتی ہیں
وہ سمندر اور زمین کے وصال کے فرق کو بھی پہچانتی ہیں
سمندر جب حدِ وصال سے آگے بڑھتا ہے
تو زمین اسے واپس بھیج دیتی ہے
اس نے کبھی مجھے ایسے واپس نہیں بھیجا
حالانکہ وہ زمین ہے اور میں سمندر
فراق کی ریت کے جلوؤں سے آنکھوں تک پہنچتی ہے
تو وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے
کہ وہ آنکھیں
صرف مجھے اپنے، جاننے اور پہچاننے کے لئے کھولتا ہے

چہار سمت کا دریا

ڈاکٹر قاضی عبدالرحمن ہاشمی
[illegible] جامعہ نگر دہلی ۲۵

پروفیسر عنوان چشتی کی شخصیت ہمارے عہد میں اعتبار سے قدر و منزلت کی حامل ہو چکی ہے۔ علمی و ادبی حلقوں میں ان [illegible] ہے۔ اور سماجی و [illegible] ہوا ہے۔ ہماری صفوں میں ادیب خال خال ہی رہ گئے ہیں جو [illegible] یا شخصیت کے مالک ہوں۔ پروفیسر عنوان چشتی ان [illegible] انسانوں میں ہیں [illegible] صرف [illegible] عزت [illegible] بلکہ [illegible] ابھی انہیں اپنی پلکوں پر جگہ دی [illegible] کا شاید ہی کوئی [illegible] ہوگا جہاں تک ان کے نام کی گونج نہ پہنچی ہو۔ سچ یہ ہے کہ اس آواز نے اپنی [illegible] اور تازہ کاری کی دھوم اس ملک کی سرحدوں [illegible] پاکستان میں بھی اس طرح مچائی ہے کہ وہاں کے لوگ اس آواز کو [illegible] فراموش نہ کر سکیں گے

[illegible] جو چیز پروفیسر عنوان چشتی کے لئے موروثی [illegible] کا وسیلہ تھی وہ شاعری تھی جو انھیں ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والد ماجد خود ایک باوقار شاعر تھے۔ [illegible] کسب فیض کرتے ہوئے ڈاکٹر عنوان چشتی نے بھی [illegible] کے میدان میں اپنی ایک منفرد جگہ بنائی۔ ان کی زندگی سے بہت قریب ہے اور زندگی کے حسن و [illegible] اس کی تلخی اور دلکش سچائیوں کا ایک [illegible] ہے۔ یہ شاعری [illegible] کا مرثیہ ہے نہ دلی کا [illegible] ایک وقت دونوں کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی

ہیں۔ ڈاکٹر عنوان چشتی کی شاعری میں فکر کی گہرائی، عمق اور تہ داری تو ہے ہی لیکن ان کا طرۂ امتیاز دراصل تمثال سازی ہے جو انوکھی ندرتوں کے ساتھ نئے نئے پہلو بدل کر سامنے آتی ہے۔ یہ شاعری انسان کو سمجھنے کا ہنر سکھاتی ہے۔ جدید میلان اور جدید اظہار کی تمام صورتوں میں ظاہر ہونے کے باوجود یہ شاعری زندگی کو ایک اکائی کے طور پر تسلیم کرتی ہے۔ اسی لئے اسے اگر حواس کی شیرازہ بندی کرنے والی شاعری کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ شاعری افکار کے جہان کا [illegible] خیالی بجائے بہترین جمالیاتی، انسانی اور آفاقی قدروں کی جستجو میں ہمہ وقت محو پرواز رہتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر عنوان حقیقی شعر کی تیلیوں کے تعاقب میں اتنے دور نہیں نکل جاتے ہیں کہ وہاں سے واپس ہی نہ آ سکیں۔ وہ ہوش و گوش کی منزل سے برابر سروکار رکھتے ہیں۔ اسی لئے شاعری انہیں پا بہ جولاں نہیں کر پاتی۔ ادب و شعر کی پرکھ، اس کے حسن و قبح کی تقویم اور میزان کی جستجو بھی اسی خلوص دل کے ساتھ کرتے ہیں جس خلوص کے ساتھ شعر کے گوہر آبدار کو اندرون دریا سے نکال لاتے ہیں۔ اس موقع پر عنوان چشتی صاحب کے چند اشعار پیش کرتا ہوں ؎

کام آئے گی یہ سوغات سفر میں لے جا
میرے اشکوں کی چمک اپنی نظر میں لے جا
دب کے بیٹھا تو پلٹ کر نہ کبھی آئے گا
ابھی موقع ہے بلا کر مجھے گھر میں لے جا

وہ اپنی ذات کے پیچھے سفر میں رہتا ہے
تو کیوں لوگ سمجھتے ہیں کہ گھر میں رہتا ہے
سوا اسکا نہ نام و نشاں ہیں وہ شخص
یہ اور بات کہ تیری نظر میں رہتا ہے

زندگی اک سلگتا صحرا ہے
اپنی آنکھوں میں آب جو رکھ لے
ہم کو آوارۂ محبت ہیں
اپنے گھر میں کبھو کبھو رکھ لے

اور کیا اس کے سوا شہرِ انا کے لوگوں
مرثیہ دل کا کہیں شب کا قصیدہ لکھو
زندگی ہے کہ کسی کرب سے ٹوٹی ہوئی نیند
خواب سے جاگی آنکھوں خواب شہر لکھو

کیا بس خود اپنی زد پہ آ گئے
بھٹکے ہوئے دنیا بھی [illegible] آ گئے
[illegible] دل کو جلتا دیکھ کر
اور کچھ آنکھوں میں سمندر آ گئے

زندگی اور میں کیسا ہو حساب دل
اپنی پلکوں [illegible] ہو جاؤں
اس نے چاہی نہیں نسبت دل
شہر سے کیسے جدا ہو جاؤں

اپنی پہچان سے [illegible] کب سے
زندگی تیرے [illegible] کب سے
دکھ [illegible]
اپنی ہی ذات [illegible]

ہم شکستہ [illegible]
ان سے پوچھ کے جانے کیا [illegible] ہیں

کسر سے چلا تھا خوابوں کے پیکر لوٹ کر سمیٹنے
خود اپنے آپ سے بھی جدا ہو گئی ہوں میں

دل سے چلے گی آنکھوں کے منظر تک آئے گی
زخموں کی اک برات گلِ تر تک آئے گی
جس موج کی تلاش میں گزری تمام عمر
وہ موج اب لہو کے سمندر تک آئے گی

یہ واقعہ ہے کہ ڈاکٹر عنوان چشتی اپنی مخلص ذات والشور رز فطانت سے بہت جلد مدت میں ایک ایسا

ادبی نقاد کی حیثیت سے اُبھرنے لگتے ہیں اور بتدریج انکا قد ادبی تنقید میں بلند ہونے لگتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تنقید کے میدان میں تقلید سے زیادہ اجتہاد کے قائل ہیں۔ محض کہی سنی باتوں کو نئے لسانی اظہار کا جامہ پہنانے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ادبی تنقید کی ایک نئی بوطیقا وضع کرنے پر اپنی تمام تر توجہ صرف کر دیتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ان کے ہاں روایت کا شعور ناپید ہے۔ وہ روایت کے قائل ضرور ہیں لیکن روایت کے اسیر نہیں۔ انہیں یہ بنیادی ادبی اصول بہت پہلے سے معلوم ہے کہ جب تک علم و فن کی ترویج نہ کی جائے محض روایت کے بل بوتے پر کام نہیں چل سکتا۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے ادبی تنقید میں لفاظی اور غیر معروضی رویہ کو یکسر ترک کرکے ادبی تنقید کے عمل کو ایک صحت مند سائنسی تجزیاتی اور معروضی انداز عطا کیا۔ جس کا چلن ہماری ادبی تنقید میں پہلے تھا اور نہ اب تک اس نوع کی ریاضت کیلئے کوئی آمادہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عنوان چشتی کی ادبی تنقید کی بنیادی خصوصیت جو انہیں ان کے بیشتر معروف اور ہم عصروں سے یکسر ممتاز کرتی ہے، وہ تنقید میں تمام تجزیاتی عمل اور اخذ نتائج سے عبارت ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر عنوان چشتی کے ذہن میں تنقید کا معیار منضبط، روشن اور واضح ہے۔ وہ کبھی کسی ابہام اور ابتذال اور اشکال کے دھند میں خود گرفتار رہتے ہیں اور نہ اپنے قاری کو گرفتار کرتے ہیں۔ جس طرح انگریزی ادب کے معروف نقاد نارتھروپ فرائی کے نزدیک ادبی تنقید تخلیقی انداز میں پیش کئے گئے حقائق کو واضح علمی زبان میں سمجھنے سمجھانے کا ذریعہ بنا دیتی ہے۔ ڈاکٹر عنوان چشتی بھی اسی اصول کے تحت شعر و ادب کی تفہیم میں موضوعیت سے معروضیت اور داخلیت سے خارجیت کا سفر کرتے ہیں۔ ایسے عالم میں جب ادبی تنقید بھٹکتا پھرتا ہے کہ جنگل جنگل ... کسی شخص کے لئے اس جنگل ... سے گزرنا کیسے خود خطرے سے

خالی نہیں ہوتا۔ لیکن ڈاکٹر عنوان چشتی اس خارزار سے گذر کر بھی صحیح و سلامت واپس آجاتے ہیں۔ اس اجمالی صورتِ حال کی وضاحت غالباً اس طرح ہو سکتی ہے کہ ہمارے ادبی تنقید میں اب تک جو تنقیدی نظریات معروف و مقبول رہے ہیں اور جن کو ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں طرح کے نقادوں نے اپنے اپنے طور پر برتا ہے وہ حالی اور شبلی کے تتبع میں یا تو سماجی تنقید کے نام سے جانے جاتے ہیں جس کے تحت صرف فن پارے کے موضوع کو زیر بحث بنایا جاتا ہے۔ یا پھر تاثراتی تنقید جو صرف تاثرات کی بازآفرینی سے سروکار رکھتی ہے۔ اس میں مزید اضافہ نفسیاتی تنقید کا بھی کیا جا سکتا ہے جو بہت بعد میں شامل ہوئی۔ لیکن جمالیاتی، اسلوبیاتی، فنی، ہیئتی، اسلوبیاتی اور متنی تنقید جو مختلف انداز سے فن پارے کا تجزیہ کرتی ہے۔ اور اس کی معنوی کائنات کی جہتوں کا پتہ لگاتی ہے۔ عنوان چشتی صاحب نے ان اسالیب تنقید سے استفادہ کیا اور ایک نئے انداز تنقید کی جو داغ بیل ڈالی یہ ایسا کارنامہ ہے۔ جو ہماری ادبی تنقید کی روایت میں جس پر انہیں نام ہی ملتا ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی نے اس کی اہمیت و ضرورت کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ ایک مدت تک خون پسینہ ایک کرکے اس خالص علمی و تجزیاتی تنقید کو ایک مستقل فن بنا ڈالا۔ ہر چند کہ مغربی ادب کے لئے یہ طریقہ تنقید نیا نہ تھا لیکن اردو تنقید کے لئے یہ طریقہ کار یقیناً ایک نئے جہانِ معنی کی تلاش تھی۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے اس ضمن میں نہایت غیر جذباتی، منطقی اور اشاراتی زبان کے ذریعے ادبی حقائق کو گرفت میں لینے کا فن سکھایا۔ اس بات سے اس نتیجہ تک پہنچنا بھی غالباً صحیح ہوگا کہ پروفیسر عنوان چشتی کے نزدیک تخلیق کار فن کے مقابلے میں کہیں زیادہ عظیم ہے۔ ہر چند کہ تنقید اور تخلیق کا تعلق واضح ہے لیکن تنقید کا وجود ہمیشہ تخلیق کے بعد ہی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے تخلیق کو اولیت مقدم ہے۔ نقاد حقیقتاً مصنف کے ... کا شارح اور ناقد ہوتا ہے جب کہ

تخلیق ایک غیر مختتم لازمانی اور ہمہ جہت حقیقت ہے۔ ڈاکٹر عنوان چشتی کی ادبی دیانت داری سے بعید تھا کہ وہ دونوں کے مقام و مرتبے کے فرق کو سمجھنے میں کوتاہی سے کام لیتے۔ ان کے تنقیدی نظریات ان کے مقالوں کے علاوہ ان کے بعض اہم کتابچے مثلاً اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے" اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت" "معنویت کی تلاش" "تنقید سے تحقیق تک" وغیرہ میں ملتے ہیں۔ اور یہی کتابیں ان کی عملی تنقید کا نمونہ بھی ہیں۔ علاوہ ازیں تنقید کے میدان میں مشکل پسندی کی روایت ڈالنے کا فریضہ ڈاکٹر عنوان چشتی نے انجام دیا سوچ سمجھ کر انجام دیا ہے کہ جوں جوں ہندستان میں مغربی علوم تک ہمارے نوجوانوں کی رسائی ہوگی اسے مغربی تنقید کے مقابلے میں اپنا تنقیدی سرمایہ کم وقعت معلوم ہوگا اس لیے کہ مغربی تنقید اب جس دور میں داخل ہو چکی ہے وہ علمی تنقید اور علمی تنقید کا معراج کمال ہے۔ یہاں تاثراتی، تخلیقی اور جمالیاتی تنقید کا تعین بھی کسی حیثیت پر بھی اب قائم نہیں ہے جبکہ ہماری اردو تنقید ابھی تک اپنی سمت و رفتار کو ٹھیک ڈھنگ سے متعین نہیں کر سکی ہے۔ ان حالات میں ضرورت تھی کہ ... اردو تنقید کے صحیح خد و خال کو اجاگر کیا جاتا ... جو اصل منصب و مقام ہے وہ ... تنقید اور

شاعری کا فہم ادراک نہیں ہے تو اس کا صیغۂ اظہار تاثراتی اور تخلیقی کیونکر ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اتنی بڑی ادبی منافقت ہے جس کو کوئی بھی سنجیدہ شخص برداشت نہیں کر سکتا۔ مغربی تنقید اس رمز کو پا چکی ہے۔ اس لیے وہاں ایسے ادبی ناقدین درجۂ استناد یا اعتبار نہیں حاصل کر سکتے جو تنقید کی زبان کو بھی تشبیہ، استعارہ اور دیگر شعری لوازم سے آلودہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عنوان چشتی کے ذریعہ ڈالی گئی اس منفرد تنقیدی روایت کا شعور اور عرفان جوں جوں عام ہوتا جائے گا، ان کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہوگا اور اردو تنقید کے جسد بے روح میں نئی حرارت پیدا ہوگی۔ تنقیدی کاوشوں کے ہجوم میں گھری ہوئی پروفیسر عنوان چشتی کی زندگی تدوین و تحقیق کے بار گراں کو بھی اپنے سر پر اٹھائے ہوئے ہے اس گوشے کی نمائندگی ان کی متعدد تالیفات اور بے شمار اعلیٰ ادبی و تحقیقی مقالات سے ہوتی ہے جو وہ لگاتار لکھتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں مکاتیب آتش (حصہ اول، دوم) اور "منارِ صدا" قابل ذکر ہیں۔

ان نہایت مشکل اور صبر آزما علمی و ادبی مشغولیتوں کے ساتھ ڈاکٹر عنوان چشتی کا معاشرتی زندگی کی بے امانی سے جو رشتہ ہے وہ بھی اٹوٹ ہے۔ انہیں زندگی کی ہر صورت سے پیار ہے، چاہے اس کا تعلق انسانی زندگی سے ہو چاہے کائنات میں پیدا شدہ دیگر اشیاء اور موجودات سے جو کسی نہ کسی صورت میں ... تمدن ...



کالازمی وسیلہ ہیں۔ ڈاکٹر عنوان چشتی اس زندگی کو ایک
لازوال حسن سے سرشار دیکھنے کے متمنی رہتے ہیں۔ وہ چونکہ
موت، شکستہ دلی، حرماں نصیبی اور شکست خوردگی
کے مناظر کو دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ اور بیشتر صورتوں
میں اسے انسان کی اپنی بد اعمالی کی سزا تصور کرتے ہیں۔
اس لئے وہ غم و اندوہ کی شب تیرہ و تار کے آنے سے پہلے
ہر عالم تاب کی ضو فشانی کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر عنوان
چشتی کا تصوف، معاشرتی زندگی کے مسائل سے گہری
واقفیت اور دلچسپی تمام انسانوں سے بلا تخصیص مذہب و
ملت ان کے آفاق گیر اخلاقی مشن کا محض ایک ادنیٰ اظہار
ہے۔ ڈاکٹر عنوان چشتی کو میں نے کبھی کسی سے نفرت کرتے
نہیں دیکھا۔ ہاں صرف سماجی برائی، افلاس، جہالت،
کمزوری، بد خلقی، احساس کمتری، تملق، وافلاس کردار، گمراہی
ظلم اور سرکشی کے خلاف ان کو ہمیشہ سینہ سپر دیکھا۔ اس
ملک کے اکثریتی فرقے میں کبھی کبھی لوگ مظلوم ہیں، کتنے ہی
نادار ہیں، کمزور ہیں، مگر غیرت مند ہیں۔ ایسے لوگوں کی مدد
بھی ڈاکٹر عنوان چشتی کے نزدیک اسی طرح ضروری ہے۔
جس طرح ہم مذہب انسانوں کے ساتھ ہمدردی لازم ہے۔
ڈاکٹر عنوان چشتی جس صوفیانہ عقیدے کے علمبردار ہیں،
وہ وہی عقیدہ ہے جو دنیا کے تمام بہترین انسانوں کا ہر دور
میں بنیادی عقیدہ رہا ہے۔ یعنی شر کی مخالفت اور خیر
کی تائید وحمایت وہ اقتصادی، تہذیبی اور اخلاقی استحصال
کے سخت مخالف ہیں انکی نگاہ میں مساوات عالم گیر اخلاقی
نظام کا بنیاد ہے۔ صرف ہے جس پہ ڈاکٹر عنوان چشتی کا ایمان
راسخ ہے۔ معاشرتی زندگی سے اخلاقی پستی کے ہر فاسد مادہ
کو نکالنا اور اس کی کدورتوں کو صاف کرنا اور ان زخموں کو
مندمل کرنے کی فکر میں گھلتے رہنا ڈاکٹر عنوان چشتی کا مقصد
بن چکا ہے۔ اس کا اندازہ صرف انہیں لوگوں کو ہو سکتا ہے جو
ان سے بہت قریب ہیں۔ لیکن وہ اپنی روح کے زخموں کی
نمائش کرکے ترحم کے طالب نہیں ہوتے، زندگی کو سنوارنے
کی دھن میں وہ اپنی جان پر کتنے ہی صدمے برداشت کرتے
ہیں، اسے ایک کامیاب عبادت تصور کرتے ہیں۔ انہیں موجوں
کی کچھ لہروں کا نام قومی ہم آہنگی و یکجہتی بھی ہو سکتا ہے۔
ڈاکٹر عنوان چشتی نے اس ملک کے مشرق و مغرب، شمال و
جنوب میں ہر خطے اور ہر شہر میں اس یکجہتی کے چراغ کو
روشن رکھنے کے لئے کیا کیا جتن کئے ہیں، ملک کے اخبارات،
ملکی عوام، اور ایک زمانہ اس کا شاہد ہے۔ اس لئے نہیں کہ
یہ ایک سیاسی ضرورت ہے، بلکہ یہ ایک دائمی ضرورت ہے۔
یہ ہماری روحانی اور انسانی ضرورت ہے۔ یہ ہماری عظیم الشان
متاع ہے، جو ہمیں اپنی تاریخ، تہذیب اور روایت سے
ملی ہے۔ بھلا ہم اس عظیم دولت کو کیونکر چھوڑ سکتے ہیں۔
اس کو ترک کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ انسان ایک بار پھر
دور وحشت کا باشندہ ہو جائیگا۔ ڈاکٹر عنوان چشتی
اس دن سے بہت ڈرتے ہیں جب تہذیب اپنے معنی کھو
چکی ہوگی، مذاہب اپنی اصلیت سے بیگانہ ہو چکے ہوں گے۔
قبل اس کے کہ یہ سب کچھ ہو وہ جان کی بازی لگا کر اس ملک
کی سالمیت کو ہر خطرے سے بچانا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر عنوان
چشتی نے تصوف کے میٹھے منتر سے لوگوں کے دلوں میں وطن
کی محبت کا بیج بویا ہے۔ یہ بیج بارآور ہو رہا ہے۔ یہ مزید
برگ و بار لائے گا۔ اور ہمارے عظیم ملک کا یہ چمن جو آج بھی

ملک، بچے پھولوں کا مسکن ہے اور کبھی اس پر خزاں نہ ہوگی۔ اس جنت نشان سرزمین پر قائم ہونے والا امن و انسانیت بھائی چارگی، شرافت تمام دنیا کے دامن دل کو اپنی جانب کھینچ رہے گی۔ ڈاکٹر عنوان چشتی انہیں دائمی قدروں کی جستجو، اشاعت اور سرفرازی کے لئے ہمہ وقت فکر مند رہتے ہیں۔

ڈاکٹر عنوان چشتی کی جس ہمہ گیر شخصیت کا تذکرہ میں نے ابتدا میں کیا تھا، اس کی ہر رنگ کا تعین بہت مشکل ہے۔ انکا پیشہ معلمی ہے۔ جس کے اپنے تقاضے اور اس کی اخلاقیات ہیں۔ پروفیسر عنوان چشتی نے بحیثیت معلم ایک عمر گذاری ہے اور اب تک طالب علموں کی کئی نسلیں ان سے استفادہ کر کے زندگی کے عملی میدان میں داخل ہو چکی ہیں۔ لیکن بہ حیثیت استاد بھی ڈاکٹر عنوان چشتی اپنے طالب علموں کے ساتھ محض ایک رسمی تعلق رکھنے کے قائل نہیں ہیں۔ وہ ایک معلم کے فرائض سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ اپنے طالب علموں کے مسائل سے شفقت، ہمدردی اور اخلاص کے ذریعے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ اور جو طالب علموں کی عملی تربیت اور اصلاح کا کام آتے ہیں وہیں پر ان کے اندر ایک سچا اخلاقی، انسانی اور آفاقی شعور پیدا کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ تاکہ وہ زندگی کی دھوپ چھاؤں سے پریشان نہ ہو اٹھیں۔ اور ایک صحت مند اور حوصلہ مند انسان کی طرح ملک و قوم کے مسائل کو حل کرنے کا سلیقہ سیکھ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے طالب علم ان سے جب کبھی ملتے ہیں اور جہاں کہیں ملتے ہیں تو فرط مسرت و احترام و عقیدت سے ان کی آنکھوں

میں آنسو چمک اٹھتے ہیں۔ پروفیسر عنوان چشتی کی ایک عمر کی کوششوں کا یہ وہ ماحصل ہے جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ اس دور میں جب استاد اور شاگرد کے مابین تعلقات کی نوعیت بالکل بدل چکی ہے دونوں ایک دوسرے سے بے تعلق ہو چکے ہیں۔ اکثر و بیشتر دونوں کے مفادات کے تصادم سے نئے نئے تنازع سامنے بھی تعلیمی اداروں میں پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے حالات میں کسی استاد کا اس درجہ علمی وقار حاصل کرنا واقعی بڑے اچنبھے کی بات ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی کے عقیدتمند اور ان سے بے پناہ حسن ظن رکھنے والوں کی تعداد اس ملک میں اتنی بڑی ہے کہ اس کا شمار کرنا مشکل ہے، ان سب کی یقیناً خواہش ہوگی کہ پروفیسر عنوان چشتی کی سوانح کے کچھ واضح نقوش بھی ابھاگر



کئے جائیں گے اس لحاظ سے یہ بتا دینا مزید ہے کہ پروفیسر عنوان چشتی ۵ رویں فروری ۱۹۳۷ء کو قصبہ منگلور ضلع ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ موصوف پیرزادہ شاہ انوارالحسن مرحوم (سجادہ نشیں و متولی حضرت شاہ عثمان جہانگیر چشتی) کے سب سے بڑے فرزند ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں سے ایم۔ اے اُردو، ایم۔ اے جغرافیہ، پی ایچ ڈی اُردو کے اعزاز سے نوازے گئے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں روٹیشن سکیم کے تحت صدر شعبۂ اُردو کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دے چکے ہیں۔ آجکل پروفیسر آف اُردو کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں

پروفیسر عنوان چشتی نے اپنا ادبی سفر شاعری سے شروع کیا۔ پہلی شعری تخلیق ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی تھی جب سے اب تک مسلسل لکھ رہے ہیں، موصوف کی [illegible] کتابیں، تقریباً دو سو مضامین اور دو سو تبصرے شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے اُردو میں ہیئتی تنقید کی بنیاد کو استوار کیا۔ ان کی تنقیدی کتابوں میں اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے، اُردو شاعری میں جدیدیت کی روایت، معنویت کی تلاش، تنقید سے تحقیق تک، تنقیدی پیرائے اور عکس اور شخص، تمام معتبر نقادوں اور محققوں سے خراج عقیدت حاصل کر چکی ہیں۔ شعری مجموعوں میں نیم باز اور ذوقِ جمال بطورِ خاص مقبول ہیں ان کی شاعری کی عصری حسیت، اور جمالیاتی کیفیت کی تحسین تحریف کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے متعدد مرتب کر کے شائع کیں نیز مکاتیبِ آتش، جلد اوّل و دوم اور مقدمہ اخواتی مرتب کرکے تحقیقاتی ادب میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ موصوف کی اور بھی کتابیں زیرِ اشاعت ہیں۔ ان کے علاوہ تقریباً ڈھائی سو مضامین اور تبصرے لکھ کر اس میدان میں اہم خدمات انجام دے چکے ہیں۔ گذشتہ بیس برسوں میں چند اہم نقادوں نے اُردو شاعری اور تنقید کو نکھارنے اور سنوارنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان میں پروفیسر عنوان چشتی کا نام بھی شامل ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی آل انڈیا یونیورسٹی ٹیچرز ایسوسی ایشن کے خازن، جماعتِ صوفیائے ہند کے جنرل سکریٹری، آل انڈیا اُردو سماج کے جنرل سکریٹری، اُردو رائٹرس اینڈ جرنلسٹ فورم برائے قومی یکجہتی کے نائب صدر کی حیثیت سے نمایاں سماجی، تہذیبی اور مذہبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ موصوف ہندوستان کی بہت سی یونیورسٹیوں کے ریسرچ بورڈز کمیٹی آف کورسز تعلیمی مجلسوں اور کمیٹیوں کے رکن ہیں۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو کے ایڈوائزری بورڈ کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر عنوان چشتی ماہنامہ "نگار" کے نگراں رہ چکے ہیں اور متعدد ہفت روزہ اخبارات کے اعزازی مجلسِ ادارت میں شامل ہیں۔

پروفیسر عنوان چشتی کو ان کی علمی، تحقیقی اور تنقیدی کتابوں پر سرکاری اور نیم سرکاری نیز عوامی اداروں اور تنظیموں نے انعامات سے نوازا ہے۔ جن میں میرا ایوارڈ بھی شامل ہے۔ ان کی بیشتر کتابیں ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ پروفیسر عنوان چشتی علمی سیمیناروں میں بہت مقبول ہیں چنانچہ وہ

نے بہت سے قومی اور بین الاقوامی سیمناروں میں مقالات
پیش کیے ہیں۔ اور بعض اجلاسوں کے صدارتی خطبے پڑھے ہیں۔
نومبر سنہ ۱۹۸۰ء میں موصوف آل انڈیا یونیورسٹی اردو
ٹیچرز ایسوسی ایشن کے وفد میں شامل ہو کر پاکستان کا دورہ
کیا۔ جہاں ڈاکٹر عنوان چشتی کی علمی ادبی اور تعلیمی خدمات
کا زبردست خیر مقدم کیا گیا اور موصوف کو پاکستان
کی تمام بڑی ادبی انجمنوں، تعلیمی اداروں، تنظیموں اور
یونیورسٹیوں نے استقبالیے دیے۔ پاکستان کے صدر جنرل
جناب ضیاء الحق صاحب نے ازراہِ علم نوازی ڈنر پر مدعو
اور مرقع چغتائی کی ایک جلد مرحمت فرمائی۔

پروفیسر عنوان چشتی کی شخصیت ایک ہمہ جہت اور
فعال شخصیت ہے۔ جس کا نشوونما چہار سمت میں ہوا ہے
اور اسی نسبت سے وہ ادب، تصوف، تہذیب اور
سیاست کے میدانوں میں اپنے فکر و عمل سے ایسے کارنامے
نمایاں کر رہے ہیں جنھیں دور تک اور دیر تک یاد رکھا
جائے گا۔

مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شخصیت چہار سمت
کا ایک ایسا دریا ہے جو کشتِ زندگی کو اپنے توانائی
سے سیراب کر رہا ہے۔ ▲▲▲

حنا چنگیزی

جہیز

باغ کی ساری اَن کھلی کلیاں
شاخ در شاخ مسکراتی ہیں
لب نازک کو کھول کر اپنے
پھر ادا سے چٹکتی ہیں ہر سو
بھنورے آتے ہیں رقص کرتے ہیں
اور دھیرے سے بول اٹھتے ہیں
رس جو چوسو! جہیز کیا دو گی ؟

وراثت

کاٹ کر ہابیل نے قابیل کی گردن
اپنے دامن سے پونچھا خنجر کو
اور پھر دیکھ کر سوئے آسماں بولا
اے خداوند تو گواہ رہے
دیئے جاتا ہوں ترے بندوں کو
میں وراثت میں خنجر و دامن

انقلاب

اک فرشتے نے یہ خدا سے کہا
لے لے فرزانے سے حکومت کو
پاگلوں کو بٹھا دے ان کی جگہ
کیونکہ پاگل کبھی نہیں لڑتے

○

رشمی کانت ساہی

ہمیں دل دیکھنا ہوگا ہمیں سر دیکھنا ہوگا
ہے اُن کے ہاتھ میں خنجر کہ پتھر دیکھنا ہوگا

خموشی سے سیہ بختی کا منظر دیکھنا ہوگا
خود اپنے سامنے جلتا ہوا گھر دیکھنا ہوگا

فریب وقت سے نظریں چرانا غیر ممکن ہے
یہ ہے وہ کھیل جس کو زندگی بھر دیکھنا ہوگا

دلیلِ اصلیت باہر کے جلوے ہو نہیں سکتے
حقیقت کے لئے ہر شے کے اندر دیکھنا ہوگا

دکھاؤں گا اگر اعجاز میں اپنے تحمل کا
تو تم کو سر جھکا کر بندہ پرور دیکھنا ہوگا

ہمیں راہی خدا وہ دن نہ دکھلائے تو بہتر ہو
سنا ہے آگے چل کے بد سے بدتر دیکھنا ہوگا

○

احمد سلطان قریشی

بے وجہ میرے دل میں سمانے سے فائدہ
دریا کو اضطراب میں لانے سے فائدہ

شاداب منظروں کا فسوں ٹوٹ جائیگا
پلکوں پہ کوئی خواب سجانے سے فائدہ

روتی ہوئی نظر کو ہنسایا نہ جب کبھی
ہنستے ہوئے دلوں کو رُلانے سے فائدہ

پھر شوق بندگی یہاں مانگے ہر جان و دل
قدموں پہ انکے سر کو جھکانے سے فائدہ

اپنا ہی خون آج مرے دشمنوں میں ہے
اسکے خلاف تیغ اٹھانے سے فائدہ

موجوں کو میری چاٹ گیا لہر کا سکوت
گم مائیگی کی صوت جگانے سے فائدہ

صحرا سے آرہا ہے بگولوں کا قافلہ
کمرے میں سرخ پھول سجانے سے فائدہ

یہ سوچتا ہوں بیٹھ کے بچوں کے درمیاں
عمرِ عزیز اپنی گنوانے سے فائدہ

سلطان دل کی بات زباں تک نہ آسکی
آنکھوں کو پھر گواہ بنانے سے فائدہ

○

قاسم خورشید

روک دو

سورج نے کئی بار ڈوبنے کی کوشش کی لیکن آسمان کا کوئی حصہ اسے قبول نہیں کر پا رہا تھا یا ہو سکتا ہے میں نے ایسا سمجھا ہو کیونکہ جس وقت اسے طلوع یا غروب ہونا ہوگا، ہوگا ہی ......!

اور پھر رام پور گاؤں سے تھانہ کی دوری طے کرتے وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس سڑک کی مرمت کے لئے ٹھیکہ داروں نے اچھی خاصی رقم سرکار سے لی ہے پھر بھی ......! اچانک کوئی چکنی چیز میرے جوتے کے نیچے آ گئی اور میں گرتے گرتے بچا۔ من ہی من چوٹ راستہ اور ٹھیکہ داروں کو برا بھلا کہتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ بالآخر اس مصیبت سے دوچار ہوا تھانے پہنچا۔

میں نے مکمل طور پر حالات کا جائزہ لیا اور پھر زور دار آواز کے سہارے کچھ دور پر سوئے ہوئے حوالدار لکشمن سنگھ کو پکارا۔

"حوالدار صاحب، ذرا ادھر سنئے۔"

بیچارہ کچھ بڑبڑاتا آنکھیں میچتا ہوا میرے پاس آیا۔ "یس سر ذرا نیند آ گئی تھی۔"

"کوئی مجھے تلاش کرنے آیا تھا؟"

"یس سر سیٹھ پیارے لال آئے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ جب داروغہ جی آئیں انہیں میرے ہاں فون کرنے کے لئے کہنا۔"

پھر میں نے اپنی نظر ٹیبل پر بکھری ہوئی چند فائلوں پر ڈالی۔ رام پور گاؤں سے متعلق جس فائل میں رپورٹ درج تھیں انہیں سرسری طور پر دیکھنے لگا۔ اچانک میرے دل میں یہ خیال تیزی سے ابھرا کہ گزشتہ پندرہ دنوں سے ہمارے یہاں کوئی کیس نہیں آیا ہے اور نہ ہی یہاں کوئی مقید ہے کچھ دیر بعد حوالدار سے پوچھ ہی لیا۔

"آج کل اس علاقے کے لوگ کچھ زیادہ شریف ہو گئے ہیں کیا؟" اس سوال کا اس نے مجھے ٹکا سا جواب دیا۔

"سر جب تک کوئی جرم کرتے ہوئے پکڑا نہیں جاتا ہم کیونکر انہیں پریشان کریں۔"

اس وقت میں نے اپنا منہ بند رکھنا ہی مناسب سمجھا۔ چند دنوں کی مایوسیوں نے مجھے اس اطراف کے گاؤں کا حال معلوم کرنے پر اکسایا۔ میں نے اپنی وردی پر ایک نظر ڈالی اس کے بعد حوالدار کو لے کر رام پور کی طرف چل پڑا ——— رام پور چوراہے کی چند دکانوں میں کلو پان والے کی دکان بھی بہت مشہور تھی۔ یہاں اب تین دکانوں کا اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ کلو پان والے کے پاس ہی ہماری ملاقات ایک قریبی دوست سے ہو گئی۔ کچھ رسمی گفتگو کے بعد ہم کلو کی دوکان کی طرف بڑھنے لگے۔ کچھ لوگ فلمی گیت سننے میں مگن تھے ہمیں دیکھ کر ان لوگوں نے راستہ صاف کر دیا۔

میں پان لیکر بنا پیسہ دئے ہی لوٹنے لگا تو کمبخت نے ٹوک دیا۔
"دو روپے بابو پیسہ نہیں دیا ......"

"اوہ ...... ہاں ...... یہ رہے پچاس پیسے۔" اس وقت میں نے اسے خونی نظروں سے دیکھا تھا۔
دوسری صبح میں تیزی سے کلو پان والے کی دوکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ
دو کوڑی کے پان والے نے مجھے میرے دوست کے سامنے ذلیل کیا ہے۔ میں اچھی طرح اسے اس کا مزہ چکھا دوں
اور میں وہاں پہنچ ہی گیا۔ دوکان پر چار پانچ آدمی کھڑے ہنتے بیٹھے ٹیکتے دیکھ کر دو تین وہاں سے کھسک
گئے۔ مگر باقی ڈھٹائی سے کھڑے رہے۔ ایک بار اپنی وردی کا بغور جائزہ لیا اور کلوا پر برس پڑا۔
"یہ پان کی دوکان ہے یا غنڈہ گردی کا اڈہ ......؟"
"لیکن سرکار ......" کلو بڑبڑایا۔
"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ آج کل تم بہت زیادہ ہوشیار بننے لگے ہے۔ ہم تم کو کئی دنوں سے دیکھ رہے ہیں ______"
"سرکار یہ لوگ تو میرے گاہک ہیں ......"
اسی وقت باقی لوگ دھیرے دھیرے وہاں سے سرکنے لگے۔ تب میری آواز اور بھی تیز ہو گئی تھی
"تو یہاں پر کیوں بھیڑ لگائے رہتا ہے۔ مجھے سب معلوم ہے۔ اب تمہاری دوکان کو بند ہی کروا نا پڑے گا"
"سرکار میں برباد ہو جاؤں گا میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"
"کیا میں نے تیرے گھر بھر کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔" تب ہی سامنے لگے ہوئے آئینے میں بھی خود کو دیکھا تھا
"سرکار اب یہاں پر بھیڑ نہیں لگنے دیں گے۔ ہم کو معاف کر دیجئے۔ سرکار" کلوا میرے پیر پر گر پڑا۔
"یہ سب کچھ نہیں چلے گا۔ تم ایک گھنٹہ کے اندر دوکان بند کرکے تھانہ میں آؤ۔" میں نے چلتے چلتے اسے ٹھوکر دیتے ہوئے کہا۔

چھ سو گھروں والی اس بستی میں میونسپلٹی والوں نے صرف ۲ ہی نل لگوائے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس جگہ میٹھا جل حاصل کرنے والوں کی خاصی بھیڑ ہوا کرتی تھی۔ ہم سکھیا کے گھر کے سامنے والے نل کے قریب پہنچ گئے اس وقت دو افراد آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ بیں جھگڑا کو نپٹانے اور کچھ اپنے مفاد کو سمیٹنے وہاں پہنچا۔ مجھے دیکھ دونوں خاموش ہو گئے۔ تب ہی میں نے ہوا میں رول گھماتے ہوئے پوچھا :-
"تم دونوں کیوں جھگڑ رہے ہو؟ ......"
"سرکار اس نے ایک بالٹی بھر لی ہے کہتا ہے دوسری بھی بھروں گا۔"
"نہیں حضور دیکھ لیا جائے میری دونوں بالٹی لین میں ہے۔"
"اس کی بات پر یقین مت کیجئے سرکار۔ ای جھوٹ بولتا ہے ایک کھالی بالٹی ابھی اس کی گھر والی نے لا کر
"گویا یہ تم لوگوں کو پانی بھرتے وقت پریشان کرتا ہے۔" میں نے ایک شادی شدہ عورت کو گھورتے ہوئے کہا۔ اور پھر جو آدمی بالٹی بھر رہا تھا اسے اشارے سے بلا کر پوچھا :-
"ارے ادھر سن کیا نام ہے تیرا ......؟"
"سرکار ہم نے کوئی کسور نہیں کیا ہے۔"

"حجور یہ اور اس کی عورت روج پانی بھرے وکھت کھینچ کھینچ کرے ہے" ایک جوان عورت کچھ سوچ کر بولی۔

"نہیں سرکار ای جھوٹ بول رہی ہے" میرے پیچھے سے ایک عورت نے سسکتے ہوئے کہا۔

اور جوں ہی میں اس کی طرف مخاطب ہوا۔ میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اپنے آنسوؤں کو ساڑی کے پلو سے خشک کرنے لگی۔ اس کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے میری نگاہ اس کے چہرے پر جم گئی۔ بے حد تیکھے نقش، چھوٹی آنکھیں، خوبصورت جسم۔ غرض ہر اعتبار سے۔ اس خوبصورت اور کمسن عورت کو میں نے پہلی بار گاؤں کی اس گلی میں دیکھا تھا۔ کچھ دیر تک میری آنکھیں اس سے الجھی رہیں پھر ایک نوجوان کی کرخت آواز پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"حجور یہی ہے سنکر بہو" اس شخص نے قیامت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"شنکر بہو ......"

"یہی دونوں ہم سب کو پریشان کرے ہے سرکار"

"گویا تم ہی اس کی بیوی اور اس کا نام شنکر ہے" پھر میں شنکر کی طرف دیکھ کر مزید کہنے لگا۔

"سارے نام پوچھا تھا اب تک نہیں بتایا ہے۔ تم دونوں کو معلوم ہے کہ گاؤں والوں کے ساتھ کتنا ظلم کر رہے ہو۔ ارے شنکر وا تو اس نل کو اپنے باپ کی جاگیر سمجھتا ہے اور دوسرے لوگوں کو ڈر دھمکا کر ستاتا ہے"

"حجور ہم ایک دم ایسا نہیں کرتے ہیں" شنکر کا دونوں ہاتھ میرے پاؤں کی طرف جھک چکا تھا۔

"گویا یہ لوگ جو تمہارے بارے میں کہہ رہے ہیں اور جو میں نے دیکھا سب جھوٹ ہے کیوں اب تو مجھے بھی جھوٹا بنا رہا ہے"

میں دھیرے دھیرے شنکر کی طرف بڑھنے لگا اور دو چار لات جماتے ہوئے چیخ کر حولدار سے کہا۔

"حولدار صاحب آپ ان دونوں کو لیکر تھانے آئیے آج میں ان سب کی شیخی بھلا کر رکھ دوں گا۔"

"حجور ہم گریب آدمی ہیں۔ ہم بڑی بنانے ہیں حجور چھوڑ دیجئے ہمیں"

"میں یہ سب کچھ نہیں جاننا چاہتا۔ حولدار صاحب کھڑے کیا ہیں ان دونوں کو لیکر تھانے آئیے"

حولدار نے میرے حکم کی تعمیل اس طرح کی جیسے کہ میں نے اسے کوئی جرم کرنے پر مجبور کر دیا ہو۔ میں تیزی سے تھانے کی طرف بڑھنے لگا۔ بہت دور تک ان دونوں کے گڑگڑانے کی آواز صاف سنائی دیتی رہی ـــــ حولدار ان دو مجرموں کے ساتھ دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔

تھانہ پہنچنے کے بعد سب سے پہلے میں نے اپنی پیاس بجھائی پھر سگریٹ کا سوٹا لگا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ بار بار شنکر بہو کا چہرہ میری آنکھوں کے اطراف گھوم رہا تھا اور میں اس سے لطف اندوز بھی ہو رہا تھا۔ کچھ دیر خیالوں ہی کی دنیا میں وہ حسین زندگی رنگ بھرتی رہی۔ ابھی میں اور کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ حولدار کے جوتوں کی ٹاپ نے مجھے اپنی طرف مخاطب کر دیا۔ میرے سامنے شنکر اپنی بیوی کے ساتھ کھڑا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے سکوت توڑتے ہوئے ایک کانسٹیبل سے کہا:

"ان دونوں کو الگ الگ کمرے میں بند کر دو۔"

کئی گھنٹے گزر گئے۔ میری بے چینی وقت کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ لگاتار بڑھتی رہی۔ رات ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ میں نے اونگھتے ہوئے کانسٹیبل سے بلا کر پوچھا۔

"یہاں ان دو قیدیوں کے علاوہ تیسرا تو نہیں؟"
"نہیں سر صرف یہ دو قیدی ہیں۔ کہئے کیا حکم ہے۔"
"نہیں کچھ نہیں یونہی پوچھ لیا تھا...... اور سنو تم دونوں کو میرے سامنے پیش کرو۔"
"یس سر...... یہ کانسٹیبل چلا گیا۔
شنکر بہو اپنے شوہر کے ساتھ میرے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انہیں دھمکانے کی غرض سے کہا۔
"دیکھو کیس بہت خراب ہو سکتا ہے۔ تم دونوں تین سال کے لئے اندر جا سکتے ہو۔"
"ہم لوگ بہت غریب ہیں حضور...... ہم لوگوں پر دیا کیجئے۔" شنکر بہو سماجی کرنے لگی۔
میں کیا کر سکتا ہوں تم لوگ کمزوروں پر ظلم کرتے ہو...... پھر پکڑے جانے پر رحم کی بھیک مانگتے ہو...... میں اس سلسلے میں کسی بھی طرح تم دونوں کی مدد نہیں کر سکتا۔"
پھر کچھ سوچ کر مزید کہا۔"...... ایک راستہ ہے تم لوگوں کے بچنے کا۔ مگر میں جانتا ہوں تم لوگوں سے یہ بھی نہیں ہونے کو ہے۔"
"کہئے بھی تو حضور ہم اسے پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔" شنکر کو امید کی کرن نظر آئی۔
"تم دونوں کو کم سے کم تین سو روپیہ جرمانہ بھرنا پڑے گا۔ اس حالت میں میں تمہیں دو تین دنوں میں چھوڑنے کی کوشش کروں گا۔"
"لیکن اتنا روپیہ...... ؟" شنکر کے چہرہ پر پسینہ کی بوندیں چمک اٹھی تھیں۔
"میں جانتا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم سب بد معاشی کرنا جانتے ہو لیکن جرمانہ بھرتے وقت دم نکلنے لگتا ہے ان......
"ساری بستی میں ہم بدنام ہو جائیں گے ہم کو چھوڑ دیا جائے حضور۔" شنکر بہو نے میری قدم بوسی کرتے ہوئے کہا۔
پھر میں نے کانسٹیبل کو آواز دیکر کہا۔ "ان دونوں کو لے جاکر بند کر دو۔"
دونوں گڑگڑاتے رہے میں مسکراتا رہا۔
رات کے نو بج رہے تھے۔ ماحول پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گھڑی مستقل ٹک ٹک کئے جا رہی تھی۔ تھانے میں ان دو قیدیوں، میرے اور کانسٹیبل کے اور کوئی نہ تھا۔ سبھی اپنی اپنی ڈیوٹی پوری کرکے جا چکے تھے۔ شنکر بہو او نگھ رہی تھی لیکن شنکر آرام سے سو رہا تھا۔ مجھے اپنے قریب بیٹھے دیکھ کر وہ جاگ گئی۔ مگر کچھ بولی نہیں۔ میں اسے بغور دیکھتا رہا۔ پھر بھی وہ اپنی نگاہ نیچے کئے رہی۔
"کیا تین سال کے لئے اندر جانا چاہتی ہے؟" میرے اس سوال کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہاں ڈری ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھنے ضرور لگی تھی۔ اسی وقت اس کا آنچل سینے سے ڈھلک گیا۔ میں نے دیکھا وہ بہت زور سے سانس لے رہی تھی۔ گردن سے بہتا ہوا پسینہ سینے میں کہیں جذب ہو رہا تھا مگر وہ اس سے بے خبر تھی۔ میں کچھ دیر تک اس کی بے چینی کو محسوس کرتا رہا اور پھر مجھے عجیب قسم کی سنسنی میرے جسم میں پیدا ہوئی۔ کالا کالا پسینہ لگی [illegible] بھی کسی حد تک تن رہی تھیں۔ اسی دوران میں نے کانسٹیبل کو بلا کر گھر جانے کے لئے کہا۔ اس کے چہرے کے ابھرتے ڈوبتے ہوئے تاثرات کو [illegible]

مائرہ پہل گیا

رودر دیکھا کہ وہ مجھے بغور دیکھتا ہوا دھیرے دھیرے باہر جا رہا تھا۔

کانسٹیبل کے جانے کے بعد میں نے چابی نکالی اور شنکر بہو کو آزاد کرتے ہوئے کہا ــ ــ ــ ــ

"تم میرے ساتھ آؤ..... تم سے بیان لینا ہے......"

ہم اس کمرے کی طرف بڑھنے لگا جو میرے آفس سے لگا ہوا تھا۔ جب کبھی نیند آتی تو اسی جگہ سو جاتا اور اگر کبھی تنہائی کا احساس جاگتا تو اس کمرے میں کسی کھڑکی کو کھول کر دیر تک سڑک پر گذرتے ہوئے مسافر کو دیکھا کرتا تھا۔

پھر اس نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہیں پر بیان لے لیجئے نا......"

"چلو اس کمرے میں بیٹھ کر سب کچھ اطمینان سے پوچھیں گے۔" میرا لہجہ قدرے نرم ہو چکا تھا۔

"میں اور یہ نہیں دے سکتی۔ ہم کو چھوڑ دیجئے۔"

"اری پگلی کتنا۔ مجھے تم لوگوں سے ہمدردی نہیں، بس چھوڑنے کے لئے ہی تو یہ سب کرنے جا رہا ہوں۔ سوچ بتا تمہیں جو جرمانہ بھرے کون جیل والا تجھے چھوڑ سکتا ہے اور اگر معاملہ عدالت تک پہنچ گیا تو حالات ...... تو جانتی ہی ہے ......" میں نے اسے بڑے پیار سے سمجھایا اور اس کا ہاتھ تھام کر کمرے کے اندر ۔ وہ بہت دیر تک مجھے خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ میں نے اس کے جذبات کو ٹھکرا کے بڑھ کے دروازہ بند ۔ اب کمرہ میں میرے اور شنکر بہو کے علاوہ کوئی تیسرا نہ تھا۔

جیسے ہی میں نے اپنی وردی اتارنے کا ارادہ کیا اس نے دروازہ کھول کر باہر جانے کی کوشش کی لیکن میری نظروں اور ہاتھوں نے اسے باہر جانے سے روک دیا۔ وہ بالکل ساکت ہو کر کھڑی ہو گئی۔ ایسا لگتا جیسے کوئی بت تراش ایک حسین بت تراش کر اس جگہ چھوڑ گیا ہو۔

اور پھر...... خاموشی سے وہ میری ہر بات میں ہامی بھرتی گئی۔ میرا مقصد رنگ لانے لگا۔ تب اپنے لئے اس نے چاروں پر پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے اس کے لئے تمام راہیں مسدود کر دی تھیں۔

سورج طلوع ہونے میں کم از کم ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اس وقت سیاہی اور سفیدی کا ملن بہت ہی خوبصورت رہا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ سیاہی سفیدی میں جذب ہونے لگی اس وقت لوگوں نے اپنے گھروں کے دروازے کھولنا شروع کر دیئے۔

کوئی زور زور سے دروازہ پر دستک دے رہا تھا۔ ساری رات جاگتے رہنے کی وجہ سے میری پلکیں بوجھل ہو گئی تھیں۔ میں سوچنے لگا صبح صبح کمبخت میری عبادت میں خلل ڈالنے آ گیا جبکہ شنکر بہو میرے ساتھ تھی۔ اس نے دروازہ کھولا نہیں تھا۔ میں بستر سے اٹھ کر دھیرے دھیرے چلتا ہوا دروازے کے پاس آیا۔ پہلے تو دستک دینے والے کو بھگانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ جھنجھلا کے دروازہ کھول دیا۔ حوالدار سے ملاقات کی میری جرأت نہ تھی۔ حالانکہ وہ مجھے آفس میں داخل ہوتے ہی سلامی ٹھوکتا تھا۔ آج اس کا ......ہوا تھا۔ وہ بنا مجھ سے اجازت لئے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں نے اسے روکنے کی ناکام کوشش کی ......دیکھتے وہ شنکر بہو کو لیا کرتے۔ باہر آ گیا۔ اسے اشتیاق تھا کہ میں کچھ کہوں گا۔ لیکن اندر سے ......مجھے کچھ بھی کہنے سے روک دی تھی۔ آج بھی جو کچھ کہتا کیونکہ شنکر کو کوئی جرم کیئے کا اہل نہ تھا۔ ایسا محسوس کیا۔ شنکر شاید چھٹنا چاہتا تھا لیکن اسے چوبارے کے کچھ کہنے کا اختیار تھا۔ میں نے ان دونوں ...... پر ایک نظر ڈالی صرف ہوتے ہوتے۔ کیا اور پھر کرتے کمرے میں آ کے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے کمرے کی تمام کھڑکیاں

کھول دیا پھر بھی مجھے گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ جب اندر کی دنیا اور بھی تاریک نظر آنے لگی تو باہر سڑک پر چلتے ہوئے مسافروں کو دیکھنے لگا۔ جولدار شنکر بہو کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ اس کی بیٹی یا بہو ہو۔ کچھ دیر بعد شنکر بہو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جولدار کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ پھر شنکر اپنی بیوی کے ساتھ دھیرے دھیرے گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔ جب دونوں بالکل گاؤں کے قریب پہنچ گئے تو اچانک شنکر نے پاس ہی میں پڑا ایک وزنی پتھر اٹھا کر اپنی بیوی کے سر پر پھینکا۔ اس نے بچنے کی کوشش نہیں کی اور اسی جگہ ڈھیر ہو گئی۔ اس کی چیخ و پکار سے گاؤں کے کچھ لوگ تیزی سے آتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ تب ہی شنکر نے چیختے ہوئے کہا۔
کسی کو نہیں چھوڑوں گا .... میری بہو کو تم سبھوں نے مار ڈالا ہے ...... کسی کو نہیں ......"

وہ تیزی سے بھاگتا رہا اور گاؤں کی بھیڑ ایک جگہ ٹھہری ہوئی اسے دیکھتی رہی ———
اس روز کے بعد شنکر گاؤں نہیں لوٹا۔ پولیس اب بھی اس کی تلاش میں ہے۔

حلیم اللہ حالی

نئی کتابوں کا تعارف

برگِ گل
شاعری

مصنف : ابو محمد سحر
ضخامت ۱۱۲ صفحات

قیمت : [illegible] روپے
پتہ : مکتبۂ ادب ۹۲ ۳ مالویہ نگر۔ بھوپال ۴۶۲۰۰۳

ابو محمد سحر ایک نقاد اور محقق کی حیثیت سے اردو کے سنجیدہ قارئین میں معروف و مقبول ہیں۔ برگِ گل ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ جناب سحر نے اپنی صلاحیتوں کو کسی ایک صنفِ ادب تک محدود نہیں رکھا ہے۔ ان کی تنقید ان کی محنت و مشقت، دیدہ ریزی و استدراک اور وسعتِ مطالعہ کی غماز ہے۔ ان کی شاعری ان کے مزاج کی لطافت و گداز اور نرمی و صاحب دلی کی پہچان ہے۔ اس طرح ان کی تنقید اور شاعری دونوں ایک دوسری کا تکملہ ہیں۔

غزل آج بھی اپنی روایات سے گہرے طور پر وابستہ ہے، اس افراط و تفریط اور تغیر و تبدل کے دور میں جب کچھ لوگوں نے تغیر برائے تغیر کے انداز میں روایت شکنی کا غیر فنکارانہ رویہ اپنا رکھا ہے غزل کا اپنی روایتوں پر مستحکم رہنا اس امر کا بین ثبوت ہے کہ یہ صنفِ سخن دامن پاک ہونے کے ساتھ توانائی اور لازوال حسن کی حامل ہے۔ یہ اس کے جلوۂ صد رنگ کا فیض ہے کہ ہر کامیاب غزل گو استعمال شدہ بحروں اور قوافی و ردیف سے ایک بالکل نیا کام نکال لیتا ہے۔ بقول سحر ؎

سنا چکا ہے زمانہ اسے سحر لیکن — دل حزیں کی کہانی نئی نئی سی ہے

جناب سحر روایت سے وابستگی کے باوجود نگارخانۂ غزل میں نو بہ نو رعنائیوں کے خالق ہیں۔ برگِ گل کے درج ذیل اشعار نے مجھے اس نتیجہ تک پہنچا دیا ہے کہ جناب ابو محمد سحر غزل کی روحانی پہنائیوں سے واقف ہیں۔

بدلنے لگا رخ ہوا کا ڈھلنے لگی سروں کی دھوپ — ان راہوں میں اپنا مقدر نہ دیکھئے

مل کے یادوں سے کوئی چوٹ نئی سے آئیں — زخم اب پچھلی عنایات کے بھر آئے ہیں

ایک بے نام سی الجھن ہے دلِ دیوانہ چھیڑ — ایک گمنام سا احساس زیاں آج بھی ہے

کوئی منزل نہ کہیں سنگِ نشاں — اف یہ فاصلے اپنا مقدر نکلے
جو یاد تجھے بھی تو کام کے ہیں بہت — وہ دن کہ ہم نے ترے پیار میں گنوائے ہیں

چل لیا

لطف ہیں سوکھے ہوئے خوشیوں کے چمن — عین ساون میں کنول جیسے ہوں مرجھائے ہوئے

جناب سحر کے شعری محرکات میں ماضی اور اس کی سہانی یادوں کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ گزرتے لمحوں کی بے معنویت اور ماضی کے حسین واقعات سے اپنی گہری وابستگی کا اظہار جگہ جگہ کرتے ہیں

آ کی پھول بن اکثر اس طرح یاد ماضی — ایک شخص اجنبی سا جیسے ہمیں ملا ہے یا

اصل عمر رواں یادوں کا جنگل ہے سحر — اب اسی جنگل میں ترتیب چمن پیدا کریں

اور اس طرح کے متعدد اشعار جناب سحر کے کلام میں ایک لطیف اور ماورائی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ جناب سحر غزل کے فارم میں غزل کے موضوعات پیش کرتے ہیں۔ میری مراد یہ ہے کہ احساس کے موضوعات کا مرکز ہے اور کسی ایک نقطے کے اردگرد متعدد محسوسات گھومتے نظر آتے ہیں۔ جناب سحر کا کلام زبان و بیان کے اعتبار سے ستھرا، محسوسات کے لحاظ سے لطیف و گداز اور حقیقت سے منفرد ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں حدیث دل بیان کرتے ہیں، وہ اظہار کے خارجی جمال اور داخلی حسن سے ایک متوازن تاثر پیدا کرتے ہیں۔ ان کی یہ خصوصیت ان کی اس شعری تجلیات کو ایک جوان فکر امتیاز و اختصاص پیدا کرتی ہے۔ "برگ غزل" کتابت طباعت، سرورق ہر لحاظ سے [illegible]

کتاب : [illegible] — مصنف : کاظم نا طق
[illegible] — صفحات : [illegible]
[illegible] — قیمت : [illegible] — ملنے کا پتہ : [illegible] راقی منڈی الہ آباد

[illegible] مصور ذات [illegible] شگفتگی [illegible] قید شکنی۔ نقش گر ذات کے مصنف جناب حلیم صبا نویدی کو اگر چہ اب اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ اپنے تعارف کی تعارفی تحریر کا سہارا لیں لیکن ہمیں اس امر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جس فنکار نے [illegible] دیکھتے دیکھتے اردو شاعری میں ایک اہم مقام پیدا کر لیا ہے اس کی فعالیت، تحریک، تاثر اور تخلیقی ابعاد کیا ہیں۔ انھوں نے شعر و ادب کے مختلف جہتوں میں غیر معمول کا ثبوت دیا ہے اور یہ حیرت انگیز کارنامہ ہمیں فنکار کی شخصیت کی تفہیم پر مجبور کرتا ہے قاعدہ ہم پہلے فن سے تاثر حاصل کرتے ہیں اور جب یہ تاثر گہرا ہو جاتا ہے اور ذہنی تجربے ہمیں حیرت میں مبتلا کر دیتے ہیں تو ہم فنکار کی ذات تک رسائی حاصل کر کے ان رموز کو جاننا چاہتے ہیں جو فن کا سبب ہوتے ہیں۔ حلیم صبا نویدی کی تخلیقیت نے ہمیں جو نکالا ہے، ان کی شعری تخلیقات کے لئے معنا اہم پیدا ہوتے ہیں۔ تمام عمر [illegible] سے مطلوم کی صبح روح پیدا کرنا ہی شاعری ہے۔ وہ انجانی سمت میں جھیج کر خود قاری دان کے پیچھے دوڑانے کا ہنر جانتے ہیں ——— اور قاری ہی بتا سکتا ہے کہ وہ کس سمت گیا اور وہاں اس نے کون کون سی تجلیاں دیکھیں۔ الفاظ کے نئے استعمال کے لئے ظاہر ہے۔ روایت سے رخصت لینی پڑتی ہے، روایت سے کبھی بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن حلیم صبا نوی پھر جب اشعار میں جاتے ہیں تو ایک بالکل نئی شعری فضا ہمارے

سامنے پیش کردیتے ہیں۔ اس طرح ان کا وداع و وصل دونوں ہمارے لئے خوشگوار معلوم ہوتا ہے

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد   ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

کاظم نائطی نے لہجہ تراش میں سلیم صبا نویدی کے فکر و فنی اور شخصیت و مزاج کا جائزہ لیا ہے یہ کام اوروں کے لئے دشوار ہو سکتا تھا لیکن کاظم صاحب چونکہ جناب سلیم صبا کو بہت دنوں سے جانتے اور پہچانتے ہیں اس لئے ان کے لئے یہ کام آسان بھی ہو گیا اور ان کے جائزہ میں قریبی مشاہدے کی جھلک بھی آگئی ہے جناب کاظم نے اس اہم فنکار کے انداز کلام اور اس کے جدید ذہن کے تنوع اور ندرت کا خیال کرتے ہوئے اپنے جائزہ کے لئے جو ذیلی عنوانات مقرر کئے ہیں وہ فنکار اور نقاد دونوں کے رجحان طبع کی بہتر عکاسی کرتے ہیں مثلاً چند ذیلی عنوانات ملاحظہ فرمائیے:

سلیم کے فکری فاصلے۔ زہراب سے گل خوش آب تک۔ اشتیاق کی آنچ۔ تیسرے شخص کی پرچھائیں۔ روشنائی کا دریا بہا دو۔ غیر معین فاصلہ کی بحالی اور چھوٹے دلاسے کا احسان وغیرہ۔ ان عنوانات سے خود کاظم نائطی کی ندرت فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے عام تنقیدی لب و لہجہ سے ہٹ کر شگفتہ اور دلچسپ انداز تحریر اپنایا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی تنقید فکر و احساس دونوں سے اپنا رابطہ پیدا کر لیتی ہے۔

کسی فنکار کا صحیح مرتبہ اسی وقت متعین ہو سکتا ہے جب متعدد نقادوں کی تفصیلی رائیں سامنے آجائیں۔ جناب سلیم صبا نویدی کے سلسلہ میں جناب کاظم نائطی نے اس تفصیلی تفہیم کی طرح ڈالی ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

کتاب مواد و موضوع اور اسلوب و بیان کے اعتبار سے اچھی ہے، ادب کے قارئین کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے

نام کتاب : نظیر اکبرآبادی   صنف : تنقید

مصنف : علی احمد فاطمی   ضخامت : ۱۱۸ صفحات

قیمت : بیس روپے   پتہ : تہذیب نو پبلی کیشنز ڈیوٹرن ۲۴۲ صدف الہ آباد

نظیر اکبرآبادی ایک زمانہ تک ہماری بے توجہی کے شکار رہے لیکن کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر۔ آخر وہ دن بھی آہی گیا جب ہم نظیر کی اہمیت اور افادیت کے قائل ہو گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اب ہمارے سرمایہ تنقید میں عہد نظیر۔ شخصیت نظیر اور کلام نظیر کی تفہیم کے اہم مواد پیدا ہو چکے ہیں لیکن جس طرح تخلیق ادب کے ہزاروں گوشے ہیں اسی طرح تنقید و تفہیم کے سینکڑوں زاویے ہیں ——— ان تمام زاویوں میں علی احمد فاطمی کی پیش نظر کتاب ایک نئے زاویہ کی طرح سامنے آتی ہے۔

علی احمد فاطمی تنقید میں قدیم ڈھب کے قائل نہیں انھوں نے پیش نظر میں (جو مروجہ عنوانات کے عنوان سے مشترک کتاب ہے) اپنے انداز فکر کی وضاحت کی۔ وہ تحقیق اور تنقید کے ناگزیر قائل ضرور ہیں لیکن تنقید کو تحقیق کے تا حال حاصل شدہ کے آخذ [illegible] ادھر سے قدرے آزاد کر کے دیکھنے پر مصر ہیں اس لئے کہ تحقیق کے نئے باب پر آن کھلتے رہتے ہیں اور تحقیق میں محدود تنقید اس طرح نیم قطعی ہو کر رہ جاتی ہے۔ فنکار کے تخمینہ اور اس کے مرتبہ کے تعین میں اس کے حصہ فن پارہ کی حیثیت لازم اور امسٹ مواد کی نسبی ہوتی ہے۔ تحقیق کے پیچھے بھاگنے والی تنقید بادلی ہو جاتی ہے اور کسی نتیجہ تک پہنچنے اور

تحلیل سے قاصر رہتی ہے۔ معروضات میں ایک جگہ میں لکھتے ہیں کہ:

"اہل علم بالخصوص اہل تحقیق واقف ہیں کہ تحقیق کی دنیا بڑی عجیب و غریب دنیا ہے، کس وقت کوئی سی صداقت کیا روپ لے کر سامنے آجائے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تحقیق کی مختلف صورتیں بہ وقت باہم گڈمڈ رہتی ہیں۔ جس کی وجہ سے صورت حال اکثر و بیشتر متبدل ہیئت اختیار کرتی رہتی ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ وہ تنقید میں تحقیق کے ذریعہ فراہم شدہ مواد کے مقابلہ میں VISION پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں، لیکن فاطمی کے انداز تنقید کو متنی تنقید یا تاثراتی تنقید بھی نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ وہ بنیادی طور پر متن کی تحلیل و تجزیہ اور اس کے خوب و زشت کو عیار نقد بناتے ہیں اور نہ فن پارہ کو وقتی تاثرات محفوظ کرنے کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ وہ عمرانی فکر کے قائل ہیں، فنکار کے عہد کو سمجھنے، اس کے انفرادی مزاج اور حالات، اس کے دور کی رسوم و رواج نیز اس کی تخلیقات میں پیش کردہ ثقافتی زندگی کی عکاسی اقدار کی طرح کے دوسرے عوامل کے پیش نظر وہ آزادانہ محاکمہ پر زور دیتے ہیں۔ یہی کچھ انھوں نے نظیر کے پیش نظر مطالعہ میں بھی کیا ہے۔ ——— جناب فاطمی نے اس کتاب میں مختلف مقالات کے ذریعہ نظیر کے متعدد پہلوؤں پر از سر نو روشنی ڈالی ہے، انھوں نے نظیر کو ان کے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کے پس منظر میں بھی تلاش کیا ہے۔ تحقیق کے ذریعہ حاصل شدہ مواد کی روشنی میں ان کے سوانحی حالات پر بھی نظر ڈالی ہے۔ نظیر اور غالب کے ذہنی و فکری رشتہ کو بھی مد نظر رکھا ہے (یہ اور بات ہے کہ یہ جائزہ ناکافی ہے) ۔ اور انھوں نے نظیر کے بنیادی کارنامہ کی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے متذکرہ بالا تمام پہلوؤں پر اگرچہ طائرانہ نگاہ ڈالی ہے۔ لیکن ان سے جو نتائج انھوں نے اخذ کئے ہیں وہ ان کی تنقیدی بصیرت کا پتہ دیتے ہیں۔ فاطمی ذہین آدمی ہیں وہ بھیڑ میں بھی اپنی منفرد راہ نکال لیتے ہیں۔ نظیر اور کلام نظیر پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے نظیر سے متعلق پیش کردہ ادب اور نظیر میلہ کو بھی فراموش نہیں کیا ہے۔ اس طرح نظیر سے متعلق اپنے جائزہ میں وزن پیدا کرنے کے لئے انھوں نے تمام ضروری عوامل پر توجہ دی ہے۔ نظیر پر ان کی تنقید بھرپور نہ سہی لیکن اثر انگیز ضرور ہے۔ اس لحاظ سے ان کی یہ کاوش لائق ستائش ہے۔ قیمت کچھ زیادہ ہی سہی مگر یہ کتاب پڑھنی چاہئے۔

بقیہ: قرآن کریم کی روشنی میں

انسانوں کو بعض قرآن مجید کی اصطلاح میں [illegible] کہا جاتا ہے جبکہ ان کی ہدایت کا سامان بھی کیا۔ لیکن اور یہ بات [illegible] کرنے کے قابل ہے، قرآن مجید کا اپروچ انسان کو مجبور محض سمجھنے کا نہیں ہے اس لئے اسے ہدایت قبول کرنے پر بھی مجبور نہیں کیا گیا ہے لیکن ساتھ [illegible]

قبول نہ کرنے کے نتائج سے آگاہ کرکے اسے آزاد چھوڑ دیا گیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کا یہ اپروچ بڑی بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور فیوڈل دور کے مقابلے میں آج جدید دور میں جو عقل اور روشنی کا دور ہے، اس اپروچ کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ ہم [illegible] آیتوں کی تشریح کرتے وقت [illegible]

[illegible]

BINNY COLOUR

BINNY

LOCKS

BINNY LOCKS CO.

Regd. No. A-25465/79

DESIGN IS REGISTERED.

NO BODY IS ALLOWED TO COPY IT.

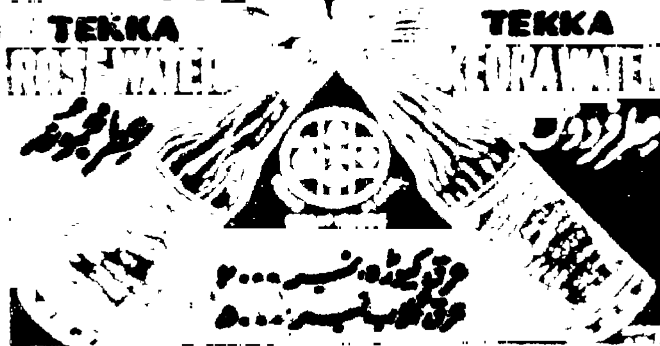
(REGD. No. A-38/44/82)

5-LEVER SECURITY

SUPER BINNY LOCK

SLVRO BINNY

MFD. BY:- N.A. PRODUCTS





Price Rs. 1.50

سہیل، گیا

ماہنامہ سہیل گیا کی عظیم پیش کش

ایک شمارہ منور رانا کے نام

"منور رانا جدید لب ولہجہ کے بانکے شاعر ہیں"

- غالب اگر زندہ ہوتے تو ڈیڑھ سو روپے پر پیرکٹ ٹونچندی کے مشاعرہ میں دھکے کھاتے پھرتے۔
- غزل اس انتظار سے زیادہ خوبصورت ہے جو گھر کے دریچے پر دو آنکھیں کرتی رہتی ہیں۔
- کچھ دنوں قبل جب میں نے اپنے ایک ٹائپسٹ سے ماہنامہ شاعر کا آزاد غزل نمبر لانے کو کہا تو اس نے کہا معاف کیجئے گا میں ابھی وضو میں ہوں اس لئے آپ خود ہی لے آئیے۔
- نظم اور غزل میں وہی فرق ہے جو ڈاکٹری دوا اور حکیمی دوا میں ہے۔
- کچھ دنوں پہلے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے ہاتھ روم میں جگن ناتھ آزاد کا شعری مجموعہ رکھا دیکھا تھا۔ اس لئے اردو میں شعری مجموعہ چھاپنے کی ہمت نہیں پڑ رہی ہے۔

(منور رانا)

جمیل منظر سنسہاروی کا لیا ہوا ایک اچھوتا انٹرویو اور منور رانا کا بے باک جواب ● والی آسی کے الفاظ میں "منور رانا اس صدی کے کبیر ہیں"

مضامین ابراہیم ہوش۔ ڈاکٹر عنوان چشتی۔ ڈاکٹر مظفر حنفی۔ ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی۔ ڈاکٹر علیم اللہ حالی۔ شکیل صدیقی۔ ڈی این آریا۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ۔ رضوان احمد۔ ڈاکٹر عظمت ملیح آبادی۔ احمد ابراہیم علوی۔ شاہ نواز قریشی۔ سعید احمد قادری۔ حبیب ہاشمی۔ پروفیسر نصرت جمیل۔ شوکت ملیح آبادی۔ مسعود عابدی۔ اقبال جاوید۔ ظہیر انور۔ جاوید انور

منور رانا اہلِ قلم کی نظر میں

شہپر رسول۔ علقمہ شبلی۔ جاوید نہال۔ بدر الحسن۔ فیروز عابد۔ سعید بریلی۔ ظفر احمد۔ ڈاکٹر قاسم امین۔ ڈاکٹر روحی قاسمی۔ نور الہدی۔ کمال احمد۔ قیصر شمیم۔ لندبیکر۔ خالق عبداللہ غازی۔ راج کمار چندن۔ وحید عرشی۔ فاروق شفق۔ ڈاکٹر یوسف تقی۔ وغیرہ

ٹیٹ صاحب میری نظر میں ــــ منیتہ رانا

صفحات ۱۴۰ ● قیمت -/۵ روپے ● لائبریری ایڈیشن - ۱۲ روپے ● تاریخِ اشاعت: اگست ۸۹ء

ترتیب: ڈاکٹر علیم اللہ حالی ــــ جمیل منظر سنسہاروی

ایجنٹ حضرات آج ہی ایجنٹ کے پاس بک کرالیں یا مولانا آزاد روڈ گیا سے طلب کریں

ماہنامہ سہیل، مولانا آزاد روڈ گیا ۸۲۳۰۰۱

ترقی اردو بیورو کی سرگرمیاں

چند اہم منصوبے

اردو انسائیکلو پیڈیا اور مختلف لغات کی تیاری اور اشاعت ترقی اردو بیورو کے اہم منصوبوں میں سے ہے۔

۱. اردو انسائیکلو پیڈیا (۱۲ جلدیں تیار) ۲ جلدیں زیر نظر ثانی
۲. انگریزی اردو لغت (۵ جلدیں تیار) پہلی جلد زیر اشاعت
۳. اردو اردو لغت (۵ جلدیں تیار) زیر نظر ثانی
۴. اردو اردو لغت برائے طلبا (ایک جلد تیار) کتابت زیر تصحیح
۵. فرہنگ سیاسیات (ایک جلد) شائع ہو چکی ہے
۶. فرہنگ ادبی اصطلاحات (ایک جلد) پریس میں ہے

اصطلاحات سازی

شعبوں میں تقریباً ۔۔۔۱۲۲ اصطلاحات وضع کی جا چکی ہیں۔

فرہنگ اصطلاحات کیمیا (ایک جلد) شائع ہو چکی ہے
فرہنگ اصطلاحات لسانیات (ایک جلد) شائع ہو چکی ہے
فرہنگ اصطلاحات معاشیات (ایک جلد) شائع ہو چکی ہے
فرہنگ اصطلاحات حیوانیات (ایک جلد) شائع ہو چکی ہے

لسانیات جغرافیہ نباتیات اور تاریخ، سیاسیات کی فرہنگوں کا کام مکمل ہو گیا ہے

چند نئے منصوبے

۱۔ اردو کتابوں کی ببلیوگرافی

(چھاپہ خانے کی ایجاد سے لیکر ۱۹۴۰ء تک)

ملک کی اہم لائبریریوں میں کام کیا جائیگا۔ فی الحال
مولانا آزاد لائبریری
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کام جاری ہے
ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری
جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کام عنقریب شروع کیا جائے گا

۲۔ اردو اداروں کی ڈائرکٹری

ترقی اردو بیورو اور ملک کی تمام اردو اکیڈمیوں کی ایک رابطہ کمیٹی قائم کی گئی ہے اور باہمی تعاون سے یہ ڈائرکٹری مرتب کی جا رہی ہے۔ اسی طرح کئی اور اہم کام کیے جا رہے ہیں

کتابت اور خطاطی کے تربیتی مراکز

اب تک ۲۰ تربیتی مراکز ملک کے مختلف حصوں میں قائم کیے گئے ہیں۔ ان میں دو مراکز اعلا فن خطاطی کی تربیت اور تین مراکز بطور خاص خواتین کے لیے ہیں۔ علاوہ ایسے اور مراکز بھی قائم کیے جائیں گے

.و ٹائپ رائٹر اور طباعتی کمپیوٹر

ترقی اردو بیورو نے ملک میں مقامی طور پر اردو ٹائپ رائٹر
اری کے سلسلے میں بھی کام کیا ہے۔ چنانچہ اب اردو ٹائپ
ہندستان میں تیار ہو رہے ہیں اور آسانی سے دستیاب ہیں۔
اح طباعتی کمپیوٹر کی تیاری کے سلسلے میں بھی کوشش جاری ہے۔

. اور نئے پروگرام

مراسلتی کورس :۔ ملک کی مختلف ریاستوں میں اردو
نے کے خواہشمندوں کے لیے انگریزی اور ہندی ذریعہ تعلیم
اردو سکھانے کا مراسلتی کورس جلد ہی شروع کر دیا جائے گا۔
ی کام مکمل کیا جا رہا ہے۔

یقی رسالہ کی اشاعت :۔ ترقی اردو بیورو کی سرگرمیوں
ے ماہی ترجمان "اردو دنیا" کے علاوہ ایک شش ماہی
ی تحقیقی رسالہ بھی جلد ہی شائع کیا جانے گا۔ ابتدائی
یاں جاری ہیں۔

.عات کی نمائش اور فروخت

ترقی اردو بیورو۔ ملک کے مختلف اردو مراکز میں ہر سال اپنی
ں کی نمائش اور فروخت کا انتظام بھی کرتا ہے پچھلے سال
نے دہلی، بھوپال، مدراس اور کلکتہ جیسے اہم مقامات پر
تابوں کی نمائش لگائی تھی۔ گذشتہ مالی سال کے دوران

۳۱۱۴۵ روپے کی مالیت کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ اس
طرح اب تک کل ۲،۱۱،۰۲،۲۵۶ روپے مالیت کی کتابیں
فروخت ہوئی ہیں۔

بچوں کا ادب

ترقی اردو بیورو اردو میں بچوں کی اچھی اور معیاری کتابوں
کی تیاری اور اشاعت کے سلسلے میں بھی کوشاں ہے اب
تک اس طرح کی اڑسٹھ (۶۸) کتابیں شائع کی گئی ہیں۔

طبی کتابیں

طب یونانی کی عام ضرورتوں کے علاوہ نصابی ضروریات کو
پیش نظر رکھتے ہوئے کئی کتابیں لکھائی جا رہی ہیں۔ اب تک
دس (۱۰) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

علمی، ادبی، سائنسی اور تکنیکی کتابیں

مختلف علوم و فنون سے متعلق اب تک ۵۵۴ کتابیں شائع
کی ہیں ان میں کئی کتابیں ایسی ہیں جو اپنے موضوع پر اولین تصنیف
ہیں اور کئی کتابیں ایسی بھی ہیں جن کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں
گزشتہ مالی سال کے دوران مختلف علوم و فنون سے متعلق ۴۵ کتابیں
شائع ہوئی ہیں جو از خود ایک ریکارڈ اشاعت ہے۔

یہ کتابیں مختلف ریاستوں میں کسی بھی بک سیلر سے خریدی
جا سکتی ہیں براہ راست بیورو سے بھی حاصل کی جا سکتی ہیں۔

تفصیلات کے لیے ذیل کے پتہ پر لکھیں

بے ٹکٹ
مسافر

کیا آپ جانتے ہیں؟

بے ٹکٹ سفر صرف مخالف سماج فعل ہی نہیں۔ اسے سنگین جرم بھی مانا جاتا ہے۔
اگر پکڑے گئے تو نتیجہ بھی سنگین ہوتا ہے۔ ۵۰۰ روپے تک

جرمانہ ورنہ تین مہینے کی

سزائے قید

بے ٹکٹ سفر کے خاتمے کے لئے نگرانی بڑھائی جا رہی ہے۔

اب خود ہی سوچیے کہ کیا یہ اچھا ہے

بے ٹکٹ سفر قوم کے لئے، سماج کے لئے اور خود آپ کے لئے بھی مضر ہے۔
سفر کرنے سے پہلے ٹکٹ لینا ہرگز مت بھولئے۔

پوربی ریلوے

بانی: مولانا حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سہنساروی ▲ بیادگار: مولوی محمد زین العابدین اکبر سہنساروی

ترقی پسند ادب کا ترجمان

ماہنامہ سُہیل گیا

جون و جولائی ۱۹۸۴ء

شمارہ: [illegible] ــــ ٥ ــــ جلد: ۴۶

ت ایڈیٹر
مسعود منظر سہنساروی

یٹر
جمیل منظر سہنساروی

اد سین
شکیل احمد جمالی
عبدالقیوم ابدالی

مجلس مشاورت
٥ ادریس سہنساروی
٥ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
٥ ڈاکٹر قمر رئیس
٥ اصغر علی انجینیئر

بدل اشتراک

فی شمارہ ــــ ایک روپیہ پچاس پیسے
سالانہ: ــــ ۱۸ روپئے
لائف ممبری: ــــ ۱۱۰ روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ: ماہنامہ سہیل - ریلوے سائڈ روڈ - گیا

فہرست

محمود

مہاراشٹر کا فساد اور ہمارا مطالبہ

مہاراشٹر کے بھیونڈی اور دیگر مقامات پر جو بدترین اقلیت کش فسادات ہوئے ان کی تفصیلات معلوم کر کے انسانیت تڑپ اٹھتی ہے اور یہ سوال خود بخود ذہن میں اٹھتا ہے کہ ہندوستان کدھر جا رہا ہے! سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ان فسادات میں تین سو سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے ہزاروں زخمی ہوئے اور لاکھوں مسلمان معاشی اعتبار سے بے پناہ اور برباد ہو گئے۔ کیوں کہ گھروں کو ان کے پھونک دیا گیا سب کچھ لوٹ لیا گیا۔ بھیونڈی میں اس کے قبل بھی تین مرتبہ فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے ہیں۔ پہلا فساد ۶۵ء میں دوسرا ۶۸ء میں اور تیسرا ۱۹۷۰ء میں ہوا۔ اور فرقہ پرست طاقتوں کے لئے ہر فساد کے بعد ہونے والا فساد ایک نیا تجربہ بنا۔ فسادیوں نے اشتعال پھیلانے کی تکنیک کو اور بھی موثر بنایا اور فسادات کا دائرہ پھیلاتے گئے۔ اس دوران عوام کی معاشی حالت بگڑتی چلی گئی اور بے کار نوجوانوں کی تعداد میں خوفناک اضافہ ہوا جنھیں مشتعل کرنا بہت آسان ہے۔

بھیونڈی میں سب سے ہولناک واقعہ ۱۹ مئی کو انصاری باغ میں پیش آیا جہاں کچھ مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں نے پناہ لے رکھی تھی جن پر ایک ہزار بلوائیوں نے لاٹھی، چھرا، بم، پستول، لوہے کی سلاخوں، برچھیوں اور تلواروں سے حملہ کیا ۱۲۷ افراد جب زخمی ہو کر گر پڑے تو بلوائیوں نے ان کے جسم پر کراسن تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ اور یہ زندہ انسان تڑپتے ہوئے جل مرے۔

مہاراشٹر کے اس مرتبہ کے فساد میں بھی شیو سینا اور اس کے لیڈر بال ٹھاکرے کے ہاتھ دیکھے گئے ہیں۔ سرکار کی ناکامی کی بات بھی سو فیصد درست ہے مگر ہم اپوزیشن کی سیکولر، جمہوری اور بائیں بازو کی پارٹیوں کی ناکامی کا تذکرہ کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتے جنھوں نے صورت حال نہ تو ٹھیک سے سمجھا اور نہ ہی بروقت موثر مداخلت کی۔ کیا فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی برقراری صرف سرکار کی ذمہ داری ہے؟ کیا یہ تمام جمہوری قوتوں کا فرض نہیں ہے کہ وہ فرقہ وارانہ پروپیگنڈے کا توڑ کریں اور فسادات کو روکیں۔؟ آخر کو ان فسادات سے سب سے زیادہ غریب عوام متاثر ہوتے ہیں؟ کیا بھیونڈی سے بمبئی تک پھیلے ہوئے اس وسیع صنعتی علاقہ میں ٹریڈ یونینوں، بائیں بازو کی پارٹیوں اور منظم مزدور طبقہ کا فرض نہیں ہے کہ وہ تمام فرقوں کے اتحاد اور بھائی چارے کا تحفظ کرے؟

ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ تمام فرقہ پرستوں کے خلاف کارروائی کی جائے۔ دونوں طرف سے ہونے والے فرقہ وارانہ پروپیگنڈے کو روکا جائے۔ دوسرے فرقہ کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے

تمام بورڈ اور پوسٹر ہٹائے جائیں۔ ایسے تمام مجرموں اور سماج دشمن عناصر کو گرفتار کیا جائے جنھیں اعلیٰ حلقوں کی سرپرستی حاصل ہے اور ان سے سختی سے نمٹا جائے۔ ریاستی سطح پر قومی یکجہتی کمیٹی کو پھر سے باعمل بنایا جائے۔ باز آبادکاری کا کام بارش شروع ہونے سے پہلے مکمل کیا جائے اور ریلیف کی مقدار کو بڑھایا جائے کیونکہ جو ریلیف دیا جا رہا ہے وہ ناکافی ہے۔ ریلیف اور باز آبادکاری کے کام سے تمام سیکولر اور جمہوری پارٹیوں کو ہر سطح پر وابستہ کیا جائے۔

جن واقعات اور حالات میں فسادات کی آگ بھڑکی اُن کی جانچ ضروری ہے تاکہ نہ صرف مجرموں کا پتہ لگا کر انھیں سزا دی جا سکے بلکہ آئندہ پھر ایسا نہ ہو سکے۔ اس کے لئے عدالتی جانچ بھی ضروری ہے۔ جس کی رپورٹ جلد سے جلد مل جانی چاہیئے۔

ایک وضاحت کی وضاحت

مقامی ہفتہ وار "مورچہ" میں ماہنامہ سہیل گیا کے "کلام حیدری، فن اور شخصیت نمبر" کے سلسلہ میں کلام حیدری کی جانب سے ایک وضاحت شائع ہوئی ہے۔ جسے مورچہ کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ وضاحت کے نیچے سہیل کی جانب سے ایک دوسری وضاحت بھی شائع کی جا رہی ہے۔

مورچہ میں شائع شدہ وضاحت :-

"رسالہ سہیل، گیا مسلسل اعلان کر رہا ہے کہ وہ کلام حیدری کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر "کلام حیدری۔ فن اور شخصیت نمبر" شائع کر رہا ہے۔ کلام حیدری نے سہیل کے اصل کرتا دھرتا جناب ادریس سنہاروی سے استدعا کی ہے کہ وہ یہ نمبر شائع نہ کریں تو ان پر احسان ہوگا۔ مگر مصلحتوں کی بنا پر وہ کلام حیدری کی اس استدعا کو نہ مانے۔ ——— میں کلام حیدری اس نمبر سے مکمل لاتعلقی بلکہ بیزاری کا اظہار کرتا ہوں کیوں کہ اس کے سوا فی الحال دوسرا کوئی چارہ نہیں ہے۔"

کلام حیدری

سہیل کی جانب سے وضاحت کی وضاحت

کلام حیدری۔ فن اور شخصیت نمبر کے سلسلہ میں میں نے ہندو پاک کے سینکڑوں اہل قلم حضرات سے رابطہ قائم کیا لیکن افسوس ہے کہ دو تین کے سوا کسی نے بھی موصوف کے فن پر روشنی ڈالنا مناسب نہیں سمجھا۔ کچھ نے تو لکھا کہ یہی بہت ہے کہ آپ ۵ صفحات پر مشتمل ایک گوشہ نکال دیجئے۔ کیوں کہ کلام حیدری کا کارنامہ اس سے زیادہ نہیں ہے۔ ایک صاحب نے تو مجھے یہاں تک لکھا کہ موصوف جب تک ہندو پاک کے ایک مشہور و معروف افسانہ نگار سے چپکے رہے تب تک کچھ اچھی کہانیاں لکھتے رہے (؟) لیکن اب کی کہانیاں ردی کی ٹوکری میں ڈالے جانے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ کئی لوگوں نے موصوف کو بھدی گالیاں لکھتے ہوئے ہمیں اس نمبر کی اشاعت ملتوی کرنے کا مشورہ دیا۔ میں ہر طرف سے بالکل مایوس ہو گیا تو پچھلے ماہ اس پروگرام کو ملتوی کر دیا اور اس کا اظہار موصوف سے بھی کر دیا۔ میں

نے ادارہ کے دوسرے رفقا سے ماہِ جون کے شمارے سے اس اعلان کو بند کر دینے کی تاکید کی۔ اسی بیچ میں کچھ ذاتی کام سے سری نگر چلا گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو ایک صاحب نے مجھے مورچہ میں شائع شدہ مندرجہ بالا وضاحتی تحریر دکھائی۔

دوسری بات یہ کہ کسی بھی فن کار کے فن کو پرکھنے کی آزادی عام ہے۔ سہیل کے اب تک جتنے نمبر بھی شائع ہوئے ہیں ان میں نہ تو متعلق افراد سے مشورہ لیا گیا اور نہ اجازت۔ اس نمبر کے سلسلے میں ہم نے موصوف سے زیادہ مشورہ تو نہیں لیا لیکن اجازت ضرور لے لی تھی۔ اس نمبر کا اعلان مسلسل چھ مہینوں سے شائع ہو رہا تھا اگر اس تجویز سے بیزار تھے تو پہلے شمارہ کے اعلان کے بعد ہی انھیں اپنی جانب سے وضاحت کر دینی چاہیے تھی۔ بیزاری اور لاتعلقی تو دور کی بات ہے جب موصوف نے یہ تجویز سنی تو نہایت دلچسپی لیتے ہوئے یہ رائے دی کہ اس شمارے کی ترتیب میں ان کے چند خاص احباب کی خدمات بھی حاصل کی جائیں ——— یہ سب کچھ نہیں ہو سکا اس لئے کہ ریاست اور بیرون ریاست کے اہل قلم لوگوں کی خفگی اور ناپسندیدگی نے مجھے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے نہیں دیا۔ موصوف نے اپنی وضاحت میں یہ بھی لکھا ہے کہ سہیل کے اصلی کرتا دھرتا سے یہ استدعا ہے کہ وہ یہ نمبر شائع نہ کریں۔ پتہ نہیں موصوف نے کب ایسا کیا۔ موصوف خود ایک غیر معروف رسالہ اور ایک ہفتہ واری کے ایڈیٹر ہیں تعجب ہے کہ انھیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ رسالہ کا اصلی کرتا دھرتا اس کا ایڈیٹر ہوتا ہے یا کوئی اور۔ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ سہیل کے اصلی کرتا دھرتا نے کچھ مصلحتوں کی بنا پر کلام حیدری کی اس استدعا کو نہ مانا۔ کلام حیدری کو یہ بھی چاہیئے تھا کہ وہ اس وضاحت میں ان مصلحتوں کی بھی وضاحت کرتے تاکہ شاید اس سے ان کی بات میں کچھ وزن پیدا ہو سکتا۔ اور مجھے بھی اس سلسلے میں مزید وضاحت کا موقع ملتا۔

تم جیو ہزاروں سال

ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری کامریڈ سی۔ راجیشور راؤ اس سال ۳ جون کو ۷۰ سال کے ہو گئے۔ آندھرا پردیش کے کرشنا ضلع کے منگلا پورم گاؤں کے ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بنارس ہندو یونیورسٹی سے حاصل کی۔ دورانِ تعلیم ہی وہ نئے عالمی نقطۂ نظر سے آگاہ ہوئے اور ۱۹۳۱ء میں وہ ینگ کمیونسٹ لیگ میں شریک ہو گئے اور ۱۹۳۴ء میں باضابطہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بن گئے۔ ۱۹۳۶ء میں کامریڈ راؤ بنارس سے آندھرا پردیش لوٹ آئے اور وہاں ڈاکٹری کے نصاب میں داخلہ لیا۔ تعلیم پوری کرنے سے پہلے ہی وہ کمیونسٹ تحریک میں پوری طرح حصہ لینے لگے، اور پارٹی کے ہول ٹائم ممبر بن گئے۔ اس پیشہ کا انتخاب شاید انھوں نے غریبوں محتاجوں اور ضرورت مندوں کی مدد کے لئے کیا تھا۔

پارٹی زندگی کی مشکلات بالخصوص ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۱ء تک اور پھر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک

آپ سے چند سوال؟

—— کیا آپ تعلیم یافتہ ہیں؟

—— کیا آپ رحم دل انسان ہیں؟

—— کیا آپ وطن کے ہوشیار شہری ہیں؟

—— کیا آپ اپنے بال بچوں کے لئے خوش حال ملک کا خواب دیکھتے ہیں؟

...... تو قومی تعلیم بالغان جیسے اہم ضروری اور ملک کو آگے بڑھانے والی اسکیم کو آگے بڑھانے میں مددگار نہیں!

وطن میں ہم نے تعلیم بالغان اسکیم کے مقابلہ میں پہلا انعام 3٪.65 لاکھ روپے حاصل کیا ہے۔
ہم مستقبل کے اسکیم بنا رہے ہیں۔

اور آپ؟

آپ

—— ایچ۔ او۔ ٹی۔ او ٹیچ ون (Each one Teach one) کے اصول پر عمل کر سکتے ہیں۔

—— ان پڑھوں کو تعلیم کی اہمیت بتا سکتے ہیں۔

—— اپنے علاقے کے تعلیم بالغان سنٹر کو ٹھیک طرح سے چلانے میں مدد دے سکتے ہیں۔

—— استحصال کرنے اور استحصال سہنے والوں کو ان کے بنیادی حقوق کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔

—— تعلیم حاصل کرنے کی اسکیم کو عوامی جدوجہد میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

—— سوچیں نہیں کریں ——

—— سمجھیں نہیں بڑھیں ——

ہمیں
آپ کی
مدد کی
ضرورت
ہے

ڈائرکٹر تعلیم بالغان بہار۔ پٹنہ

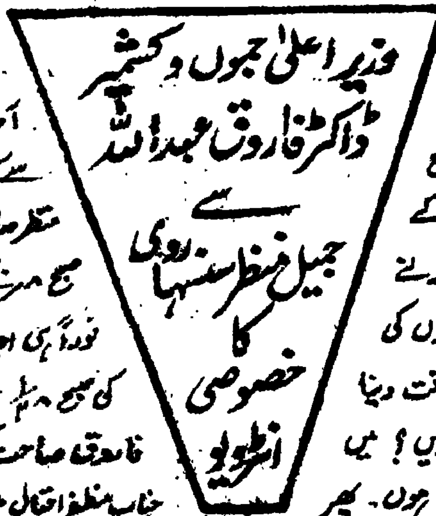
[illegible] 57-21 ([illegible] 48) / 84-85

انٹرویو

فاروق عبداللہ

پاکستان نواز، علاحدگی پسند اور فرقہ پرست

۲۵ مئی صبح ۹ بجے گپکار روڈ سری نگر میں ایک بنگلے کے باہر کافی چہل پہل تھی۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے [پوچھ]ا کہ کیا ڈاکٹر فاروق عبداللہ صاحب یہیں رہتے ہیں۔ ڈرائیور نے فوراً کہا جی صاحب! میں نے وہیں ٹیکسی [چھو]ڑ دی اور اندر چلا گیا۔ پولیس آفیسر جناب مظفر اقبال صاحب سے ملاقات ہوئی۔ سلام کلام کے بعد مرزا صاحب نے [مجھے ف]وراً ہی فاروق صاحب سے ملایا۔ انھوں نے گلے لگا لیا۔ فاروق صاحب کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنی رہائش گاہ پر سیکوریٹی [ک]وئی خاص انتظام نہیں رکھتے۔ اس لئے عوام کو اُن سے ملنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ [عوا]م سے بڑی محبتوں سے مل رہے [ہیں ا]ور ضرورت مندوں کی فراخ دلی [سے م]الی امداد بھی کر رہے ہیں۔ [...] معاف کیجئے گا منظر صاحب۔ آج [...]ن بھر عوام سے ملتا ہوں اور ان کے [...]ل کو سنتا ہوں اور انھیں حل کرنے [کی کو]شش کرتا ہوں اس لئے آج لوگوں کی [ب]ھیڑ ہے۔ میں آپ کے ساتھ کچھ وقت دینا [چا]ہتا تھا۔ آپ سری نگر میں کب تک ہیں؟ میں [نے] فوراً ہی کہہ دیا ابھی دو تین دن ہوں۔ پھر [...]ہے کل صبح ۹ بجے آجایئے۔ ایک گھنٹہ ہم لوگ ساتھ [...] بات چیت کریں گے۔ اور کل ہی ۱۰ بجے نیشنل کانفرنس [ک]ی اور ڈیلیگیٹ سیشن بھی ہے وہاں آپ کو [...]لے بھی چلیں گے۔ میں نے فوراً ہی اپنی خواہش کا [ا]ظہار کر دیا کہ فاروق صاحب! میں آپ سے ہفتہ وار



[...] نے کہا ٹھیک ہے کل یہ کام بھی ہو جائیگا۔ تو آپ کچھ اور پہلے ۸ بجے تک آجایئے اور پولیس آفیسر مظفر اقبال سے کہا کل صبح میں کسی سے نہیں ملوں گا۔ منظر صاحب کو انٹرویو دینا ہے اور آپ بھی صبح ۸ بجے تک آجایئے گا۔ میں اُسی دن فوراً ہی اجازت لیکر واپس چلا آیا۔ ۲۶ مئی کی صبح ۸½ بجے میں ابو قمر صدیقی اور مسعود الحق فاروق صاحب کے بنگلہ پر پہنچ گئے۔ پولیس آفیسر جناب مظفر اقبال منتظر تھے ہمیں فوراً اوپر لان میں لے جایا گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ فاروق صاحب انٹرویو دینے کے لئے لان میں پہلے ہی بیٹھے ہیں۔ پہلے تو گلے لگایا اور پھر ہم ان کے ساتھ ہی لان میں بیٹھ گئے۔ فاروق صاحب کی یہ خوبی ہے کہ طبیعت ہی پر مزاح ہیں۔ بات بات پر ایسا جملہ کہہ دیتے ہیں کہ خود کی ہنسی آجاتی تھی۔ ۱۰ بجے

بنا رہی تھی کہ فاروق صاحب آپ کی ریلی کا وقت ہو گیا ہے اس لئے اب اجازت دیجئے۔ انھوں نے فوراً ہی مرزا صاحب سے کہا کہ انھیں گاڑی سے ریلی میں لے چلئے اور ریلی کے بعد ڈیلی گیٹ سیشن میں لیتے آئیے گا۔ میں ان سے اجازت لیکر نیچے آیا اور مرزا صاحب سے کہا کہ چھوڑیئے مرزا صاحب آپ مجھے کہاں کہاں ڈھونڈیں گے میں خود ریلی بھی دیکھ لوں گا اور ڈیلی گیٹ سیشن بھی دیکھ لوں گا۔ وہاں سے ریلی دیکھنے کے لئے میں لال چوک چلا آیا۔ لال چوک ریلی کا استقبال کرنے کے لئے دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ سڑکوں کی دونوں جانب ریلی کا استقبال کرنے کے لئے لوگوں کی زبردست بھیڑ تھی کہ چلنے کی بھی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ جگہ جگہ لوگوں نے ریلی میں شامل لوگوں کے لئے پینے کے پانی کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ ریلی لال چوک سے گذر رہی تھی۔ آگے ایک کھلی جیپ پر مادرِ مہربان بیگم شیخ عبداللہ (مرحوم) اور ڈاکٹر فاروق اور ان کے پیچھے نہ ختم ہونے والا عوامی سیلاب۔ میں نے آج تک اتنی بڑی ریلی نہیں دیکھی۔ آج میں نے محسوس کیا کہ واقعی کشمیری عوام ڈاکٹر فاروق سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ چلئے! انٹرویو کی طرف چلتے ہیں۔

جمیل منظر: فاروق صاحب! کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ نیشنل کانفرنس کا دائرہ اور وسیع کیا جائے؟ کیا اسے آپ ہندوستان گیر پیمانے پر آرگنائز نہیں کر سکتے؟

فاروق عبداللہ: نیشنل کانفرنس ایک علاقائی پارٹی ہے اور اس کا دائرہ اس ریاست سے باہر نکالا جائے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ فی الحال ہم ریاست کے باہر جانا بھی نہیں چاہتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری ریاست جموں و کشمیر میں اتنے مسائل ہیں کہ اس کو حل کرنے میں کافی دشواری ہو رہی ہے اور ہم جب تک ان مسائل کو حل نہ کر لیں تب تک دوسری طرف کیوں الجھیں۔

جمیل منظر: کیا علاقائیت پسندی یا علاقائی پارٹیوں سے ہندوستان کی سالمیت کو خطرہ نہیں پہنچ سکتا؟

فاروق عبداللہ: جناب! خطرہ لوگوں کی کرسی کو پہنچ سکتا ہے۔ ہندوستان کی سالمیت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان میں کئی ریاستیں ہیں اور سب کا اپنا اپنا وجود ہے۔ یہاں مختلف طرح کی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ تہذیب و تمدن میں فرق ہے۔ ہر علاقے کے لوگ مختلف ذہن رکھتے ہیں۔ ہر کے سوچنے کا انداز الگ ہے۔ ان سب کے باوجود مجموعی طور پر ہم ہندوستانی ہیں۔ اور یہی ہندوستان کی خوبی ہے۔ مثال کے طور پر آپ اس باغ کو دیکھیں جس میں کئی طرح کے دے رہا ہوں مختلف اقسام و رنگ کے پھول ہیں جن کی وجہ سے کہ باغ کتنا خوبصورت ہے۔ ورنہ اس میں ایک رنگ اور صرف ایک قسم کے پھول ہوتے تو باغ کی یہ خوبصورتی نہیں ہوتی جو ابھی ہے۔ یہ ہندوستان بھی ایک باغ کی طرح ہے۔ اس لئے علاقائی پارٹیوں کی وجہ سے سالمیت کو کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ اس کی خوبصورتی میں اور اضافہ ہو رہا ہے۔

جمیل منظر: ہندوستان میں مسلم لیڈرشپ کے بارے میں

علاقائی پارٹیوں سے لوگوں کی کرسی کو خطرہ پہنچ سکتا ہے۔ ہندوستان کی سالمیت کو کوئی خطرہ نہیں

مولانا ابوالکلام آزاد اور رفیع احمد قدوائی کے بعد مسلمانوں کا کوئی لیڈر پیدا ہی نہیں ہوا۔

میں مسلمانوں کا لیڈر بننا نہیں چاہتا

آپ کا کیا خیال ہے؟ اور آپ کیا مسلم لیڈرشپ سے مطمئن ہیں؟ اس سلسلے میں آپ پہل کیوں نہیں کرتے؟

فاروق عبداللہ: میں مسلم لیڈرشپ سے قطعی مطمئن نہیں ہوں مجھے میں تو یہ کہوں گا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی لیڈر اس وقت ہے ہی نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور رفیع احمد قدوائی کے بعد ایسا کوئی مسلمان لیڈر ہندوستان میں پیدا ہی نہیں ہوا جو پورے ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کر سکے۔ میرے والد مرحوم (شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ) نے کچھ پہل ضرور کیا تھا لیکن زندگی نے ان کے ساتھ وفا ہی نہیں کیا۔ ویسے ہندوستانی مسلمانوں کو نا امید نہیں ہونا چاہیے، انشاء اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی آدمی ایسا ضرور پیدا ہوگا جو مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کر سکے، مجھے پوری امید ہے۔

> کانگریس میری حکومت کو گرانے کا ہر حربہ استعمال کر رہے ہیں!

جہاں تک میرا سوال ہے میں مسلمانوں کا لیڈر بننا نہیں چاہتا اس لئے مجھے پہلے ریاست کو دیکھنا ہے۔ اپنی ریاست کے ہی بہت سارے مسائل ہیں جنھیں میں اچھی طرح نہیں نپٹا پا رہا ہوں۔ یہ ریاست ہے تو بہت خوبصورت لیکن یہاں مشکلات بہت ہیں۔ مثال کے طور پر بہت جگہ سڑکیں نہیں ہیں۔ طبی سہولیات کی کمی ہے۔ اور سب سے بڑا مسئلہ بے روزگاری کا ہے تو میرا پہلا فرض یہ ہوتا ہے کہ میں یہاں کے لوگوں کے لئے کچھ کر سکوں۔

جمیل منظر: ایسی کون سی وجہ ہے کہ جو شخص پچھلے پارلیمانی الیکشن میں ہر جگہ گھوم گھوم کر کانگریس (آئی) کے لئے کام کیا ہو اور اس وقت اسے کانگریس (آئی) کا سب سے بڑا مخالف مانا جاتا ہے؟

فاروق عبداللہ: جمیل منظر صاحب! یہ سوال آپ کو کانگریس (آئی) کے لوگوں سے پوچھنا چاہیئے۔ ہم دوست اور دشمن میں فرق محسوس نہیں کرتے۔ میں ایک سال سے چلا چلا کر کہہ رہا ہوں کہ میں قوم دشمن اور ملک دشمن نہیں ہوں لیکن کانگریس (آئی) مجھ پر بار بار یہی الزام عائد کر رہی ہے کہ میں ملک اور قوم کا دشمن ہوں۔ کانگریس جو طریقے استعمال کر رہی ہیں وہ تمام کام ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لئے میرا اب ان سے بنا مشکل ہے۔

جمیل منظر: کشمیر کی موجودہ صورتحال کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

فاروق عبداللہ: کشمیر کی موجودہ سمسیا آپ کے سامنے ہے۔ میں اپنی کوشش میں ہوں کہ ریاست میں جو سیاسی بحران ہے اس سے ریاست کو باہر نکالوں۔ پنجاب تحریک کی وجہ مجھے بہت دشواری ہو رہی ہے کیوں پنجاب ایک پڑوسی ملک ہے اور جب پڑوسی صوبہ میں کوئی خلفشار ہوگا تو اس کا اثر بھی ہمارے صوبہ پر ضرور پڑے گا۔ دوسری طرف کانگریس (آئی) پچھلے الیکشن میں ہارنے کے بعد میری حکومت کو گرانے کا ہر حربہ استعمال کر رہی ہے۔ یہاں تک کہ میرے اپنے رشتہ داروں کو خرید لیا ہے۔ اور ان کے ذریعہ طرح طرح کی سازش کرائی جا رہی ہے۔ پھر بھی انشاء اللہ مجھے پوری امید ہے کہ عوام میرا ساتھ دے گی۔ اس کا فیصلہ آج ہونے والے نیشنل کانفرنس کے ڈیلیگیٹ سیشن میں ہو جائے گا کہ کشمیر کے سیاسی بحران کا ذمہ دار کون ہے؟ اور کشمیری عوام کس کے ساتھ ہیں؟

> میں چلا چلا کر کہہ رہا ہوں کہ میں ملک و قوم دشمن نہیں ہوں!

> میرے اپنے رشتہ داروں کو خرید کر ان کے ذریعہ طرح طرح کی سازشیں

جمیل منظر: پچھلے دنوں نیشنل کانفرنس کے

باغی گروپ کی جانب سے گورنر جگموہن صاحب کو دیئے گئے ایک میمورنڈم میں آپ پر الزام عائد کیا گیا ہے کہ پاکستان نواز، علاحدگی پسند اور فرقہ پرست عناصر آپ کی حکومت کی شہ پر سرگرم ہیں۔ اس میں کہاں تک سچائی ہے؟

فاروق عبداللہ: منظر صاحب! اس میمورنڈم میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ میمورنڈم کانگریس (آئی) والوں کے میمورنڈم کا چربہ ہے۔ اب آنیوالا وقت ہی بتلائے گا کہ فاروق عبداللہ کتنا پاکستان نواز ہے، علاحدگی پسند اور کتنا فرقہ پرست ہے۔

> سیاست داں ایک اچھا خاصا ایکٹر بھی ہوتا ہے

جمیل منظر: ابھی ابھی پچھلے ۲۳ مئی کو نیشنل کانفرنس کے باغی گروپ کی جانب سے جو کنونشن منعقد ہوا اور نیشنل کانفرنس کی صدارت محترمہ خالدہ شاہ کو سونپی گئی۔ اس سلسلے میں اپنا ردعمل ظاہر کیجئے؟

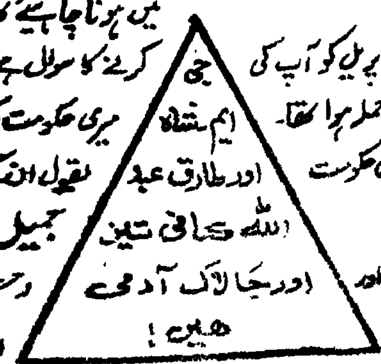
فاروق عبداللہ: اس سلسلے میں میرا کوئی ردعمل نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ سرداری عوام کا حق ہے۔ جمہوریت میں عوام کو پوری آزادی حاصل ہے۔ میں اپنا فیصلہ عوام پر چھوڑتا ہوں۔ وہ دنیا کو بتا دیں کہ اصلی نیشنل کانفرنس کون ہے اور نقلی کون۔ آج ہی نیشنل کانفرنس کی ایک ریلی اور ڈیلیگیٹ سیشن منعقد ہو رہا ہے۔ میں تو آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ خود اس میں جا کر دیکھ لیں کہ عوام کس کے ساتھ ہے۔

جمیل منظر: فاروق صاحب! پچھلے ۱۳ اپریل کو آپ کی بڑی بہن محترمہ خالدہ شاہ پر جو قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ اس میں کن لوگوں کا ہاتھ تھا اور آپ کی حکومت اس سلسلے میں کیا کارروائی کر رہی ہے؟

فاروق عبداللہ: جناب! میری بہن اور ان کے سرتاج تو یہ کہتے ہیں کہ میرا ہی ہاتھ تھا گو کہ اس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ دراصل میں آپ کو بتا دوں کہ اس حملے میں ان لوگوں کا ہاتھ تھا جنہوں نے ان کے سرتاج کو ووٹ دیا اور ان کے ووٹ دے جیتنے کے بعد جی۔ ایم شاہ کا رویہ وہاں کے عوام کے ساتھ اچھا نہیں رہا۔ جس کے ردعمل کے لوگوں نے اپنی ناراضگی ظاہر کی جس کے نتیجے میں یہ حادثہ پیش آیا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں لوگوں نے احتجاج کیا تھا لیکن میری بہن مجھے ہی موردِ الزام ٹھہرایا۔ حالاں جس روز یہ حادثہ پیش آیا۔ وہاں سے میں کافی دور ایک عوامی جلسے میں گیا ہوا تھا۔ اس کا علم تو مجھے بعد میں ہوا جس کا مجھے بیحد افسوس ہے۔ پھر میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ سیاست بھی عجیب چیز ہے۔ سیاستداں ایک اچھا خاصہ ایکٹر بھی ہوتا ہے۔ جیسے مثال کے طور پر انگریزی کے ایک رسالے میں میری بہن کی ایک تصویر شائع ہوئی تھی جس میں دکھایا گیا تھا کہ وہ ایک بیڈ پر لیٹی ہوئی ہیں اور اس تصویر کے ذریعے یہ ظاہر کرنا تھا کہ انھیں شدید چوٹیں آئی ہیں لیکن جناب اسی روز شام میں وہ گاندربل، جہاں اُن پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا اس سے لگ بھگ ۳۰ کیلو میٹر دور چرار شریف میں میرے خلاف تقریر فرما رہی تھیں جب کہ انھیں اس دن اسپتال میں ہونا چاہیئے تھا۔ جہاں تک میری حکومت کی کارروائی کرنے کا سوال ہے تو میں آپ کو بتا دوں کہ اس سلسلے میں میری حکومت کوئی کارروائی نہیں کر رہی ہے کیوں کہ بقول ان کے میں ہی مجرم ہوں۔

> میرا بھائی اس لئے ناراض ہے کہ میں اسے سرکاری نوکری نہیں دے سکا!

جمیل منظر: فاروق صاحب! ایسی کون سی وجہ ہے کہ آپ کے اپنے بھائی آپ کی اپنی بہن اور آپ کے بہنوئی، آپ کے گھر کے سارے افراد آپ کے مخالف ہیں؟



(بقیہ صفحہ ۶۳ پر)

کلامِ آتش کی امتیازی خصوصیت

نغمہ خانم
ریسرچ اسکالر، مگدھ یونیورسٹی۔ بودھ گیا

فکر و فن کے میدان میں انفرادیت و امتیاز کا حاصل کرلینا بازیچۂ اطفال نہیں۔ ایک اتھاہ سمندر میں ڈوب کر ہیرا چننے کی کاوش کا صلہ بشکل انفرادیت ملتا ہے۔ یہ کاوشِ عظیم فنکاروں کا تقاضا کرتی ہے۔ خواجہ حیدر علی آتش (۱۷۷۸ء - ۱۸۴۶ء) اپنے عہد کے عظیم فن کاروں میں سے ہیں۔ منفرد و ممتاز دبستانِ لکھنؤ کے وابستہ ایسے خوش نصیب شعراء بہت کم ملیں گے جن کے کلام پر ہماری نگاہ تا دیر ٹھہر سکے۔ آتش ان میں سے ہی ایک ہیں۔ ان کا فن اور ان کی شخصیت دونوں ہی منفرد و غیر روایتی رہی ہیں۔

آتش مصحفی کے شاگرد تھے۔ مصحفی اپنے تذکرے "ریاض الفصحا" میں لکھتے ہیں:

> "خواجہ حیدر علی ولد خواجہ علی بخش المتخلص بہ آتش وجیہ و مہذب الاخلاق است۔ دریائے طبعش بہ خروش و خروش و زبانِ نظم ریختہ کہ آنہم در متانت و رزانت از غزل فارسی کم نیست کہ بر معاصرینش سبقت بردستن دشوار نمی نماید۔ اگر عمرش وفا کردہ چند سال بر ہمیں و تیرہ رفت و فکر تیغش را تیغ در پیش نہ باید یکے از بے نظیرانِ روزگار خواہد شد۔"

دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات شاعری کے حسین و پُرلطف امتزاج سے آتش کا منفرد رنگِ سخن ابھر کر سامنے آتا ہے۔ یہ امتزاج واقعی قابلِ صد تحسین ہے۔ آل احمد سرور رقم طراز ہیں:

> "اُن کا (آتش کا) فن سرتاسر لکھنوی ہے مگر ان کے فکر میں دہلی اور لکھنؤ کی دھوپ چھاؤں ملتی ہے۔"

اُن کی طبیعت میں ایک اعتدال پسندی تھی۔ مزاج کی اسی اعتدال پسندی نے حقیقتاً آتش کو آتش بنایا ہے۔ یہ اعتدال لکھنؤ کی خارجیت اور دہلی کی داخلیت کے درمیان قائم کیا گیا۔ اس نئی راہ سے ہو کر آتش فلکِ فن کی اس منزل پر پہنچتے ہی جہاں انفرادیت ان کے انتظار میں کھڑی تھی۔

ان کے یہاں ایک طرف تو دہلوی عناصر یعنی داخلیت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ فکر کی گہرائی و گیرائی، اظہار کی

سادگی، افکار و خیالات کی پاکیزگی، جذبہ و احساس
کی شدت اور تصوف کی چاشنی انھیں دبستانِ دہلی
سے قریب تر کر دیتی ہے اور دوسری طرف وہ دبستانِ
لکھنؤ کی بھی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام
میں لکھنوی خارجیت کی بھی گہری چھاپ ہے۔ ان کا
دامنِ شاعری لکھنؤ کی روایتی شاعری کے فسانۂ گل و
بلبل اور کاکلِ پرخم کی مدح سرائی سے یکسر پاک نہیں،
لیکن ان کے یہاں ابتذال و رکاکت کی وہ کیفیت نہیں
جو لکھنوی شاعری کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ ان کی خارجیت
لکھنؤ کی وہ خارجیت نہیں جو اردو شاعری میں بدنام
ہو چکی ہے۔ جس میں احساس و جذبات کی گہرائی کا فقدان
ہوتا ہے۔ اور محض بازی گریِ الفاظ اور فنی صنعتوں کا سہارا
لیکر شاعری کے گل بوٹے کھلائے جاتے ہیں۔ آتش کی
خارجیت فطری ہے۔ کیوں کہ اس کے پیچھے آتش کا فطری
میلان کار فرما ہے۔ یہ خارجیت دبستانِ لکھنؤ
اور لکھنوی ماحول کی پوری پوری عکاسی کرتی ہے لیکن
خارجی ماحول کی عکاسی کے باوجود ان کے کلام میں
ایک لطف باقی رہتا ہے اور اشعار کا حسن بھی مجروح نہیں
ہوتا۔ انکی خارجیت لکھنؤ کی لذتیت اور ہوسناکی سے
پاک ہے۔ ان کی یہ فطری خارجیت اردو شاعری کے لئے
واقعی سرمایۂ افتخار ہے۔ اپنی خارجیت پسندی میں
بھی وہ اعتدال برتتے ہیں۔ مرصع سازی اور
صناعی کی جھونک میں وہ ناسخ کی طرح اپنے تجربے
کا خون شکار نہیں ہوتے۔ ظاہری طور پر انھوں نے
لکھنوی ماحول کی ترجمانی تو کی ہے مگر باطنی طور پر انھیں
جگہ جگہ اس سے انحراف بھی ملتا ہے۔ چونکہ آتش
لکھنؤ کے پر تعیش ماحول میں رہ رہے تھے۔ لکھنؤ کا ادبی
ماحول بھی تصنع و تعیش کا آئینہ دار تھا۔ اس لئے انکے
یہاں مرصع زبان، پرپیچ بیان، رعایتِ لفظی اور
خارجیت کی رنگارنگی ملتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے
آتش نے اخلاق و تصوف کے مضامین بھی پیش کئے
ہیں۔ ان تہذیبی قدروں کو خاطر خواہ اہمیت دی
ہے۔ اس طرح آتش نے دونوں دبستانوں کی روایات
و خصوصیات کو اپنانے میں بڑے ہی اعتدال و فنکاری
کا ثبوت دیا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں:

"ان کی افتادِ طبیعت پر دہلی اسکول کا
اثر تھا اور ماحول کا اثر مزاج پر تھا۔ اس
کشمکش میں وہ کبھی اِدھر ہوتے تھے کبھی
ادھر ہوتے تھے۔ .... لیکن لکھنؤ اسکول
کا اثر ان کے دیوان میں کافی ہے۔ مگر فکری
مزاق کی چھاپ بھی اپنا اثر نمایاں کر دیتی
ہے۔"

امداد امام اثر "کاشف الحقائق" میں فرماتے
ہیں:

خواجہ کی فطری صلاحیت بڑی اعلےٰ
درجے کی تھی۔ .... آتش بھی
اکثر غزل سرائی میں شاعری کا خارجی پہلو لیتے
تھے ...... جہاں پر خواجہ کی شاعری
نے داخلی رنگ اختیار کر لیا ہے وہاں اکثر
اشعار ارفع درجے کے وارداتِ قلبیہ
سے تعلق رکھتے ہیں۔"

آتش کے کلام میں دہلویت

جان ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ
ہر قدم پہ ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا!

ہنار سہسوین گیا

اُٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روئیے کس کے لئے کس کس کا ماتم کیجئے

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

سمجھتا یا نہ اے آتش سمجھتا
دلِ مضطر کو سمجھایا تو ہوتا

خوشا وہ دل کہ ہو جس میں آرزو تیری
خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

معرفت میں تیری ذاتِ پاک کے
اڑتے ہیں ہوش و حواس اِدراک کے

تنہائی ہے، غریبی ہے، صحرا ہے، خار ہے
کون آشنائے حال ہے کس کو پکار ہے

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تیری محفل

نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشک دریا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

پیامبر نہ میسر ہوا کہ خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

غمزہ و جفائے یار سے رنج و محن نہ ہو
دل پر ہجومِ غم ہو جبیں پر شکن نہ ہو

مشتاقِ دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

دل کو اگر لاگ نہیں لطف نہیں جینے کا
گتھیوں کے الجھے سلجھے زلف کے گرفتار رہو

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
زلف کے اس کی سب اسیر ہوئے

لکھنویت :

اس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیونکر نبھے
دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

عالم حسن خداداد بتاں ہے کہ جو تھا
ناز و انداز بلائے دل و جاں ہے کہ جو تھا

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

باعثِ کیفِ مے سے کھل گئی اس شوخ کی آنکھ
لگا کر منہ سے پیمانے کو وہ پیماں شکن بگڑا

خدا سر دے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

چاندنی میں جب مجھے یاد اے مہِ تاباں کیا
رات بھر اختر شماری نے مجھے حیراں کیا

ناگفتنی ہے عشقِ بتاں کا معاملہ
ہر حال میں ہے شکرِ خدا کچھ نہ پوچھیے

چمن میں شب کو جو وہ شوخ بے نقاب آیا
یقین ہو گیا شبنم کو کہ آفتاب آیا

حضوری نگاہوں کو دیدار سے تھی
کھلا تھا وہ پردہ کہ جو درمیاں تھا
شبِ وصل تھی چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا

پڑھا ہے ہم نے بھی قرآں قسم ہے قرآں کی
جواب ہی نہیں رکھتی ہے گفتگو تیری

یہ اشارہ ہم سے ہے انکی نگاہِ ناز کا
دیکھ لو تیرِ قضا ہوتا ہے اس انداز کا

روح قالب سے جدا کرتا ہے قالب سے
ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے یہ تیرِ ناز کا

تن سے بارِ سرِ آمادۂ سودا اترا
شکر ہے خنجرِ قاتل کا تقاضا اترا

ہجر کی شب ہو چکی روزِ قیامت سر دراز
دوش سے نیچے نہیں اترے ابھی گیسوئے دوست

بلا سے سرو کو کچھ اپنی راستی میں کھل
کلاہ کج جو نہ کرتا تو لالہ کیا کرتا

قصۂ سلسلۂ زلف نہ کہنا بہتر
پیچ در پیچ خاموش ہی رہنا بہتر

صناعی و مرصع سازی آل احمد سرور فرماتے ہیں کہ:-

"لکھنؤ دبستان میں فکر و فن کے ایک نئے احساس کی کارفرمائی تھی.........

اس کی اس خدمت کا اعتراف ضروری ہے کہ اس نے ہر معنی میں اردو شاعری کی سرپرستی کی۔ اسے وسعت عطا کی۔ رنگا رنگی بخشی۔ جہاں خونِ جگر کے داغ تھے وہاں نئے نئے پھول کھلائے۔ جہاں محرومی و ناکامی تھی وہاں نشاط و کامرانی کی لے پیدا کی۔ ماورائیت کی بجائے ارضیت سکھائی۔ جسمانی حسن کا احساس دیا۔ شاعری کو گرد و پیش کی حقیقتوں کا آئینہ بنایا۔ اور اس آئینے سے ہر قسم کے کام لیے۔"

"لکھنؤ اسکول دہلی اسکول سے کئی معنی

میں ترقی یافتہ ہے۔ دہلی اسکول کی کان
سے جو سونا نکلتا ہے جو اس کی چمک بھی
نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ کبھی اس میں
دھرتی کے دوسرے اجزا ملے ہوئے ہوتے ہیں۔
اس معدنی پیداوار کو صاف کرکے سونا
لکھنؤ نے بنایا۔ شاعری کی ایک منزل سونا
نکالنے کی ہے۔ دوسری منزل اسے صاف
کرکے اس سے زیور بنانے کی ہے۔ کان کن
کا ایک درجہ ہے صناع کا دوسرا اور
شاعری صناعی بھی ہے۔"

آتش بھی شاعری کو مرصع سازی و صناعی قرار
دیتے ہیں۔ انھوں نے شاعری کے عمل میں چار اہم مرحلے
بتائے ہیں۔ وہ ہیں خیال، فکرِ رنگیں، بندشِ الفاظ اور
مرصع سازی کہتے ہیں ؎

کھینچ دیتا ہے شبیہِ شعر کا خاکہ خیال
فکرِ رنگیں کام اس پر کرتی ہے پرواز کا
بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

ان کے یہاں مرصع سازی و صناعی انکی فطری
خارجیت کی دین کہی جا سکتی ہے۔ کیونکہ خارجیت لکھنؤ کی
ماحول میں رچی بسی ہوئی تھی اور کوئی بھی فن کار اپنے
ماحول کے اثر سے خود کو یکسر بدل کر نہیں رکھ سکتا۔ آتش
کے یہاں مرصع سازی و صناعی کے جو نمونے ملتے ہیں اُن
کی رعایت زبان، پُر پیچ، رعایت لفظی اور خارجیت
کی رنگا رنگی دراصل ماحول کے اثر کی ہی کارفرمائی
ہے ؎

خار سرِ رہ تو سودا ہے تری زلفِ پریشاں کا
جو انکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستان کا

اس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر نبھے
دل سوا شیشے سے نازک، دل سے نازک خوئے دوست

جو دیکھتے تیری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

نہ مڑ کے بے دردِ قاتل نے دیکھا
تڑپتے ہیں یہ ان کے نیم جان کیسے کیسے

ترے آنے کی چمن میں ہوگی ہر گل کو خوشی
سُرخ تر لالے سے رنگِ یاسمیں ہو جائیگا

حضوری نگاہوں کو دیدار سے تھی
کھلا تھا وہ پردہ کہ جو درمیاں تھا
شبِ وصل تھی چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا

تمہارے شہیدوں میں شامل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

جو ابرِ گریہ زناں ہے تو برقِ خندہ زناں
کسی میں خو ہے ہماری کسی میں خو تیری

نام تیرا جسکو وردِ اسے گل بدن ہو جائیگا
غنچہ و گل کی طرح خوشبو دہن ہو جائیگا

قصۂ سلسلۂ زلف نہ کہنا بہتر
پیچ در پیچ خاموش ہی رہنا بہتر

اے آسماں دکھائینگے آیا جو بام پر
کیا کیا ہم نے بھی مشقِ نظر کی ہے

حسن تکلیف لبِ بام اسے دیتا ہے
شرم کھاتی ہے سایہ پسِ دیوار نہ ہو

...ن آتش کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ یہاں کہیں وہ جادۂ اعتدال
...نظر آتے ہیں۔ انکی مرصع سازی کو ری خارجیت کا نتیجہ
نہیں کہا جا سکتی۔ اور نہ ہی ان کی شاعری کی اہمیت
محض اس وجہ سے ہے کہ یہ مرصع سازی کا کمال پیش کرتی
مرصع سازی سے زیور کا حسن مزید چمک جاتا ہے مگر یہ
شعریت کا بدل نہیں ہو سکتی۔ ہمیں آتش کی مرصع سازی
کے پیچھے احساس و جذبات کی ایک دُنیا آباد ملتی ہے۔
انھوں نے محض بازی گیری الفاظ اور فنی صنعتوں کا سہارا
لیکر شاعری کے گل بوٹے نہیں کھلائے بلکہ ان کے
یہاں ہمیں جذبہ و احساس کی گہرائی اور شدت کا بھی
احساس ملتا ہے۔ وہ الفاظ کے قالب میں جذبے کی
روح اور توانائی باقی رکھتے ہیں۔ معنی آفرینی اور قافیہ
پیمائی دونوں کا جیش کرتے ہیں۔ آتش حسنِ الفاظ
بندش کا خیال ضرور رکھتے ہیں مگر ناسخ کی طرح ثقیل
اور گراں الفاظ نہیں استعمال کرتے جس کی وجہ سے
ان کے اشعار میں سادگی، سلاست اور روانی ملتی ہے
ان کا اسلوب ظاہر ہوتا ہے کہ خیال کی ترسیل انھیں عزیز
ہے۔

منفرد لب و لہجہ: معاصرین شعرائے لکھنؤ میں
آتش کا لب و لہجہ انفرادیت کا حامل ہے۔ ان کے شاعرانہ
لہجے سے شعرائے دہلی کے لہجے سے نظری نقاہت و کمزوری

اور ڈھیلا پن نہیں جھلکتا بلکہ یہ لکھنؤ کی فطری بشاشت
و تازگی کی نمائندگی کرتا ہے۔ آتش ان رجحانات کے
نمائندہ شاعر ہیں جس نے غمِ عشق میں کو نشاط کیف
میں اور سوز کو ساز میں بدل دیا ہے بقول رام بابو سکسینہ
"کلام میں ان کے تخلص کے اعتبار سے گرمی بہت ہے"
امداد امام اثر کاشف الحقائق میں آتش کے کلام کی خوبیوں
کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"کلام کا رنگ بہت مردانہ تھا۔ غزل گوئی کے
لئے اس رنگ کی بڑی حاجت ہے۔ ورنہ
اشعار میں وہ جلالت و تمکنت کی صنعتیں حاصل
نہ ہونگی۔ الغرض خواجہ صاحب میں وہ سب
خوبیاں موجود ہیں جو ایک بڑے شاعر کے
لئے درکار ہیں"

سرور کہتے ہیں:

آتش شاعری کے فن کے بہترین معلموں میں سے
ہیں۔ ان سے اُردو شاعری میں نشاطیت
کی لے بڑھی اور مردانگی کا لہجہ ابھرا۔ ہر دور
میں ان کا اثر ملتا ہے۔ انیس، چکبست اور
یگانہ کے نام اس اثر کی ضمانت ہیں۔

آتش کی شخصیت میں جو انا اور خودداری تھی، ان
کے افکار و خیالات اس کی مکمل غمازی کرتے ہیں۔ گو
وہ تنگدستی و تنگ حالی کا شکار رہے مگر انکی شاعری
میں دُور دُور تک میر کی سی حرماں نصیبی، یاسیت اور
قنوطیت کا شائبہ نہیں۔ نامرادی و ناکامی کا سایہ
نہ تو ان کی شخصیت پر پڑا اور نہ ہی انکی شاعری اس
الم سے لوث ہوئی۔ انکی شاعری کو ہم اولوالعزمی اور
حوصلہ مندی کی بہترین و کمیاب مثال کہہ سکتے ہیں۔ لفظ

ے

خاک کا کھٹکا نہیں رکھتے ہم آتش قدم
موم ہو جائے اگر آ جائے آہن زیرِ پا

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

ڈراتا ہے عبث اے شیخ تو نارِ جہنم سے
سمندر موج مارے گر نچوڑوں پاٹ دامن کا

مشتاق دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

ملا نہ سرو کو کچھ اپنی راستی میں پھل
کلاہِ کج جو نہ کرتا تو لالہ کیا کرتا

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
مجھ سے خلاف ہو کے کریگا زمانہ کیا

سرِ شمع ساکٹائیے پہ دم نہ مارئیے
منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہارئیے

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

[اس] طرح آتش کا لہجہ مردانہ و سپاہیانہ ہے۔ وہ [آلام] و الم اور حالات کی سنگینوں کا مقابلہ مردانہ وار [کر]تے ہیں۔ ان میں جور و جفائے یار اور ستم روزگار

سے دل میں پیدا ہجوم غم کا بار اٹھانے کی حوصلہ مندی ہے۔ لیکن وہ رنج و محن اور جور و ظلم کے اثرات اپنے چہرے سے عیاں ہونے دینا نہیں چاہیئے ؎

جور و جفائے یار سے رنج و محن نہ ہو
دل میں ہجوم غم ہو جبیں پر شکن نہ ہو

آتش کے تیور اور انکی افتادِ طبع میں ہمیں زندگی سے نبرد آزمائی کا حوصلہ ملتا ہے۔ آتش کی مجاہدانہ شخصیت داخلیت کے حصار میں بند رہ کر "دل کے خون کرنے" اور "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" کو سرچشمۂ حیات نہیں قرار دیتے۔ انکے یہاں تابناکی و جہاں نثاری ملتی ہے۔ تازگی کیف و نشاط اور سرشاری ملتی ہے۔ ان کے مزاج کی یہ خارجیت دراصل لکھنؤ کی فطری خارجیت ہے۔ بقول فراق گورکھپوری:

"جب داخلیت بجائے غم کے نشاط کی
طرف متوجہ ہوتی ہے تو نشاط کی فطری
وسعت شاعر کے دل کو دنیا کی رنگا رنگ
بزم آرائیوں کی طرف لے جاتی ہے اور
صحیح معنوں میں خارجی شاعری کا آغاز
یہیں سے ہوتا ہے"

آتش کی شاعری میں کہیں سے بھی دہلی کی یاسیت و قنوطیت اور مریضانہ کیفیت کی بو نہیں آتی بلکہ ان کی عظمت کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ ان کی آواز کی ساحری نے ہمارے ان حواس کی تسکین کا سامان فراہم کیا ہے جو ابھی تک تشنہ تھے۔ آتش کی مردانگی و حوصلہ مندی دراصل لکھنؤ کے اس ماحول کی دین ہے جس میں دلی کی سی شکست و ریخت کے آثار نہیں ملتے بلکہ یہاں "خوش بخور و خوش بدار ایام را" کے فلسفے

استعمال سہل ہو گیا

پر عمل کیا جاتا تھا۔ اور پھر ان کی اپنی طبیعت میں بھی ایک شگفتگی و شادابی تھی۔ ان کے مزاج میں حوصلہ مندی و بانکپن تھا۔ ان کے یہاں یاسیت و زخم خوردگی کے جو نمونے ملتے ہیں اس میں بھی ایک اکڑ اور طنطنہ پایا جاتا ہے ؎

نہ مڑ کر کے بے درد قاتل نے دیکھا
تڑپتے ہیں یہ ان کے بسمل کیسے کیسے

تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

اس طرح معاصرین شعرائے اردو میں آتش کا لب و لہجہ اور شاعرانہ تیور منفرد و ممتاز ہے۔

تصوف و اخلاق

مصحفی کی شاگردی اور خاندانی پس منظر میں آتش کے مزاج میں تصوف بھی داخل کر دیا تھا۔ انھوں نے محض علمی یا ذہنی سطح پر تصوفانہ خیالات کو قبول نہیں کیا بلکہ تصوفانہ تصورات میں جذب ہو کر انہیں اپنی شخصیت کا جزو بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ عملاً صوفی نہ تھے مگر صوفیانہ مزاج ضرور پایا تھا۔ ان کی عملی زندگی میں درویشی اور فقیری کی شان موجود تھی جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں بھی تصوف کے بعض عناصر موجود ہیں۔ آتش کی قناعت، توکل، وسیع المشربی، انسان دوستی، ترکِ دنیا اور گوشہ نشینی انہیں عناصر کی غمازی کرتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر شاہ عبدالسلام:

> وہ خود خانقاہ نشیں صوفی تو نہ تھے مگر گوشہ نشیں فقیر ضرور تھے اور اس گوشہ نشینی میں محبوبِ حقیقی کے متعلق غور و فکر بھی کرتے تھے۔ قلندرانہ زندگی نے ایسی بے باکی، سیر مستی اور سرشاری بخشی تھی کہ شعری جمالیات اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ تصوف و اخلاق کے مضامین ان کے یہاں ایک انفرادی شان لیے ہوئے ہیں۔ آتش کی قلندرانہ شان انسان دوستی اور اخلاق کی ایک علامت ہے۔ ان کے کردار کی بلندی اور ان کی قلندرانہ روش نے ان کی شاعری میں ایک بے نیازی و استغنا کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔"

پیا بسر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

بادشہی سے فقیری کا ہے پایہ بلند
بوریا چھوڑ کے کیا تختِ سلیماں مانگوں

نہ بدرقہ ہے نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے
فقط عنایتِ پروردگار راہ میں ہے

ان کے کلام میں جا بجا وحدت الوجود، معرفتِ الٰہی، مقامِ حیرت، عرفانِ نفس، مظاہراتِ خداوندی، مقامِ فنا، صفائے باطن، عشقِ حقیقی جیسے فلسفیانہ تصورات، فقیری و درویشی اور اخلاق کے مضامین ایک جمالیاتی احساس کے ساتھ ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

مسائلِ تصوف اٹھا اِدھر نقاب تو پردے اُدھر پڑے
آنکھوں کو بند جلوۂ دیدار نے کیا

ہنا سہل ہو گیا

نظر آیا تماشائے جہاں جب بند کی آنکھیں
صفائے قلب کے پہلو میں ہم نے جامِ جم پایا

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھ کو
کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا

نقشِ صورت کو مٹا کر آشنا معنی کا ہو
قطرہ بھی دریا ہے جو دریا سے واصل ہو گیا

رہتی ہیں آنکھیں بند تصور میں یار کے
تارِ نگہ سے اپنے بندھا ہے خیالِ دوست

مجھ سے مے نوش کو ساقی پلاتا ہے شراب
دیکھتا ہوں میں بھی ظرفِ شیشہ و پیمانہ آج

ناسمجھی ہی پردہ ہے دیدار کے لئے
ورنہ کوئی نقاب نہیں یار کے لئے

کچھ نظر آتا نہیں اس کے تصور کے سوا
حسرتِ دیدار نے آنکھوں کو اندھا کر دیا

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

ظہورِ آدمِ خاکی سے یہ ہم کو یقیں آیا
تماشا انجمن کا دیکھنے خلوت نشیں آیا

دل کے آئینے میں کر جوہرِ پنہاں پیدا
در و دیوار سے ہو صورتِ جاناں پیدا

معرفت میں تیری ذاتِ پاک کے
اڑتے ہیں ہوش و حواس ادراک کے

خدا یاد آ گیا مجھ کو بتوں کی بے نیازی سے
ملا بامِ حقیقت زینۂ عشقِ مجازی کا

فقیری و درویشی

بادشاہی سے ہے فقیری کا پایا بلند
بوریا چھوڑ کر کیا تختِ سلیماں مانگوں

مسندِ شاہی کی حسرت ہم فقیروں کو نہیں
فرش ہے گھر میں ہمارے چادرِ مہتاب کا

منزلِ فقر و فنا جائے ادب ہے غافل
بادشاہ تخت سے یاں اپنے اتر لیتا ہے

دو نعمتیں یہ میری ہیں میں ہوں فقیرِ مست
اک نانِ خشک اور اک پیالہ شراب کا

اخلاقیات

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ
قناعت بھی بہارِ بے خزاں ہے

سرِ شمع سا کٹائیے پر دم نہ ماریئے
منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریئے

ناقص ہے دوست داری میں کامل نہیں ہے تو
دشمن سے بھی غبار اگر دل میں رہ گیا

خیالِ تن پرستی چھوڑ کر حق پرستی کر
نشاں رہتا نہیں ہرگز ہم رہ جاتا ہے انساں کا

بُت خانہ کھود ڈالیے مسجد کو ڈھائیے
دل کو نہ توڑیے یہ خدا کا مقام ہے

رندانہ مضامین اُردو شاعری نے رندی و سرمستی کی روایت فارسی شاعری سے مستعار لی ہے۔ اُردو شعرائے بادہ و ساغر، شراب اور شراب سے متعلق لوازمات کو اپنا محبوب موضوع بنا کر اس پر خوب خوب طبع آزمائی کی ہے۔ دبستانِ لکھنؤ کے شاعروں کے یہاں بطورِ خاص اس کی کارفرمائی نظر آتی ہے لیکن آتش کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے روایتی رنگ سے ذرا ہٹ کر اپنی ایک الگ راہ بنائی ہے۔ انھوں نے رندانہ مضامین کو اس طرح برتا ہے کہ کہیں سے بھی لکھنوی ابتذال کی بو نہیں آتی بلکہ ایک پاکیزہ جوش و مستی، کیف و نشاط کی کیفیت ملتی ہے ؎

مجھ سے دریا نوش کو ساقی پلاتا ہے شراب
دیکھتا ہوں میں بھی ظرفِ شیشہ و پیمانہ آج

ڈراتا ہے عبث اے شیخ تو نارِ جہنم سے
سمندر موج مارے گر نچوڑوں پاٹ دامن کا

ساقی ہے، مے ہے، یار ہے، بزمِ نشاط ہے

چھیڑے جواب نہ ساز کو مطرب کو چھیڑیے

ساقی نہ قطع سلسلۂ دورِ جام ہو
مطرب نہ تار ٹوٹے اب آوازِ چنگ کا

شرابِ لالگوں سے ساقیا جامِ صبوحی بھر
شفق اپنی مجھے دکھلا رہا ہے نور کا تڑکا

ابرِ دریا بار آ پہونچا قریبِ میکدہ
ناخدائے کشتیِ مے، ساقیِ گلفام ہو

کام شیشے سے ہم کو اور نہ ساغر سے غرض
مست رہتے ہیں شرابِ روح پرور سے ہم

جہاں ذکارِ جہاں سے ہوئے ہیں بے خبر میں مست
زمیں کدھر ہے کہاں آسماں نہیں معلوم

سبوئے غنچہ ہے معمور جامِ گل لبریز
ٹپک رہی ہے شراب ابرِ نو بہاری سے

بھرے ہے مے رکھتی ہے اس میکدے میں کیفیت
محتسب توڑ کے شیشے کو پشیماں ہو گا

بعض اوقات آتش اپنی رندی و سرمستی میں اللہ رمزیت و اشاریت میں حافظ سے کافی قریب نظر آتے ہیں۔ عبد السلام ندوی "شعر الہند" میں کلام کی خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اردو میں رندانہ مضامین میں خواجہ حافظ
جیسا جوش اور انکی سرمستی کا اظہار صرف
خواجہ آتش ہی کی زبان سے ہوا ہے"

شقیہ مضامین آتش کی عشقیہ شاعری کی فضا
ہایت ہی صحت مند اور نشاط انگیز ہے۔ ان کے یہاں
سن کا جو شوخ اور رنگین احساس ملتا ہے۔ انکی عشقیہ
شاعری میں جو ایک فطری اور دلکش خارجیت پائی
سالی ہے وہ ہماری اردو شاعری کا سرمایۂ افتخار
ہے۔ بقول فراق گورکھپوری :

"ان کی عشقیہ شاعری میں ایک ہمک اور لہک
پائی جاتی ہے وہ عشق کو ایک جان لیوا
روگ بنا کر پیش نہیں کرتے۔ ان کے یہاں
عشق زندگی کی امنگ بن کر سامنے آتا ہے"

اری عمر سے یاں عاشقانہ شعر ڈھلتے ہیں
زباں کو اپنی بس اب حسن کا افسانہ آتا ہے

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

جو دیکھتے تری زنجیر زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

دل کو اگر لاگ نہیں لطف نہیں جینے کا
گیسو کے الجھے سلجھے زلف کے گرفتار رہو

خوشا وہ دل کہ جس میں ہو آرزو تیری
خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

مشتاقِ دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

بقول ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی : ـ

"انکا عشق ایک صحت مند اور صحیح الدماغ
انسان کا عشق روحانی قسم کا نہیں،
بلکہ خالص دنیاوی قسم کا ہے۔ اور ان کا
محبوب بھی کوئی خیالی ہستی نہیں بلکہ گوشت
پوست کا انسان ہے، ان کے یہاں
چاہنے کے ساتھ ساتھ کسی کو اپنا بھی کر لینے
کا جذبہ ہے"

کسی کا ہو رہے آتش کسی کو کر رکھے
دو روزہ عمر کو انساں نہ رائیگاں کرے

آتش نے غم عشق کو نشاط و کیف میں اور سوز
کو ساز میں بدلنے کی کوشش کی ہے۔ آتش کا عشق
ماورائی نہیں بلکہ مادی ہے۔ اس لیے جسم کی خوشبو اور
کشش اپنے محور پر اسے خوب گردش دیتی ہے۔ نتیجے
میں کیف و سرور اور جوش و خروش کی ایک عجیب
فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں کبھی ذوق کی تسکین ملتی ہے،
کبھی تیر و نشتر کی ٹیس، کبھی جمال محبوب کی مصوری اور
کبھی بے خودی اور سرشاری کی لذت۔ آتش
حسن کے مصور ہیں۔ اپنی تصویروں میں انھوں نے
تخیل اور احساس کے رنگوں سے ایک نئی زندگی پیدا
کر دی ہے۔

عالم حسن خدا داد بتاں تھا کہ جو تھا
نازکی انداز جلائے دل وجاں تھا کہ جو تھا

اس بلائے جاں سے آتش دیکھئے کیونکر بچے
دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

کوچۂ دلبر میں میں بلبل چمن میں مست ہے
ہر کوئی یاں اپنے اپنے پیرہن میں مست ہے

خوشا وہ دل جس میں ہو آرزو تیری
خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

یہ آرزو تھی تجھے گل کے رو برو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

خدا سر دے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

کوچۂ یار میں سائے کی طرح رہتا ہوں
در کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس

جو ابر گریہ زناں ہے تو برق خنداں زناں
کسی میں خو ہے ہماری کسی میں خو تیری

کسی طرف سے تو نکلے گا آخر اے غنچۂ حسن
فقیر دیکھتے ہیں راہ کو بہ کو تیری

تمہارے شہیدوں میں شامل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا
بنا دے کیفیت مے سے کھل گئی اس شوخ کی آتش
لگا کر منہ سے پیمانے کو وہ پیماں شکن بگڑا

خوشبو سے ہو رہا ہے معطر دماغ و جاں
چلتی ہے کس طرف کی ہوا کچھ نہ پوچھئے

کسی دن تو ہو اے یوسف اتنا تازہ دماغ اپنا
کبھی تو زرہ ادھر بھی تیری بوئے پیرہن بھر لے

قد صنم سا اگر آفریدہ ہونا تھا
نہ سرو باغ کو اتنا کشیدہ ہونا تھا

چمن میں شب کو جو وہ شوخ بے نقاب آیا
یقین ہو گیا شبنم کو آفتاب آیا

حسن و جمال سے ہے زمانے میں روشنی
شب ماہتاب کی ہے تو دن آفتاب کا

ناگفتنی ہے عشق بتاں کا معاملہ
ہر حال میں ہے شکر خدا کچھ نہ پوچھئے

آتش کی شاعری کی عاشقانہ اور پربہار فضا نے
ان کی شاعری کو بڑی وسعت، بوقلمونی اور پربہار فضا
دی ہے۔ آتش کی عاشقانہ شاعری کی بوقلمونی اور رنگا رنگ
خوشگوار فضا میں نشاط و سرمستی، لطف و حرکت،

نا سہیل گیا

ا چاؤ اور دل نوازی کے گوناگوں مناظر سامنے
تے ہیں۔ جن سے طبیعت میں انبساط و شگفتگی کی
ب ہر دوڑ جاتی ہے ؎

تمہارے شہیدوں میں شامل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

نام تیرا جس کو ورد اے گل بدن ہو جائیگا
غنچہ و گل کی طرح خوشبو دہن ہو جائیگا

تیرے آنے کی چمن میں ہوگی ہر گل کو خوشی
سرخ تر لالہ سے رنگ یاسمیں ہو جائے گا

آتش کے یہاں عشق و جنس کے عناصر کی مناسبت ا
ہنگی نے ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے جو ین
انی نفسیات کی غماز ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی نے
تش کی عشقیہ شاعری کو کافی اہمیت دی ہے۔
ن کے یہاں جو صحت مند جنسیت چھائی ہوئی ہے
سراہا ہے۔ اردو شاعری میں محرومی و ناکامی کی
قنوطیت کی جو فضا چھائی ہوئی ہے اسے دیکھتے
ئے آتش کی جاندار، رنگارنگ اور بھرپور عشقیہ
عری بڑی قابل قدر ہو جاتی ہے ؎

مبارک شب قدر سے بھی وہ شب تھی
سحر تک مہ و مشتری کا قرآں تھا

حضوری نگاہوں کو دیدار سے تھی
کھلا تھا وہ پردہ کہ جو درمیاں تھا

شب وصل تھی، چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا، خدا مہرباں تھا

آتش کی شاعری کا عاشق و معشوق دونوں اپنی
اپنی نفسیات و جذبات کے ساتھ ایک دوسرے سے
بغل گیر ہوتے ہیں۔ جس کے سبب ان کی شاعری کی
پوری فضا وصل کی خوشبو سے معطر ہو جاتی ہے۔ اور
ہمیں ایک بھرپور عشقیہ ماحول کا احساس ہوتا ہے۔
اس طرح ان کے یہاں حسن و عشق اپنی مکمل صحت مندی
کے ساتھ جلوہ نما ہے۔ شرارت بھی وہ نقاہت اور
مریضانہ کیفیت نہیں جو بعض اوقات ناگواری کی انتہا
پار کر جاتی ہے۔ یہاں کیف و انبساط کی فضا ملتی ہے۔ ؎

الٹا ادھر نقاب تو پردے ادھر پڑے
آنکھوں کو بند جلوۂ دیدار نے کیا

چاندنی میں جب تجھے یاد اے مہ تاباں کیا
رات بھر اختر شماری نے مجھے حیراں کیا

دست و بازو کے تصور میں ہوا آتش یہ قتل
پائے بوسی کی ہوس نے خاک سے یکساں کیا

گلے ہیں شکر کے بدلے جفائے یار پر کیا کیا
رہا ہے دل میں راضی رضائے یار پر کیا کیا

ناگفتنی ہے عشق بتاں کا معاملہ
ہر حال میں ہے شکر خدا کچھ نہ پوچھئے

تڑپتے ہیں یہ ان کے نیم جاں کیسے کیسے

مشتاق دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

کہا جاتا ہے کہ آرائشِ خم کاکل کے لئے آتش اور اندیشہ ہائے دُور و دراز کے لئے اردو شاعری غالب کی مرہونِ منت ہے۔ اور یہ بھولنے کی بات نہیں کہ خم کاکل کے بغیر اندیشہ ہائے دُور و دراز کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آتش آرائشِ کاکلِ پُرخم کے استاد مانے گئے ہیں۔ یہ استادی انھیں مصحفی کی شاگردی کے زیرِ اثر ملی ہے۔ بقول آلِ احمد سرور آتش کے یہاں حسن کی مصوری میں احساس سے رنگ آتا ہے۔ یہی احساس و ارادتِ عشق کو کیف و مستی کی دُنیا بنا دیتا ہے۔ میر کے یہاں یہ ایک آزار ہے۔ مگر آتش کے یہاں ایک شراب ہے۔ ایک خوشبو ہے۔ ایک چاندنی ہے۔ ایک رقص و وجد کی شے ہے۔

آتش اردو کے پہلے عاشق سرشار ہیں۔ آتش کے یہاں حسن کی مصوری اور عشق کی کیفیات کی نقاشی کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ (۳) وجہ سے ان کی شاعری SENSONS ہے۔"

اشعار میں جذبات و کیفیات کی جو مصوری ملتی ہے وہ انسانی فطرت و نفسیات سے متعلق ایک ایسی بصیرت عطا کرتی ہے جو دیرپا ستر کا باعث ہوتی ہے۔ یہ خصوصیت ہر بڑے شاعر میں ہوتی ہے۔"

آتش کی اوّلیت و انفرادیت کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اردو کے عام شعرا کی روش سے ہٹ کر انھوں نے مذہبِ عشق کے پیغام کو عام کیا۔ اردو شاعری میں عام طور پر عشق و محبت کو ایک روگ اور وبالِ جان قرار دیا گیا ہے۔ لیکن آتش اس کے برعکس عشق کو صحت مندی اور انسانی جذبات کے عین مطابق قرار

دیتے ہیں۔ اس معنی میں آتش میر کے ہم مسلک ہیں ؎

دل کو اگر لاگ نہیں لطف نہیں جینے کا
کسو کے اُلجھے سُلجھے زلف کے گرفتار رہو

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

جو دیکھے تیری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

خدا سر دے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

خوشا وہ دل کہ ہو جس میں آرزو تیری
خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

کسی کا ہو رہے آتش کسی کو کر رکھے
دو روزہ عمر کو انساں نہ رائیگاں کرے

ڈاکٹر شاہ عبدالسلام "دبستانِ آتش" میں رقمطراز ہیں :

خواجہ آتش کی شاعرانہ خصوصیت کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بلاشبہ دبستانِ لکھنؤ کے شعرا میں خواجہ آتش کی شخصیت نمایاں اور استادی مسلم تھی۔ انکا کلام سوز و گداز، سادگی و صفائی، فقر و تصوف، قناعت و استغنا، رندی و سرمستی و ارادتِ قلبیہ اور لطیف تشبیہات محاورات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کو ہم فخر کے ساتھ دبستانِ دہلی کی شاعری کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں

اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں :

آتش کا رنگ ان کا اپنا رنگ ہوتے ہوئے

بھی مختلف رنگوں کا مجموعہ تھا۔ سودا کی واہ، درد کا تصوف اور متانت، میر کی آہ، جرأت کی معاملہ بندی اور خود آتش کی رندی و سرمستی کا مجموعہ تھا۔"

آتش کی شاعری میں فکر کی گہرائی، جذبے کی حرارت، احساس کی جاذبی اور خیال کی توانائی بھی موجود ہے اور زبان و بیان اور فن کے معنوی تقاضوں کی پاسداری بھی —— داخلیت کی گرمی میں خارجیت کی اُودی ہوا چلتی محسوس ہوتی ہے۔ .... اس تناظر میں آتش کا مقام اُردو شاعری میں بلند و منفرد ہے۔

آزاد :-

ان کے کلام نے پسندِ خاص و قبول عام کی سند حاصل کی اور نہ فقط اپنے شاگردوں میں بلکہ بے غرض اہلِ انصاف کے نزدیک بھی مقبول اور قابلِ تعریف ہے۔"

ابو سکینہ رقم طراز ہیں :

کلام میں ان کے تشخص کے اعتبار سے گہری بہت ہے۔ تصنع اور تکلف مطلق نہیں ...... اکثر اشعار میں روانی، موسیقیت کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ ...... میر و غالب کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے تو وہ آتش ہیں۔"

ڈاکٹر عبدالسلام :

میری ناچیز رائے میں خواجہ حیدر علی آتش کی شخصیت بلاشبہ دبستانِ لکھنؤ کے شعرا میں سب سے زیادہ اہم ممتاز اور باعظمت شخصیت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ قدرت نے انھیں گداز دل اور بلند دماغ بھی ودیعت کیا تھا۔ ان کی شاعری نے انھیں وہ امتیازی حیثیت دلائی جو کسی دوسرے

ہم عصر شاعر کو نصیب نہ ہو سکی۔"

بقول سرور :

آتش کا سنجیدہ مطالعہ لکھنؤ اسکول کے کارناموں کی قدر و قیمت واضح کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔ آتش شاعری کے فن کے بہترین معلموں میں سے ہیں۔"

بقیہ شہر خیال

مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ان سارے معاملات میں بھی آپ اپنی ہمت کم نہ ہونے دیتے ہیں۔ مہاراشٹر کے شہر بمبئی، مالیگاؤں، کامٹی اور ناگپور میں بھی ایسے ادیب اور شاعر ہیں۔ فلم نگری سے وابستہ ایم پی، یوپی بہار کے لوگوں کے علاوہ وہ ادیب اور شاعر جنھوں نے یہاں جنم لیا اور یہیں ان کی ادبی تربیت اور ترقی ہوئی ایسے ادیب اور شاعر آپ کی تلاش میں ہوں گے۔ سہیل کا کوئی نمبر [illegible] ان کے نام سے بھی آئے تو بہتر ہوگا۔ آئندہ کسی ایسے شمارے کے اعلان کا انتظار رہے گا۔

منصور اعجاز۔ دیوت محل۔ مہاراشٹر

مکرمی سلام مسنون! آپ کا ارسال کردہ "سہیل" کا ایک شمارہ ڈاکٹر علیم اللہ حالی کے نام ملا۔ شکریہ: اتنا عمدہ شمارہ نکالنے کے لئے میری جانب سے مبارکباد قبول کیجیے۔ پڑھ کر جی خوش ہو گیا اس طرح کے خاص شمارے کسی ایک شاعر یا افسانہ نگار کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوں گے اور اس کی حیثیت دستاویز کی ہو جاتی ہے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ خدا سہیل کی عمر دراز کرے۔ (آمین)

نیاز کیش: نسیم محمد جان۔ چھپرہ

(بہار)

اپنی زندگی کی حفاظت کیلئے پیڑ لگائیں / پیڑ بچائیں

دُنیا کا پہلا آدمی پیڑ کے بیچ پیدا ہوا ہوگا۔ پیڑ انسان کے بزرگ ہیں۔ پیڑوں اور جنگلوں کی گود میں انسانی سماج پھلا پھولا اور بڑھا۔ یہ تعلقات آج کل کا نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں سال کا ہے۔
پیڑ اپنی زندگی سے لے کر موت تک انسان کی خدمت کرتا رہا ہے۔ پیڑوں اور جنگلوں کی بدولت بارش ہوتی ہے جس سے غلہ پیدا ہوتا ہے۔ مٹی کو باندھ رکھنے کی اس کی بے مثال طاقت ہے۔ اگر پیڑ نہیں رہے تو مٹی ہی صاف ہو جائیگی۔ جہاں غلہ پیدا کیا جاتا ہے۔ نہ صرف اناج بلکہ پھل اور پھول سے بھی وہ آدمی فیض پہونچاتا ہے۔ عمارتی لکڑی کے علاوہ جلاون دیتا رہا ہے۔ اور لو اور گرمی، جاڑا اور برسات میں آدمی کو سایہ دیتا ہے۔

لیکن انسان نے اپنے ایسے دوست کے ساتھ بھی دوستی کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ اپنے غلط مفاد کی وجہ کر اس نے جنگل کے جنگل کاٹ دیئے ہیں برباد کر دیئے ہیں۔ لوگوں کو شک ہے کہ اس سے پریاورن سنتولن میں گڑبڑی آگئی ہے۔ تجربہ کاروں کا کہنا ہے کہ اس سے بہت سی بھیانک بیماریوں نے حملہ کر دیا ہے۔ لیکن تشفی کی بات ہے کہ دُنیا بھر میں پیڑوں کی حفاظت اور پریاورن سنتولن پر اوپری سطح تک دھیان دیا گیا ہے۔
اس ملک میں وزیر اعظم کے ۲۰ نکاتی پروگرام میں جنگل لگانے کو ایک خاص اہمیت دی گئی ہے جس کے اچھے پھل دکھائی دے رہے ہیں۔
صوبہ بہار میں ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۱۰ کروڑ ۴۰ لاکھ پیڑ لگانے کے تارگیٹ کے خلاف ۱۰ کروڑ ۶۹ لاکھ ۵۰ ہزار پیڑ لگائے گئے ہیں جو طے شدہ تارگیٹ کا ۱۰۲٫۸۵ فیصد ہوتا ہے۔ یہ کامیابی بہت اونچے درجے کی کامیابی ہے۔ ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۱۲٫۵ کروڑ پیڑ لگانے کا تارگیٹ ہے۔
حکومت کے علاوہ آپ کا بھی فرض ہے۔

اس لئے وزیر اعظم کا اعلان ہے
"ایک بچے کے لئے ایک پیڑ"

[illegible] 122-[illegible] ([illegible]-105)/84-85

شام بارک پوری

دو شاعری میں بنگلہ دیش کے حسن کی عکاسی !

بنگلا دیش قدرت کے بیش بہا حسن سے مالا مال ہے۔ اس دیارِ رقص و نغمہ میں جھومتے ہوئے
ل اور سپاری کے درخت، پٹ سن، چائے اور دھان کے خوبصورت پودے، آم اور بانس کے جھرمٹ
پیلے کا درخت، گنگناتی ہوئی ندیاں، لہلہاتے ہوئے کھیت اپنی بہاریں دکھاتے ہیں۔ سرسبزی و شادابی
ی حسن اور دلفریب مناظر آنکھوں کے لئے بہشت جاوداں کا درجہ رکھتے ہیں۔ کس کا جی نہ چاہے گا کہ
بنت نگاہ نظاروں کو اپنے دامن میں سمیٹ لے۔ مشہور سیاح ہیون سانگ نے اسی سرزمین کے
ق کہا تھا " یہ سرزمین کے متعلق کہا تھا۔" یہ سرزمین اس خوبصورت دوشیزہ کی طرح ہے جس نے ہری ہری گھاس
لیں لباس پہن رکھا ہے، جھیلیں اور تالاب اس مخملیں لباس پر چمکیلے ہیروں کی طرح جڑے ہوئے ہیں اور
کے کندھوں پر آبِ رواں کا دوپٹہ لہرا رہا ہے۔

یہاں کا چپہ چپہ اپنے اندر ایک رعنائی اور دلکشی رکھتا ہے۔ مشرقی بنگال ہلچل مچا دیتی ہیں۔
ہر نگاہ اٹھائیے سبزہ ہی سبزہ جدھر نکل جائیے ہریالی ہی ہریالی۔ ان ہی نظاروں سے متاثر ہو کر اردو
کے قلم نے صفحۂ قرطاس پر ایک نظم بکھیر دی

ے

بستی بستی ہر سو رونق جنگل جنگل جھکے
ذرہ ذرہ چم چم چمکے، غنچہ غنچہ دمکے
اپنے دیس کی مٹی میں ہیں، ہیرے موتی لعل اے ساتھی ہیرے موتی لعل
ہرا بھرا بنگال اے ساتھی ہرا بھرا بنگال

یہاں کا ہر موسم اپنے اندر ایک جاذبیت اور کشش رکھتا ہے۔ برسات زمین کو سبز لباس پہنا کر
تی ہوجاتی ہے اور ساری فضا جنت نگاہ بن کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اودے اودے بادل اپنے
پا شادمانی اور کامرانی کا پیغام لئے ہوتے ہیں

ے

گنگناتی ہوئی آتی ہیں فلک سے بوندیں
کوئی بدلی تری پازیب سے ٹکرائی ہے
(قتیل شفائی)

ہر جگہ کیف و سرور کا عالم ہوتا ہے۔ ہر طرف پھولوں کی خوشبو بکھری
رہتی ہے۔ مشرقی بنگال کی ساری خوبصورتی، رعنائی، دلکشی اور جاذبیت سب ان ہی دریاؤں کی
ہے۔ دنیا یہاں کی خوبصورتی میں رگِ جاں کی حیثیت رکھتا ہے۔ دریا کے کنارے دور دور تک
ے بکھرے ہوتے ہیں اور پانی کے عکس میں چاند اور ستاروں کا کارواں، رواں دواں ہوتا ہے حسین

شاندار ساحل اور یہاں کی راحت بخش فضا، قدرتی حسن میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ یہ پر کشش ساحلی مقام مختلف حسن کے مناظر پیش کرتا ہے۔ اطراف کی خاموش فضا اور چاروں طرف پھیلے ہوئے مناظر ایک ایک نظارہ اور سب سے بڑھ کر بل کھاتی ہوئی ندیوں کی لہروں کی اوٹ میں غروب ہوتا ہوا آفتاب کا منظر بل دیتا ہے۔

فلک نیلگوں پر جب چاند نکھرا ہوا ہوتا ہے اور اس کے پر نور چہرے سے بکھری ہوئی چاندنی برستی ہے تو حد نظر تک بس حسن ہی حسن نظر آتا ہے۔ اس لئے پیکوڈ کے لئے موتی اور جواہرات سے جڑا ہوا تارا جگنو بے حد خوبصورت ہو جاتا ہے۔ اس وقت بکھرے ہوئے پھولوں کی بہار قابل دید ہوتی ہے۔ چاندنی راتوں میں پھولوں کے نظارے سے کام و دہن پر نشہ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ تالاب اور جھیلوں میں کنول کے پھول ارمان بھرے دل کی طرح کھلے ہوتے ہیں۔ اسی سے متاثر ہو کر نذر الاسلام نے کہا تھا۔

آئیں گی جب آسن کی ہوائیں، ڈھونڈیں گی شبنم میں فضائیں
سب ہوں گے اک میں ہی نہ ہوں گا، گو تمھیں گی پیکری صدائیں

اس پر رومان پرور چاندنی رات میں زلف بنگال اور ملیح چہرے ٹمکنت کا احساس دلانے والی آنکھیں کتنوں کے دلوں کی دھڑکنیں بن جاتی ہیں۔ جب وہ اپنے محبوب سے ملنے دانتوں میں آنچل دبائے، بدن چرائے خرام ناز سے نغمہ چھیڑتی، ناریل اور سپاری کے درختوں کے جھنڈ میں اپنے بیقرار محبوب سے ملنے آتی ہے تو بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے: "ہوا تمہارے آنے کے وعدے کی خوشبو سے معطر ہو رہی ہے"۔

اس آہو چشم حسینہ کی آنکھیں نشاط رنگ و بو سے مخمور ہوتی تھیں۔ اس کے پیرہن سے جوانی کی خوشبو بکھر کر فضا کو معطر کرتی ہے۔ اس کے ملیح چہرے پر شفق کی لہریں بکھرنے لگتی ہیں۔ اس کے ماتھے کا ٹیکہ عاشق صادق کا تارا بن جاتا ہے۔ شاید ایسی ہی دوشیزہ بنگال کو دیکھ کر جمیل آلدین عالی کا دل دھڑکا تھا۔ کہ

پیچھے ناچیں ڈھاب کے پیڑ اور آگے پان سپاری
انہی ناچوں کی تھاپ سے ابھرے سانولی بنگلہ ناری
سانولی بنگلہ ناری جس کی آنکھیں پریم کٹورے
پریم کٹورے جن کے اندر کنتی دکھوں کے ڈورے

یہاں کے چپہ چپہ میں زندگی کا قافلہ رواں دواں ہے۔ گوشے گوشے سے حیات کا دریا ابلتا ہے۔ یہاں کا انسان آزاد بھی ہے اور مجبور بھی۔ زندگی کا سارا حسن اور رعنائی اس کے دست و بازو میں سمایا ہوا ہے۔ انسان اپنے ہل سے زمین کا سینہ چیر کر انسان کو جینے کا پیغام دیتا ہے۔ مچھیرا ایک بہادر سپاہی کی طرح دریا کی لہروں سے برد آزما ہوتا ہے۔ کشتی تنکے کی طرح آگے بڑھتی ہے۔ اس کو دیکھنے سے ہوا بند دیوتاؤں کی ہیبت کا خیال آتا ہے۔ زندگی حرکت کا نام ہے۔ موم شمع بننے کے لئے مضطرب ہے۔ قطرے کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ موتی بن جائے۔ اور ہر ذرہ کی یہ خواہش ہے کہ وہ آفتاب بن جائے۔ یہاں کے ہر دل میں امید کا جام لبریز ہے۔ یہ دیار رقص و نغمہ اپنے دامن میں گیتوں کی دنیا بسائے ہوئے ہے۔ فطرت نے ہر شخص کو ذوق شعری عطا کیا ہے۔ نغمہ و آہنگ کے رسیا گوشے گوشے میں مل جائیں گے۔ اسی لئے مشہور چینی سیاح

ناہیان نے اسے گیتوں کی سرزمین کہا ہے۔ جب حسن و جوانی اس حسین منظر سے مخمور ہوتی ہے تو اس کا

ے گنگنانے پر مجبور کرتا ہے۔ ساحل کے کنارے جب مچھرن اپنے محبوب کا انتظار کرتی ہے تو وہ کشتی لے
ں لیے سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ اس سوگوار حسن کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بنبے پر بیٹھی ایک حور
نت آنسو بہا رہی ہے۔ یا کوئی ملکۂ پرستان ہے جو اپنی آنکھوں سے موتی بکھیر رہی ہے۔ محبوب کی یاد میں
بات سے ڈوبی ہوئی آواز ابھرتی ہے۔ دریا، جنگل، کھیت سب اس کی آواز کے سحر میں کھو جاتے
۔ اس کی پردرد آواز پر فطرت [illegible] بہاتی ہے۔ ساری فضا پر ایک یاس اور بے چینی کی کیفیت
اری ہوتی ہے جو ذرہ ذرہ بے چینی کے عالم میں ہوتا ہے کہ اچانک اس کے کانوں سے بھٹیالی گیت کی آواز
رائی ہے۔ اس کی منتظر نگاہیں کشتی دیکھ لیتی ہیں۔ مچھیرے کی کشتی واپس آتی ہے۔ اب سماں
جاتا ہے۔ ذرے ذرے پر جنت کا گمان ہوتا ہے۔ اس کے نغمے فضا میں ایک ارتعاش پیدا کرتے
ر جذبات کی دنیا میں رنگین وادیوں کی جلوہ سامانیاں رقص کناں ہوتی ہیں۔ گویا ساری فضا شراب
عر میں ڈوب جاتی ہے اور منظر کے آوارہ خیالات گھٹاؤں کی شکل میں افق پر چھا جاتے ہیں اور اس
عمات پر فرشتے بھی جھوم اٹھتے ہیں۔ کیا خوب کہا ہے [illegible] نے۔

شراب و شعر میں ڈوبی بصد ناز و ادا اٹھی
ہے تکمیل حسرت وہ نگاہ فتنہ زا اٹھی

قدرتی مناظر کا حسن ہر ملک اور ہر زبان کے شاعروں کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ کیٹس ہو یا ورڈزورتھ
دل ہو یا جسیم الدین، نذر شیرازی ہو یا علامہ اقبال، سبھوں کی نظموں میں قدرت کی رنگینیاں اور جلوہ
سامانیاں پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اقبال کی شاعری میں بھی قدرتی حسن و دلکشی کی طرح تخیل کے
ن سے آہستہ آہستہ نمودار ہوتا ہے۔ اس میں محسوسات کی لذت اور تصورات کی رنگینی ہے۔ علامہ اقبال
ر بنگلہ دیش سے ہزاروں میل دور تھے مگر جب وہ اپنے شاعرانہ تخیلات کو بروئے کار لاتے ہیں
کی نگاہ تصور میں مشرقی بنگال کا قدرتی حسن ابھرتا ہے۔ اور ان کے قلم کی ہر جنبش جادو جگانے لگتی ہے
یہی اشعار کا م و دہن کو لذت بخشتے ہیں تو انسان ان کے حسن میں کھو جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے
ن کی نظم "ایک آرزو" بنگال کے خواب کی تعبیر ہے۔ یہ پوری نظم شاعرانہ مصوری کی بہت دلکش
ا ہے۔ ان کے اشعار میں دریا کی روانی، آبشار کا ترنم، پھول کی نزاکت اور بہار کی خنکی سما گئی ہے
سرزمین کے حسن کو انھوں نے اپنے موئے قلم سے اس سرزمین کے حسن کو انھوں نے اپنے موئے قلم سے اس
پیش کیا ہے گویا مصور سے بھی دو قدم آگے نظر آتے ہیں۔ اس لیے کہ مصور فضا کی بدلتی ہوئی کیفیتوں
اری نگاہوں کے سامنے پیش نہیں کر سکتا لیکن اقبال اپنی شاعری سے ننھے ننھے نقش ابھارتے اور ان
پر جادو سا کرتے نظر آتے ہیں۔ اس نظم کے مست رنگین منظر میں شاعر تصورات کے دوش پر پرواز
ہوا معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے منظر نگاری اور فطرت کی عکاسی کے بڑے حسین مناظر پیش کیے ہیں۔ اگر آپ
میں شاعر کے زیر لب یہ نظم پڑھیں تو آپ کے ذہن میں مرغزار دلکش کا تخیل ابھرے گا۔ شعر ختم کرتے
[illegible]

ہو ہاتھ کا سرہانا سبزہ کا ہو بچھونا — شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں — ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ماہنامہ سہیل گیا





ڈاک گھر بچت بنک میں جمع کرائے گئے 200 روپے آپ کو 1,00,000 روپے فاضل دلا سکتے ہیں

بچت کی ایک سرکاری اسکیم جو چھوٹے بچت کاروں کو ... فیصد ٹیکس سے مستثنیٰ سود کے علاوہ ... روپے تا ایک لاکھ روپیہ کے کسی نقد انعام کا امکان بھی پیش کرتی ہے۔

انعامی اسکیم

ڈاک گھر بچت بنک کے [illegible] لاکھ سے زیادہ کھاتہ دار ایسے انعام حاصل کر چکے ہیں۔
آپ اپنے خاندان کے ہر فرد کے نام کھاتا کھلوا کر اپنے انعام جیتنے کے مواقع میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ آپ ... اپنے نام سے چاہے جتنے بھی کھاتے کھول سکتے ہیں۔

ڈاک گھر بچت بنک میں ۱۰ اکتوبر تک کھاتہ کھول لیجئے تاکہ آپ جولائی [illegible] میں نکالے جانے والے ڈرا میں شامل ہو سکیں۔



...ہو گیا

...ا ناتھ درد

دستاویز

...سانسوں سے اکھڑے تو موت کا عالم
...ی کڑی سے جڑے تو بنے کہیں زنجیر
...ا ماضی اندھیروں میں گم ہوا ہے مگر
...ا حال اندھیروں کی ہو گیا تفسیر
...ی شعلہ بیانی کی خواب نگاہوں سے
...گی وقت کے [illegible] کو اک نئی تعبیر
...ا ہے ہم نے نئی نسل کے جو ماتھے پر
...ت تو کے مورخ پڑھیں گے وہ تحریر
...ے سامنے سرگوشیوں کی چلمن ہے
...ری آنکھ تلے عمر کے فسانے ہیں
...ہوسکے تو کتاب حیات کو پڑھنا
...ہ سکے تو کتابوں کے قید خانے ہیں
...ا جیسے ہے قسمت تمہارے فردا کی
...ری زیست ڈگر ہے تمہاری دنیا کی

سردار شفیق۔
قاسم پورہ۔ مئو ناتھ بھنجن

غزل

گیسوؤ رخسار پر بھی کچھ نہ کچھ لکھا کروں
اس کو ضد ہے میں بھی اوروں کی طرح سوچا کروں

اس سے تو مل بیٹھنے کی اب بھی ہیں صورتیں
آنکھ سے روٹھے ہوئے خوابوں کو کیوں ڈھونڈا کروں

اس کو ہونا ہے کسی دن موج طوفاں کا حریف
اپنے اس بے مایہ قطرے کو ذرا دریا کروں

دور تک بہتے ہوئے پانی سے خالی ہے زمیں
کس ندی میں جسم کا آتش کدہ ٹھنڈا کروں

ایسی منزل تک لئے جائے مجھے جینے کا کرب
میں بھی خوابوں کی طرح ٹوٹا کروں بکھرا کروں

ہر نیا موسم بدل دیتا ہے خواہش کا مزاج
اب تری جانب نظر اٹھتی نہیں تو کیا کروں

ہے مسلط ذہن و دل پہ خود پرستی کا جنوں
اس سے چھٹکارا ملے تو آپ کو سجدہ کروں

بھول کر بھی رہ نہ جائے کوئی پل بے احتساب
سلسلہ ماضی کا اپنے حال سے جوڑا کروں

اہل حق کے واسطے جب نصب کی جائے صلیب
سب سے پہلے میں تری محفل میں سر اونچا کروں

علی عباس امید۔ بھوپال

بستر علالت سے ایک نظم

پیرہن دھند کا سورج کا مقدر ٹھہرا
پلکیں بوجھل ہوئی جاتی ہیں ان دریچوں کی امید
دن کی دہلیز پہ آ پہنچے اندھیرے شاید
بجھتے جاتے ہیں دیواروں کے روشن چہرے

تند ماحول میں ٹھہرے ہیں گریزاں لمحے
زندگی ایک چھلاوے کی طرح آ کے چلی جاتی ہے
جاگتی آنکھ کو بے نور بنا جاتی ہے !!

دن کی دہلیز پہ آ پہنچے اندھیرے شاید
پھر سزا جاگتے رہنے کی ملے گی مجھ کو
ذہن کے دشت میں آوارہ خیالوں کے ہجوم
درد کے قافلے بھٹکے ہوئے خوابوں کے نجوم
یاس کے شانے پہ سر رکھے شکستہ احساس
ٹوٹے لفظوں میں الجھتی ہوئی آس
کوئی بھولا ہوا لمحہ، کوئی بسرا ہوا سا نغمہ
کوئی مانوس سی خوشبو کوئی شفقت بھرا ہاتھ
ایک اک کر کے دبے پاؤں چلے آئیں گے

بجھ گئے ہیں در و دیوار کے روشن چہرے
ہو گئے اور بھی تنہائی کے سائے گہرے
درد کی کرنیں پھیلی ہوئی رات آ پہنچی

شب تو شب ہے بہرحال گزر جائے گی
صبح کو آنا ہے، آئے گی، ضرور آئے گی
ہوگی پھر سوچ کے دل ہے کہ بجھا جاتا ہے

پلکیں بوجھل تھیں دریچوں کی وہ اب بند ہوئیں
جاگتا تھا دلِ خواب سو رہا ہے اب بھی !!

حسن نجمی سکندر پوری

اپنی موت مرے گا راون

کوئل بولی، سن اے برہن
ڈھونڈ نکلیں گے اب کے ساجن
بھاگی گھومی بن بن دیکھے
میری الجھن، میری تڑپن
اے تلسی کے پودے اب میں
کس دل سے لیپوں گھر آنگن
ٹوٹے گا ان سب سے ناتا
کنگھی، چوڑی، کاجل، درپن
کنگن نے دم سادھ لیا ہے
دھوم گئی پیروں کی چھن چھن
لیکن ان کی چیخیں بھی آئیں
"مل مالک سے ہے ان بن"
کہتے ہیں مزدور" بڑے بھیّا
بھتّا بونس اور ڈیوٹی"
"تالابندی کا چرچا ہے"
"لگنے والا ہے کرفیو"
"سپنا دیکھیں ہم امرت کا!"
"کرتے جائیں ساگر منتھن!"
پیا نے پھر آگے لکھا ہے
"تم دل میں مت لانا الجھن"
"اپنا تو وشواس ہے اس پر"
"جیٹھ کے بعد آئے گا ساون"

"سیتا! تجھ سے رام ملیں گے"

"اپنی موت مرے گا راون"

۱۹۳، گووند کھنڈ۔ وشوا کرم نگر
نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۳۲

لامسہ

(۱۱ مارچ ۱۹۸۳ء کے مٹیا برج میں ہونے والے فساد سے متاثر ہو کر)

نوان مظلوم بیکس بے زبان
ہر کے سارے مکینوں کی طرح
ف سے سہمی ہوئی تھی
عورت اور بھی
ب بہ رنگ کتوں کی آمد کی صدا
بیک نازل ہوئی دستک ہوئی
ئے آبرو میں
نتِ نازک تھے اٹھے
اب رحم کر یا موت دے
نازک کے اعضا کٹتے رہے
لیکن
شدہ پاگل درندوں کی قطار
ے مغرور تھی مسرور تھی
رہی تھی دست نازک پر اشر
ستان دختر ہندوستان !

ام - کے - اشر

آکاش بیل

میں وحشتوں سے گاؤں اور شہروں کی بھاگ کر
جنگل کی اور آیا کہ تازہ ہوا ملے
خوش رنگ حسین پھول تھے پودے تھے ہر طرف
منظر وہ دلفریب کہ خوشیوں کے باغ ہوں
جھونکے ہوا کے چھوتے تھے اشجار کے بدن
جنبش میں برگ و بار کی نغمے تھے پیار کے
ندی کا شور جیسے کہ جینے کی صدا ہو
جو اونچے نیچے راستوں سے شور مچاتا
منزل کی سمت جاتا تھا بے خوف اور خطر
آزاد فضاؤں میں وہ پر عزم پرندے
آکاش فتح کرنے نکل آئے تھے جیسے
کچھ بیٹھے ہوئے شاخوں پہ گاتے تھے ترانے
ہر چیز دے رہی تھی جواں زندگی کا درس
اک پیڑ تھا کہ سوکھ رہا تھا کھڑا کھڑا
پتوں سے خالی خالی تھا اس پیڑ کا بدن
ایک جال بن رکھا تھا مگر کوئی چیز نے
جس کا تنہ تھا کوئی نہ مضبوط جڑیں تھیں
لیکن غذا وہ لیتی تھی اس سوکھے پیڑ سے
جس کو دبوچ رکھا تھا جانے میں کب سے
"آکاش بیل تھی کہ جو جینے پہ تلی تھی"
جیسے شہر میں سود پہ پلتا ہے مہاجن
گاؤں کا خون چوس کے بڑھتا ہے مہاجن
دھرتی پہ جبر کرکے اکڑتا ہے مہاجن

منصور اعجاز

غزل

عشق کے پیکاں بن کے دل میں تیر و نشتر ٹوٹ گئے
تیر کے مقابل جب بھی آئے سارے خنجر ٹوٹ گئے

تیری خاطر پھرتا ہوں جنگل جنگل صدیوں سے
چلتے چلتے پاؤں میں میرے کانٹے اکثر ٹوٹ گئے

پیچھے زمیں پر کیسے رہتا میں تنہا بالکل تنہا
جیسے جہاں کے غم تھے میرے سر پہ آکر ٹوٹ گئے

تم نے کیسا زخم لگایا تم نے کیسا درد دیا
ہم نے لگائے جتنے ٹانکے زخم میں یکسر ٹوٹ گئے

جگ یہ کیسے جاری رہتی کوئی تو بتلائے مجھے
تم سے جب سیفی پہ یادوں لاکھوں نشتر ٹوٹ گئے

سیفی سرونجی

سیفی لائبریری سرونج (ایم۔پی)

غزل

شب کے سناٹے سے چھوٹے دام سحر میں آئے
رات کے بھٹکے ہوئے قافلے گھر میں آئے

قطرۂ اشک کی مانند مژہ سے ٹپکے
درد بن کر وہ مرے قلب و نظر میں آئے

دل پہ بھی زخم جو ویرانے میں تھا گرم سفر
کتنے ہی حادثے اثنائے سفر میں آئے

پیش منظر کو تو میں دیکھ رہا ہوں لیکن
زندگی کا پس منظر بھی نظر میں آئے

اس کے سجدہ کیلئے شوق سے جھک جائے جبیں
نقش پا تیرا اگر راہ گزر میں آئے

دل آشفتہ بھی تیری جنت کی فضا سے محروم
ہم بیاباں سے جو نکلے تو کھنڈر میں آئے

آخری خواہش ہے مرے دل کی انام
بس یہی اس کی چاندنی ہر شخص کے گھر میں آئے

انعام الحق بیدار

سوبھن ڈاکخانہ لال شاہ پور۔ دربھنگہ

غزل

زنگ لگتا ہے خنجروں میں کبھی
خون اُٹھتے ہیں منظروں میں کبھی

عکس پھولوں میں ڈوب جاتے ہیں
خواب ڈھلتے ہیں پیکروں میں کبھی

شہر اُٹھتا ہے میری صورت سے
بت شکن ہیں ذریت آذروں میں کبھی

تو کنارے بھی غم کی آب ہوئے
پھر اُٹھی سمندروں میں کبھی

اب کمالِ شکستگی دیکھیں
تابش برق پیکروں میں کبھی

کوئی طائر خلا میں اڑتا تو
زور ہوتا جو شہپروں میں کبھی

پل صراطوں سے بھی ظفر گزرے
موت رہتا مسافروں میں کبھی

ظفر ہاشمی

بسٹوپور۔ جمشید پور

831001

شام مبارک پوری

سنگ تراش کا دل

عمارت رنگ و نور میں ڈوبی ہوئی تھی۔ رنگ رنگ کی بتیوں سے کٹ آؤٹ جگمگا رہا تھا۔ ملک کے اُس
عظیم سنگتراش کے نام کا ایک نیون سائن بورڈ بھی آویزاں تھا۔ آج اس فنکار کو خراج عقیدت
پیش کیا جا رہا تھا جس کے مجسمہ کو بین الاقوامی مقابلے میں اوّل قرار دیا گیا تھا اور جس کے لئے ایک سمپوزیم
کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ ملک کے گوشے گوشے سے بڑے بڑے دانشور اور شہر کے بڑے بڑے قدردان
اس موقع پر شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ پریس رپورٹروں اور فوٹو گرافروں کے ساتھ لوگوں کا جم غفیر تھا
جو گیٹ کے اندر داخل ہونے کے لئے زور آزمائی کر رہے تھے۔

خستہ حال راحیل پھٹے ہوئے لباس، بڑھی ہوئی شیو، آنکھوں میں وحشت لئے مجمع میں موجود تھا۔ وہ
اندر داخل ہونا چاہتا تھا کہ استقبالیہ کمیٹی کے کارکن نے اسے اندر جانے سے روک دیا۔
"چل دفع ہو یہاں سے ---- یہ جگہ تمہارے جیسے بھکمنگوں کے لئے نہیں" چوکیدار نے اسے جھڑک دیا۔
بڑی بڑی کاریں آتیں اور چوکیدار گیٹ کھول دیتا۔ لوگوں کا ہجوم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ مجمع کو کنٹرول
کرنے کے لئے پولیس تعینات تھی۔ اخباری نمائندے اپنا اپنا کارڈ دکھا کر گھس رہے تھے۔

وہ شکستہ دل حسرت بھری نظروں سے اس عمارت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آج اس سنگتراش
کو فراموش کر دیا گیا تھا جس نے اپنے خونِ جگر سے اور تخیل سے مجسمہ کو تراشا تھا۔ آج خود اس کی اپنی نگاہیں اپنی
تخلیق کی بہار دیکھنے کو ترس گئی تھیں۔ وہ اپنے ماضی کے تصور سے ہراساں تھا۔ اُسے اپنے گزرے
ہوئے دنوں سے نفرت تھی، اس لئے اُس نے اپنے وجود کو چھپا رکھا تھا۔ اُسے نہ کسی ستائش کی تمنا
اور نہ صلے کی پرواہ۔

راحیل کے تصور پر پرانی یادیں یوں برسنے لگیں جیسے برسات میں رم جھم ہوتی ہے۔ گزشتہ واقعات
اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی طرح لہرانے لگے۔ سینے کے ویران گوشوں میں ایک ٹیس سی کروٹیں لینے لگیں۔ اس نے فائن
آرٹس میں ڈگری لی تھی۔ اس کی امنگیں جوان تھیں اور حوصلے بلند۔ کچھ کرنے کا جذبہ اس کے رگ و پے میں
سمایا ہوا تھا مگر جلد ہی وقت کے ہاتھوں اس کی امنگوں کا گلا گھٹ چکا تھا۔ ارمانوں کا گرم لاوا ٹھنڈا پڑ کر
رہ گیا، اور آرزوؤں کی چبھن دل میں اترتی چلی گئی۔ وقت ہوا کے جھونکے کی طرح اڑتا چلا گیا۔ اور اداسی
زرد رنگ خزاں کی طرح چھا گیا۔

ایک شام جب سورج رات کے آنچل میں منہ چھپا رہا تھا۔ وہ سڑک پار کر رہا تھا کہ اچانک ایک

کار کی زد میں آنے سے بال بال بچا۔ کار کے پہیئے چرچرا کر رک گئے۔ کار کی کھڑکی سے جس شخص کی گردن نکلی، وہ
اس کا کلاس فیلو توقیر تھا جو کمرشیل آرٹ کا ڈپلوما لے کر اپنا کاروبار چلا رہا تھا۔ اس نے اسے کھینچ
کار کے اندر بٹھا لیا۔ کار سبک رفتاری سے آگے بڑھی۔ ان میں بچپن کی باتیں، کلاس کی شرارتیں
حسینوں کے تذکرے چھڑ گئے۔

"مگر آج کل تم کیا کر رہے ہو؟" توقیر نے تھرڈ گیر دے کر گاڑی تیز کر دی۔

"میں افلاس کے ہاتھوں کھلونا بن گیا ہوں یعنی بے کار ہوں"

"تم جیسے ماہر فن جینئس کو ٹھاٹ دار زندگی گذارنی چاہیئے تھی۔" توقیر نے افسوس اور حیرت سے کہا

"ارے یار۔ پھول نہ سہی کانٹے ہی سہی۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں۔"

"میں نے بہت بڑی پبلسٹی کمپنی کھول رکھی ہے۔ اخباروں، رسالوں اور کمپنیوں کے ڈیزائن بھی تیار کرتا ہوں۔ فلموں کی نمائش پر بینر اور پوسٹر بھی تیار کرتا ہوں۔"

توقیر کی گاڑی اب آصف علی روڈ کی طرف جا رہی تھی۔ "مجھے عرصہ سے ایک اچھے آرٹسٹ کی ضرورت تھی۔ اخباروں میں اشتہار بھی دیا مگر کوئی کام کا آدمی نہ ملا۔ بہتر ہوگا کہ تم میری فرم سے منسلک ہو جاؤ۔ میرا اسٹوڈیو اسی روڈ کی پچھلی طرف ہے جس کے تم انچارج ہوگے اور میں کنٹریکٹ بیلنس وغیرہ سنبھالوں گا۔"

"مگر یہ سب کچھ مجھے کچھ عجیب سا لگتا ہے۔" راحیل کو جھجک سی محسوس ہوئی۔

"ارے یار چھوڑو بھی۔ تم جیسے فنکار بہت حساس ہوتے ہیں۔ میرا کام اتنا بڑھ گیا ہے کہ سنبھالنا میرے بس کا روگ نہیں، اور پھر میں تمہیں بحیثیت نوکر تھوڑی رکھ رہا ہوں بلکہ منافع میں پارٹنر ہو"

اس کی گاڑی اسٹوڈیو کے سامنے جا کر رک گئی۔ نچلے فلور میں مختلف لوگ اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ پہلی منزل پر بہت بڑا ائیرکنڈیشنڈ ہال۔ سجاوٹ کا ایک نیا انداز پیش کر رہا تھا۔ یہ ہال سمندر سے الگ کھلا تھا۔ آرٹسٹ کے کام کرنے کا ایک الگ گوشہ تھا۔ دوسری طرف نئے نئے ڈیزائن کے صوفے اور فرنیچر تھے۔ ساتھ میں ماڈرن ٹائپ کا باتھ روم بھی منسلک تھا۔

"اب یہ ہال اور یہاں کی ہر چیز تمہاری ہے۔ یہاں بیٹھ کر تم اپنے فن کا جوہر دکھا سکتے ہو۔" توقیر ایک ایک چیز دکھا رہا تھا اور سمجھا رہا تھا۔ پھر نیچے آکر اپنے تمام اسٹاف سے راحیل کا تعارف کرایا
اس کے بعد دونوں کار کے قریب آئے۔

"اب چلیں ——— کار میں بیٹھیں۔" توقیر نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟"

"کیا میرا چھوٹا سا آشیانہ نہیں دیکھو گے جہاں میں اور میری بیوی رہتی ہے۔"

"ارے! تم نے شادی بھی کر لی ——— مگر کب اور کہاں؟ اتنی دیر سے تمہارے ساتھ ہوں۔ تم نے بتایا تک نہیں"

"میرے یار۔ کام کے پریشر اور تمہارے ملنے کی خوشی میں بھول گیا تھا۔ اب تو اس بھول کی تلافی کر دو"

کار اب ماڈل ٹاؤن کی طرف رواں دواں تھی۔ یہ کالونی نئی نئی بنی تھی۔ بڑی چوڑی ملائم سڑکیں، تارکول کی چکنی سڑکیں، شاپنگ سنٹر ——— توقیر کی کار ایک نئی طرز کی شاندار عمارت کے پورٹیکو میں جا کر رک

وہ راحیل کو اپنے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ عین اسی وقت ایک حسن و جمال کا پیکر، ریشمی لباس
ڈرائنگ روم کے دوسرے دروازے سے نمودار ہوئی۔ راحیل نے کبھی ان آنکھوں میں ستاروں کی چمک دیکھی
دونوں اگرچہ حیرت و استعجاب کے عالم میں چپ تھے۔ مگر آنکھیں زبان بن گئی تھیں۔
آؤ آؤ آرزو۔ یہ راحیل ہے۔ ہمارے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھا کرتا تھا۔ کیا تم بھول گئیں؟"
تعارف کرانے کے انداز میں کہا۔
انہیں کوئی بھول سکتا ہے!" آرزو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جیسے غنچے چٹخ گئے ہوں۔
بل۔ یہ صرف میری آرزو ہی نہیں بلکہ اب میری شریک حیات بھی ہے۔"
آرزو سراپا رنگ و بو اور پیکر حسن و نطافت ہی ان دونوں کے سامنے صوفے پر آکر بیٹھ گئی،

عطر بیز خوشبو
گلاب کے پھول
دنگیے سے آنے
جھونکے
رسالے تھے
کی غیر مبہم
ناکام محبت
اٹھی تھی۔
وائے کبھی ملاؤگی
رہوگی" تو تیر
تو ڑی۔
دیکھتے ہوئے وہ
باورچی خانے
ہوئے اس کی
لیکنڈ ہی تھی۔
وہ باغ میں

س سے
تا تھی۔
کے
کے
پر تیز
تھوں
نا میں
اچک
چلے
بیٹھی
تسی
ی"
۔
تھی۔
ے جاتے
اٹھا ان
بدل

بھڑک اٹھے تھے۔ آج اس کے مقدر نے پلٹا کھایا تھا۔ ایک سرور سا اس کے احساس کو جگانے لگا تھا
جگنو طوفان میں گھر جائے۔
بظاہر وہ تو تیرے محو گفتگو تھا۔ مگر نہ جانے کیوں اس کا دل اداس ہو گیا تھا۔ خیالات بھٹک
جذبات ابھر آئے تھے۔ پیار کا جھمرا دل پڑا تھا۔
کچھ دیر بعد وہ چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی آئی۔ اس کی نظریں نیچی تھیں جیسے ندامتوں میں جھکی
۔ اس کے قدموں کی چاپ سے راحیل کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اس کے دل میں یادوں کی
محسوس ہوئی۔ وہ اپنی مخروطی انگلیوں سے چائے بنا کر دینے لگی۔ پھر گفتگو کا سلسلہ الیاودراز

گھڑی کی سوئی کس رفتار سے بھاگی، کسی کو پتا ہی نہ چلا۔ آہستہ آہستہ حجاب اور ندامت کا پردہ اٹھ چکا تھا۔ آرزو مسرت و شادمانی سے بھرپور تھی مگر دوبارہ اس کی آنکھوں میں دیے سے روشن ہو گئے تھے اور اس کے ہونٹوں کی کلیاں کھل اٹھی تھیں مگر راحیل نے اس کی مست آنکھوں کو سراہا نہیں۔ توقیر نے آرزو کو سب کچھ بتادیا کہ کل سے راحیل اس کے اسٹوڈیو کا چارج سنبھال رہا ہے۔
اچانک راحیل کی نظر گھڑی پر گئی تو وہ چونک پڑا۔

"ارے باپ رے۔ کافی رات ہو گئی۔ اب مجھے سو لینا چاہئے۔" اس نے اجازت چاہی۔

"رات ہو گئی تو کیا ہوا، یہیں سو جاؤ۔ صبح ہم دونوں اکٹھے آفس چلیں گے۔" توقیر نے تجویز پیش کی۔ "رات کا کھانا بھی ساتھ کھائیں گے۔"

"نہیں یار۔ گھر جانا ضروری ہے۔ کچھ کام بھی ہے۔"

"چلو میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔ اتنی رات گئے کوئی سواری ملنی مشکل ہے۔"

"میں آٹو رکشا پکڑ لوں گا۔"

"بہت تکلف کرتے ہو۔" توقیر نے اس کی ایک نہ سنی اور بازو سے پکڑ کر کار میں لا بٹھایا۔
آرزو انہیں چھوڑنے برآمدے تک آئی۔ اس کے پیرہن سے ایسی خوشبو نکل رہی تھی کہ دور تک فضا معطر ہو گئی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں ایسی دلکشی تھی جیسے پھولوں پر چاندنی سوئی ہوئی ہو۔
کار تیزی کے ساتھ گیٹ سے نکل گئی۔

آسمان کا نیلا رنگ بڑا دلکش تھا۔ افق کی جیسی روشنی سے جھلک رہی تھی۔ راحیل ائرکنڈیشنڈ ہال میں بیٹھا، ایک کمپنی کی پبلسٹی کے لئے ڈیزائن بنا رہا تھا۔ اچانک ایک آہٹ سی ہوئی۔ اسے کوئی اپنی طرف آتا ہوا محسوس ہوا۔ ایک خوشبو اس کے دماغ سے ٹکرائی۔ آرزو اس پر جھکی بڑے غور سے اس کے ڈیزائن دیکھ رہی تھی۔ اس کے شانے پر پھولوں کی طرح نرم اور حسین زلفیں لہرا رہی تھیں۔ وہ مسکرائی تو آرزو کے لب تبسم کی بجلیاں گرا رہے تھے۔

"آرزو۔ اپنی زلفیں میرے شانے پر کیوں بکھیر رہی ہو؟ تمہارے ہونٹوں پر یہ تبسم کی لکیر رہ رہ کے میرے دل پر چرکے لگاتی ہے۔" وہ مسکرایا۔

"یہ زلف صرف بکھرنے کے لئے نہیں بلکہ بکھری یادوں کو سمیٹنے کے لئے پھیلی ہے۔" وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ شعلہ، بجلی اور جلوے کا طوفان بنی آئی تھی۔

"کہاں اپنی زلفوں کی کچھ خبر نہیں۔ ان کالی ناگنوں نے میری زندگی کو ڈس لیا تھا۔ کبھی ان زلفوں کی قید گوارا تھی، اب نہیں۔" راحیل کے لہجے میں شکایت تھی۔

"آؤ ان کالی ناگنوں سے لپٹ کر جدائی کی سب کلفتیں دور کر لو۔" یہ کہہ کر اس نے جو اپنی زلفیں جھٹکیں تو دل پر گھٹا سی لہرا گئی۔

"مجھے کہنے دو کہ پہلے میں تمہارے گداز بدن، نیم باز آنکھوں اور گھنیری زلفوں کے سائے میں جی لیتا تھا، مگر اب ان کے سائے نہ چھیڑو، کیونکہ وقت ساز گار نہیں۔" اس کا جواب مایوس کن تھا۔

مے ہوئے نقوش چمکانے آئی ہوں۔ وہ مخمور آنکھیں اور کاکل پیچاں بیگانہ ہو گئے تھے مگر میرا دل تو بیگانہ نہ تھا۔"
ن جیسی مستی میں لہراتی ہوئی بولی۔
"تمہارے حسن کی روشنی اب بھی میرے دل میں ہے مگر قطع تعلق میں بھی کتنا حسن ہے۔"
"ت صرف حسن وجمال کی پیکر ہی نہیں، وہ زندگی ساز سے نکلی ہوئی وہ لَے ہے، جس سے ہمیشہ محبت کا نغمہ بکھرتا
اور پھر تم ایک فنکار ہو اور میں تمہارے فن کا دل ہوں" اس کی رگوں میں پیار کی گنگناہٹ اور
رمحبت کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ ایک ندی جو موج طوفان سے آگے بڑھنا چاہتی تھی۔
"گذشتہ کی وہ حسین تصویر مجھے کیوں دکھانے آئی ہو۔ میں اس تصویر پر اپنے دل کا پھول ارپن کر چکا
... اب تو محبت ترک کر کے بیٹھنا دل کے ٹکڑے بھی جوڑ نے ہیں۔" راحیل نے سنجیدگی سے کہا "میں فنکار
مجھے فطرت کے نظاروں سے الفت ہو گئی ہے۔"
"تمہاری قربت نے میرے دل میں پھر سے پیار کی شمع جلادی ہے۔ میں زندگی کے بند دریچوں سے گزر کر آئی
حقائق سے ہم آغوش ہونے کے لئے۔" وہ کھلکھلا کر ایسی ہنسی کہ حیا کی شمع جھلملا کر رہ گئی۔
"ب میں تمہیں پا نہیں سکا تو چمن سے ایک کی طرح نکل گیا اور اب تو دل میں سوز دبا رکھا ہے۔" وہ
ن کی الجھن سے نکلنا چاہتا تھا۔
"ے ساتھی کو تاریکیوں میں رہنے دو۔ میرا ماضی میری رسوائی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مجھے میری بے وفائی کے
نہ سناؤ۔" اس نے ماضی کی کتاب سے سوکھا ہوا پھول نکال کر حال کا آئینہ دکھانا چاہا۔
"منے تو پھول تمہارے جوڑے کے لئے چنا تھا، اب تو اس کا دھندلا سا تصور بھی میرے ذہن میں نہیں۔
ن بے وفائی کا کوئی غم نہیں۔ اب مایوسی میری فطرت بن چکی ہے۔ کسی تحریک پر دوبارہ میری قیمت
نہیں سکتی۔ پھر تمہارا ہو کر بھی تمہارا ہو نہیں سکتا۔" اس نے بھڑکتی ہوئی شمع کو مصلحت کے فانوس
یانے کی کوشش کی۔
"ے اعصاب محبت کی آگ سے جل رہے ہیں۔ میرے اس طرح کے ٹھکراؤ راحیل۔" اس کی آنکھوں پر آنسو
کر لرز اٹھا۔ اس کی جوانی سلگ رہی تھی اور دل تڑپ رہا تھا۔
"ہی اور کے دامن کا پھول ہو۔ میری راتیں تمہاری خوشبو سے نہیں بس سکتی۔"
"اس عہد کا مفہوم تصور کرتی ہوں۔ جب میرے دل میں تمہاری محبت کا پہلا کنول کھلا تھا۔" اس کے سینے
فان کا تلاطم اور آنکھوں میں بجلی کے شرارے دوڑ رہے تھے۔
"س طرح تمہیں شریک محبت کروں جبکہ اپنی زندگی کا بار اٹھا نہیں سکتا۔" وہ حالات کو وقت کے ترازو پر
رہا تھا۔
"ے دل میں تمہاری محبت کا طوفان اٹھا ہوا ہے۔ پتا نہیں یہ لہریں مجھے بہا کر کہاں لے جائیں۔" اس کی
رہا گڑگڑائی۔ اس کی آنکھوں میں اس کی لو تھرائی جیسے دیا تیز ہوا کی زد پر جلتا ہو۔
"ان حسین خوابوں کی تعبیر سے ڈرتا ہوں، اگر پھر مجھے تمہاری باہوں کا سہارا نہ ملے۔"
"بالکل اپنے سینے میں سمیٹ کر باغ و بہار بنا ڈالو۔" اس نے اٹھ کر اس کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں اور
سک سسک کر ایسا رونے لگی جیسے اس کی آنکھوں میں برسات کی جھڑی لگی ہو۔

میں اُسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ آرزو فوراً الگ ہٹ کر کھڑی ہو گئی اور اپنے رو
گلابی آنچلوں کا عطر جذب کرنے لگی۔ پہلی منزل سے کاریگر آیا تھا۔ کام کی کیفیت معلوم کرنے
اُسے اپنا ڈیزائن دکھا کر تفصیل بتانے لگا۔ جب وہ کاریگر سے فارغ ہو کر پلٹا تو دیکھا کہ آرزو اس کی
اور دل شکستگی سے واپس ہو کر جا چکی تھی۔

راحیل عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اُس نے زندگی کا سفر جہاں سے شروع کیا تھا۔ اب
موڑ پر آ گیا تھا۔ اُس کی دنیا میں پیار کے اجالے چمکنا چاہتے تھے۔ وہ محبت کی لاش کندھے پر اٹھائے ہو
کہ عشق کے دریچوں سے مسرتوں نے جھانکنا شروع کیا۔ ویسے اُس نے اپنے جینے کی راہ اس طرح
کر لی تھی جیسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ وہ دوستی اور محبوبہ کے دوراہے پر کھڑا تھا۔ اُس نے یہی د
کہ بیگانۂ الفت ہو کر اپنے سینے میں جذبۂ نفرت پیدا کر دو۔
مگر آرزو ہمیشہ اس کی تنہائی میں ہوا کے جھونکے کی طرح آجاتی اور اُس کے سوئے ہوئے جذ
بیدار کرنے کی کوشش کرتی۔ اُس کا دل جس میں محبت کا نور تاباں تھا۔ اُس کا پیار پھر سے انگڑائی لے کر جا
اٹھا۔ اُس کے رگ و پے میں راحیل سمایا ہوا تھا۔ اُس کے دل کے تاریک گوشے میں امید کی چمک پیدا
ہوئی۔ وہ طوفان کیا ــــــ سمندر کا ہیجان بن کر آئی تھی۔ محبت کی کیفیت آ گئیں تنہائی میں ــــــ
جذبات کے دھارے میں بہہ کر اُس کے سازِ دل کے تار چھیڑنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے دل میں سوئی ہوئی تمنا کو سہا
ملا۔ راحیل نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ رنگ و بو کا یہ جہنم اُسے جلا کر رکھ دے گا۔
ایک دن چھت پر بوندا باندی کا جلترنگ بج رہا تھا۔ برکھا بھی وجد میں آ کر چھما چھم برس رہی تھی۔ کہ خلوت
نصیب بھاگ اُٹھے۔ خوشبوؤں سے کمرہ مہک اٹھا جیسے کسی کے ہاتھوں سے گر کر عطر دان الٹ جائے۔ با
میں بھیگی ہوئی ساڑھی میں ملبوس اس کا سڈول جسم کا ایک ایک عضو چھلک رہا تھا۔ اس کے
جسم سے حسن و جوانی کی شراب چھلک رہی تھی اور آنکھوں کے ڈورے جیسے گلابی کٹورے چھلک جائیں
کے ارمانوں میں موج سا آنے لگا۔ اُس کے تخیل میں ایک فنکار کا ذہن جاگ اٹھا رکھا۔ اس کے خوابوں کا
اُس کے سامنے کھڑی تھی۔
"آؤ آؤ آرزو۔ تمہاری آمد سے روئے فطرت پر تابندگی چھا گئی ہے۔"
"اگر تم میں ہمت ہے تو میرے لبوں کا رس نچوڑ لو۔ میرے عارضوں کا پھول توڑ لو۔" اُس کے پہلو میں دل مچلنے
اس پر عجیب سی وارفتگی کی کیفیت طاری تھی۔
"تمہارے لب و رخسار کے یہ دہکتے انگارے۔ میرے شکستہ دل کا مداوا تو نہیں۔"
"مجھے اپنے دل پر قابو نہ رہا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ تم سے پیار کروں یا نہ کروں۔" سرشار جوانی نے جذبات۔
مجبور ہو کر حجاب کا پردہ اٹھا دیا تھا۔
"میرا دل تمہاری بے وفائی سے مزا چکھ چکا ہے۔ اب میرے سینے میں دھڑکن کہاں سے پیدا ہو؟"
"یوں کہو کہ تم اپنے دل میں محبت کا انتقام لئے بیٹھے ہو، اس لئے مجھے ٹھکرا رہے ہو۔" جیاس کی آواز میں
ڈوبی ہوئی ایک ساز تھی۔

"محبت اپنی جگہ پر مگر عقل بھی کوئی چیز ہے۔ اب تم کسی کی امانت بن چکی ہو، اور اگر تم اسی طرح جذبات کے دھارے میں بہتی رہیں تو ایک دن ہم دونوں رسوا ہو جائیں گے۔"

"عشق اور رسوائی کوئی نئی چیز نہیں۔ عشق ازل سے زمانے میں بدنام ہے۔"

"معاشرہ اپنے ہاتھوں میں اخلاق کا قانون لئے بیٹھا ہے۔"

"بات بات پر قانون، اخلاق اور ضابطے کی باتیں مت کرو۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ تمہارے دل کے نرم گوشے میں میرے لئے جگہ ہے یا نہیں؟"

"میرے دل میں تمہاری محبت اس شاخ کی طرح ہے جو سوکھ جائے تو اسے کاٹ دیا جاتا ہے۔" راحیل نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میری نظروں میں تمہاری قدر و منزلت ہے۔ میں تم سے بدظن نہیں ہوں۔ در اصل ہمارے درمیان سماج اور دوستی کی دیوار آ کھڑی ہوئی ہے۔ اب ہماری راہیں الگ الگ ہیں۔ تم قمر کے اعتماد کو بھی دھوکا نہیں دے سکتیں۔"

"سنا تھا کہ فنکار کا دل بہت بڑا ہوتا ہے اور وہ محبت کا علاج نفرت سے نہیں بلکہ پیار کے مرہم سے کرتا ہے۔" وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔

"جہاں تک میرے فنکار ہونے کا تعلق ہے، تمہاری محبت کو وہ مرتبہ نہیں دے سکتا، ورنہ میں بھی شاہجہاں کی طرح تاج محل بنا دیتا۔"

"میرے جذبات کی چنگاری کو ہوا نہ دو۔ ایک بار پہلے بھی تم نے یونیورسٹی میں وعدہ کیا تھا کہ میرے لئے ایک ایسا بت تراشو گے کہ اندھی بھی دیکھے تو اسے اپنی تمنا کا احساس ہو۔ تم تو سنگ تراشی کے فن کے ماہر ہو۔ وہ بھولا ہوا وعدہ شاید تمہیں یاد ہو۔ پھر اب ٹوٹے ہوئے دل کی صدا کیسے سن سکتے ہو؟"

"آرزو۔ میں سنگ تراشی کو اپنا پیشہ بنا کر اپنے فن کی توہین کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بت تراشی میں اپنے [illegible] اور سکون دل کے لئے کرتا ہوں۔ اور تم سے کیا ہوا وعدہ اب تک نہیں بھولا ہوں۔ آنے والا وقت بتائے گا میری بات میں کتنی صداقت ہے۔" اس نے متانت اور عزم کے ساتھ کہا۔

"پتھروں کا کام کرتے کرتے تم کتنے سنگدل ہو گئے ہو؟"

"کچھ بھی کہو۔ تمہاری چاہت کی گرمی سے یہ پتھر کبھی نہیں پگھلے گا۔ انسان خواہش کا غلام ہوتا ہے۔" راحیل نے کہا۔ "اور پھر زندگی تاش کے پتوں کی طرح ہے۔ تم اور قمر صاحب بی بی ہو اور میری حیثیت غلام کی ہے۔ ترپ کے تمام پتے تمہارے شوہر کے ہاتھ میں چلے گئے ہیں، اس لئے میں پیار کی بازی ہار چکا ہوں۔"

"تم تو پیار کی قربانی دے چکے ——— اگر اپنے پیار کا ایک نذرانہ اپنی محبت کی ایک یادگار [illegible] دیتے تو میری زندگی کا انمول تحفہ ہوتا۔" اس کے سینے میں پیار کا سمندر موجزن تھا۔

"آرزو۔ میں اپنے پیار کا ایک ایسا نذرانہ تمہیں پیش کروں گا کہ ایک فنکار اپنا تصور، مصور اپنا تخیل اور انسان اپنا ہوش کھو بیٹھے گا۔"

"آرزو۔ میں اپنے پیار کا ایک ایسا نذرانہ تمہیں پیش کروں گا کہ ایک فنکار اپنا تصور، مصور اپنا تخیل اور انسان اپنا ہوش کھو بیٹھے گا۔"

ماحول میں غم کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ آرزو نے اپنے لئے جو خواب سجایا تھا۔ افسوس کہ اس خواب کی تعبیر غلط نکلی۔ آرزو نے اشک بار آنکھوں لڑکھڑاتے ہوئے ہاتھوں سے پانی سے بھیگا ہوا ایک لفافہ راحیل کے حوالے کیا اور تھکے تھکے قدموں سے واپس لوٹ گئی۔ راحیل نے لفافہ کھولا تو اس میں آرزو کی سالگرہ کا کارڈ تھا جو آئندہ ہفتے ہونے والی تھی۔

راحیل کی مصروفیت دن دن بڑھتی جا رہی تھی۔ کام کا انبار تھا جو اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ ادھر پانچ چھ دنوں سے آرزو کی آمد بھی بند تھی۔ راحیل کو آغاز میں ہی انجام کی معلوم تھا۔ کہ جانے کے بعد رشتے سے آجا لا نہ پھوٹے گا۔ اس نے اپنے ہی ہاتھوں محبت کا گلا گھونٹ دینا مناسب سمجھا۔ اس نے کسی ضرورت کے تحت توقیر کو فون کیا مگر وہ آفس میں موجود نہ تھا۔ اچانک اس نے کسی خیال کے تحت اس کی رہائش گاہ پر فون کیا۔

"کون؟" کال ریسیو کرنے والی آرزو تھی۔

"راحیل"

"اللہ اللہ۔ آج میرے نصیب جاگے۔" آرزو کی رس بھری آواز میں مسرت کی آمیزش تھی۔

"دراصل مجھے توقیر سے کچھ کام تھا۔ وہ اپنے آفس میں بھی نہیں۔"

"گویا تمہیں صرف توقیر سے ہی کام ہے۔ تمہاری نظروں میں میری کوئی وقعت نہیں۔"

"آرزو، میری حیثیت بکھرے ہوئے پھول کی سی کر رہی ہے۔ بہتر ہو گا کہ تم اپنا گلشن اپنے ہی گل سے سجاؤ۔"

"تم مجھے جینے کی راہ سکھا رہے ہو، اگر گھٹ گھٹ کے مرنا بھی کہو گے تو ہم مر لیں گے۔" اس کی آواز میں حزن و ملال شامل تھا۔

"پھر بھی میری تقدیر سے جو خاک اڑے گی تو یہی کہے گی کہ مجھے تم سے پیار ہے۔"

"تمہارے غم کا دکھ میرے لئے بھاری ہے، مگر توقیر کے اعتماد کو میں مجروح نہیں کر سکتا۔"

"توقیر تو اب ہماری تمہاری محبت کو شک کی نظروں سے دیکھنے لگا ہے۔ کئی بار اس سلسلے میں تلخ کلامی بھی ہو چکی ہے جس کا مجھے ڈر تھا، پھر یہ شک کی دیوار گرا کر رہوں گا۔ آخر وہ ہے کہاں؟"

"معلوم نہیں۔ اکثر رات گئے دیر سے گھر واپس آتے ہیں۔ خاموش لب، شکایتوں کے فسانے لئے۔ اب میں بیچ پر بھی نہیں آتی۔" آرزو نے بتایا۔

"تم دونوں کی یہ غلط فہمی میرے لئے سوہان روح ہے۔ میں تم دونوں کے راستے کا پتھر نہیں بننا چاہتا۔"

"خیر یہ باتیں پھر ہوں گی۔ کل کی بات یاد ہے نا؟" آرزو نے یاد دہانی کرانا چاہی۔

"بالکل۔ کل تمہاری سالگرہ ہے۔ بھلا اس دن کو میں کیسے بھول سکتا ہوں۔"

"میری نظریں تمہاری آمد کی منتظر رہیں گی۔ تمہارے بغیر میری سالگرہ بالکل پھیکی رہے گی۔"

"اچھا جب توقیر آئے تو مجھے فون کرنے کے لئے کہنا۔ بہت سی کاروباری باتیں کرنا ہیں۔ ان کے مشورہ بغیر کام پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔" یہ کہہ کر راحیل نے فون رکھ دیا۔

اس کے ذہن میں ایک ذہنی کھچاؤ سا لگا تھا۔ اس کے دل کا چین تو اجڑا ہوا تھا، کچھ اور بھی اجڑ جاتا۔

ڈکیا فرق پڑتا ہے۔ وہ توقیر کی زندگی میں زہر گھولنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے ایک اٹل فیصلہ کیا اور اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔

سالگرہ کی شام اپنے دامن میں خوشیوں کا پیغام لئے آئی تھی۔ ڈرائننگ روم پھولوں سے سجایا جا رہا تھا۔ انواع و اقسام کے کھانے پک رہے تھے۔ آرزو تتلی کی طرح سارے گھر میں بکھر رہی تھی۔ توقیر بھی بجھے دل میں ہاتھ بٹا رہا تھا۔ مہمانوں کی آمد میں ابھی دیر تھی۔ اُسی وقت چند لوگ چادر سے ڈھکی ہوئی کوئی چیز کاندھے پر لئے داخل ہوئے جیسے کوئی تابوت اٹھائے ہوئے ہوں۔ ہال کے ایک طرف ایستادہ کر کے اور توقیر کے ہاتھ میں ایک خط دے کر چلے گئے۔ آرزو بھی اُس کے قریب کھڑی تھی۔ اُس نے خط پڑھنا شروع کیا جسے راحیل نے لکھا تھا :-

" پیارے توقیر !

میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ وقت کا دھارا مجھے کہاں سے کہاں لے جائے گا۔ تم کا چمکتا ہوا سورج ہو اور تاریکی میرا مقدر ہے۔ اب ہمارے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہو گئی ہے جسے پاٹنا بہت ہی مشکل ہے۔ میں تمہاری زندگی میں کانٹے بونا نہیں چاہتا بلکہ تمہارے گلشن کو ہمیشہ پھولوں سے شاداب دیکھنا چاہتا ہوں۔

یہ حقیقت ہے کہ یونیورسٹی میں میری اور آرزو کی محبت پروان چڑھی تھی مگر وقت کے ہاتھوں نے ہمیں جدا کر دیا۔ دوبارہ جب تمہاری بیوی کے روپ میں ملی تو میری نظروں میں اُس کی عزت اور احترام اور بھی بڑھ گیا۔ محبت بہت سے کی جان ہو جسم سے ہیں۔ اس لئے تمہاری بیوی کا جسم گنگا جل کی طرح پوتر ہے۔ اس کی پاکدامنی کی حرم اور رسیتا کے ناموس کی قسمیں کھائی جا سکتی ہیں۔

میں تم لوگوں سے بہت دور جا رہا ہوں، اتنی دور کہ دوبارہ نہ پا سکو تاکہ پھر غلط فہمی کی دیوار کھڑی نہ ہو سکے۔ جاتے وقت ایک سنگتراش کی زندگی کا پہلا اور آخری تحفہ آرزو کی سالگرہ کے لئے حاضر خدمت ہے۔"

راحیل کی اتنی بڑی قربانی پر توقیر کا دل رو پڑا۔ آرزو اُس کے ہاتھ سے خط لے کر پڑھتی جا رہی تھی اور آنسوؤں کے قطرے اُس کے رخسار پر بہتے جا رہے تھے۔ خط کے اختتام پر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ساون بھادوں جاری تھا۔

توقیر آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا راحیل کے نذرانۂ دل کی طرف بڑھا اور اُس پر سے چادر ہٹا دی۔ سنگ مرمر کا وہ لازوال نمونہ آرزو کے بت کی صورت میں فطرت کی صناعی کا زندہ شاہکار بنا کھڑا تھا۔ واقعی اُس نے سنگتراشی کا ایسا جوہر دکھایا تھا کہ اگر آذر بھی دیکھ لیتا تو اس کے فن کو خراج [illegible] کا ایک ایک عضو چھلک رہا تھا۔ سنگ [illegible] آرزو میں جان پڑ گئی تھی۔ نقل اصل سے [illegible] ایک کونے میں تھا "سنگ تراش کا دل"

توقیر اور آرزو فوراً کار نکال کر راحیل کے گھر کی طرف بھاگے، مگر وہاں دروازے پر بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ پوچھ گچھ پر لوگوں نے بتایا کہ وہ ہمیشہ کے لئے جا چکا ہے۔ کہاں؟ یہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ توقیر کی بدگمانی کے بادل چھٹ گئے تھے۔ شک کی مضبوط چٹان کو راحیل نے اپنے تیشے سے پاش پاش کر دیا تھا۔ اتنا بڑا فنکار گمنامی کے اندھیروں میں بھٹکنے لگا تھا۔ اس میں بھی ایک راز تھا۔ توقیر نے اس کی تلاش میں اخباروں میں اشتہار بھی دیا مگر وہ اس سے بہت دور دیوانوں کی طرح نگری نگری، شہر شہر پھر رہا تھا۔

ادھر توقیر نے بین الاقوامی نمائش میں راحیل کی سنگ تراشی کا مجسمہ مقابلے کے لئے رکھوا دیا۔ جسے ججوں نے اس سال کی بہترین تخلیق قرار دیا۔ اسی سلسلے میں مباحثے اور مذاکرے کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں سنگ تراش کو خراج عقیدت پیش کیا جانے والا تھا۔

راحیل غم اور مایوسی کے سمندر میں غرق سڑک پار کر رہا تھا کہ اچانک کار کے مسلسل ہارن کے ساتھ پہیئے چرچرانے کی آواز آئی اور کار اس کی لاش کو کچلتی ہوئی چلی گئی۔ لوگ اس حادثے پر چاروں طرف سے دوڑ پڑے۔ اس کے گرد لوگ گھیرا ڈالے افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ انہیں کیا معلوم کہ یہی وہ گمنام سنگ تراش تھا جس کے فن کو سراہنے کے لئے جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔

آہ راحیل گمنامی کی موت مر چکا تھا مگر اس کے فن کا شاہکار مجسمہ زندہ جاوید ہو کر شہرت کی بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ اگرچہ وہ اب مردہ تھا مگر اس کا دل مجسمے کے سینے میں دھڑک رہا تھا۔

مشرف عالم ذوقی

میرے اندر کا عفریت

۱

میرے اندر ایک عفریت بیٹھا ہے۔ جو لمحہ لمحہ مجھے ڈستا رہتا ہے۔ اور اپنی بڑی بڑی زہریلی آتشیں
[illegible] سے چیخیں نکالتے خشمگیں نظروں سے مجھے تکا کرتا ہے۔ جیسے کہہ رہا ہو...... دیکھو! اپنے خول سے باہر نکلو —
— بھلا اپنے خول سے باہر کیسے نکل سکتا ہوں میں — ! میں — جو ایک بوڑھا مزدور ہوں۔ میں بچپن
[illegible] کام کرتا چلا آ رہا ہوں۔ اینٹیں اٹھاتا۔ گھروندے بناتا۔ ڈھلیا کرتا۔ جوانی کے انمول لمحے۔ اسی بے
[illegible] سور میں گارے۔ اپنے توانا کاندھے...... ہی نہتے، گردا، چھینی اور مٹی سیمنٹ کی بڑی بڑی بوریاں اٹھاتے ہوئے
[illegible]ے..... کدال اور پھاوڑا کتنی ہی بار زمین کی نیو کھودتے ہوئے میرے پیروں سے گوشتوں کے ٹھوکتے نکال
[illegible]ے اور ہر بار ایک نئی گرمی، کھردری اور سخت کھال وہاں دوبارہ پیدا ہو جاتی — کدال اور پھاوڑے
کا یہ بے ہنگم کھیل پھر بھی جاری رہا —
اور پھر صدیوں یہیں چلتا رہا —

مگر ہر دور میں — میں اپنے ذہن اور اپنے اندر چھپے عفریت کے بیچ ایک عجیب و غریب ذہنی کشمکش سے
[illegible]ہوتا رہا — جب بھی چھینی اٹھاتے ہوئے — یا پھاوڑا چلاتے ہوئے میں خود کو زخمی کر لیتا —
تو پیروں سے بہتے ہوئے خون کے قطروں پر اپنی اوچھی حقارت آمیز نظریں ڈالتا ہوا مالک ایک موٹی گالی
کے ساتھ میرے کھردرے، پھیلے ہوئے ہاتھوں پر میری محنت سے کم پیسہ رکھ کر کہتا..... جا بے.....
بھٹ.......

جب — اسی وقت — میرے اندر کا عفریت اپنی خوفناکی کی حد تک بڑھے ہوئے نوکیلے ناخنوں کو
[illegible] گوشت پوست کے نرم لوتھڑوں میں گھسیڑ دیتا — اندر پھر ایک جنگ شروع ہو جاتی — اور پھر —
[illegible] پھیلی ہوئی بند مٹھیوں میں رات کے کھانے کی باسی مہک لئے ہوئے کسی ہارنے ہوئے جواری کی طرح
[illegible]ش دبے افسردہ قدموں سے گھر لوٹ پڑتا۔

سارے راستے میرے اندر کا عفریت میرے ہارے ہوئے شکست خوردہ شخص پر تھو تھو کرتا رہتا
— مجھ پر طرح طرح کی پھبتیوں سے کوستا رہا — اور میں — کسی مرے ہوئے جانور کی طرح پسپا ہو کر
اپنے لٹے پٹے شکستہ وجود کی لاش لئے، گھونگے کی طرح اپنے قدم تیز کر دیتا —
رات کے بستر پر وہ عفریت میرے ساتھ ہوتا — مجھے جھنجھوڑ دیتا — میری غیرت کو للکارتا —
— میری کمزوریاں... ہلکے سے کھلی ہوئی خون آلودہ مٹھی زوروں سے بند ہو جاتی۔ اینٹھتی
[illegible] سرد ہواؤں کے بیچ برداشت کرتے ہوئے مجبوروں کے زور سے کھل جاتی —

اور وہ عفریت ساری رات کنکریلے، ناہموار بستر پر لیٹا لیٹا مجھے اپنے زہریلی جیبھ چبھوتا رہتا اور ہر رات میں اپنے شکن زدہ وجود کی لاش کی بے حرمتی کرتا ہوا نظر آتا ــــــ

سوچتا ہوں تو لگتا ہے ــــــ میرے اندر وہ عفریت میرے بچپن سے ہی لگا بیٹھا ہے ــــ اس وقت سے ہی ہر وقت ــــ ہمیشہ میرے ساتھ رہتا ہے ــــ میرے ساتھ ساتھ اٹھتا ــــ میرے ساتھ ہی پھاوڑا اور کدالیں چلاتا ہے ــــ میرے ساتھ ساتھ گیڑا اور ڈھیلتی، بھری چھالی اٹھا میرے ساتھ ساتھ خود کو بھی زخمی کرتا ہے ــــ اور پھر زخمی ہو کر بھوکے خنجر کی طرح میری نس نس پر اپنے زہر جیبھوں کی خوب ابھار دیتا ہے ــ

بچپن میں، میں اپنے باپ کے ساتھ کام پر جایا کرتا تھا۔ اور جب جب باپ کے پسینے پسینے ہوئے ٹوٹے بکھرے وجود کو اپنی "پھٹی پھٹی" حیران سی آنکھوں کی سیلاب زدہ پتلیوں سے گھورا کرتا تو ایسا احساس ہوتا کہ کل یہی کام میرے ذمے بھی سونپا جائے گا ــــ باپ ہی کی طرح روز روز مالک کی طوفانی تجاویں کے بیچ تلے ماں میرا وجود بھی کسی کونے سے گر گئے۔ خون آلودہ بچے کی طرح چھٹ پٹاتا، سسکیاں لیتا نظر آئے گا.... باپ ہی کی طرح ہر لمحہ ایک جنگ کھیلنی پڑے گی...... ایک بھیانک خونی جنگ۔

اور پھر میں بیتی یادوں کی کھرنڈ چھیلنے لگتا ــــــ

مجھے یاد آتا میری ہی طرح جب میرا باپ اپنے زخمی کاندھے پر کدالیں یا پھاوڑا اٹھائے، قدرے جھکا ہوا، ہر بل جالوں سے چلتا ہوا جب گھر آتا تو دن بھر کی تھکی ہاری میا دیر تک باپو کے سخت کھردرے ہاتھوں کی ضرب برداشت کرتی رہتی ــــ

چیخنے چلانے اور ہار مان جانے کے بعد

جب باپ تھک جاتا اور ننگے پلنگ کی نیواڑ پر گر جاتا تو ممتا —— کچھ بول کر ہمیشہ کی طرح بڑے آرام سے وہ سر پھیر دیتا ہوا باسی کھانا باپ کے سامنے پروس دیتی ——

باپ کھاتا —— ممتا اس درمیان دیر تک پنکھا جھلتی رہتی ——

مجھے لگتا —— شاید اس میں نہ ممتا کا قصور ہے نہ باپ کا۔ اپنے اندر کے ہارے ہوئے شکست خوردہ آدمی کو بھی تو جوش دلانا پڑتا ہے —— باپ یہی کرتا تھا۔ گھر آ کر اپنے مضبوط اور توانا ہونے کا ناکام احساس ماں کے سامنے پیش کرتا ——

ایک سوال اسی وقت سے برابر مجھے پریشان کرتا چلا آ رہا ہے۔

باپ ایسی مادر گالیوں کی بوچھار کرتے ہوئے مالک کی طرف کیوں نہیں اچھالتا ....؟

باپ کمزور ہے ——

مجھے ایسا احساس ہوتا کہ باپ کے اندر کا آدمی کمزور ہے ——

باپ کے اندر کا آدمی صرف اسی وقت توانا بنتا ہے جب وہ چوٹ کھائے ہوئے جانور کی طرح تھکا ماندہ اپنے ماند میں واپس آتا ہے اور اپنے ہی طبقے کے کمزور جانوروں کی طرف غرا غرا کر اپنے اندر کا بھڑاس نکالا کرتا ہے ——

باپ ایسا ہی کمزور ہے ......

اور وہاں اُس نئے مکان میں کام کرنے والے اُس کے باپ جیسے سبھی کامگار اُس کے باپ جیسے ہی کمزور تھے —— سبھی تو سب بیٹھے ہیں مگر آواز کوئی بلند نہیں کرتا ——

آواز میں بلند کروں گا ——

میں اٹھاؤں گا ہاتھ ——

میرے چھوٹے چھوٹے ہاتھ تب غصے میں بھنچ جاتے —— نسیں اینٹھنے لگتیں —— حلق سوکھنے لگتا —— آنکھیں غصے کی شدت سے باہر کو اُبل آتیں ——

(آنگن کا کنواں اپنی سوکھی خشک سطح کو میری جانب دکھا کر مجھے منہ چڑھا رہا تھا۔)

مگر اس وقت مجھے اس کا احساس نہ تھا۔

پھر وقت گزرا اور ایک پھاوڑے کی جگہ دو پھاوڑے ذہن میں اتر آئے۔

باپ کے ساتھ ساتھ میں بھی کام پر جانے لگا —— اور پھر وہی روٹی روٹی، ہزاروں بار دہرائی ہوئی تاریخ ایک بار پھر خود کو دہرانے لگی ——

اس وقت میری مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں —— کدال اور پھاوڑا چلاتے چلاتے جب میں جلد ہی تھک جاتا اور کچھ دیر کے لئے کسی پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ جاتا —— تو آگے کا منظر بڑی سنسنی خیزی سے میرے سامنے عریاں ہو جاتا ——

سب اپنی اپنی صلیب اپنے کاندھوں پر لئے جھکے چلے جا رہے ہیں ——

ان میں یسوع مسیح بھی ہے —— عبدل بھی ہے —— رمیا بھی ہے —— گوبر بھی ہے ——

میرا باپ بھی ہے ـــــ
میں بھی ہوں ـــــ
میرا کاندھا زخمی ہے ـــــ جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے ـــــ نسیں اینٹھ رہی ہیں۔
تھکنے سے جسم کو سکون ملتا ہے ـــــ
مگر سکون کہاں ہے ـــــ ؟
مالک غصے میں آکر میرے چھلے ہوئے شکن زدہ چہرے پر ایک اور شکن پیدا کر دیتا ـــــ کام کر ـــــ
کام کر ....
آوازیں چہار سمت سے مجھے دبوچتیں ـــــ
میں آوازوں کے نرغے میں قید ہو جاتا ـــــ
پھاوڑا اٹھا لیتا ـــــ اور زمین دوبارہ خون نا خون ہونے لگتی ـــــ
اور پھر شام ہو جاتی ـــــ
اپنے اپنے چہروں پہ بے پناہ سلوٹیں لئے ہوئے کام گر اپنے گھر لوٹ پڑتے ـــــ میرا باپ بھی' میں بھی ـــــ گومیا، بیتوش، عبدل، رمیا ـــــ سب کے سب ـــــ میں سب کے چہروں کی طرف دیکھتا۔
سب کے چہرے خون میں سنے ہوئے ہوتے ـــــ سب کے چہروں پر لاتعداد کھردنچوں کے نشان ہوتے۔ سب کے چہرے ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ملتے ـــــ
میرے احساسات برف کی طرح یخ ہو جاتے
ـــــ میں سوچتا ہے ـــــ ان کو بتاؤں ـــــ ان سے کہوں ـــــ
رمیش چچا .... کھدیرن چچا .... امیا تائی ....
عبدل .... تم سبھی .... تم سبھوں نے کبھی اپنا چہرہ دیکھا ہے .... اپنے چہروں پر پڑی شکنوں اور سلوٹوں کو محسوس کیا ہے .... اپنے جسم پر پڑے ہوئے خون کے دھبوں کے عکس کو محسوس کیا ہے ؟
نہیں .... نہیں ـــــ
آوازوں کا ملا جلا شور دوبارہ بلند ہوتا ـــــ
اور اجنبی ـــــ مہیب قہقہوں کی زد میں ہوتا ـــــ
میرا لہو لہان جسم ـــــ
تم سب نی را سس ہو ـــــ !
ایک آواز میرے ارد گرد منڈلاتی ـــــ
تم سب روز ہی اپنے چہروں پر پڑی لاتعداد لکیروں کو دیکھتے ہو ـــــ
روز ہی اپنے خون کے دھبوں کے عکس محسوس

رتے ہو —
تمہارے پاس تو اپنے ہی چہرے ہیں، دیکھنے کے لئے —
اس کے باوجود تم دکھ نہیں کہتے —
تم سب تی راسسی ہو —
جو اپنے چہرے کا عکس ندی کے صاف شفاف چشمے میں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا — اور اپنے گرد و پیش سب کچھ بھول کر کوئی روز تک دم بخود وہاں کھڑا رہ گیا — اور آخر وہی جگہ اس کی موت کا سبب ثابت ہوئی —
تمہارا چہرہ بھی ایک ندی ہے —
جس میں سب کا عکس صاف نظر آرہا ہے۔ کھڑونچوں، شکنوں اور سلوٹوں سے بھرا ہوا عکس —
میرے اندر ایک عفریت ہوا ہوا ہوگا — اپنے جسم کو خوفناک کی حدوں تک کھیلاتا — لمبی ہی خوفناک سانسیں لیتا — اپنی بھنچی ہوئی مٹھیوں کو زوروں سے اینٹھتا — اور اپنی زہر آلود پھنکاریں میرے جسم سے نکال دیتا —
اور پھر میں لمحہ لمحہ بھنچی ہوئی لاتعداد مٹھیوں کو دیکھتا — کاندھے پر پھاوڑے اور کدال اٹھائے بے شمار لوگوں کے ہجوم کو دیکھتا — جو آناً فاناً غصے میں اس عفریت جیسا بھوت ہو کر ان نئے مکان پر ٹوٹ پڑے ہوں — مکان کی اینٹیں آندھی کی طرح بکھر رہی ہیں...... ہجوم غصے میں گل ہو رہا ہے — اور پھر — نیا بنتا ہوا وہ مکان ملبے کی صورت ڈھے ہوئے کھنڈر کی طرح زمین پر آ گیا ہے — مگر —
اب کچھ بھی نہیں تھا —
اور جب ایسا احساس ہوتا — تو بھنچی ہوئی مٹھیوں کا تناؤ ڈھیلا ہو جاتا —
مگر وہی خواب میرے اردگرد روز منڈلاتا رہتا۔
اور پھر وقت گزرا —
پھر کدال اکیلی رہ گئی — اور اکیلا رہ گیا میرا تپتا سلگتا ہوا خون آلودہ جسم —
اور وقفے وقفے جیب میں اپنی مردہ ساعتوں کے بیچ، اپنی زندہ مگر ٹوٹتی ہوئی ساعتوں کی تلاش میں گم ہوتا تو کچھ پل کے لئے حالات کے فرسودہ ورق دوبارہ پھڑپھڑا کر میرے سامنے نکل جاتے —
ایسا ہر صدی میں ہوتا رہا ہے —
کیا ایسا ہر صدی میں ہوتا رہے گا —؟
اور پھر ایسا محسوس ہوتا — جب میرے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ایک اور پھاوڑا زمین کے پیچھے رہ گیا۔ اُس وقت اُس کی وجود میری ہی طرح لیسا اور جگہ جگہ سے ادھڑا ادھڑا ہوگا —
اور اسی لمحے میرے اندر کا عفریت خشمگیں ہو کر دوبارہ اپنی آستینیں زہریلی ہیں میرے جسم سے نکالتا —
اور ایک سوال میرے آگے پھن مار کر کھڑا ہو جاتا — محنت کش کی مزدوری اُس کے پسینے اور

ہے خون سے بھی کم ——؟"

میر مٹھیاں شدید جذبہ کے تحت بھنچ جاتیں۔

اندر کا عفریت دوبارہ ضرب پہنچانے لگتا —— حد یاں گزر گئیں۔ میری جیبھیں تمہارے متعدد اعضا پر اپنے نشانیاں چھوڑ گئیں —— اور تمہاری بے حسی کا یہ عالم ہے کہ آپنے کو ننگے بن میں کسی سدھائے ہوئے جانور کی طرح جھکتے ہوئے چل رہے ہو ——

دور سے کئی گھوڑے مسلسل ہنہنا رہے ہیں ——

اور گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز مسلسل تیز ہوتی جا رہی ہے ——

میں چونک اٹھتا ہوں۔ ہزیانی کیفیت میں اپنے نچڑتے ہوئے جسم کا جائزہ لیتا ہوں —— بلوری کھال لہو لہان پڑی تھی ——

اور ایک کمزور آدمی اپنی ہی صلیب اٹھائے تنہا بوجھ سے لدا، مواد سے بھرے گھنونے زخموں کے ساتھ لمحہ لمحہ جھکتا چلا جا رہا ہے ....

(ریشمی چٹانوں کی اوٹ سے کوئی بچھو تیز رفتاری سے باہر نکلا اور آناً فاناً اپنے جھنڈ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا)

خاموشی دریاؤں میں جذب ہو چکی ہے ——

شام پھر گھر آئی ہے۔

کئی دنوں سے مسلسل وہ عفریت مجھے پریشان کرتا چلا آرہا ہے —— نیا مکان اونچی اڑان بھر رہا ہے —— اور اس کے پیچھے سے کالی بھنبھناتی چیونٹیاں باہر نکل آتی ہیں۔

مکان والے کے قہقہوں کی بے ہنگم صدا کانوں سے ٹکرا رہی ہے۔ سورج مغرب کی طرف بادلوں کے بڑے بڑے کے بیچ غائب ہوتا جا رہا ہے۔



کام ختم ہو گیا ہے ——

ڈھلتے ہوئے سورج کی تپش چبھ رہی ہے ——

مکان والا سب کی مٹھیوں کو سکوں سے بند کر رہا ہے ——

اور ایسا محسوس ہے جیسے سب کی مٹھیاں ڈھیلی ہوں ——

سب کے چہرے ٹکڑوں میں بٹ گئے ہوں ——

اندر کے عفریت نے پھر سر نکالا

ہے ..... تم سب اپنا اپنا چہرہ نی راسس کی طرح ایک دوسرے میں دیکھتے رہو گے ۔
اور یہاں اس گندی بستی میں پیپ پول کا گندہ ناچ چلتا رہے گا ۔
— اور نی راسس کی طرح میں مبہوت ہو کر اپنے چہرے کی گھر و چر ل اور سلوٹوں میں اپنی کہانی
تاہبستا کی کے صفحے کو پڑھتے پڑھتے کالا سمندر کہتا ہوں اپنے میں جذب کر لے گا ۔
اور پھر یہ نئی صدی اس قصے کو لے کر دقفے وقفے شروع ہوتی رہے گی ......
اس لئے ضروری ہے کہ نی راسس کو اس کا چہرہ دیکھنے سے بچاؤ ۔
پیپ پول کا گندہ ناچ ختم کرو ۔
میری مٹھیاں بھینچ — شریانوں میں خون تیزی سے دوڑا ۔ نسوں میں تناؤ آیا ۔ اور
دفعتاً اندر بیٹھے ہوئے عفریت نے مجھے پوری طرح ڈس لیا ۔ اور دفعتاً میرے اندر کے خول کے مردہ آدمی
لاش کو روندتا ہوا وہ عفریت باہر نکل آیا — پہلی بار میں وحشیوں کی طرح چیخا — میری
چ آسمانوں میں گونج گئی ۔
پتھریلے، ملبے تلے دبے، صدیوں سے کچلاتے 'جھکے' مرلی، شکست خوردہ انسانوں کے چہرے
چانک میری تیز فلک شگاف چیخ سے چونک پڑے ۔ ان کے مردے جسم میں پہلی بار جان محسوس ہوئی ۔ ان
خالی، کھوکھلی ہتھیلیوں میں پہلی بار کا احساس ہوا ۔ سوچ، یخ زدہ خوابیدہ ذہن پر جیسے پہلی بار
ھوڑے کی چوٹ پڑی ہو ۔ اور دفعتاً جھرّیوں میں ہزاروں سوکھے کمھلائے ہاتھوں کی مٹھیاں، خوابیدہ
کیفیت کی ٹوٹ کر غصے میں بھینچ گئیں ۔
اگلا لمحہ خاموشی کے تند تھپیڑوں کو سہتا سہتا اچانک ہی شیر کی طرح بپھر اٹھا تھا ۔
چھپتے چھپتے بھی لال سورج مسکرا اٹھا ۔
نی راسس کے مرنے کی جگہ پر نرگس جیسا خوبصورت پھول اگ آیا تھا ۔)

بقیہ اردو شاعری میں بنگلہ دیش کے حسن کی عکاسی

آغوش میں زمین کا سویا ہوا ہو سبزہ
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے سبزہ سی
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو

پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
سرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ کے لئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے۔ (ایڈیٹر)

- نام کتاب: **دبستانِ عظیم آباد**
- مرتب: سلطان آزاد
- صفحات: ۱۲۶
- قیمت: ۳۰ روپے
- ملنے کا پتہ: سلطان آزاد - نیو لین - گلزار باغ - پٹنہ ۷
- مبصر: سید احمد قادری - نیو کریم گنج - گیا (بہار)

دبستانِ عظیم آباد کو بھی دوسرے دبستانوں کی طرح تاریخی اور ادبی مقام حاصل ہے۔ اس دبستان کے تاریخی پس منظر پر نگاہ ڈالی جائے تو اسلاف کے کارناموں کا بیش بہا خزانہ دیکھنے کو ملے گا۔ جن سے دورِ حاضر کے ادباء و شعرا روشنی حاصل کر رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر میں دوسرے دبستانوں کے مقابلے میں دبستانِ عظیم آباد کہیں زیادہ فعال ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب " دبستان عظیم آباد " نوجوان ادیب سلطان آزاد نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے مرتب کی ہے۔ تحقیقی کام آسان نہیں ہے۔ اس کام میں بڑے صبر آزما اور دشوار گذار راستوں سے گذرنا پڑتا ہے تب کہیں جاکر کامیابی کی کرنیں نظر آتی ہیں۔ اس امر کا بخوبی اندازہ سلطان آزاد کو دبستانِ عظیم آباد کے ترتیب کے وقت ہوا ہے تبھی وہ اپنے " عرض حال " میں یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ " کم از کم میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ایک تخلیق کار کے لئے تخلیقی کام آسان ہے بہ نسبت تحقیقی کام کے " لیکن زیرِ نظر کتاب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ سلطان آزاد صبر آزما اور دشوار گذار راستوں سے بڑی کامیابی سے گذرے ہیں۔ جس کی وجہ اپنے وطن عزیز عظیم آباد سے ذہنی و دلی وابستگی اور کچھ کر دکھانے کا جذبہ اور لگن ہے۔ نتیجے کے طور پر عظیم آباد سے تعلق رکھنے والے سینکڑوں مشہور و معروف فنکاروں کی حالاتِ زندگی اور ان کے ادبی اور علمی کارناموں کے ذکر سے اپنی کتاب تیار کی ہے۔

مستند فنکاروں کے ساتھ ساتھ ایسے ادیب اور شاعر کا بھی ذکر اس کتاب میں موجود ہے، جن سے مستقبل میں امید یں وابستہ ہیں۔ کتاب کی ابتدا میں قتیل دانا پوری اور دانش عظیم آبادی کے تاریخی قطعات ہیں۔ اس کے بعد مشہور شاعر مظہر عظیم آبادی نے " مختصر دبستانِ عظیم آباد " کے تحت دبستانِ عظیم آباد کا منظوم تعارف بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

میاں محمد ناظر ... نے اپنے گہرے مطالعے و مشاہدے کا ثبوت پیش کرتے ہوئے دبستانِ عظیم آباد کی قدر و منزلت پر ... نگاہ ڈالتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ " دبستانِ عظیم آباد نے آدمی کے باطن میں انسان کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ انسان صرف اخلاقی سطح پر محض ایک وقت کا نمائندہ نہیں

[illegible] کے زنداں سے باہر آنے کے لئے بیتاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی سطح پر کئی تحریکیں جنم لیتی رہیں، کئی ادبی محاذ وقوع پذیر ہوتے رہے جو ایک آدرش نصب العین اور نظامِ خیال بھی مہیا کرتے رہے ہیں۔"

"عرضِ حال" میں مرتب سلطان آزاد نے کتاب کی ترتیب میں جن دقتوں سے انھیں گذرنا پڑا یا ان تجربوں کا ذکر کیا ہے جو کتاب کی ترتیب کے وقت در پیش ہوئے۔ "عرضِ حال" کے بعد ایک بے حد معلوماتی مقالہ بعنوان "دبستانِ عظیم آباد۔ ماضی کے آئینے میں" ہے۔ جس میں ماضی کے بہت سارے ایسے قلمکاروں کا تذکرہ مع نمونۂ کلام ہے۔ جن کے علم و ادب سے عظیم آباد کا وقار بلند ہوا ہے۔ اس کے بعد حال اور مستقبل کے ادبا و شعرا کا ذکر پڑھنے کو ملتا ہے۔ اور پڑھنے کے بعد ناظر عاشق ہرگانوی کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ:

"سلطان آزاد نے اپنی اس کتاب میں ادبی تاریخ کو ایسے سانچے میں ڈھالا ہے کہ تاریخ کے سارے اجزا ایک ہی سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتے ہیں۔"

بلاشک و شبہ "دبستانِ عظیم آباد" میں سلطان آزاد نے جس دیدہ وری اور دور اندیشی سے کام لیا ہے اور جتنی محنت کی ہے اس کا صلہ انھیں اس صورت میں ملے گا کہ تاریخ ادب میں اُن کا نام ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائیگا۔

یقینی طور پر سلطان آزاد کی ترتیب دی ہوئی یہ کتاب ایک ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہونے والی اس کتاب کو نکھار ادب پبلیکیشنز، مئو ناتھ بھنجن (یوپی) نے بڑے سلیقے سے شائع کیا ہے۔ کتاب کی ضخامت کے اعتبار سے قیمت زیادہ ہے۔

بقیہ نمود

تک انڈر گراؤنڈ رہے۔ انڈر گراؤنڈ زندگی کے مصائب نے انھیں آہنی انسان بنا دیا۔ انھوں نے تلنگانہ میں پارٹی کی بنیاد ڈالا۔ جب نظام کے خلاف عوامی بغاوت ہوئی تو راجیشور راؤ اس کے ممتاز رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ آزادی سے پہلے اور بعد میں کئی مرتبہ انھوں نے قید و بند کی صعوبتوں کو برداشت کیا۔

۶۴ء میں پارٹی پھوٹ کے بعد ہوئی پہلی پارٹی کانگریس منعقد بمبئی میں پارٹی کے جنرل سکریٹری چُنے گئے اور اس کے بعد ہوئے تمام پارٹی کانگریس میں جنرل سکریٹری چُنے جاتے رہے ہیں۔

محنت کش عوام کی نجات اور ملک میں سوشلزم کا قیام ہی وہ دو آدرش ہیں۔ جن کے لئے کامریڈ راؤ نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔ عالمی نقطۂ نظر اور مارکسزم اور لینن ازم سے آگاہی نے انھیں ایک اعلیٰ ترین درجے کا بین الاقوامیت پسند بنا دیا ہے۔ پرولتاری بین الاقوامیت پر غیر متزلزل اعتقاد کی وجہ سے عالمی کمیونسٹ تحریک کو درپیش مسائل اور شدید اختلافات ہونے کی صورت میں انھیں درست موقف اختیار کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کیا۔ ۱۹۷۴ء میں انھوں نے آرڈر آف لینن کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔

ادارہ سہیل کامریڈ راجیشور راؤ کی ۷۰ویں سالگرہ پر انہیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ اور ان کی درازی عمر کے لئے دعا گو ہے۔

شہرِ خیال

ادریس بھائی! سلام و محبت!! اپریل ۸۴ء کا "سہیل" ایک شمارہ "ڈاکٹر علیم اللہ حالی کے نام" موصول ہوا۔ اپنے محدود ذرائع کے باوجود "سہیل" ہر تیسرے چوتھے مہینے شائقین ادب کو ایسے نئے اور پرانے ادیبوں اور شاعروں کے فن اور شخصیت سے روشناس کراتا ہے جن کی اردو ادب میں ایک منفرد آواز ہے اور جن کا فن نقاد کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ سہیل کا موجودہ "ڈاکٹر علیم اللہ حالی نمبر" مختصر سہی لیکن اس میں موصوف کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور فن کے اہم گوشوں کو اجاگر کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر حالی سے جمیل منظر سہسرامی کی ادبی ملاقات (انٹرویو) میں وہ تمام ضروری باتیں آگئی ہیں جن کے سہارے حالی صاحب کے فکر و فن کا تجزیہ کرنے میں بہت مدد ملے گی۔

اس ادبی ملاقات میں حالی صاحب نے جتنی صفائی اور بے باکی سے اپنے فنی نظریے کی وضاحت کی ہے وہ خاصے کی چیز ہے۔ ترقی پسند ادب کے متعلق ان کا واضح اعلان اور پھر یہ جملہ "میں ترقی پسندی کے کسی محدود تصور کا قائل نہیں" بہت اہمیت کے حامل ہوگئے ہیں۔

جدیدیت کے متعلق ڈاکٹر حالی نے دو ٹوک بات کہی ہے۔ موصوف جدیدیت کو ترقی پسندی کا ضمیمہ سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض جدیدیت یا نجیدہ جدیدیت کو ترقی پسندی کی کاٹ نہیں قرار دیتے۔ اس انٹرویو میں موصوف نے غزل، آزاد غزل، پابند اور آزاد نظم اور جدید افسانے کی ہیئت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ پریم چند کے فن کو بڑی فراخدلی سے تسلیم کیا ہے لیکن سعادت حسن منٹو کو وہ افسانہ نگار تسلیم نہیں کرتے اور انھیں خاکہ نگاروں کے خانہ میں رکھتا ہے۔

مستقبل میں اردو زبان کی ہیئت اور شکل و صورت کے بارے میں بھی حالی صاحب نے اپنا نظریہ واضح طور پر پیش کیا ہے۔ وہ پنجابیت، دہلویت، لکھنویت اور بہاریت جیسے الفاظ کے سخت خلاف ہیں۔ وہ صوبہ پرستی کی لعنت کے اثرات کی حامل زبان کے قائل نہیں۔ موصوف کے خیال میں صوبائیت کی لعنت سے پاک ایک معیاری اردو زبان کی ابتدا ہو چکی ہے۔ اس یادگار خصوصی نمبر کے لئے ہم ادارہ سہیل کو ادبی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

سہیل کے لئے نیک خواہشات کے ساتھ   آپ کا مخلص   حسن مجمی سکندر پوری

محترم قسیم! علیم اللہ حالی سے لئے گئے آپ کے انٹرویو کے ایک سوال کے جواب میں کہ "ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں بہار کے ادیب و شاعر زیادہ بہتر تخلیقات پیش کر رہے ہیں۔ حالی نے اس کی مکمل وضاحت پیش کر دی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ وہ شعر و ادب کو صوبائی علاقوں میں تقسیم کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ آپ نے بھی شاعروں ادیبوں کے نام سہیل کے خاص شمارے وغیرہ نکال کر وہ صوبہ پرستی کی روایت کو توڑا اور فن کار کی جیتے جی قدر و منزلت کی جس کے لئے آپ

(باقی صفحہ پر)

اردو — یا — ہندی

بخشی جنتری ۱۹۸۴ء

ہر دو زبانوں میں اپنی خوبصورتی۔ افادیت اور مقبولیت کے ڈنکے بجا رہی ہے۔ اگر آپ نے اب تک اس کارآمد نسخے کو حاصل نہیں کیا ہے تو ہم سے براہ راست یا درج ذیل اسٹاکسٹوں سے حاصل کریں۔ بخشی جنتری ۱۹۸۴ء اردو یا ہندی

اسٹاکسٹ

پٹنہ — سبزی باغ۔ پرویز بک ہاؤس، کتاب منزل، بک امپوریم۔ آفتاب بکڈپو۔

مظفرپور — معین الحق بک سیلر۔ شمع بک اسٹال اسٹیشن روڈ۔ محمد کریم بخشی بک سیلر کمپنی باغ۔ عبدالحا دفتری، لوک بندھو پستکالیہ جنک پور روڈ۔

دربھنگہ — ظہیرالدین عملی کٹکی بازار۔ مکتبہ اسلامی لہریا سرائے۔

سمستی پور — لکشمی اسٹور۔ سیمی بک ڈپو اسٹیشن روڈ۔

ڈھولی — مولوی عبدالوہاب قاسمی مدھے پور۔

سیتامڑھی — محمد توفیق بک سیلر۔ محمد رفیق مہسول چوک۔ اقبال سنٹر

سیوان — نظام الدین بک سیلر چوک بازار۔ وارثی اسٹور۔ مدرسہ اسلامیہ احسانیہ۔ گوپال گنج

گیا — ظفر بک ڈپو۔ فضل بک ڈپو جی بی روڈ۔ اسعد بک ڈپو۔ حنفیہ بک سنٹر اورنگ آباد۔

چمپارن — بک امپوریم بتیا۔ شیام سہتیہ سدن سکٹا۔ یونیورسل بک ڈپو بتیا۔ محمد اکرام بک سیلر عبدالرحمٰن دفتری رکسول۔ دینی کتاب گھر۔ رام نگر۔

آرہ — ضیاء الحسن، حاجی فرحت الدین چوک۔ سوداگر سنگھ بسیا۔ بھوجپور۔

بیگوسرائے — کتابستان۔ شمیم کتب خانہ ہوا ویشالی۔ نیشنل بک ڈپو۔ حاجی پور

کٹیہار — اپنا کتاب گھر کٹیہار۔ جنرل کتاب گھر ایم جی روڈ۔ کٹیہار۔

پورنیہ — کیور چند رسا۔ پیپر کارنر۔ اردیہ کورٹ۔ محمد اسماعیل اشرفی جوگینی۔

کشن گنج۔ — صادق کتاب گھر۔ رضوان بک ڈپو۔ جیوتی پستک بھون۔ شمشی بک ڈپو۔

بھاگلپور — حمید پستک بھنڈار۔ سہنولا چوک۔ اسلامیہ بک ڈپو۔ کمالیہ بک ڈپو۔ تاتار پور۔

**ایس۔ اے۔ بی بخشی کمپنی۔ ۳۲ مولانا شوکت علی (کولوٹولہ) اسٹریٹ کلکتہ ۷۳۰۰۰

فاروق عبداللہ پاکستان نواز، علاحدگی پسند اور فرقہ پرست

فاروق عبداللہ: منظر صاحب! یہ اللہ کی شان ہے۔ محض اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں اپنے بھائی مسٹر طارق عبداللہ کو سرکاری نوکری نہیں دے سکا۔ اور اپنے بہنوئی مسٹر جی ایم شاہ کو اپنی حکومت میں وزیر نہیں بنا سکا جس کی وجہ سے شاہ صاحب تو ناراض تھے ہی ساتھ ہی میری بہن بھی ناراض ہو گئیں۔ ان دونوں حضرات کا عوام کے ساتھ سلوک بھی اچھا نہیں تھا۔ اس لیے ہم نے انہیں عوام سے الگ ہی رکھنا بہتر سمجھا۔ ویسے یہ دونوں حضرات کافی تیز اور چالاک ہیں۔

جمیل منظر: کیا یہ سچ ہے کہ آپ کی حکومت مرکز سے ٹکراؤ چاہتی ہے؟

فاروق عبداللہ: جناب! کوئی بھی ریاستی حکومت مرکز سے ٹکراؤ قطعی نہیں چاہتی کیوں کہ صوبہ کے عوام کے حق میں بہتر نہیں ہوتا۔ میری حکومت بھی مرکز سے ٹکراؤ قطعی نہیں چاہتی۔ میں نے الیکشن جیتنے کے بعد اقبال پارک کے پہلے جلسہ عام میں پہلی تقریر میں کہا تھا کہ دوسری تمام سیاسی پارٹیوں کو الیکشن کی تلخیوں کو بھول جانا چاہیے اور ملک و صوبہ کے مفاد کے لئے کام کرنا چاہیے۔ مرکز کو بھی صوبے کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں برتنا چاہیے۔ میں تو الیکشن کی تلخیوں کو بھول گیا ہوں۔ لیکن کانگریس (آئی) اپنی شکست کا بدلہ ہر دن نئے مسائل کھڑا کر کے لے رہی ہے۔

> کانگریس (آئی) اپنی شکست کا بدلہ ہر دن نئے مسائل کھڑا کر کے لے رہی ہے!

بے سہاروں کا سہارا

سماجی تحفظ پنشن پروگرام کے تحت موجودہ مالی سال ۸۴-۸۵ء میں پہلے چھ ماہ کے لئے (اپریل ۸۴- ستمبر ۸۴ء) کل -/26,17,66,820 روپے کی منظوری حکومتِ بہار نے دی ہے۔

۱۵ مئی ۱۹۸۴ء تک 16,10,235 لوگوں کو اس پروگرام کے تحت پنشن دیا گیا۔ اِس سلسلے میں یہ خاص بات ہے کہ اِس پروگرام کے تحت ایسے لوگوں کو پنشن مِلا تھا جن کی مالی حالت کافی اچھی تھی یا جو اس پنشن کو پانے کے حقدار نہیں تھے۔ اس لئے ریاستی حکومت نے ضلع مجسٹریٹ کو یہ کڑی ہدایت دے رکھی ہے کہ پنشن یافتہ فہرست میں جتنے بھی اِس طرح کے لوگوں کے نام ہیں انھیں فوراً ہٹا دیا جائے۔

ابھی صوبہ کی کل آبادی کا قریب ۲ فیصد لوگ اس پروگرام سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔

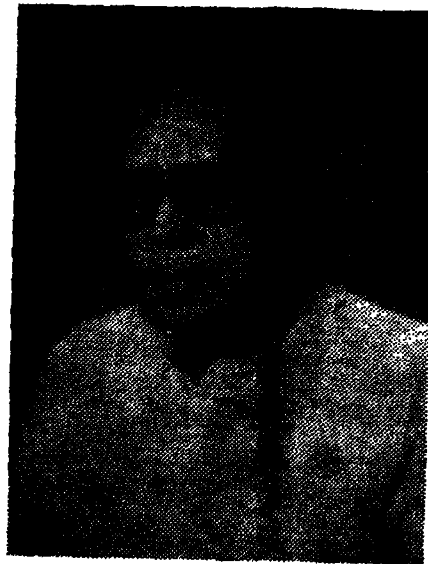
سماجی تحفظ پروگرام کے تحت ۳۰ روپے کا ماہانہ پنشن سبھی بیوہ عورتوں، اپاہجوں، بندھوا مزدوروں اور اُن سبھی لوگوں کو دیا جاتا ہے جن کی عمر ۶۰ سال سے زیادہ ہے، جنھیں چھوٹا ناگپور اور سنتھال پرگنہ میں ڈھائی ایکڑ اور متصل علاقوں میں ایک ایکڑ سے زیادہ زمین نہیں ہے اور جن کی ماہانہ آمدنی ۵۰ روپے سے زیادہ نہیں ہے۔

بندھوا مزدوروں، اپاہجوں اور بیواؤں کی عمر میں چھوٹ دی گئی ہے۔

محکمہ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ بہار

सू० ज० स० नि० ०/49 स(उ-127)/84

egd. No. Gay—4 Regd. with the R. N. Pat. R. No. 3520/57
46 YEARS OF PUBLICATION
THE SOHAIL MONTHLY, River Side Road, Gaya - 823 001



ادریس شنسہاروی مرحوم

وفات ۲۵ اگست ۱۹۸۴ء

بانی: مولوی حافظ محمد عبدالرحمٰن سہیل سنسہاروی ● بیادگار: مولوی محمد زین العابدین آکمؔ سنسہاروی

ترقی پسند ادب کا ترجمان

سہیل

اگست ۱۹۸۴ء

شمارہ: ۸ ● جلد: ۴۶

مدیر مؤسس: ادریس سنسہاروی مرحوم

چیف ایڈیٹر مسعود منظر سنسہاروی ● اڈیٹر: جمیل منظر سنسہاروی

معاونین
● شکیل احمد جمالی ● عبدالقیوم ابدالی ●

بدل اشتراک
فی شمارہ: ایک روپیہ پچاس پیسے ● سالانہ: ۱۸ روپے ● لائف ممبری: ۱۱۰ روپے

خط کتابت و ترسیل زر کا پتہ: ماہنامہ "سہیل" ریور سائڈ روڈ گیا

فہرست

نمود

میرے والد اور سہیل کے سرپرست و مالک
جناب ادریس سنبھاروی
نے
مورخہ ۲۵ ؍اگست ۲۰۰۳ء کو ساڑھے تین بجے شام میں ہم لوگوں کو
داغِ مفارقت دے دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ط
قلم مفلوج ہے، جسم وجان بے حس ہیں
اور
نہ دل ودماغ میں اتنی صلاحیت ہے
کہ
ادریس سنبھاروی کی تعزیت میں کچھ لکھوں
کیسے لکھوں ـــــ کہ ادریس سنبھاروی ہم سب کو چھوڑ چکے ہیں۔
کیسے لکھوں ـــــ کہ میرے والد ہم سب کو چھوڑ چکے ہیں۔
کیسے لکھوں ـــــ کہ ہم اب انکی شفقت، محبت اور بے پناہ
پیار سے محروم ہو گئے ہیں۔
کیسے لکھوں ـــــ کہ اب ہر قدم پر راہ دکھانے والا نہیں رہا۔
ایسا لگتا ہے جیسے ہمارے اندر کی سب سے قیمتی چیز کھو گئی ہو۔
چاروں جانب اندھیرا ہے، تاریکی ہے۔
اب ہم کہاں جائیں، اور کس سے روشنی طلب کریں۔
.....
مگر ـــــ آپ نے روشنی کی جستجو کو "مذہب" بتایا تھا۔

ہم وعدہ کرتے ہیں
کہ
اس مذہب پر
ہمارا ایمان
اب پہلے سے اور زیادہ پختہ اور مضبوط ہوگا۔
ان حالات میں اپنے کرم فرماؤں ــــــ اور
قارئین سہیل سے میری صرف ایک ہی گذارش ہے :
دعا فرمائیے کہ مجھے اور دوسرے متعلقین کو صبر آجائے۔

اور
سہیل کو ان کی یاد میں شائع کرتے رہنے کا دوبارہ عزم کروں ــــ!

جمیل منظر سنسہاروی
۲۹ اگست ۱۹۸۴ء

ڈاکٹر محبوبہ وانی
شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی سری نگر

اقبال بحیثیت رومانی شاعر

AURTHER .O LOVEJOY اپنے مشہور مقالے ON THE DESCRIMINATION OF ROMANTICISM میں مختلف ممالک کے ادب کی رومانیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ایک ملک کی رومانیت دوسرے ملک کی رومانیت سے مختلف ہو سکتی ہے۔ RENE WELLEK اس کے نظریے پر تبصرہ کرتے ہیں

"بلا شبہ رومانیت ایک نہیں بلکہ متعدد اقسام کی ہے وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ ان میں کوئی مشترک نسبت نما ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ کبھی نظر نہیں آتا ہے۔"

"THE CONCEPT OF CRITICISM" BY RENE WELLCK

ظاہر ہے ادب اپنے سماجی، جغرافیائی اور تہذیبی حالات کے پس منظر میں پروان چڑھتا ہے۔ اور یہ حالات مختلف ممالک میں مختلف شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ رومانیت کا تصور بھی ہر ملک اور ہر قوم کے فکری، تہذیبی اور جغرافیائی حالات کے تابع رہا ہے۔ اردو شاعری میں رومانیت کی جو مختلف شکلیں ابھر آئی ہیں وہ مغربی رومانیت سے متاثر ہونے کے باوجود انفرادی خد و خال رکھتی ہیں۔ یہ رومانی تصورات قدیم دور میں بے شک انفرادی شعرا کے یہاں ملتے ہیں لیکن کسی رجحان تحریک یا عمومی انداز نظر کی صورت میں نہیں ملتے۔ البتہ بیسویں صدی میں ملکی اور بین الاقوامی سطحوں پر پہلی جنگ عظیم کی ہولناکیوں کے پس منظر میں رونما ہونے والے تہذیبی اور سماجی بحران کے نتیجے میں رومانی رجحان کی شناخت ممکن ہوئی ہے۔ یہ رجحان افسانے میں مجنوں گورکھپوری، ل احمد، حجاب امتیاز علی تاج، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، سجاد انصاری، کی تحریروں میں، اور شاعری میں اقبال، اختر شیرانی، مجاز، حفیظ وغیرہ کے یہاں ملتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ موجودہ صدی میں بھی اردو شاعری میں اس کی مختلف شکلیں نظر آتی ہیں کہیں نادیدہ بستیوں کی تلاش میں، کہیں انقلاب کی رجز خوانی میں، کہیں جذبات کے شوق کے رموز میں، کہیں تخیلاتی فضا آفرینی میں۔ اور کہیں عشق کی ماورائی تصورات میں ملتی ہے۔ بنیادی طور پر شعر و ادب کے

کہ ایک مخصوص مزاج کی نشاندہی کرتی ہے۔ جو ہر دور میں کسی شکل میں نمودار ہوتا رہتا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات و تقاضات کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ رومانیت زندگی کی اسراریت میں دلچسپی رکھتی ہے۔ وہ آزادانہ طور پر زندگی کی اصل اس کے ارتقا اور اس کے زوال کے بارے میں نت نئے سوالات کو جنم دیتی ہے۔ اور پھر پوری تخیلی آزادی کے ساتھ اپنے نتائج مرتب کرتی ہے۔ اس طرح سے رومانی رویے میں تجرباتی انداز اور بے باکی موجود رہتی ہے۔ بقول حالیؔ

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

بیسویں صدی اپنے ساتھ بڑے انقلابات اور تبدیلیاں لے کر آئی۔ اس زمانے میں سیاسی اور تہذیبی سطح پر اہم تغیرات ہوئے۔ جس کے نتیجے میں زندگی میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہونے لگیں۔ افکار و خیالات اور زندگی کے متعلق تمام تر نظریات میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ تبدیلی اور تغیر کا یہ عمل اگرچہ سرسید کے وقت سے شروع ہو چکا تھا لیکن اس میں شدت اقبال ہی کے عہد میں پیدا ہوئی۔ بیسویں صدی کے آغاز تک ان کے ذہن و مزاج میں وسعت پیدا ہوئی تھی۔ وہ ایک حساس شاعر کی طرح برق رفتار تبدیلیوں کا گہری تشویش سے مطالعہ کرتے رہے۔ اقبال کس حد تک اپنے گرد و پیش بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہوئے اس کا اندازہ اس شعر سے ہو سکتا ہے ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

شام حسین لکھتے ہیں:

"بیسویں صدی کے آتے آتے آزادی کی خواہش اور مغربی اثرات نے عمل کی دنیا سے دور ایک انتہا پسندانہ رومانوی اور تخیلی انداز نظر پیدا کر دیا تھا۔ جو کسی کے یہاں مذہب سے بغاوت کی شکل میں، کسی کے یہاں تخیل کی رنگین بیانی اور والہانہ گم شدگی کے رنگ میں رونما تھی۔ جو زنجیریں واقعی زندگی میں نہیں ٹوٹ سکتی تھی۔ وہ خیالوں میں ٹوٹنے لگیں۔ اور تصور کا مینا کاریوں کی محدود زندگی میں ہی نئے چمن کھلنے لگے۔"

شاعری حسن و محبت کے صدہا کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ اور تقریباً ہر شاعر نے یا تو محبوب کی گلی خوب چھانی اور اگر نہیں تو کم از کم اس کی تمنا ضرور کی ہے۔ عام طور پر شعرا کا نقطہ نظر یہی رہا ہے کہ دلی جذبات اور احساسات ہی فن یا آرٹ کی نمود و افزائش کے لئے سب سے ضروری شئے ہیں۔ چاہے وہ جس روپ میں ہوں۔ محبت کی بنیاد گہری ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو ہمیں اپنی زندگی اپنے ماحول اور اپنے فن سے پیار کرنا سکھاتا ہے۔ اور یہی جذبۂ الفت وسعتوں میں گم ہو کر ذہن شاعر کے تاریک گوشوں میں روشنی بکھیر کر عظیم کارناموں کا باعث بنتا ہے۔

اقبال کی شاعری پہلودار، وزنی اور ہمہ گیر شخصیت ہے۔ ان کی شعری تخلیقات میں متعدد رجحانات اور ت کی مصوری کرتی ہے۔ وہ وطنیت اور ہندوستانیت کے علاوہ مغربی تہذیب صورت حال کی بھی ترجمانی کرتے خارجی مسائل کے ساتھ ساتھ داخلی کوائف کی مصوری کرتے ہیں۔ وہ موجودہ صدی کے بحران کے ساتھ ساتھ ذہنی جذباتی استحکام کی طرف بھی متوجہ ہیں۔ ان سب میلانات اور تجربات کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں رومانی تصورات ری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن نے انہیں رومانی شاعر قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اقبال کی شاعری میں رومانی اثرات بہت نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں جذبات اور وجدان کی افراط کا غلبہ اس قدر زیادہ ہے کہ اگر ان کو رومانی شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا"

(اردو ادب میں رومانوی تحریک)

غا "اردو شاعری کا مزاج" میں لکھتے ہیں:

"اقبال ہی سے اس رومانوی تحریک کا آغاز ہوا۔ جس نے بعد ازاں جدید نظم میں داخلیت کے قیمتی عناصر کا اضافہ کیا"

عالمی جنگ کے آغاز و اختتام نے ادب، سیاست، تہذیب معاشرت اور اقتصادیات کو بہت حد تک متاثر کیا اور فرانس کی صنعتی مزدور تحریک نے اور بھی زیادہ اثر ڈالا۔ اس اشتراکیت کو نشو و نما کے مواقع فراہم ہوئے۔ سی اور اقتصادی تبدیلی نے اردو شاعری کے انداز فکر کو ایک نئے سانچے میں ڈالا۔ مغربی تہذیب ایک میکانکی تہذیب بدیل ہو رہی تھی۔ میکانکی تہذیب انسان کو مشین کا پرزہ بنا رہی تھی۔ وہ اخلاقی اور روحانی قدروں سے بیگانہ تھا۔ نتیجے میں انسان کا ذہنی اور نفسیاتی وجود منتشر ہو رہا تھا۔ اقبال اس موقع پر شکست کو قبول کرنے کی بجائے پوشیدہ قوتوں کو بروئے کار لانے کی جد و جہد کرتے رہے۔ انہوں نے انسان کی اخلاقی اور روحانی قوتوں

کی نئی تنظیم کر کے اسے ایک ایسی قوت کے طور پر پیش کیا جو پورے عہد کا سامنا کر سکتی ہے۔ یہ عرفان، وجود، ولولہ اور تب و تاب زندگی ان کے رومانی ذہن کی نشاندہی کرتا ہے۔ "مسجد قرطبہ" نظم کے ذیل کے اشعار سے اقبال کے رومانی ذہن کا صحیح اندازہ ہوتا ہے ؎

تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل — وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائیدار تیرے ستون بے شمار — شام کے صحرا میں ہوں جیسے ہجوم نخیل
تیرے در و بام پر وادی ایمن کا نور — تیرا منار بلند جلوہ گہ جبرئیل
ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر — قلب مسلمان میں ہے اور نہیں ہے کہیں

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

اقبال حسن فطرت کے شیدائی ہیں۔ جو چیز ابتدا سے انتہا تک اقبال کی تخلیقی زندگی میں حسن و فطرت کے ایک لازمی کے طور پر موجود رہی وہ ان کی رومانیت ہے۔ زندگی کے بے مسائل سے سلامتی کے ساتھ گزرنے کے لئے رومانیت اقبال کے لئے نہ صرف ایک جذباتی سہارا بنی بلکہ ان کے تخلیقی ذہن کی ایک خارجی صورت بھی میسر آ گئی۔ البتہ یہ ہے کہ رومانیت ان کی شاعری میں جمال کے ساتھ ساتھ جلال کے مظاہر میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ کہیں شبنم ہے تو کہیں شعلہ، فطرت کا حسن اس کے لئے باعث کشش بنتا ہے۔ ان کے آئینۂ ادراک میں حسن فطرت اور حسن کائنات کی خارجی و باطنی دونوں تصویریں بیک وقت رقص کرنے لگتی ہیں۔ نظم "شاعر" میں فطرت کی مصوری کا ایک دلآویز نمونہ ملتا ہے ؎

جوئے سرود آفریں آتی ہے کوہسار سے — پی کے شراب لالہ گوں میکدۂ بہار سے
مست مئے خرام کا سن تو ذرا پیام تو — زندہ وہی ہے کام کچھ جس کو نہیں قرار سے
پھرتی ہے وادیوں میں کیا دختر خوش خرام — کرتی ہے عشق بازیاں سبزۂ مرغزار سے

اقبال کی منظر کشی کو ورڈس ورتھ کے آرٹ کے مقابلے میں نہایت فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے وہ الفاظ کے ذریعے فطرت کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ حقیقت آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ ان کی نظم "کشمیر" ان کی سحر نگاری کا ایک عجیب نمونہ ہے ؎

رخت بکشمیر گشا کوہ و تل و دمن نگر — سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر!
باد بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج — صلصل و سار زوج زوج بر سر نارون نگر
لالہ ز خاک بر دمید موج بہ آب جو تپید — خاک شرر شرر ببیں آب شکن شکن نگر

زخمہ بہ تار ساز زن بادہ بہ ساتگیں بریز
قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر!

اقبال تجریدی تصورات کو ٹھوس شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اور الفاظ کے طلسم سے بے جان اشیا میں روح پھونک کر انہیں فضا، اجرام و اجسام دنیا عالم الروح تک سب بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی نظم "بزم انجم" ادبی مصوری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے ؎

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو
طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے
محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی
چمکے عروسِ شب کے موتی وہ پیارے پیارے

وہ دور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے !
کہتا ہے کہ جن کو انساں اپنی زباں میں تارے

کے یہاں منظر نگاری کے متعدد مثالیں کلام اقبال میں ہمیں قدم قدم پر نظر آتی ہیں۔ ہمالہ، ابر، کوہسار، خفتگاں سے استفسار، ایک آرزو، ماہ نو، عشق اور موت، جگنو، ایک شام، تنہائی، گورستان شاہی، نمود صبح، وات، بزم انجم، خضر راہ، طلوع اسلام، مسجد قرطبہ، ذوق و شوق اور ساقی نامہ اس طرح کی مثالوں سے لبریز ہیں۔

اقبال کے یہاں عشق کا تصور بھی ان کی لافانی آرزو مندی کا مظہر ہے وہ انسان میں نادیدہ جہانوں کی ... کے لیے جذبہ عشق لازمی سمجھتے ہیں۔ "عشق" کی اصطلاح کو وہ نہایت وسیع معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اور کہتے ... حق زندگی کے جمالیاتی پہلوؤں کا صرف مطالعہ ہی نہیں بلکہ زندگی کی مشکلات پر قابو پانے کا بہترین ذریعہ بھی ... مز انسان کا وہ پاکیزہ اور طاقتور جذبہ جو اس کے کردار کو بلند سے بلند تر کر دے جو ذہنی اور طبعی موانعات اور ... ت کے باوجود اس کو لطیف اور اعلیٰ مقاصد کی طرف دھکیلے۔ اقبال کے نزدیک عشق کی تعریف میں داخل ہے فرماتے ہیں ؎

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق!

ان کے خیال میں عشق کا دائرہ عمل نہایت وسیع ہے۔ محفلوں کی رنگینی، پہاڑوں کی تنہائی، واعظ کی شعلہ نوائی اور مجاہد کی سرفروشی ۔۔ یہ سب عشق کی ہی شکلیں ہیں۔

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق! ۔۔۔ کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر! ۔۔۔ کبھی مولا علی خیبر شکن عشق

اقبال کے کلام میں عشق ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہیں یہ موضوع بہت پسند ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انہیں عشق سے عشق ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کائنات کی رنگینی اور عالم رنگ و بو کے عشوے غمزے عشق ہی کے سبب سے ہیں

بہ برگ لالہ رنگ آمیزیٔ عشق ۔۔۔ بہ جان ما بلا انگیزیٔ عشق
اگر ایں خاک داں را واشگافی! ۔۔۔ درونش بنگری خونریزیٔ عشق

اقبال ہر راہ گزر میں نقش کف پائے یار دیکھتے ہیں۔ مظاہر قدرت میں بے پایاں حسن انہیں نظر آتا ہے۔ یہ حسن کوہسار کی ہیبت ناک خاموشی، مہر کی ضو گستری، شب کی سیہ پوشی، عظمت دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار، ننھے طائروں کی آشیاں سازی، چشمہ کوہسار، صحرا اور پہاڑ میں ہر جگہ جلوہ گر ہے۔ مگر حسن کی اس فراوانی سے اقبال عشق کا پہلو نکالتے ہیں۔ جو حسن کی عظمت، دلفریبی، اور ناز برداری کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہے ؎

روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس ۔۔۔ ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثل جرس

رومانیت پسند فن کار کا دل ہمیشہ انسان کی بے پناہ محبت سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اپنے فن کی قوتوں سے اپنے تخیل اور جذبے کی مدد سے انسانی قدروں کو فروغ دیتا ہے۔ تاکہ زندگی کے مخفی گوشے اجاگر ہوں۔ اسے اس بات کا پورا علم ہوتا ہے کہ انقلاب زمانہ اگرچہ انسانی تہذیب اور تمدنی آثار کو ہر ممکن مٹانے کی کوشش کرے لیکن اس کی محبت خوابوں اور خیالوں کی دنیا کو نہیں مٹا سکتا۔ بلکہ کسی نہ کسی شکل میں ان کا وجود باقی رہتا ہے وہ اگر بعض خارجی حالات کی وجہ سے افسردگی اور تنہائی کے جذبات کی پیکر تراشی کرتا ہے۔ تو وہ امید آفرینی اور آزادی کو بھی عزیز رکھتا ہے۔ وہ دل کی پوشیدہ خواہشوں کو دباتا نہیں۔ ماضی کی روشن قدروں کو اس لیے سینے سے لگاتا ہے تاکہ اپنے تخیل کے ذریعہ ماضی کی تصویر پیش کر دیتا ہے۔ چونکہ اقبال انسان کی آزادی کے دلدادہ اور علمبردار ہیں۔ لہٰذا یہ خیال لازمی کہ انہیں رومانی شاعری سے بالکل قریب کر دیتا ہے۔ اس سلسلے میں عزیز آغا کا یہ خیال صحیح ہے:

"اقبال کے یہاں فرد کو آزادی دلانے کا ایک رجحان بھی موجود تھا جو رومانی نقطہ نظر کا ایک اہم پہلو ہے۔" ۔۔۔ فروغ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے۔

بال کے یہاں شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں عشق و عقل کی متضاد قوتوں کی کارفرمائی کو خاص اہمیت حاصل ہے
ل استدلالی قوت ہے۔ اور عشق انسان کی جبلی قوتوں کا آزادانہ اظہار ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق کائنات
آفرینش کا سب سے بڑا محرک ہے۔ یہ آتش افروزاں ہے۔ جو سینۂ کائنات میں روشن ہے۔ اقبال اس آگ کو وہ
یہ روشن رکھنے کے خواہاں ہیں۔ یہ تصور بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ ایک ازلی اضطراب ہے۔ اور اتش حیات
امن جو انسانی وجود کو آتشیں پیکر بناتا ہے۔ اور اسے نئے جہانوں کی تسخیر کے لئے بے چین رکھتا ہے۔ اقبال نے
کے مقابلے میں عشق کو فوقیت دے کر عشق کے رومانی تصور کی آئینہ داری کی ہے

عشق فرسودہ قاصد سے سبک گام عمل ۔ عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام ۔ اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

اقبال کے تصور خودی کا مرکزی خیال یہ ہے کہ انسان وجود مطلق کا ایک مظہر ضرور ہے۔ وہ صرف انفرادیت
یں رکھتا بلکہ خودی کے جذبے سے سرشار ہے۔ یہ جذبہ ایک تخلیقی جذبہ ہے۔ جو حیات اور کائنات کے تخلیقی ارتقا
آہنگ ہے۔ اس تخلیقی اور فطری جذبہ کا خاصہ یہ ہے کہ انسان جستجو میں مصروف رہے۔ اور اپنے لئے اعلیٰ سے
منازل طے کرے۔ ان منازل اور مقاصد کے حصول کے لئے خارجی رکاوٹوں سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے انسان
ت کے مقابلے میں صرف حقیقت کا عکس ہی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے اور روحانی بصیرت کا مالک ہے

خودی را زندگی ایجاد غیر است ۔ فراق عارف و معروف غیر است
قدیم و محدث ما از شمار است ۔ شمار ما طلسم روزگار است

بال کے نزدیک خودی ایک لازوال حقیقت ہے۔ وہ کائنات ہستی کے ہر ذرہ میں نمایاں ہے۔ لیکن اس کا
کمال انسان میں ظاہر ہوتا ہے انسانی زندگی کو یہی جذبہ حرکت میں لاتا ہے۔ اور نت نئے نصب العین کی تخلیق
رگی میں کشش اور اس کی بقا کی صورت پیدا کرتا ہے۔ اس کی بدولت ایک نصب العین کے حصول کے ساتھ ہی
نصب العین انسان کے سامنے آجاتا ہے۔ اور اس طرح کوشش پیہم کا سلسلہ مستقل اور مستحکم ہو جاتا ہے

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی ۔ اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

بدولت انسان خدائی کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ وہ خود خدا کے اندر جذب نہیں ہوتا۔ زندگی کے نظم و
انسانی شخصیت کی پائداری اس کے بغیر ممکن نہیں۔ اسرار خودی کے انکشاف سے پانی کا قطرہ گوہر بنتا ہے
ہے سبزہ گلشن کے سینے کو چاک کرکے باہر نکل آتا ہے

چوں حیات عالم از زور خودی است ۔ پس بقدر استواری زندگی است

قطرہ چوں حرف خودی از بر کند — ہستی بے مایہ را گوہر کند
سبزہ چوں تاب دمید از خویش یافت — ہمت او سینۂ گلشن شگافت

چوں خودی آرد بہم نیروے زیست
می کشاید قلزمے از جوئے زیست

اقبال کے تصور کے مطابق انقلاب تغیر اور ترقی ہے۔ اور کش مکش زندگی کی علامت ہے۔ ان کے نزدیک کائنات اور ہم ذی روح کی موجودہ شکل ہزاروں برس کی ارتقائی جد وجہد تصادم اور پیکار کا نتیجہ ہے۔ اور حقیقت ایسے اجزا کا مجموعہ ہے جو تصادم اور کش مکش کے ذریعہ باہمی ربط پیدا کر کے زمانہ کی صورت میں تبدیلی اور ترقی کے باعث ہوتے ہیں۔ یعنی جسے ہم حقیقت کہتے ہیں۔ وہ انقلاب ہے اور انقلاب قانون قدرت ہے گویا انقلاب سے انسان کو استحکام اور استقلال حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح انسان کو کش مکش اور جستجو کی طرف مائل کرنے اور میدان عمل کی طرف لے جانے کی اقبال نے بڑی تحریک و ترغیب دی ہے۔ انسانی رفعت و بلندی کی اکیا علی منزل پر وہ خود پہونچتے ہیں۔ اور تمام نوع انسان کو وہاں تک آنے کی دعوت دیتے ہیں۔

عروج آدم خاکی کے منتظر ہیں تمام — یہ کہکشاں یہ ستارے یہ نیلگوں افلاک
ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا — حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

اقبال کی شاعری میں اسلام کے ماضی کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ جس طرح انگریزی رومانی شعراء میں کیٹس (KEATS)
عہد وسطیٰ کی رنگین زندگی شیات اور حسن سے بے حد لگاؤ تھا۔ اسی طرح اقبال کے جدید رومانی رجحانات میں شوکت پاستاں کا
بدل ملتا ہے ؎

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا — مسکن آبائے انساں جب بنا دامن تیرا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا — داغ جس پر غازۂ رنگ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو!!

پیام مشرق میں اقبال کی ایک نظم کا عنوان "تنہائی" ہے لفظ تنہائی سے رومانیت کا گہرا اور شدید احساس ہوتا ہے۔ اس نظم میں اقبال انسان اور فطرت کا ایک بڑے لطیف اور پرکیف انداز میں مقابلہ کرتا ہے۔ فطرت کے مقابلے میں انسان کی عظمت کا راز ظاہر کیا ہے چونکہ انسان کے سینے میں دل ہوتا ہے۔ جو آرزوؤں، تمناؤں اور درد سے بھرا ہوتا ہے۔ لہٰذا فطرت کے مقابلے میں انسان کا قدرداں ہے ؎

بہ بحر رفتم و گفتم بہ موج بے تابی ! — ہمیشہ در طلب استی چہ مشکلی داری ؟
ہزار لولوی لالاست در گریبانت — درون سینہ چو من گوہر دلی داری ؟
تپید و از لب ساحل رمید و ہیچ نہ گفت

غرض اقبال کی شاعری میں بلند ولولۂ حیات، عزم و یقین، اثبات وجود اور توانائی کا جو عنصر محسوس ہوتا ہے
جلوہ گر ہے وہ ان کے رومانی مزاج کا آئینہ دار ہے۔

تجھے یاد کیا نہیں ہے میرے دل کا وہ زمانہ
وہ ادب گہہ محبت وہ نگہ کا تازیانہ

بقیہ: نئی کتابوں کا تعارف

خلیل بیگ نے اسلوب کی تعریف، وضاحت، توضیح اور تشکیل کے ضمن میں مختلف ادبا کے ذریعہ اٹھائے جانے والے مباحث سے علمی ریاضت اور ذہنی عرق ریزی کے ساتھ بحث کی۔ اور ان پر بہتر نتائج اخذ کئے ہیں۔

آخر میں یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ یہ کتاب مطالعۂ ادب کی ایک نئی سمت اور تنقید شعر کی ایک نئی جہت متعین کرتی ہے۔ نیز اپنی موضوعاتی ندرت و اہمیت اور خوش نما گردوپیش کی وجہ سے مطالعہ کا حق رکھتی ہے۔

—— مشہیر رسول دہلی کالج

ماہنامہ سہیل گیا کی عظیم پیشکش

ایک شمارہ ۔ منوّر رانا کے نام

منوّر رانا جدید لب و لہجہ کے بانکے شاعر ہیں

★ غالب اگر زندہ ہوتے تو ڈیڑھ سو روپے پر میرٹھ لوچندی کے مشاعرہ میں دھکے کھاتے پھرتے۔

★ غزل اس انتظار سے زیادہ خوب صورت ہے جو گھر کے دریچے پر دو آنکھیں کرتی رہتی ہیں۔

★ کچھ دنوں قبل جب میں نے ایک ٹائپسٹ سے ماہنامہ شاعر کا آزاد غزل نمبر لانے کو کہا تو اس نے کہا معاف کیجیے گا میں ابھی وضو میں ہوں اس لیے آپ خود ہی لے آئیے۔

★ نظم اور غزل میں وہی فرق ہے جو ڈاکٹری دوا اور حکیمی دوا میں ہے۔

★ کچھ دنوں پہلے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے باتھ روم میں جگن ناتھ آزاد کا شعری مجموعہ رکھا دیکھا تھا۔ اردو میں شعری مجموعہ چھاپنے کی ہمت نہیں ہوگی ۔ ——— (منوّر رانا)

جمیل منظر سنہاروی کا لیا ہوا ایک اچھوتا انٹرویو اور منور رانا کا بے باک جواب ● والی آسی کے الفاظ میں "منوّر رانا اس صدی کے کبیر ہیں"

مضامین ابراہیم ہوش، ڈاکٹر منوان چشتی، ڈاکٹر مظفر حنفی، ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی، ڈاکٹر علیم اللہ شکیل صدیقی، ڈی۔ این آریا، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، رضوان احمد، ڈاکٹر عظمت آبادی، احمد ابراہیم علوی، شاہ نواز قریشی، سید احمد قادری، حبیب ہاشمی، پروفیسر نصرت جمیل، شوکت آبادی، مسعود عابدی، اقبال جاوید، ظہیر انور، جاوید انور صابری۔

منوّر رانا اہل قلم کی نظر میں

شبیہ رسول، علقمہ شبلی، جاوید نہال، بدر الحسن، فیروز عابد، سعید پریمی، ظفر احمد، ڈاکٹر قاضی امین، ڈاکٹر ... وی قاضی، انور امدی، کمال احمد، قیصر شمیم، انور بیکر، خالق عبداللہ غازی، راج کمار جین، وحید عرشی، فاروق شفق، ڈاکٹر یوسف تقی، اور "میرے صاحب میری نظر میں" رعینہ رانا۔

صفحات ۱۶۰ ● قیمت ۱۰ روپے ● لائبریری ایڈیشن ۱۲ روپے ● تاریخ اشاعت ستمبر

ترتیب :- ڈاکٹر علیم اللہ حالی ——— جمیل منظر سنہاروی

(ایجنٹ حضرات ابھی سے اپنے پاس بک کرالیں یا براہ راست ہمیں لکھیں۔

منیجر- ماہنامہ سہیل ریلوے سائڈ روڈ گیا۔ پن ۸۲۳۰۰۱

باغباں

سیف الدین انصاف

ایک وہ وقت تھا ــــــ
جب میرے گلستاں کا
ہر اک پیڑ مٹی میں نیچے گڑائے
مخالف ہواؤں سے آنکھیں لڑائے
اپنی ہستی پہ نازاں
بڑے فخر سے لہلہاتا کھڑا تھا
آخری سانس لیتے ہوئے زرد پتے بھی
ہری ڈالیاں چھوڑ جانے کو راضی نہیں تھے
اور باغباں ــــــ
میلے ہاتھوں میں اجلی درانتی سنبھالے
دھوپ اور چھاؤں میں
اپنی محنت کو ایماں کی رسّی بنائے
رنگ و خوشبو کے پلکوں پہ سپنے سجائے
بڑی خوبصورت سی دنیا بنانے میں مصروف تھا
ایک یہ وقت ہے ــــــ
درختوں کے قدموں تلے سے زمیں بہہ چکی ہے
زرد پتے تو پتے ہری ڈالیاں تک
درختوں سے انگلی چھڑانے لگی ہے
اور میاں باغباں ــــــ
سر پہ پگڑی جمائے، سرد کمروں میں بیٹھے
گلستاں کے پھل پھول اور لکڑیوں سے
اپنے عشرت کدے کو جنت بنانے میں مصروف رہیں
اور مایوس پتے، بگولوں کے شانہ بہ شانہ
آوارہ گلیوں میں پھرتے پھراتے
اپنی پہچان تک کھو رہے ہیں
فنا ہو رہے ہیں
بوڑھے درخت اپنے شانے جھکائے
بڑی بے بسی سے یہ سب دیکھتے ہیں
اور مخالف ہواؤں سے کبھی کانپتے ہیں۔

کبوتر

نہیں جو سامانِ تحفظ
تو خواہشِ حسن چھوڑ دیجئے
شباب کی بھی ہے اپنی منطق
بدن پہ کپڑا نہ تن میں دانہ
نہ پرورش کا کوئی ٹھکانہ
مگر وہ اپنے کو شہزادہ ہی مانتا تھا
اور طبیعت تھی عاشقانہ
سفید جنگلی کبوتروں کا بڑا جنوں تھا
بڑے جتن سے وہ ایک جوڑا چرا تو لایا
مگر نہیں تھا نصیب دانہ
یوں وہ تلاش شاہزادہ
آب و دانہ کی جستجو میں نکل پڑا تھا
اک عمر تک ڈھونڈتا رہا تھا
اور آج لوٹا ہے اپنے گھر کو تو دیکھتا ہے
سفید جنگلی کبوتروں کا کہیں بھی نام و نشاں نہیں
کبوتروں کی قیام گاہ میں
سیاہ منحوس
الٹا چمگادڑوں کا جوڑا لٹک رہا تھا۔

ع۔ عامر

نظمیں

(بخاری کے نام)

(۱)

پامال خزاں
گونگی آنکھوں میں
اتری ہے،
کل شب کیسی
اندھی آندھی
ٹھہرے پانی میں
دیواروں سے ٹکرائے
سانسوں میں اتری
پیاسی ریت
گھٹا ہے
کیا کیا مانگے ؟

(۲)

اب بوڑھی راتوں کی
جھریاں
کس شیتل چہرے کو دیکھیں
گذرے وقتوں کی
دوشیزہ کن قدموں کی
اب چاپ سنے
بن میں سوئی کومل پنکھڑی
کی مانگ سجائے
سورج کس کھائی میں اترے
اگلے وقتوں کی باتیں ہیں
اجلے لمحوں کی سوغاتیں
اک دن خود ہی
دیمک کی باہوں میں
آجاتی ہیں ۔

بدیع الزماں خاور

نئی تہذیب

شہر اور جنگل کی
سرحدیں دن بدن مٹتی جا رہی ہیں
شہر کے لوگ جنگل میں
اور جنگل کے جانور شہر میں
آزادی کے ساتھ آنے جانے لگے ہیں
انسان اور جانور
دونوں کے دلوں کا خوف آہستہ آہستہ دور
ہوتا جا رہا ہے اور
دو تہذیبیں
دو پرانی تہذیبیں دھیرے دھیرے
ایک نئی تہذیب کو جنم دینے کیلئے
قریب سے قریب تر آتی جا رہی ہیں
ایک نئی تہذیب
جو نہ شہری ہوگی
نہ جنگلی
جسمیں نہ کوئی انسان رہے گا
نہ کوئی جانور
اس کا کوئی نام بھی نہیں ہوگا
وہ صرف ایک تہذیب ہوگی
ایک نئی تہذیب
اور اسکا موٹو ہوگا "ہم سب ایک ہیں"!

فضا ابن فیضی

یہ کیا بتائیں کہ کس رہگذر کی گرد ہوئے
ہم ایسے لوگ، خود اپنے سفر کی گرد ہوئے

نجات یوں بھی بچھڑنے کے کرب سے نہ ملی
ہوئے جو آئینہ، سب کی نظر کی گرد ہوئے

یہ کن دکھوں نے چم و خم تمام چھین لیا
شعاعِ مہر سے ہم بھی شرر کی گرد ہوئے

سب اپنے اپنے افق پر چمک سکے تھوڑی دیر
بجھے، تو دامنِ شام و سحر کی گرد ہوئے

پکار دو کہ گئے ہیں چھاؤں جی نہ بہلے گا
بچے جو دھوپ سے پائے شجر کی گرد ہوئے

ہمیں بھی بولنا آتا ہے، پھر بھی ہیں خاموش
کہ ہم ترے سخنِ مختصر کی گرد ہوئے

دھلا سا چہرہ بھی کچھ ماند پڑ گیا آخر
ہوئے نہ اشک، مری چشمِ تر کی گرد ہوئے

شریر و تند ہوا تھی، کہ رَد معانی کی
تمام لفظ، لبِ معتبر کی گرد ہوئے

زمیں پہ رہ کے بھی سورج کی طرح چمکے وہ
جو تیرے دیدۂ معنی نظر کی گرد ہوئے

یہ راہ کتنی پُر آشوب ہے، فضاؔ نہ کہو
قلم کی راہ چلے ہم، ہنر کی گرد ہوئے

اچھا ہوا میں وقت کے محور سے کٹ گیا
قطرہ گہر بنا جو سمندر سے کٹ گیا

زندہ جو بچ گئے ہیں ہمیں نفرتوں کے دکھ
اپنا گلا تو پیار کے خنجر سے کٹ گیا

موسم بھی منفعل ہے بہت کیا بھریں اُڑان
رشتہ ہواؤں کا مرے شہپر سے کٹ گیا

میں دھوپ کا حصار ہوں تو چھاؤں کی فصیل
تیرا مرا حساب برابر سے کٹ گیا

وہ میل جول حسن و بصیرت میں اب کہاں
جو سلسلہ تھا پھول کا پتھر سے کٹ گیا

کتنا بڑا عذاب ہے باطن کی کشمکش
آئینہ سب کا گرمیِ جوہر سے کٹ گیا

سب اپنی اپنی ذات کے زنداں میں بند ہیں
مدت ہوئی کہ رابطہ باہر سے کٹ گیا

دیکھا گیا نہ مجھ سے معانی کا قتلِ عام
چپ چاپ میں ہی لفظوں کے لشکر سے کٹ گیا

خود سر سے تا قدم ابھی آئینہ خانہ ہوں
نقصاں ہی کیا جو میں ترے منظر سے کٹ گیا

اس کے انا کی وضع تھی سب سے الگ فضاؔ
کیا شخص تھا کہ اپنے ہی جوہر سے کٹ گیا

چھنا پرساد واحی

○

یہ سب سلسلۂ پیچ و خم ہیں دیواریں
کہ جیسے حدِ وجود و عدم ہیں دیواریں

قتیلِ خنجرِ باطل نہ جانے کون ہوا
کہ آج خونِ صداقت سے نم ہیں دیواریں

اداس کھڑکیاں نیلامے اگلتی ہیں
چھپے ہوئے تری یادوں کا سم ہیں دیواریں

یہ سنگ و خشت بھی احساس سے نہیں عاری
وہ دیکھو بارِ حقائق سے خم ہیں دیواریں

حصارِ ہستیِ موہوم توڑ دیں لیکن
ہماری راہ میں قول و قسم ہیں دیواریں

ہمارے سائے میں سورج پناہ لیتا ہے
شعاعِ کرب سے ٹکرا کے ہم ہیں دیواریں

اٹھو کہ منزلیں آواز دے رہی ہیں ہمیں
بڑھو کہ صرفِ نظر کا بھرم ہیں دیواریں

میں ممکنات کی حد سے گزرنے والا ہوں
کوئی پہاڑ اگاؤ کہ کم ہیں دیواریں

○

سمجھ سکا نہ کوئی رازہائے خاموشی
مجھے صلیب ملی بر بنائے خاموشی

اچھالئے نہ ہوا میں صداؤں کے خنجر
کہ چاک ہو نہ سکے گی ردائے خاموشی

کہاں کا ظرف کہ جب دورِ خودنمائی ہو
اتار پھینک سمندر قبائے خاموشی

میں آگہی کی کڑی دھوپ سے ہی پاؤں بچا
شعورِ ذات نہ دے انتہائے خاموشی

اٹھا لیا ہے جو خنجر تو سوچنا کیا ہے
مری زبان قلم کر برائے خاموشی

وہ اسکی اندھی عقیدت عجب مقام پہ ہے
تراش لے نہ کوئی بت خدائے خاموشی

خروشِ خواہشِ ہستی لہو میں ڈوب گیا
رگوں میں تیز رہی ہے نوائے خاموشی

○

شب زاد اندھیروں سے سحر پیدا کر
اس رات کی دیوار میں در پیدا کر

ممکن نہیں احساس مگر پیدا کر
کہسار کے سینے میں شرر پیدا کر

خاموش ہیں اخبار مرے بارے میں
اے دوست کوئی تازہ خبر پیدا کر

بے نام جزیروں کا پتہ دے یارب
پانی میں کوئی راہ گزر پیدا کر

اذہان پہ میری ہی حکومت کیوں ہے
اے وقت کوئی اہلِ ہنر پیدا کر

سید رونق رضا

ین جنگ ہارا ہوں لڑتے لڑتے تو نیند کی رَو اُچٹ گئی ہے
ترلس کے ایک وار ہی سے انا کی تلوار کٹ گئی ہے

میں ساحلوں کا سفیر بن کر چلا تو آیا ہوں پانیوں تک
مگر لگتا ہے دُور جیسے مرے تنفس کی کٹ گئی ہے

ہی جالا جالا پڑا ہے لمحے پرانی یادیں دھواں دھواں ہے
ہے طاقِ نسیاں میں کوئی صورت مگر غبار وہ بھی اَٹ گئی ہے

جو اس کے احساسِ برتری نے شکست کی شرط مان لی ہے
ری بالا قدی کی ضد بھی اُسی کی نسبت سے گھٹ گئی ہے

جہاں کے مختلف نمونوں میں کوئی شے مشترک ہے شاید
ترکِ شباہت کی سرحدوں تک نگاہ چہروں میں بٹ گئی ہے

سید شان معراج

وہ اک اداس سا عالم تمام عمر رہا
کوئی نہ کوئی ہمیں غم تمام عمر رہا

تمہارے بعد بہاریں اداس اداس رہیں
چمن میں گریۂ شبنم تمام عمر رہا

تجھے نہ بھیجا جو خط آنسوؤں سے لکھا تھا
ر یہ رنج ہے کہ وہ نم تمام عمر رہا

اری آرزو جلتی رہی اندھیروں میں
داغ زیست کا مدھم تمام عمر رہا

وہ ایک لمحہ کہ جس میں ملی تھی اُن سے نظر
ل ایک لمحے کا عالم تمام عمر رہا

ہیں سکون نہ پایا اسے خفا کر کے
ہا اپنے آپ سے برہم تمام عمر رہا

بد والوں سے اے شان ہم سے منفرد
بسوں پہ تبسم تمام عمر رہا

حال موسم کا ہی پوچھے گا وہ جب پوچھے گا
مجھ سے کب میری اُداسی کا سبب پوچھے گا

اس سے ملنے پہ خوشی کیسے چھپائی جائے
کیا بتائیں گے وہ جب وجہ طرب پوچھے گا

ڈال لو چہرۂ غمگیں پہ ہنسی کا عالم
کون اس حال میں رونے کا سبب پوچھے گا

اپنی تنہائی کو محصور کئے ہیں گھر میں
گھر سے نکلیں گے تو پھر شہر طرب پوچھے گا

میری بستی میں سبھی شام سے سو جاتے ہیں
کون مجھ سے سبب نالۂ شب پوچھے گا

کوچۂ عشق میں کیا عزتِ سادات کا غم
شان کوئی نہ یہاں نام و نسب پوچھے گا

آزادی — ایک نعمت — ایک موقع

37 سال قبل ہم نے غلامی کی زنجیریں توڑ دی تھیں اور ہم آزاد ملک کی صف میں شامل ہو گئے تھے۔
تب سے ہم نے زندگی کے تمام میدانوں میں نمایاں ترقی کی ہے۔

- آج ہمارے کسان قوم کی ضرورت کے لئے کافی اناج پیدا کرتے ہیں۔
- صنعتی پیداوار میں ہم نے دنیا کے تمام ملکوں میں ایک قابل فخر مقام حاصل کر لیا ہے۔

نیا بیس نکاتی پروگرام ہماری مسلسل عملی سرگرمیوں کا آئینہ دار ہے تاکہ سب کو سماجی اور اقتصادی انصاف مل سکے۔

صرف اسی نشانے پر کاربند رہ کر ہم اندرونی اور بیرونی خطرات کے خلاف اپنی آزادی اور ملکی سالمیت کا تحفظ اور دفاع کر سکتے ہیں۔

آئیے، آزادی کے 38ویں سال میں داخل ہوتے ہوئے ہم کڑی محنت اور مل جل کر کام کرنے کا عہد کریں۔ تبھی ہم اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔



84/98

شبیہہ عباس جارچوی (پاکستان)

سچ مچ کا شہزادہ

کریم بخش اس گاؤں میں تقریباً آٹھ سال پہلے آیا تھا جس وقت وہ یہاں آیا اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں سولہ سترہ سال کی عمر تھی، اس نے اس عمر میں نہ تو تعلیم ہی حاصل کی تھی نہ کوئی ہنر۔ رئیس اللہ بخش وڈیرے کے والد ابھی ش اس وقت زندہ تھے۔ انھوں نے جب پوچھا کہ ہٹا چھوکرا تو کہاں سے آیا ہے اور کس وجہ سے آیا ہے تو کوئی ریم بخش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جب انھوں نے بہت یادہ دھمکایا اور کہا کہ اس کا اس دنیا میں یا پھر ون سے نکل جاؤ تو کریم بخش نے جواب دیا کہ اس کا اس نیا میں کوئی نہیں ہے اور وہ مصیبت زدہ ہے کوئی رم نہیں ہے اور صرف سہارا چاہتا ہے۔ جب وڈیرے نے کہا کہ سہارے کے لئے کسی بڑے شہر میں چلا جاؤ تو کریم ش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے یہ منظر دیکھ کر ارسیلہ ل نے جو قریب ہی کھڑا تھا، کہا سائیں یہ غریب اور سہارا معلوم ہوتا ہے اسے گاؤں ہی میں رہنے کی اجازت ے دیں اور یوں ارسیلہ مغل کی سفارش پر اسے گاؤں رہنے کی اجازت مل گئی تھی۔

کریم بخش کو گاؤں میں رہنے کی اجازت تو مل گئی لیکن اب سوال روزگار کا تھا۔ روزگار تو شہر میں ہوتا ۔ دیہات میں اجنبی کے لئے روزگار کہاں۔ ارسیلہ ل کمہار کا کام کرتا تھا اور ہفتے میں پانچ دن تک مختلف م کے مٹی کے برتن جیسے گھڑے، صراحیاں، لوٹے اور لونے وغیرہ بناتا اور ایک دن جاکر قریب کے بے میں دکانداروں کو فروخت کر آتا تھا۔ ایک دن وہ کام سے چھٹی کرتا تھا کے پاس جیسے لوگ پیار میں بیلا بھی کہتے تھے۔ کام زیادہ تو نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے ایک ایسے مددگار کی ضرورت تھی جو اس کا تھوڑا بہت ہاتھ بٹائے۔ اس نے اپنے گھر سے ذرا فاصلے پر مٹی کا ایک مکان بنایا ہوا تھا جس میں آوا یعنی برتن پکانے کی بھٹی اور چاک یعنی وہ پاٹ تھا جس پر برتن بنائے جاتے ہیں اور کچھ جگہ برتنوں کے رکھنے کے لئے تھی وہیں ایک چارپائی پڑی رہتی تھی۔ دوپہر میں ارسیلہ اپنے گھر سے بچوں سے کھانا منگوا لیتا تھا اور کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کرتا اور پھر چاک گھمانا شروع کر دیتا اور اپنے ہاتھ کی مہارت سے مختلف قسم کے برتن ڈھالتا جاتا۔ برتن پکانے کا کام عام طور پر رات میں یا علی الصبح جب گرمی کم ہوتی۔

بیلے نے کریم بخش کو ایک ہفتے تک تو اپنے ساتھ بطور مہمان رکھا اور بعد میں کہا کہ میرے پاس کچھ زیادہ کام تو نہیں ہے لیکن اگر تم چاہو تو میرے ساتھ کام شروع کر دو۔ روٹی کپڑے کے علاوہ تمہیں تیس روپے مہینہ تنخواہ دوں گا اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ کریم بخش نے گویا اطمینان کا سانس لیا۔ کریم بخش نے دل لگا کر کام کیا۔ برتنوں کے لئے مٹی گوندھتا، بھٹی پر کام کرتا گدھے کی [illegible] اور چارے گھاس کا خیال رکھتا۔ جب اپنی خدمت اور محنت سے کریم بخش نے ارسیلے کے دل میں جگہ بنا لی تو اس نے اپنے ہنر اور پیشے کے دو اہم کاموں میں بھی اسے شریک کر لیا یعنی ایک تو برتن بنانے کے لئے چاک پر بٹھاتا اور اور دوسرے گدھا گاڑی میں مال سپلائی کرنا۔ کریم بخش

کو برتنوں ہی کے پاس پڑی چارپائی پر سوجاتا جبکہ اربیلا
مغرب کے لگ بھگ اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ وقت اسی طرح
گزرتا رہا اب کریم بخش کام پر پوری مہارت حاصل کرچکا
تھا بلکہ بعض کاموں میں تو وہ اپنے استاد سے بھی
آگے نکل گیا تھا۔ اربیلا اب ادھیڑ عمر ہوچکا تھا جبکہ
کریم بخش ابھی نوجوان تھا۔ اس لئے بھی اس کے کام کی
رفتار تیز ہوتی تھی۔ اربیلے نے متعدد مرتبہ اضافہ کرکے
اس کی تنخواہ ایک سو روپے مہینہ کردی تھی اور کہہ دیا کہ
اس سے زیادہ تنخواہ دینے کی گنجائش نہیں اور اگر وہ
چاہے تو زیادہ تنخواہ کے لئے کہیں اور کام ڈھونڈ
سکتا ہے۔ لیکن کریم بخش نے اس کے پاس سے کہیں
اور جانے سے انکار کردیا۔

اربیلا مغل کے چار بچے تھے ـــــ سب سے بڑا جو
اس وقت تقریباً اٹھارہ برس کا تھا، اس کا نام یوسف تھا
اس سے چھوٹی ایک لڑکی تھی جس کا نام فاطمہ تھا اس سے چھوٹی
زینب اور سب سے چھوٹا سکندر تھا۔ ان سب بچوں میں
دو دو سال کی چھوٹ بڑائی تھی۔ بڑا بیٹا شروع ہی سے
اپنی بے اولاد خالہ کے پاس شہر میں رہتا تھا۔ اربیلا اپنی
بیٹیوں کی شادی کے لئے فکر مند تھا اور بڑی بیٹی کے سلسلے
میں اس کی نظر کریم بخش پر لگی تھی لیکن کریم بخش کے ماضی
کے متعلق کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا اور یہی چیز اس پر اعتبار
کرنے کے معاملے میں رکاوٹ تھی۔ کریم بخش سے جب بھی
کسی نے کچھ کریدا تو اس نے یا تو بات ٹالنے کی کوشش
کی اور بہت زیادہ پوچھنے پر وہ رنجیدہ ہوجاتا اور
اسی سبب اس کے ماضی پر اب تک پردہ پڑا ہوا تھا۔

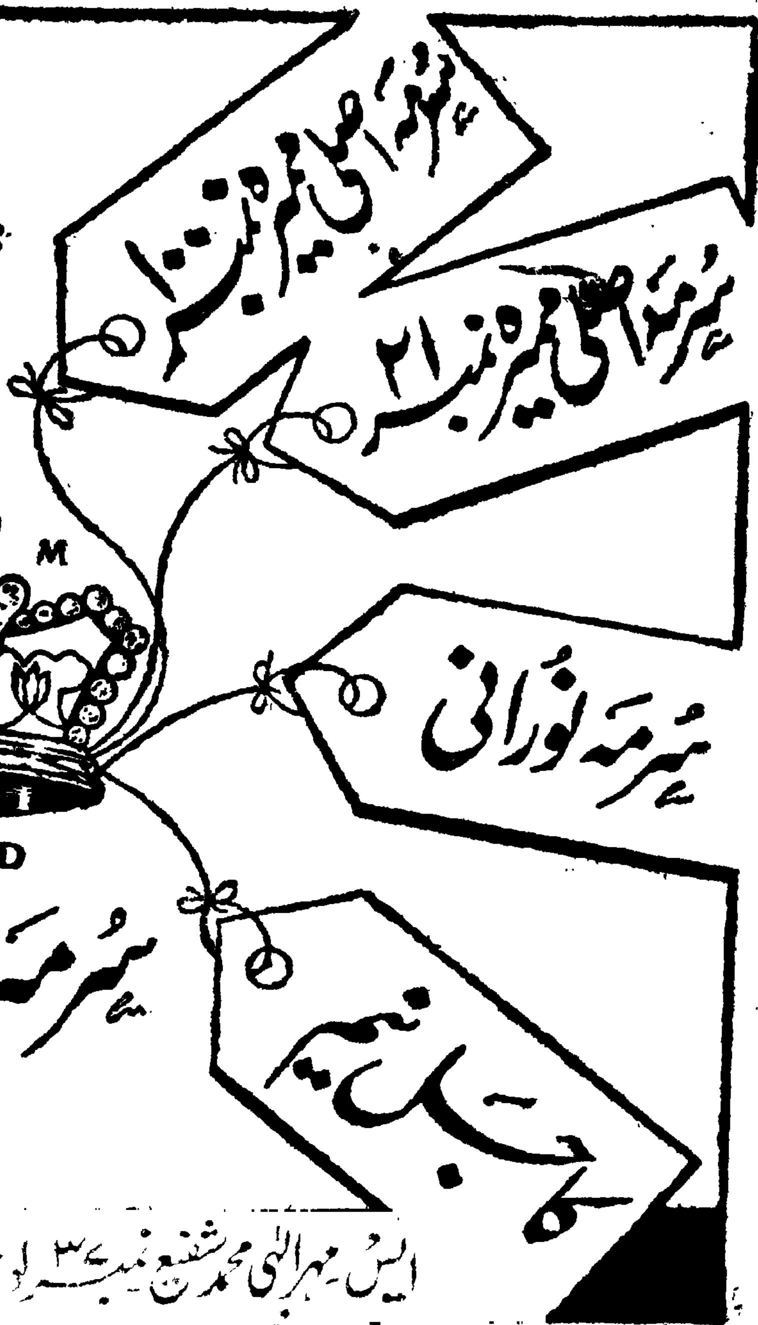
ایک دن صبح سویرے اربیلا چاک پر بیٹھا
تھا گرمیوں کے دن تھے۔ صبح چھ بجے کا وقت ہوگا۔ ابھی
اس نے چاک چلانا شروع نہیں کیا تھا کہ اس پر دل کا دورہ
پڑا اور آدھ گھنٹے میں چٹ پٹ ہوگیا۔ استاد کا بیٹا
یوسف جو شہر میں رہتا تھا۔ اب بجائے مہینے دو مہینے کے
ہر ہفتے ماں بہنوں اور بھائی کے پاس آکر مل جاتا اور
اپنی تنخواہ میں سے زیادہ رقم ماں کو دینے لگا لیکن وہ
مستقل طور پر گاؤں میں رہنے کو تیار نہیں تھا۔ کچھ عرصے
کے بعد استاد کی بیوہ نے استاد کے کام کی جگہ اور
ساز و سامان کریم بخش کو فروخت کردیا۔ یوسف کی ماں
سے عورتیں کہتیں کہ بھاگاں (فاطمہ) کی شادی کریم
بخش سے کردے لیکن وہ یہ جواب سن کر کہ اس کے
ماضی اور سگے والوں کا کچھ پتہ نہیں ہے تو کیسے لڑکی کا
ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دوں چپ ہوجاتیں۔

اگلے ماہ شاہ لطیف کا عرس تھا۔ اس عرس
میں گاؤں کے لوگ بھاری تعداد میں شریک ہوئے تھے
اور کریم بخش بھی اپنے استاد اور اس کے گھر والوں کے
ساتھ ہر سال جایا کرتا تھا۔ عرس کی تقریبات تین
دن تک ہوتی تھیں اور بیلے کے گھر والے اور کریم
بخش اور گاؤں کے دوسرے افراد جنہیں عرس میں شرکت
کرنی تھی۔ صبح سویرے ہی پہنچ گئے تھے۔ بھاگاں مزار
پر سے واپس باہر آئی تو اس نے بتایا کہ ایک عورت
اسے بتا رہی تھی کہ اس کا ایک بھائی جس کا نام کریم
بخش تھا عرصہ آٹھ سال سے غائب ہے اور وہ
اس کے لئے منت مانگنے آئی ہے۔ بھاگاں کی ماں
اس عورت سے ملی اور پوچھا کہ بی بی تمہارے بھائی کا
نام کیا ہے۔ بہن جی میرے بھائی کا نام کریم بخش ہے۔
آٹھ سال ہوگئے ہیں اس کا کوئی پتہ نہیں۔ ہر طریقے
سے تلاش کرچکی ہوں۔ اب ڈھونڈتی ڈھونڈتی یہاں
آئی ہوں۔ عورت نے ہمدرد پاکر ایک ہی سانس میں
اپنا دکھڑا بیان کردیا۔ بی بی اس نام کا لڑکا میں نے
سنا تو ہے جو ہمارے گاؤں میں کام کرتا ہے۔ شاید یہاں
بھی وہ آئے ویسے بہن تمہارا نام کیا ہے اور تمہارا
بھائی کس سبب سے لاپتہ ہوا ہے مجھے بھی کچھ تو بتلاؤ
بہن میرا نام صغریٰ ہے اور میں [illegible] کی رہنے
والی ہوں۔ ہم اپنے ماں باپ کی دو ہی اولادیں تھے
ایک میں ایک میرا بھائی جو مجھ سے دو سال چھوٹا تھا

جب میری عمر آٹھ سال اور بھائی کی چھ سال تھی تو ہمارے والد کو ہمارے مخالف قبیلے کے ایک شخص نے قتل کر دیا تھا اور قبیلے کے رواج کے مطابق میرے بھائی کو جوان ہونے کے بعد اس قتل کا بدلہ لینا ضروری تھا جس کے بعد ہمارے مخالف قبیلے کے لوگ اس کا بدلہ لیتے اور یہ چکر اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک کہ قبیلوں میں صلح صفائی اور تصفیہ نہیں ہو جاتا جب میرا بھائی گھر سے گیا اس وقت ہماری ماں زندہ تھی اور ہم دونوں ماں بہنوں نے اسے خود کہا کہ گھر چھوڑ کر چلے جاؤ اور ہمارے بہت زیادہ کہنے سننے کے بعد رات وہ ہمیں روتا چھوڑ کر گھر سے چلا گیا۔ کچھ عرصے بعد ماں مر گئی اور میری بھی شادی ہو گئی اور اب دو بچے ہیں۔ دونوں دشمن قبیلوں میں دو سال ہوا صلح صفائی ہو گئی اور جان و مال کے نقصان کا تصفیہ بھی ہو گیا۔ جب سے ہی میں بہت زیادہ پریشان ہوں اور دل کہتا ہے کہ صغریٰ تو نے ہی بھائی کو گھر سے نکالا تھا اب تو ہی اسے ڈھونڈھ کر لا۔ کچھ دیر بعد کریم بخش، صغریٰ اور صغریٰ کا شوہر اور بچے کوٹ مولا داد جانے والی بس میں سوار ہو رہے تھے۔



پرنٹر، پبلشر ایم اے ادریس نے ملت آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ ۶ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ سہیل گیا سائیڈ روڈ گیا ۸۲۳۰۰۱ سے شائع کیا



ہماری مصنوعات
تاج مارکہ
سرمہ اصلی ممیرہ نمبر ۱۰۰
سرمہ اصلی ممیرہ نمبر ۲۱
سرمہ نورانی
T M
REGD
سرمہ و کاجل
ایس مہر الٰہی محمد شفیع نمبر ۳۷

ارمیلا کول

مشرف عالم ذوقی

منتیں

کُشلا کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ سناٹے سے ابھرا ہلکا کھٹکا بھی سینے میں ہتھوڑے جیسا لگ رہا تھا۔ ایک سانس
م نام کی — تو دوسری واہ گرو تیری کرپا ...... دہشت اور وحشت کی آندھی میں اُس کا وجود ایک تنکے جیسا لرز رہا تھا۔
وہی سن سینتالیس جیسا ....

تاریخ کا دکھ پینتیس چھتیس سال کے بعد میں امن کا پرچم لئے خلا میں گھومتے گھومتے دوبارہ اپنے ہی گھر کے
نی دلدل میں پھنستا جا رہا ہے۔ وہ حیران تھی کہ یہ کیسی تبدیلیاں ہیں ...... تبدیلیوں میں کیسے کیسے خاندان ہیں۔
ئے ...... میرا پنجاب ....

پہلے بھی قصاب کی چھری چلی تیری گردن میں ...... آج کو پھر ذبح ہونے لگا......

ایک گہری سانس نکل گئی ...... کاش میرا پیرا تیرا اس خونی وحشت سے بری رہتا ... کاش .. کاش ..!!

کُشلا کا بچپن بھی تو دہشت اور وحشت کی فضا میں ہی پلا تھا ....

بھلے ہی جنگ عظیم کے خونی کارنامے نہ دیکھے ہوں لیکن آئے دن خاندان کے بجھتے دیے تو دیکھے ہیں.... محسوس
ے ہیں ..... جوائنٹ فیملی میں آئے دن کوئی نہ کوئی کہرام مچتا۔ بچے، بوڑھے ...... سبھی ایک دائرے میں بیٹھ جاتے...
ر ایک سے چھاتی اور جانگھوں پر دوہتھڑ مار کر "سیاپا" کرتے بیٹھ جاتے ...... لمبی لمبی تان کھینچ کر "دیوا" کا کام
وا "ستڑے ودھوا" کے خوفناک رنڈاپے کا احساس دلاتیں۔ "دی وہگت ہووا" امر ڈاہوا جوان" کہ
ارتیں ..... 'اچی پگڑی والیا ..... کتھے چھٹ گیا لال چوڑے والی نوں ..... ہائے ہائے شیرا ..... ہائے
ے میرا ......"

ڈری ڈری کُشلا چھپ چھپ کے تال کا "سیاپا" دیکھتی ..... بغیر سمجھے بینڈ سنتی۔ سہمی سہمی گوری
ری چھاتیوں پر لگاتار دوہتھڑ پڑنے سے ابھرے ہوئے لال چکتے دیکھتی ..... "پھوڑی بنتی۔ پھوڑی" اٹھتی...
ورتیب سے بھری جوانی میں "دہوتی" جڑ چکی تھی۔ سیرنی سے ہونٹ "آنکھوں میں پیاز سی" اور غلامی کا بھری زندگی..
لام پر گئے تھے چھوٹے چاچا۔ ابھی "کلیرے" (سہاگ کی نشانی) بھی نہیں کھلے تھے ..... کرمانے مورچے کا
کم آ گیا۔ پندرہ دن کے سہاگ پر سر کا لڑی تار "بجلی کے جیسا جسم گیا ..... "سالو پھٹ گیا"۔ سیندور پونچھ
دیا گیا ..... چوڑیاں توڑی گئیں ....

مورچے پر چندو کا کام آ گئے ....

کُشلا اس وقت چھوٹی سی بچی تھی۔ مورلی چاچی کی کو گھر دو سنگار دیتی، چمکتے مہندی رچے ہاتھ کے

دیکھتی۔ بھا نجھروں کے رم جھم تال پر کشلا، چاچی کے گرد ناچتی۔ مودی چاچی بھی اُسے بہت مانتی، محبت کرتی تھیں۔ آج قسمت ہی جیسے پلٹ گئی تھی۔ بڑی بوڑھیاں، مودان کو کھیتی، ابھاگن کہتیں تو وہ چپ چپ کر کشلا ٹکر ٹکر تاکتی..... اپنے فراک سے چپ چاپ چاچی کے آنسو پونچھ لیتی۔

اور اُس وقت انگریزوں کی جیت جب کی سلطنت میں منائی گئی تھی۔ دیپ مالائیں ہوئی مٹھائیاں بانٹی گئی تھیں۔ مگر کشلا کے خاندان میں ماتم کا وہی اندھیرا اب بھی بنا ہوا تھا۔ اسکول میں لڈو ل گئے۔ کشلا کا ہاتھ لینے نہیں بڑھا۔

رکمنی نے اُس کا ہاتھ کھینچ کر آگے بڑھایا۔ "دے دیجئے اِکشلی کو.......!"

ادھر پرنسپل نے دو لڈو اُس کے ہاتھ میں ٹھونس دیئے۔ کشلا لڈو لے کر گھر چلی آئی۔ جیب ننھے منے کو تھما دی۔ گھر میں تہلکا مچ گیا "لڈو کون لایا۔ کون لایا لڈو، کون سوگ میں خوشی منانے لگا ہے!" ممّو بوا نے لپک کر ننھے کے منھ تک آئے لڈو کو چھین کر کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔ ننھے کی چیخ جاگ گئی مگر معصوم کشلا جرم کے عجیب سے احساس کے تحت خاموش ہو گئی ــــــــــ

شمال مشرق کی سرحد کو چھوتا ہوا چھوٹا سا شہر..... کیمبل پور..... وسیع دریا کے کنارے کھڑا عالیشان تین منزلہ گھر..... شیشے ہی شیشے..... لوگ اسے کیمبل پور کا شیش محل کہتے۔ باہر آؤٹ میں بچپن کھیلا اور اس محل کے سارے چمکتے شیشوں پر گہرا رنگ پھیر دیا۔ دور تک پھیلے میدان ہمیشہ رونق رہتی۔ کبھی میلے یا دنگل کی چہل پہل یاری آگ آ جاتی۔ کبھی قواعد کرتے نوجوان مستعد دکھائی دیتے۔ کبھی لال کرتی جماعت کے لوگ۔ رام لیلا کے راون اور میلے تھے تو کبھی چھتے کو جلتے۔ کبھی ہولی تو کبھی محرم کے تعزیے۔ ملے جلے سب تہوار ات۔ نہ کوئی ہندو نہ مسلمان۔ روحانی بھائی چارگی۔ روزے رکھتا تو اسیم کے گلے سے نوالہ نہیں اترتا۔ اسیم روزے رکھ لیتا۔ عید مناتا۔ ہولی کی صبح کریم دوڑا آتا۔ اور بستر میں ہی یا لکہ ہولی کے رنگوں سے خراب کر دیتا۔

فرنگی حکمرانوں نے حکومت کی تباہی دیکھ کر نفرت کی ننگی تلواریں دونوں کے ہاتھوں میں تھما دیں۔ وہ پنجاب کے بدن میں بیچ بیچ کر کے اتر گئیں۔ رشتوں کی پاکیزگی نے خون کے حوض میں غسل کیا۔ باؤجی کا ستھ پتھ شور لاش چاچی کو چہرے کی نوک پر اچھال دیا گیا۔ آخری وقت کی دہشت دہ رہ چیخ آج تک وہ نہ بھول پائی..... وہ مودان چاچی..... امیر غریب سب بھیڑ بکریوں کی مانند ٹرکوں پر لاد دیئے گئے۔ لٹے ہوئے قافلوں پر بھی حملے۔ افراتفری میں سب ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ اور کشلا..... اپنی زندگی کے انوکھے تہہ باب میں داغ کوئی بھی تو نہ تھا جسے اپنا کہتی.......

بس ایک دیال تھا۔ جو دن بھر کی محنت کے بعد شام کو فوجی کیمپ میں لوٹتا تو ایک ڈبل روٹی اس کے ہاتھ میں ہوتی۔ ننھی سی بچی کی آنکھوں میں جانے کیسا جلوہ تھا کہ آدھی ڈبل روٹی اسے تھما دیتا۔ اور ہر شام ایک سہمی کیمپ کے باہر انتظار کرنے لگی..... دیال کا یا ڈبل روٹی کا..... اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ ڈبل روٹی کے ساتھ گڑ بھی تھا کشلا نے کہا..... ڈبل روٹی کے ساتھ گڑ کھانا پڑے گا۔ دیال کو اچانک چھوٹی سی معصوم بچی میں ایک گھریلو عورت کا احساس ہوا۔

کشلا نے دوبارہ کہا۔ "بھنا چنا گڑ زیادہ اچھا لگتا ہے۔"

چنا گڑھ... آنکھوں میں پھر کوئی ٹوٹا تارہ چبھ گیا...... حویلی کی بادشاہت..... درختوں تو کر چاکری فوج..... کھیت کھلیان...... خاندان عزت اور وقار کا عجیب سا ٹھہراؤ۔ ماں بھول جائے پھولوں جیسا برتاؤ۔ کسی نے پانی مانگا تو تھالی میں بھنا چنا اور گڑ بھی ساتھ جاتا۔ ساتھ میں لسی کا چھنا..... سادہ پانی پلا دینا خاندان کی عزت کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔

جمیلہ اور پھولاں کے خاندان میں ہمیشہ کا یارانہ تھا۔ نئی مخالفت ہوا نے جمیلہ کے بھائی کے دماغ کو بھی موڑ دیا۔ اور اس دن جمیلہ بدحواسی سی دوڑتی آئی۔ پھولاں آیا! کہیں بھی بھاگ چلو...... جمالو ابا کے بس میں نہیں ہے......خون ریزی کی دھن سر پہ سوار ہے......'

"کس پہ خون ریزی سوار ہے" جمالو ہوا کی تیزی کے ساتھ اندر گھس آیا۔

"بھائی جان! رحم...رحم بھائی جان ...... اس خاندان پہ رحم...... بخش دو...... بھا...ئی...جا...ن"

"ہم بخشنے کے لیے نہیں آئے...... ہٹ جاؤ پرے"۔

"بھائی جان خدا کا واسطہ ہے۔ دوستی کا واسطہ ہے......پھولاں بھی ساتھ گھر چھوڑ کر....."

"کافروں سے محبت اپنے مذہب سے غداری ہے یہ... یہ محبت تمہیں مہنگی پڑے گی"

"جان سے بھی!"

اور دوسرے ہی لمحے چھرا جمیلہ کی گردن کے باہر تھا۔ ایک عجیب خوف دیال پر طاری تھا۔ دوسری کوٹھی پر چھپا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مولی گاجر کی طرح سارے مرد کاٹ دیئے گئے۔ جمالو تے شاید دیال کی بند کلی سی ہیبت دلی کو چھوا ہی تھا کہ گرد اور سمرو کی آنکھوں میں مالک کا نمک گرج اٹھا......خبردار! آپ پر ہاتھ لگایا تو.... ہمارا مقصد فقط قتل ہے......'

دودھ دہی مکھن سے پیٹ بھرنے والے آج اس دہلیز سے خون پی کر رخصت ہوئے تھے۔ دیال کیسے بچ گیا وہ خود بھی نہ سمجھ سکا۔

چنا گڑھ کی یاد سے گرد سمرو کی دعائیں گرج اٹھیں ...... کرما والئے ...... بختاں والئے ...... تیرا کنبہ پھلے پھولے"۔

دیال کے اندر بجلی گر پڑی ...... دعائیں بددعائیں کیسے بن گئیں۔

وقت کے ساتھ سب کچھ بدلنے لگا.....

ایک دن ایک پلندہ دیال نے کشلا کو تھما دیا ———

"کیا ہے؟"

"کھول کے دیکھو"

چھینٹ کا گھگرا دیکھ کر وہ بولی "یہ کیوں لائے۔ پھر اپنے پھٹے فراک اور جانگیا سے خود ہی جھینپ گئی۔ آہستہ سے بولی۔ "تمہارا بھی پاجامہ قمیص پھٹا ہے"۔

"پھر پیسے جمع کروں گا تو....."

کشلا کی آنکھوں میں خواب تھرا گئے اور پھر ایک دن سرشار تھی کیمپ میں معمولی رسم سے کشلا اور دیال کی شادی ہو گئی۔ کشلا دیال کے لئے گیہوں چاول کی گٹھری باندھ دیتی اور دیال پٹڑوں کے کھمبے گرو کے پنکھوں

کا جاتا نکل جاتا۔ دام کھرے مل جاتے۔ دو ایک سال میں دیال نے ایک پرانی سائیکل خریدلی۔ پنجابی قوم بہادری کی لاکھوں کہانیاں منفرد عالم پر چھائی ہیں۔ گٹھڑ سے مقدر بنانے کا یہ سلسلہ کافی مدت سے چلا آرہا ہے کٹ پیسوں کے گٹھڑ سے کر کوٹھی کوٹھی چکر لگانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ ایک سرکاری مشین کشلا کو مل گئی۔ اب کوٹھیوں کے پوشاک سینے لگی۔ آنکھوں میں کبھی کبھی تھیل پورا اور شیش محل لہرانے لگتا۔ آنکھیں کھٹک جا مگر پنجہ صاحب کے کرشموں نے رحم کو پوری طرح بھر دیا تھا۔

یکا یک کشلا کو اپنی گود کے سونے پن کا احساس ہوا۔ انگلیوں پر ازدواجی زندگی کے ورق بننے لگے.... ۱ سال...... دو سال..... آٹھ سال..... کاش پنجہ صاحب اس کی پہنچ میں ہوتا۔ گرد مہر سے پتر گود آگیا۔ کشلا نے نام رکھا — مہر سنگھ — منت کے مطابق وہ اس کی گو تھنے لگی۔ ایک دن پگڑی کی رسم بھی کر دا مہر کے بعد تو گرد مہر کی جھڑی لگ گئی ...... شیکھر، سرلا اور نرملا —

بے گھر بچھڑوں کو سایہ مل گیا تھا۔ تنگ دستی کے دن کہانی بن چکے تھے۔ جیسے وہ اپنے بچوں کو کرتے اور اسی بہانے بھولے بچھڑے دوستوں کو یاد کیا کرتے۔ گھر کی منزلیں اٹھ گئیں تو بچوں کے مستقبل منصوبے بننے لگے۔ مہر ڈاکٹر بنے گا۔ شیکھر بڑا افسر بنے گا۔ پھر وقت کے ساتھ سرلا نرملا بی۔ اے کر گئیں۔ کے کپڑے کے مشہور بیوپاری سے سرلا کی "بیاہتا" گئی۔ نرملا شادی کے بعد امبالا چلی گئی — جن بیتا کرشن کی تیجی کے روپ میں۔ اس کا پتی مشہور نیڈر تھا۔ "انکار" کا سمپادک۔ انکار میں انکار دے کر کشلا کو بھی اپنے اس داماد پر ناز تھا۔

کشلا کی صحت اب گرنے لگی تھی۔ دیال نے مہر کی شادی کی بات چھیڑی۔ کشلا کی آنکھوں میں ننھے تارے ابھر آئے۔ مہر نے اب وہ گھبرانے لگی تھی۔ کچھ ہی روز پہلے مہر نے اچانک سوال داغا تھا۔

"میرے کیس کیوں رکھے بی بی! شیکھر کے کیوں نہیں رکھے؟"

"پتر تیرے لئے منت مانگی تھی۔ واہے گرو کی مہر سے مجھے تیرا پرشاد ملا تھا۔"

"یعنی ہندو کے گھر سکھ؟"

"پتر! ہندو اور سکھ دو تھوڑے ہی ہیں۔ ماں بھگوتی اور رام کے اپاسک ہی تو نانک جیسے سنت شیش ہیں۔ مغلوں سے ٹکر لینے کے لئے گرو گوبند سنگھ نے بہادر ہندوؤں کی جماعت بے کر خالصہ کی رکھی۔ پتر! پنتھ تے سنتوں نے، گروؤں نے، پیغمبروں نے کسی بھی قوم کو بیر نہیں سکھایا۔"

"یہ سب ڈھکوسلہ ہے بی بی! ہندو ہندو رہیں۔ سکھ سکھ۔"

"نہیں پتر۔ یہ ایک ہی ہیں۔"

"اور بڑا ہو گیا...... بی بی! تم نے خود ہی اپنے گھر پھوٹ کا بیج بو یا ہے۔ ایک سکھ دوسرا ہے سرلا اور نرملا کو بھی تم نے کیس دھاری سے نہیں بیاہا۔ کیوں؟"

معصوم کشلا اپنے معصوم بھول کی گنہگار ہو گئی تھی۔ وہ کیا کہتی کہ پتر منتوں کا پرتاپ دیکھ تو پنجاب کے شہر شہر گاؤں گاؤں میں دیکھ۔ ہندوؤں نے بھی منتیں مانگ کر کیس دھاریوں کی یوں اضافہ کیا ہے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ ایک دن یہی منت بد دعا بن جائے گی ......!

لیکن پتر کے لئے کچھ بھی نہیں پڑا۔ منتوں کی پاکیزگی اور معصومیت وہ کیا جانے؟ وہ کیس دھاری

کیس دھاریوں کا ہے۔ کیس دھاری اس کے ہیں۔ جو کیس دھاری نہیں ہیں۔ وہ اس کا نہیں ہے۔ نیا بھی نہیں۔ شیکھر بھی نہیں۔ سرلا، نرملا بھی نہیں۔ کیونکہ ان کے پتی کیس دھاری نہیں ہیں۔ ہرمیش لال کھنہ کی بیٹی کا رشتہ اس نے اس لئے ٹھکرا دیا تھا۔ اور نریندر سنگھ نرخان کی بیٹی مہندر کور سے گرنتھ صاحب کے سامنے پھیرے لے لئے ——— تبدیلیوں کے کانٹے نے تو کشلا کو ان تمام باتوں کا عادی بنا دیا ہے۔ لیکن باپ اپنا غم کیسے دکھاتا۔ اندر ہی اندر ٹوٹ گئے۔ مہر نے ام اے کا امتحان چھوڑ دیا۔ اور سسرال میں ہی بس گیا۔ عجیب و غریب انداز سے کیس دھاریوں کے ماحول میں ضم ہو گیا۔ بچپن سے آج تک کا تمام واقعہ نہاں خانے میں دفن ہو گیا۔ کشلا اکثر بیٹھ کر سوچا کرتی۔ تمام واقعات کو سلسلہ وار جوڑا کرتی۔ فرشتے جیسا باپ ..... ماں گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر گیتا، جپو جی، گرنتھ صاحب، گٹکا اور سکھمنی کا پاٹھ کرنے بیٹھ جایا کرتی۔ اس کا مذہب کتنا عظیم ہے ..... یہ خیالات کے لوگ نانک صاحب جیسے پیر کے اس ست کے ماننے والے تو نہیں لگتے؟ یہ تو کوئی اور ہیں ..... کوئی اور ہیں ..... پوجا کی جگہوں پر سلاح ساز کے ڈکیو ہیں ..... سلاح شوروں کی ٹاپوں کی صدائیں کیوں ہیں؟ یہ کون ہیں جنہوں نے پوجا کرنے کی جگہ کو اسلحہ خانہ بنا رکھا ہے۔؟

اور مہر ہزاروں سوالات کے تہ خانہ میں قید ہو جاتا۔ آہستہ آہستہ مہندر کے بھائی کرپال سنگھ نے ان باتوں سے آگاہ کر دیا ..... جیجا جی! یہ جہاد ہے ..... سکھوں کا جہاد ہے ..... اور مذہبی تعصب کا سا گہرا رنگ اس کے چہرے پر پوت دیا۔ ———

اور پھر ایک نئی دور زندگی کی شروعات ہو گی ———
کرپال سنگھ پنجاب کا رنجیت سنگھ بننے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ مہر اس کا سپہ سالار۔ مہر نے جگہ جگہ کی مدد کی۔ ام۔ [illegible] ۔ اس پاس نہیں کیا تو کیا ..... وقت بے وقت چھپے ہوئے زخمیوں کی مرہم پٹی کرتا وہ جانتا ہی تھا۔ کرپال سنگھ کی فلاسفی کبھی کبھی سمجھ میں نہیں آتی۔ اور آخر مہر نے اپنی روح میں ایک نشتر اچھال۔ دولت کہاں سے آتی ہے ..... اُسے ان باتوں سے کیا مطلب؟

شیکھر کو مہر کے رویے سے تکلیف پہنچی تھی۔ دہشت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ لوگوں کے چہرے خوف سے پیلے ہوئے جا رہے تھے۔ آئے دن قتل۔ ہر جانب بربادی کے آثار۔ وحشت کا رقص ..... قاتل کا دور دور تک نام نہیں۔ اور ایسے حالات میں زندگی سود سی تھی ..... موت کی انگلی پر بکھر آئی۔ پی۔ اس کمپلیٹ کر گیا تھا۔ اس۔ ای تیج پال سنگھ کے ساتھ اس کی ٹریننگ شروع ہوئی۔ تیج پال سنگھ دہشت پسند عناصر کو کچلنے کا عزم کر رکھا تھا۔ اور پھر ایک دن سننے میں آیا ..... اس۔ پی صاحب کا نام دہشت پسندوں نے آگے مارے جانے والوں کی لسٹ میں لکھ لیا ہے ..... اس پی صاحب نے شیکھر کو بلایا۔ آہستہ سے بولے .....

"شیکھر تمہارا میرے ساتھ رہنا خطرے کو دعوت دیتا ہے۔"
"کیا مطلب سر؟"
"میری وجہ سے تمہاری جان ....."
"پولیس کی نوکری لیا جاؤں کی کیا پرواہ ....."

"شاباش میرے نوجوان ...... پھر بھی ...... اس پی صاحب مسکرائے ......

"ڈانٹ وری سر۔" شیکھر نے مستقل مزاجی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

اور اُدھر کشلا کی زندگی میں ایک اور اس شروعات کا سورج طلوع ہو گیا۔ دیال کے شوروم کے شیشے توڑ ڈالے گئے۔ اور وہی وحشت کا رقص آنکھوں کے آگے دھواں دھواں بن کے لہرا گیا ...... کشلا نے ہی کے دہاتے پر آنے والے کل کا منظر دیکھ رہی تھی ......

انگارے کی لہو لہو سرخیوں نے اک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ زمانے کی تلخ سچائیوں کا پردہ فاش کرتے ہوئے صورت حال کا گھناؤنا چہرہ عوام کے سامنے رکھا تھا۔ قلم میں بیباکی کے عنصر تھے۔ سرحد پار سے نقلی سکھوں کی گھس پیٹھ، توڑ پھوڑ کی کارروائی، چوری چھپے اسلحوں کا آنا، غیر ملکی طاقتوں کا دہشت پسند عناصر کا ساتھ دینا ...... یہ سرخیاں تھیں کہ کشلا بربادی کے چہرے کو بڑے قریب سے دیکھ رہی تھی ...... اور پھر ایک دن موٹے حاشیئے میں ہری کرشن کی تصویر دیکھ کر وہ چیخ اٹھی ——— ہائے نرملا ......

مگر آنسو کہاں تک نکلتے ...... سرلا کے سسر کے تھوک کپڑوں کی گانٹھوں میں آگ لگا دی گئی تھی یہ کیا ہو رہا ہے .... واہے گرو تیری کرپا .... ہے رام ..... یہ کیسا چکر ہے ..... ایک کے بعد دوسرا لمحہ ...... شیکھر تو بھی تو اکیلا چھوڑ کر خطرے کی گود میں چلا گیا ہے ......

کشلا کی آنکھوں نے کتنے ہی خواب گھڑ لئے تھے ......

دیال کیا ..... گھبرا کیوں ہو ..... تم نے تو دھوپ کی تمازت دیکھی ہے ......"

وہ دیال کے سوکھے چہرے کو تاکتی ——— "اپنا چہرہ دیکھا ہے .... دن بدن سوکھتے جا رہے ہو۔ آخر میں تنہا کیسے بن جاؤں ...... ماں ہوں ......"

اور آنکھوں میں جانے کہاں سے جہر کی صورت ناچ جاتی ...... تونے دعاؤں کی صورت یہ کیسا پرساد دیا .... ہری کرشن چلا گیا۔ نرملا پر قیامت آ گئی۔ سرلا کو بھاری نقصان ہوا ..... اور شیکھر ..... دیال کی جھریاں کانپ اٹھیں ....

نرملا نے انگارے کی باگ ڈور تھام لی۔ اور پھر وہی لہو لہو سرخیاں تھیں ——— بیتی کا امر چہرہ تھا .... جیب پریم، اس پی تیج پال سنگھ بال بال بچے .... نو دس زخمی ...... اسپتال میں بم کے چھرے جسم سے نکالے گئے ..... اب حالت خطرے سے باہر ......

اور ان بہت ساری سرخیوں میں ایک سرخی اور پھر نمایاں ہوئی ...... ایک رات اسپتال کے بستر پر ہی شیکھر کی ہتھیا کر دی گئی ..... قاتل پوجا استھل میں جا چھپے ...... تیج پال سنگھ پر دوبارہ حملہ آخری ثابت ہوا ....

اور فساد بڑھتا جا رہا ہے ...... لہر پھیلتی جا رہی ہے ......

کرپال سنگھ گرفتار ...... دوسرا فرار ...... دہشت پسندوں کے خلاف پولس کی سخت کارروائی کی مانگ اور جوابی دھماکے ..... پوری طرح سے کشلا بے حس ہو گئی۔ دل نے دھڑکنا بند کر دیا۔ اخبار ہاتھ سے چھوٹ گیا ...... بس اتنا کہہ سکی .... میری منت "میرا پرشاد .... واہے گرو .... تیرا گھر ..... میرا گھر ....

اور غش کھا کر زمین بوس ہو گئی ———

۲۰ نکاتی پروگرام — خاص کامیابی

وزیرِ اعظم کے ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت ترقی کے لئے کئے گئے مختلف کوششوں اور
میابی کے لئے پلاننگ کمیشن نے صوبائی حکومت کی کافی تعریف کیا ہے۔ پلاننگ کمیشن
کے ذریعہ ۹۰ فیصد یا زیادہ ٹارگیٹ کو پورا کرنے کی تاکید کو 'بہت اچھا' کہہ کر مخاطب کیا
گیا ہے۔ اس کوٹی میں سمیکت گرامین وکاس پروگرام آتا ہے، جس سے ۳٬۵۲ کے
ٹارگیٹ کے خلاف ۴۵ ا٬۳۰٬ ۴ خاندان کو فائدہ ہوا ہے جو ۱۲۲۰۱ فیصد کامیابی ہے۔
اس طرح بندھوا مزدوروں کی مکتی کے پروگرام میں ۶٫۵۰٫ ا فیصد کی٬ انوسوچیت ذات کے
خاندانوں کو مالی مدد کے سلسلے میں (جس سے ۹۶۸٬ ۲۲٬ ا خاندانوں کو فائدہ ہوا ہے)
۲۶۱۰۱ فیصد کی٬ پانی کی دشواری والے گاؤں کو پینے کے پانی کی آسانیاں فراہم کرنے
میں ۸٫۹۹ فیصد کی٬ بے زمین لوگوں کے بیچ رہائشی زمین کے بٹوارے میں ۹۹٫۱ فیصد
کی٬ کمزور لوگوں کے لئے گھروں کی تعمیر میں ۴٫۱۰۱ فیصد کی٬ پیڑ لگانے میں ۸٫۱۰۲ فیصد
کی٬ بائیو گیس پلانٹ لگانے میں ۲۴ فیصد کی اور پرائمری ہیلتھ سنٹر اور سب سنٹروں
کی تعمیر میں ۵٫۰۰۱ فیصد کی٬ کامیابیوں کو بھی 'بہت اچھا' کی کوٹی میں رکھا گیا ہے٬ جہاں
کامیابی ۸۰ سے ۹۰ فیصد ہے اسے صرف اچھا کہا گیا ہے۔ اس کوٹی میں بھومی سدھار پروگرام
کا ذکر کیا جاسکتا ہے، جس میں بھومی ہینوں کے بیچ ۶۶٬۲۰ ایکڑ زمین کا بٹوارہ کیا گیا
ہے۔ یہ کامیابی ۸۲٫۷ فیصد ہے۔ انوسوچیت ذات کے خاندانوں کو دی گئی مالی مدد میں
۸۴٫۱ فیصد٬ جھگی جھونپڑی کے سدھار میں ۸۲٫۵ فیصد اور گاؤں میں بجلی کی فراہمی
میں ۸۲٫۲ فیصد کی کامیابی ہوئی ہے۔ یہ خاص بات ہے کہ ۵۴۰۰ گاؤں میں بجلی لگانے
کے ٹارگیٹ کے خلاف ۳۶۹۹ گاؤں میں بجلی لگائی گئی ہے۔ یہ ساری کامیابی پچھلے مالی
سال کا ہے۔

सू० प्र० स० नि०-178 ग (सू-152)/84-86

گیا ضلع کے بڑھتے قدم

گیا ضلع میں اس سال جون مہینے سے ہی اچھی بارش ہونے کی وجہ سے دھان کی فصل بہت سالوں کے بعد بہت اچھی طرح لوگ لگا سکے ہیں۔ کسانوں کو بیج اور کھاد ٹھیک وقت پر مہیا کیا گیا ہے۔ اس سال راشٹریہ گرامین نیوجن پروگرام کے تحت بہت سارے اسکول بھون، پنچایت بھون، کلبھرٹ، گاؤں کی سڑکیں، آہر پئین وغیرہ کا کام لیا گیا اور کافی تعداد میں عوامی ملکیت کو بچایا گیا۔ ضلع میں اس کے علاوہ اور بھی ترقی کا کام جیسے کریش پروگرام کے تحت بورنگ، آر۔ ایل۔ ای۔ جی۔ پی۔ آئی۔ آر۔ ڈی۔ وی کا کام بھی بہت اچھا ہوا ہے۔ ہریجنوں کو سیلنگ میں دی گئی زمین پر "بھوی سنگرکچھن" کا کام دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بورنگ کرواکر سینچائی کا کام بھی انتظام کیا گیا ہے۔ اس طرح کا کلسٹر کوسا بیجا (شیر گھاٹی)، گوگا (مان پور) کے علاوہ کئی اور جگہوں پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ہریجنوں کے مکان کا کھپرا کرن کرنے کے لئے ایک خاص اسکیم چلائی گئی ہے۔ اس اسکیم کے تحت اب تک چار ہزار سے زیادہ مکانوں کا کھپرا کرن کر دیا گیا ہے۔ امن و قانون کی حالت بھی اس ضلع کی بہتر ہے۔ پولس کے ساتھ کئی نکسلی اور جرائم پیشہ افراد مارے گئے اور ان کے پاس سے ناجائز ہتھیار بھی برآمد کئے گئے۔ اس ضلع میں میٹرک، انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے کا امتحان بھی بخیر و خوبی انجام پایا۔ ضلع میں درخت لگانے کا کام بڑے پیمانے پر کیا جا رہا ہے۔ سرکاری زمینوں، اسکول کالج کے میدان میں اور ندی کے کنارے پر کافی تعداد میں درخت لگائے گئے ہیں۔ گیا میں ٹیلی ویژن ریلے سنٹر کا افتتاح ۳۱ جولائی کو ہوا۔ ٹی۔ وی کے ذریعے عوام کا بہتر منورنجن کیا جا رہا ہے۔ خاص کر اولمپک دیکھنے کا ایک اچھا خاصہ موقع مل گیا۔ گیا میں اس سال پتر پکچھ میں کافی تعداد میں تیرتھ یاتریوں کے آنے کی امید ہے اور اسی لئے ان کے رہنے اور تمام سہولیات مہیا کرانے کے لئے بہتر انتظامات کئے گئے ہیں۔

دستخط:- کرتی چند ساہا
ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ گیا

जन 9/८४ नगर संप० [illegible]

نئی کتابوں کا تعارف

نام کتاب : سمندر پھر بلاتا ہے
صنف : شعری مجموعہ
مصنف : عرفی آفاقی
ضخامت : ۱۹۲ صفحات
قیمت : ۳۰ روپے
پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

عرفی آفاقی کا نام اگرچہ دنیائے شعر و ادب میں
[معر]وف نہیں ہے۔ لیکن ان کے کلام کی پختگی اس بات کا پتہ
[دیت]ا ہے کہ یہ مشاق اور تجربہ کار شاعر ہیں۔ شاعری کی
[ا]ن کے دو رویے عام طور پر ہمارے یہاں نظر آتے ہیں
[پہ]لا یہ کہ کوئی اپنی غیر معمولی تخلیقی اپج کی بدولت بغیر
[کسی] شعری ماحول اور تربیت کے بھی اپنے طور پر اپنے شعری
[اح]ساسات کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ دوسرا رویہ یہ ہوتا
ہے جہاں کوئی شخص مضبوط خاندانی شعری روایات
[س]ے متاثر ہو کر یا اہل خاندان اور اہل ہنر کی صحبتوں
[س]ے مستفیض ہو کر شعر و سخن کے میدان میں آتا ہے۔

عرفی آفاقی کو ہم مذکرہ بالا دوسرے رویہ
سے متاثر دیکھتے ہیں۔ انہیں لکھنؤ کی صاف ستھری اور
پاکیزہ زبان کا ماحول ملا۔ وہاں کی ادبی سرگرمیوں میں
شریک رہنے کا موقع ہاتھ آیا۔ اس لئے ان کے تخلیقی شعور
میں روایات کو بڑا دخل رہا ہے۔ لیکن چونکہ ہر اچھا
شاعر اپنی شناخت کے لیے روایت سے ہٹ کر
کچھ نئے نقوش بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے عرفی
آفاقی نے بھی اس منفرد پہچان کے لیے جد و جہد کی
ہے۔ چنانچہ "دوہا چھند" اور "سری چھند" میں کہے
گئے ان کے اشعار "DUET" کے فارم کی
تخلیقات نیز نئی ہیئتوں کی حامل نظمیں انہیں روایت
سے منسلک رہنے کے باوجود کہیں کہیں الگ رکھنے کی
کوشش کرتی ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عرفی
آفاقی کے فن میں روایت بنیادی محرک کا کام کرتی ہے
ان کی غزلوں میں جگہ جگہ مقامی اثرات نمایاں ہیں خاص
طور پر وہ خصوصیت بیشتر جگہوں میں دکھائی دیتی ہے
جسے ہم دبستان لکھنؤ کی خصوصیت کا نام دیتے چلے آئے
ہیں۔ مثلاً یہ اور ان جیسے اشعار اس مجموعے میں متعدد

جگہوں پر ملتے ہیں ؎

چلا ہی تھا دلِ وارفتہ سوئے کنج دہن
کہ چپکے چپکے اشاروں میں کچھ ذقن نے کہا

یا

کھنکا کے وہ کنگن تپشِ شوق بڑھانا
دکھلا کے لبھانا ہے وہ گلزار حنا یاد

عرفی آفاقی کے یہاں اپنے روایتی ماحول کے مثبت نقوش بھی نظر آتے ہیں۔ ایجاز و اختصار، برجستگی اور بے ساختگی نیز تصویر کشی کی خصوصیات انہیں اپنے ماحول سے ہی حاصل ہوئی ہیں۔

عرفی قدرتِ کلام کے حامل ہیں۔ وہ طرح طرح کے موضوع کو کامیابی کے ساتھ نظم کر دیتے ہیں۔ ان کے یہاں کئی جگہوں پر ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جن سے روایت سے انحراف کی ایک خوبصورت دلیل ہاتھ آجاتی ہے۔ یوں تو ان کی غزلوں کے موضوعات وہی پرانے موضوعات ہیں۔ لب و لہجہ بھی بالعموم وہی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے اشعار کی بنا پر عرفی کو اختصاص اور امتیاز کی کوئی سند نہیں دی جا سکتی۔ لیکن مجموعے میں کچھ اشعار ایسے ضرور ہیں جن سے تازگی کا احساس ہوتا ہے مجھے عرفی کے ان اشعار نے اپنی طرف متوجہ کیا ہے ؎

ہم آپ گلو ہیں، آپ خنجر!
خود اپنی ہی پیاس ہو گئے ہیں

ورنہ چیخ اٹھیں گے اندرون کے سناٹے
منہ میں ہے زباں جب تک بولتے رہو یارو

عمر! اے عمرِ دو روزہ، ترے سو جاں سے نثار
حادثہ پیش نہ آئے بھی تو بیماری

اتنے رسمی ہیں سب آداب کہ جی چاہتا ہے
بات وہ کیجیے اب جس سے دل آزاری

حاصل زندگی ہوگئے ہیں :

مجھے کچھ لا ئیگاں رائیگاں سے

اس مجموعے کے سلسلے میں فلیپ پر ڈاکٹر سلمان
ی اور مولانا شمس تبریز خاں کی رائیں پیش کی گئی
۔ موخر الذکر نے عرفی آفاقی کو نظم کے مقابلے میں غزل کا
قرار دیا ہے ۔ میں اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا ۔
آفاقی کی نظمیں موضوعات ، بحر و وزن ، ہیئت اور
TREATMENT کے اعتبار سے زیادہ ہی
ے ہیں ۔ نظموں میں روایتی نقوش دھندلے دکھائی
ہیں ۔ چند عنوانات سے ہی اس کا اندازہ ہوجاتا ہے
نذر مکھنڈر شہر غزل ، سمندر پھر بلاتا ہے ، توئیں
شاف ، ایک آوارہ شام ، کاروبار ، اور مجھ
ی جیسے عنوانات شاعر کے جدت نواز ذہن کے
۔ صرف عنوانات ہی نہیں بلکہ موضوع اور ہیئت
سے بھی ان نظموں میں تخلیقیت کی تازہ کاری
دیتی ہے ۔ ایک شام ، کاروبار ، انکشاف اور
بیچ نظمیں تو اس تاثر کو قطعی زائل کر دیتی ہیں ۔
آفاقی کی روایت بردوش غزلوں کے مطالعہ سے
ہا تھا ۔

عرفی آفاقی کی شاعری عظیم اور بہت حسین نہ ہی
ی پر ایک اچھا تاثر قائم کرتی ہے ۔ کتابت و
یہ سلیقہ مندی ہے ۔ عرفی آفاقی اگر نظموں پر
یہ دیتے رہے تو اچھی بہتر شناخت دے

ـــــ ڈاکٹر علیم اللہ حالی

نام کتاب : متاع ہنر
صنف : شعری مجموعہ
مصنف : رونق سیمابی
ضخامت : ۱۲۵ صفحات
قیمت : ۱۶ روپے
پتہ : نکھار پبلی کیشنز ، مئوناتھ
مئوناتھ بھنجن ، (یوپی)

" متاع ہنر " اردو کے کہنہ مشق اور معروف شاعر
رونق دکنی سیمابی کا مجموعۂ کلام ہے ۔ رونق دکنی سیمابی
کی عمر آج لگ بھگ اسی سال کی ہے ۔ انہوں نے شعور
حاصل کرنے کے بعد سے شعر کہنا شروع کر دیا ۔ الحال آج
تک ان کا یہ تخلیقی سلسلہ جاری و ساری ہے ۔ ظاہر ہے کہ
جس عہد میں انہوں نے شعری شعور سنبھالا ۔ وہ روایتی
اقدار سے مملو تھا ۔ شاعری کرنے کے لئے استاد کا سہارا
ضروری سمجھا جاتا تھا ۔ زبان کے نوک پلک ، الفاظ کی
نشست و برخاست ، رعایت لفظی اور فصاحت و
بلاغت جیسی خصوصیتوں پر توجہ دی جاتی تھی ۔ لیکن
جب سے لے کر اب تک زندگی کی قدروں کی طرح شعر و
ادب کی قدروں میں بھی بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں ۔
موضوعات ، الفاظ اور اشارات ہر لحاظ سے روایتی
تغیرات میں فنی قدروں میں بہت سی تبدیلیاں پیدا
کر دی ہیں ۔ ہم رونق دکنی سیمابی کی شاعری کو ان
کے ابتدائی عہد کی قدروں کی روشنی میں دیکھنے اور سمجھنے
کی کوشش کریں ۔ تو ہمیں ان سے کوئی مایوسی نہیں ہوگی

پیش نظر مجموعہ میں نظمیں اور غزلیں دونوں ہیں۔ رونق دکنی کی غزلوں میں زبان کا رکھ رکھاؤ اور ترکیبوں کا شکوہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ان کا لب ولہجہ باوقار ہے۔ ان کے موضوعات منقبت اور تعمیری ہیں۔ زبان پر ان کی زبردست گرفت ہے اس حقائق اور شکایت کے بعد شاعر کا یہ کہنا حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ ؎

نئی نسلیں سنور سکتی ہیں مجھ سے
کہ ماضی کا میں اپنے آئینہ ہوں!

اس میں شک نہیں کہ نئی نسل ابھی باقیات الصالحات سے فکر و نظر اور زبان و بیان کے بہت سے نکات سیکھ سکتی ہے۔

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ رونق دکنی کی تراکیب میں ایک خصوصی شوکت و رفعت ہے۔ انہوں نے میان درد، حریف تشنہ جام و سبو، خورشید فردا، رنگش شبنم بے محابا احساس کرب، عفت حسن، صمیم قلب تقدیر بے بس نگہ نیاں، نوید شرکت بزم طرب موج خون تحمیل تقسیم بادہ، محیط جہل تعصب حجاب ابطال حقیقت اور اس طرح کی تراکیب کو شعری قالب عطا کرنے کا حق اور فن سخن کی پہچان دی ہے۔
جناب رونق دکنی کو حضرت قادر بلکھوری اور حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی سے تلمذ کا شرف حاصل ہو چکا ہے یہی وجہ ہے کہ ان

کلام سے زبان کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اشعار فنی اعتبار سے درست ہیں۔ لیکن ایک جگہ وہ ایک اضافت کے سلسلے میں یا تو دھوکہ کھا گئے ہیں یا کتابت میں کہیں کوئی غلطی ہوئی ہے ان کا شعر ہے۔

سفر کٹھن نہ سہی، آدمی سے انساں تک
مگر یہ جرأت بشری بھٹک نہ جائے کہیں

میری گزارش ہے کہ "جرأت بشری" مسکون شین غلط

اور بہ حرکت شین پڑھا جائے تو مصرع ساقط الوزن ہو جاتا ہے۔

میں اپنے آپ کو تو اس لائق نہیں سمجھتا۔ کہ رونق دکنی جیسے کہنہ مشق فن کار کی شاعری میں کسی طرح کی تبدیلی و اصلاح کا کوئی مشورہ دوں لیکن جی چاہتا ہے کہ کسی پختہ کار شاعر کا ہر شعر بیان و زبان کے اعتبار سے ہمارے لئے ایک مشعل راہ بن جائے۔ بسا اوقات بعض معمولی تبدیلیوں سے شعر میں زبردست انقلاب پیدا ہوجاتا ہے۔ جناب رونق دکنی کا ایک شعر یوں ہے کہ

میں چل پڑا تو لوگ میرے ساتھ ہو لیے
انداز رہبری کا مری رہ روی میں تھا

شعر بہت اچھا ہے لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ دونوں مصرعوں میں معنوی ربط مضبوط کرنے کے لیے اگر پہلا مصرع یوں ہوتا تو اچھا تھا کہ:

یوں چل پڑا کہ لوگ میرے ساتھ ہو لیے

اسی طرح رونق دکنی کا ایک شعر ہے

وہ ہوں کتاب زیست کی تحریر معتبر
حرف غلط کی طرح مٹایا گیا ہوں میں

مجھے لگتا ہے پہلے مصرعے میں "وہ" کی بجائے "گو" ہونا چاہئے۔ میں ادب و فن امور کے سلسلے میں رونق دکنی سیمابی کی ہدایت و وضاحت کا منتظر رہوں گا۔

اس مجموعہ کلام میں کئی خوبصورت نظمیں ماں، وا ہے، حادثے، سایے، آئینے، وقت رہم بھی، اور احساس کے وغیرہ۔ ایسی منظومات ہیں جن کو بھی اچھے فن پارے کے مقابلے میں رکھی جا سکتی ہے تمام شعر ایک کامیاب فن کار کی خوبصورت تخلیقات ہوتی ہے ——— ڈاکٹر علیم اللہ حالی

نام کتاب: کردار کے غازی۔ قاضی محمد عدیل عباسی
مرتب: ڈاکٹر اختر بستوی
ضخامت: ۲۲۶ صفحات
قیمت: ۱۴۰ روپے
پتہ: مرزا اینڈ سنس، ریتی کا پل
گورکھپور (یو۔پی)

پیش نظر کتاب میں مرتب ڈاکٹر اختر بستوی نے وہ مقالات اور منظومات یکجا کر دیئے ہیں جو قاضی محمد عدیل عباسی کے سلسلے میں مختلف اہل قلم حضرات نے تحریر کئے ہیں۔ اور ملک کے جرائد و رسائل میں ادھر ادھر شائع ہوتے رہے ہیں۔ قاضی محمد عدیل عباسی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ ان کی دینی، علمی، ادبی، صحافتی اور سیاسی خدمات نے انہیں عہد حاضر کے ان ایسے گنے چنے لوگوں کا مرتبہ بخش دیا ہے جن پر ملک و ملت کو بجا طور پر فخر کرنا چاہئے۔ قاضی صاحب اصلاحی، تعمیری، اور ادبی کام کرنے والے افراد کے لئے ایک مشعل راہ بن گئے۔ اقتصادی مجبوریوں کے باوجود انہوں نے جس طرح تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ زبان و قلم سے بے باک و حق گوئی کی جو روش قائم کی۔ اور اجتماعی مقاصد کے لیے جس خندہ پیشانی کے ساتھ اپنی قربانیاں پیش کیں۔ اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ ایسے افراد پر مضامین لکھتے رہیں اور انہیں یکجا کرنا صرف ایک تاریخی دستاویز مرتب کرنا نہیں ہے۔ بلکہ اس ذکر جمیل سے دوسرے تعمیری کام کرنے والوں کی مہمیز بھی ہوتی ہے۔ اس طرح ڈاکٹر اختر بستوی نے یہ کتاب مرتب کر کے ایک غیر معمولی خدمت انجام دی ہے۔

باتوں سے پرہیز کیا ہے۔ اگرچہ شمیم صاحب کے تعارف کے لیے یہی کچھ کم نہیں کہ وار دب کے بلند قامت روشن دماغ استادی پروفیسر محمد یس صاحب قبلہ کے بڑے بھائی ہیں۔ تاہم یہ حقیقت بھی چشم پوشی کے لائق نہیں کہ انھوں نے زندگی کے بیشتر حصہ میں اردو شاعری میں قدیم شعرا کے کلام کی ورق گردانی کی ہے۔ اس کے نتیجے میں اردو شاعری کی روایات اور زندگی کے تجربات کا بھرپور عکس ان کی غزلوں میں نمایاں ہے۔ اس راہ اعتدال میں ان کی غزلوں میں شگفتگی اور تازگی کے ساتھ کیف و نشاط کی عجیب صورت پیدا کردی ہے۔ تغزل کا یہ اچھوتا رنگ دیکھئے ؎

آپ جب تک نہیں تھے مرے ہم سفر کتنی سنسان تھی زندگی کی ڈگر
آپ کے عارضوں کی نئی دھوپ تھی آپ کے گیسوؤں کے یہ سائے تھے
عمر بھر زندگی کو ترستے رہے گھپ اندھیروں میں کرلی بسر زندگی!
چاندنی تھی نہ گھر میں کوئی چاند تھا آنسوؤں کے دیئے بھی جلائے تھے!

کہیں کہیں تو صوتی ہم آہنگی اور لہجے کے اتار چڑھاؤ نے شعر میں جمالیاتی کرشمہ کی سی کیفیت پیدا کردی ہے ؎

یہی اگر زندگی ہے لوگو عذاب دوزخ کا خوف کیوں ہو
بڑھاؤ مینا اٹھاؤ ساغر شراب ڈھالو شراب ڈھالو
کوئی صنم ہے کوئی صنم گر کوئی پجاری خود اپنے بت کا
شمیم تم بھی اٹھاؤ تیشہ نیا خدا اک تراش ڈالو



لیکن شمیم صاحب کی غزلوں میں سراسر ملائمت اور رومانہ کیف ہی سمویا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ اس مجموعے کے متعدد اشعار زندگی کے حقائق پر مبنی ہیں۔ جن میں جیتی جاگتی زندگی کے تلخ و شیریں تجربوں کی آمیزش نے ایک خاص قسم کا اثر پیدا کردیا ہے ؎

یا تو ہم دل کی حرارت سے پگھل جاتا ہے۔
ورنہ پتھر کی کسی شکل میں ڈھل جاتا ہے۔
ایک تم پر نہیں موقوف ہے حالات کیساتھ
خود کیا چیز ہے دستور بدل جاتا ہے۔

غور کیا جائے تو شمیم صاحب کی غزلوں میں داخلی حظ اور مسرور کن کیفیت ہی نہیں بلکہ غزل کی مسرت بخش چاشنی کے ساتھ تشنگی درد، دھوپ، صحرا، کانٹے، دھرتی کا سوندھا سوندھا پن کڑی محنت کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔ دھوپ اور سایہ، روشنی اور

قاضی محمد عدیل عباسی کی شخصیت اور ان کی علمی سرگرمی کے سلسلے میں اس کتاب میں کئی مقتدر مضامین شامل ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر محمود الٰہی، حیات اللہ انصاری، علی جواد زیدی، مولانا محمد منظور نعمانی مولانا ضیاء الدین اصلاحی، ڈاکٹر عمار رضوی، اور رام لعل وغیرہ کا شمار ان معتبر ناموں میں ہے۔ جنھوں نے قاضی صاحب کی عدیم المثال شخصیت اور غیر معمولی کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ خاص طور پر حیات اللہ انصاری، علی جواد زیدی، مولانا محمد منظور نعمانی، ڈاکٹر احمد لاری، شبنم سبحانی، مسعود صدیقی، عتیق احمد قاسمی، خلیل الرب، مولانا محمد شکیل احمد عباسی ندوی، نیز محمد حامد علی وغیرہ نے جناب قاضی صاحب کے سلسلے میں تفصیلی مضامین میں ان کے کارناموں پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ ان سارے مضامین کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ جو شخص سچے دل سے ملک و ملت سے محبت رکھتا ہے اہل وطن اور ارباب ملت بھی اس کے لئے جاں نثار ہو جاتے ہیں۔

قاضی صاحب کی شخصیت بڑی پہلودار تھی۔ اصلاح معاشرت، تبلیغ دین، کردار سازی، سیاست، تمدن، شعر و ادب اور صحافت و زبان کے متعدد میدان ہیں۔ جہاں قاضی صاحب نے اپنے کارہائے نمایاں پیش کیے ہیں۔ ان کی شخصیت غیر معمولی استعداد اور فعالیت کی ایک روشن مثال یہ ہے کہ تمام شعبہ جات میں انہوں نے الگ الگ اتنے عظیم شاندار کارنامے انجام دیئے ہیں جو بسا اوقات ایک جہت میں کام کرنے والے افراد بھی اپنے شعبوں میں مشکل سے انجام دے سکتے۔

مرتب نے اس کتاب میں وہ نظمیں بھی شریک کی ہیں۔ جن میں شعرائے کرام نے اس عظیم شخصیت کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ غرض کم و بیش ڈھائی سو صفحات پر یہ کتاب تحریک آزادی ہندوستان کا ایک باب بھی ہے۔ ہمارے تہذیبی سفر کی ایک روشن دلیل بھی ہے۔ ملک و ملت کے ایک خادم و مخدوم کو نذرانۂ عقیدت بھی اور تعمیری جہتوں میں کام کرنے والے افراد کے لیے آئین و دستور بھی، یہ اہم کتاب ہر سنجیدہ قاری کو محبوب و مطبوع ہوگی۔ کتابت، طباعت اور گٹ اپ کے لحاظ سے بھی یہ پیشکش لائق ستائش ہے۔

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

نام کتاب : نقش نوا
شاعر : مبارک شمیم
ناشر : مکتبہ طارق، شاہجہاں پور یوپی
قیمت : دس روپے۔

"نقش نوا" مبارک شمیم صاحب کی ۵۲ غزلوں اور قریب ایک درجن متفرق اشعار کا مختصر شعری مجموعہ ہے۔ جو ۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ خوب صورت رنگین سرورق صاف ستھری طباعت اور کاغذ سفید ہے آج جب جدیدیت نواز شعراء آزاد غزل کے روپ میں غزل کے قالب ہی نہیں اس کی روح کو بھی بے طرح مسخ کر رہے ہیں۔ خال خال ہی سہی اب بھی ایسے باکمال شعرا موجود ہیں۔ جو غزل کو اس گمراہ کن روش سے بچا کر اس معنویت، تازگی اور صنف تغزل کے موتی پرو رہے ہیں۔ بلاشبہ شمیم صاحب صالح غزل کے ایسے ہی خوش ذوق دلدادہ ہیں جنہوں نے اپنی غزلوں میں بھرپور

شب شمیم صاحب کی امیجری کے خاص اور اہم علامتی
پیکروں کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔

جن لوگوں نے غالب، جگر، فانی اور میر کی
غزلوں کو پڑھا ہے ان کے سامنے کسی دوسرے شاعر
کے اشعار بے کیف دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن راقم کا خیال
ہے کہ ایسے بلند مذاق لوگ مبارک شمیم صاحب کے اشعار
کو یقیناً پسند کریں گے۔ کیونکہ ان کے اس سب کچھ کا
حسین امتزاج موجود ہے۔ جو اردو کے ان بلند پایہ شعرا
کے یہاں الگ الگ ملتا ہے۔ ان کے یہاں فانی کی طرح
زندگی سے فرار تو نہیں مگر میر و فانی کی ملی جلی سی سوز و
درد کی لہریں ضرور موجود ہے۔

ہم ایسے سادہ دلوں کی کہیں نہیں ہے گزر
نہ اس جہاں کی خبر ہے نہ اس جہاں کی خبر

لیکن باوجود مجبوری اور بے مائیگی کے رجائیت کا دامن
ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا۔ اور غالب کا تفکر اور کیفی
اعظمی کا جوشش و رجا کا پرتو بھی نظر آتا ہے ؎

جنوں کو راہ تمنا میں چھوڑ دوں کیوں کر
یہی سفر کا وسیلہ یہی رفیق سفر!
شب حیات کی تاریکیوں کا خوف نہ کر
کہ پھوٹتا ہے کہ انہیں ظلمتوں سے سحر

الفاظ کی بندش اور خیالات کے موثر شعری اظہار میں
صاحب کلام کو ملکہ حاصل ہے۔ وہ بڑی سی بڑی بات
بھی سادہ الفاظ اور کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں
کہ بات دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔

اجالے کرو داغ دل کے جلا کر
نہ اب روشنی مانگتے جاؤ در در
جو نکلے نہیں ٹوٹ کر رہ گئے ہیں
سسکتے ہیں کتنے وہی دل میں اکثر

شعر گوئی کا اعجاز ہی یہ ہے کہ شعر اتنا موثر ہو
کہ پڑھنے سے پہلے ذہنوں میں اتر جائے۔ اور پڑھتے
ہی کو از بر ہو جائے۔ مبارک شمیم صاحب
کا یہ شعر اسی قول کا مصداق ہے۔

جتنی تیزی سے بڑھیں تاریکیاں
روشنی پھیلی نہ اس رفتار سے

نقش لزا کی غزلوں میں شعری حظ اور قلبی لطافت
کے ساتھ فکر کے رشتہ میں پروئے ہوئے الفاظ بھی ملتے
ہیں جو انسان کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

میرا وجود بھی تاریخ ہے زمانے کی
مجھے بھی کبھی پڑھ کے دیکھئے تو بہتر تھا
وہی ہے آج زمیں پر خراب و خستہ و خوار
جو اپنی شان میں قدامتوں سے بہتر تھا

تازگی فکر اور کلاسیکی رچاؤ کے علاوہ شمیم صاحب کی
غزلیں روانی اور سلاست سے پر ہیں۔ اور اکثر ایسے جب
موقع پڑھنے، لائق برمحل اور منہ بولتے اشعار ہیں جنھیں
ایک مرتبہ پڑھ کر بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ شمیم
صاحب کے یہاں یہ وہی تغزل ہے جو حسرت جو حسرت
موہانی کی غزلوں کی روح ہے۔ اور ذہنوں کو سرمست
کر دینے والے عالم میں پہونچا دیتا ہے۔

تم بات نہ کرتے تو کوئی بات نہ ہوتی
اچھا تو یہی تھا کہ ملاقات نہ ہوتی
زلفوں کو سربام اگر تم نہ جھٹکتے
ہوتی مگر اس طرح برسات نہ ہوتی

غزل کا یہی لہجہ ہے جو شمیم صاحب کے یہاں کلاسیکی
روش کے ساتھ بنیادی طور پر کارفرما ہے۔ اور اس
پر مستزاد ان کی حسب ضرورت پیکر تراشی نے ان کے
مفاہیم و معانی میں چار چاند لگا دئے ہیں۔ ...

ہے کہ "نقش نوا" شمیم صاحب کی ایسی غزلوں کا مجموعہ ہے جو اردو میں قابل فخر سرمایہ کہا جا سکتا ہے جو قدیم اساتذہ کے فنی تجربوں سے معمور اور جدید اسلوب سے بھی مزین ہے۔ مجھے تو یہ غزلیں پڑھ کر یگانہ اور جگر کی مست کر دینے والی شاعری یاد آگئی اور جگہ جگہ ایسا لگا جیسے ان میں جگر کے تغزل اور یگانہ کے فکری لہجہ کو سمو دیا گیا ہو کبھی کبھی اقبال کا فکری نظام اور بلند پرواز نظر آتی ہے۔

وہ کیا بنیں گے مرے جذب و شوق کی منزل
مہ و نجوم بھٹکتے ہیں خود خلاؤں میں

اور کسی شعر میں اچانک جدید غزل کا اسلوب غالب نظر آتا ہے۔ اور وہ جدید ترکیبیں اور جدید پیکر استعمال کرتے گئے ہیں ؎

مجھے تو پھر نظر آتا ہے آندھیوں کا غبار
شدید حبس ہے کچھ دیر سے فضاؤں میں
یہ ہم سے کون طلاب یہ کس طرح سمجھیں
ہیں ایک چہرے میں شامل کئی کئی چہرے

نہیں ؎

کیسا ہے دستور یہاں کا الٹی گنگا بہتی ہے
صحراؤں میں موتی برسیں آنگن ہے گلزار نہیں

جس سمت ہم نے پاؤں بڑھایا جھلس گئے
یہ عرصۂ حیات جہنم سے کم نہیں

ان تمام باتوں کے باوجود مجموعہ میں ایک دو جگہ ایسی کوتاہی رہ گئی ہے جس کی طرف دھیان دلانا ضروری لگا ہے کہ بعض شعر نہ معلوم سہواً نہ معلوم کتابت کی غلطی سے خارج از بحر ہے مگر ان چھوٹی چھوٹی معمولی چوک سے ان کی شاعرانہ عظمت پر حرف نہیں آتا۔ وہ بڑی خوبی سے اپنا خیالات کا اظہار کر جاتے ہیں۔

"نقش نوا" کا مقدمہ اردو کے جانے پہچانے محقق ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب نے لکھا ہے۔ مقدمہ میں شمیم صاحب کی شخصیت اور شاعری پر بالاختصار ہر زاویہ سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ افسوس ہے شمیم صاحب اتنے اچھے شاعر ہوتے ہوئے بھی اپنے اشعار کو دوستوں تک پہونچانے میں بخل اور کوتاہی کرتے رہے تھے۔

اس طرح صاحب کلام قدیم روایتی اسلوب اور پیکروں کے ساتھ ساتھ جدید طرز ادا اور نئی نسل کے نئے پیکروں سے بھی پوری طرح آگاہ ہیں۔ ان کی ان غزلوں کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ زبان و بیان کے اسلوب پر صاحب مجموعہ کو پوری قدرت حاصل ہے۔ کہیں کہیں تو اردو کی عام بول چال کے علاوہ ضرب المثلوں کے استعمال ہوئے ہیں کہ اس سے [illegible] استعمال کا [illegible]

تنویر علوی صاحب نے لکھا ہے:

"یہ بھی معلوم ہوا کہ مبارک شمیم صاحب شاہجہاں پور کے تہذیبی و ادبی حلقوں کی جان رہے۔ اور کم و بیش چوتھائی صدی سے شعر کہتے ہیں لیکن شہرت طلبی کی ترغیبات سے ہمیشہ دور رہتے ہیں۔ مقامی مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں لیکن اپنا کلام شائع نہیں کراتے۔ سچ پوچھئے تو انہوں نے اپنے کلام کو جمع کرنے یا محفوظ رکھنے کی بابت کبھی سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں۔ اگر تحریر نیس صاحب کی تحریک اور ان کا شدید اصرار نہ ہوتا تو ان کے کلام کا یہ انتخاب ہمیں یوں دستیاب نہ ہوتا۔"

یہ اردو کے ساتھ ازلی بدنصیبی رہی ہے کہ اکثر بڑے باکمال شعرا کا کلام اسی احساس کمتری اور بے اعتنائی کا شکار ہو کر تلف ہوا ہے۔ اور آج ادب ان جواہر پاروں سے محروم ہے۔ مگر یہ ان کی شخصیت کا اخلاص اور ہمہ گیر رشتۂ حیات ہے جو اچھے شاعر میں ہونا ہی چاہئے۔ اور اسی نے یہ مجموعہ کو ایک منفرد آہنگ بخشا ہے

توقیر احمد خاں

نام کتاب: زبان، اسلوب اور اسلوبیات
مصنف: ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ
قیمت: ۳۰ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۱

"زبان اسلوب اور اسلوبیات" مرزا خلیل بیگ کے سات اہم مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو گزشتہ چند برسوں میں لکھے گئے ہیں۔ اور ملک اور بیرون ملک کے ادبی، علمی و تحقیقی شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ مرزا خلیل بیگ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات میں استاد ہیں۔ اور علمی لیاقت اور اعلیٰ ادبی صلاحیت کے مالک ہیں۔ یہی سبب ہے کہ علی گڑھ کتابتی و طباعتی دشواریوں کے باوجود بھی انہوں نے نہایت خوشنما اور قابل مطالعہ کتاب پیش کی۔ یوں تو علی گڑھ سے بہت سی کتابیں چھپتی رہی ہیں۔ لیکن کتابت و طباعت کے اعتبار سے اس قدر دیدہ زیب کتاب (علی گڑھ کی چھپی ہوئی) اب تک میری نظر سے نہیں گزری۔ جس کے لیے مرزا خلیل بیگ کو ذاتی سلیقے اور دل سوز محنت کی داد نہ دینا ناانصافی ہو گی۔

زیر تبصرہ کتاب کا پیش لفظ ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں نے تحریر کیا ہے۔ ان کا یہ خیال یقیناً درست ہے کہ:

"لسانیاتی اسلوبیات کے موضوع پر وہی شخص قلم اٹھا سکتا ہے جو ایک طرف اس علم کی تمام معلومات سے واقف ہو۔ اور دوسری طرف شعر و ادب کا رچا ہوا ذوق بھی رکھتا ہو۔ مرزا خلیل بیگ دونوں حیثیتوں سے مسلم ہیں۔ انہوں نے لسانیات کی تعلیم باقاعدہ حاصل کی ہے۔ اور وہ زبان کی ساخت کی ہر سطح سے چاہے وہ صوتیات ہو، یا صرف و نحو کہ

معنیات کو بھی واقف ہیں۔ اساس
کے مختلف نظریات پر اچھی گرفت
رکھتے ہیں۔"

زبان وادب میں اسلوب اور اسلوبیات کو
ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ زبان اور اسلوب کا
چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کسی بھی فن پارے کی قدر و
قیمت کے تعین میں اسلوب کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ ادبی
اسلوبیات کی غیر موجودگی میں ادبی تنقید کا تصور مکمل
نہیں ہوتا۔ لسانیاتی اسلوبیات کے زیر اثر زبان و
ادب کے سائنسی مطالعہ کا آغاز اردو میں تقریباً نصف
صدی قبل ہوا ہے۔

"زبان، اسلوب اور اسلوبیات" کا پہلا
مضمون ادبی مطالعہ و تنقید اور لسانیات کے باہمی
رشتوں کا ایک بھرپور جائزہ پیش کرتا ہے۔ دوسرے
مضمون میں مرزا خلیل بیگ نے شعری اسلوب کا صوتیاتی
مطالعہ قلمبند کیا ہے۔ احمد فیض کی نظم "تنہائی" کا
صوتیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے اس کا موازنہ اقبال
کی نظم "تنہائی" سے کیا ہے۔ ان دونوں نظموں کی
کثیر الاستعمال آوازوں کے اعداد و شمار مرتب کیے ہیں۔
اور ان کی توجیہہ دونوں نظموں کی اثریت اور موڈ
سے کی ہے۔ تیسرے مضمون میں اردو کے مشہور صاحب
طرز ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی کے اسلوب تحریر
میں مرکبات عطفی کا مطالعہ و تجزیہ سامنے آیا ہے۔
ان کے خیال میں رشید احمد صدیقی نے جس کثرت سے
عطفی و اضافی مرکبات استعمال کیے ہیں۔ کسی دوسرے
ادیب نے نہیں کیے۔ ان کے علاوہ مروجہ مرکبات
کے ساتھ ساتھ نئے خود وضع کئے ہوئے مرکبات

کے استعمال کئے ہیں۔ اور اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔ یہ
مضمون بھی پہلے دو مضامین کی طرح اہم اور نادر ہے۔
چوتھے مضمون میں اردو کے مشہور و مقبول شاعر اختر
انصاری کی طویل نظم "وقت کی بانہوں میں" کا اسلوبیاتی
مطالعہ جانفشانی کے ساتھ بڑے دلچسپ پیرائے میں
کیا گیا ہے۔ بیگ صاحب کی نظر میں "وقت کی بانہوں
میں" اختر انصاری کی ایک ایسی طویل نظم ہے۔ جسے
زندگی کی المناک داستان کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اس میں
غم ذات، غم حیات، غم انسانیت اور غم کائنات کی
کتنی ہی متحرک پرچھائیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اور محسوس
ہوتا ہے کہ شاعر نے حزن و الم کے اشکوں میں حسرت و
آرزومندی کو اس طور گوندھا ہے۔ کہ زندگی اتفاقاً کا
ایک حسین و جمیل مرقع بن کر سامنے آگئی۔ چنانچہ ہر شخص
اختر انصاری کے اس مصرع۔

"ابھی کچھ اور جی لیتا ابھی کچھ جی لیتا"

کو دہرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پانچویں مضمون میں شاعر
فیض احمد فیض کے یہاں شعری اسلوبیات میں تسلسل
بیان اور معنیاتی وحدت کا بڑا جامع محاکمہ کیا گیا ہے
اور فیض کی غزلوں کے اشعار میں موضوع کے درمیان
باہمی ربط سے بحث کی گئی ہے جس سے فیض کے شعری
اسلوب اور اسلوبیاتی امتیازات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے

چھٹا مضمون ادبی مطالعہ و تنقید اور اسلوبیات
کے داخلی روابط کا ایک ایسا جائزہ پیش کرتا ہے جس
سے اسلوبیات کی تاریخ اور ادبی مطالعہ و تنقید میں
اسلوبیات کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ساتواں اور آخری مضمون، اسلوب کی تعریف
توضیح اور تشکیل سے متعلق ہے۔ اس مضمون کے مرتبا

[illegible]

جربول

اگر آپ خارش سے پریشان ہیں
اور راتوں کی نیند حرام ہے تو صرف دو
تین بار کی مالش سے آرام ہو جاتا ہے۔

بالک جیون

بچوں کی تندرستی اور صحیح
نشوونما کے لئے

میکسٹون

ہر موسم میں گھر بھر کیلئے یکساں طور پر
فائدہ بخش جنرل ٹانک

اکسیر صدر

نزلہ۔ زکام اور کھانسی
کی بہترین دوا

موتی منجن

دانتوں کو صاف اور چمک دار بناتا
ہے پائیریا کا دشمن ہے۔

نیشنل دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۳۱ کلکتہ

شہر خیال

تازہ سہیل سے غیاث احمد گدی صاحب سے
اقات ہوئی۔ اسے جان کر ہی اندازہ ہوا کہ آپ نے مجھے
ہیل بھیجنا بند کر دیا۔ بھائی آپ مجھ سے ناراض تو نہیں
گئے ؟۔

آپ گیا شہر کے ایک سرمایہ دار افسانہ نگار پر
ہیل کا نمبر شائع کر رہے تھے۔ یہ انکشاف بھی زیر نظر
رہ سے ہوا۔ میری بھی یہی رائے کہ موصوف پر ایک
مد گوشہ ہی شائع فرمائیے کیونکہ ان کی طرح بہت
مارے لوگوں نے ادب میں تیر مارے ہیں۔

——— رونق مشہری

سہیل کا نیا شمارہ دیکھا۔ بہت پسند آیا ہے
ن میں نہیں تھا۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک کو زندہ
نے میں اس رسالہ کا بھی اہم رول ہے۔ یہ ایک تسلیم شدہ
یقت ہے۔

کہیں کہیں کتابت پر کچھ دھیان دینے کی ضرورت
.. ویسے آپ خود [illegible] بساط ہی کیا ہے؟
لحت پسند لوگوں سے دور ہی رہئے۔ ورنہ یہ اچھا
معیاری رسالہ شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگے گا
ادبی سطح پر معیار کو اہم سمجھئے۔ اور جنھیں عرف
نے کا روگ ہو، انہیں چلئے پلا کر رخصت کیجئے۔

——— قاسم خورشید۔ (پٹنہ)

آپ کا پرچہ آج ہی ملا۔ مضامین تقریباً سبھی
اچھے ہیں۔ مگر کتابت اور طباعت بڑی گندی ہے
اس کی وجہ سے پرلطف مضامین پڑھنے میں بڑی دقت
ہوئی۔ مجھے ڈر ہے اگر آپ نے کتابت اور طباعت
کی طرف خاص توجہ نہیں دی۔ تو مستقبل میں آپ کے
سہیل شمارہ پڑھنے والے اتنے اچھے مضامین سے مکمل طور
پر فیض یاب نہیں ہو سکیں گے۔

——— (ابراہیم احمد جی (بمبئی))

سہیل ملا۔ بہت بہت شکریہ!
ممنوع اس شمارہ کی جان ہے۔ اسی طرح
مصلحت پسندوں کو بے نقاب کیا کیجئے۔ پہلی نظر میں
پرچہ دیکھ کر یقین ہی نہیں ہوا کہ یہ سہیل ہے۔ کتابت
اور طباعت بہت اچھی ہے۔ صفحات کی بھی کمی
نہیں۔ اور قیمت بھی بہت کم۔ "کلام آتش کی امتیازی
خصوصیت" میں نعیمہ خانم صاحبہ نے آتش کی
شاعری کی خصوصیات پر بھرپور روشنی ڈالا ہے۔
منظومات کا انتخاب بھی بہتر ہے۔
کہانیاں دونوں اچھی ہیں۔ شام بازی گیری
مشرف عالم ذوقی صاحب تک میری مبارکباد پہنچا
دیجئے۔

——— نیلوفر رحمٰن۔ (گیا)

اناج کی حفاظت ملک کی حفاظت

ہمارا مقصد مناسب قیمت پر صارفین کو ضروری چیزیں جیسے خالص سرسوں تیل (اگمارک گریڈ۔ I)، دالیں، چنا، کاپیاں اور کورس کی کتابیں، کنٹرول اور غیر کنٹرول کے کپڑے، ایچ۔ ایم۔ ٹی اور بلیٹرون کی گھڑیاں، کیلیٹرون ٹرانسسٹر وغیرہ کی فراہمی اور کسانوں سے ان کی پیداوار میں لگی رقم کو مدنظر رکھتے ہوئے واجب قیمت پر خریدیں۔

ہمیشہ آر۔ بی۔ ڈی پام آئل ریفائنڈ ربیپڈ تیل کا استعمال کریں۔ یہ خالص اور سستے کھانے کے تیل ہیں۔

بہار اسٹیٹ فوڈ اینڈ سیول سپلائیز کارپوریشن لمیٹڈ

پوربی بورنگ کنال روڈ۔ پٹنہ ۸۰۰۰۰۱

Progressive/84/295

---

۱۵ اگست ۸۴ء کے موقع پر شاندار مستقبل کی ضمانت

خاندان کے صحت مند، خوبصورت اور خوشحال مستقبل کیلئے ایک ہی راستہ

چھوٹا خاندان

—— پہلا جلدی نہیں —— دوسرا ابھی نہیں —— تیسرا کبھی نہیں ——

اس کے لئے مندرجہ ذیل خاص طریقے:

۱۔ نرودھ ۲۔ لوپ ۳۔ مردانہ نسبندی ۴۔ زنانہ بندھیاکرن ۵۔ کھانے کی گولیاں۔ اپنی پسند کے مطابق کوئی بھی طریقہ اپنائیے۔ آپ کی آسانی کے لئے ضلع کے تمام اسپتالوں اور پرکھنڈوں آفسوں میں رضاکارانہ یہ خدمات مفت حاصل ہیں۔ **عورتوں کے لئے**: حمل کے دنوں میں خون کی کمی اور ٹیٹنس سے بچنے کے لئے دوا۔ **بچوں کے لئے**: اندھے پن کی روک تھام کے لئے وٹامن (اے)، ٹیٹنس، ڈپتھیریا، کالی کھانسی وغیرہ بیماریوں سے بچنے کے لئے ٹیکہ۔ اوپر لکھے خدمات ضلع کے سبھی اسپتالوں میں مفت حاصل ہیں۔

آج ہی موقع سے فائدہ اٹھائیے

—— ضلع پریوار کلیان بیورو، گیا



انتساب

بھائی محمد شمیم خان !

اور

بھائی رام چندر پرساد جی !

آپ کی حوصلہ افزائی اور بے مثال التفات کا بدل میں کس طرح دوں ؟ یہ بات میرے بس سے باہر ہے۔ اگر آپ کی مسلسل حوصلہ افزائی نہ ہوتی تو میں کانٹوں بھری دشوار راہوں پر چلنے کی قطعی جرات نہیں کرسکتا تھا۔

اپنی اس حقیر پیش کش کو آپ کے نام منسوب کرتے میں احسانات سے سبکدوشی کی ہلکی سی مسرت ضرور محسوس کر رہا ہوں۔

——— حالاں کہ یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ پیش کش بھی آپ ہی کی عنایتوں کا عکس ہے۔

؎ یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

جمیل منظر سنہاروی



بانی: مولوی حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنسہاروی ○ یادگار: مولوی محمد زین العابدین اختر سنسہاروی

ترقی پسند ادب کا ترجمان

سُہَیل گیا

جلد: ۳۶ ○ ستمبر ۱۹۸۴ء ○ شمارہ: ۹

ایک شمارہ: منور رانا کے نام

قیمت: -/۱۰ روپے

بدل اشتراک:

○ سالانہ -/۱۰۰ روپے ○ لائف ممبری ۲۵۰۰ روپے ○

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

○ ماہنامہ سہیل ریور سائڈ روڈ، گیا ○

فہرست

ایک شمارہ
مُنَوَّر دَانا
کے نَام

ترتیب:
- ڈاکٹر علیم اللہ حالی
- جمیل منظر اسنہاروی

علقمہ شبلی

ایک روپ پانچ رنگ

○

اشعار میں دل بول رہا ہے جیسے
افکار کی تہہ کھول رہا ہے جیسے
رآنا جسے ہم دوش بہاراں کہیئے
ہر کان میں رس گھول رہا ہے جیسے

○

احساس میں پھولوں کی مہک ہے پنہاں
آواز میں کلیوں کی چٹک ہے لرزاں
ماحول چمن کیوں نہ تپاں ہو، رآنا
افکار میں لالہ کی لپک ہے رقصاں

○

سورج کی تمازت میں گھنیرا سایہ
تپتے ہوئے موسم میں ہوائے تازہ
جلتے ہوئے ہونٹوں کو، منور رآنا
ہر شعر ترا جوئے رواں کا قطرہ

○

بے رنگ سے چہروں پہ نکھار آجائے
پامال جہاں دل کو قرار آجائے
سن کر ترے اشعار جواں کو، رآنا!
گل زار تمنا میں بہار آجائے

○

آئینہ زمانے کو دکھاتے رہنا
خود راہ نئی اپنی بناتے رہنا
گل زار غزل میں ہے دعائے شبلی
رآنا، نئے گل بوٹے کھلاتے رہنا

عرضِ مرتب

میں شعروادب کے میدان میں تخلیق کی عرق ریزی کرنے والے ہر فن کار سے محبت و احترام اور موانست و عقیدت کے اظہار کو ایک ادبی فریضہ سمجھتا ہوں ـــــ لیکن اس فرض ناشناس کے دور میں سب سے اچھا آدمی وہ ہے جو فرائض سے طرف توجہ دلاتا رہے۔ اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ اگر برادرم جمیل منظر مدیر ماہنامہ سہیل گیا بار بار میری توجہ اس طرف مبذول نہ کراتے رہیں تو میں بھی اس کار خیر سے محروم رہوں۔ چنانچہ آج جب میں منور رانا کے اس خصوصی شمارہ کو مرتب کرکے آپ کے سامنے پیش کرنے کی مسرت حاصل کر رہا ہوں تو مجھے اس پردۂ زنگاری میں وہی معشوق نظر آرہا ہے۔ کہ "اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل"۔

میرے جل کا تو یہ عالم تھا کہ میں منور رانا کو اچھی طرح جانتا بھی نہیں تھا۔ جمیل منظر نے ایک دن ان کا شعری مجموعہ "غزل گاؤں" حوالے کرکے اسے پڑھنے کی تاکید کی۔ یہ مجموعہ دیوناگری رسم الخط میں ہے ـــــ پہلی منزل میں ہی مجھے ذہنی کوفت سے دوچار ہونا پڑا۔ میں ہندی کن دشواری سے پڑھتا ہوں اس کا اندازہ غالباً میرے مخاطب کو نہ تھا۔ چند دنوں میں رک رک کر میں نے یہ مجموعہ پڑھ لیا۔ منور رانا کی شاعری اپنے انفرادی لب و لہجہ، غیر صناعانہ پیش کش، چھوٹی قدروں سے گہری وابستگی، موجودہ اقدارِ حیات میں دم گھٹنے کے احساس اور کھلی ہوئی لامحدود فضا میں فطرت کا ایک جزو بن جانے کی تڑپتی خواہش کی وجہ سے اپنی طرف کھینچنے لگی ـــــ اور دوسری ہی ملاقات میں میں نے جمیل منظر کو وہ چنگاریاں منتقل کرنی چاہیں جو مجھے جلا رہی تھیں، میں نے منور رانا کے چند خوبصورت اشعار انھیں سنائے جن میں سے کئی وہ پہلے سن چکے تھے۔

یہ تجویز کہ منور رانا سے متعلق سہیل کا خصوصی شمارہ شائع کیا جائے۔ در اصل ہمارے اسی تاثر کا نتیجہ ہے جو ان کے مجموعۂ کلام کے مطالعے کے بعد پیدا ہوا۔ لیکن اس فیصلے کے بعد ہمیں مضمون نگاروں سے مقالے لکھوانے کی گراں بار دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمارے شعروادب کی پس ماندگی کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ مقالہ نگار حضرات دوسروں کی تخلیقات پر رائے دیتے ہوئے مختلف قسموں کے تاثرات اور تعصبات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بزرگ اہلِ قلم کم عمر کے فنکاروں پر لکھتے ہوئے کسرِ شان محسوس کرتے ہیں، معاصرین کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اپنے ہم عصر کو آگے بڑھا کر کہیں وہ اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی تو نہیں چلا رہے ہیں۔ یہ تاثرات اس امر کی دلیل ہیں کہ ہم میں اب تک سچا تنقیدی ذوق اور تنقیدی شعور پیدا نہیں ہوا ہے۔ مغرب کی ترقی یافتہ زبانوں میں یہ رجحان نہیں ہے۔ تخلیق کے اچھے نمونے ہر حال میں ہر طبقے سے خراجِ عقیدت وصول کرتے ہیں۔ وہاں سن رسیدہ معمر اور بڑے سے بڑا ناقد بھی بڑی کشادہ دلی کے ساتھ اپنے سے کم عمر فنکاروں کی تخلیقات کی صحیح داد دیتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ یہ نہیں سوچتا کہ کسی ایک فرد کی تعریف و ستائش کی جارہی ہے بلکہ وہ اپنی زبان کے شعروادب کے ارتقائی سفر پر مسرور و شادماں ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اچھا ادب کسی ایک فرد کی دین نہیں ہوتا بلکہ معاشرہ، زبان، تہذیب، ثقافت اور ذہنی بالیدگی کی اجتماعی پہچان ہوتا ہے۔ نہ جانے ہم اس نفسیاتی پیچیدگی یا ذہنی مرض سے کب نجات پائیں گے۔ عالم یہ ہے کہ اگر کوئی بزرگ اہلِ قلم کسی مجبوری کی

وجہ ہے اگر نوجوان فن کار پر لکھنا بھی ہے تو دعائیہ کلمات لکھ کر اپنی بزرگی کے تحفظ کا سامان بہم کر لیتا ہے۔ حالانکہ تنقید کو دعائیہ کلمات سے کیا تعلق۔

بہرکیف: ان دشواریوں سے گزر کر ہم نے منور رانا پر مضامین لکھوائے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس تیزی سے ابھرتے ہوئے اور بہت آسانی سے پہچانے جانے والے فن کار کے سلسلہ میں ہماری یہ کوشش سعی اولیں ہے۔ ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ منور رانا کا یہ سرسری تعارف ان کے شعری مرتبہ تک رسائی کا ایک کامیاب وسیلہ ہوگا۔

منور رانا کا تخلیقی سفر جاری ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ابھی تو ان کی رفتار میں ہلکی سی تیزی آئی ہے۔ منور رانا تخلیقی سفر میں تنہا چلنے کے قائل ہیں، وہ نہ گروپ بناتے ہیں، نہ انجمن سازی کرتے ہیں۔ انہیں نہ داد و تحسین سے تعلق ہے نہ تنقید و تضحیک سے، ان کی طبیعت کی بے نیازی اور تمام علائق سے الگ رہ کر جادۂ تخلیق پر سرگرم سفر رہنے کے انداز سے اس نتیجہ تک پہنچنا مشکل نہیں کہ وہ ستائش کی تمنا اور صلہ کی پرواہ کئے بغیر شاعری کرتے ہیں۔ فن کاری میں یہ بے نیازی بلکہ بے پروائی اچھے اثرات مرتسم کرتی ہے اس لئے کہ ایسی صورت میں فن کار پر ان تحسینی کلمات کا کوئی منفی اثر نہیں پڑتا جن کی زد میں آکر فن کار تخلیقِ فن کی ذمہ داریوں کو بھول جاتا ہے اور تحسین و تعریف ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ منور رانا جہاں ہیں انہیں اس سے بہت آگے جانا ہے، یہ ہمارا یقین ہے، اور ان کی شاعری کا تیور اس یقین کا سبب ہے۔

سلیم اللہ حالی

بقیہ منور رانا کی غزل — ایک تاثر

وہ پڑھتا جا رہا ہے رو رہا ہے
مرا چہرہ بھی گیتا ہو رہا ہے

یہاں تو جو بھی ہے آبِ رواں کا عاشق ہے
کسی نے خشک ندی کی طرف نہیں دیکھا!

تمہیں کچھ اور لکھنا چاہتا تھا
مگر کاغذ ہی بھیگا جا رہا تھا

میں نرم مٹی ہوں تم روند کر گزر جاؤ
کہ میرے ناز تو بس کوزہ گر اٹھاتے ہیں

میں اک فقیر کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ہوں
کسی سے بھی مری قیمت ادا نہیں ہوگی

یہ بہت خوبصورت اور دل کو چھو لینے والے اشعار ہیں۔ رانا نے کہا ہے ؎

ہوائے شام میں روشن ہے جو بنام غزل
میں اس چراغ کی لو کو سلام کرتا ہوں

ہوا کے روبرو چراغ کی لو سے محبت کا یہ زندہ حوصلہ منور رانا کی غزل کے لئے ایک بشارت ہے۔

پرنٹر، پبلشر ایم اے انیس نے
ملت آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ میں چھپوا کر دفتر
ماہنامہ سہیل ریلوے سائیڈ روڈ گیا سے شائع کیا

منور رانا سے ایک ادبی ملاقات

جمیل منظر

گذشتہ شب طویل ہونے کی بنا پر صبح میں تاخیر سے اٹھا۔ جلد از جلد تیار ہو کر جدید لب و لہجہ کے بانکے شاعر منور رانا کے یہاں پہنچنا تھا تاکہ ان سے سہیل کے ایک خصوصی نمبر "ایک شمارہ ——— منور رانا کے نام" کے لیے انٹرویو لیا جا سکے۔ تاریخ اور وقت کا تعین ہو چکا تھا۔ پھر بھی میں اور برادرم کامل حمیدی صاحب رانا صاحب کے یہاں تاخیر ہی سے پہنچے۔ غالباً رانا صاحب اور بھابھی رعینہ رانا صاحبہ منتظر تھے۔ تاخیر کی معذرت کے بعد میں نے اور کامل صاحب نے اپنی نشست سنبھال لی۔ خوبصورت اور ڈھنگ سے سجے سجائے ڈرائنگ روم سے رانا صاحب کے ذوق کا پتہ چل رہا تھا۔ میری نظر کمرے کے چاروں طرف دوڑ رہی تھیں۔ اور رانا صاحب بھی سامنے بیٹھ چکے تھے۔ چہرے سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اب میرے سوالوں کا جواب دینے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ ماحول پر سنجیدگی طاری ہو چکی تھی۔ جو مجھے کھل گئی۔ میں چاہتا تھا کہ انٹرویو بے تکلفی کے ماحول میں ہو۔ چنانچہ میں نے اس کا رُخ ہی بدلنا دینا مناسب سمجھا۔ اور کاروبار کے متعلق یوں ہی غیر ضروری باتیں کرنے لگا۔ اور رانا صاحب بڑی تفصیل سے مجھے سمجھانے لگے۔ جب یہ سلسلہ ختم ہوا تو میں نے رانا صاحب سے کچھ تازہ غزلوں کی فرمائش کر دی۔ کچھ پس و پیش کے بعد رانا صاحب نے دو تین غزلیں سنائیں۔ رانا صاحب پورے موڈ میں آ چکے تھے۔ اس لئے میں نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی غزلوں میں سے کچھ ایسے اشعار سنانے کی فرمائش کر دی جو انہیں خود پسند ہوں۔ رانا صاحب نے تیس چالیس اشعار سنائے۔ میں نے کہا رانا صاحب آپ نے اپنے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ میں نے آپ کے ہندی مجموعہ "غزل گاؤں" میں اتنے پیارے پیارے اشعار پڑھے ہیں۔ جو مجھے بطور خاص بہت پسند ہیں لیکن آپ انہیں نظر انداز کر گئے۔ لیکن رانا صاحب نے یہ کہہ کر مجھے لاجواب کر دیا کہ وہ آپ کی پسند ہے۔ اسی ملاقات میں انہوں نے دوسرے شعراء کے مندرجہ ذیل شعر بھی سنائے اور یہ بتایا کہ وہ ان اشعار سے متاثر ہوئے ہیں

مسکراہٹ، دبدبہ، لہجہ، سادگی
بیچ کر میں سارے زیور کھا گیا

کانٹے کی نوک پہ کسی سخاوت کی گفتگو
سارا لہو گلاب کے چہرے پہ مل دیا

کس کس کی میں ہجوم میں آنکھیں نکالتا
اچھا ہوا کہ آپ دریچے سے ہٹ گئے

میں سازشوں میں گھرا ایک یتیم شہزادہ
یہیں کہیں کوئی خنجر میری تلاش میں ہے

ایک لڑکا شہر کی رونق میں سب کچھ بھول جائے
ایک بڑھیا روز چوکھٹ پہ دیا روشن کرے

کبھی تم آسماں پہ جا کے دیکھو اے زمیں والو
وہاں سے یہ زمیں بھی آسماں معلوم ہوتی ہے

گڑیا سے کھیلتی ہوئی بچی کی آنکھ میں
آنسو بھی آ گیا تو سمندر لگا ہمیں

یہ سرد رات یہ آوارگی یہ نیند کا بوجھ
ہم اپنے شہر میں ہوتے تو گھر گئے ہوتے

وہ پرندہ جسے پرواز سے فرصت ہی نہ تھی
آج تنہا ہے تو دیوار پہ آ بیٹھا ہے

بکھرتے ٹوٹتے رشتوں کی اک لمبی کہانی ہے
کسی کو کیوں کوئی الزام دے مجبوریاں ہونگی

حویلیوں میں پرانی دُلائیاں اوڑھے
سسک رہی ہے میرے خاندان کی خوشبو

تم محبت لے کے گئے تو کسی بیٹا کا شیشہ ٹوٹ گیا

سج دھج کے لیے سب آرائش اس نے تو ہمیں دکھاوے ہیں

افلاس نے بچوں کو بھی سنجیدگی دے دی
سہمے ہوئے رہتے ہیں شرارت نہیں کرتے

ابھی تو جنوری ہے چاہے جتنے خون کر ڈالو
پرندوں کے چلے جانے کا موسم فروری تک ہے

نامرادانِ محبت کو حقارت سے نہ دیکھ
یہ بڑے لوگ ہیں جینے کا ہنر جانتے ہیں

سامنے حال کا غم پشت پہ ماضی کی تھکن
اب تو رستہ مجھے منزل پہ نہ جانے دیگا

اب کوئی رام نہیں غم کا دھنش جو توڑے
زندگی روتی ہے سیتا کے سوئمبر کی طرح

اتنی جسارتیں تو اسی کو نصیب تھیں
جھونکے ہوا کے کیسے گلے سے لپٹ گئے

ہم ایسے پیڑ ہیں جو چھاؤں بانٹ کر اپنی !
شدید دھوپ میں خود سائے کو ترستے ہیں

میرا دکھ یہ ہے کہ اپنے ساتھیوں جیسا نہیں
میں بہادر ہوں مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں

مری روح کی حقیقت مرے آنسوؤں سے پوچھو
مجلسی تبسم مرا ترجماں نہیں ہے!

حیران کھڑی ہے کھیت میں گندم کی بالیاں
اس بار فصل کاٹنے والے کہاں گئے !

تمہارے شہر میں بے چہرہ لوگ بستے ہیں
کبھی کبھی کوئی چہرہ دکھائی دیتا ہے

کیا کہوں دیدہ تر یہ میرا چہرہ ہے بچو ! !
سنگ کٹ جاتے ہیں پانی کی جہاں دھار سے

دوستوں سے ملاقات کی شام ہے
یہ سزا کاٹ کر اپنے گھر جاؤں گا۔

ماحول کی سنجیدگی ختم ہو کر ایک خوش گوار تبدیلی آگئی تھی ۔ رانا صاحب کی تخلیقات میں انسانی زندگی کے بھرپور مسائل دیکھ کر میں نے فوراً ایک سوال ٹھونک دیا۔

سہیل منظر : رانا صاحب ! "ادب برائے ادب" یا "ادب برائے زندگی" دونوں میں کس بات سے آپ متفق ہیں ؟

منور رانا : یہ سوال اتنا گھس گیا ہے کہ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی جیسے عنوان پر زبان کھولنا REPEATATION تو ہے ہی ساتھ ہی ساتھ اپنا وقت آپکے قلم کی طاقت اور سہیل کے قیمتی اوراق کو برباد کرنا ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ شاعری کسی پلاننگ کا نام نہیں ہے۔ شاعری کسی سگریٹ کمپنی کے اشتہار کا نام نہیں ہے۔ شاعری کلکتہ کے موتی سیل اسٹریٹ کی کسی ربر گڈس کی دوکان کا نام ہے بلکہ میرے خیال کے مطابق شاعری اس کیفیت کا نام ہے جسے خود کلامی کہا جاتا ہے اور جب ہم شاعری کو کسی مقصد کے تحت استعمال کرتے ہیں مقصد سے میری مراد لیبل ہے۔ لیبل سے میری مراد ترقی پسندیت ۔ جدیدیت یا بزرگوں کی پرانی روش نہیں ہے۔ بلکہ لیبل سے میری مراد یہ ہے کہ علی گڑھ میں فساد ہوا تو شاعروں میں اور رسائل میں جلی ہوئی لاشوں کو شاعری کے جھنڈے میں سجا کر اپنی شہرت کے لیے پیش کرنا یا مئی ڈے ۔ ۳۰ ستمبر لینن کا جنم دن ۔ غالب کا یوم وفات اور اسی قسم کے موضوعات کو نشانہ بنا کر آپ کو شہرت مل سکتی ہے لیکن ادب کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہونچتا ہے ۔

صاحب ! بُرا مت مانئے گا۔ مجھ سے میرے ایک دوست نے ایک سوال کیا تھا کہ محبت نام کے کوئی چیز دنیا میں نہیں ہے۔ میرے دل میں بھی اس بیان نے گھر کرنے کی کوشش کی انہیں دنوں میں اپنے وطن رائے بریلی گیا۔ آنگن میں ایک مرغی اپنے بچوں کے ساتھ دانہ چُگ رہی تھی۔ اچانک فضا میں اڑتی ہوئی ایک چیل کی پرچھائیں آنگن میں تیرنے لگی۔ مرغی نے اپنی جانی پہچانی آواز میں بچوں کو اپنے پاس بلا کر پروں میں چھپا لیا۔ چیل نے کئی بار جھپٹا مار کر مرغی کو لہو لہان کر دیا۔ لیکن مرغی نے اپنے بچوں پر آنچ نہ آنے دی۔ میں چار بچوں کا باپ بے ساختہ دوڑتا ہوا دالان میں بیٹھی ہوئی اپنی ماں سے لپٹ گیا۔ اس واقعے کے بعد سے میں پہچاننے لگا ہوں کہ شاعر کون ہے۔ اور غیر شاعر کون ۔

جمیل : آپ نے جو جواب دیا ہے اس میں صرف شاعری کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ میرا سوال تھا کہ آپ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی دونوں میں کس بات سے متفق ہیں۔ ؟

دانا : پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ مجھے بحیثیت شاعر جانتے ہیں۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ادب برائے زندگی یا ادب برائے ادب کسی ایک کو تسلیم کر لینے سے دوسرے عنوان کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے لیکن اس سے آپ کا ایک پہلو ضرور واضح ہو سکتا ہے میں آپ کو ایک لطیفہ سناتا ہوں۔

"ایک صاحب نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے باوجود جب بھی کسی مندر کے پاس سے گزرتے تھے تو ہاتھ جوڑ لیتے تھے ان کے دوستوں نے کہا کہ یہ تو بڑی خراب بات ہے۔ اب تو آپ مسلمان ہیں پھر مندر کو دیکھ کر ہاتھ کیوں جوڑتے ہیں۔ وہ صاحب کہنے لگے کہ بھیا یہ بھی بھگوان ہیں پتہ نہیں ان سے کب کام پڑ جائے۔"

جمیل : "ترقی پسند تحریک اور جدیدیت" ان دونوں نے اردو ادب پر جو اثرات مرتب کئے ہیں اس کے تناظر میں آپ کا کیا خیال ہے۔ ؟

دانا : جب میں چھوٹا تھا تو ایک بات بتائی جاتی تھی کہ مزار پر جانا اچھی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ معلوم ہوا کہ جو مزار پر نہیں جائے گا وہ گنہ گار ہو جائے گا۔ جب میں اور بڑا ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ مسجدیں تقسیم ہونے لگی ہیں۔ اور کچھ لوگ جب نماز پڑھ کر نکلتے ہیں تو دوسرے جاتے ہیں مسجد کو دھوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مسجد کو پاک کرتے ہیں میں عجیب سی الجھن میں رہتا ہوں کہ یہ تقسیم یہ تفرقے اور یہ سیاسی کھیل کیسے ہیں۔ لہٰذا میرا ایک اصول ہے کہ میں ہر مسجد میں نماز پڑھ لیتا ہوں۔ سلام پھیرتا ہوں۔ دعا مانگتا ہوں اور گھر چلا آتا ہوں۔ آج تک جو مانگا ہے سب ملا ہے۔ پھر میں یہ کیسے تسلیم کر لوں کہ فلاں مسجد میں نماز پڑھنا چاہئے۔ فلاں میں نہیں پڑھنا چاہئے۔ یہی صورت حال ترقی پسندی اور جدیدیت کے سلسلے میں ہے۔ میں صرف کہتا ہوں کہ شعر کہنا چاہتا ہوں۔ اور شعر کہتا رہوں گا۔

جمیل : جدیدیت کے نام پر صلاح الدین پرویز نے جو چیزیں کہی ہیں کیا اس سے ادب پر برا اثر نہیں پڑا ہے اس پر بھی ذرا اپنے خیالات کا اظہار کرتے چلیے۔ ؟

دانا : صلاح الدین پرویز کی ایک تصویر میں نے کہیں دیکھی تھی۔ میں نے سوچا اگر یہ آدمی لڑکی ہوتا تو زیادہ خوب صورت ہوتا۔ پھر ایک بار احمد ہمیش کا ایک مضمون صلاح الدین پرویز کے سلسلے میں پڑھا۔ تو مجھے اپنی پچھلی بات اور زیادہ یاد آنے لگی۔ آپ کہیے گا کہ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تو میں کہوں گا پھر صلاح الدین پرویز کا ناول کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

جمیل : پرویز صاحب کی شاعری کے بارے میں آپ نے کچھ نہیں فرمایا؟

دانا : دراصل جمیل صاحب میں جس کی شخصیت سے متاثر نہیں ہوتا اس کی شاعری بھی مجھے متاثر نہیں کرتی۔ صلاح الدین پرویز کی شاعری ایک ایسا گھر ہے جس میں [illegible] ہے اور با [illegible] بہترین قالینوں سے آراستہ کر [illegible]

ریفریجریٹر، دیواروں پر داغ چھپانے والے وال پیپر
وقت بتانے والی گھڑی، صوفے اتنے ملائم کہ
جسم کا آدھا حصہ نہ دکھائی دے۔ شرابیں اتنی
قسم کی کہ روز مترو کا پینے والا بھی یہ سوچتے سوچتے
بے ہوش ہو جائے کہ کون سی بوتل پہلے کھولنی چاہیے
لیکن اس گھر میں زندگی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس
میں زندگی کا وہ وجود بھی نہیں ہے جو گھر کی دہلیز میں
ٹوٹی ہوئی چارپائی پہ ۹۰ سالہ دمے کے مریض
بزرگ کے پاس ہوتی ہے۔ وہ زندگی بھی نہیں
ہے جو اسپتال کی ننگی فرش پر پڑی ہوئی اس
طوائف کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ جو حمل گروانے
کے چکر میں مرنے کے قریب ہوتی ہے۔

بیلے: جدید غزل کے متعلق کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس میں
بڑی کشش ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

رانا: یقیناً ہے۔
لیکن چونکہ ادب میں گھس پیٹھیے بہت آگئے ہیں
اور خاص طور سے جدید شاعروں میں بیمر توڑ
قسم کے شاعر جو نرم گھاس پر بھی جوتے پہن کر چلتے
ہیں اور شاعری میں بھی بہت گنجائش کرتے ہیں۔ نتیجہ
یہ ہوتا ہے کہ جدید شاعری میں کیڑے نکالنے والوں
کو موقع ملتا رہتا ہے۔ اور جدید شاعری بدنام
ہونے لگتی ہے۔ بکری میں میں کرتی ہے بکرا نعرہ
لگاتا ہے۔ اب بھلا بتائیے اسے شاعری کون کہے گا
اماں جمیل بھائی! اب تو میں الٰہ آباد جانے سے
بھی ڈرتا ہوں کہ ساحل احمد مجھ سے کب فرمائش
کر دیں [illegible] کے لیے۔

بیلے: آزاد غزل اور نثری نظم سے آپ کس حد تک
متاثر ہوئے؟

رانا: صاحب! مجھے ایک ہزار روپیہ کما کر اتنی خوشی
نہیں ہوتی جتنی خوشی غزل کا ایک اچھا شعر سن
کر ہوتی ہے۔ غزل اس آبشار سے زیادہ خوبصورت
ہے جو گھر کے دریچے پر دو آنکھیں کرتی رہتی ہیں
غزل اس دلہن سے زیادہ خوب صورت ہے جو
آپ کو آئینے پر ہوتا ہے۔ غزل اس تحریر سے
زیادہ کارگر ہے جو آپ اپنے محبوب کے لئے استعمال
کرتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ غزل کو قاعدے سے برتا
جائے۔ اور اس بات کو بھلا دیا جائے کہ غزل
محبوب گفتگو کرنے کا نام ہے —— لیکن ——
—— آزاد غزل —— ارے بھائی!
ہندوستان آزاد ہوا تو ہر آدمی اتنا اترایا ہوا سا
ہو گیا۔ اگر کہیں غزل نہ آزاد ہو گئی تو کلیم الدین احمد
مرحوم قیامت کے دن ہم لوگوں کو دوزخ میں
ڈلوا دیں گے۔ ابھی پچھلے دنوں "شاعر" نے آزاد
غزل نمبر شائع کیا تھا چونکہ میں اس کا سالانہ
خریدار ہوں لہٰذا حسب معمول وہ پرچہ میرے پاس
آیا میں نے اپنے ایک پڑھے لکھے "ٹائپسٹ"
TYPIST سے رسالہ لانے کو کہا تو وہ کہنے
لگے کہ آپ خود ہی اٹھا لیجئے میں وضو کئے ہوا ہوں
بہر حال وہ پرچہ میں نے پڑھا۔ حالانکہ ایسے ہی پڑھا
جیسے ایک شہر میں رہنے والا آدمی دیہات میں رہنے
والی بیوی کا خط پڑھتا ہے۔ بڑی بے دلی سے
—— بڑی بیزاری سے اس کے باوجود
موڈ اتنا خراب ہوا کہ محلے والوں نے تو نظر انداز
کر دیا مگر بیوی کے ہاتھوں سے پٹتے پٹتے بچا۔
مشتاق یوسفی نے کہیں لکھا ہے کہ دنیا میں [illegible]
[illegible] جو کچھ بھی جہاں بھی ہو رہا ہے میری [illegible]

کے بغیر ہو سکتا ہے۔ نثری نظم اور آزاد نظم کے سلسلے میں میری رائے اس سے بھی زیادہ خراب ہے۔

جمیل: پروفیسر کلیم الدین احمد مرحوم نے غزل کو نیم وحشی صنف قرار دیا ہے۔ آپ اس رائے کے متعلق کیا کہیں گے؟

دانا: یہ سوال پوچھنا تھا تو کچھ دنوں پہلے آتے۔ بزرگوں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ ؎
"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"
جمیل بھائی! زندہ لوگوں کے بارے میں پوچھئے مجھے گنہگار نہ کیجئے۔

جمیل: رانا صاحب! آپ کو دوسرے شاعروں کے بھی سارے اشعار زبانی یاد ہیں۔ جبکہ بہت سے شاعروں کو اپنے اشعار بھی یاد نہیں رہتے اس کی کیا وجہ ہے؟

دانا: میرا ایک ذاتی تجربہ ہے کہ جو لوگ کلام پاک نہیں پڑھتے ہیں اور کلام پاک کی آیتیں جن لوگوں کو نہیں یاد ہوتی ہیں ان کی یادداشت کبھی اچھی نہیں ہوتی ہیں۔ ممکن ہے میری اس رائے سے قاری اتفاق نہ کریں لیکن بقول میر ؎

مستند ہے میرا فرمایا ہوا
آپ بھی آزما کر دیکھ لیجئے

اس کی ایک مثال ہمارے شہر کے سالک لکھنوی ہیں جنہیں اپنا بھی ایک شعر نہیں یاد ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے کلام پاک نہیں پڑھا ہے۔

جمیل: غزل اور نظم میں آپ کس صنف کو اظہار خیال کے لیے بہتر سمجھتے ہیں؟

دانا: صرف غزل میں اس لئے کہتا ہوں کہ نظم مجھے کہنا نہیں آتی ہے۔

نظم اور غزل میں وہی فرق ہے جو ڈاکٹری دوا اور حکیمی دوا میں ہے۔ آج تک میں نے کسی کو حکمت پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ جبکہ ہمارے ایک دوست حکیم عبدالجبار ڈاکٹری دواؤں کا استعمال کر رہے ہیں۔ صاحب ایک کیپسول میں جس کا وزن بمشکل تمام ½ گرام ہوتا ہوگا کتنی کارآمد دوائیں بند کر دی جاتی ہیں۔ جبکہ حکیمی نسخے کی دوا رکھنے کے لئے مجبوراً کر ڈالا کا ڈبہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ لہٰذا میں مضمون غزل کے کیپسول میں بند کرنا چاہتا ہوں۔ ؟ کے کے ڈبے سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

جمیل: غالب نے اردو غزل کو ایک نئی زندگی دی سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجئے۔؟

دانا: حالی بھی نہ تھے منکر غالب بھی نہیں تھے
ہم اہل تذبذب کسی جانب بھی نہیں تھے

جمیل: اقبال کی شاعری کے سلسلے میں اپنے خیالات اظہار کیجئے؟

دانا: جب میں پیدا ہوا تھا تو اقبال دنیا سے جا چکے تھے۔ اور جگن ناتھ آزاد دنیا میں آچکے تھے ہیں اور اللہ جانے کب تک موجود رہیں گے آپ انہیں سے جا کر اقبال کی شاعری کے سلسلے میں اظہار خیال کی گزارش کیجئے۔

جمیل: غزل میں عشق کا برتاؤ ضروری ہے بلکہ یہ کہ اردو شاعری میں عشق کو غالب حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجئے

دانا: جس قوم نے اردو شاعری زیادہ کی ہے۔ محبت اور نفرت دونوں کے سلیقوں سے واقف ہے

جو لوگ شاعری نہیں کرتے وہ لوگ بھی عشق کرتے ہیں۔ اور شاعر تو پیدائشی طور پر حسن پسند واقع ہوا ہے۔ میں نے احمد فراز سے انٹرویو لیتے وقت ایک جملہ تحریر کیا تھا کہ دنیا میں جہاں کہیں حسن ہے ہمارا رشتہ دار ہے۔ اس پندرھویں صدی میں ریل میں اگر بیٹھنے کی جگہ مل جاتی ہے۔ سینما ہال کا ٹکٹ مل جاتا ہے پیٹرول پمپ پر تیل مل جاتا ہے۔ راشن کی دوکان پہ آٹا فن مل جاتا ہے تو ہم اتنے خوش ہو جاتے ہیں جتنا ہمارے بزرگ محبت کرکے خوش نہیں ہوتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ محبت خواہ محبوبہ کی ہو، ماں کی ہو بہنوں کی ہو، بھائیوں کی ہو یا آپ کے گھر میں پالتو بلی یا بکری کی ہو تو آپ کو بہت اچھی لگتی ہے۔ چونکہ شاعر اپنے جذبات کا اظہار آسانی سے کر سکتا ہے۔ لہذا غزل کے کینوس CANVAS پر محبت کی یہ تصویر نمایاں ہو جاتی ہے۔

آپ کے جواب سے یہ ظاہر ہے کہ غزل میں عشق کا ہونا ضروری ہے چونکہ یہ جذبہ فطری ہے ارادتاً نہیں؟

مثلاً شاعری میں میرے خیال کے مطابق ارادے کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ارادہ تو باغ لگانے کا کیا جاتا ہے پھل کھانے کا نہیں۔ ارادہ شادی کرنے کا کیا جاتا ہے بچہ پیدا کرنے کا نہیں۔ شاعری تو ایک ایسا عمل ہے جس پر سے آپ کے ان SENTI-MENTS کو بھی گذرنا پڑتا ہے جو لنگڑے ہوتے ہیں۔ یہ فیصلہ بعد میں کیا جاتا ہے کہ صحیح سلامت SENTIMENTS اس پل سے گذر گئے ہیں۔ اور یہیں پر شاعری کی سطح اور مقام متعین ہوتا ہے۔ اب آپ دیکھئے شاعری فوٹو گرافی تو

نہیں ہے کہ کیمرہ مین نے کامل حیدری سے کہا کہ تم ہٹ جاؤ ہم صرف جمیل منظر اور مسعود رانا کی تصویر اتاریں گے۔ شاعری تو اس ظالم پولیس والے کی لاٹھی ہے۔ جس سے اس کے بڑے افسر کا بیٹا بھی مر سکتا ہے۔

کامل: میرا خیال ہے کہ طرحی غزل میں آدمی اپنے جذبات کو اس انداز میں نہیں پیش کر سکتا ہے اتنی اچھی شاعری نہیں کر سکتا ہے جیسی غیر طرحی غزلیں لکھ کر؟

دانا: پہلے زمانے میں صرف طرحی مشاعرے ہوتے تھے طرحی غزلیں کہی جاتی تھیں۔ اس میں فرمانبرداری غیرت اور قدروں کا دخل تھا۔ یہ پندرھویں صدی ہے آپ کا اپنا بیٹا اگر آپ سے CAR کی چابی مانگتا ہے آپ نہیں دیتے ہیں تو وہ پیٹرول کی ٹنکی میں شکر ڈال دیتا ہے۔ نافرمانی کا یہ عالم ہے کہ جہاں پر لکھا ہوتا ہے کہ یہاں پر پیشاب کرنا منع ہے۔ لوگ وہیں پیشاب کرتے دیکھے جاتے ہیں۔ بے غیرتی کا یہ عالم ہے کہ لوگ کالا بازاری کے سلسلے میں جیل جاتے ہیں اور جیل سے نکلنے کے بعد فرماتے ہیں کہ سسرال سے آرہا ہوں۔ شاعروں کا جہاں تک معاملہ ہے تو ہر شاعر کسی نہ کسی کرسی یا کرسی والے پر پالش کرتا ہوا نظر آتا ہے قدروں کا معاملہ یہ ہے کہ ہر بچے صبح ٹرین کے ڈبوں میں لٹک کر کارخانوں کی دوزخ کی طرف چل دینا پڑتا ہے۔ گھر لوٹتے ہیں تو تھکن اتنی سوار رہتی ہے جیسے آبرو ریزی کی ہوئی عورت۔ مسئلے اتنے ہیں کہ لڑکا ضد کرتا ہے کہ سوتی پینٹ پہن کر کالج نہیں جاؤں گا۔ سب لڑکے ٹیری کاٹ پہنتے ہیں۔ لڑکی تمنائی ہے کہ پبلک بس میں بیٹھ کر

اسکول نہیں جاؤں گی۔ راستے میں لڑکے بدتمیزی اور کھینچا تانی کرتے ہیں۔ میرے لئے رکشے کا انتظام کرا دیجئے پاپا۔ بیوی کا حکم نامہ جاری ہوتا ہے کہ گھر کے اخراجات اب آپ سنبھالئے تو ورزم منسٹری نہیں دے دیجئے۔ سویرے سات بجے سے رات کے دس بجے کی اس نوکری کے بعد جب پسینے سے بھیگا ہوا ہاتھ خون پسینے سے بھیگی ہوئی قمیص کی جیب میں ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مصرعہ طرح کا پرچہ آنسا گل چکا ہوتا ہے کہ بالائی میں ملاوٹ کی کام ہو سکتی ہے۔ اور سیاہی سے لکھی ہوئی مصرعہ طرح بے ضمیر آدمی کے دل کی طرح بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ صاحب! مجھ سے مصرعہ طرح میں غزل نہیں ہو پائے گی۔

جمیلہ: کہتے ہیں کہ شاعری الہام کا دوسرا نام ہے۔؟ آپ اپنی رائے کا اظہار کیجئے۔؟

دانا: شاعری اگر الہام کا نام نہیں ہوتا تو سب سے پہلے مجھے ہی شاعروں کی فہرست سے نکال دیجئے کیونکہ اپنی کوشش سے میں آج تک ایک شعر بھی نہیں کہہ پایا۔

جمیلہ: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آج زبان بے حد مختلف ہو گئی ہے اور انتشار کا سبب بنتی جا رہی ہے آپ اپنی رائے دیجئے۔؟

دانا: بھائی زبان ہوٹل کے کھانے کی پلیٹ نہیں ہے کہ اس میں ایک ہی رضیہ دسترخوانی قسم استعمال کیا جائے۔ زبان اس ضرورت کا نام ہے اللہ نے ہم کو جو گوشت پوست کی زبان دی ہے وہ بھی ضرورت پر استعمال کرنے کے لئے ہے میں آپکو ایک لطیفہ سناتا ہوں :

• ایک مضافاتی ریلوے اسٹیشن ماسٹر کو جنرل منیجر کی جانب سے یہ ٹیلی گرام ملا کہ مینجمنٹ سے اجازت لئے بغیر کوئی کام نہ کیا جائے۔ کچھ دنوں بعد اسٹیشن ماسٹر نے جنرل منیجر کو ایک ٹیلی گرام روانہ کیا کہ پلیٹ فارم پر شیر ایک مسافر کو کھا رہا ہے مجھے حکم دیا جائے کہ میں کیا کروں

کامل: آپ یہ بتائیے کہ مشاعرے کی شاعری زیادہ ہے یا پرچے میں چھپنے والے کی زیادہ اہمیت

دانا: اہمیت تو یقینی طور پر پرچوں میں چھپنے والوں کی زیادہ ہے۔ لیکن کیا آپ ہندوستانی رسالوں میں چھپنے والوں کی شاعری سے مطمئن ہیں؟ میں تو مطمئن نہیں ہوں۔

کامل: مطمئن نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟

دانا: جدید شاعری کے بانی مجروح ترقی پسند یار داغ کا کوئی غیر مطبوعہ کلام یا کم شہرت یافتہ اپنے نام سے کسی اردو رسالے میں بھیج دیجئے۔ ایڈیٹر صاحب باعزت طور پر غزل آپ کو واپس کر دیں گے۔ نیچے لکھا ہوگا کہ غزل ہمارے رسالے کے معیار کے مطابق نہیں ہے۔ خریداری چندے کی رسید کی فوٹو کاپی یا شراب خانے کا ساتھ میں ATTACH کر کے بھیجئے آپ کی ایک غزل ایک ہی رسالے میں ۱۸ ماہ میں دو بار چھپ جائے گی۔ ۱۷ مہینے میں اس لئے نہیں کہ بچے محرم ۱۹۰۰ کے بعد پیدا ہوئے

کامل: بہت اچھے شاعر اچھی شاعری کرتے ہوئے بھی مشاعرے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ ایسا کیوں؟۔

دانا: بعض مشاعرہ کرتب [illegible] ہے ایک

گاؤں میں بہت بہادر کہلاتا ہے۔ اور وہ اکیلے
چار آدمیوں سے مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتا ہے
لیکن شہر میں اس کو ایک دبلا پتلا لڑکا استرا ہاتھ
میں لے کر بھیگی بلی بنا دیتا ہے۔ بالکل یہی صورت
حال اچھے شاعری کرنے والے شاعروں کے ساتھ
ہے۔ مشاعرہ وہ شہر ہے جہاں تعلقات میں آپ
کی جان پہچان ہو۔ آدمی آپ کے ساتھ ہوں
اور ہر قسم کا نشہ کرنے کے لیے آپ تیار رہیں
مثال کے طور پر بہت سے مشاعروں میں میں اس
لیے نہیں جاتا کہ وہاں شراب بہت پی جاتی ہے
اور بہت سے مشاعروں میں مجھے اس لیے نہیں
بلایا جاتا کہ میں شراب نہیں پیتا۔ اور یوں بھی
مشاعروں کا ماحول کسی شریف شاعر کے لئے قطعی
ساز گار نہیں ہے۔ برا مت مانیے گا اگر غالب
آج زندہ ہوتے تو وہ بھی ڈیڑھ سو روپے کے
PAYMENT پر میرٹھ لوچنڈی کے مشاعرے
میں دھکے کھاتے پھرتے۔

سوال: آپ مشاعرے کے ماحول کو شریف شعراء کے لئے
ساز گار نہیں مانتے۔ پھر یہ شاعرات کس جذبے
کے تحت مشاعرے میں شرکت کرتی ہیں۔ اور کچھ
مشاعروں کی باگ ڈور خود آپ کے ہاتھوں ہوتی
ہے۔؟

ر آغا: تعجب ہے کہ آپ ابھی تک مجھے شریف آدمی سمجھتے
ہیں۔ جہاں تک مشاعروں میں شرکت کرنے کا
سوال ہے تو میں پکنک کے طور پر مشاعروں میں جاتا
ہوں۔ بقول حبیب ہاشمی منہ کالا کرا لینا بہتر ہے
مشاعرے میں منتظمانہ شرکت کی ذمہ داری
لینا مناسب نہیں ہے۔ اور یوں بھی مشاعروں
کی وجہ سے مجھے کاروبار میں کافی نقصان پہنچتا ہے
جتنا مجھے PAYMENT ملتا ہے اس سے
تین گنا زیادہ میرا پیسہ خرچ ہوتا ہے۔ اور دکان
چھوڑنے کی وجہ سے یہاں پر بھی کاروباری نقصان
ہو جاتے ہیں۔ اور جہاں تک مشاعروں میں
شاعرات کی شرکت کا سوال ہے تو آپ خود
دیکھیے کہ فی زمانہ عورت ہماری زندگی کا ایک ایسا
حصہ بن گئی ہے کہ اس کے بغیر آج کی دنیا میں کوئی
کام نہیں ہوتا ہے۔ مشاعروں میں ۳۰ فیصد شاعر
سننے والے ہوتے ہیں۔ ۵۰ فیصد شاعرہ دیکھنے
والے ہوتے ہیں۔ ۱۰ فیصد شاعروں کے دوست
احباب ہوتے ہیں۔ اور بقیہ ۱۰ فیصد میں گھر سے
نکالے ہوئے اور بھاگے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ یا
جن لوگوں کو مسافر خانے یا ہوٹل میں جگہ نہیں ملتی
ہے۔ ان کو بھی اسی میں شمار کر لیجیے۔ کنوینر
CONVENER مشاعرہ کا پہلا سوال یہ ہوتا
ہے کہ دیکھنے میں کیسی لگتی ہے لہٰذا آپ نے بھی
دیکھا ہوگا کہ اکثر شاعرات صورت کے معاملے میں
مناسب ہوتی ہیں۔ کچھ ہمارے شعراء کرام ہیں
جو مشاعرے سے پہلے دن بھر تاش کھیلتے ہیں۔
مشاعرہ شروع اور ختم ہونے تک شراب پیتے
ہیں۔ شراب ختم ہوتے ہی دل بہلانے کا دوسرا
سامان تلاش کرتے ہیں۔ موقع سے فائدہ کوئی
بار میں نے بھی اٹھانا چاہا لیکن ؎
کہیں قافیہ ہی نہیں سجا۔ تو کہیں ردیف نکل گئی۔

کامل حیدری صاحب! ایک مشاعرہ تو آپ نے
بھی بپا کی تھی۔ لیکن ؎
تم نے جس جا گھر بنایا وہ سڑک میں آ گیا۔

یا سے
تعاقب تعارف، تکلف، تعشق
مگر اس کی شادی ہوئی دو سے

کامل : چونکہ آپ خود بھی ہر سال مشاعرہ آرگنائز کرتے ہیں اور کنوینر رہتے ہیں تو مشاعرے سے اردو کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے اس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کریں۔؟

دانا : میری ذاتی رائے اس سلسلے میں یہ ہے کہ مشاعرے سے اردو شاعری کو اتنا فائدہ نہیں پہونچ رہا ہے جتنا نقصان اردو کے اچھے شاعروں کو مشاعرے میں شرکت کرنے سے ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر بشیر بدر، راحت اندوری، معراج فیض آبادی یہ لوگ مشاعروں کی وجہ سے بدنام ہو گئے ہیں۔ حالانکہ مشاعروں کے کاروبار میں بشیر بدر نے CAR خرید لی۔ راحت اندوری نے مکان بنوالیا۔ معراج فیض آبادی سنی وقف بورڈ پر قبضہ جمانے کی فکر میں ہیں دراصل ہمارے یہاں ہندوستان میں مشاعروں کے دو گروپ ہو گئے ہیں۔ ریڈیو کا مشاعرہ ہوتا ہے تو سقراط اور بقراط بلائے جاتے ہیں شہری کمیٹیوں کے مشاعرے ہوتے ہیں تو وہاں پر صرف گویئے اور بچھیئے بلائے جاتے ہیں۔ اب آپ دیکھئے کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے اکثر مشاعرے بہت پھس پھسے ہوتے ہیں۔ اور کمیٹیوں کے مشاعرے نوٹنکی معلوم ہوتے ہیں جبکہ ہونا یہ چاہئے کہ دونوں قسم کے مشاعروں میں شاعروں کو مدعو کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ مشاعرہ اردو کی بزم خواب گاہ ہے۔ بے تکلفی اور احترام، لگاوٹ اور سلیقہ تہذیب اور بے ساختگی، ترنم اور کرختگی دونوں کو شامل ہونا چاہئے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں لگ بھگ تقریباً قریب ۸۰ فیصد اوسط درجے کے لوگ سنتے ہیں۔ موٹے موٹے فلسفوں کے پتھر، ادق ادق الفاظ کے لشکر، بے روح شاعری کی پھلجھڑی آدمی بھگاؤ ترنم سن کر شاعرے اور اردو کو نقصان ہی پہونچتا ہے۔

کامل : مشاعرہ اگر ہر ماہ کل ہند پیمانے پر منعقد کیا جائے تو لوگ ۲۵ - ۵۰ روپے کا ٹکٹ خرید کر شرکت کرتے ہیں۔ جبکہ اردو کا ادبی رسالہ دو روپے کا بھی بک اسٹال پر لٹکا رہ جاتا ہے ایسا کیوں۔؟

دانا : کامل صاحب! میں نے شروع میں ایک بات عرض کی تھی اردو کے ادبی رسائل بدعریانیت کی غلاظت سے بھرے ہوئے ہیں۔ دوسری بات تو یہ ہے کہ اردو کے رسالے تو اچھی خاصی تعداد میں بکتے ہیں۔ ادبی رسالوں کا حال برا ہے۔ اس کی وجہ اس کی کتابت اور طباعت بھی ہے۔ میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں آپ غور کیجئے گا۔ ۳-۴ سال پہلے کلکتہ سے آزاد ہند روزنامہ ہند، اور عصر جدید یہ تین اخبارات صبح ایڈیشن کے نکلتے تھے۔ آزاد ہند کے بارے میں لوگوں کی رائے یہ ہے کہ وہ اردو کا انگریزی اخبار ہے۔ کیونکہ اس کا اداریہ، اس کی محتاط خبریں اس کے چھپتے ہوئے بیانات اور ہلکے پھلکے اشتہاروں سے گریز کی وجہ سے کلکتہ میں اس اخبار

کو کافی اہمیت دی جاتی ہے اس کے باوجود تمام اخبارات بہت ہی خراب طباعت کے ساتھ میلے میلے کاغذ پر چھپ کر قارئین تک پہونچتے تھے آپ یقین کیجیے کہ ان تینوں اخبارات کی تعداد میرے خیال سے چھ سات ہزار سے روزانہ سے زیادہ نہیں رہی ہوگی۔ فی الوقت کلکتہ سے تین اخبارات آفسیٹ پر نکل رہے ہیں۔ اخبار مشرق کا یہ CONTRIBUTION رہا ہے کہ اس نے کلکتہ میں اخبار آفسیٹ پر چھاپنے کی داغ بیل ڈالی میں نے تھوڑی بہت انگریزی بھی پڑھی ہے اور یہ ہندی تو ہمارے ملک کی قومی زبان ہے۔ لیکن اس کے باوجود جس دن میں اردو کا اخبار نہیں پڑھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے برش سے دانت صاف کیے بغیر ناشتہ کر لیا ہو۔ اس کے باوجود اگر کبھی مجھے سویرے کے جہاز سے کہیں جانا ہوتا تھا تو میں اردو کی آبرو بچانے کی خاطر اردو کا اخبار نہیں خریدتا تھا۔ لیکن اب جبکہ ماشاء اللہ کلکتہ سے روزنامہ "اقرار" کو ملا کر تین اخبارات آفسیٹ پر نکل رہے ہیں جن کی مجموعی تعداد کم و بیش ۳ ہزار سے کم نہیں ہوگی۔ میری عادت میں شامل ہو گیا ہے کہ صبح جو اخبارات مل جائیں میں ان کو خرید لیتا ہوں۔ اور ہوائی جہاز میں اسی شان سے پڑھتا ہوں جس شان سے اتنی بدسلوکیوں اتنی محرومیوں، اور اتنے ظلم و ستم کے بعد اردو ہندوستان میں زندہ ہے۔ اور آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ میں جہاں سفر ختم کرتا ہوں یہ اردو کے اخبارات ہوائی جہاز میں چھوڑ آتا ہوں۔ کیونکہ ممکن ہے کہ میری طرح کے اور بھی بہت سے لوگ دانت صاف کیے بغیر ناشتہ کرنے کے عادی نہ ہوں۔

میں نے ایک بار اخبار مشرق کے مدیر وسیم الحق سے کہا تھا کہ جب تمام اسٹالوں پر اردو کے اخبارات ملتے ہیں تو لکھنؤ ایرپورٹ کی طرح کلکتہ ایرپورٹ پر بھی اردو کے اخبارات ملنے چاہئیں۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ کلکتہ سے سویرے کے جتنے جہاز ہیں ان میں آپ اپنی جانب سے ۱۰ اخبارات فی جہاز COMPLIMENTRY کاپی بھیج دیا کیجیے۔ اس کا خرچ ہمارا ادبی ادارہ "اردو آرٹس" برداشت کرے گا۔ ملکہ کامل صاحب میں تو جمیل صاحب سے بھی یہ کہوں گا کہ پٹنہ ایرپورٹ پر بھی اس قسم کا اہتمام کیا جائے کیونکہ بہار کی وزارتیں بھی اردو دوستی کا بہت دعویٰ کرتی ہیں۔ کلکتہ میں ایک کمپنی جس کا نام "DEYS MEDICAL STORES" ہے اس نے کبھی کسی اخبار یا رسالے کو اشتہار نہیں دیا تھا۔ میں اپنے مشاعرے کے مجلہ کے سلسلے میں DEYS MEDICAL کے مینجنگ ڈائرکٹر مسٹر بھوپیندر ناتھ ڈے سے ملا وہ مجھے اپنے بیٹے کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ میں نے ان سے گذارش کی کہ آپ کیوکارپن تیل کے اشتہارات اردو اخباروں کو بھی دیجیے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے یہاں کوئی اردو جاننے والا نہیں ہے۔ لہٰذا اس کا بلاک اور میٹر کیسے بنائیں گے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ بہتر ہے میں آپ کے پاس ایک آدمی بھجوا دوں گا اس کے بعد میں نے اخبار مشرق کے ایڈیٹر وسیم الحق سے ایک ملاقات پر کہا کہ آپ DEYS

MEDICAL میں مسٹر بھوپندر ناتھ ڈے
سے ملاقات کر لیجئے کہ وہ اردو اخبارات میں
اشتہار دینا چاہتے ہیں۔ بہرحال اس کے کچھ دنوں
بعد ہی DEYS MEDICAL جیسی بڑی
کمپنی کے اشتہار اردو اخبارات کو ملنے لگے۔
اشتہارات خواہ سرکاری ہوں، نیم سرکاری یا
پرائیویٹ کمپنیوں کے صرف تعلقات کی بنا پر ملتے
ہیں یا آپ یوں کہہ لیجئے۔ "ADVERTISE-
-MENTS DEPEND ON RELA-
TION NOT CIRCULATION"
اگر ہمارے ادبی رسائل کے مالکان رسالے
کو قاعدے سے نکالنا چاہیں اور طریقے سے کام
کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ فنون، نقوش، اوراق
اور سیپ کی طرح کے رسالے ہندوستان میں
نکل سکیں۔ اس سلسلے میں اگر چھوٹے
اردو رسالے میری مدد لینا چاہیں تو کہیں بھی
لکھا ہو کہ ہم لوگ گفتگو کر سکتے ہیں۔

جمیل: کچھ لوگ اردو رسم الخط ہی بدل دینے کی بات
کرتے ہیں اس سلسلے میں آپ بھی اپنی رائے
دیجئے؟

دانا: اردو رسم الخط کا بدلا جانا قطعی غیر دانشمندانہ
فعل ہے۔ یہ تو جمیل صاحب بالکل ایسا ہی ہے
جیسے ہم لوگ ہندوستانی ہونے کے ناطے اپنے
اپنے نام تبدیل کر لیں۔ مثلاً آپ جے مل ہو جائیے
اور میں منوہر لال ناہو جاؤں۔ بشیر بدر بنی بازمہر
ہو جائیں۔ اور راہی معصوم رضا راہی ادم راجا ہو
جائیں۔ دیکھئے جمیل مظفر صاحب! نہ تو میں ہندوستان
چھوڑ کر بھاگا اور نہ ہی آج تک کسی کو بھگا کر لایا ہوں
کیونکہ نہ میں اپنا گھر چھوڑنا چاہتا ہوں اور نہ کسی
دوسرے کا گھر برباد کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا اردو
رسم الخط کے بارے میں میری بے باک رائے ہے
کہ اس کو ہرگز تبدیل نہ ہونا چاہئے۔ بشیر بدر میرے
بہت ہی قریبی دوست ہیں پچھلے دنوں ان کے
بارے میں بھی یہ بات اڑائی گئی کہ وہ اردو رسم
الخط کے تبدیلی کے حق میں ہیں۔ بشیر بدر کو میں
بہت قریب سے جانتا ہوں ان کو اردو یا ہندی
سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اردو
ہندی کے جھگڑوں سے ہمیشہ دور رہنے والے آدمی
کا نام بشیر بدر ہے لیکن شہرت حاصل کرنے
کا شوق بشیر بھائی کو اتنا زیادہ ہے کہ وہ حرام
حلال کی تمیز نہیں کر پاتے ہوں گے۔ میں نے بہت
سے لوگوں کو مری ہوئی فاختہ کھاتے ہوئے دیکھا
ہے۔ لوگ تو کہنے لگے مری نہیں تھی مرنے کے قریب
تھی۔ راکیش شرما جس نے خلا پر جا کر اقبال کا شعر
"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"
پڑھ لیا ہے اس کے بارے میں اگر بشیر بدر کو معلوم
ہو جاتا تو بشیر بدر کو چاہے کچھ بھی کرنا پڑتا لیکن وہ
راکیش شرما کو اقبال کا شعر پڑھنے نہیں دیتے
اپنا کوئی شعر پڑھواتے۔ اردو رسم الخط میں کسی
قسم کی تبدیلی کا خیال بھی کفر کی مانند ہے۔ رسم
الخط کرایہ کا وہ مکان نہیں ہے جس کو شاد عارفی
نے ۲۶ بار بدلا تھا۔

زباں وہ شہر نہیں ہے جہاں پہونچنے
کے لئے گاڑیاں بدلنی پڑتی ہیں
... نسل کو اک تازہ مدینے کی تلاش
صاحبو اب کوئی ہجرت نہیں ہوگی ہم سے

جمیلہ: اردو کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

دانا: برا مت مانئے گا جس کا ماضی تابناک ہوتا ہے اس کا مستقبل ہمیشہ خراب ہوتا ہے اس کی ایک وجہ ہے ماضی کے سردخانے میں رکھی ہوئی لاش اپنے پاس سے سوگواروں کو اٹھنے نہیں دیتی مستقبل کی دھوپ آتی ہے۔ دریچوں سے لوٹ جاتی ہے۔ مستقبل ماضی میں بدلتے رہتے ہیں۔ وقت گزرتا جاتا ہے۔ سردخانوں میں بیٹھے ہوئے سوگوار خواہشوں کے حصے میں اپنے بچوں کے مستقبل کی تمنا کو پی جاتے ہیں۔ اب چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ آج سے ۵۰ سال پہلے جن رؤسا نے اپنی عمارتیں وقف اولاد کردی تھیں۔ ان کے صاحبزادگان نے اس ۵۰ سال کے سفر میں ایک نئی اینٹ بھی نہیں خریدی حویلیاں نحیف مزدوروں کی طرح گرنے کے قریب ہیں۔ ان کے گھروں کی عورتیں اپنے لہجہ، دائیوں کے کپڑے زیب تن کرنے لگی ہیں۔ ان کے بچے اپنے ودہاتوں کی مصاحبی کر رہے ہیں۔ آپ غور کیجئے گا کہ جن شہروں کی ایک ادبی حیثیت رہی ہے۔ مثلاً لکھنؤ، عظیم آباد، رام پور، اعظم گڑھ وغیرہ وغیرہ۔ فی زمانہ ان شہروں کا حال دیکھئے۔ لکھنؤ کا ہر آدمی خواجہ حیدر علی آتش پٹنہ کا ہر آدمی شاد عظیم آبادی، رام پور کا ہر آدمی محمد علی جوہر، اور شاد عارفی، اعظم گڑھ کا ہر آدمی اپنے آپ کو فلاں فلاں تصور کرتا ہے۔ ایک صورت حال پیدا ہو تو آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اردو کا مستقبل تابناک ہے

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جو قوم اخبار مانگ کر پڑھتی ہے وہی قوم روٹی بھی مانگ کر کھاتی ہے اب آپ مسلم چائے خانوں کا جائزہ لیجئے ایک اخبار پر پوری قوم سوار رہتی ہے۔ چھینا جھپٹی میں یہ بھی دھیان نہیں رہتا ہے کہ ہمارا ماضی جو ایک لاش کی شکل میں ہے اٹھ بیٹھتا ہے۔ اور اس کی آنکھوں سے غیرت مند آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔ رتنا کا ۳۰ نمبر زردہ، بابا کا ۱۲۰، اور ۱۶۰ نمبر زردہ، تلسی کا ۶۰۰ اور ایک ہزار نمبر زردہ، پان پراگ، پان بہار، اور چار مینار پان مسالوں سے آراستہ ایک پان ایک روپیہ سے لے کر تین روپے کی قیمت تک کا ملتا ہے۔ کتنی غیرت کی بات ہے کہ ۲ سے ۱۰ روپے تک کے پان کھانے والے لوگ ۵۰ پیسے کا اخبار اور دو روپئے کا اردو رسالہ نہیں خرید سکتے ہیں۔

جمیلہ: سن پیدائش اور جائے پیدائش؟

دانا: بزرگوں سے سنا ہے کہ ۲۶ نومبر ۱۹۳۲ء بروز جمعہ شام کو ساڑھے پانچ بجے ہندوستان کی ایک بڑی ریاست یوپی کے چھوٹے سے شہر رائے بریلی میں پیدا ہوا۔

جمیلہ: ابتدائی تعلیم اور زندگی کے بارے میں بتائیے؟

دانا: شروع شروع میں میرا نام رائے بریلی میں ہمارے محلے کے ایک چھوٹے سے اسکول شیب ودیالے میں لکھوا دیا گیا۔ جہاں میں نے پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد درجہ چھ میں میرا داخلہ گورنمنٹ انٹر کالج رائے بریلی میں کرا دیا گیا۔ جہاں میں ساتویں جماعت

میں فیل ہو گیا۔ والد صاحب بہت سخت مزاج
واقع ہوئے ہیں انہوں نے میری بہت پٹائی کی۔
اور میرے میں ایک شفیع مستری صاحب رہتے
ہیں جن کو ہم لوگ گاؤں کی تہذیب اور عظمتوں
کی بنا پر بڑے ابا کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ ہمارے
خاندان سے تعلق نہیں رکھتے۔ لیکن چونکہ شرافتیں
کسی ایک خاندان کی میراث نہیں ہوا کرتیں محبتیں
قسمیں اور فرہاد کو وراثتوں میں نہیں ملی ہیں۔ لہذا
ہمارے دیہات ہمارے قصبے ہمارے چھوٹے
چھوٹے شہر ابھی بھی ہندوستانی وضع داری
خلوص اور بے لوث خدمتوں کی نشاندہی کرتی
ہے۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میرے والد صاحب
نے میری پٹائی کرنے کے بعد دوسرے دن سویرے
بڑے ابا کے ساتھ راج مستری کے کام پر بھیج
دیا۔ اس زمانے میں رائے بریلی میں ایک نئی
اور غالباً پہلی کالونی بن رہی تھی۔ دو دنوں
تک وہاں میں نے راج مستریوں کے ساتھ مزدوری
کا کام کیا۔ تیسرے دن والدہ نے ابو صاحب کو
سمجھا کر معاف کروا دیا۔ آپ کو سن کر حیرت ہوگی
کہ بچپن سے لے کر آج تک مجھے میری والدہ نے
پھول کی چھڑی سے بھی نہیں مارا۔ والد صاحب
نے تو مجھے اتنا مارا ہے کہ میں اب اپنے بچوں کو اس
لئے نہیں مارتا ہوں کہ ان کے حصے کی مار بھی میں
نے کھالی۔ حالانکہ ہمارے والد محترم اللہ ان کو
حیات دے ہمیں اتنا پیار کرتے ہیں کہ اگر آپ
یا کوئی بھی صرف ۵ منٹ ان سے گفتگو کریں گے
تب بھی کہیں نہ کہیں سے وہ میرا تذکرہ ضرور
کریں گے۔ میں جانتا ہوں کہ جس دن خدا نہ کرے
میرے والد اس دنیا میں نہیں رہیں گے منور رانا
کی روح مرچکی ہوگی جسم سڑکوں پر ٹہلتا ہوا مل
جائیگا۔ اس کے بعد میرا داخلہ لکھنؤ کے سینٹ
جان ہائی اسکول میں کرادیا گیا۔ جہاں میں اپنی
دادی کے پاس رہتا تھا۔ ساتویں اور آٹھویں
جماعت تک پڑھنے کے بعد ۱۹۶۵ء میں میرا
داخلہ کلکتہ کے محمد جان ہائر سکنڈری اسکول
میں کرادیا گیا کیونکہ اس وقت تک ہمارے والد
اور والدہ نے کلکتہ میں سکونت اختیار کرلی تھی
ہائر سکنڈری کرنے کے بعد امیش چندر کالج
میں میں نے داخلہ لیا۔ ہمارے یہاں B.com
کا کورس تین سال کا ہوتا ہے اور ہم دو سال
سے زیادہ وہ کالج میں قید نہیں رہ سکے۔ شعیب
ودیالے سے امیش چندر کالج تک بہت سے
اسکولوں اور کالجوں کے منہ دیکھے لیکن تعلیم
آج بھی اتنی ہی ہے جتنی شعیب ودیالے میں
حاصل کی تھی۔

قد کے لحاظ سے تو بڑا ہو گیا ہوں میں

جمیلہ: خاندانی حالات کے بارے میں کچھ بتائیے؟

رانا: سنتے ہیں کہ ہمارے اجداد و اسلاف جونپور
کی فوج میں ملازم تھے پھر اس کے بعد ان لوگوں
نے رائے بریلی کو آباد کرلیا۔ اور علمی کام میں
مصروف ہوگئے۔ ہم نے اپنے دادا سید صادق
علی کو بچپن میں دیکھا ہے ہمارے والد صاحب
اور ہمارے بھائی سبھی لوگ بہت ہی کٹر قسم
کے مسلمان ہیں۔ مذہبی ذوق کے معاملے میں چاہے
جو کچھ بھی کہہ دیا جائے لیکن مسلمانوں کا بانکپن
ہمارے خاندان میں آج بھی موجود ہے۔

سید نہیں وہ جس میں سخاوت کی بو نہیں ۔
بہت کٹر قسم کا مولوی گھرانہ ہے ۔ رائے بریلی
میں دو مستند خاندان ہیں ۔ ایک سید مولانا
سید ابوالحسن علی ندوی اور دوسرا ہم لوگوں
کا ۔ ہمارے اجداد تو چاہے جیسے رہے ہوں ہم تو
بہت گنہگار آدمی ہیں ۔ عاقبت کی خبر خدا جانے
پہلے رائے بریلی کے قصبہ بھاؤں اور فتح پور کے
قصبہ بھون میں ہم لوگوں کی کافی زمینداری تھی
لیکن جب سالا انتخاب ہوئے تو سب ختم ہو گیا
خاندان کے قریب قریب ۸۰ فیصد افراد پاکستان
چلے گئے ۔

"ہم ایسے پرندے ہیں جو اڑ کر نہیں جاتے"
والد صاحب اور ان کے ایک بڑے بھائی سید
حکیم عبدالجبار مرحوم ہندوستان میں رہ گئے تھے
والد صاحب شروع سے بہت خوددار اور بہت
محنت کش واقع ہوئے ہیں ۔ انہوں نے ٹرک
کی ڈرائیوری کرنا قبول کر لیا ۔ لیکن خاندان کے
کسی صاحب حیثیت فرد کا احسان لینا قبول
نہیں کیا ۔ ۱۷ سال تک میرے والد محترم نے اپنی
زندگی شیر شاہ سوری روڈ پر ٹرک چلانے
میں گزار دی ۔ ٹرک کے پہیوں سے اڑنے والی
گرد وراہ نے میرے والد کے تمام بال سفید
کر دیئے ۔

دکھ بزرگوں نے کافی اٹھائے
مگر میرا بچپن بہت ہی سہانا رہا

دھوپ میں عمر بھر جلتے رہے
اپنی شاخیں ثمر دار کرتے ہوئے

والد صاحب کی اس خودداری سے خاندان
کے فقیر مزاجی کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں ۔ ایک
بار انہوں نے کانپور سے رائے بریلی ٹرک
لے کر آتے وقت موضع کندن گنج کے پاس
تین ڈاکوؤں کو پکڑا تھا ۔ اور ڈاکوؤں سے
ایک بندوق بھی چھین لی تھی ۔ ایک ڈرائیور
کو ڈاکو آدھا حصہ اور پھر پورا سامان دینے
کی پیشکش کرنے لگے ۔ جس کی مالیت ۱۹۴۶
میں تقریباً تین لاکھ روپے تھی لیکن ڈاکوؤں
کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کے سامنے ایک
محنت کش ڈرائیور کے روپ میں ایک
مسلمان کھڑا ہوا ہے ۔ والد صاحب نے ان
ڈاکوؤں کو پکڑ کر تھانہ ضلع رائے بریلی میں
بند کرا دیا ۔ وہیں یہ ڈکیتی ہوئی تھی ۔ جس
شخص کے یہاں ڈکیتی ہوئی تھی اس کا نام
مصری لال ہے ۔ اس نے والد محترم کو انعام
میں ایک ٹرک دینے کی پیشکش کی ۔ والد
صاحب نے جواب دیا کہ ہم فرض ادا کرنے
کی قیمت نہیں لیتے ۔ ہاں اگر چاہو تو میری
حفاظت کے لیے ایک بندوق دلوا دو ۔ عدالت
نے پہلی ہی پیشی پر مجرموں کو غالباً ۱۲ سال
کی سزا کا حکم سنا دیا ۔ عدالت سے جیل
جاتے ہوئے بیڑیاں اور ہتھکڑیاں پہنے ہوئے
ڈاکوؤں نے گھوم کر والد صاحب سے کہا ۔
کہ انور ۱۲ سال میں آدمی مر نہیں جاتا ۱۲
سال کے بعد ہی جیل سے آ جائیں گے ۔ والد
صاحب نے بہت ہی اعتماد کے ساتھ شیر
کی طرح غرّا کر کہا کہ ۱۲ سال میں میرے چار
لڑکے میرے برابر کے ہو جائیں گے ۔

خدا کا شکر ہے، محسن کہ اب میرا بیٹا
قدم ملا کے میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ والد صاحب مصری لال سے بندوق لینا بھی بھول گئے شاید اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی محنت کے پیسے سے بندوق دلوانا چاہا تھا۔ رائے بریلی کی عالمگیر شاہی مسجد کی ... سو سال سے امامت کرنے والا خاندان کیا مزاج رکھتا ہے اس واقعہ سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

جمیکی: آپ نے شاعری نظم سے شروع کی یا غزل سے اور کتنی عمر میں؟

رانا: اب تک میں نے صرف ایک نظم کہی ہے جو آپ سہیل کے صفحے پر ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ صرف غزلیں کہتا ہوں جب نظم کہنے کی ضرورت محسوس ہوگی تو ضرور نظم کہوں گا۔ شاعری تو میں بچپن سے کرتا تھا لیکن صرف لڑکیوں کو دیکھ کر نہ کسی کو سناتا تھا اور نہ کہیں لکھتا تھا۔ لکھتا آج بھی کہیں نہیں ہوں ۔ ہاں سناتا ضرور ہوں چھپتا بھی کم اس لئے ہوں کہ کہیں غزل لکھنے سے زیادہ کسی کو محبت نامہ (LOVE LETTER) لکھنے میں مزا آتا ہے ۔ ۱۹۷۵ء کی ایک شام کلکتہ کے غالب بار میں ایک بار بیٹھا ہوا تھا میرے ساتھ میرے کچھ کاروباری دوست تھے تمام لوگ شراب سے منہ کالا کر رہے تھے میرے پاس اس وقت کوئی کام نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے ایک غزل کہی، وہ غزل میرے مزاج سے ملتی جلتی تھی ۔ اور میری پہلی شاعری کے خلاف

جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

وقت کی سیڑھیوں پہ لیٹے ہیں
اس صدی کے کبیر ہیں ہم لوگ

شاعری شراب خانے سے شروع کی ہے اس لئے شراب کبھی نہیں پی ۔ اور امید ہے کہ انشاءاللہ موت بھی کسی مسجد میں ہوگی ۔ میرے دوست کہتے ہیں کہ اگر منور رانا سنجیدگی سے شاعری کریں تو پورے ہند و پاک میں اپنا کوئی جواب نہیں چھوڑیں گے ۔ میں کہتا ہوں کہ سنجیدگی سے میں نے محبت کی تھی اور ناکام ہو گیا تھا لہٰذا میرے دوست مجھے ورغلا کر بے وقوف نہیں بنا سکتے ہیں ۔

جمیکی: شاعری کے سلسلے میں آپ نے کن حضرات کی رہنمائی قبول فرمائی ۔ ؟

رانا: یوں تو جس موچی سے میں نے چپل میں کیل ٹھونکنا سیکھا ہے اس کا بھی میں احترام کرتا ہوں اور اس لحاظ سے ہماری رہنمائی ہمارے دوستوں نے ہر مقام پر کی ۔ لیکن غزلیں کہہ کر سب سے پہلے اپنے والد صاحب کے دوست اور ملک کے نامور شاعر پروفیسر اعزاز افضل کی خدمت میں حاضری دی ۔ اور میں انہیں کو اپنا کلام کئی برسوں تک دکھلاتا رہا ۔ لیکن چونکہ افضل صاحب کے مزاج اور میرے مزاج میں کوئی مطابقت نہیں تھی لہٰذا بات بنتی ہوئی نظر نہیں آتی تھی ۔ میں ان سے بار بار یہ کہتا تھا کہ آپ کے شاگرد لائق ہیں ایک کو نالائق رہنے دیجئے ۔ لیکن ان کے مصرعے بدل دینے کی وجہ سے میرے مضمون کی ساخت بگڑ جاتی تھی ۔ مثال کے طور پر میں نے

مثال کے طور پر میں نے ایک مطلع کہا ہے

جب بھی دیکھا میرے کردار پہ دھبا کوئی
دیر تک بیٹھ کے تنہائی میں رویا کوئی

افضل صاحب نے اس شعر کو اس طرح کر دیا ہے

جب نظر آیا زمانے میں نہ مجھ سا کوئی
دیر تک بیٹھ کے تنہائی میں رویا کوئی

دوسری بات یہ تھی کہ افضل صاحب اصلاح تو کر دیتے تھے لیکن عیب کے سلسلے میں کچھ نہیں بتاتے تھے۔ اور افضل صاحب کی ایک اور خرابی ہے کہ وہ کسی بھی اچھے شعر پر کھل کر داد نہیں دیتے لہٰذا سامعین یہ سمجھتے ہیں کہ افضل صاحب [illegible] سمجھتے ہیں۔ اور میرے جیسے طالب علم یہ سمجھتے ہیں کہ شاید میں نے کبھی کوئی اچھا شعر کہا ہی نہیں۔ حالانکہ افضل صاحب شعر پر داد دیتے ہیں لیکن بالکل اسی طرح جس طرح ایک بچہ مار کھانے کے بعد اپنے والدین کو چپکے چپکے گالیاں دیتا ہے۔ انہی دنوں میں اپنے کاروباری سلسلے میں لکھنؤ گیا ہوا تھا لکھنؤ میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا میں مشاعرہ سننے کا چونکہ بہت شوقین ہوں لہٰذا مشاعرے کا کارڈ حاصل کرنے کے لئے اشتہار میں دیئے ہوئے پتہ پر پہونچا۔ وہاں والی آسی صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔

نئے لب و لہجے کے شاعر بے پناہ یادداشت کے مالک پنج وقتی نماز پڑھنے والے شاعر نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرنے والے شاگردوں کے ساتھ گالیاں بکنے والے بے تکلفی اور زندگی کی بے ترتیبیوں کی زندہ مثال، سب سے دوستی اور فوراً ناراض ہو جانے والے مولانا عبدالباری آسی کے صاحبزادے حضرت والی آسی نے اس مشاعرے میں مجھے بھی شرکت کی دعوت دی۔ حالانکہ اس مشاعرے سے ان کا اتنا ہی تعلق تھا جتنا آزاد ہندوستان سے انگریزوں کا ہے۔ بہرحال وہ اس مشاعرے میں مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ دو تین دنوں بعد میں ان کی دوکان پر پہونچا تو سب سے پہلے انہوں نے جیب سے ۵۰ روپے نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ میں ان کی اس ادا کا قائل ہو گیا کیونکہ میں مشاعرے کا شاعر تو ہوں نہیں لہٰذا اگر وہ مجھے پیسے نہیں بھی دیتے تو مجھے کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ میں نمازی اور ایماندار آدمیوں سے بہت ڈرتا ہوں اس زمانے میں یہ دونوں چیزیں بہت کم لوگوں کے پاس ملتی ہیں۔ لہٰذا میں نے والی آسی صاحب سے گزارش کی کہ آپ مجھے اپنا شاگرد بنا لیجئے۔ لیکن شاید وہ یہ جانتے ہیں کہ اس زمانے میں لوگ اپنے باپ کی عزت نہیں کرتے ہیں۔ استاد تو ثانوی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا والی صاحب نے مجھے اپنا شاگرد نہیں بنایا۔ آج تک وہ مجھے ایک دوست اور بیٹے کی طرح سمجھتے ہیں۔ میں نے والی آسی صاحب کے پیر بھی دبائے ہیں سر بھی دبایا ہے لیکن ؎

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اگر کوئی حکومت لکھنؤ کو ایک ریاست میں

تبدیل کر کے مجھے خوش کرنا چاہے اور اس میں والی آسی بیٹھا ہوں تو میں لکھنؤ شہر کو ٹھوکر مار کر چلا آؤں گا۔

جو لوگ والی آسی سے نفرت کرتے ہیں میں تحریری طور پر عرض کر رہا ہوں کہ وہ کمینے لوگ ہیں۔ والی آسی ایک شاعر کا نام نہیں ہے ایک فرشتہ صفت آدمی کا نام ہے والی آسی مکتبِ دین و ادب کے مالک کا نام نہیں ہے اس فقیر کا نام ہے جو فٹ پاتھ پر بیٹھ کر سب کو دعائیں دیتا رہتا ہے۔ والی آسی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر لگے ہوئے اس پنکھے کا نام ہے جس سے امیر و غریب سب فیض یاب ہوتے ہیں۔ والی آسی اس لالٹین کا نام ہے جو قصبوں میں آج بھی دروازے کے باہر جلا دی جاتی ہے کہ آنے جانے والوں کو تکلیف نہ ہو۔ والی آسی اس شہد کا نام ہے جو ریشم کے پھولوں سے نکالا گیا ہے۔ والی آسی ایک دستار کا نام ہے لیکن لوگ ایسے پیروں سے روندی جانے والی قالین سمجھتے ہیں والی آسی غزل کے ایک شعر کا نام ہے کتبے پر لکھی ہوئی عبارت کا نام نہیں ہے، والی آسی زندگی کا نام ہے قبرستان کی خاموشی کا نہیں۔ والی آسی بلندی پر اڑتے ہوئے اس کبوتر کا نام ہے جو مسجد کے مینار پر بسیرا کرتا ہے۔ والی آسی اس دیوار کا نام ہے جس کا پلاسٹر ٹوٹ چکا ہے لیکن بنیادوں کا ہاتھ تھامے ہوئے ہیں۔ والی آسی ریل کے اس ڈبے کا نام ہے جس میں لوگ داخل ہوتے ہیں

مونگ پھلی کھاتے ہیں چھلکے وہیں پھینک دیتے ہیں پان اس لئے کھاتے ہیں کہ ڈبے میں تھوک سکیں اور اس کے بعد اپنی منزل آنے پر اتر جاتے کہنے والے بھی یہی کہتے ہیں کہ ڈبہ بہت گندہ تھا

ے اصل مجرم پر کسی کی بھی نظر جاتی نہیں
شہر میں لیکن وہی حاملہ بدنام ہے پاگل

جمیل: ادب سے تعلق صرف شاعری تک ہی ہے یا کوئی تعمیری کام بھی کرنے کا ارادہ ہے؟

دانا: آپ نے بھی ٹھیک ہی سوال کیا ہے اگر شعر کہنے کے بجائے اکیڈمیوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے، الٹی سیدھی کتابیں چھاپ کر پیسہ کماتے، قصیدہ خوانی کرتے، اردو ادب کے سرمائے سے کوٹھی بنا لیتے، تو غالباً وہ تعمیری کام ہوتا۔ لیکن میں نے صرف شعر کہے ہیں اس سے زیادہ میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ میں اردو ادب کے تاش کے پتوں کا ۵۳ واں کارڈ ہوں میری ضرورت صرف اس وقت پڑ سکتی ہے۔ جب کوئی کارڈ گم ہو جائے۔ لیکن میری دعا ہے کہ نہ ہی اکیڈمیوں کے پتے گم ہوں نہ حکومت کے پتے کم ہوں۔ نہ وزارت کے پتے کم ہوں۔ نہ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹیوں کے پتے کم ہوں۔ اور نہ ہی پدم شریوں اور پدم بھوشنوں کے پتے کم ہوں۔ میں جہاں ہوں خدا کا شکر ہے مطمئن ہوں۔ آرام سے ہوں، ے

میں نازم مٹی ہوں مجھ کو روند کر گزر جاؤ
کہ میرے نقشِ قدم پر لوگ رک جاتا ہے

جمیل: اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیے؟

دانا : جمیل بھائی! میں ٹوٹا پھوٹا آدمی ہوں۔ میری مسکراہٹیں اس عورت کی ہنسی کی طرح ہیں جو اپنے بے وقوف چاہنے والوں کے بارے میں سوچ سوچ کر ہنستی ہے۔ آپ میری ہنسی میری چھیڑ خانیوں سے یہ اندازہ لگاتے ہوں گے کہ میں بہت مطمئن آدمی ہوں۔ میں کلکتہ دوردرشن پر اردو پروگرام اناؤنس کرتا ہوں۔ اگر دوردرشن والوں کو اور ٹیلی ویژن دیکھنے والوں کو یہ اعتراض رہتا ہے کہ آپ بار بار اوپر کیا دیکھتے ہیں۔ ممکن ہے جمیل بھائی یہ بات آپ نے بھی محسوس کی ہو۔ دراصل تقریباً ۱۰۔۱۱ سال پہلے مجھ سے ایک چیز کھو گئی تھی۔ اس کے بعد سے آج تک میں اسی چیز کو تلاش کرتا رہتا ہوں میرے احساس کے مطابق وہ چیز اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ لہٰذا میں اوپر والے کی طرف اس لئے تکتا رہتا ہوں کہ شاید وہ مجھے میری چیز لوٹا دے۔ اس کا امکان قطعی نہیں ہے اور نہ اس سلسلے میں مزید گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ ؎

میرے پتے سے غیر کو کیوں تیر آ لگے۔

جمیل : دانا تخلص اختیار کرنے کی وجہ؟

دانا : کسی انگریز کا مقولہ ہے کہ مجھ سے انکار نہیں ہوتا۔ اچھا ہوا کہ میں عورت نہیں ہوں۔ یہ بات میرے سلسلے میں بھی صادق آتی ہے۔ جس نے جو کہا میں نے اسکو مان لیا۔ ذکی آسی صاحب نے فرمایا کہ منور دانا نام رکھ لو لہٰذا سید منور علی سے منور دانا ہو گیا۔ جمیل منظر صاحب آپ اس بات سے یہ نہ سمجھئے گا کہ اب اگر آپ کوئی دوسرا نام رکھنا چاہیں تو ہرگز میں آپ کا مشورہ قبول نہیں کروں گا۔

جمیل : کوئی مجموعہ منظر عام پر آیا یا نہیں؟

دانا : ایک صاحب نے پانچ ہزار روپے مجھے دیئے۔ اور کہا ہندی میں مجموعہ نکالو۔ لیکن کسی کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ میں نے آپ کو ۵ ہزار روپے دیئے ہیں۔ جبکہ اردو اکاڈمیاں حکم صادر فرماتی ہیں کہ تحریر کیجیے کہ یہ کتاب فلاں فلاں اردو اکاڈمی کے مالی اشتراک سے شائع کی جا رہی ہے۔ لہٰذا میں نے ہندی ایک کتاب "غزل گاؤں" کے نام سے شائع کی۔ اس کتاب کے توسط سے جو آمدنی ہوئی یا ہو رہی ہے اس سے اردو کا مجموعہ "نیم کے پھول" منظر عام پر آنے والا ہے۔ ایک نثری کتاب "۳۲ پتوں والا پیڑ" آپ ہی چھاپ دیجئے گا۔ سوچئے کہ لوگ اپنے گھروں میں کرنسی نوٹ تک چھاپ لیتے ہیں اور میں مجموعہ تک چھاپنے میں شرماتا ہوں۔

جمیل : کوئی اہم واقعہ جس سے آپ کی زندگی متاثر ہوئی ہو؟

دانا : میری زندگی اہم واقعات سے بھری ہے۔ میں سہیل کے قیمتی اوراق ضائع نہیں کرنا چاہتا ؎

خدا کبھی مجھے فرصت کے دن نصیب کرے
ہر ایک قصۂ غم مختصر نہیں ہوتا!!

جمیل صاحب سچ پوچھئے تو ؎

لکھا نہ کتابوں میں مجھے وقت نے
دلی کی طرح میں بھی کئی بار لٹا ہوں

جمیل : دانا صاحب! آپ کی شاعری کا مستقبل بے حد تابناک ہے۔ لیکن آپ کی کاروباری مصروفیتیں اسے پنپنے دیں گی۔؟

دانا: میں نے کہیں پڑھا ہے کہ جس زمین میں سوراخ کرنے کے لیے کدال کی ضرب کا استعمال کرنا پڑتا ہے اسی زمین کو ایک چھوٹا سا بیج سمجھا بجھا کر رضامند کر لیتا ہے اور اندر آجاتا ہے۔ بالکل یہی صورت حال کاروبار کے ساتھ شاعری کا ہے جو سے پچھلے دنوں بنگلا اخبار کے کالم نگار بہار الدین صاحب نے ایک سوال کیا تھا کہ آپ ٹرانسپورٹ کاروبار کے ساتھ شاعری کس طرح کرتے ہیں میں نے ان کو پہلے تو یہی بتایا کہ ٹرانسپورٹ کے کاروبار اور شاعری بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی مولوی کسی سنیما ہال کا دربان ہو جائے۔ جب وہ بیٹھے ہوئے تو میں نے ان سے پوچھا آپ نے ریل کی پٹریاں تو دیکھی ہوں گی۔ ریل کی پٹریوں پر چلتے ہوئے آدمی بھی دیکھے ہوں گے۔ اور اسی پٹری پر ریل کو بھی گزرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ اب آپ غور کیجئے کہ ریل کی پٹری صرف ریل کے لئے بنائی جاتی ہے نہ کہ آدمیوں کے چلنے کے لئے۔ قانونی طور پر ریل کی پٹری پر چلنا جرم ہو سکتا ہے۔ مگر چلنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ صرف آپ کو یہ خیال رکھنا ہوگا آپ کے اور ریل کے گزرنے میں ٹائمنگ کا فرق رہنا چاہئے۔ بالکل یہی صورت حال میری شاعری اور میرے کاروبار کے بیچ ہے۔ میری زندگی ریل کی پٹری ہے کاروبار بھاری بھرکم ریل گاڑی اور میری شاعری پٹریوں پہ چلتا ہوا آدمی۔ صرف ٹائمنگ کا فرق ہے اور انشاء اللہ میں کوشش کروں گا کہ یہ فرق قائم رہے۔

جمیلہ: آپ نے اردو سے پہلے ہندی میں اپنا مجموعہ کیوں چھپوایا؟

دانا: کچھ دنوں پہلے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے ہاتھ روم میں جگن ناتھ آزاد کا اردو مجموعہ رکھا دیکھا تھا۔ اسی وجہ سے اردو میں مجموعہ چھپانے کی ہمت نہیں پڑ رہی ہے۔

جمیلہ: دانا صاحب ایک انٹرویو میں آپ نے احمد فراز سے ایک سوال کیا تھا کہ حسن میک اپ کے لباس میں اچھا لگتا ہے یا بے لباس؟ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

دانا: یعنی سہ

نام چہرے پہ میک اپ ہی کا جو لگاتا ہے

جمیل منظر صاحب! ابھی آپ نے میری بیوی کا پکایا ہوا کھانا نوش فرمایا ہے۔ اور ابھی آپ کو کھانا پھر کھانا ہے آپ اپنی خوراک اور میری عاقبت دونوں کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ میں حسن پسند ضرور ہوں حسن پرست قطعی نہیں میں نے غزل میں ایک شعر کہا تھا سہ

یہ بکتے پھول کافی خوبصورت ہیں مگر دانا
ہم اپنے گھر میں کوئی چیز بازاری نہیں لاتے

جمیلہ: آپ نشے کیا کیا کرتے ہیں؟

دانا: صاحب! میرا سب سے بڑا نشہ روٹی ہے۔ اس کے بعد پان اور بزرگوں کی گالی۔ چائے تو میں اس طرح پیتا ہوں جیسے کوئی شریف آدمی غصہ پیتا ہے۔ چاندنی چوک میں امیر اللہ صاحب پان والے ہیں وہ پان اسی سلیقے سے لگاتے ہیں جس سلیقے سے عورتیں الزام لگاتی ہیں۔ حالانکہ

پان ان کا کاروبار ہے لیکن پھر بھی وہ مجھ سے لوگ کہتے
رہتے ہیں کہ آپ پان بہت کھاتے ہیں۔ اور
حقیقت بھی یہی ہے کہ میں پان اسی طرح کھاتا
ہوں جس طرح غریب مزدور گالیاں کھاتا ہے
گرمی کے زمانے میں میرا ایک نشہ بڑھ جاتا ہے
اور وہ ہے آم کھانا۔ آم کے بارے میں میرا
فیصلہ یہ ہے کہ آم اگر اچھے اور میٹھے ہوں تو نہ
صرف چرا کر بلکہ چھین کر بھی کھا لینا چاہئے۔ ایک
سدا بہار نشہ ہے کتابیں چرانا۔ شہر کی کوئی لائبریری
ممبر نہیں بناتی۔ کوئی شاعر ادیب کتابوں کی الماری
کھلی نہیں چھوڑتا۔ لیکن تالے صرف شریفوں کے لئے
ہوتے ہیں۔ اس لئے جن کتاب کی ضرورت
ہوتی ہے وہ کتاب مجھے مل جاتی ہے۔ کہاوت
ہے کہ "جو چیز جیسے آتی ہے اسی طرح چلی جاتی ہے"
لہذا میرے گھر سے کتابیں اسی طرح غائب ہو جاتی ہیں
جس طرح ہندوستان سے رفتہ رفتہ شرافت اور
ایمانداری غائب ہو رہی ہے۔

جمیل: ہند و پاک میں آپ کے مزاج کے کون کون سے شعراء
ہیں۔؟

رانا: ہندوستان میں جو شعرائے کرام مجھے پسند ہیں میں نے
احمد فراز سے گفتگو کرتے وقت ان میں سے اکثر و بیشتر
لوگوں کا حوالہ دیا ہے۔ چونکہ آپ وہ انٹرویو بھی
شائع کر رہے ہیں۔ اس لئے مزید نام گنوانے
سے کوئی فائدہ نہیں۔ پاکستان کے کچھ شعراء جو مجھے
پسند ہیں ان کے نام گنوائے دے رہا ہوں۔
شکیب جلالی۔ ناصر کاظمی، احمد فراز، سلیم احمد
ظفر اقبال، یاسمین حمید، پروین شاکر، افتخار
عارف، احمد مشتاق اور چند نام اور بھی جو مجھے
یاد نہیں آ رہے ہیں۔ صبح کے ۸ بجکر ۱ منٹ سے
سالے تین بجے تک تو میں نے اپنی بیوی کو بھی کبھی
وقت نہیں دیا ہے۔ آپ خوش نصیب آدمی ہیں
جمیل مظہر صاحب۔ اب ان لوگوں کے شعر سنانے
کے لیے مت کہئے گا پوری پوری کتابیں لدی ہوئی
ہیں۔ اور آپ کا پرچہ بہت کمزور سا ہے بالکل
ہند و پاک سیاسی تعلقات کی طرح۔

جمیل: آپ شعر کب کہتے ہیں؟

رانا: میں عموماً شعر اس وقت کہتا ہوں جس وقت شاید
کوئی شاعر نہیں کہتا ہوگا۔ مثال کے طور پر آج تک
قلم کاغذ لے کر شعر ایک مصرعہ بھی نہیں کہا۔ دن
بھر شہر کی سڑک پر گاڑی دوڑاتا رہتا ہوں، ذہن
کے جال میں اشعار کی مچھلیاں پھنستی رہتی ہیں۔ جو مچھلی
چھوٹی ہوتی ہے وہ واپس سمندر میں چلی جاتی
ہے۔ بڑی مچھلیوں کو دل کے ٹھنڈے کمرے میں رکھ
لیتا ہوں ایک کمپنی ہے LIPTON INDIA
اس چائے کمپنی میں تقریباً ۲۵ برس رہا ہوں۔ اور یہاں
میرے ایک دوست ہیں [illegible] وہ بیچارے
جب مجھے خاموش دیکھتے ہیں تو بنگالی میں کہتے ہیں
"کی کو تیا ہو چھے" اور یہ کہہ کر وہ بیچارے فوراً
میرے لئے دو چائے منگا دیتے ہیں۔ میں نے ادھر
دو سال میں جو غزلیں کہی ہیں ان میں سے اکثر لپٹن
چائے کمپنی میں بیٹھ کر کہی ہیں۔ میری غزلوں میں
میرے بہت سے شعر کمزور ہیں۔ اس کی وجہ آپ
یہ نہ سمجھئے گا کہ میں شعر کہہ نہیں پایا ہوں بلکہ اس کی
وجہ صرف یہ ہے کہ آج تک میں نے کوئی بھی غزل دس

منٹ سے زیادہ میں نہیں کہی ہے۔ سفر میں بھی غزلیں بہت کہتا ہوں ریل میں شعر کہنے کا مجھے بہت شوق ہے جب ریل میں شعر کہنے کا موڈ ہوتا ہے تو ڈبہ کے دروازے پر میں باہر کی جانب پیر لٹکا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ اور شعر کہتا ہوں ایک بار مرتے مرتے بچا بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ گئی تھی۔ تیز رفتار ٹرین نے مجھے باہر پھینک دیا ہوتا لیکن زندگی انجن سے زیادہ طاقتور ثابت ہوئی۔ پاس بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے لپک کر مجھے کھینچ لیا۔ شعر میں نے بہت کہے ہیں۔ لیکن میں آپ سے سچ عرض کر رہا ہوں کہ غزل کے جو شعر میں کہنا چاہتا ہوں آج تک کہہ نہیں پایا۔ سہیل کے صفحات پر صرف ایک نظم ہے۔ بس وہ میری شاعری کا زاویہ ہے۔ میں صرف اس نظم کے جیسے شعر کہنا چاہتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ خدا مجھے توفیق اور طاقت عطا فرمائے۔

مجیب: کلکتہ آپ کو کیسا لگتا ہے؟

وآنا: کلکتہ ہندوستان کا غالباً سب سے سستا شہر ہے۔ ۵۰ پیسے میں کلکتہ کی سڑکوں پر دوڑتی ہوئی ٹرامیں اور بسیں آپ کو ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہونچا دیتی ہیں۔ آپ ڈیڑھ روپے میں کھانا کھا سکتے ہیں۔ اور دو روپے میں حوا کی بیٹیاں آپ کے پہلو کو گرم کر سکتی ہیں۔ غریبوں کا شہر کلکتہ، کسبیوں کا شہر کلکتہ، جلوسوں کا شہر کلکتہ، مارواڑیوں کا شہر کلکتہ، فلسفیوں کا شہر کلکتہ، انقلابیوں کا شہر کلکتہ، فقیروں کا شہر کلکتہ، قلندروں کا شہر کلکتہ، جوٹ ملوں کا شہر کلکتہ، پوجا پنڈالوں کا شہر کلکتہ، بم کے دھماکوں کا شہر کلکتہ، اپنے سینوں میں سینکڑوں سال سے ہزاروں زخم چھپائے ہوئے آج تک زندہ ہی نہیں مسکرا بھی رہا ہے۔ ایک طرف ہوگلی ندی کا بل کھاتا ہوا لہراتا پانی، جیسے کسی دوشیزہ نے اپنی گردن میں دوپٹہ ڈال رکھا ہو۔ تو دوسری طرف گندے نالے جیسے کسی یتیم بچے کی ناک بہہ رہی ہو۔ دم دم اور علی پور کے خوبصورت بنگلے کلکتہ کے گندی بستیوں کو منہ چڑھاتے رہتے ہیں۔ دفتروں میں کام کرنے والے یہ بابو چاول کی پھرہی" (بنگلہ میں موری کہتے ہیں) میں ۱۵ پیسے کا نمکین سموسہ ملا کر حلق سے اتارنے کے لئے ۲۰ پیسے کی چائے کا استعمال کب تک کرتے رہیں گے۔ رات کے ۱۰ بجے کے بعد ٹرام اور بس کے اسٹاپ پر پہنچے ہوئے لوگ انتظار میں کھڑے کھڑے یہ سوچتے رہتے ہیں کہ نہ جانے کب ہاتھ کی گھڑی یا بیوی کے گلے کا آدھے تولے کا زیور چھین لیا جائے۔ اے میرے پیارے شہر کلکتہ تو نے مجھے بولنا اور بات کرنا سکھایا ہے۔ تو نے مجھے ظلم نہ سہنے کی ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی تعلیم دی ہے۔ تو نے انقلابیوں کی اتنی بڑی فوج بنائی تھی جنھوں نے کالا پانی کی گہرائی اپنی لاشوں سے کم کر دی۔ جنھوں نے بندوق اور توپ کو انگریزوں کا کھلونا بنا دیا۔ تیرے وہ سپوت کہاں ہیں۔ تو انھیں آواز کیوں نہیں دیتا تو گرنگا کیوں ہوا جا رہا ہے۔ اے میرے

شہر کلکتہ کہیں تیری پہچان نہ کھو جائے۔ اگر خدا نہ کرے تیری پہچان کھو گئی تو میرے جیسے لاکھوں لوگ برباد ہو جائیں گے۔ کلکتہ ممتا کی نرم، محبوب کی زلفو کی طرح دراز، بچوں کے لہجے کی طرح ملائم، بہنوں کی آنکھوں کی طرح معصوم، بھائیوں کے بازوؤں کی طرح مظلوم، رشتہ داروں کے ارادے کی طرح خطرناک، دوستوں کی صحبتوں کی طرح پر لطف، غریب کے دل کی طرح پر سکون، اور میری شاعری کی طرح مجھے پیارا ہے۔

جمیلہ: رانا صاحب یہ بتائیے اگر کوئی خوبصورت گلوکارہ آپ کی غزل آپ کے روبرو بہت دلکش انداز سے گا رہی ہو تو آپ کو کیسا لگتا ہے؟ معاف کیجئے گا یہی سوال آپ نے احمد فراز صاحب سے بھی پوچھا تھا میں آپ کے سوال کو دہرا رہا ہوں۔

رانا: بھیا جمیل مظہر صاحب! میری شاعری سرمایہ داری کے کھانے کی طرح بے کیف، مزدور کی تنخواہ کی طرح مختصر، کلکتہ کی سڑکوں کی طرح کھردری، اور ایک گھریلو عورت کی ڈائری کی جیسی ہے جس سے گانے بجانے کا کوئی کاروبار نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی گلوکارہ آپ سے مل کر اس خواہش کا اظہار کرے تو مجھے اس کا پتہ ضرور بتلائے گا، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

جمیلہ: پاکستان اور ہندوستان کی شاعری میں کیا کوئی بنیادی فرق ہے؟

رانا: سب سے بڑا بنیادی فرق تو یہ ہے کہ پاکستان اور ہندوستان دو الگ الگ ملک ہیں پاکستان کی موجودہ شاعری ان کی سیاسی بازی گری اور فوجی خود غرضیوں کا چڑھ چڑھا اظہار رہے۔ ہندوستانی شاعری آج بھی پردیس سے بند پائے کر آنے والے شوہر کا انتظار، ہنگھٹ پر کھنکتی ہوئی چوڑیاں گاؤں سے پردیس جانے والوں کی کہانیاں، اور سیدھی سادھی ممتا، ہاتھ میں راکھی لئے ہوئے بہنیں، میلے میں کھو جانے کا احساس، بڑوں کے سامنے آنچل سرک جانے کا خوف اور ایسے ہی بہت سے موضوعات سے متاثر ہے۔ اب آپ خود ہی سوچئے کہ جب ایک شاعر ان سب چیزوں سے بھی آشنا ہے۔ تو اس کی شاعری میں گہرائی کم سے کم آئے گا۔ پاکستان کی موجودہ شاعری ہندوستان کی شاعری سے یقیناً اچھی ہے۔ لیکن ایک بات سمجھ لیجئے کہ ہندوستان کی شاعری انگریزی شاعری کا چربہ قطعی نہیں ہے۔ جب کہ پاکستان کا ہر شاعر جب غیر ملک کے دورے پر جاتا ہے تو ایک غیر ملکی محبوبہ کا تصور، ایک غیر ملکی شراب کی بوتل، اور ایک غیر ملکی شاعر کے تاثرات لے کر کراچی اور لاہور کے ایرپورٹ پر اترتا ہے۔ کسٹم والے شراب سے اپنا حصہ لیتے ہیں۔ محبوبہ کا تصور ان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اور غیر ملکی شاعری کسٹم والوں کے مطلب کی چیز نہیں۔ ہم ہندوستانیوں کا یہ معاملہ ہے کہ راکیش شرما خلا میں پہنچتا ہے تو وہاں سے بھی وزیر اعظم اندرا گاندھی سے جب مخاطب ہوتا ہے تو شیکسپیئر، شیلی، لینن، ورڈس ورتھ، یا کسی اور کی زبان میں بات کرنے کے بجائے اپنی سر زمین کی زبان میں ہندی ۔۔۔۔۔۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔

جمیل: شاعری کے سلسلے میں تنقید ہو رہی ہے۔ اس میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟

درآنا: اس رائے کو میں ابھی محفوظ رکھوں گا کیونکہ ابھی میرا نمبر آنے والا ہے، نمبر سے مراد سہیل کا نمبر نہیں ہے۔ بلکہ میری شاعری پر تنقید کا نمبر آنے والا ہے دشمنی مول لے کر مجھے اپنا نقصان نہیں کرنا ہے۔

جمیل: کلکتے کے ادبی ماحول کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کیجئے؟

درآنا: کلکتے کا ادبی ماحول شاعری کے سلسلے میں قطعی اچھا ہے۔ لیکن جہاں تک ادبی سیاست کا معاملہ ہے تو میں عرض کروں گا کہ کوئی بھی پلیٹ فارم اس قابل نہیں ہے۔ جہاں بیٹھ کر کوئی آدمی اپنی آبرو اور عاقبت بچا سکے۔ دراصل ہر دور میں آزادی دلانے والوں کا انجام ہمیشہ قید رہنا ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں میں نے کہیں پڑھا تھا کہ نیتا جی سبھاش چندر بوس کی فوجی طاقت کو مزید مضبوط بنانے کے لئے جس بنگالی نے اپنی جائداد فروخت کر کے اس وقت چالیس ہزار روپے دیئے تھے۔ وہ آدمی وہ کمزور آدمی شیام بازار کی کسی عمارت میں ایک سو پچیس ۱۲۵ روپے ماہانہ قلیل تنخواہ پر دربانی کر رہا ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ کلکتے کی ادبی فضا میں زندہ رہنا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس شہر کی ایک عجیب و غریب خوبی یہ ہے کہ یہاں کوئی کسی کو تسلیم نہیں کرتا۔ نوجوانوں میں بغاوت تو فطری چیز ہے۔ لیکن اگر بزرگوں کی طرف سے خلوص اور شفقت کا اظہار نہ کیا جائے۔ تو نوجوانوں کا احساس نہ صرف یہ کہ مجروح ہوتا ہے۔ بلکہ ادب کو نقصان پہونچتا ہے۔ میرے دوست اظہر عنایتی کا شعر ہے ؎

راستو کیا ہوئے وہ لوگ جو آتے جاتے
میرے آداب پہ کہتے تھے کہ جیتے رہئے

ہر چہرے پر ایک کاروباری مسکراہٹ، معانقہ کے لئے بڑھتا ہوا ہاتھ، خنجر کی طرح بے کیف، مسکراتی ہوئی آنکھوں میں ریاکاری کی جھلک ایسی چیزیں اس شہر بہت عام ہیں۔ میرے دوست نصرت جمیل جو مولانا محسن کالج میں پروفیسر ہیں ان کو دیکھ کر مجھے مشتاق یوسفی کا ایک بہت یاد آتا ہے کہ آدمی اگر ایک بار پروفیسر ہو جائے تو اس کے بعد چاہے لوہ قاعدے باتیں بھی کرنے لگے، پروفیسر ہی رہتا ہے یہ جملہ صرف نصرت جمیل کے لئے نہیں ہے۔ اس میں پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔

کلکتے میں نئی نسل بہت ہی مضبوط اعصاب کی مالک ہے۔ تب ہی تو اتنے ظلم و ستم اتنی ادبی ناانصافیوں اور اتنے مایوس کن حالات میں بھی نہ صرف یہ کہ لکھ رہے ہیں۔ بلکہ بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ کانپور کے ایک کہنہ مشق شاعر استاد رشید لکھنوی نے ایک بار جلسے کے مشاعرے میں تقریر کے دوران ایک بات کہی تھی کہ "اگر نئی نسل کو ہم آگے بڑھنے کا راستہ نہیں دیں گے تو یہ نئی نسل ہم کو پھلانگ کر

...ا پسلیاں اور اپنے پیروں سے ہمارے جسم کو
...ورے آگے نکل جائیں گی۔ لہٰذا عقل مندی اور
۔ تقاضہ یہی ہے کہ جنگ آگے جاتا چاہیں ان
...ے دیوار بن کر حائل نہیں ہونا چاہئے۔ کیوں کہ
...ن یہی نہیں جانتی ہے۔ کہ قانون اندھا ہوتا
...نسل یہ بھی جاننے لگی ہے کہ قانون بنانے والے
...ہوتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قانون اگر بہت
...تا ہے تو توڑ دیا جاتا ہے تاریخ گواہ ہے کہ جن
...کو آباد کرنے والے لوگ وہی تھے جنھوں نے
...کومت یا سرمایہ داری نظام کے خلاف علم
...ند کیا تھا۔ اور یوں بھی صلیب و دار
...کے لئے سروں کی ضرورت ہر دور میں پڑتی
...یہ سلسلہ لامتناہی نہ ختم ہوا ہے نہ ختم ہوتا
...ا ہے۔ ایک فطری چیز یہ بھی ہے کہ اکثر و بیشتر
...سگریٹ پینے سے لے کر ...... تک لوگ
...دم سے شروع کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر ادب
...ٹ چھٹکارا اور ناانصافیاں ختم نہ کی گئیں تو
...ماحول اس باتھ روم کی طرح ہو جائے گا جہاں
...یرہ سے لوگ شوق فرماتے ہیں۔

آپ مغربی بنگال کے ادبی حلقوں کا تفصیلی
...لئے۔ آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ باہر کے
...ادیب سے گفتگو کرنے کی صلاحیت اعزاز افضل
...ید کو چھوڑ کر جلدی سے میرے خیال کے مطابق
...ا نہیں ملے گی۔ حالانکہ اگر ایسی رنجشیں ختم
...ہیں۔ دلوں کے آئینے سے ماضی کی دھول صاف
...ے تو اور بھی کئی مسائل نہ صرف یہ کہ حل
...ے بلکہ آئندہ بھی [illegible] ہو جائے گا کہ ایسے [illegible]

ملیح ہوئے۔ شہر اور مضافات میں نئے لکھنے والوں کی
ایک طویل فہرست ہے۔ یوسف تقی، شمیم انور، فاروق
شفیق، نور بیگر، اکبر حسین اکبر، حبیب ہاشمی، رئیس
انولوی، کلیم حاذق، حیدر صفت، اشہر ہاشمی، فیروز عابد
انیس رفیع، عابد ضمیر، نسیم اشتفاق، ظہیر انور، کمال
احمد، رفیق انجم، الفر غزالی، اور اسی طرح کے
بہت سے نوجوان جن لوگوں کو دیکھنے کے بعد میں صرف
ایک مصرعہ پڑھتا ہوں ؎

ہم ایسے پھول ہیں جو جنگلوں میں کھلتے ہیں۔

وکیل اختر مرحوم، قیصر شمیم، شہود عالم آفاقی، رونق نعیم
ادریس صدر، حالی گورکھپوری، بشیر آروی، کامل
اختر، حسن اختر، ابراہیم ہوش، ظفر اوگانوی، جاوید
سنہال یہ وہ لوگ ہیں جن کو دیکھنے کے بعد شاد عظیم آبادی
کا یہ مصرعہ یاد آتا ہے کہ ؎

آنا ہے اگر تو آ جا کہ ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

میری ادبی عمر بہت کم ہے۔ لہٰذا شہری معاملات کے سلسلے
میں میری معلومات بہت کم ہیں۔ لیکن میں نے یہ اندازہ
لگایا کہ کلکتے کا ادبی ماحول سیاست سے بلکہ برسر اقتدار
سیاست سے ہمیشہ منسلک رہا ہے۔ جس کی وجہ سے کوئی
بھی آواز اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے۔ اور یا اگر
میرے جیسا دیوانہ اگر آواز اٹھاتا بھی ہے تو آواز اسی
طرح دبا دی جاتی ہے جس طرح پہلے زمانے میں ناجائز بچے
کا گلا پیدا ہوتے ہی گھونٹ دیا جاتا تھا۔ لیکن صاحب
[illegible] رومن اسٹان۔ ڈیلو کنسن جیسی چیزوں کا
ہے کیپسولس اور مختلف قسم کے TUBE کا ہے گلا
گھونٹنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی ہے۔ ایسے ہی کام چلا جاتا
ہے لیکن خیال ہے MANUFECTURING

(باقی صفحہ ۱۰۲ پر)

میرے صاحب میری نظر میں

دغلینہ سوانا

۱۹۷۳ء کی بات ہے جب میں نے میٹرک پاس
کر کے انٹر کا فرسٹ ایئر جوائن کیا تھا کہ اگست کے مہینے میں
[illegible] گھر پر کچھ مہمان تشریف لائے اور اچانک ہی شام کو
[illegible] منگنی ہو گئی۔ اس اچانک حادثے سے میرے دل میں کچھ
[illegible] تو ضرور پیدا ہوئی لیکن چونکہ ماں باپ کی بات کو ہم
[illegible] کے گھر میں بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ لہٰذا فرمانبرداری
کے ساتھ میں نے وہ منگنی کی انگوٹھی قبول کر لی۔ کیوں کہ عمر بھی
[illegible] اس وقت بہت کم تھی۔ قریب سولہ سال کی رہی ہوگی۔
[illegible] سال بعد تو منگنی کو۔ ویسے ہی ہنستے کھیلتے رہے۔ صاحب
[illegible] دیکھے گئے۔ میں تو کبھی سوچتی کہ پتہ نہیں کیسے آدمی ہونگے۔
[illegible] بالکل اس کے الٹا نکلے۔ مجھے تو صاحب بالکل لڑکے
[illegible] لگے۔ ان کی عمر بھی اس وقت ۲۱ کے لگ بھگ رہی
ہو گی۔ چونکہ ہماری دور کی رشتہ داری بھی صاحب سے تھی۔
[illegible] پڑھنے کے لئے کوئی خاص پابندی نہیں تھی۔ بچپن
[illegible] شوق کی عادی تھی کہ ایک جگہ سکون سے کبھی
[illegible] نہیں تھے۔ سب کو دن بھر ہنساتے رہتے۔ اس کی
[illegible] کچھ۔ اس کو ستانا۔ بس یہی کام تھا۔ لگتا
[illegible] آگئے ہیں۔ گھر کے ایک فرد بن کر رہ گئے تھے۔
[illegible] ان کی باتوں، چٹکلوں میں مزہ آتا تھا۔

[illegible] ایک [illegible] شادی [illegible] سال

ہو گئے ہیں۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ جیسے دس دن ہی ہوئے ہیں۔
ہمارے ہاں ماشاء اللہ چار لڑکیاں ہیں۔ ان [illegible] سالوں میں
میں نے ان میں جو عادتیں پائی ہیں یا یوں کہئے جو خوبیاں ان
میں میں نے دیکھی ہیں وہ آج کل خاص طور سے کسی نوجوان
میں مشکل سے ملتی ہیں۔ میں نے تو پہلے جب سنا کہ صاحب
شاعر بھی ہیں تو مجھے کچھ مایوسی ہوئی کہ نشہ کا مزید شوقین
ہوں گے اور میرے خیال کے مطابق جو لوگ شراب پی سکتے ہیں
ان میں اور سب بری عادتیں بھی ہونگی۔ لیکن میں نے یہاں
آنے پر دیکھا کہ وہ شراب وغیرہ سے بہت دور ہیں مگر [illegible]
اور پان سے تو کبھی انکار نہیں کر سکتے ہیں۔ چاہے آپ ان
کو کھانا نہ دیجئے۔ میں تو اپنے کو خوش نصیب سمجھتی ہوں
کہ میرے صاحب اندر سے بھی شاعر ہیں۔ وہ ہر انسان
کے دکھ درد کو سمجھتے ہیں۔ گھر میں [illegible]
ان سے ایسا برتاؤ کرتے ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ نوکر ہیں۔
[illegible] کا تو ذرا سا بھی فرق ان میں نہیں ہے۔ [illegible]
کا اندازہ آپ اسے تو ہم سوچ لیتے ہیں کہ [illegible]
مال غنیمت کی طرح تقسیم ہو جائیں گے۔ کبھی [illegible] کسی کو کیا
کر [illegible] کھانا ہے یا کسی کے گرم کپڑا [illegible]
فوراً اسی وقت اپنا پہنا ہوا اتار کر دے دیں گے [illegible]
[illegible]
[illegible]

چھ بھائیوں میں اکیلی ایک بہن ہے اسی لئے زیادہ تر عورتوں اور لڑکیوں کو وہ بہن، ماں اور بیٹی بنا لیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں بھی ماں، بہن، بھائی کا بہت ذکر ہوتا ہے جس کو سبھی لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔ حالانکہ شادی سے پہلے شاعری سے مجھے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ پھر بھی چونکہ میری فیملی میں ادب و شعر کا چلن آج تک موجود ہے۔ خاص طور سے میری امی اور پاپا کو شاعری سے کافی دلچسپی ہے۔ سچ پوچھئے تو شادی کے بعد مجھے شاعری سے دلچسپی ہوئی۔

میرے صاحب نے بھی شاعری شادی کے بعد ہی شروع کی ہے۔ پہلے بھی شعر کہتے تھے لیکن سنجیدگی سے نہیں۔ وہ کہتے بھی ہیں کہ تم میرے لئے بہت لکی (lucky) ہو کیونکہ شادی کے بعد ہی ان کو ادب میں شہرت اور کاروبار میں کافی ترقی ملی ہے۔ میرے خیال میں اس عمر میں اتنے کم وقت میں اتنی شہرت جلدی کسی کو نہیں ملتی۔ صاحب کی شاعری مجھے اس وجہ سے بھی اچھی لگتی ہے کہ انھوں نے ایسے لفظوں کو غزل کے خوبصورت روپ میں ڈھالا ہے کہ دوسرا بڑے سے بڑا شاعر ان لفظوں کو اچھی طرح برت نہ سکا۔ جیسے مفلر، گگری، پیاسے وغیرہ۔

ان کی شاعری جہاں ایک پڑھا لکھا آدمی پسند کرتا ہے وہیں ایک مزدور بھی سمجھتا اور پسند کرتا ہے۔ ان کے شعر میں پورا ایک افسانہ چھپا رہتا ہے۔ میں ان کے شعروں کی تعریف اس لئے نہیں کر رہی ہوں کہ وہ میرے شوہر ہیں بلکہ اسلئے کہ ان کے شعر حقیقت سے بہت قریب ہیں۔ جب کہ صاحب سنجیدگی سے شعر نہیں کہتے ہیں۔ تمام کاروباری الجھنیں رہتی ہیں۔ پھر بھی میں یہ کہوں گی کہ بہت جلدی شعر کہتے ہیں اور اچھے سے اچھا شعر کہتے ہیں۔ جو بھی شعر یا غزل کہیں گے سب سے پہلے وہ مجھے سناتے ہیں۔ زیادہ تر وہ رات میں دیر سے گھر آتے ہیں۔ جب میں بہت خفا ہوتی ہوں، صاحب بد سے معافی مانگ لیں گے۔ لیکن پھر وہی ڈھرا رہے گا۔ معافی مانگنے کے معاملے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیتے ہیں۔ اب تو میں بھی عادی ہو گئی ہوں۔ بے پرواہی تو کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ گھر سے کچھ کہکر چلیں گے پھر باہر جاکر بھول جائینگے۔ اس بے پرواہی سے تو ان کے گھر میں سب پریشان ہیں۔ صاحب کو غصہ آتا ہی نہیں ہے۔ آئے گا تو زبردست، لیکن صرف دس منٹ تک۔ آج تک ہم لوگوں میں اگر کسی بات پر خفگی بھی رہی ہے تو صرف گھنٹے۔ آئیں گے ویسے ہی ہنستے ہوئے گھر میں۔ لاؤ یہ، لاؤ وہ، بلکہ میرا غصہ نہیں اترتا جب تک میں باتیں نہ سنا لوں۔ بلکہ کبھی کبھی دل میں خیال بھی ہوتا ہے کہ دن بھر کاروبار میں الجھے رہتے ہیں اگر رات میں دو ایک گھنٹے دوستوں میں رہے تو کیا حرج ہے۔ وہ نمازیوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ شاید اسی لئے مجھ سے کبھی نہیں بولتے۔ وہ برابر نماز نہ پڑھیں یہ الگ بات ہے لیکن نمازیوں کا خیال بہت رکھتے ہیں۔ نماز کے وقت صبح نیچے ہوٹل سے گرم پانی بھی لینے چلے جائینگے۔ اگر طبیعت خراب دیکھیں گے ورنہ تو خود ہل کر پانی بھی پینے والے نہیں۔ طبیعت اگر میری ذرا بھی خراب دیکھیں گے تو کہیں گے کہ کچھ کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک بچی کی پیدائش کے وقت میری طبیعت اتنی خراب ہو گئی کہ ڈاکٹر وغیرہ مایوس ہو گئے تھے۔ ہاسپٹل میں صاحب جتنی دیر بیٹھتے بچوں کی طرح رویا کرتے تھے۔ میں ان کا حوصلہ بڑھاتی تھی کہ میں اچھی ہو جاؤں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔

دل تو بہت ہی نازک ہے۔ بہت جلدی گھبرا جاتے ہیں۔ کہانیوں میں پڑھا کرتے تھے ایسی محبت کرنے والوں کے بارے میں۔ میں نے حقیقت میں ایسا محبت کرنے والا شوہر پایا لہٰذا میں اپنے آپ پر فخر کرتی ہوں۔ میرے گھر والے اور ان کے والدین، بھائی بہن سبھی ان پر جان چھڑکتے ہیں۔ زیادہ مردوں کے کسی گوشے میں کوئی الٹی سیدھی بات ضرور چھپی رہتی ہیں۔ ان کا تو یہ حال ہے کہ سالیوں سے بھی آج تک کوئی بھدا مذاق نہیں کیا۔ ہم تین بہنیں۔ تینوں کی شادی ہو چکی ہے۔ دامادوں میں سب سے زیادہ انھیں کو سب لوگ

پسند کرتے ہیں۔ کھانے پینے کے معاملے میں صاحب کی عادت بہت اچھی ہے۔ جو بھی سامنے رکھ دو، چپ چاپ کھالیں گے۔ آم وہ بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ جتنا کھائیں گے نہیں اس سے زیادہ تشہیر کریں گے۔ کھائیں گے اگر دو آم تو کہیں گے روزانہ ذرا پندرہ بیس آم لے آنا۔ اس بات پر ان کی والدہ بھی ٹوکتی ہیں "کھانے کا دو آم ہیں آم سناتا ہے، سب کی نظر دو میں چڑھ جائیگا"۔ اس طرح کی عجیب عجیب حرکتیں ہیں ان میں —

اگر میں ان کو لکھنے بیٹھوں تو فرصت ہو جائے گی۔ اب یہی دیکھیے کہ صاحب میرے کس عجیب مزاج کے ہیں۔ جب میں یہاں نہیں رہوں گی تو نو دس بجے گھر میں آکر چپ چاپ لیٹ جائیں گے۔ جب میں آجاؤں گی پھر تو وہی رات کے بارہ اور ایک بجنے لگیں گے۔ میں ان سے پوچھتی ہوں کہ ایسا آپ کیوں کرتے ہیں؟ تب کہتے ہیں کہ تم یہاں رہتی ہو تو اطمینان رہتا ہے کہ گھر میں کوئی انتظار کرنے والا ہے، جب نہیں رہتی ہو تو لگتا ہے کہ اب میں کسی کے انتظار کے قابل بھی نہیں ہوں۔ یہ سوچ کر جلدی گھر چلا جاتا ہوں۔ اب یہی دیکھیے رات کافی ہو چکی ہے۔ صاحب بہادر کا کیا ان کی کار کی آواز سے بھی یہ کان محروم ہیں۔ یہ شعر شاید انھوں نے میرے ہی لئے کہا ہے ؎

یہ سوچ کر کہ ترا انتظار لازم ہے
تمام عمر گھڑی کی طرف نہیں دیکھا

ان کے کچھ شعر جو مجھے کچھ زیادہ ہی پسند ہیں، تحریر کر رہی ہوں ؎

الماری سے خط اس کے پرانے نکل آئے
پھر سے مرے چہرے پہ یہ دانے نکل آئے

اس نے رکھا ہے حفاظت سے ہمارے غم کو
عورتوں سے کبھی زیور نہیں پھینکا جاتا

لپٹی رہتی ہے تیری یاد ہمیشہ ہم سے
کوئی موسم ہو یہ مفلر نہیں پھینکا جاتا

سفیدی آگئی بالوں میں اس کے
وہ باعزت گھرانہ چاہتا تھا

گھیر لینے کو مجھے جب بھی بلائیں آگئیں
ڈھال بن کر سامنے ماں کی دعائیں آگئیں

میں وصیت کر نہ سکا کوئی وعدہ لے نہ سکا
میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ حادثہ ہو جائیگا

مدت سے کوئی خط بھی تمہارا نہیں آیا
رستے میں کہیں بادِ صبا بھی نہیں ملتی

اس وقت بھی اکثر تجھے ہم ڈھونڈنے نکلے
جس دھوپ میں مزدور بھی چھت پر نہیں جاتے

سفر کا شوق بھی کتنا عجیب ہوتا ہے
وہ چہرہ بھیگا ہوا آنسوؤں میں چھوڑ آئے

ویسے تو ان کے سبھی شعر مجھے یاد ہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے کے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہوتے ہیں۔ اس کھلی کتاب میں جو خوبیاں یا خامیاں ہیں میں نے آپ کے سامنے رکھ دیں۔ میں آخر میں یہ کہوں گی کہ صاحب کو میں شوہر کم محبوب زیادہ محسوس کرتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے فضل سے ہم لوگوں کی زندگی خوشگوار گذر رہی ہے۔ ؎

دعائیں مانگتی رہتی ہوں میں نمازوں میں
خدا کرے کہ سلامت مرا سہاگ رہے (باقی آئندہ)

منور رانا۔ آج کا شاعر

ابراہیم ہوش

منور رانا عہد نو کا شاعر ہے وہ اپنی شاعری میں فلسفہ نہیں بگھارتا۔ بلکہ جو کچھ کہتا ہے سیدھے سادے اور عام فہم انداز میں کہتا ہے۔ وہ اپنے ہر خیالات کو حالات و مشاہدات کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ اس کی شاعری کا لباس اگرچہ کلاسیکی ہے لیکن وہ اپنا سفر اس طرح طے کر رہا ہے کہ روایت کا بھرم بھی قائم رہے اور نئے لہجہ و محاورے کا حق بھی ادا ہو۔

اصلیت یہ ہے کہ کسی موضوع سخن کے لئے پہلے صنف شاعری اور ہیئت کا انتخاب ہوتا ہے۔ جو ہیئت کے مصنوعی رنگ ہیں۔ اور تب خیالات کو اس کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ لیکن اچھی شاعری کے لئے محض اسی قدر کافی نہیں ہے۔ ایک پست معیار کی شاعری میں بھی یہی باتیں مل سکتی ہیں۔ لیکن ایک بہتر شاعری کے انداز فکر اور اسلوب کا بھی بہتر اور اونچا ہونا ضروری ہے۔ شعر کے حسن میں فنکار کی فطری صلاحیتوں کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس صلاحیت کو ہم انداز فکر، طرز بیان، یا اسلوب کہتے ہیں۔ اور یہی ہیئت کا فطری رنگ ہوتا ہے۔

انداز فکر کا تعلق براہ راست شاعر کی شخصیت سے ہوتا ہے۔ یہ انداز فکر نقل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی نقل کرتا ہے تو اس سے ایک ایسا انداز فکر تشکیل پاتا ہے جو نہ اپنا ہوتا ہے نہ دوسرے کا۔ نقل کرنے میں کبھی نہ کبھی قلعی ضرور کھل جاتی ہے۔ مستعار انداز فکر یا تو ملمع ہوتا ہے یا کوئی خطوط سا شئے۔

منور رانا کا اپنا انداز فکر ہے اور جدید لب و لہجہ لئے ہوئے ہے۔ مختلف ادوار کی غزلوں میں زبان کا جو فرق ہم کو ملتا ہے وہ زبان کی بدلتی ہوئی شکل کا عکس ہے۔ مثلاً رانا کا یہ شعر ہے

بندھے ہوئے ہیں مرے ہاتھ پشت کی جانب   کہاں ہیں آئیں پرانی عداوتوں والے

اور یہ شعر ہے

ہمارے کچھ گناہوں کی طرح سر پہ سایہ کئے ساتھ چلتی رہی
ایک بچی کہ جس کے جانے کے بعد ہم خاموشی سے سفر کرتے ہوئے

دونوں اشعار بتا رہے ہیں کہ ان کا تعلق شاعر کی افتادِ طبع اور اس کے زیرِ فکر مسائل کی نوعیتوں سے ہے۔

دو شعر اور ملاحظہ کیجئے ؎

کچھ کھلونے کبھی آنگن میں دکھائی دیتے ۔ کاش! ہم بھی کسی بچے کو مٹھائی دیتے

سونے پنگھٹ کا کوئی درد بھرا گیت تھے ہم شہر کے شور میں کیا تجھ کو سنائی دیتے

ہے کا مطلب یہ ہے کہ ہر دور کی اپنی ایک لغت ہوتی ہے مگر شاعروں کے طبائع کا رچاؤ الگ ہے۔ اپنی بات، اپنی اپنی زبان۔ اور اپنا اپنا لہجہ۔

منور رانا کی شاعری کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ اور اس اعتبار سے وہ ہنوز طفلِ مکتب ہے۔ مگر اس کی شاعری کی اٹھان بتا رہی ہے کہ اس کے خیال و احساس کی تازگی اور لہجے کی وارفتگی اسے بہت جلد ملک کے ممتاز شعرا کی صف میں لا بٹھائے گی۔

منور رانا کا پورا کلام میرے پیشِ نظر نہیں ہے۔ سردست دس بارہ اشعار میرے مطالعے کے دسترس میں ہیں۔ لیکن میرے خیال میں ان چند گنے چنے اشعار سے ہم اس کے رنگِ سخن، شعری مسلک، اور منفرد اسلوب کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اور میرے خیال میں یہ ضروری نہیں ہوگا کہ رانا کے کلام میں ندرتِ خیال، لطافتِ احساس، صداقتِ جذبات اور حسنِ بیان وغیرہ شعری محاسن کا کھوج لگایا جائے۔ اور مثالیہ اشعار پیش کر کے ان کا ثبوت فراہم کیا جائے جو خوبیاں منور رانا کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ اس کا فیصلہ قاری کے ذوق اور ہمدردانہ مطالعے پر مبنی ہوگا۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ وہ ایک خوش فکر اور خوش نوا شاعر ہے۔ اور اس کی شاعری رگوں میں حیات، فطرت، اور کائنات کے زندہ و تابندہ شعور کو گرم خون کی طرح دوڑاتی ہے

اب اس کے چند اشعار پڑھئے ؎

ساتھ اپنے رونقیں شاید اٹھا لے جائیں گے جب کبھی کالج سے کچھ لڑکے نکالے جائیں گے

کچی سڑکوں سے لپٹ کر بیل گاڑی رو پڑی غالباً پردیس کو کچھ گاؤں والے جائیں گے

ہم تو اک اخبار سے کاٹی ہوئی تصویر ہیں جس کو کاغذ چننے والے کل اٹھا لے جائیں گے

حادثوں کی گرد سے خود کو بچانے کے لئے ماں ہم اپنے ساتھ صرف تیری دعا لے جائیں گے

(رانا [illegible])

منور رانا ۔ مغربی بنگال کے شعری مزاج کا ترجمان

ڈاکٹر مظفر حنفی

مغربی بنگال میں آزادی کے بعد کے ادبی سرمائے کا جائزہ لیجئے تو سب سے زیادہ حیرت انگیز بات
آڑ ۔ یہ ہے کہ اس علاقے میں جہاں فورٹ ولیم کالج کے وسیلے سے عام فہم ادبی نثر کی بنیاد پڑی تھی آج قابل ذکر نثر
کی تعداد افسوس ناک حد تک کم ہے ۔ میری اس بات پر ممکن ہے جاوید نہال ، شانتی رنجن بھٹاچاریہ ، عبدالرؤف ،
لکھنوی ، ظفر اوگانوی وغیرہ کبیدہ خاطر ہوں لیکن میرا مقصد ان کی نثری کاوشوں کو کم کرنا ہرگز نہیں ہے ۔ عرض اتنا
کہ پچھلے تیس پینتیس برسوں میں شعر کہنے والوں کی جتنی بڑی تعداد منظر عام پر آئی ہے ان کے مقابلے میں نثر لکھنے والے
انگلیوں پر شمار کئے جا سکتے ہیں ۔ میری یہ بات بے موقع اور بے محل بھی نہیں ہے کہ علامہ وحشت اور پرویز شاہدی
لے کر اعزاز افضل اور منور رانا تک تخلیق کاروں کا ایک بڑا قافلہ ہے جس سے ہماری تنقید بے رخی برتتی آرہی ہے ۔
سمجھتا ہوں کہ اگر اس خطے نے دو چار نقاد بھی پیدا کئے ہوتے تو صورت حال یقیناً مختلف ہوتی ۔

ماہنامہ "شاعر" (بمبئی) نے حال ہی میں میرے دوست بشیر بدر کا ایک دلچسپ مضمون "غزل کیا"
شائع کیا ہے ۔ جس میں موصوف نے منور رانا اور ان کے ہم عصر چند اور شعراء کے (جن کا تعلق مغربی بنگال سے
اشعار درج کر کے سوال کیا ہے کہ ان اشعار کو کسی خاص علاقے سے متعلق ثابت نہیں کیا جا سکتا ۔ بشیر بدر نے
مضمون میں اور بھی کئی تہلکہ خیز انکشافات کئے ہیں ۔ مثلاً میر اور غالب کی شاعری کا بڑا حصہ جسے غزل سمجھا جاتا
دراصل غزل سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتا ۔ غزل کی کوئی زبان نہیں ہوتی ۔ اردو سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں
اردو مر جائے گی اور غزل زندہ رہے گی ۔ وغیرہ وغیرہ ، سب سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ پورے مضمون میں بیشتر
اشعار میں سے نوے فیصد خود بشیر بدر کے ہیں ۔ جنھیں فاضل مقالہ نگار نے مثالی غزلیہ شعروں کی حیثیت سے پیش
ہے ۔ یہاں میں بشیر بدر کی دوسری باتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف منور رانا کے حوالے سے گفتگو کرنا چاہتا
پہلے رانا کے وہ مشہور شعر پڑھئے جو بشیر بدر نے اپنے مضمون میں درج کئے ہیں ۔

بچپن میں کسی بات پہ ہم روٹھ گئے تھے
اس دن سے اسی شہر میں ہیں گھر نہیں جاتے

اس وقت بھی اکثر ہم تجھے ڈھونڈنے نکلے — جس دھوپ میں مزدور بھی چھت پر نہیں جاتے

اور اب منور رانا کے کچھ اور اشعار بھی ملاحظہ فرمائیے جو مندرجہ بالا اشعار ہی کے ہم مزاج ہیں ؎

شرم آتی ہے مزدوری بتاتے ہوئے ہم کو — اتنے میں تو بچوں کا غبارہ نہیں ملتا

میں اک فقیر کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ہوں — کسی سے بھی مری قیمت ادا نہیں ہوتی

جہاں پر گن کے روٹی بھائیوں کو بھائی دیتے ہیں — سب چیزیں وہاں دیکھیں مگر برکت نہیں دیکھی

ہمارے ساتھ چل کر دیکھ لیں یہ بھی چمن والے — یہاں اب کوئلہ چنتے ہیں پھولوں سے بدن والے

میں کہ فرہاد نہیں باپ ہوں اک بیٹے کا — صرف روزی کے لئے کوہ کنی آ جائے

مرے گھر کے در و دیوار کی حالت نہیں دیکھی — برستے بادلو! تم نے بھی میری چھت نہیں دیکھی

نہیں بھی پیٹ کی خاطر خزانہ ڈھونڈ لینا ہے — اسی پھینکے ہوئے کھانے سے دانہ ڈھونڈ لینا ہے

جب یہ سنا کہ جنگ سے لوٹا ہوں ہار کے — راکھی زمیں پہ پھینک کے بہنیں چلی گئیں

ہمیشہ اپنی شرطوں پہ ہجرتیں کی ہیں — مسافروں نے قلی کی طرف نہیں دیکھا

اس خرابے کو گلزار بنانا تھا اُسے — ورنہ آدم کو زمیں پر نہیں پھینکا جاتا

جو دھوپ میں جلنے کا سلیقہ نہیں رکھتے — ان پیڑوں کو پتوں کی قبا بھی نہیں ملتی

منور رانا کوئی پُر گوشاعر نہیں ہیں لیکن ان کے زیرِ طبع پہلے مجموعہ کلام "نیم کے پھول" میں اسی نوع کے اشعار کی کثرت ہے کیا وہ کسی مزاجِ شعر کی غمازی نہیں کرتی ۔؟ کوئی سبب ہوگا کہ رانا بار بار مزدوروں اور غریبوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اور انتہائی ہمدردی کے ساتھ کرتے ہیں ۔کہیں دھوپ کی شدت میں ان کا سینہ بھبکتا دکھائی دیتا

ہے تو کہیں ان کی اجرت کم ہونے کا گلہ ہے۔ کہیں قلی سے مسافروں کی بے اعتنائی شاعر کو خون کے آنسو رلاتی ہے۔ کہیں فقیر کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور اس کی بے وقعتی ہر شاعر کا خون کھولاتا ہے۔ کسی شہر میں پھینکے ہوئے کھانے سے رزق تلاش کرنے والے نظر آتے ہیں۔ اور کہیں پھول سے بدن والے کوئلہ چنتے ہوئے پائے جاتے ہیں اور کہیں بھائی بھائیوں کو گن کر روٹیاں فراہم کرتا ہوا ملتا ہے۔ کہیں روزی کے لئے کوہ کنی کی جا رہی ہے۔ تو کہیں گھر کی چھت نہ دیکھنے پر بادلوں کی بے حسی کا شکوہ کیا جا رہا ہے۔ بھوک روٹی، روزی، مکان، مزدور، غریبی اور مزدوروں اور مجبوروں کے استحصال بیجا پر شعر کہنے والا یہ نوجوان جدید نسل کے دوسرے شاعروں کی طرح گردن ڈال کر چلنے سے انکار بھی کرتا ہے۔ ان کے اشعار میں بہنیں شکست خوردہ بھائی کو راکھی باندھنے سے انکار کر دیتی ہیں۔ اسے معلوم ہے کہ آدم کو زمین پر اس لئے اتارا گیا ہے کہ وہ اس خرابے کو گلزار بنائے۔ وہ پیڑوں کو پیغام دیتا ہے کہ دھوپ میں جلنے کا سلیقہ نہ ہو تو پتوں کو قبا ہاتھ نہیں آتی۔ اتنے بہت سے شواہد موجود ہوں اور ہم علاقے کا تعین نہ کر سکیں تو ہمیں اپنی سخن شناسی پر اتنا اعتبار نہیں کرنا چاہیے جتنا بشیر بدر کو ہے۔

کسی دسویں جماعت کے طالب علم سے سوال کر کے دیکھئے کہ برہمی اور احتجاج کی لے ہندوستان کے کس علاقے میں سب سے زیادہ بلند ہوتی ہے؟ - جواب ملے گا بنگال میں۔ از ابتدا تا حال یہ خطہ اشتراکیت کا پرچم علمبردار رہا ہے۔ نذرالاسلام جو کہ قیام نذیر ہیں جس کے خمیر میں ذوق جمال اور لطافت طبع کے ساتھ احتجاج برہمی، جوشش، ولولہ اور سرکشی داخل ہے۔ ممکن ہی نہیں کہ کوئی اچھا اور سچا فنکار اپنی زمین سے کٹ کر اور ماحول سے بے نیازی برت کر شعر کہہ سکے۔ البتہ رانا کو اپنے پیش روؤں سے جن میں بیشتر غالی ترقی پسند ورثے میں جو مزاج شعر حاصل ہوا اس میں عصری رجحانات اور تقاضوں کو آمیز کر کے انہوں نے ایک ایسا رنگ برآمد کیا جس میں جدیدیت، مقصدیت، اور ترقی پسندی ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چلتے ہیں۔ اور شعر ترقی پسندی کی باڑھ میں آکر نعرہ بازی نہیں کرتا بلکہ اس نظریے کو جذبے میں تحلیل کر کے نئی لفظیات سے آشنا کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ چنانچہ اپنی تمام تر مقصدیت اور نظریاتی وابستگی کے باوصف وہ شعر رہتا ہے۔ جمالیاتی حس کو آسودگی اور دل و دماغ کو بیک وقت متاثر کرنے والا شعر۔

لیکن مغربی بنگال میں تو منور رانا کے جونیئر اور سینیئر ہم عصر شاعروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ کسی جانب سے سوال اٹھ سکتا ہے کہ ان کے درمیان منور رانا کی شناخت کیا ہے جواب یہ کہ اچھے شاعر بھیڑ میں گم نہیں ہوا کرتے۔ یہ جواب میرا نہیں، منور رانا کے مندرجہ ذیل اشعار کہہ رہے ہیں ؎

تمہارے شہروں میں بھی رہ کر برابر یاد کرتا تھا وہ اک چھوٹے سے اسٹیشن کا منظر یاد کرتا تھا

وہ میلا سا بوسیدہ سا آنچل نہیں دیکھا برسوں ہوئے ہم نے کوئی پیپل نہیں دیکھا

گلا سڑکوں سے لپٹ کر پھول گاڑی رو پڑی غالباً پردیس کو کچھ گاؤں والے جائیں گے

جب اک واقعہ کچھ کا ہم کو یاد آیا ۔ ہیہات پرندوں کو پھر گھونسلوں میں [illegible]

ہم گاؤں میں جب تک رہتے تھے یہ سب منظر مل جاتے تھے
دو چار کنویں مل جاتے تھے دس بیس شجر مل جاتے تھے

گھنشکر فون پہ ہو جاتی ہے رانا صاحب ۔ اب کسی چھت پہ کبوتر نہیں بیٹھا کرتا

تو اب اس گاؤں سے رشتہ ہمارا ختم ہوتا ہے ۔ پھر آنکھیں کھول لی جائیں کہ سپنا ختم ہوتا ہے

ابھی تک میرے مسجد میں کئی ایسے گزرتے ہیں ۔ کبھی رمضان میں مسجد سے افطاری [illegible]

یہ اور اس قبیل کے بہت سے اشعار بتاتے ہیں کہ رانا کا بچپن گاؤں میں گزرا ۔ جہاں [illegible] کنویں ، بچی سڑکیں ، بیل گاڑیاں ، تالاب ، ماں کا میلا اور بوسیدہ آنچل [illegible] جیتوں پہ بیٹھے ہوئے کبوتر شعر کے بار بار آ تے ہیں ۔ اور یہ یادیں اشعار [illegible] تشکیل کرتی ہیں ۔ ایسے تمام اشعار یکجا کر کے دیکھے جائیں ۔ تو ان سے ابھرتا ہوا گاؤں [illegible] آتا ہے ۔ یاران نکتہ داں کے لئے صلائے عام ہے خود تجزیہ کر کے دیکھ لیں ۔

منور رانا کے شعری سرمایہ کا ایک دوسرا اور گہرا رنگ یہ کہ چونکہ ان کے اکثر اشعار [illegible] کی ممتا ، پدرانہ شفقت اور بچوں کی معصومیت کو شاعری کی زبان [illegible] مثلاً

ماں باپ کی بوڑھی آنکھوں میں اک فکر سی چھائی رہتی ہے
جس کمبل میں سب سوتے تھے اب وہ بھی چھوٹا پڑتا ہے

کھلونوں کے لئے بچے ابھی تک جاگتے ہوں گے ۔ تجھے اے مفلسی کوئی بہانا ڈھونڈ لینا ہے

اب دیکھئے کون آئے جنازے کو اٹھانے ۔ یوں تار تو میرے سبھی بیٹوں کو ملے گا

[illegible] جب [illegible] آ گئیں ۔ گھر سے نکلا جو کر سامنے ماں کی دعا [illegible]

کچھ کھلونے کبھی آنگن میں دکھائی دیتے کاش ہم بھی کسی بچے کو مٹھائی دیتے

جس کو بچوں میں پہنچنے کی بہت عجلت ہو اس سے کہیے نہ کبھی کار چلانے کے لئے

کسی بچے کا یہ جملہ ابھی تک یاد ہے رانا یتیموں کو پڑھانے کو استانی نہیں جاتی

ہر سہولت تھی میسر لیکن اس کے باوجود ماں کے ہاتھوں کی پکائی روٹیاں اچھی لگیں

دوستی، دشمنی دونوں شامل رہی، دوستوں کی نوازش تھی کچھ اس طرح
کاٹ لے شوخ بچہ کوئی، جس طرح ماں کے رخسار پر پیار کرتے ہوئے

جب یہ سنا کہ جنگ سے لوٹا ہوں ہار کے راکھی زمیں پہ پھینک کے بہنیں چلی گئیں

یہ بوڑھی آنکھیں، چھوٹا کمبل، بچوں کے کھلونے، باپ کی موت کا تار، ماں کی دعائیں اور اس کے ہاتھ کی پکائی روٹیاں، یتیموں کو نہ پڑھانے والی استانی، بچوں میں مٹھائی بانٹنے کی خواہش، بہن کی راکھی اور ماں کے رخسار کو کاٹنے والے شوخ بچے، کس طرح سامنے کی بات اور پیش پا افتادہ مضامین دراصل غزل کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ اہل نظر محسوس کر سکیں گے اور ساتھ ہی یہ بھی محسوس کر سکیں گے کہ یہ باتیں ایک خاص دھرتی کی پیداوار میں رچی بسی ہیں۔ دوسرے علاقوں مثلاً مغربی ممالک کے شاعر انہیں اس طرح نہیں کہہ سکتے۔ دراصل ایک مخصوص خطۂ ارض اور کوئی خاص زبان کسی صنف شعر کے لئے والدین کی حیثیت رکھتی ہے۔ خصوصاً منور رانا پر یہ بات زیادہ صادق آتی ہے کہ وہ اردو کی غزلیہ شاعری میں مغربی بنگال کے مزاج شعری کے ترجمان ہیں۔ نیز خاندان اور رشتوں کی تقدیس پر ایمان رکھتے ہیں۔ لشیر بدر کو ان کا ایک اور شعر سنا کر میں اپنی بات ختم کرنا چاہتا ہوں

آسمانو! کبھی پاتال کی جانب آنا
مجھ سے ملنا ہو تو بنگال کی جانب آنا

بقیہ :- منور رانا ۔۔۔ اچھے دوست

پچھلے چند برسوں میں جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے وہ ان کا حق ہے مگر نہ جانے کیوں مجھے ان کے بڑھتے ہوئے تیز قدم کو دیکھ کر ایک اندیشہ سا ہے کیونکہ وہ ایک سادہ لوح اور کسی حد تک وہ غیر محتاط ہیں خدا انہیں نظر بد سے محفوظ رکھے ●

منور رانا: غزل گاؤں میں

انور ندیم

ستارے چاند کلیاں اور کیاری نہیں لاتے
غزل میں ہم کبھی بھرتی کی گلکاری نہیں لاتے

خوشامد چاپلوسی اور مکاری نہیں لاتے
ہم اپنے شعر میں الفاظ درباری نہیں لاتے

صحیفوں کو ہمیشہ دل کے جزدانوں میں رکھتے ہیں
کتابوں کے لئے چاندی کی الماری نہیں لاتے

یہ بچے پھول کافی خوبصورت ہیں مگر رانا
ہم اپنے گھر میں کوئی چیز بازاری نہیں لاتے

گوتم کی طرح گھر سے نکل کر نہیں جاتے
ہم رات میں چھپ کر کہیں باہر نہیں جاتے

بچپن میں کسی بات پہ ہم روٹھ گئے تھے
اس دن سے اسی شہر میں ہیں گھر نہیں جاتے

اس وقت بھی اکثر تجھے ہم ڈھونڈنے نکلے
جس دھوپ میں مزدور بھی چھت پر نہیں جاتے

ہم وار اکیلے ہی سہا کرتے ہیں رانا
ہم ساتھ میں لیکر کہیں لشکر نہیں جاتے

اب دھوپ حقیقت کی ہے اور شوق کی راہیں
خوابوں کی گھنی چھاؤں میں ہم رک نہیں سکتے

شاید ہمارے پاؤں میں تل ہے کہ آج تک
گھر میں کبھی سکون سے دو دن نہیں رہے

حالات نے چہرے کی چمک چھین لی ورنہ
دو چار برس میں تو بڑھاپا نہیں آتا!

بڑے لوگوں سے ملنے میں برائی کچھ نہیں رانا
مگر اس پیڑ کی شاخیں بہت کمزور ہوتی ہیں

مسافر ہیں ہمیں بھی شب گذاری کے لئے رانا
بجائے میکدے کے چائے خانہ ڈھونڈ لینا ہے

عہد نو تیرے میر ہیں ہم لوگ
آپ اپنی نظیر ہیں ہم لوگ!!

وقت کی سیڑھیوں پہ بیٹھے ہیں
اس صدی کے کبیر ہیں ہم لوگ

ہائے کتنی خوبصورت گالیاں دینے لگے
اب مرے احباب مجھ کو کرسیاں دینے لگے

جو تیر بھی آتا ہے وہ خالی نہیں جاتا
مایوس میکدے سے سوالی نہیں جاتا

مری سرشت میں شامل رہا ہے بچپن سے
پتنگ ہاتھ نہ آئی تو اسکو پھاڑ دیا

تم نہ سمجھوگے ہمارے سر کا جنون
ٹوٹ جائے گا، غم نہیں ہوگا

میں فقیری میں بھی سکندر ہوں
مجھ پہ دولت کا مت اثر ڈالو

آندھیو! دلِ پامال کی جانب آنا!
آسمانو! کبھی پاتال کی جانب آنا

عشق ہے کام مرا، نام منور رانا
مجھ سے ملنا ہو تو بنگال کی جانب آنا

ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں، یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان اشعار سے ایک تصویر بنتی ہے، ایک ایسی تصویر جو بولتی ہے اور منور رانا کی اس بولتی ہوئی تصویر کو کسی تعارف کی ضرورت نہیں، مگر آپ کی طرح ہم بھی ایک ایسی دنیا میں سانس لینے کے لئے مجبور ہیں جہاں روشنائی کے بے شمار سمندر، آج بھی کاغذ کے پہاڑوں پر اسی ایک خیال ایک جملے کی وضاحت اور تبلیغ کے لئے رینگ رہے ہیں کہ "خدا ایک ہے، اور وہی سب سے بڑا ہے" اس لئے الونیزم کے قلم کو بھی منور رانا کے سلسلے میں کچھ عرض کرنے کی اجازت دیجئے!

منور رانا ۱۹۷۷ء تک منور علی آتش اور اس کے بعد سے منور رانا۔ منور رانا کا آبائی وطن رائے بریلی، ابتدائی تعلیم، سنگم رش اور دکاس کا میدان کلکتہ، باپ سید ان سنگیخ، دونوں کے گھروں میں زمینداری اور مذہب کا رچاؤ۔ زمینداری کا سومناتھ ٹوٹ کے بکھر گیا۔ ایک ممتاز مذہبی گھرانے سے کئی افراد، زمینی راحتوں کی دلیوداسیوں کے چکر میں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے، اور چاہا کہ منور رانا کے باپ اور اپنے بھائی انور علی کو خاک میں ملا دیں، جن کی جواں مردی کو گھر کی مذہبی فضا نے صبر و ہمت کی برکتوں سے نوازا تھا۔ انور علی زمینداری کے کھنڈر کو ٹھوکر مار کر الگ ہو گئے۔ گھر چھوڑا، کلینر بنے، ڈرائیور کی، انقلاب جھیلا، پیچھے ہٹے، مات کھائی، ہار مانی، ٹوٹے بکھرے، سمٹے ابھرے، مگر محنت کی آنکھوں میں مستقبل کے سنہرے خواب ہمیشہ تیرتے رہے اور ۶۵ میں جیالے انور علی نے اپنے بچوں کی خاطر تعمیر محل کی بنیاد کا پہلا پتھر، کلکتہ کی زمین کے حوالے کر دیا۔

منور نے جنم لیا محل، کھیلے کودے محل میں، لڑکپن کی گندے محل میں، جوانی کو دیکھا محل میں، شہزادگی کو برتا محل میں، سہرا باندھا محل، باپ بنے محل میں، زندگی کے پہلے دکھ کی لذت سے آشنا ہوئے محل میں، جان لیوا سوالوں سے ملاقات ہوئی محل میں، جیون درشن نے اکسایا محل میں، ایک لمبی عمر اور اس کی کئی منزلوں سے گزرے بھی محل میں؛ منور رانا نے آنکھ کھولی ۱۹۵۲ء میں، جوان ہوئے ۱۹۵۲ء میں، بالغ ہوئے ۱۹۵۲ء؛ آج منور رانا کے بدن کی ۳۲ سالہ حویلی میں، ایک طفل معصوم اپنی زندگی کی ۲۳ ویں سیڑھی میں بیٹھا ہوا، ایک باعمل ۳۲ سالہ دانش ور کے اقوال کو غزل کی پھول مالا میں گوندھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

کتابی ضرورتوں اور ختنہ رکھ رکھاؤ کی جی۔ ٹی۔ روڈ پر منور رانا کا غزل گاؤں، سڑک کے کنارے گاؤں کے نام کا میز، منور رانا کی ایک بڑی سی تصویر، اسکے پرچے کا اشتہار، اس کے عقیدے کا ایک کالا پتھر، کچھ دوسرے ناموں کی تختیاں، میل کے چھوٹے بڑے پتھروں کا انبار اور گاؤں کی طرف مڑنے والا ایک نثری گلیارہ؛ غزل گاؤں کا رقبہ ۹۲ صفحات پر پھیلا ہوا اور اس کی مجموعی آبادی امتِ غزل کے ۲۹۰ اشعار پر مشتمل چھوٹی سی بستی میں غزل کے ۴۹ کنبے، کسی گھر میں فقط دو فن کے سات اور کسی میں کل تین چہرے، اور گاؤں کے آخری کنارے کی ٹھنڈی ریت پر ۵۲ اشعار کی سوتی جگتی آبادی۔

غزل گاؤں میں پرانے زمیندار کی حویلیاں بھی ہیں، اور نئے دھانک کی کوٹھیاں بھی؛ سرپنچ کے کھنڈر کھنڈالے بھی ہیں، اور پرجوں کی دکانیں بھی؛ غریب کا پردہ بھی ہے، اور فقیر کی کٹیا بھی؛ آم اور برد کے باغ بھی ہیں، گیہوں اور سرسوں کے کھیت بھی؛ پیڑ ال، جامن اور شہتوت کے؛ پودے رات کی رانی، چنبیلی اور گیندے کے؛ کہیں مسجد، کہیں شوالے؛ کہیں گھاٹ، کہیں چوپال؛ کہیں پھوس کا چھپر اور کہیں آسائش کی ننگی چھت

۱۔ صفحہ ۲۳-۳۵-۴۱-۷۷ … ۴۴-۵۱ سے میں
۲۔ صفحہ ۳۰-۳۳-۶۲-۶۳-۶۴-۷۴ … ۲۱-۲۶-۵

کشمیر، ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے یا نہیں، ہمیں نہیں معلوم، مگر غزل گاؤں، ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے، پاکستان کی تہذیبی اور شعری فضاؤں سے مختلف: رسم الخط دیوناگری ہے مگر غزل گاؤں کی زبان' اردو ہے' منور رانا کی اردو' ہماری آپ کی اردو۔ مولوی عبدالحق کی کتابی زبانی اردو نہیں؛ بازار کی عوامی' ٹکسالی اردو' قلعہ ادب کی اردو: جہاں عربی گھوڑوں' اونٹوں کو نہلانے اور بلانے کی اجازت نہیں ہے ـــــ!

لوگوں کو اِس بات کا پورا یقین ہے کہ شاعر بھی انسان ہی ہوتا ہے۔ پھر بھی اردو شاعر کی ایک عجیب و غریب پہچان؛ غزلوں میں رنگینی رہتی ہے اور اس پہچان کو پیدا کیا ہے میر اور میراجی کے مخصوص نفسیاتی رویوں نے' جوش اور فراق کی حرکتوں نے' مجاز اور جگر کی مے نوشیوں نے' ساغر اور کیفی کی طرح داریوں نے' پھر بھی اس عجیب و غریب پہچان کا منور رانا کی شکل و شبیہ سے کوئی رشتہ نہیں ہے ـــــ!

کچھ دیکھنے' سوچنے' سمجھنے اور کہنے کے لئے جب منور کی آنکھیں کھلیں تو ہندوستان کی جھوٹی آزادی اور کچی تقسیم خونی نیتوں کا سیلاب اس کے چاروں اور چیخ رہا تھا' علم ہندوستان کی تاریخ انسانی خون سے نہا کر پاکستان کی طرف بھاگ رہی تھی' زمیندار اپنی پوٹلیاں لے کر بھاگ رہے تھے۔ وطن' تہذیب' مذہب' زبان اور انسانی رشتوں کے تمام شیشے ایک دوسرے سے ٹکرا کر ٹوٹ رہے تھے ـــــ! منور رانا نے سنا اور دیکھا تھا کہ اس خاندان جہاں میں جلتا ہے' اسکے باپ کی ننھی ہتھیلی کو زمینداری نے سیر و تفریح کے لئے کبھی گھوڑے کی لگام بخشی تھی' ہندوستان کی جھوٹی آزادی نے اُسے مال برداری کے لئے ٹرک ڈرائیور کی سیٹ پر بٹھا دیا۔ رائے بریلی کے ایک اونگھتے ہوئے خاندان نے بنگال کے ابر آلود آسمان کی چادر اوڑھ لی ـــــ!

ہوا میں معلق خاندان کو سب سے پہلے زمین پر کھڑا کرنا تھا۔ منور رانا کے لئے تعلیمی دلدل کی گنجائش نہیں تھی۔ یہ سلسلہ کلکتہ میں شروع ہوا اور وہیں انٹر کے آخری سال میں سمٹ کے رہ گیا۔ یقیناً یہ منور رانا کا وہ کارنامہ ہے کہ اس نے اپنے محنت کش مزدور اور سابق زمیندار باپ کے لئے ایک بھرپور زندگی کے خواب کو ساکار کیا اور اپنے ٹرانسپورٹ کے کام کو یہاں سے وہاں تک پھیلانے میں کامیابی حاصل کی۔ آج اس کے ایک اشارے پر کئی موٹر ٹرک حرکت کرتے ہیں۔ مختلف شہروں میں اس کے کئی دفتر' کئی گودام' کئی گاڑیاں' کئی کاریں ہیں اور اس کی جیب میں ایک پستول ہے۔ اس کی داڑھ میں پان کے کئی بیڑے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں رَس اور پیار ہے۔ اسکے ماتھے پر پسینہ اور بدن پر گوشت کی مناسب پرتیں ہیں۔ اس کے بدن پر کبھی بنگالی کرتا اور کبھی بین الاقوامی بشرٹ کے تیز گہرے رنگ ہیں۔ اس کی رنگت سانولی اور سینہ آہنی ہے۔ اس کے رویوں میں شرافت اور [illegible] ہے۔ اس کے ہونٹوں پر لطیفے اور گالیاں ہیں۔ اس کی زبان پر شاعری اور لن ترانی ہیں۔ اس کے دل میں گنجائشیں ہیں اور ذہن میں وسعت ہے۔ اس کے کلام کا ہیرو اس کا باپ! اس کی شاعری میں مستانی ملتی اس کی ماں۔ منور نے اپنے باپ کے تعلق سے ان کے بھائی کے قاتل رویے کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کوشش میں اردو غزل کو کئی خوبصورت اشعار مل گئے ہیں:

میں اپنے بھائیوں کے ساتھ جب باہر نکلتا ہوں
مجھے یوسف کے جانی دشمنوں کی یاد آتی ہے

لے مسودہ حاشیہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

بندھے ہوئے ہیں مرے ہاتھ پشت کی جانب
کہاں ہیں! آئیں پرانی عداوتوں والے

مات دیکھا ہے بہاروں پہ خزاں کو ہنستے
کوئی تحفہ مجھے شاید مرا بھائی دیگا

جہاں ملا انھیں موقعہ وہیں اُجاڑ دیا
مرے بڑوں نے گھروندا مرا بگاڑ دیا

ممتاز کی محبت میں شاہجہاں سنگ مرمر کو اپنے دل کی دھڑکنیں دے گیا۔ منور اپنی ماں کی مقدس شخصیت کو کسی کتاب کے رسمی انتساب سے بڑھانا نہیں چاہتا۔ منور نے نئی اردو شاعری میں اپنی ماں کے لئے کئی تاج محل تراشے ہیں:

لبوں پہ اسکے کبھی بد دعا نہیں آتی
بس ایک ماں ہے جو مجھ سے خفا نہیں ہوتی

گھیر لینے کو مجھے جب بھی بلائیں آ گئیں
ڈھال بن کر سامنے ماں کی دعائیں آ گئیں

کیا جانے کہاں ہوتے مرے پھول سے بچے
ورثے میں اگر ماں کی دعا بھی نہیں ملتی

ہر سہولت تھی میسر لیکن اس کے باوجود
ماں کے ہاتھوں کی پکائی روٹیاں اچھی لگیں

لپٹ کے روتی نہیں ہیں کبھی شہیدوں سے
یہ حوصلہ بھی ہمارے وطن کی ماؤں میں ہے

مقدس مسکراہٹ ماں کے ہونٹوں پر لرزتی ہے
کسی بچے کا جب پہلا سپارہ ختم ہوتا ہے

جب بھی دیکھا مرے کردار پہ دھبا کوئی
دیر تک بیٹھ کے تنہائی میں رویا کوئی

حادثوں کی گرد سے خود کو بچانے کے لئے
ماں ہم اپنے ساتھ بس تیری دعا لے جائیں گے

پھر اس کے بعد وہ آنکھیں کبھی نہیں روئیں
ہم ان کو ایسی غلط فہمیوں میں چھوڑ آئے

سسکیاں اس کی نہ دیکھی گئیں مجھ سے رانا
رو پڑا میں بھی اسے پہلی کمائی دیتے

اب دیکھئے کون آئے جنازے کو اٹھانے
یوں تار تو میرے سبھی بیٹوں کو ملے گا

ماں کی ممتا گھنے بادلوں کی طرح سر پہ سایہ کئے ساتھ چلتی رہی
ایک بچہ کتابیں لئے ہاتھ میں خامشی سے سڑک پار کرتے ہوئے

دکھ بزرگوں نے کافی اٹھائے مگر میرا بچپن بہت ہی سہانا رہا
عمر بھر دھوپ میں پیڑ جلتے رہے اپنی شاخیں ثمردار کرتے ہوئے

منور کی فکر اور شاعری کی زبان میں فاصلہ نہ ہونے کے برابر ہے، اس کی غزلوں میں اسی کے مخصوص تیور کا بانکپن ہے۔

منور کی غزلوں میں اس کی شخصیت کی پہچان خو[illegible] کی طرح مہکتی ہے، اس کے شعروں میں اس کی آتما [illegible] خون گردش کرتا ہے۔

قتل بھی ہوگا ہمارا تو یہیں پر ہوگا
فیصلہ جو بھی ہو دشمن کی زمیں پر ہوگا

بھٹکاتے ہوئے شردوں کو تباہی دے گا
اور کیا ملک کو مفرور سپاہی دے گا

ہماری جیتی آنکھوں نے جلتے شہر دیکھے ہیں
برے گئے ہیں اب قصے نہیں بھائی بہن والے

تلوار کی نیام کبھی پھینکنا نہیں
ممکن ہے دشمنوں کو ڈرانے کے کام آئے

سلسلہ دوستی کا کیوں ٹوٹے
نہ سہی تیر تو زباں سے چلے!

میں اس خیال سے جاتا نہیں ہوں گاؤں کبھی
وہاں کے لوگوں نے دیکھا ہے بچپنا میرا

اس جنگ نے بیساکھیاں بخشیں مجھے بابا
سرکار سے انعام حدیدوں کو ملے گا

راہِ حق میں منزلِ دار و رسن آئے تو دو
جو زباں رکھتا ہے وہ بھی بے زباں ہو جائیگا

نئے چراغ جلانے میں جب کبھی ہم رہا
ہمیں ہواؤں کے قصے سنائے جاتے ہیں

منور رانا کے باپ نے برسوں ہندوستان کی مختلف مصنوعات کی بار برداری کا کام کیا ہے اور منور نے کیاری کے اس پیشے کو سنجیدگی سے اپنایا ہے مگر فکر و فن کے معاملے میں منور رانا دوسروں کا فکری مال اپنی شاعری کے ٹرک میں لادنے کے لئے تیار نہیں ہے۔
ممکن ہے فوٹو اسٹیٹ سے نقلیں اتارنے کی ترکیب اردو مشاعرے کے اسٹیج پر ہی وجود میں آئی ہو اور وہیں سے یہ طریقہ دیسی بیچ کر بازاروں میں اور گلی کوچوں میں پھیل گیا ہے؛ جگر اور شمیم کا ترنم، نشور اور بیکل کی آواز، وسیم اور ساحر کا انداز، کیا انھیں اسلوبی چولوں میں دوسروں نے اپنے بھدے بدن کو ڈالنے کی کوشش نہیں کی ہے، کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اردو کے سینکڑوں غزل تراش کچھ لوگوں کی برتی ہوئی اترنوں سے اپنا کام چلاتے ہیں، مگر ہاں! منور رانا اپنی تخلیق کا پیٹ، اپنی آزاد فکر کی محنت اور کمائی سے بھرنا چاہتا ہے۔

منور کی غزلوں کا مزاج، اسکولی لڑکیوں کے رویہ سے بالکل مختلف ہے، اس کی غزلیں فینسی شو کی چھوٹی اور مکاتی زندگی کو برداشت نہیں کر سکتیں، منور کو معلوم ہے کہ اس کی تخلیق کے بدن پر کس کی گھسی پٹی زبان کا لباس کیسا لگے گا۔ منور اپنی شاعری کے لئے لفظی جامہ تراشی کا کام خود ہی انجام دیتا ہے۔

جوش کے بزرگوں نے کئی بار بہت ہی گھٹیا شکل و صورت اور نچلی ذات کی عورتوں کو اپنے جنسی دائروں میں داخل کیا تھا، جوش نے یہ ماننے کے باوجود کہ لفظوں کا اپنا خاندان ہوتا ہے۔ ان کا اپنا مزاج، اپنا رکھ رکھاؤ، ان کی اپنی پسند ناپسند ہوتی ہے، زندگی بھر ٹوٹے پھوٹے، گرے پڑے، حقیر و کمتر الفاظ کو بھی اپنی فکر اور اپنے فن کے قریب رکھے، تاکہ ان سے جوش کی خواہش، ضرورت، اور منشا کے مطابق شاعری میں ایک خوفناک، گھناؤنی فضا کو بنانے میں مدد ملے، منور بھی بہت ہی معمولی سے شبدوں کو یکایک اٹھا کے برت لیتا ہے مگر اس طرح کہ پھر وہ معمولی نہیں رہتے۔ منور کی شعری لفظیات میں نئی طرح کے زاویاں بھی ملیں گی جس کی سبب کسی نئے خیال کی اردھانگنی غزل کی آبرو بچا رہا
میں اس مضمون کو یہیں اپنے شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

مجھکو ایسا لگتا ہے اب کوئی مجھے لے کے جاتا ہے!
شبدوں میں لفظوں کو جوڑ کر اکثر ... کا پستا کرو

غزل گاؤں کا باسی

احمد ابراہیم علوی

گزشتہ پانچ چھ برسوں میں ابھر کر سامنے آنے والے شاعروں میں جنھوں نے توجہ حاصل کی ہے [illegible] ان میں ملک کے منور رانا کا نام نمایاں ہے۔ منور رانا کا لہجہ اپنے ہم عصروں سے مختلف ہے۔ ان کا موضوع اور بیان بھی دو [illegible] شعر ادا ہوا کرتا ہے۔ یہ بات چونکا دینے والی ہے جس کے سبب منور رانا کی طرف نظریں اٹھتی اور ٹھہرتی ہیں۔ منور رانا بڑے شہروں کی مجبوری رونقوں کو حقارت سے دیکھتے ہوئے گاؤں کی فضا پر اپنے تصور زندگی میں سچے تصور کی تلاش اپنا [illegible] نظر رکھتے ہیں۔ یہ یقیناً ان کا منصب ہے کیونکہ وہ کلکتہ جیسے بڑے شہر کے رہنے والے ہیں جہاں انسانوں کا ایک ایسا جنگل ہے جہاں درد، کرب، گھٹن، بیماری، بھکمری، لاچاری، بے حسی اور چھین جھپٹ [illegible] ہے لیکن انسانی ہمدردی، مروت، محبت اور امن و سکون نابود ہے۔

منور رانا کے ارادے بڑے نیک، عزائم پرحوصلہ، اور منصوبے لائق تحسین ہیں۔ ان کا مشاہدہ گہرا اور [illegible] حقیقت قابل رشک حد تک انہیں حاصل ہے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے ایسا لگتا ہے جیسے ان کا مطالعہ [illegible] کے منظر پیدا ہوتا ہے

تیرے شہر میں بھی رہ کر برا بھلا کرتا تھا
وہ کلیجہ چیر کے اپنے شہر کا منظر یاد کرتا تھا

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

پھول سے بدن والے ہماری روایتی شاعری میں بڑے ستمگر اور ناز نخرے والے ہوتے ہیں لیکن منور رانا نے اپنے وسیع اور صحیح مشاہدے سے ان کو مظلوم اور جفاکش دیکھا ہے۔ اور اس طرح پیش کیا ہے کہ اب ان پر ترس آتا ہے۔ اسی طرح بچوں کی مفلوک الحالی پر بھی وہ بڑی خوبی سے اظہار خیال کرتے ہیں جیسے ؎

بستے کی جگہ پیٹھ پہ جو بوجھ لئے ہو ۔۔۔ ان بچوں میں بچوں کی ادا بھی نہیں ملتی

منور رانا غزل اور گاؤں دونوں کے دلدادہ ہیں۔ اس لئے وہ غزل کی شہری تہذیب کو گاؤں سے جاکر ملا ایک ایسا ماحول پیدا کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ جس میں گاؤں کی صداقت، خلوص، اور دیت رواج کے ساتھ ادب و لحاظ بھی بقدر ضرورت شامل ہے۔ غزل کو گاؤں کا پس منظر عطا کرنے والے منور رانا حیرت انگیز حد تک اپنی کوشش میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں گاؤں کی گلیاں، مٹی کے مکان، ہرے بھرے درخت، درختوں کی ڈالیوں میں جھولے، پنگھٹ اور پنگھٹ پر گوریوں کی جمگھٹ، پھر سب سے بڑھ کر گاؤں کا اخلاص، بے کاری، بے بسی، رشتوں کا بھرم، اعلیٰ اور رشتوں کا پاس، انسانی قدروں کا احترام، وغیرہ سمایا رہتا ہے۔ وہ غزل کی لطیف تشبیہات و استعارات، اور رمز و کنایات کو سمجھنے پرکھنے اور برتنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ اس لئے وہ غزل کی زبان میں گاؤں کے مسائل پیش کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔

رانا کا انداز بیان نہایت صاف، سادہ لیکن دلنشیں ہے۔ آج کی سچائیوں کو غزل کے اشعار میں بخوبی پیش کرنے میں ان کو ملکہ حاصل ہے۔ ان کے اشعار میں حکایت بہ یار گفتن قطعاً نہیں۔ اس کے برعکس آج کے مسائل، کرب اور حقیقتیں پنہاں ہیں۔ دیکھئے ؎

ماں باپ کی بوڑھی آنکھوں میں اک فکر سی چھائی رہتی ہے
جس کمبل میں سب سوتے تھے اب وہ بھی چھوٹا پڑتا ہے

یا

شرم آتی ہے مزدوری بتاتے ہوئے ہم کو ۔۔۔ اتنے میں تو بچوں کا غبارہ نہیں ملتا

منور رانا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے کلام میں تصنع اور جھوٹی تسلیاں یا خود فریبی بالکل نہیں۔ وہ ایک کھرے اور سچے شاعر ہیں۔ اس لئے بے دھڑک حقیقتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی سیاسی بصیرت ان کو مصلحتوں سے معاہدہ کر لینے سے ہمیشہ باز رکھتی ہے۔ سچ کہنے میں ان کو کبھی کوئی عار نہیں ہوتی ؎

نہ جانے جرم کیا ہم سے ہوا ہے ۔۔۔ ہمیں قسطوں میں لوٹا جا رہا ہے

یا

اب اس پہ ہوگی کچھ مرہم نوازی ۔۔۔ ہمارا زخم دھویا جا رہا ہے

یا

بڑے شہروں میں قربانی کا موسم جبسے آیا ہے ۔۔۔ مرے بچے کبھی ہولی میں پچکاری نہیں لاتے

بندھے ہوئے ہیں مرے ہاتھ پشت کی جانب ۔۔۔ کہاں ہیں، آئیں پرانی عداوتوں والے

اس بے باکی سے غزل کو حقیقتوں کا ترجمان بنانا یقیناً قابل رشک و تحسین ہے۔ ایسے شاعر سے بے شک بڑی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

منور رانا کے پہلے شعری مجموعے "غزل گاؤں" میں بعض بعض ایسی غزلیں ملتی ہیں جو چونکا دیتی ہیں۔ کبھی کبھی تو یقین ہی نہیں آتا کہ کوئی نووارد نوجوان شاعر اس مشاقی و فنکاری کا بھی مظاہرہ کر سکتا ہے۔

ماں کی عظمت اور گاؤں کے باسی، ان کے ریت رواج، ان کا خلوص، صداقت اور پیار زندگی منور کے محبوب موضوعات ہیں۔ اور وہ کسی نہ کسی بہانے انہیں ہی کو موضوع سخن بنائے رکھتے ہیں۔ دیکھئے ؎

گھیر لینے کو مجھے جب بھی بلائیں آ گئیں ۔۔۔ ڈھال بن کر سامنے ماں کی دعائیں آ گئیں

لبوں پہ اس کے کبھی بد دعا نہیں ہوتی ۔۔۔ بس ایک ماں ہے جو مجھ سے خفا نہیں ہوتی

حادثوں کی گرد سے خود کو بچانے کے لئے ۔۔۔ ماں ہم اپنے ساتھ بس تیری دعائیں لے جائینگے

ہر سہولت تھی میسر لیکن اس کے باوجود ۔۔۔ ماں کے ہاتھوں کی پکائی روٹیاں اچھی لگیں

مقدس مسکراہٹ ماں کے ہونٹوں پر لرزتی ہے ۔۔۔ کسی بچے کا جب پہلا سپارہ ختم ہوتا ہے

ماں کی ممتا گھنے بادلوں کی طرح سر پہ سایہ کیے ساتھ چلتی رہی
ایک بچہ کتابیں لئے ہاتھ میں خامشی سے سڑک پار کرتے ہوئے

برباد کر دیا ہمیں پردیس نے مگر ۔۔۔ ماں سب سے کہہ رہی ہے کہ بیٹا مزے میں ہے

کیا جانے کہاں ہوتے مرے پھول سے بچے ۔۔۔ صدقے میں اگر ماں کی دعا بھی نہیں ملتی

ان اشعار کے مطالعے کے بعد یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ منور رانا وہ پہلے غزل گو شاعر ہیں جنھوں نے اپنے اشعار

یں ماں کو اس طرح موضوع بنایا ہے جس طرح محبوب کو بنایا جاتا غزل کی روایت رہا ہے۔ اس طرز نے منور کے اشعار بڑا پاکیزہ اور باوقعت بنا دیا ہے۔ یہ کوشش بڑی مستحسن اور قابل صد ستائش ہے اس طرح ماں کو لے کر جسے یں انہوں نے جن جذبات کا اظہار کیا ہے وہ بھی کچھ کم قابل تعریف نہیں۔

اپنی جنم بھومی گاؤں اور جنم داتا ماں سے والہانہ وابستگی کا اظہار منور رانا بڑے لطیف پیرائے میں کرتے ہیں شاید آگے چل کر یہی ان کی شناخت کا باعث بنے گا۔

گاؤں میں افلاس، بیکاری اور بھکمری کے باعث گاؤں سے لوگوں کی شہروں کی طرف مراجعت پھر مراجعت کا کرب اور بھولی بسری یادیں، اور افلاس کی باتیں جو گاؤں کے لوگ شہروں میں برسوں رہ کر بھی نہ بھول نہیں پاتے یہ سب منور کے محبوب موضوعات ہیں۔ اور وہ اپنے اشعار میں محاکات کی کرشمہ سازیوں کے ذریعے لوٹ دے کو گاؤں کی پگڈنڈیوں، کھیتوں، کھلیانوں، اور چوپالوں کی طرف کھینچ [illegible] کامیاب ہیں۔

منور کا لب و لہجہ جتنا جدید ہے۔ اتنا ہی دلکش اور اتنا ہی پاکیزہ ہے۔ وہ جدید فکر رکھتے ہوئے بھی تہذیبی روایات کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اعلیٰ تہذیبی روایات کی پامالی پر انہیں اظہار تاسف کرتے ہوئے بخوبی دیکھا جا سکتا ہے ؎

تلاش کرتے ہیں ان کو ضرورتوں والے   کہاں گئے وہ پرانی شرافتوں والے

مری تہذیب ننگی ہو رہی ہے   یہ آنچل گر کے اک دوپٹہ جارہا ہے

مفلسی اور اس کے سبب مجبوری اور بے بسی کا اظہار بھی منور رانا اپنے مخصوص انداز میں بڑے اچھے پیرائے میں کرتے ہیں ؎

ہمیں بھی پیٹ کی خاطر دانا ڈھونڈ لینا ہے   اس پیٹ بھرنے کو کانسے سے دانا ڈھونڈ لیا ہے

کھلونوں کے لئے بچے ابھی تک جاگتے ہوں گے   تجھے اے مفلسی کوئی بہانہ ڈھونڈ لینا ہے

میں کہ فرہاد نہیں باپ ہوں اک بیٹے کا   صرف روزی کے لئے کوہ کنی آجائے

وہ اک گڑیا جو میلے میں کل دکان پہ تھی   دنوں کی بات ہے پہلے میرے مکان پہ تھی

منور رانا کے کلام اور خصوصاً غزل کا "ماں" کے مطالعے کے بعد یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ ماں نے جو دعا کی تھی

سچا شاعر ۔ منوّر رانا

ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی

یہ تو یاد نہیں کہ منور رانا سے پہلی مرتبہ ملاقات کب ہوئی ۔ ذہن پر زور ڈالتا ہوں جب بھی وہ مبارک ساعت حافظہ کی گرفت میں نہیں آتی ۔ لیکن یہ یاد ہے کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے کی سعادت جناب والی آسی صاحب کے مکتبہ دین و ادب لکھنؤ میں حاصل ہوئی تھی ۔ یہ بھی یاد ہے کہ محض رسمی تعارف ہوا تھا ۔ اور میں بہت دیر تک ان کی بڑی بڑی آنکھوں کو دیکھتا رہا تھا ۔ اس طرح کی خوبصورت آنکھیں دیکھنے کو اب نہیں ملتیں ۔ دنیا جس طرح سائنسی ترقیات کے باوجود بے روح ہوتی جارہی ہے انسان کا ظاہری حسن بھی کم ہو رہا ہے ۔ میں بہت دنوں تک اس پر غور کرتا رہا کہ اس شخص کے سانولے رنگ اور موٹے ہونٹوں کے ساتھ ایسی بڑی اور پرکشش آنکھوں کی کیا ضرورت تھی ۔

اس کے کچھ دنوں بعد شاعر منور رانا سے ملاقات ہوئی تو بہت سی گرہیں خود بخود کھلتی چلی گئیں ۔ اب تک جس کی آنکھوں کی خوب صورتی جاذب نظر تھی ۔ شعر سننے کے بعد اندازہ ہوا کہ ۔۔۔ نے اپنی ان آنکھوں کی پاکیزگی کو بھی قائم رکھا ہے ۔ ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اس راز کو سمجھ لیا ہے کہ خدا نے یہ آنکھیں صرف دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے مظاہر دیکھنے سمجھنے بلکہ ان کو اپنے اندر جذب کرنے کے لیے عطا کی ہیں ۔ منور اگر شاعر نہ ہوتے تو ان کی آنکھوں کے ساتھ ظلم ہوتا ۔ اور ان کی شخصیت ادھوری رہ جاتی ۔ وہ بانکے جوان ہو سکتے تھے ۔ اپنی آنکھوں کے ڈورے ڈال سکتے تھے ۔ دوسروں کو اپنا گرویدہ بنا سکتے تھے یہ سب وہ اب بھی کرتے ہیں ۔ لیکن شاعر ہونے کی صورت میں ان کی شخصیت کی تکمیل میں جو خلا رہ جاتا اس کو کیسے پورا کیا جاسکتا تھا ۔

میں نے اکثر دیکھا ہے کہ شعر سناتے وقت پوری شاعرانہ کیفیت ان کی آنکھوں میں سمٹ آتی ہے ۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ مشاعروں میں پڑھتے ہوئے اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھا دیتے ہیں ۔ وہ عوام سے داد کی بھیک نہیں مانگتے ۔ اور پیشہ ورانہ حرکات سے انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے ۔ ممکن ہے اس بات کو خود منور نے محسوس نہ کیا ہو لیکن میں نے اکثر اس کا مشاہدہ کیا ہے اور اسی کے بعد یہ لگا ہے کہ اس بنیادی کے باوجود وہ شعر کے کاندھوں اٹھائے گئے ہیں ۔ اور مشاعروں کی محفل منور ہو گئی ہے ۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ خاموش بیٹھے ہیں۔ منہ میں پان "اوورلوڈ" (OVER LOAD) ہوا ہے یا بے تکلف گفتگو کر رہے ہیں۔ اور کہیں سے ان کے شاعر ہونے کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی ظاہری ساخت سے وہ اس کا یقین بھی نہیں دلا سکتے۔ لیکن جب وہ شعر سناتے ہیں تو اچھے اچھے شعر کہنے والے بھی دم بخود رہ جاتے ہیں مجھے خود اس کا یقین نہیں تھا۔ لیکن جب میں نے ان کی شخصیت کو دیکھا سمجھا بلکہ پڑھنا شروع کیا تو مسلسل ان کے شعر سننے کو ملے تو اندازہ ہوا کہ شاعری میں اسی طرح کے کچھ امکانات کے پیش نظر رشید صاحب نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا تھا۔ یہ بات جس وقت کہی گئی تھی اس کو بیس برس سے زائد ہو چکے ہیں۔ اس درمیان غزل نے اپنا سفر بھی جاری رکھا ہے۔ اور اسی درمیان ہماری اردو تنقید میں نئی غزل کی اصطلاح رائج ہوئی۔ اور دیکھتے دیکھتے نئی اور پرانی غزل کی بحث نے طول بھی پکڑا۔ اور شدت بھی اختیار کی۔ نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ یہ بحث جتنی بے مطلب تھی اور ہے اس کا اندازہ نقادوں نے بھی کیا ہے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کے سلسلے میں بھی یہی رویہ سامنے آتا ہے نئے اور پرانے افسانے پر گفتگو ہوتی ہے۔ تو اسی طرح کی خود ساختہ اصطلاحات معیار قرار دیا جاتا ہے۔

مختصر سی بات یہ ہے کہ اصل معیار شاعر کا نظریۂ فکر و فن ہے۔ اس کا احساس و شعور ہے۔ اس کی یہ کیفیت ہے کہ اس نے اپنے دور کے حالات کو کس حد تک اپنے فن میں سمویا ہے اس کی آنکھوں نے کتنی دور تک اور کتنی گہرائی میں جھانک کر دیکھا ہے۔ کتنے دلوں کی دھڑکنوں کو اپنے کانوں سے سنا ہے۔ دوسروں کے جذبات اور احساسات کو کس حد تک اور کس طرح اپنے قلب و نظر سے ہم آہنگ کیا ہے۔ دوسروں کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو موتی کے دانے کی طرح چن چن کر محفوظ کیا ہے۔ اور انہیں اپنی تخلیق کا موضوع بنایا ہے۔ کسی تخلیق میں اگر یہ چیزیں نظر نہیں آتیں تو وہ چاہے قدیم ہو یا جدید۔ ترقی پسند ہو یا جدیدیت کے علمبردار۔ غزل نئی ہو یا پرانی، اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں بنتی۔

منور رانا نے اپنے ذہن کو اس طرح کے مباحث سے ہمیشہ الگ رکھا ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ ان کی شاعری پر نظریات کا کوئی لیبل نہ لگایا جائے۔ اسی لئے انھوں نے قصۂ جدید و قدیم سے خود کو بے نیاز کر کے اپنے طرز نگاہ اور نفس کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ اصطلاحات اور نظریات کی روشنی میں جو لوگ سفر کرتے ہیں۔ وہ زندگی بھر ریا من میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور جو دل کی روشنی میں چلتے ہیں وہ خود بھی پرسکون رہتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی راحت پہونچاتے ہیں مجھے بارہا اس کا احساس ہوا ہے کہ بہت سوچ سمجھ کر منور شعر اس طرح کہتے ہیں کہ وہ ان کی ذاتی جاگیر ہونے کے باوجود سننے والے کو ایک کیفیت میں مبتلا کر دیں۔ اور اس پوری عمارت کو اپنی کہہ سکیں جو اس شعر میں تعمیر کی گئی ہے۔

وہ اپنے کاروبار کے لحاظ سے ایک بڑے سرمایہ دار ہیں۔ اور پورے ملک میں ان کے ٹرانسپورٹ کا کام ہے۔ دنیاوی عزت و وقار حاصل ہے۔ اور دور جدید کی ہر آرائش اور شہرت بھی۔ لیکن منور نے اپنے آپ کو سرمایہ داری کی ان لعنتوں سے محفوظ رکھا ہے جن کے پیش نظر لینن نے خدا کے حضور میں یہ خواہش کی تھی کہ اس کا

ڈوب جائے۔ منور نے اپنی ذاتی زندگی اور ذہن کو اس سے الگ رکھا اور اسے اپنی شخصیت پر مسلط نہیں ہونے دیا۔ بلکہ اس کے بہتر عمل کے باوجود اس سیلاب کو اپنی قابو میں رکھا جو آتا ہے تو سیرت اور شخصیت سب کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے۔

جگر نے ایک مرتبہ طنزاً کہا تھا کہ لوگ جھونپڑیوں میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھتے ہیں۔ ہم ترقی پسند محلوں میں رہ کر جھونپڑیوں کا خواب دیکھتے ہیں۔ یہ بات ترقی پسند تحریک کے سلسلہ میں صحیح ہو یا غلط۔ ظاہر ہے اس ایک جملے سے پوری تحریک کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ منور رانا کو اس دور میں محل نہ سہی بہت آرام دہ زندگی کے سارے مواقع میسر ہیں لیکن اس کے باوجود اپنے اشعار میں متوسط طبقہ کی زندگی کے مسائل کو پیش کرنا اور انہیں اپنا پسندیدہ موضوع بنانا صرف اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ منور ترقی پسند شاعر ہے۔ بلکہ یہ طرزِ فکر اس امر کی دلیل ہے کہ شاعری میں اپنی آنکھوں کو اوپر اٹھائے رکھنے والا یہ بھی جانتا ہے کہ اپنی راحت کے ساتھ ساتھ زمین پر بسنے والی تمام مخلوق کی مشکلات کو بھی سمجھتے رہنا ضروری ہے۔

اس طرزِ فکر نے منور کو مشاہدہ فطرت، انسانی نفسیات کا شناسا اور اسی انداز نظر نے انہیں ایک دردمند اور غم خوار شاعر بنا لیا ہے۔

منور نے زندگی کا مشاہدہ کرنے کے لیے سب سے پہلے اپنے گھر آنگن کا انتخاب کیا جہاں انہیں کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ماں کے روپ میں نظر آئی ؎

لبوں پہ اس کے کبھی بد دعا نہیں ہوتی
بس ایک ماں ہے جو مجھ سے خفا نہیں ہوتی

ترقی یافتہ دنیا کے ذہن سے یہی حقیقت اوجھل ہوتی جا رہی ہے اور مادیت کا سیلاب اس روحانیت کو سمیٹتا جا رہا ہے۔ مغرب پہلے ہی اس روشنی سے محروم ہو چکا تھا۔ مشرق کو اپنی اس تہذیب پر ناز تھا۔ اور وہ اس کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ مغرب میں تہذیبیں ننگی ہوتی گئیں۔ نظریات برہنہ ہو کر الجھتے جا رہے ہیں۔ دلوں کی دنیا ویران ہو رہی ہے۔ عشق کے آتش کدے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ حسن محروم ہو رہا ہے۔ انسانی بصیرت کم ہو رہی ہے۔ اخلاقی سطح کمزور ہو رہی ہے۔ انسانی رشتے بے وقعت ثابت ہو رہے ہیں۔ اور ان سب کے باوجود مغرب میں علم و ہنر کی روشنی بڑھتی جا رہی ہے۔ دنیا پھیلتی جا رہی ہے۔ انسان خلاؤں کی سیر کر رہا ہے۔ تہذیب اور اخلاق کی سطح کمزور ہونے کے باوجود مغرب کی سب نگاہوں میں مہذب بلکہ معلم اخلاق بنا ہوا ہے۔ تو مشرق نے اس صورت حال کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے اندر بھی تبدیلی کی ضرورت محسوس کی۔ مشرق اور مغرب مادیت اور روحانیت جو ایک دوسرے کے مد مقابل سمجھے جاتے تھے۔ وہ آپس میں گڈمڈ ہونے لگے۔ فراق نے سوال کیا تھا تہذیبیں کیوں غروب ہو جاتی ہیں۔ یہ سوال ہر دور میں اہم رہا ہے

اور ہمیشہ اس کا جواب فلسفیانہ طور پر دیا گیا ہے۔ اور اس کے مختلف رموز بیان کیے گئے۔ لیکن یہ حقیقت نظرانداز کی گئی کہ تہذیب اپنی انفرادیت سے اجتماعی شکل اختیار کرتی ہے۔ اگر اس کی انفرادیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ تو ساری دنیا میں اس کے لیے کچھ بھی کیا جائے اسے بچایا نہیں جا سکتا۔ مغرب اور مشرق کی آویزش کو دیکھتے ہوئے اقبال نے کہا تھا ؎

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

منور کا کلام دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں مشرق کی روایات اور اس کی روحانیت کا تقدس عزیز ہے۔ انہیں اپنی وہ تہذیب بھی پیاری ہے جو آج کی مہذب دنیا کے لیے ناقابل قبول ہے بلکہ معاشرہ میں اسے غیر ترقی یافتہ کہا جاتا ہے ؎

مری تہذیب ننگی ہو رہی ہے　　　　یہ اڑ کر ایک دوپٹہ جا رہا ہے

یہ بات خود منور کو بھی معلوم ہے اور وہ اپنے کاروبار میں اس کا ہر لمحہ اندازہ کرتے ہوں گے۔ وہ اعلیٰ سوسائٹی کے تقاضے بھی پورے کرتے ہیں۔ لیکن اس طرح کہ اس سے دل کی عظمت پر کوئی حرف نہ آ سکے۔

ماں کا تصور ان کی شاعری میں مختلف انداز اور مختلف زاویوں کے ساتھ آیا ہے۔ یہ صرف ایک سعادت مند بیٹے کی تصویر نہیں ہے۔ بلکہ اس سے ایک تہذیبی پیکر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ جس میں ماں کی حقیقت سب سے زیادہ روشن، سب سے زیادہ فکر انگیز اور سب سے زیادہ دل آویز نظر آتی ہے۔ منور نے یہ دیکھتے ہوئے کہ اس طرح کی حقیقتیں موجودہ دور کی بے حسی کی نذر ہوتی جا رہی ہیں۔ اپنی انفرادی تہذیب کو باقی رکھا ہے۔ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ مستقبل اس کی اجتماعی شکل پیش کرے گا۔ اور وہ زیادہ خوب صورت اور پورے معاشرہ اور سماج کے لیے زیادہ مسرت اور عافیت کا باعث ہوگی ؎

یہ سوچ کے ماں باپ کی خدمت میں لگا ہوں　　　　اس پیڑ کا سایہ مرے بچوں کو ملے گا

بہت دن ہوئے جب منور نے اپنا یہ شعر سنایا تھا ؎

بھٹک سے تو ہو کر ابھی گاؤں کو واپس چلو　　　　شہر میں رہنے سے یہ بچہ بُرا ہو جائے گا

تو مجھے یاد ہے کہ میں کافی دیر تک خاموش رہ گیا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک برابر اس طرح کے شعر سنتا رہا ہوں جن میں گاؤں، مزدور، بیل گاڑی، جھولا، کچی سڑک، اور کار، فون، کلینڈر، مفلر، کبوتر، کمبل کا ذکر تھا۔ منور جب اس طرح کے شعر سناتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ کلکتہ جیسے خود غرض شہر میں رہنے والا یہ سوداگر شاعر اپنی آنکھوں سے ان گھڑیوں کو کیسے دیکھ لیتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اسے کیسے اس کی خبر ہوتی ہے کہ ؎

ماں باپ کی بوڑھی آنکھوں میں اک فکر سی چھائی رہتی ہے　　　　جس کمبل میں سب سوتے تھے اب وہ بھی چھوٹا پڑتا ہے

اس نے کیسے اس کیفیت کو محسوس کیا ہے

کھلونے کے لیے بچے ابھی تک جاگتے ہوں گے تجھے اے مفلسی کوئی بہانہ ڈھونڈ لینا ہے

اور یہ سوال کیسے اس کے ذہن میں آیا ہے

کس دن کوئی رشتہ مری بہنوں کو ملے گا کب نیند کا موسم مری آنکھوں کو ملے گا۔

اور یہ حسرت آمیز شعر منور نے کیسے کہا ہے

کبھی کھلونے کبھی آنگن میں دکھائی دیتے کاش ہم بھی کسی بچے کو مٹھائی دیتے

اس طرح کے سوالات منور کی شاعری میں اکثر سامنے آتے ہیں۔ ان اشعار کی ظاہری چمک دمک سے علاوہ ان کا معنوی حسن ان کے اندر کی کیفیتیں اور ان کا والہانہ پن ذہن کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔ میں اسے محض شاعری بھی کہہ سکتا تھا۔ اور قدرت کلام بھی۔ اور اگر صرف یہی بات ہوتی جب بھی ان کے وقار کو کمی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے کہ شعر کے لیے ضروری نہیں ہے کہ اس کے اندر جو کیفیت ہے وہ شاعر کی شخصیت میں بھی موجود ہو۔ تخلیقی ذہن جانے کہاں کہاں سے کیا کیا ڈھونڈ کر لاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے نتیجے میں شعر و ادب کا جو سرمایہ وجود میں آیا جس نے بڑی حد تک عوامی جذبات و احساسات کی ترجمانی کی۔ اس کے افکار کی توانائی میں بھی سوز دروں نہیں۔ بلکہ فلسفہ اور آئیڈیالوجی کا دخل زیادہ تھا۔ نظریات کا گلشن اس طرح سنوارا اور سجایا گیا کہ اس کا ہر گوشہ راحت جاں بن گیا۔ اسی طرح جدیدیت کی وہ تحریک جو بڑی بلند آہنگی سے سامنے آئی ہے جس میں انسان کی بے چہرگی اور زندگی کی شکست و ریخت کا مرثیہ اور المیہ شامل کیا گیا ہے۔ اس میں بھی اس دور کا مشینی انداز نظر آتا ہے نئی اصطلاحات اور علامتوں کے ذریعہ بات کہنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور عام طور پر قلم سے دل کا رشتہ جوڑا جاتا ہے۔ یہ شاعر کا کمال فن ہوتا ہے کہ وہ اپنے قلم سے دل کی دھڑکنوں کو سنتا بھی ہے۔ اور تخلیق کائنات کو شمار بھی کرتا ہے۔

منور انا کے متعلق بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے اور انہیں اس سے مستثنیٰ کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ بھی جو کچھ کہتے ہیں اس میں خود ان کا دل نہیں دھڑکتا۔ بلکہ ان کا شاعرانہ ذہن ان کیفیتوں کو اپنی گرفت میں لیتا چلا جاتا ہے۔ میں جب تک ان کے اشعار سنتا رہا اور ان کی ذاتی شخصیت کو دیکھا اور سمجھا نہیں تھا۔ ان کے متعلق میرا یہی تصور تھا لیکن جب میں نے دیکھا کہ چائے لانے والا بچہ غریب بچہ اپنی پیالیوں اور پیسوں کے ساتھ اپنی ہچکیوں کے پیسے بھی لے گیا اور منور بہت غور سے اس بچے کو دیکھتے رہے۔ اور پھر دیر تک نہ صرف اس کے متعلق بلکہ اس کے ماضی حال، اور مستقبل اور اس دور کے متعلق باتیں کرتے رہے جس میں وہ بچہ پرورش پا رہا ہے تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس شخص کے اشعار میں دلوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی جو آواز آتی ہے۔ وہ اس کے اپنے دل کی آواز ہے۔ جو آنسو چمکتے ہیں وہ بھی اس کے اپنے ہیں۔ جس کرب اذیت اور المناکی کا تصور ابھرتا ہے ان کا اس کی [illegible] زندگی سے گہرا

تعلق ہے۔ اور صوری نہیں بلکہ حقیقی طور پر ان کی شاعری اس کی شخصیت سے ہم آہنگ ہے وہ شخصیت نہیں جو ٹرانسپورٹ کے ایک بڑے دفتر میں ہوائی جہاز کی پروازوں میں نظر آتی ہے۔ بلکہ وہ شخصیت جو اس نے اپنے دل کے نہاں خانے میں چھپا رکھی ہے جس سے منور کی کبھی ملاقات بھی نہ ہوئی ہو۔ اس لیے کہ ان کا یہ طرز عمل شعوری نہیں غیر شعوری ہے۔ یہ ان کی طبیعت اور مزاج کی فطرت معصومیت شرافت اور ذہنی پاکیزگی کا مظہر ہے۔ منور کے لیے یہ قدرت کا انعام ہے۔ ان کی سرمایہ داری اور ان کا پھیلا ہوا کاروبار مبارک ہے۔ اس کی اونچی سطح پر پہنچ کر جب شخصیت مستی ہو جاتی ہے منور کا چہرہ تابناک اور ان کی آنکھیں روشن نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعری میں ان کا کاروبار نہیں۔ بلکہ ان کے کاروبار میں ان کی شاعری نظر آتی ہے۔ اور اسی لیے جب میں نے ان کا یہ شعر سنا ؎

ہمیں مزدوروں کی محنت کشوں کی یاد آتی ہے
عمارت دیکھ کر کاریگروں کی یاد آتی ہے

تو ایک لمحہ کا توقف کیے بغیر اس اعلان حق پر یقین آ گیا اور کئی دنوں تک سوچتا رہا کہ اس شخص نے زندگی کی سچائیوں کو کتنی گہری نظر سے دیکھا ہے۔ اور اس کی حقیقتوں کو کتنی ایمانداری کے ساتھ اپنے اندر جذب کیا ہے۔ حالانکہ زندگی کی قدریں، وضع داریاں، اور پاسداریاں روایتیں اور حکایتیں جتنی تیزی سے تبدیل ہو رہی ہیں۔ ان کی زد میں آ کر سچائیاں قربان ہو رہی ہیں۔ حقیقتیں خواب بنتی جا رہی ہیں۔ انسان مجسم مشین ہو چلا ہے۔ منور کا یہ شعر ؎

گفتگو فون پہ ہو جاتی ہے رانا صاحب
اب کسی چھت پہ کبوتر نہیں پھینکے جاتے !

اسی تبدیلی کا مظہر ہے۔ فون اور کبوتر کے الفاظ نے بظاہر اس شعر کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ لیکن اس میں مادی تبدیلیات کی جو نشاندہی کی گئی ہے اس پر غور کیا جائے تو اندازہ ہو سکتا ہے۔ مادی ترقیوں کے دباؤ سے زندگی اپنے مقام سے ہٹتی جا رہی ہے بقول رشید احمد صدیقی حقیقتیں ٹکراتی ہیں تو ٹریجڈی وجود میں آتی ہیں۔ منور کی شاعری میں اس طرح کی ٹکراہٹ بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ٹریجڈی بھی۔

مجموعی طور پر ان کی شاعری میں جو فضا بنتی ہے اور جو مجموعی تاثر ابھرتا ہے زندگی سے اس کا تعلق بہت گہرا اور پائیدار ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ نئی غزل کا جو تاج محل تیار ہو رہا ہے اس کے معماروں میں منور کا نام اہمیت حاصل کر رہا ہے۔ ان کا اصرار ہے کہ ان کی شاعری پر کوئی لیبل نہ چسپاں کیا جائے۔ اور انہیں کسی نظریے کا پابند نہیں سمجھا جائے۔ میں نے شروع میں عرض کیا ہے کہ منور نے اس طرح کے مباحث

سے خود کو ہمیشہ الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے اشعار پڑھنے اور سننے کے بعد میری بھی یہی خواہش ہے کہ وہ اس طرح کی پابندیوں کو قبول نہ کریں۔ بلکہ کاروباری مصروفیات کے باوجود اپنی شاعری کا حق ادا کریں۔ جو اکثر سہنی ہو پاتا لیبل اور نظریات کی فکر نہ کریں۔ اقبال اور حسرت موہانی کو اشتراکی اور ترقی پسند ثابت کرنے کی مہم جتنے زور و شور سے چلی تھی۔ اس کا کیا انجام ہوا۔ قلم کی محنتیں بیکار ثابت ہوئیں۔ اور ان کا اصلی چہرہ جگمگاتا رہا۔

منور نے اپنی شاعری کو زندگی کا حقیقی ترجمان بنایا ہے۔ اس میں ان کا خلوص اور ان کے دل کی سچائی شامل ہے۔ ہوائی جہازوں میں اڑنے کے باوجود پیدل چلنے والوں کا جو احترام ان کے یہاں پایا جاتا ہے اور جیسے انہوں نے اپنی شخصیت اور شاعری کا شناخت بنایا ہے وہ اگر باقی رہ گیا اور یہی لب و لہجہ زندہ رہا تو مستقبل میں اردو غزل میں ان کا ایک مقام متعین ہو سکے گا لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ شاعری کو SIDE JOB نہ بنایا جائے۔ بلکہ اس کے تقاضوں کی پوری تکمیل کی جائے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ غزل منور سے بڑی امیدیں رکھتی ہیں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس کی امیدوں کو پورا نہ کریں۔

جی چاہتا ہے کہ ایک آخری بات بھی منور سے براہ راست کہہ دوں کہ صلاح الدین پرویز نے اپنی سرمایہ داری سے شعر و ادب کے ایوانوں پر جس طرح شب خون مارا ہے وہ اپنی شاعری اور شخصیت کو اس طرز عمل سے محفوظ رکھیں تو بہتر ہے مجھے تو ان کی وہی اداسی عزیز ہے جس کا سلسلہ خود انہوں نے میر کے

رانا کی شاعری میں دو بنیادی جذبات

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

منوّر رانا کی شاعری پر ابھی کچھ فیصلہ کرنے کا
ت نہیں آیا ہے اور نہ ہی یہ فیصلہ کرنا اب ممکن ہے چونکہ
ب تک اردو میں (گذشتہ سال ہندی میں اُنکی غزلوں
ایک مجموعہ شائع ہوا ہے) اُن کے کلام کا کوئی مجموعہ
سامنے نہیں آیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُن کی جملہ تخلیقات
مقدار بھی زیادہ نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ان کی تمام
لیقات، جو مختلف رسائل کے اوراق پر بکھرے ہوئے
یں، کو یکجا کیے جائیں تو بمشکل سَو صفحات کا ایک مجموعہ
شائع ہو سکے گا۔ ان کی عمر اب لگ بھگ ۳۵، ۳۶ برس
ہوگی اور شاعری کی عمر غالباً ۸ — ۱۰ سال۔ لیکن یہ
شی کی بات ہے کہ ماہنامہ "سہیل" گیا نے ابھی سے "ایک شمارہ
منوّر رانا کے نام" پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں
اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو ابھرتے ہوئے شاعر
ادب میں خیر مقدم کرنا ہوگا اور دوسرا خود منوّر رانا کے
ئے یہ "ایک شمارہ" اپنے آپ کو جاننے، پہچاننے
اور مستقبل کو سنوارنے کے لئے مفید ہوگا۔ لہذا
یل کا یہ اقدام قابلِ مبارکباد ہے۔

رانا سے کئی بار ملنے کا مجھے شرف حاصل ہے۔ اسلئے
بھی اس عظیم شہر کلکتہ کے باسی ہیں۔ جس شہر کے ایک
میں میرا بسیرا بھی ہے اور جو شہر اب میرا اور اُن کا
ہے۔ لیکن اس کے باوجود منوّر رانا کے آباو اجداد،
اور آبائی وطن، خاندانی حالات وغیرہ کا مجھے کچھ معلوم
نہیں ہے۔ کہہ نہیں سکتا کس گاؤں سے آکر وہ کلکتے
میں بس گئے ہیں۔ لیکن وہ کلکتے میں ہیں ——
کلکتے کی ہنگامہ خیز زندگی —— آدمی کتنا مصروف
ہے اس شہر میں۔ صبح سے شام تک نظروں کے سامنے
سے کتنے لوگ گزرتے ہیں۔ سینکڑوں اور لاکھوں لوگ،
سینکڑوں اور لاکھوں چہرے —— لیکن سب
سب دوڑتے ہوئے، بھاگتے ہوئے۔ کہیں سکون نہیں،
ٹھہراؤ نہیں، چین —— کس لئے بھاگ رہے ہیں یہ
لوگ، کہاں بھاگے جا رہے ہیں؟ دفتروں میں، دکانوں
میں بازاروں میں، کل کارخانوں میں —— کیوں؟
کس لئے؟ روٹی کے لئے، روپیوں کے پیچھے، دولت
کے پیچھے ——!

آدمی اس شہر میں ایک مشین بن چکا ہے۔ بے حس
مشین جس کا دل نہیں ہوتا، جو صرف ایک بٹن داب
دینے سے کھڑکھڑا کر، شور مچاتے ہوئے چل پڑتا ہے،
بھاگنے لگتا ہے اور اس وقت شور مچاتا ہے، بھاگتا
رہتا ہے، چلتا رہتا ہے، چکراتا رہتا ہے۔ جب تک
کوئی اور آکر اس کے بند ہونے والا بٹن نہیں داب
دیتا۔ بس یہی حال ہے یہاں انسانوں کا۔ ایسا لگتا
ہے کہ صبح صبح یہاں کے سینکڑوں آدمیوں کو دوڑتے

دوڑتے رہنے کو کوئی انجانا طاقت ور ہاتھ بٹن داب
دیتا ہو۔ اور لوگ اِدھر اُدھر دوڑتے رہتے ہیں، بھاگتے
رہتے ہیں، چکراتے رہتے ہیں، شور مچاتے رہتے ہیں۔ شور و
غل اور ہنگاموں کے اس شہر میں سکون کہاں؟ صبح سے
شام تک سینکڑوں قسم کی کان پھٹ آوازیں، موٹر،
ٹرام، بس، لوگوں کا ہجوم، گلی کوچوں، سڑکوں اور بازاروں
میں شور و غل، جلسے، جلوس، زندہ باد اور مردہ باد، کرنا ہوگا،
دینا ہوگا، نہیں چلے گا، نہیں چلے گا وغیرہ وغیرہ کے
فلک شگاف نعرے ـــ اور شور و غل میں اضافہ کرنے
کے لئے گلی گلی میں مندر کی گھنٹیوں اور باجوں کی گھنگھناہٹ
کے علاوہ مسجدوں کے میناروں پر لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکر،
جو اس شور و غل سے شہر میں گلا پھاڑ پھاڑ کر لوگوں کو
یہ یاد دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ آؤ یا خدا کبھی کرلو ـــ
ـــ لیکن سینکڑوں آوازوں میں مل جاتی ہیں
اور شور و غل میں محض مزید اضافے کا کام کرتی ہیں۔

آوازوں کے اس عظیم شہر میں آخر کون سی آواز
ہے جو ذہن میں دیر پا جسم کر رہ سکتی ہے؟ دماغ کے
رگ رگ میں سینکڑوں آوازیں ٹکرا کر اس طرح گھل
مل گئی ہیں کہ کسی کے جداگانہ وجود کی تلاش مشکل ہے اور
اب ذہن کے کسی گوشے میں کسی آواز کو پکڑے رکھنے کی صلاحیت
باقی نہیں ہے؟ بس جس طرح شہری زندگی کے ہنگاموں
سے بھاگ کر چند لوگ سیر و تفریح کے لئے دیگھا یا جوہو
میں سمندر کے کنارے دو چار دن سکون کی تلاش میں چلے
جاتے ہیں یا پھر دارجلنگ یا کشمیر کی پہاڑیوں میں سکون
کی تلاش میں جاتے ہیں تاکہ ماحول بدلے، ہنگاموں سے
ایک دو دن دور رہیں، بالکل اسی طرح سینکڑوں لوگ
اپنے آپ کو کچھ دیر بہلانے کے لئے سنیما ہال یا تھیٹر ہال
میں گھس جاتے ہیں اور ان ہالوں میں کچھ دیر بیٹھ کر اپنے
کو بہلانے کی کوشش کرتے ہیں اور جب ان ہال گھروں
سے باہر نکل کر پھر سے سڑکوں پر آتے ہیں تو بھول جاتے
ہیں کہ انھوں نے کیا دیکھا، کیا سنا؟ دانشوروں کا وہ
طبقہ جن میں پڑھنے کی عادت ہے، وہ پڑھتے ہیں، افسانے
ناولیں اور کلام۔ اور جب تک اوراق کے حروف پر نظریں
دوڑتی رہتی ہیں۔ مختلف کردار و واقعات ذہن کے
پردے پر اُبھرتے ڈوبتے رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح
جس طرح پردہ فلم پر آپ کرداروں کو چلتے پھرتے دیکھتے
ہیں ـــ پھر کتاب بند، ذہن کے دریچے بند ـــ
جس طرح چند دنوں سمندر کے کنارے کہیں سیر و تفریح
کے بعد جب آپ گھر لوٹ آتے ہیں تو چند دنوں تک
لوگوں سے آپ سمندر کی فرحت بخش لہروں کا ذکر کرتے
ہیں اور پھر سب کچھ بھول جاتے ہیں اور شہر کے ہنگاموں
میں، زندگی کی دوڑ میں گم ہو جاتے ہیں۔ بالکل یہی حال
ہے افسانوں کا، ناولوں کا، شعر و کلام کا ـــ!

شہری زندگی سے راناؔ بھی بار بار گھبرا گئے ہیں۔ وہ دیگھا
گئے یا پوری یا دارجلنگ یا کشمیر مجھے علم نہیں لیکن جب کبھی
وہ شہری زندگی سے تھک گئے تو ان کو وہ پُرسکون گاؤں
یاد آیا جہاں وہ کبھی تھے یا گئے تھے۔ اور ان کے دل نے
اس گاؤں کی یادوں کو سمیٹ کر چند اشعار ڈھالے ہیں،
ایسے ہی چند اشعار ڈھالے ہیں ؎

ہم گاؤں میں جب تک رہتے تھے یہ سب منظر مل جاتے تھے
دو چار کنوئیں مل جاتے تھے دس بیس شجر مل جاتے تھے

تو اب اس گاؤں سے رشتہ ہمارا ختم ہوتا ہے
پھر آنکھیں کھول لی جائیں کہ سپنا ختم ہوتا ہے

سونے پنگھٹ کا کوئی درد بھرا گیت تھے ہم
شہر کی شور میں کیا تجھ کو سنائی دیتے

شہر میں ان کو روزگار ملا، روٹی ملی، دولت ملی، عزت
ملی، شہرت ملی۔ لیکن اسکے باوجود انھوں نے محسوس کیا
کہ یہاں خلوص کی کمی ہے، محبت کی کمی ہے، اخلاق کی

ہے — لہٰذا رانا کے کلام میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں شہری زندگی سے نفرت کا اظہار ہے ؎

روتے ہوئے بچھڑنے کی فصلیں چلی گئیں
شہروں سے اب خلوص کی رسمیں چلی گئیں

لہٰذا جب شہری زندگی سے نفرت کا یہ جذبہ ان کو خوب تڑپا گیا ہے تو ان کو کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ اس زندگی سے موت بہتر ہے۔ گاؤں میں اگر بھوکے رہ بھی جاتے تو کم از کم اخلاقی قدروں کو لئے ہوئے رہتے۔ ایسے ہی جذبے کا نتیجہ یہ شعر ہے ؎

بھیک سے تو بھوک اچھی گاؤں کو واپس چلو
شہر میں رہنے سے یہ بچہ بُرا ہو جائے گا

- - - - - -

آج ادب کی تخلیق بہت بڑی حد تک "بازار میں کھپت" یا بازار کی ضرورت (MARKET DEMAND) کو مدِ نظر رکھ کر کی جاتی ہے۔ اور عموماً نامی گرامی قلمکار آرڈر یا حکم کے مطابق (AS PER ORDER) لکھا کرتے ہیں۔ مثلاً کسی بڑے قلم کار کے انتقال پر جب کئی رسالے اس ادیب کی یاد میں خاص نمبر نکالنے کی تیاریاں کرتے ہیں تو قلمکار کو "آرڈر" ملتا ہے کہ وہ اس مرحوم فن کار پر "کچھ" لکھیں اور آج کے قلم کار آرڈر کو پورا کر دیتے ہیں۔ کسی فن کار کی برسی کا زمانہ آیا، صدی منانے کا زمانہ آیا۔ مثلاً غالب، اقبال، پریم چند، حسرت یا وحشت تو پھر سینکڑوں کتابیں اور رسائل کے "خاص نمبر" وجود میں آگئے۔ یا پھر کسی خاص موضوع پر کوئی سیمینار ہو اور لکھنے کی دعوت ملے۔ لہٰذا آج جو ۹۹ فیصد تخلیقات سامنے آتی ہیں وہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" کے اصول پر جنم لیتی ہے۔ اب یہی دیکھئے کہ منور رانا کے اشعار کو میں نے کئی بار سُنا اور پڑھا لیکن ان کے کلام پر اظہارِ خیال کرنے کی کوئی وجہ سامنے نہیں آتی اور نہ ہی میں نے ان کے کلام پر لکھنا مناسب سمجھا۔ لیکن آپ کا رسالہ "سہیل" نے منور رانا کے سلسلے میں ایک شمارہ نکالنے کی تیاری کی ہے تو منور رانا یاد آگئے — لیکن جب لکھنے بیٹھا ہوں اور لکھنے کا پس منظر بھی عرض کر چکا ہوں تو ایک دو سچی باتیں ضرور کہوں گا۔

منور رانا صبح سے شام تک اپنے کاروبار میں مگن رہتے ہیں ٹرانسپورٹ کا کاروبار ہے لیکن اس کاروبار کے باوجود رانا ایک شاعر بھی ہے اور کمال ہے کہ اس میں شاعر کا دل ابھی تک زندہ ہے۔ میں نے جہاں تک اس کے کلام کا مطالعہ کیا ہے اس شاعرانہ دل کی زندگی کی وجہ صرف دو چیزوں کو پایا ہے۔ اور ان دو چیزوں، ان دو قدروں، ان دو جذبات کو ہی میں ان کی پوری شاعری کی بنیادی اینٹ سمجھتا ہوں۔ یہ وہ بنیادی اینٹ ہیں جو شہر زندگی کے سینکڑوں ہنگاموں کے باوجود اپنی جگہ پر ٹھوس حقیقت بن کر قائم ہیں اور زمانے کی ہوا ان کو مٹا نہیں پائی ہے۔ دو جذبے جس کے نقوش ان کے دل و دماغ پر چھا گئے ہیں۔ اب مٹائے نہیں جا سکتے۔ جس طرح آکاش بیل کسی بلند و تناور درخت پر چھا جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ دو بنیادی جذبے ان کی شاعری پر چھائے ہوئے ہیں۔ اور یہ دونوں جذبے عظیم ہیں، مقدس ہیں۔ ان جذبوں نے ہی مسیکڑیال سے رانا کو شاعر بنا دیا ہے۔

ان دو میں ایک "ان کی ماں ہے" — ماں کی ممتا، ماں کا پیار، دامن مادر میں زندگی کا سکون، ماں کے دل میں اولاد کا درد، ماں کا سپنا، ماں کی تمنائیں، ماں کی دعائیں — ماں، جس کی محبت کا اس دنیا میں کوئی بدل نہیں۔ ماں جس کے قدموں تلے جنت ہے۔ رانا کے کلام میں ماں کا ذکر بار بار طرح طرح سے اور خوب خوب آیا ہے صرف چند اشعار دیکھئے ؎

حادثوں کی گرد سے خود کو بچانے کے لیے
ماں ہم اپنے ساتھ بس تیری دعا لے جائیں گے

گھیر لینے کو مجھے جب بھی بلائیں آ گئیں
ڈھال بن کر سامنے ماں کی دعائیں آ گئیں

لبوں پہ اس کے کبھی بددعا نہیں ہوتی
بس ایک ماں ہے جو مجھ سے خفا نہیں ہوتی

ماں کی ممتا گھنے بادلوں کی طرح سر پہ سایہ کئے ساتھ چلتی رہی
ایک بچہ کتابیں لئے ہاتھ میں خاموشی سے سڑک پار کرتے ہوئے

ہر سہولت تھی میسر لیکن اس کے باوجود
ماں کے ہاتھوں کی پکائی روٹیاں اچھی لگیں

کیا جانے کہاں ہوتے مرے پھول سے بچے!
ورثے میں اگر ماں کی دعا ساتھ نہیں ملتی

مقدس مسکراہٹ ماں کے ہونٹوں پہ لرزتی ہے
کسی بچے کا جب پہلا سپارہ ختم ہوتا ہے

والدہ دوسرا عظیم جذبہ ہے بچے اور بچپن کی یادیں ——
بچپن کا زمانہ بھی کیا خوب زمانہ ہے ——— بچے، معصوم بچے، شریر بچے، ضدی بچے، ہنستے کھیلتے بچے، بے فکر بچے، بچے جو لڑتے ہیں اور پھر کچھ دیر کے بعد لڑائی جھگڑا بھول جاتے ہیں، پھر مل کر کھیلنے لگتے ہیں، بچے جن کے دل صاف ہوتے ہیں، پاک ہوتے ہیں۔ بچے جو بڑوں کو زندگی کے لئے جدوجہد کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں بچے جو بڑوں کی آنکھوں کا تارا اور مستقبل کا سہارا ہوتے ہیں۔ بچے جن کا بچپن ہر بار اسے آپ کو تلاش کرتا ہے۔

——— آج کا بچہ جو کل کا جوان ہوگا، اس دنیا کا مالک بنے گا ——— وہ کیسا ہو، اسکے مستقبل کو سنوارنے کے لئے آج ہم کیا کریں؟ اس دنیا کو اس کے پروان چڑھنے اور خوشگوار زندگی کو گزارنے کے لائق بنا جائے، اس کے لئے ہمیں کیا کرنا ہوگا؟

یعنی بچے اور بچپن۔ یہ وہ دوسرا موضوع ہے جس کو میں رانا کی شاعری کا ایک اور ستون قرار دیتا۔ منور رانا نے اس دوسرے موضوع پر مختلف انداز سے مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے کے چند اشعار بھی دیکھئے ؎

کچھ کھلونے کبھی آنگن میں دکھائی دیتے
کاش ہم بھی کسی بچے کو مٹھائی دیتے

بستے کی جگہ پیٹھ پہ جو بوجھ لئے ہوں
ان بچوں میں بچپن کی ادا بھی نہیں ملتی

کھلونوں کے لئے بچے ابھی تک جاگتے ہوں گے
تجھے اے مفلسی کوئی بہانا ڈھونڈ لینا ہے

دکھ بزرگوں نے کافی اٹھائے مگر میرا بچپن بہت ہی سہانا رہا
دھوپ میں عمر بھر پیڑ جلتے رہے اپنی شاخیں ثمردار کرتے رہے

ہم ایک تتلی کی خاطر بھٹکتے پھرتے تھے
کبھی نہ آئیں گے وہ دن شرارتوں والے

تری گلی کو دیکھ کے آیا ہمیں خیال
ہم جیسے اس جگہ کبھی بچپن میں آئے تھے

یوں بجھا ہے چراغ یادوں کا
جب بھی بجلی نے کرب کے سائے

جیسے اکلوتا لال بیوہ کا
کسی موڑ سے دب کے مرجائے

مری سرشت میں شامل رہا ہے پھولوں سے
پتنگ ہاتھ نہ آئی تو اس کو پھاڑ دیا

جب ایک واقعہ بچپن کا ہم کو یاد آیا
ہم ان پرندوں کو پھر گھونسلوں میں چھوڑ آئے

میں وہ میلے میں بھٹکتا ہوا اِک بچّہ ہوں
جسکے ماں باپ کو روتے ہوئے مرجانا ہے

اب دو چار شعر اور پیش کرتا ہوں جن اشعار میں ماں باپ، بھائی بہن، بچہ، بچپن، یا بچپن کے کھلونے کا سہارا لیکر ماناسے کئی اچھے اشعار کہے اور اس طرح

ان دو بنیادی جذبات کے حسین ملاپ سے یا بطور استعارے ان کو استعمال کرتے ہوئے کئی خیالات کے پر باندھے ہیں۔

مثلاً ؎

کسی بچے کی طرح پھوٹ کے روئی تھی بہت
اجنبی ہاتھ میں وہ اپنی کلائی دیتے

وہ ایک شخص جو بچپن سے میرے گاؤں میں ہے
یہ جانتا نہیں کوئی کہ دیوتاؤں میں ہے

یوں ہی میں نے ترے آنچل کی تمنا کی تھی
جیسے بچّہ کوئی بادل کو پکڑنا چاہے

شرم آتی ہے مزدوری بتاتے ہوئے اپنی
اتنے میں تو بچّے کا غبارہ نہیں ملتا

غزل گاؤں کا باسی: منور رانا

شاہ نواز قریشی

کلکتہ ——— بنگال ——— دراز گیسوؤں کا نگر،
نذرل اور ٹیگور کا دیس ——— اپنی کھوئی شناخت ڈھونڈتے آگے
آگے مڑتے جائیے نہ۔ وہی کلکتہ جس کے ذکر پہ غالب نے
کہا تھا۔ اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے۔
یہیں اس کرب نے اظہار کا پیکر اختیار کیا تھا ؎

شرمندہ کیا جوہر بالغ نظری نے
اس جنس کو بازار میں پوچھا نہ کسی نے

پھر بہت دنوں بعد اسی نگر میں یہ المناک آواز بھی گونجی ؎

اس شخص کے غم کا کوئی اندازہ لگائے
جس کو کبھی روتے ہوئے دیکھا نہ کسی نے
(وکیل اختر)

اور ایک وہ شخص جسے برسوں سے نیند نہیں آئی تھی، اس کا
دکھ، اس کا پیڑا کیا تھی ؎

اک گونج ہے اور تشنگی حالات کے بھیتر
اِک بانگ ہے اور چیختی روحوں کے گلے ہیں
(مظفر حیدری)

دور، دور تک یادوں کے بھیڑ ہیں۔ بہت سارے نام
ہیں جو ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہوتے جا رہے ہیں......
پرویز شاہدی، ابراہیم ہوش، سالک لکھنوی، اعزاز افضل،
ڈاکٹر عبدالرؤف، ناظم الحسینی، ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹا
چاریہ، علقمہ شبلی ——— اور ڈاکٹر ظفر اوگانوی،
بدنام ظفر، مشکین انصاری، حمید عرشی ——— اور

رائٹرز کارنر......شمس الزماں، حسن اثر، حسن
عرفی، کمال اختر، اقبال کرشن ——— ثقلین حیدر
اور ظہیر انور..... فاروق شفق ——— اور ستیہ
جیت رے، مرنال سین، بھون شوم، انٹرویو،
CALCUTTA 71 ناموں کا سلسلہ ڈراموں کے شور میں ڈوبتا
ابھرتا...... چاروں طرف فلک بوس عمارتیں ہیں۔
——— دوڑتے بھاگتے لوگ ہیں۔ بسوں کی بھیڑ اور ؎

دو منزلہ بس کی اوپری منزل پر
اکثر میں توازن کھو دیتا ہوں
اک دوسرے شخص کی مدد ہی سے
پھر مجھ کو توازن مل پاتا ہے
(کلکتہ اور میں: دیپ رائے)

جلسے، جلوس، مظاہرے......اسپلینیڈ، ڈلہوزی،
رائٹرس بلڈنگ..... تحریکوں کا جوش، جذبہ اور کالج
اسٹریٹ ——— آمار نام، تمار نام، ویت نام
——— آمار پارٹی، تمار پارٹی، نکسل پارٹی۔
اور...... اور دراز گیسوؤں کی چھاؤں میں سلونے
رخساروں پہ بلا کی نمکینی...... چورنگی، میٹرو سینما،
وکٹوریہ میموریل کا پُرفضا ماحول...... سجا بنا اور
پُروقار پارک اسٹریٹ...... بے پناہ حسن، گلیمر اور
بلا کی جگمگاتی شامیں، محفلیں، تقاریب، ثقافتی پروگرام
اور رنگ برنگ کرتا ہوا ایک تیکھا اور بانکپن ———

Shatrughan Sinha of Calcutta نہیں جانے کب کیول اینگلس کا نوسکھیا اور پارعب شخص غزل نگاؤں کا باسی ہو گیا اور اسکے تیور یہ ہو گئے ؎

عشق ہے کام میرا، نام منور رانا
مجھ سے ملنا ہو تو بنگال کی جانب آنا

ٹراموں اور بسوں کے ہجوم کے بیچ رہتے ہوئے بھی گاؤں اسکے وجود سے الگ نہ ہو سکا ؎

تمہارے شہر کی رونقیں اچھی نہیں لگتیں
ہمیں جب گاؤں کے کچے گھروں کی یاد آتی ہے

گذر گئی ہے کچلتے ہوئے یہ بس جس کو
وہ شخص لوٹ کے کل گاؤں جانے والا تھا

یہ سوچ کے ابھی گاؤں کو واپس چلو
شہر میں رہنے سے یہ بچہ برا ہو جائے گا

روتے ہوئے بچھڑنے کی فصلیں جل گئیں
شہروں سے اب خلوص کی رسمیں چلی گئیں

غزل نگاؤں محض اظہار ذات کا نام نہیں ہے۔ اس میں دوسروں کے دکھ کا پرتو بھی نمایاں ہے ؎

نہ جانے کونسی مجبوریاں پردیس لائی تھیں
وہ جتنی دیر بھی زندہ رہا گھر یاد کرتا تھا

ہمارے ساتھ چل کر دیکھ لیں یہ بھی چمن والے
یہاں اب کوئلہ چنتے ہیں پھولوں سے بدن والے

کسی بچے کی طرح پھوٹ کے روتی تھی بہت
اجنبی ہاتھ میں وہ اپنی کلائی دیتے

بستے کی جگہ پیٹھ پہ بوجھ لئے ہوں
ان بچوں میں بچوں کی ادا بھی نہیں ملتی

گرانڈ ہوٹل کے سامنے، سڑک کے اس پار میدان میں جگہ جگہ بکتی ہوئی چاٹ ...... لوگ چاٹ کھا کر پتے پھینکتے ہیں تو ننگ دھڑنگ کالے کلوٹے بچے دوڑ کر ان پتوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ پتے جن کے ہاتھ لگ جاتے ہیں وہ انھیں چاٹ جاتے ہیں۔ جن کے ہاتھ نہیں لگ پاتے، وہ کوڑے کے ڈھیر میں تلاش کرتے ہیں ؎

ہمیں بھی پیٹ کی خاطر خزانہ ڈھونڈ لینا ہے
اسی پھینکے ہوئے کھانے سے دانا ڈھونڈ لینا ہے

غزل نگاؤں کے باسی کے لہجے میں اداسی بھی ہے اور کرب بھی۔ جگ بیتی اس میں آپ بیتی بن گئی ہے۔ غزل نگاؤں اس حقیقت کا بھی واضح ثبوت ہے کہ شعری اظہار کے لئے زبان کا سخت، مشکل اور ادق ہونا کوئی لازمی چیز نہیں ہے۔ غزل نگاؤں آسمان کا اتارا نہیں ہے۔ یہ معرفت کا ہے اور دھرتی ہی کی رسیدی، سادی، زبان میں کہی گئی جو عام آدمی کو خود سے جوڑتی ہے۔ کہیں کہیں لہجہ بڑا تیکھا بھی ہو گیا ہے، جس سے بے باز [illegible] والی کیفیت بھی پیدا ہو گئی ہے ؎

مشقت نے چہرے کی چمک چھین لی ورنہ
دو چار برس میں تو بڑھاپا نہیں آتا

بڑی مشکل سے لوٹی بارات ٹکتی ہے
بیاہ ہوکے بھی مجبور ہوتے ہیں دلہن والے
جو گھر والوں کی مجبوری کا سودا کر لیا ہم نے
ہمیں زندہ [illegible] کے [illegible] والے

۱؎ منور رانا کا شعری مجموعہ

منور رانا ۔ اچھے دوست

حبیب ہاشمی

میانہ قد، بھرا ہوا جسم، گول چہرہ، چمک دار صاف شفاف پیشانی، اور تیز روشن آنکھیں یہ ہیں سید منور علی ... دس سال پہلے میری ملاقات آج کے منور رانا سے اسی نام سے ہوئی تھی۔ ان دنوں منور شاعری تو کرتے تھے مگر اپنے کو خود ہی شاعر تسلیم نہیں کرتے تھے۔ دراصل یہ ان کی حد درجہ سادگی اور انکساری تھی۔ میں یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ان دنوں بھی وہ اچھے شعر کہتے تھے۔ اور ان میں شعر کہنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ ... بات ہے کہ ان میں خود اعتمادی نہیں تھی۔

ایک دن انہوں نے ایک لمبی نظم مجھے دی اور اصلاح دینے کو کہا۔ ہر چند کہ ان دنوں مجھے اپنی شاعری پر خود ہی اعتماد نہیں تھا تاہم میں نے وہ نظم لے لی اور دو تین دنوں بعد اپنی استعداد کے مطابق اصلاح کرکے واپس کر دی۔ منور رانا کی شرافت نفسی اور احسان مندی ہے کہ آج بھی وہ ملاقات گفتگو میں اس اصلاح کا تذکرہ کرتے ہیں۔

اس واقعہ کے بیان کرنے کا ماحصل یہ ہے کہ اس سے ان کے کردار کا ایک خوبصورت گوشہ سامنے آتا ہے کہ وہ اپنے سے سینئر لوگوں کی کتنی عزت کرتے ہیں۔ کچھ لوگ جو ان کے قریب کبھی نہیں آئے انہیں وریدہ دہن اور مغرور سمجھتے ہیں۔ منور دو ٹوک باتیں ضرور کرتے ہیں۔ مگر اس وقت جب کوئی ان کی انا کو ٹھیس پہونچاتا ہے یا انہیں چھیڑتا ہے۔ وہ خود یہ مصرعہ پڑھا کرتے ہیں ؎

وہ اگر ... یہ آنا تو میں جانے دینا

اس لئے انہیں گستاخ نہیں کہا سکتا۔ منور جب اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو وہ شرمندہ بھی ہوتے ہیں۔ مگر تاسف کا اظہار وہ اپنے خاص دوستوں میں کرتے ہیں۔

منور رانا مغرور ہیں۔ اس مغرور ہونے کا کوئی علاوہ ... صورت نہیں۔ جنھوں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے ان میں سے ایک میں بھی ہوں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ ان کی دوستی کسی نیک عمل کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے جزا کے طور

پر بخشی ہے۔ نہ میں دولت مند ہوں نہ میری کوئی سماجی حیثیت ہے نہ میری شخصیت میں کوئی ایسی بات ہے کہ منور رانا مجھ سے اس قدر محبت کریں۔ پھر بھی وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کبھی میری کسی بات کو ٹالا یا رد کیا ہو۔ میں نے تو یہی دیکھا ہے کہ زیادہ تر میری باتیں مان لی ہیں۔ کوئی بھی اہم کام کرنے سے پہلے مجھ سے اور رئیس انصاری سے جو ہماری تثلیث کا ایک رکن ہیں سے مشورہ ضرور کر لیتے ہیں۔ دل کی دھڑکنوں کی یکسانیت، ذہن کی مماثلت، اور انداز فکر کی یک جہتی کی بنیاد پر غیر شعوری طور پر تشکیل شدہ یہ تثلیث حبیب، رئیس، منور صرف کلکتے ہی میں نہیں بلکہ پورے ملک میں جانی پہچانی جاتی ہے۔ شہر کے بعض احباب کچھ دنوں اس غلط فہمی کے شکار رہے کہ ہم تینوں نے مل کر ایک گروپ بنا لیا ہے گروپ سازی میری طبع سے قطعی مختلف شئے ہے۔ گروپ تو بے صلاحیت اور نا اہل لوگ بناتے ہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم میں کوئی بھی نا اہل نہیں۔

منور رانا ایک اچھے انسان، ایک کامیاب شاعر اور بہترین دوست ہیں۔ اچھے انسان اس لئے کہ ان میں انسانی ہمدردی کے جذبوں کی فراوانی ہے۔ ان کا ماضی حال کے مقابلے میں کٹھن رہا ہے۔ اکثر وہ ماضی کے غاروں میں جھانکتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں اپنے دکھ بھرے دنوں کو بعض واقعات بیان کرتے ہیں۔ اس وقت وہ اپنے ابو سید انور علی کی جد و جہد، قربانی، اور عزائم کے تذکرے بڑے والہانہ انداز میں کرتے ہیں۔ جس شخص کا اپنے ماضی سے اتنا گہرا رشتہ ہو بلاشبہ وہ اچھا انسان ہے۔ چنانچہ وہ کسی کے دکھوں کا ماجرا سن کر بہت جلد متاثر ہوتے ہیں۔ اور اس کی مدد کرنے کے باوجود بھی اس کے بارے میں سوچ سوچ کر دیر تک اداس رہتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے انہیں محتاجوں اور مجبوروں پر ترس کھاتے ہوئے اور ان کی مدد کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس وقت ان کے چہرے پر اداسیوں کی پرچھائیاں، چمکدار صاف و شفاف پیشانی پر ابھری ہوئی لکیریں اور تیز روشن آنکھوں میں غموں کے گہرے بادل دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس وقت ان کے یہ اشعار کتنے سچے اور پاکیزہ لگنے لگتے ہیں اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ؎

بہت زخمی تھے اس کے ہونٹ لیکن ــــ وہ بچہ مسکرانا چاہتا تھا

بستے کی جگہ پیٹھ پہ جو بوجھ لئے ہوں ــــ ان بچوں میں بچوں کی ادا بھی نہیں ملتی

کامیاب شاعر اس لئے کہ منور رانا کی شاعری مبالغے سے کوسوں دور اور حقیقت سے قریب تر ہے۔ بہترین دوست اس لئے کہ ان میں دوست بنانے اور دوستی نبھانے کی تمام تر خصوصیات موجود ہیں۔ وہ یاروں کے یار ہیں۔ ان کی شخصیت بہت پیاری ہے۔ انہیں دیکھ کر دل نہ جانے کیوں خوشیوں کا گہوارہ بن جاتا ہے میرے خیال سے یہی کیفیت ان کے یہاں بھی اپنے دوستوں کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہوگی ـــــ کیونکہ "دل کو دل سے راہ ہوتی ہے"۔ وہ اپنی خارجی زندگی میں بہت سخت اور با اصول ہو سکتے ہیں۔ لیکن نجی زندگی میں بہت کھلنڈرے

دلچسپ اور غیر ذمہ دار آدمی ہیں۔ اپنے خسر صاحب سے تثلیث کے اراکین کا تعارف کراتے ہوئے کہنے لگے کہ ہم لوگ گہرے دوست ہیں ہم ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے اتنے ہوشیار کہ ایک مسجد میں ایک ہی صف میں جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد دعا کے وقت ایک دوسرے کی گولی سے محفوظ رہنے کی دعائیں مانگتے ہیں۔ "گولی" منور رانا کا ایجاد کردہ ایک خاص لفظ ہے جسے وہ دھوکہ بازی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

منور رانا دل کے بہت صاف اور زبان کے بہت سچے انسان ہیں۔ یہ ہمارا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ کوئی غلط کام کرکے زیادہ دیر چھپا نہیں سکتے۔ رئیس آنولوی کا کہنا ہے کہ منور رانا کو دوسروں کے شعر اور دوسروں کا راز افشا کرنے کا خبط ہے۔ ان تمام فروعی اور سطحی کمزوریوں کے باوجود وہ بے حد اچھے انسان اور بے پناہ کشش رکھنے والی شخصیت کے مالک ہیں۔

آج کل ہماری تثلیث میں دو اہم شخصیتوں کا اضافہ ہوا ہے۔ حکیم عبدالمجید، اور امجد جاں باز۔ حکیم عبدالمجید مخلص اور پیارے انسان ہیں۔ مگر لمحہ لمحہ ناراض ہونے والے۔ منور رانا حکیم صاحب سے بہت پیار کرتے ہیں۔ مگر پریشان بھی اسی طرح کرتے ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جس دن حکیم صاحب منور رانا یا ہم سب سے برہم نہ ہوتے ہوں۔ مگر نہ منور حکیم صاحب کے بغیر اپنا وقت کاٹ سکتے ہیں اور نہ حکیم صاحب منور کے بغیر خوش رہ سکتے ہیں۔

امجد جاں باز ہمارے شہر کے نہایت ہی نفیس اور شستہ ذوق رکھنے والے بہت ہی اچھے قوال ہیں ہمارا کہنا ہے کہ امجد اپنی سمت بھول کر غلط جہتوں پر رواں دواں ہیں۔ دراصل انہیں شاعر ہونا چاہیے تھا امجد کو اتنے اشعار یاد ہیں کہ آج کے دو مصرعوں کے شعراء پر ان کی ذہانت بہت بھاری ہے۔ منور رانا امجد کے بہت قریب ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ انہیں امجد کا شعری ذوق اور مزاج بہت پسند ہے۔ بعض ناعاقبت اندیش لوگ منور کی اس فعل کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ دراصل وہ منور کے اندر چھپے ہوئے ایک عظیم فنکار سے ناواقف ہیں۔ جسے ایر کنڈیشنڈ میں بیٹھ کر ادب برائے زندگی کے موضوع پر گفتگو کرنے والوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جو نام نہاد خود ساختہ پروفیسر شعراء سے دور رہ کر اپنے انفرادی پہلو کو بہرحال برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

آج کل ہماری ملاقاتیں کم ہوتی ہیں۔ اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے جب سے اپنی پرانی جگہ شیب پور کو چھوڑ کر کلکتہ آیا ہوں اداس اداس ہوں۔ مجھے اپنے ماضی کے دن، اپنی پرانی جگہ کا ماحول، اور بچھڑے بچھڑے ساتھیوں کی یادیں بہت آتی ہیں۔ اداس یادوں کی سوگ گوشوں میں اپنے بیتے ہوئے لمحوں کی بازگشت بہت غور سے سننے کی کوشش کرتا ہوں۔

ہم مہینوں ایک دوسرے سے نہ ملیں مگر ہماری محبتوں میں کبھی کوئی افتراق یا فاصلہ پیدا نہیں ہوتا۔ مہینوں بعد بھی ملتے ہیں تو ایسے لگتے ہیں جیسے ہر لمحہ ساتھ تھے۔

بلاشبہ یہ محسوسات اور کیفیات منور رانا کی محبتوں اور اخلاق حسنہ کی وجہ سے ہیں۔ منور رانا

[illegible]

منوّر رانا کی غزل : ایک تاثر

عرفان صدیقی

اگر شاعر کے کلام پر تاثر کا اظہار کرتے ہوئے صرف ایک جملہ کہنے سے کام چل سکتا تو میں کہتا کہ منوّر رانا کی شاعری ایک سادہ، بے ریا، اور حساس دل پر زندگی کی واردات کے اوّلین اور فطری ردّعمل کا سچا اظہار ہے۔ لیکن معاملہ یہ ہے کہ اس جملے کے معنوی خطوط میرے ذہن میں جس طرح روشن ہیں اسی طرح انھیں دوسروں پر واضح کرنے کے لئے کچھ اور باتیں کہنے کی بھی ضرورت ہے، سو ان سطروں کے وسیلے سے میں اس تاثر کو جو رانا کے شعروں نے مجھ پر واضح کیا ہے، اوروں تک پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ ایک ذاتی تاثر ہے اور اسی لئے اسکو اپنی نوعیت میں ویسا ہی ہونا چاہیئے جیسا خود اس شاعر کا تخلیقی ردعمل ہے۔ فطری اور بے تصنع۔

رانا کی غزلیں سن کر اور اُنکا مجموعہ پڑھ کر میرا پہلا احساس یہ رہا ہے کہ شاعر نے زندگی کے جن تجربوں کو برتا ہے اور جن حقیقتوں کا مشاہدہ کیا ہے ان پر اپنا ردّعمل اپنے اشعار میں پہلی، اصلی اور فطری شکل میں ظاہر کیا ہے۔ اس ردّعمل کو بے وجہ تراشے، بھلے یا بگاڑے بغیر۔ بظاہر یہ بات غیر اہم سی لگتی ہے لیکن ذرا سوچیے تو اس کے لئے بڑی شاعرانہ جرأت اور ہمت اور خود اعتمادی کی ضرورت ہوتی ہے۔

رانا کی غزلوں کے بیشتر اشعار تجربات اور واقعات پر اس اوّلین ردّعمل (INITIAL RESPONSE) کی مثال ہیں۔ جسے بہت دنوں سے غزل کی شاعری نظر انداز کر رکھا ہے۔ شاید شعوری طور پر کہ تہذیب کی طرح عصری شاعری میں بھی بہت سے لوگ اپنے اصل ردّعمل کو چھپانا اور اس کی شکل بدل کر اسے سجا سنوار کر پیش کرنا کمالِ ہنر سمجھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ زندگی کی طرح شاعری سے بھی جذبوں کی تازگی، سادگی اور سچائی کا حسن کم ہوتا جا رہا ہے۔ یعنی یہ ایک رنگ بہت ہی اچھا لگتا، ہم نے جان بوجھ کر اپنی تصویر سے کم کر دیا ہے۔ لیکن رانا اپنے جذبوں کے اظہار میں سچا نظر آتا ہے اور اپنے ماحول کے سامنے سرخرو۔ وہ اپنی خوشی، اپنے غصے، اپنا غم اپنی بے قراری، اپنی محبتوں، اپنی حسرتوں، اپنی خواہش پہ استعاراتی تہ داری اور پیچیدگی کے پردے نہیں ڈالتا، انھیں برملا پیش کرتا ہے۔ اس کے جذبوں اور رویوں کو رد بھی کیا جا سکتا ہے، قبول بھی، لیکن اس پہ تخلیقی ریاکاری کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔

وہ رشتے جو انسانوں کو گھر، کنبے، قبیلے، طبقے، سماج اور دُنیا کی اکائیوں سے وابستہ رکھتے ہیں۔ زندگی کے بڑھتے ہوئے تناؤ اور تضادات کے اثر سے

کتنے بدلتے جا رہے ہیں۔ رانا کو اس کا شدت سے احساس ہے
اور جب وہ اپنے دل اور اپنی آنکھوں میں بسے ہوئے گاؤں
کا روپ حقیقی دنیا کے پس منظر میں بدلتا ہوا، بگڑتا ہوا
اور اپنے خوابوں سے دور ہوتا ہوا دیکھتا ہے تو اس کا
ردِ عمل کبھی بہت تیکھا اور کبھی بہت حزن آمیز اور
ہو جاتا ہے۔

بڑے شہروں میں رہ کر بھی برابر یاد کرتا تھا
وہ اک چھوٹے سے اسٹیشن کا منظر یاد کرتا تھا

تو اب اس گاؤں سے رشتہ ہمارا ختم ہوتا ہے
پھر آنکھیں کھول لی جائیں کہ سپنا ختم ہوتا ہے

رِستے ہوئے زخموں کو دوا بھی نہیں ملتی
اب ہم کو عزیزوں سے سزا بھی نہیں ملتی

پردیس جانے والے کبھی لوٹ آئیں گے
لیکن اس انتظار میں آنکھیں چلی گئیں

کچا سمجھ کے بیچ نہ دینا مکان کو
شاید کبھی یہ سر کو چھپانے کے کام آئے

جہاں بِلا رکھیں موقع وہیں اُجاڑ دیا
مرے بڑوں نے گھروندا مرا بگاڑ دیا

تمہیں اے بھائیو یوں چھوڑنا اچھا نہیں لیکن
ہمیں اب شام سے پہلے ٹھکانہ ڈھونڈ لینا ہے

ان شعروں میں گذرے منظروں کا گہرا دکھ ہے لیکن
کوئی منفی یا مریضانہ تاسف نہیں۔ بدلتے ہوئے منظر اس
کے لئے اجنبی ہیں۔ مگر وہ ان سے خوفزدہ نہیں ہے۔ اُن میں
اپنی ذات کے رشتے اور حوالے تلاش کر رہا ہے۔

لکھی ہوئی ہے مقدر میں موت پانی کی
یہی سبب ہے کہ ہم کشتیوں میں رہنے لگے

سفر میں جو بھی ہو رختِ سفر اٹھاتا ہے
پھلوں کا بوجھ تو ہر اک شجر اٹھاتا ہے

جو دھوپ دھوپ میں گرمِ سفر نہیں رہتا
تو میرے بچوں کی قسمت میں گھر نہیں رہتا

رانا کے اشعار میں ترکِ سکونت (میں اسے ہجرت
نہیں کہوں گا) کا تصور اس سماجی اور معاشی تبدیلی کا
علیہ ہے جس کے نتیجے میں چھوٹے چھوٹے سادہ اور خوبصورت
گاؤں اور بستیاں اُجڑتی جاتی ہیں اور شہر بڑے سفاک تر
اور گنجان ہوتے جا رہے ہیں۔ مشینی زندگی کے عفریت نے
معصومیت اور سادگی کو نگل لیا ہے۔ اور قدروں کے
ایسے نظام کا آغاز کیا ہے جس سے مٹی اور رشتوں کی
خوشبو کا شیدائی الزس نہیں لیکن اسے قبول کرنے پر
مجبور ہے ؎

ہوائیں چپکے چپکے کان میں آکر یہ کہتی ہیں
پرندو اُڑ چلو اب آب و دانا ختم ہوتا ہے

روتے ہوئے بچھڑنے کی فصلیں چلی گئیں
شہروں سے اب خلوص کی رسمیں چلی گئیں

مسلسل دھوپ میں چلنے کا یہ انجام ہے رانا
کہ اب پیڑوں کے سائے بھی بُرے معلوم ہوتے ہیں

بھیگی پلکیں مگر مسکراتے ہوئے، جیسے پانی برسنے لگے دھوپ میں
میں نے رانا مگر مڑ کے دیکھا نہیں گھر کی دہلیز کو پار کرتے ہوئے

برباد کردیا ہمیں پردیس نے مگر
ماں سب سے کہہ رہی ہے کہ بیٹا مزے میں ہے

راناؔ کی غزلوں میں ایک ایسے برہم نوجوان کی آواز سنائی دیتی ہے جس کا لہو ابھی زندہ ہے۔ یہ برہمی یوں ہے کہ وہ اپنی عزیز قدروں کو تباہی کی زد پر دیکھ رہا ہے۔ یہ جنگ شاید وہ ہار ہی جائے کہ یلغار شدید ہے اور وہ تنہا۔ لیکن تنہا لڑنے میں جو سرفرازی ہے اسے اس کا پورا احساس ہے اور اس پر ناز بھی۔ اسکے لہجے کا بانکپن اسکے اس مسئلے کو ایک نیا حُسن دیتا ہے ؎

جو تیر بھی آتا ہے وہ خالی نہیں جاتا
مایوس مرے در سے سوالی نہیں جاتا

قتل بھی ہوگا ہمارا تو یہیں پر ہوگا
فیصلہ جو بھی ہو دشمن کی زمیں پر ہوگا

تم نہ سمجھو گے میرے سر کا جنوں
ٹوٹ جائے گا، ختم نہیں ہوگا

ہے روح بے قرار ابھی تک یزید کی
وہ اسلئے کہ آج تک پیاسا مرنے میں ہم

یہ سوچ کر بھی نہ لے جاؤ دار کی جانب
تمہیں بناؤ گے اک دن مجسمہ میرا

راناؔ کے لہجے کا طنز اور تیکھا پن اس کی غزلوں کی ایک خاص پہچان ہے۔ یہ ایک ایسے تنہا لیکن حوصلہ مند شخص کے تیور ہیں جو حالات کے جبر کے باوصف اپنے رویوں پر نازاں ہے۔ یہ ایسے شخص کا ردعمل ہے جسے سیاہ کو سیاہ کہنے پر اصرار ہے ؎

گوتم کی طرح گھر سے نکل کر نہیں جاتے
ہم رات میں چھپ کر کبھی باہر نہیں جاتے

راہِ حق میں مسئلہِ دار و رسن آئے تو دو
جو زباں رکھتا ہو وہ بھی بے زباں ہو جائیگا

دُنیا اگر مذاق بدل دے تو اور بات
اب تک تو جھوٹ بولنے والا مرے میں ہم

اس طرح کے اشعار میں راناؔ کا انداز اکثر راست اور بیانیہ ہوجاتا ہے لیکن ایسا لگتا ہے جیسے اس نے اپنی شدتِ احساس کو نمایاں کرنے کے لئے جان بوجھ کر تخلیقی تہ داری سے اجتناب کیا ہے۔

بچھڑتی چاہتوں اور بیتے موسموں سے اس کے جذباتی تعلق نے راناؔ کے لہجے کو گداز، افسردگی اور کی کیفیت دی ہے جو اس کے بہت سے شعروں کو حسن اور تاثر عطا کرتی ہے۔ وہ زندگی کے نئے تقاضوں سے دو چار ہے۔ لیکن اپنے خوابوں سے اس نے اپنا رشتہ قائم رکھا ہے۔ یہ اس کی شاعری کا خوبصورت ترین پہلو ہے ؎

ذرا سی بات پہ آنکھیں برسنے لگتی تھیں
کہاں چلے گئے موسم وہ چاہتوں والے

ساتھ رہنے سے بھی کھل جاتے ہیں رشتوں کے کنول
بہنیں رونے لگیں مجھ کو رہائی دیتے

کیا میں کیا فصلِ گل، سب کچھ نہاں ہو جائیگا
بجھ گئیں آنکھیں تو ہر منظر دھواں ہو جائیگا

بچھڑ کے تجھ سے بہت مضمحل ہے دل لیکن
کبھی کبھی تو یہ بیمار سر اٹھاتا ہے

(باقی آئندہ)

منور رانا اور "غزل گاؤں"

ڈی، این آسیا

زندگی کی نقالی یا ترجمانی کا نام شاعری نہیں بلکہ شاعری زندگی کو نئی تنظیم، نیا نظریۂ حیات، تہذیب، مسلک اور جمالیاتی حسن عطا کرتی ہے۔ شاعری فرد، سماج اور حالات کا آئینہ دار ہوا کرتی ہے۔ شاعری نام ہے دل کی گہرائیوں میں اتر جانے کا۔ شاعری محض الفاظ سے جادو جگانے، فیشن یا فارمولے کی بازیگری کا نام نہیں ہے۔

کسی بھی فنکار کی شاعری اس کے حسن بیان اور اسلوب سے پہچانی اور جانی جاتی ہے۔ آج کی شاعری نہ جانے کتنے نامساعد حالات سے گزرتے ہوئے نئے اسلوب اور نئے لب و لہجے تک آئی ہے۔ ہمارے درمیان جہاں ان کو برتنے والے نمایاں امیجیت کار ہستیاں ہیں وہیں کچھ ابھرتی ہوئی قدریں بھی ہیں جن سے خوشگوار امیدیں وابستہ ہیں۔ ان میں سے ایک نام منور رانا کا بھی آتا ہے جو عشق کی داستان کو لکھتا ہے مگر اپنے ڈھنگ سے۔ وہ عشق کے وسیلے سے حسن کی تصویر نگاری الفاظ کو معنی کے نئے لباس پہنا کر کرتا ہے۔ اور ایسے موزوں ترین الفاظ استعمال کرتا ہے جو قاری یا سامع کے دھندلے ذہنوں میں گنجینۂ معنی کے چراغ روشن کر دیتے ہیں۔

منور رانا کی خمیر اودھ کی سرزمین ہے مگر پروان کی بنگال کی نرم و گداز مٹی میں چڑھی۔ چند سالوں میں ہی اس ابھرتے ہوئے شاعر نے اپنے گرد شاعری کے ایسے تابناک دیئے روشن کئے کہ اہل نظر کی نگاہیں ان پر پڑنے لگیں جس کی مثال دنیائے شاعری میں کم ملتی ہے۔ میری اس بات کی ثبوت میں ان کی تخلیق کا مجموعہ "غزل گاؤں" ہی کافی ہے۔ تاریخی حیثیت سے اگر جائزہ لیا جائے تو غزل شاہی دربار، امراء کی مجلسوں، صوفیائے کرام کی محفلوں میں ہی ملتی رہی۔ اور زندگی بھری رہتی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ یہ کن تحریکوں سے وابستہ رہی۔ غزل کا یہ خاصہ رہا ہے کہ وہ کسی بھی دور کسی بھی محفل میں رہی اس کا جادو ہمیشہ سرچڑھ کر بولتا رہا۔ اور غزل کی تابناکیوں میں کہیں سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ یہاں تک کہ تقریباً ڈیڑھ دہائی قبل جب جدید شاعری ایک تحریک کی شکل اختیار کر رہی تھی۔ اور اپنے عبوری اور تجرباتی دور سے گزر رہی تھی اس وقت بھی اہل نے اس تحریک کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ نہ ہی سلجھے ہوئے قلم کاروں نے جدید تحریک کی مخالفت کے باوجود غزل کے دامن کو ہاتھ سے جانے دیا۔ کیونکہ وہ اس کی دلربائیوں سے بخوبی واقف تھے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ کم سوادوں کو چھوڑ کر جدیدیت سے وابستہ شاعروں نے کسی بھی مقام پر کلاسیکل اور مقامی شاعری کی تکنیک نہیں کی۔ بلکہ اس کا پورا پورا احترام کیے

رہے اور آج انکا شاعرانہ اسباب بھی ہیں۔ میرے نزدیک جدید شاعری روایت سے بغاوت کا نام نہیں ہے۔ بلکہ جدید شاعری ہمیں نیا اسلوب، نیا انداز فکر عطا کرتی ہے۔ اس لئے کہ جدید غزل کہنے والا بھی سیکڑوں سال پرانے وضع کئے ہوئے ردیف و قوافی کے ضوابط کا آج بھی پابند ہے۔ بہرحال میرا مبحث جدید و قدیم شاعری نہیں ہے۔ بات ہے غزل کی جو مختلف ادوار میں مختلف محفلوں، مجلسوں، درباروں میں اپنی اداؤں کا خراج وصول کرتی رہی۔ مگر یہ کمال منور رانا کا ہے کہ غزل کو دارالسلطنت اور شہری فضا سے نکال کر گاؤں کے خوشگوار ماحول تک پہونچایا۔ بلاشبہ ان کا یہ مجاہدہ قابل ستائش ہے۔ منور رانا اچھے اور خوشگوار شاعر تو ہیں ہی۔ ان کی ایک اضافی صفت مشاعروں کی مقبول اناؤنسری بھی ہے۔ جو آج شاعری کے ساتھ ساتھ مشاعروں کی ملازمت کے مترادف ہے۔

منور رانا آنکھیں بند کرکے شاعری نہیں کرتے بلکہ کھلی رکھتے ہیں۔ اپنے گرد و پیش کے ماحول کا عمیق مشاہدہ کرتے ہیں۔ حالات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اور انہیں مشاہدات اور تجزیئے کو اپنے نئے اور انوکھا اسلوب کی مدد سے جب شعری پیکر عطا کرنے پر آتے ہیں تو کبھی بھیک پر بھوک کو ترجیح دے کر بچے کو برا ہونے سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی رہائش کا مسئلہ پیش کرتے ہیں۔ کبھی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں چھت پر جاکر اپنی والہانہ کیفیت کی اطلاع اپنے محبوب کو دیتے ہیں۔ کبھی سیڑھیوں پر لیٹ کر سنت کبیر کی تقلید کرتے ہیں۔ غرض کہ منور رانا کی نگاہ رسا زندگی کے مسائل، حالات کی پیچیدگیاں، اور زندگی کے معاملات پر پڑے بغیر نہیں رہتی۔ اور انہیں مسائل پیچیدگیوں اور معاملات کو جب اپنا لہجہ عطا کرتے ہیں تو شاعرانہ مستی کی رنگین انگڑائیاں لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ نیز ذہنی فضا میں قوس قزح کے ساتوں رنگ کی بہار بکھر جاتی ہے۔ اس موقع پر منور رانا کے کچھ اشعار سپرد قلم کرنا بے محل نہ ہوگا بلکہ میرے دعوؤں کی دلیل ہوگی۔

بھیک سے بھوک بہتر گاؤں کو واپس چلو — شہر میں رہنے سے یہ بچہ برا ہو جائیگا

نہ جانے کون سی مجبوریوں میں رہنے لگے — مکان بیچ کے کالونیوں میں رہنے لگے

اس وقت بھی اکثر تجھے ہم ڈھونڈنے نکلے — جب دھوپ میں مزدور بھی چھت پر نہیں جاتے

وقت کی سیڑھیوں پہ لیٹے ہیں — اس صدی کے کبیر ہیں ہم لوگ

مسلسل دھوپ میں چلنے کا یہ انجام ہے رانا — کہ اب پیڑوں کے سائے بھی برے معلوم ہوتے ہیں

یہ [illegible] پہلے کبھی آیا نہیں کرتے — آپ سے ہوگا یقیناً میرا رشتہ کوئی

لوٹا ہوں جنگ ہار کے جب یہ پتہ چلا
ڈاکو ندی میں پھینک کے بھنس چلی گئیں

تلوار کی نیام کبھی پھینکنا نہیں
ممکن ہے دشمنوں کو ڈرانے کے کام آئے

لبوں پہ اس کے کبھی بددعا نہیں ہوتی
بس ایک ماں ہے جو مجھ سے خفا نہیں ہوتی

یہ سوچ کے ماں باپ کی خدمت میں لگا ہوں
اس پیڑ کے سایہ میرے بچوں کو ملے گا

زندگی کی سچائیوں کو اسلوب کے نئے پیکر دے کر پیش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ۔ منور رانا کا اسلوب نیا اور لہجہ توانا ضرور ہے فی الحال منفرد نہیں ہے۔ مگر انفرادیت کی کرنیں بلاشبہ پھوٹ رہی ہیں ۔ جو ان کے روشن مستقبل کی ضامن ہیں ۔ شاعری کے لئے یہی لگن اور خلوص برقرار رہا تو انشاءاللہ ہمیں کہتے ہوئے فخر محسوس ہوگا کہ منور رانا اپنے ملک کے ایک منفرد لب ولہجہ کے شاعر ہیں ●

بقیہ :- غزل گاؤں کا باسی

کی ہے۔ وہ ان کو کامیابیوں کی منزلوں سے ہمکنار کرنے میں پوری طرح ممد ومعاون ہے انہوں نے جن موضوعات کو منتخب کیا ہے۔ وہ غزل اور نئی غزل کی حد تک یقیناً اچھوتے اور پرکشش ہیں ۔ ان کا انداز دلربایانہ اور اظہار بے ساختہ و برملا ہے ۔ ان کے بعض اشعار مقبول عام ہو جانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں ۔

" ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی "

سب سے بڑی اور خوش آئند بات یہ ہے کہ شاعری منور رانا کے لئے نہ وسیلۂ شہرت ہے اور نہ ذریعہ معاش، بلکہ شاعری ان کی فطری مجبوری ہے ۔ اس کے ذریعہ وہ اظہار ذات بھی کرتے ہیں ۔ اور تلاش ذات بھی ، ان کی شاعری میں ظاہری ترک بھڑک پیدا کرنے کے لئے غیر ضروری اور غیر فطری طور طریق سے گریز بہت نمایاں اور واضح ہے یہ سب وہ علامتیں ہیں جو ان کی کامیابی کی ضمانت ہوں گی ●

بقیہ :- منور رانا کی شاعری

اس کے ساتھ ساتھ شہری الفاظ کا نیا پن جیسے بھکارن ، کالونی ، کوئلہ چننا ، یونین والے ، یتیم کے تمام نئی دنیا آباد کر سکتے ہیں اگر منور رانا اپنی تخلیق سے کچھ پہلے ان لفظوں کے پس منظر اور ماحول کی امکانات کو تلاش کریں ●

گاؤں کا شاعر

ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی

اُتر پردیش کے مشرق میں جنمے، رائے بریلی
کے واسی، صنعتی شہر کلکتہ کے نواسی ــــ بھولا بھولا بدن،
بال میں بانکپن، بڑی بڑی خوف ناک آنکھیں، دہقن
جیسی باتیں، کھنک دار آواز، رنگ باندھنے کے انداز،
نہ چہرے سے شاعر، نہ پیشانی سے ادیب، نئی شاعری کا
راز، منور رانا نے اپنے گاؤں سے رشتہ توڑ لینے
کے باوجود، گاؤں کو فراموش نہیں کیا ہے ــــ وہاں
کے کھیتوں کی خوشبو، ماں کی ممتاؤں کا جادو، ادھر
اور سرسوں کے پھولوں کی مہک، پگڈنڈیوں پر دوشیزاؤں
کی لچک، ریوڑوں کو چراتے ہوئے گوالے، کچے گھڑوں
پر تیر کر محبوباؤں تک پہنچنے کا حوصلہ رکھنے والے جیالے،
کھیتوں میں رقص کرتے ہوئے مور، گھاٹوں پر غسل فرماتے
ہوئے جیت چور، گھرتی ہوئی گھٹائیں، شائیں شائیں
کرتی ہوئی تند ہوائیں، پتوں پر گرتی ہوئی بوندوں
کے ساز، برہا میں تڑپتی ہوئی کوکوں کی آواز، کھیتوں
کا سینہ چیرتی ہوئی کدالیں، پسینے میں تر اور مزدور،
کھیتوں میں کوڑا بناتے ہوئے کسان، خلوص، محبت،
عبادت کی آئینہ بعدی کے پیکر جیرگ، بزرگوں کی ڈیوڑھیاں،
ڈیوڑھیوں پر گڑگڑاتے ہوئے حقے، حقوں کے گرد کرسیاں،
کرسیوں پر مونچھوں کو مروڑتے ہوئے خرفار، ان کے
ہاتھوں میں چاندی کی موٹھ لگی ہوئی چھڑیں، ان کے پیار،
ان کی کہانیاں، ان کے لباس، ان کی بیتی ہوئی جوانیاں،
ــــ گھروں میں رکھے ہوئے پیٹ اینٹھتے ہوئے بہویں اور
بیٹیاں، چاندی کے پاندان، اور چارپائی کی پٹی تک اُگلتے
اگالدان، جن ذہنوں میں رسائی رکھتے ہیں، ان کے لئے
منور کی شاعری ایک سرور ہے، ایک کیفیت ہے، ایک ساز
ہے، ایک آواز ہے، ایک آہٹ ہے اور ایک دھڑکن ہے۔

منور کا ذہن ایک ایسی خالی تختی محسوس ہوتا ہے۔
جس پر مشاہدات کے نقش مرتسم ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن
منور رانا کا یہ کمال ہے کہ وہ مشاہدات کی اس آباد دنیا
کے انھیں پیکروں سے ہماری ملاقات کراتے ہیں جن سے
ملنا ہمارے لئے ضروری ہے، غیر ضروری اور غیر اہم پیکر یا تو
منور کے ذہن پر اپنا نقش ہی نہیں بناتے یا وہ انہیں
متعارف کرانے کی زحمت نہیں اٹھاتے۔

منور کے کلام کی پہلی جھلک "غزل گاؤں" ہماری کئی
سو برس پرانی اردو شاعری کی اس جمی ہوئی برف کی
گلیشیئر ہے جس کو نئے سورج کی کرنوں نے بہت تاخیر اور
احتیاط کے ساتھ مس کیا ہے۔ اسی لئے "غزل گاؤں"
کی جھرنوں کی روانی کے ساتھ ساتھ بلندی سے گرتے ہوئے
پتھروں جیسی گھڑگھڑاہٹ بھی محسوس ہوتی ہے اور ایسا

لگتا ہے جیسے یہ پگھلی ہوئی برف مستقبل قریب میں ٹھہر کر دم لینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی ہے

تو اب اس گاؤں سے رشتہ ہمارا ختم ہوتا ہے
پھر آنکھیں کھول لی جائیں کہ سپنا ختم ہوتا ہے

خوابوں کی دنیا، تصورات کی محفل، محفل کی ہلچل میں ڈوبتے اور ابھرتے ہوئے چہرے، چہروں پر انکار زمانہ کی جھریاں، جھریوں پر بڑھاپے کے آثار، یہ احساس دلاتے رہتے ہیں کہ سپنے ٹوٹ جاتے ہیں، خیالات کی لہریں سمندری لہروں میں فنا ہو جاتی ہیں۔ منصوبے بنتے اور بکھرتے ہیں لیکن کاروانِ حیات آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے اور شاعر یہ سوچنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے کہ

حالات نے چہرے کی چمک چھین لی ورنہ
دو چار برس میں تو بڑھاپا نہیں آتا

حقائق کے بیان کے یہ تیور، منور رانا کی پہچان بنتے چلے جا رہے ہیں۔ انھیں چہرے کی چمک دمک اور آب و رنگ کے چلے جانے کا احساس اس لئے اور بھی پریشان کرتا ہے کہ

یہ حادثہ ہوا تھا کہ صرف ایک بار
میں بام پر کھڑا تھا وہ آنگن میں آ گئے

میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے اپنی روایتی شاعری کے طویل سفر کا جس میں محبوب ہمیشہ بام پر نظر آتا ہے تاکہ عاشق کی تڑپ، اس کے دل کی دھڑکن، اس کے چہرے کے تغیرات، اس کی سانسوں کی الجھن، اس کی نظروں کی بے چینی اور اس کے جذبات کی ہیجان برقرار رہے۔ اور بام تک پہنچ کر محبوب سے ملاقات کے ممکن منصوبوں میں عمر عزیز کو تمام کر دیا جائے۔ اردو غزل کا یہی حقیقی اور فطری مزاج تھا اور اسی تڑپ کی موجودگی غزل کو توانائی بخشتی تھی، لیکن بیسویں صدی کے اختتام تک آتے آتے غزل کے مزاج کے ساتھ انکارِ غزل میں بھی تغیرات آ گئے ہیں۔ اور محبوب کی فطرت میں بھی تبدیلی آ گئی ہے۔ اس نے اپنی سابقہ روایات کو فراموش کر دیا ہے، شرم و حیا کی بھی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ اور سینکڑوں برس پرانی بے وفائی کی عادت کو بھی نظر انداز کر دیا ہے

کہتا تھا پاس وعدے کا انکو بھی اُدلوں
اک بار بھیگتے ہوئے ساون میں آ گئے

ہماری سماجی زندگی اور روز مرّہ میں عورت جس تیزی سے داخل ہو رہی ہے۔ سماجیات، سیاسیات، کھیل کود، صحافت، شعر و ادب اور فلمی دنیا میں اس نے جو اہمیت اختیار کی ہے اور اپنے توانا ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے اس کے اثرات اردو شاعری پر ہی نہیں ہندو پاک کے مکمل سماجی ڈھانچے پر پڑ رہے ہیں۔ اب عورت گلدان نہیں ہے، پائل اور کنگن بھی نہیں ہے، وہ ٹھیکری بھی نہیں ہے، اس نے طبلہ اور حجاب ہونے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ اب اسے گھر کی چہار دیواری میں مقید کرنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہے، وہ گھر اب ٹوٹ پھوٹ کر کباڑ میں بک چکے ہیں جہاں بہوئیں اور بیٹیاں چہار سے پردہ کرتی تھیں اور "جس سے نکاح ہو سکتا ہے، اس سے پردہ ضروری ہے" پر عمل کیا جاتا تھا ــــ اب عورت مردوں کے شانہ بہ شانہ کلبوں، بازاروں، ہوٹلوں، مشاعروں اور دانش گاہوں میں فخر کے ساتھ کھڑی ہے۔ اب عشق بھی اتنا دشوار نہیں ہے جتنا کہ میر تقی میر کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ اب محبوب سے ملاقات یا اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے "دیوار کے سائے" میں پڑے رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ مرزا اسداللہ خان غالب کے زمانے کے وہ دربان ہی دکھائی دیتے ہیں جنھیں دعائیں دیکر داخلہ ممکن ہوا کرتا تھا۔ ــــ اب آپ جس محبوب کا چاہیں سکر باتار نظارہ کر لیں، ملاقات کر لیں اور بات بھی کر لیں ــــ اسی لئے اردو غزل میں وہ تغزل اور رومانیت دیکھنے کو نہیں ملتے جو قاری کو تڑپایا کرتے تھے۔ اسی تڑپ اور کرب نے نیا روپ دھار لیا ہے۔ اور یہ

روپ یقیناً کارآمد بھی ہے اور دیرپا بھی۔

منور رانا نے اسی روپ کے شاعر ہیں، ان کی محبت اور ان کے عشق کا انداز بھی نیا ہے، محبوب کی ضد پوری کرنے کے لئے ماں کا کلیجہ نکالنے والوں سے یہاں ملاقات نہیں ہوتی بلکہ یہاں شاعر کو ماں کی قربانیوں اور اسکی محبتوں کا احساس ہے ؎

لبوں پہ اس کے کبھی بد دعا نہیں ہوتی
بس ایک ماں ہے جو مجھ سے خفا نہیں ہوتی

یہاں شاعر کو احساس ہے کہ ماں کے علاوہ کوئی دوسرا حقیقی محبت سے آشنا نہیں کرتا کیونکہ دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں۔ تمام محبتیں نفرتوں میں تبدیل ہو سکتی ہیں لیکن بس ایک ماں ہے جو مجھ سے خفا نہیں ہوتی۔

یہ احساس اور یہ اعتراف اردو شاعری کا انتہائی توانا پہلو ہے کیوں کہ شاعری کا یہ انداز قاری کو نہ تو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اور نہ عمیق مطالعے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ یہ شاعری باتوں کی شاعری ہے جو فوری طور پر متاثر کرتی ہے اور قاری بھی فوری طور پر اس کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ صادر کر دیتا ہے۔

بندگھل نے ایسی شاعری کو غیر اہم اور مشاعروں کی شاعری کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی کہ ان کا خیال ہے کہ مشاعروں میں وہی شعرا داد حاصل کرتے ہیں جن کی ذہنی سطح پر سامعین فوری طور پر سوار ہو جاتے ہیں اور انہیں غور و فکر کے لئے علم یا مطالعے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی لئے یہ بڑی شاعری نہیں ہوتی۔ میں اس رائے سے اس لئے اتفاق نہیں کرتا کہ ہمارا معاشرہ جس تیزی سے انفرادی اور معروف ہوتا چلا جا رہا ہے، اس میں ذہن کسی فلسفے یا پہلو دار شاعری کو سمجھنے کے لئے تیار نہیں کئے جا سکتے۔ اب جس قسم کا آدمی تیار ہو رہا ہے اس کے لئے سنار کی چوٹ کی نہیں لوہار کی ایک چوٹ کی ضرورت ہے۔ جن شعرا میں یہ چوٹ دینے کی صلاحیت ہے وہ قاری کو متاثر بھی کرتے ہیں، اس کی اصلاح بھی کر سکتے ہیں۔ اور اپنے خیالات کے ساتھ اسے بہا لے جانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ منور رانا نے اس لہر کو اچھی طرح محسوس کر لیا ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں ؎

ہمیں مزدوروں کی محنت کشوں کی یاد آتی ہے
عمارت دیکھ کر کاریگروں کی یاد آتی ہے

ہر سہولت تھی میسر لیکن اسکے باوجود
ماں کے ہاتھوں کی پکائی روٹیاں اچھی لگیں

جس کو بچوں میں پہنچنے کی بہت عجلت ہو
اس سے کہیے نہ کبھی کار چلانے کے لئے

لوٹتا ہوں جنگ ہار کے جب یہ پتہ چلا
رکھی زمیں پہ پھینک کے بہنیں چلی گئیں

اس دور ترقی میں کبھی مفلس کی جوانی
بھٹی میں سلگتے ہوئے ایندھن کی طرح ہے

میں ریل میں بیٹھا ہوا یہ سوچ رہا ہوں
اس دور میں آسانی سے پیسہ نہیں آتا

منور رانا کی غزلوں میں افکار و خیالات کی جو طہارت ہے، جو پاکیزگی ہے، جو آہنگ ہے اور جو روانی ہے وہ انہیں فنا نہیں ہونے دے گی۔ کیونکہ اس شاعری کے ساتھ وہ حادثہ پیش نہیں آیا کہ جس کا شکار ہمارے دوسرے شعرا ہو گئے ہیں، میرا اشارہ ان شعرا کی جانب ہے جو مشاعرے کے مقبول شاعر ہونے کے باوجود اپنے مطبوعہ مجموں کے بوجھ تلے

دفن ہو گئے ہیں۔

منور کی غزلوں سے یہ حقیقت بھی عیاں ہو رہی ہے کہ شاعر کے شذرات کی دنیا جتنی وسیع ہے مطالعے کی دنیا تنی ہی محدود، اور یہ حادثہ صرف منور کے ساتھ ہی پیش نہیں آیا ہے بلکہ موجودہ شعراء میں اکثریت ایسے ہی شعراء کی ہے جنھیں کتابوں سے زیادہ دشمنی ہے، رسائل سے بغض ہے، اخبارات سے نفرت ہے، اور دوسرے شاعروں کا کلام پڑھنے سے ایمان چلے جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے اور یہ ڈر غالب رہتا ہے کہ کہیں اس کے افکار و خیالات غالب نہ آجائیں۔ مطالعہ قاری کو صرف مزید دعوتِ مطالعہ ہی نہیں دیتا بلکہ اس کے سوئے ہوئے گوشوں کو بیدار کرتا ہے۔ ان خزانوں کی نشاندہی کرتا ہے جو شاعر کو علم کی دولت سے مالا مال کرتے ہیں۔

منور نے ابھی اصلی خزانے کا سراغ نہیں پایا ہے۔ اسی لئے ان کے اشعار میں غریب کمزور اور ایسے الفاظ شامل ہو گئے ہیں جو عام طور پر شرفا کی محفلوں میں داخل نہیں ہوتے۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ غریب لفظ استعمال ہی نہ کئے جائیں، میں تو صرف اس جانب اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ جب ہمارے سامنے محنت مند، دلکش اور شیشے کی طرح چمکتے اور دمکتے الفاظ موجود ہیں تو ہم ایسے الفاظ کیوں استعمال کریں جو مفہوم کی ترسیل میں دشواریاں پیدا کرتے ہیں۔ :

ہیں پیار کی راہوں میں ابھی سنگ طلب پتھر

رفتار بتاتی ہے قدم رک نہیں سکتے!

●●●

بقیہ غزل گاؤں کا باسی۔ منور رانا

مری دولت، میری کار، اور مرا گھر دیکھنے والو

سبھی دیکھا مگر تم نے مری محنت نہیں دیکھی

بہن کا پیار، ماں کی ممتا، دو چیختی آنکھیں

یہی تحفے تھے وہ جن کو میں اکثر یاد کرتا تھا

غزل گاؤں کے باسی کو اس سپاٹ پن اور بے اثر STATEMENTS سے بچنا ہوگا۔ یہ میرا دوستانہ مشورہ ہے، تنقیدی رائے نہیں۔ لیکن اس بے اثر STATE-MENT اور سپاٹ پن کی نشاندہی کر کے میں کوئی کارنامہ نہیں انجام دے رہا ہوں۔ کیوں کہ کولرج نے کہا ہے کہ :

جو شخص مجھ سے یہ کہتا ہے کہ کسی

نئی تحریر میں نقائص اور عیوب

ہیں تو وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتا

جو اس کے بتلائے بغیر مجھے نہ معلوم

ہوتی۔ لیکن وہ شخص جو کسی (نئی)

طبع زاد تحریر کے محاسن بیان

کرتا ہے، یقیناً مجھے کار آمد اور

دلچسپ اطلاع فراہم کر دیتا ہے۔[1]

---

[1] ترسیل کی ناکامی کا المیہ " شمس الرحمٰن فاروقی (نئے نام صـ ۲۳)

اساطیری غزل کا شاعر منور رانا

رضوان احمد

اگر آپ نے پھولوں پر لہراتے ہوئے بھونروں کی گنگناہٹ سنی ہے۔ گرمیوں کی تپتی دوپہر کے سناٹے میں کوئل کی کوک سنی ہے۔ دیہاتوں کی دھول بھری پگڈنڈیوں پر بیل گاڑیوں کی مدھم رفتار دیکھی ہے۔ کھیتوں کے کنارے چلتے ہوئے رہٹ کی متوازن آواز سنی ہے۔ کسی جنگل کے سناٹے میں تیرتی ہوئی کسی بانکے کی بانسری کی لے سینے میں اترتی محسوس کی ہے ——— تو آپ منور رانا کی شاعری کی روح میں اتر سکتے ہیں۔

منور رانا کی غزلوں کو میں اساطیری غزلیں کہنا پسند کروں گا کیوں کہ ان کے ہر شعر کے پسِ پشت ایک طویل داستان موجزن ہے۔ وہ اپنے سارے اشعار بھی داستانی رنگ میں شروع کرتے ہیں، جس میں ایک ڈرامائی کیفیت ہوتی ہے ؎

تو اب اس گاؤں سے رشتہ ہمارا ختم ہوتا ہے
پھر آنکھیں کھول لی جائیں کہ سپنا ختم ہوتا ہے

تو منور رانا اسی اساطیری بستی کے باشندے ہیں۔

میری ان سے ملاقات سرسری ہے مگر ان کی شاعری سے تعارف گہرا ہے ——— یہ کوئی تین چار سال ادھر کی بات ہے کہ محترم والی آسی اور برادرم رئیس انصاری میرے غریب خانے پر ایک کھلنڈرے نوجوان کے ساتھ تشریف لائے۔ تعارف ہوا تو بتایا کہ یہی منور رانا ہیں۔ ٹرانسپورٹر ہیں۔ اور فی الحال سون پور میلے سے ہاتھی خریدنے آئے ہیں۔ مجھے بڑی ہنسی آئی۔ ٹرانسپورٹر ہاتھی اور شاعر اس پر مستزاد کہ بقول ان کے لوگ انہیں شاعروں کا بکیاں سنگھ کہتے ہیں۔

منور کا حافظہ غضب کا ہے۔ انھیں بیشمار اشعار یاد ہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں جانے انہوں نے کتنے اشعار سنا ڈالے۔

ایک دن لکھنؤ میں میں عرفان صدیقی سے اردو کے نئے شعرا کا ذکر کر رہا تھا اور منور کا ذکر بار بار آ رہا تھا۔ اتفاق سے اسی شام والی آسی کی دکان پر ان سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ان دنوں ریوالور کے لائسنس کے چکر میں تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ شاعر ہمیشہ ہی غیر شعوری کام کرتا ہے۔ یہ تو اپنے اشعار سے ہی لوگوں کے دلوں کو چھلنی کر ڈالتا ہے پھر اسے ریوالور کی کیا ضرورت۔ بہر حال ریوالور کا ذکر ختم ہوا تو ان سے متعدد غزلیں سنی گئیں۔ اور ان کے متعدد اشعار تو بے زبانی یاد ہو گئے جو اب تک یاد ہیں۔ اچھے شعر کی یہی خوبی ہے کہ وہ غیر شعوری طور پر ذہن میں بس جائے۔ یہ خوبی منور کے اشعار میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کی غزلوں میں جو اچھوتا پن ہے وہ صاف جھلکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے اشعار کو ہی سہل ممتنع کہا جاتا ہے۔ پھر ان کو میں نے دہلی کے ایک مشاعرے میں سنا۔ چند ماہ قبل میں کلکتہ گیا تو انھوں نے اپنا مجموعہ "غزل گاؤں" عنایت کیا جو ابھی دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوا ہے اور اس سلسلے میں بھی انھوں نے اپنے استاد والی آسی کی پیروی کی ہے۔

جنھوں نے پہلے اپنا مجموعہ "ہشید" دیوناگری رسم الخط میں شائع کیا تھا بعد میں اسے اردو میں چھپوایا۔

منور رانا ہندوستان کے سب سے بڑے شہر کلکتہ میں شاندار انداز میں رہتے ہیں مگر ان کے اندر ایک گھلنڈرا بچہ اب تک ہمک رہا تھا۔ جس کے احساسات انھوں نے اپنے اشعار میں سموئے ہیں۔ ان کے ذہن کے نہاں خانے میں ایک گاؤں بستا ہے جس کا نام غزل گاؤں ہے۔ اس گاؤں سے منور رانا کو الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا کیونکہ اس کے بغیر ان کی تکمیل ممکن نہیں۔

منور رانا خود بھی ایک دیومالائی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی شاعری بھی اساطیری ہے۔ ان کے ایک ایک مصرعے میں طول طویل داستان ہے ؎

خاندانی وراثت کے نیلام پر آپ بچے کو تیار کرتے ہوئے
اس حویلی کے سارے مکیں رو دیے اس حویلی کو بازار کرتے ہوئے

وقت کی سیڑھیوں پہ بیٹھے ہیں
اس صدی کے کبیر جیسے ہم لوگ

کہیں بے نور نہ ہو جائیں وہ بوڑھی آنکھیں
گھر میں ڈرتے تھے خبر بھی مرے بھائی دیتے

گھیر رکھے ہیں چاروں طرف سے مجھے حریف
موسیٰ کے رہنما کوئی رستہ نکال دے

دل وہ بستی ہے جہاں کوئی تمنا نہ ملی
میں وہ نکھٹو ہوں جسے کوئی بھی رادھا نہ ملی

ایک ہی آگ میں تا عمر جلے ہم دونوں
تم کو یوسف نہ ملا ہم کو زلیخا نہ ملی

میرا بن باس پہ جانے کا ارادہ تھا مگر
مجھ کو دنیا میں کہیں کوئی بھی سیتا نہ ملی

گوتم کی طرح شہر سے نکل کر نہیں جاتے
ہم رات میں چھپ کر کہیں باہر نہیں جاتے

ہر شخص مرے شہر میں دشمن کی طرح ہے
اب رام کا کردار بھی راون کی طرح ہے

نمازیں پڑھ کے واپس لوٹتے بچوں سے ملتے ہی
نہ جانے کیوں ہمیں پیغمبروں کی یاد آتی ہے

میں اپنے بھائیوں کے ساتھ جب باہر نکلتا ہوں
مجھے یوسف کے جانی دشمنوں کی یاد آتی ہے

مرے بچے کبھی جو مجھ سے پانی مانگ لیتے ہیں
تو پہروں کربلا کے واقعوں کی یاد آتی ہے

ہمارے شہروں میں قربانی کا موسم جب سے آیا ہے
مرے بچے کبھی ہولی میں پچکاری نہیں لاتے

اس خرابے کو تو گلزار بنانا تھا اسے
ورنہ آدم کو زمیں پر نہ اتارا جاتا

ہے روح بیقرار ابھی تک یزید کی
وہ اس لیے کہ آج تک پیاسا حسین ہے

میں نے یہاں پر چند اشعار بطور مثال درج کئے ورنہ منور کے یہاں اور بہت سے اشعار مل جاتے ہیں جن کا [illegible] اساطیر میں [illegible]

ستان نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

مگر منور کی شاعری صرف انھیں اساطیر، دیو مالا داستان تک محدود نہیں ہے۔ ان کے یہاں مٹتی تہذیب مرثیہ بھی ہے اور آج کے درد و کرب کا شدید احساس بھی۔ وہ سچا فن کار ہو ہی نہیں سکتا جو گرد و پیش کے حالات 'سماج' معاشرہ' ماحول سے روگردانی کرے۔ منور کی غزلوں میں جا بجا ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے عصری حسیت کا پتہ چلتا ہے۔

آج پیٹرو ڈالر کی حرص میں ہر شخص باہر بھاگ رہا ہے' اس کی کتنی خوبصورت عکاسی وہ اپنے شعر میں کر رہا ہے ؎

برباد کر دیا ہمیں پردیس نے مگر
ماں سب سے کہہ رہی کہ بیٹا مزے میں ہے

میں اگر ایک صحافی کی حیثیت سے منور کی شاعری کا جائزہ لیتا ہوں تو بھی ایسے اشعار ملتے ہیں جو میرے جذبات و احساسات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک صحافی کو سب سے شدید کرب اس وقت جھیلنا پڑتا ہے جب وہ مجبور ہو کر حقائق سے روگردانی کرتا ہے۔ منور اس کی یوں عکاسی کرتے ہیں ؎

راہِ حق میں منزلِ دار و رسن آنے تو دو
جو زباں رکھتا ہے وہ بھی بے زباں ہو جائیگا

دنیا اگر مذاق بدل دے تو اور بات
اب تک تو جھوٹ بولنے والا مزے میں ہے

کس میں ہمت ہے کہ سچ بات کہے گا ساتھ
کون ہے جو مرے حق میں گواہی دے گا

منور ابھی جوان ہیں۔ انھوں نے شاعری کی پر خار وادی میں چند برسوں قبل ہی قدم رکھا ہے مگر ان کی منفرد آواز دور سے پہچانی جاتی ہے اور اس میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مضامین ان بنجر زمینوں سے تلاش کرکے لاتے ہیں جنھیں عام طور پر لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کی انفرادیت ہی ابھری ہے ——— دیہات کی کچی زمینوں پہ پلا ہوا' کچے مکانوں میں بڑھا ہوا۔ کھلی کھلی فضاؤں میں سانس لیتا ہوا۔ بچپن جب کسی شہر میں آتا ہے تو اس کی آنکھیں چکا چوندھ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ایک لمحے کے لئے وہ مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے دل میں عجیب عجیب احساسات جاگتے ہیں۔ اس تنگ ماحول میں وہ گھٹن محسوس کرنے لگتا ہے مگر شہر کی کمندیں اسے اس طرح جکڑ لیتی ہیں کہ وہ فرار اختیار نہیں کرتا۔ وہ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے اور گاؤں کا ماحول اور لوک رسم و رواج اس کے دل میں بس جاتے ہیں۔ یہی احساس منور کی شاعری کو منفرد بناتے ہیں ——— وہ ہندوستان کے سب سے بڑے اور مصروف شہر میں رہتے ہیں جہاں زندگی کی رفتار بہت تیز ہے وہ خود بھی اسی مشین کا پرزہ بن چکے ہیں مگر ان کے ذہن میں جو گاؤں ہے وہ اس مشین کا پرزہ بننے پر آمادہ نہیں ہے۔ ان کے داخل و خارج میں تصادم ہو رہا ہے۔ جسم و ذہن کے درمیان سرد جنگ چل رہی ہے۔ یہ صرف ان کے احساسات نہیں ہیں بلکہ ہر اس شخص کے ہیں جو گاؤں چھوڑ کر شہر میں آیا ہے۔

یہی احساسات منور کو منفرد مضامین دے جاتے ہیں جو ان کی پہچان ہے ؎

ہم جب گاؤں میں رہتے تھے یہ سب منظر جاتے تھے
دو چار کنوئیں مل جاتے تھے دو چار شجر مل جاتے تھے

کچی سڑکوں سے لپٹ کر بیل گاڑی روپڑی
غالباً پردیس کو کچھ گاؤں والے جائیں گے

یہ اپنا گاؤں کی پگڈنڈیاں ہم کو بلاتی ہیں
مگر مشکل بہت ہے اب ہمارا لوٹ کر جانا

بھرے شہروں میں بھی رہ کر برابر یاد کرتا تھا
وہ اِک چھوٹے سے اسٹیشن کا منظر یاد کرتا تھا

تمہارے شہر کی یہ رونقیں اچھی نہیں لگتیں
ہمیں جب گاؤں کے کچے گھروں کی یاد آتی۔

منور رانا آج کی تلخ حقیقتوں پر لکھتے بھی ہیں اور لوگوں کی منافقتوں پر طنز بھی کرتے ہیں مگر ان کی شاعری کی انفرادیت وہیں سے شروع ہوتی ہے جب وہ گاؤں کی کچی اور ناہموار پگڈنڈیوں سے نکل کر شہر کی چمکدار سڑک پر آجاتے ہیں اور غیر شعوری طور پر مراجعت کرتے ہیں ——— یہی المیہ ان کی شاعری کو آفاقی رنگ و آہنگ دے گیا ہے۔

منوّر رانا کی شاعری

ظہیر انور

شہر کلکتہ اپنے جلو میں بے پناہ تضادات رکھتا ہے تارکول کی خوشبو سے لے کر شکستہ مکانوں تک جھپاتے، لہراتے، رنگ برنگ ذائقوں سے لے کر روایت کی بوڑھی بیکی چوکھٹ تک سماجی ناہمواری سے لے کر محفل یاراں کی شدت انگیزی تک، معاشی بدحالی سے لے کر معاشی بلندی تک، کلکتہ ایک ایسا شہر ہے جو تخلیق کے سرچشمے کو ہر لمحہ رواں رکھ سکتا ہے۔ بنگالی شاعری کے دروبست میں شہر کی تاریخ اور شاعر کا تصور پوشیدہ ہیں۔ تحریکیں اور ہیئتیں جنم لیتی رہتی ہیں۔ لیکن صد افسوس کہ اردو شاعری کو اب تک کوئی تابندہ اور زندہ شاعر نہ مل سکا۔ یہ اس شہر کی شدت انگیزی کا ماتم نہیں کیونکہ اس شہر کی اونگھتی دوپہر اور لال شیلا کی راتیں دوسری زبانوں کے علاقائی ادب میں تو زندہ و تابندہ ملتی ہیں۔ لیکن ہماری حسیات کا یہ نوحہ ہے کہ کوئی شاعر تضادات کی اس بھیڑ میں اپنی تعمیر کرنے میں ناکام ہی نہیں رہا بلکہ تجربات کی چوحدی کو اپنے اندر پکانے سے گریزاں بھی رہا۔

ہمارے سامنے ذاتی شدت انگیزی اور کاربن کاپی کی مثالیں تو ہیں اور نئے پرانے شعرا کی آزمائش بھی اپنی آخری منزل پر پہونچ چکی ہیں یا پہونچ رہی ہیں لیکن زبان کا نیا ذائقہ جو شہر اپنی بنیاد کی توسط سے دیا کرتا ہے۔ خال خال ہی نظر آیا۔ ہمارے سامنے منور رانا کی کتاب "غزل گاؤں" ہے جو اردو زبان کی بدنصیبی کا شکوہ تازہ کرتے ہوئے ہندی میں چھپی ہے۔

منور رانا ہماری نسل کے نئے شاعر ہیں۔ ہماری یہ نسل جو اعزاز افضل، ابراہیم ہوش، قیصر شمیم، فاروق شفق اور اس طرح کے دوسرے شعراء سے بہت دوری پر نہیں ہے۔ کچھ بہتر شعرا کا دعویدار ہو سکتی ہے جن شاعروں میں حسن اثر، یوسف تقی، احسن شفیق، مشہود عالم آفاقی، شہابی، حبیب ہاشمی، حمید رفعت اکبر حسین اکبر، وغیرہ ایسے لوگ ہیں جو کچھ خوب صورت متفرق اشعار کا الزام اپنے سر لے سکتے ہیں۔ منور رانا بڑے اعتماد لہجے میں شہر کی وادیوں میں کو د پڑے ہیں ؎

عہد نو تیرے میر ہیں ہم لوگ   آپ اپنی نظیر ہیں ہم لوگ

وقت کی سیڑھیوں پہ لیٹے ہیں   اس صدی کے کبیر ہیں ہم لوگ

میر اور کبیر کی روایت کی پاس داری شاعر کو پُر آشوب دور میں روایت سے جوڑے رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شاعر کی خود اعتمادی کا اعلان بھی ہے یہ زبردست خود اعتمادی جو منور رانا کی شاعری کی ایک خصوصیت ہے کلکتہ میں کامیاب ہے غزلوں اور متفرق اشعار کے اس "گاؤں" میں شاعر کی شخصیت، اس کا رجحان، اس کی ذہنی کیفیت اور تجسس اسی پرزور اعلان کے توسط سے مکمل کر سامنے آسکے ہیں۔

منور رانا کی مختلف غزلوں میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ ہے گاؤں۔ YEATS کہتا ہے کہ "ہر شاعر کے سینے میں ایک گاؤں آباد ہے" اس قول میں حقیقی گاؤں کے علاوہ شاعر کی قوت متخیلہ کا بھی اظہار ہے منور رانا شہر کی ہاہمی میں گاؤں کے خواب کھلی آنکھوں میں بنتے ہیں۔ اور پھر اسے آنسوؤں سے تر بتر کرتے ہیں۔ یہ خواب جو آنسوؤں میں تر بہ تر ہے اپنی جذباتی شدت انگیزی کے باوجود بھی اپنے اندر ایک بے مثال معصومیت رکھتا ہے "گاؤں" سے رشتہ منقطع کرنے کے باوجود گاؤں کی پوری آبادی کھلنڈرے معصوم بچپن، کے علاوہ بیل گاڑی کی قدیم تمازت شاعر کے سینے کے اندر بار بار ہچکولے پیدا کرتی ہے ؎

کچی سڑکوں سے لپٹ کر بیل گاڑی روپڑی   غالباً پردیس کو کچھ گاؤں والے جائیں گے

معصوم بچپن، گاؤں کا گھر، بیل گاڑی کی سادگی اور کچی سڑکوں سے اٹھتی ہوئی مہک غزلوں میں رچی بسی ہے۔ گاؤں سے ہجرت کرنے والا یہ معصوم بچہ جو منور رانا کی جواں سال شاعری میں اچھلتا کودتا اور شرارت کرتا نظر آتا ہے۔ گاؤں سے ہجرت کر چکا ہے۔ اور سر پہ "ماں" کا سایہ اور اس کی دعا لیتا آیا ہے۔ گاؤں کی پگڈنڈی شاعر کو مسلسل آواز دیتی ہے۔ اور اس آواز کو روکا نہیں جا سکتا ہے۔ لہٰذا شاعر گاؤں کو واپس چلنے کی ہدایت تو کرتا ہے لیکن خود ہنگام شہر کی نذر ہے ؎

یہ مانا گاؤں کی پگڈنڈیاں ہم کو بلاتی ہیں   مگر مشکل بہت ہے اب ہمارا لوٹ کر جانا

شہر کی بنیاد معیشت کی چالبازی کی وجہ سے ہے لہٰذا شاعر اس دلدل میں پھنس چکا ہے۔ اور دوران سفر ریل میں بھی کمائی کی خطرناک صورت حال پر سوچتا ہے۔ گاؤں کی مٹی کا جادو منور رانا کی شاعری کے بدن میں خون بن کر دوڑ رہا ہے۔ لہٰذا وہ کہتا ہے ؎

بڑے شہر میں رہ کر بھی برابر یاد کرتا تھا   وہ اک چھوٹا سا اسٹیشن کا منظر یاد کرتا تھا

شعر کی ترکیب پر غور کیجیے، کچی سڑک سے لپٹ کر بیل گاڑی کا رونا، اور چھوٹے سے اسٹیشن کا تصور ——— شاعری معصومیت سے قریب تر ہوتی بہن اور ماں کی یاد اس گھر (کچا مکان) کا ذکر جو بہت پیچھے کہیں گرد ہوں کے اٹھتے ہوئے بادلوں میں گم ہو گیا ہو۔ وہ ماسوریں جو جل گئی ہیں۔ منور رانا کی پوری شاعری پر نوستالجیا (NOSTALGIA) کی دبیز چادر ڈال دیتی ہیں۔ اور ان کا شعری ردیہ ترمیت سے آراستہ ہو جاتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ منور رانا کے غزل گاؤں میں گاؤں کا ایک سیدھا سادا لڑکا بھٹکتا ہوا ملتا ہے

یہ لڑکا بہت معصوم بہت شوخ ہے۔ جو شہر کے ریلے ٹھیلے میں کھو گیا ہے۔ یہ ایک ایسا بچہ ہے جو لاپتہ ہے۔ لیکن یہ لڑکا ان کی شاعری میں برابر جھانکتا ہوا ملتا ہے۔ اور ان کی شاعری کے نقائص کو اپنی ہنسی سے دھوتا بھی رہتا ہے۔ یہ بچہ اختر الایمان کے بچے سے مختلف نہیں۔ لیکن اس کا شدت اور کردار کی تکمیل و تعمیر مکمل نہ ہو پائی۔ یہ بچہ سطروں میں لشکارا ہے۔ یہ بچہ جو شاعر کے باطن میں زندہ ایک کردار ہے۔ کمزور تو ہے لیکن بدصورت نہیں۔ یہ بچہ شہر آشوب میں بھٹک کر زخمی تو ہے لیکن گھر واپس جانے کی چاہت یا پھر اپنی مٹی سے ہم آہنگ ہونے کی خواہش شاعری کو اعتبار سے مملو کرتی ہے۔ یہ بچہ "ماں" کے COMPLEXES میں مبتلا نہیں۔ صرف اس کی محبت کا اسیر ہے۔ شاعر پوری شدت سے اس معصوم بچہ کو اس کی شرارتوں کو دوبارہ پانے کے لئے لپکتا ہے ؎

ہم ایک تتلی کی خاطر بھٹکتے پھرتے تھے　　　کبھی نہ آئیں گے وہ دن شرارتوں والے

بہت زخمی تھے اس کے ہونٹ　　　وہ بچہ مسکانا چاہتا تھا

سفیدی آ گئی بالوں میں اس کے　　　وہ باعزت گھرانا چاہتا تھا

ان شعروں میں تتلی کی تمثیل گزرے ہوئے بچپن کے کھو جانے کا دکھ، زخمی ہونٹ، اور مسکرانے کی خواہش اس بچے کے چہرہ اور کردار کی تعمیر ہی نہیں کرتے شاعر کی تخلیق کو یکسر معاصر انسان کے نصیب سے جوڑتے ہیں۔ تیسرے شعر میں باعزت گھرانے کی دھن میں بالوں میں سفیدی آنے تک عہد جدید کی کرب انگیزیوں کی پوری کہانی جھلکتی ہوئی ہے۔ یہ بچہ کلکتہ کی کڑوی کسیلی فضا میں جوان ہو چکا ہے۔ شہر میں بے پناہ لمحوں کو جوڑ کر گڑیوں کے گھر بنانے والے بچے کی جوانی درد اور چبھن سے آراستہ ہے۔ لیکن اپنی تفہیم میں وہ بالکل اکیلا اور تنہا ہے ؎

ہم تماشہ بھی تو ایسی جگہ　　　تھیں نہ آنا جہاں دور تک کھو گیا

اس درجہ مصائب میں جیا ہوں　　　اب کوئی بھی موسم ہو پسینہ نہیں آتا

ہوائیں چپکے چپکے کان میں آ کر یہ کہتی ہیں　　　پرندو! اڑ چلو اب آب و دانہ ختم ہوتا ہے

جس میں صدیوں سے غریبوں کا لہو جلتا ہو　　　وہ دیا روشنی کیا دے گا سیاہی دیگا

ان اشعار میں شاعر کا ایک مکمل کرب سامنے آتا ہے شعری رویے میں تضادات بھی ہیں۔ جو امکانات کی دلیل ہیں۔

پہلے شعر میں دکھ، تنہائی، اور شہر کی بے توجہی تو دوسرے میں کسی بھی موسم میں پسینہ نہ آنے کی خوب صورت ترکیب تضاد کے اعتماد کو سنبھال رکھتا ہے۔ تیسرے میں پرندے کے اڑ جانے کی ہیئت تضاد کی موجودگی کی دلیل ہے۔ اور آخر شعر میں شعور وقت کی جھلک!

مختصر یہ کہ منور رانا کی شاعری میں منظم تسلسل کی موجودگی ہے۔ گاؤں سے بچے کی ہجرت، بچے کا شہر میں پروان چڑھنا، اور شہر کی سفاکی میں جواں سال شاعر کا تنہا جی داری سے دکھ اٹھانا شعری تاریخ کی حیثیت لیتا نظر آتا ہے۔ دوسری طرف ان شعروں میں پختہ شعور کی کارفرمائی ہے۔ جو خیالات کو نئے زاویئے میں ڈھالنے میں کامیاب بھی ہے۔ لیکن میں کچھ نقائص کی طرف بھی رانا صاحب کی توجہ چاہوں گا۔ ایسا نہ ہو کہ امکانی شاعر بچے کے سنبھل میں عہد پختگی کی شاعرانہ بلندی سے محروم ہو جائے۔

غزل ایک ایسی صنف ہے کہ جہاں معاصر دنیا کے بے پناہ مشاہدات و تجربات کے امکانات ہیں۔ لیکن غزل کی ایک اپنی الگ پہچان بھی ہے۔ نئے مضمون کے ساتھ نئی چاشنی اور نئی لفظی بھی ہو۔ منور رانا کی غزلوں میں، بچاؤ کی سمت کمی ہے۔ اور ابہام کی کیفیت تازہ دنیا لئے ہوئے قاری کو لبھاتی ہے۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ جہاں مضمون بلند نہیں ہوتے وہاں تنگی، ادھاؤ، اور ابہام کی کیفیت تازہ دنیا لئے ہوئے قاری کو لبھاتی ہے۔ دوسری طرف غزل یا شاعری کی کسی بھی صنف میں سادگی کی تو اہمیت ہے لیکن سادہ پن کی نہیں۔ سپاٹ سادہ اشعار غزل کی مکمل اکائی کو مجروح کرتے ہیں۔ ایسے اشعار ؎

میں دہلی میں بیٹھا ہوا سوچ رہا ہوں اس دور میں آسانی سے پیسہ نہیں آتا

یا

تم کو یوسف نہ ملا ہم کو زلیخا نہ ملی

اور اس قبیل کے بہت سارے اشعار جدید شعری حسیات اور منور رانا کے شعری رویئے کے لئے مضر ہیں۔ اضافت سے خالی اس شاعری میں بہت سے خیال نثر میں بیان کئے جا سکتے ہیں۔ غزل کے دو مصرعے تو جہان نو کا الزام اٹھاتے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی ایک نیا ابھرتا شاعر جو موت کی چاپ کو بھی زندگی کے پہلو بہ پہلو سن رہا ہو وہ امکان کے نئے روشن رکھتا ہے ؎

جب ہوا سوکھے ہوئے پتے اڑا لے جائے گی میری خاطر کوئی مصروف دعا ہو جائے گی

مجھکو گہرائی میں مٹی کی اتر جانا ہے زندگی باندھ لے سامان سفر جانا ہے

چند لفظی بندشوں سے رانا کی غزلوں کا خمیر تیار ہوا ہے، مثلاً کچا مکان، گاؤں کا پنگھٹ، امیروں کے پتھر، مٹوں کا پوسٹر، پرندے اور گھونسلے، جنت شہر، خوابوں کی چھاؤں، [illegible]، اور

جدید اردو غزل کا نمائندہ شاعر منوّر رانا

سید احمد قادری

اردو غزل بڑی کٹھن اور دشوار گزار راستے پر چل کر آج حیات و کائنات اس کے اسرار و رموز اور عصر حاضر کی تمام تر کربناکیوں اور تلخیوں کو اپنے اندر سمو کر جدید اردو غزل کی شکل میں سامنے آئی۔ اور غالباً ایسی ہی جدید اردو غزل جس میں صرف حسن و عشق اور جام و سبو کے قصے نہ ہوں بلکہ زندگی اور اس کے عوامل کا خوب صورت اظہار ہو کا تصور کلیم الدین احمد کے ذہن میں بھی تھا۔

عہد حاضر میں ہر طرف خوف و ہراس درد و کرب، گھٹن، بے چہرگی، محرومی، بدحالی، استحصال کا بول بالا ہے ایسے ماحول سے شاعر کا جو عام لوگوں سے زیادہ حساس واقع ہوا ہے متاثر ہونا فطری ہے۔

منور رانا عصر جدید کے ایسے ہونہار شاعر ہیں، جنھوں نے اپنے فکر و فن مطالعہ و مشاہدہ اور احساسات و جذبات کے خوب صورت اظہار سے بہت کم عرصے میں اپنی ایک پہچان بنالی ہے۔ مشہور شاعر والی آسی نے اپنے اس شاگرد شاعر سے صرف چھ تبل توقعات وابستہ کی تھیں کہ:

"جس شاعر کے یہاں غزل کی روایت سے بغاوت اتنے خوب صورت انداز میں ہو
وہ ضرور آگے جائے گا اور نئی اردو غزل کو بہت کچھ دے گا"

اور اس شاعر نے اپنی ذہانت و صلاحیت اور فکر و نظر سے یقینی طور پر نئی اردو غزل کو بہت کچھ دیا ہے۔ منور رانا نے جدید اردو غزل میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے اس لئے ان کے ذکر کے بغیر جدید اردو غزل کی تاریخ نامکمل رہےگی۔

منور رانا نے نہ صرف زمانے کے تغیرات کو قریب سے دیکھا ہے بلکہ جھیلا اور بھوگا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اظہار میں اور ان کے خیال میں صداقت نظر آتی ہے۔ عصر حاضر کی تمام تر کربناکیوں اور تلخیوں اور محرومیوں سے رانا بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ یہ تاثر ان کے اشعار میں نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔

منور رانا کا مطالعہ و مشاہدہ بڑا گہرا ہے۔ ان کی گرفت فن پر بھی مضبوط ہے۔ اس طرح رانا ہمیں شعر کہنے کی وہ فنی اور فکری دونوں لحاظ سے قابل قدر اور متاثر کن ہوتا ہے۔ مخصوص اور منفرد لب و لہجہ والے اس شاعر

کے یہاں علامتوں، استعاروں اور تشبیہوں کا استعمال بڑے سلیقے، خوب صورت اور دلکش و دلچسپ نظر آتا ہے اور اہم بات یہ ہے کہ ان کے استعمال سے ترسیل یا ابہام کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ فہم و ادراک کے نئے دروازے وا ہوتے ہیں۔

ان ہی خصوصیات کی بنا پر رانا کو ان کے ہم عصر شعرا مثلاً ناصر کاظمی، شکیب جلالی، کشور ناہید، اختر، پروین شاکر، ندا فاضلی، اور ظفر اقبال کے وغیرہ کے درمیان بآسانی پہچانا جا سکتا ہے۔

چھوٹی بڑی بحروں میں منور رانا سیدھے سادے اور عام فہم لفظوں میں اتنی بڑی اور اہم باتیں کہہ دیتے ہیں۔ کہ بعض اوقات فلسفہ کا گمان ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ رانا فلسفہ نہیں بلکہ حیات و کائنات اور اس کے رموز کو پیش کرتے ہیں۔ اور عصر حاضر کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی تعفن پر بڑا گہرا طنز کرتے ہیں۔ رانا نے روایت سے یکسر بغاوت بھی نہیں کی ہے۔ بلکہ وہ اس سے رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ کر ان کے یہاں روایت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ رانا آج بھی ماضی میں پناہ لینے کے ساتھ ساتھ سنہری یادوں کے جھروکے سے جی رہے اس لئے کہ آج کے اس ہنگامی اور سیاسی دور میں حساس انسان کو ہر لمحہ ذہنی جھٹکوں سے دوچار ہونا پڑتا۔ ایسے میں ماضی اور اس کے حسین یادیں ہی چند ساعتوں کے لئے اس درد و کرب سے بھری دنیا میں دور لے جاتی ہیں۔ رانا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہم گاؤں میں جب تک رہتے تھے یہ سب منظر مل جاتے تھے
دو چار کنویں مل جاتے تھے دس بیس شجر مل جاتے تھے

ہم ایک تتلی کی خاطر بھٹکتے پھرتے تھے
کبھی نہ آئیں گے وہ دن شرارتوں والے

حالات نے چہرے کی چمک چھین لی ورنہ
دو چار برس میں تو بڑھاپا نہیں آتا!

تو اب گاؤں سے رشتہ ہمارا ختم ہوتا ہے
پھر آنکھیں کھول لی جائیں کہ سپنا ختم ہوتا ہے

عصر حاضر کی مصیبتوں، محرومیوں اور تلخیوں سے منور رانا گھبراتے نہیں ہیں۔ بلکہ ان مصائب سے مصالحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں چونکہ عصر حاضر کے یہی انعام ہیں۔ اس لئے ان سے مصالحت اور سمجھوتہ ضروری ہے۔ ورنہ آدمی گھٹ گھٹ کر مر جائے ؎

مسلسل دھوپ کے چلنے کا یہ انعام ہے رانا
کہ اب پیڑوں کے سائے بھی بُرے معلوم ہوتے ہیں

شجر اندر ہی اندر جل رہا ہے　　　مگر حسب ضرورت پھل رہا ہے

اس درجہ مصائب کے جہنم میں جلا ہوں　　　اب کوئی بھی موسم ہو پسینہ نہیں آتا !!

سقراط جیسا شخص بھی جس کو نہ پی سکا　　　اس تلخیٔ حیات کو بھی ہم نے پی لیا

منور رانا کی غزلوں کا مطالعہ کرتے وقت بے اختیار خلیل الرحمٰن اعظمی کی ایک بات یاد آتی ہے انہوں نے ایک جگہ لکھا تھا :

"جدید تر غزل کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس غزل پر آپ کسی قسم کا لیبل نہیں لگا سکتے نہ کسی ایک صفت نہ کیفیت کے دائرے میں اسے مقید کر سکتے ہیں"

خلیل الرحمٰن اعظمی کی بتائی ہوئی یہ خصوصیات منور رانا کی غزلوں میں نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ منور رانا نہ کسی ازم کے زیر اثر ہیں اور نہ نعرہ بازی کرتے ہیں بلکہ ان کے یہاں موضوع کا تنوع ہے۔ اور شاعر جس عہد اور جس ماحول میں جی رہا ہے اس میں جو سیاسی اتھل پتھل ہے اس میں جو سماجی نابرابری ہے، معاشرتی اور تہذیبی خلا ہے اور ان سے پیدا ہونے والے جو عوامل ہیں۔ ان پر شاعر کی بڑی گہری نگاہ ہے۔ یہ شاعر ایسے میں مختلف کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے جن کا اظہار اپنے مخصوص و منفرد لب و لہجہ میں خوب صورتی اور البیلے انداز سے کرتا ہے ؎

ہائے کتنا خوب صورت گالیاں دینے لگے　　　اب میرے احباب مجھ کو کرسیاں دینے لگے

روتے ہوئے بچھڑنے کی فصلیں چلی گئیں　　　شہروں سے اب خلوص کی رسمیں چلی گئیں

ہم نہ دلی تھے نہ مزدور کی بیٹی لیکن !　　　قافلے جو بھی ادھر آئے ہمیں لوٹ گئے

بازار میں عجیب کل ایک حادثہ ہوا　　　مزدور کے پسینے کو ریشم نے پی لیا

نیا چراغ جلاتے ہیں جب بھی ہم رانا　　　ہمیں ہواؤں کے قصے سنائے جاتے ہیں

سب کہتے ہیں یہ دلکش ہمارا سمنے کی ایک چڑیا ہے
اس بات کو وہ کیسے مانے جسے بھوکا سونا پڑتا ہے !

بہت زخمی تھے اس کے ہونٹ لیکن　　وہ بچہ مسکرانا چاہتا تھا

منور رانا کے یہاں ایسے سیاسی، سماجی اور معاشرتی شعور کے ساتھ ساتھ حسن وعشق کی بھی نمایاں کارفرمائیاں دیکھنے کو ملتی ہیں جن میں تلمیحوں کے ساتھ ساتھ تازگی اور شگفتگی بھی ہے۔ اور یہ حسن وعشق کا گہرا تجربہ اور مشاہدہ بھی۔ رانا کے ایسے اشعار پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ حسن وعشق کی یہ باتیں صرف سنی سنائی نہیں ہیں۔ بلکہ رانا نے انہیں قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے ؂

کہاں تھا پاس ان کو بھی وعدے کا ان دنوں　　ایک بار بھیگتے ہوئے ساون میں آئے تھے

جب ان کا سامنا ہوا کچھ بھی رہا نہ یاد　　ویسے کئی سوال میرے من میں آئے تھے

تذکرہ تھا تیری آنکھوں کا سر بزم کہیں　　اور مجھے میر کا دیوان بہت یاد آیا

زخم ناصحنے کے چھلکے لگے گیسو کی طرح!　　اب تری یاد بھی آتی ہے تو خوشبو کی طرح

منور رانا کے ایسے اشعار دل ودماغ کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ حسن وعشق کی دنیا آباد کرتے ہیں رانا کے یہاں جو سادگی، نفاست اور عام فہم انداز پایا جاتا ہے وہ انہیں منفرد اور قابل قدر بناتا ہے ●

بقیہ :۔ منور رانا۔ آج کا شاعر

پریشانی کا موسم بھی بہت دلچسپ موسم ہے　　میرے چہرے کو لوگوں نے غموں کا پوسٹر جانا

میرا بن باس پہ جانے کا ارادہ تھا مگر!　　مجھکو دنیا میں کہیں بھی کوئی سیتا نہ ملی

پیڑ امیدوں کا یہ سوچ کے کاٹا نہ کبھی　　پھل نہ آ پائیں گے اس میں تو ہوا ہی دینگے

بڑے شہروں میں رہ کر بھی برابر یاد کرتا تھا　　وہ اک چھوٹے سے اسٹیشن کا منظر یاد کرتا تھا

بچپن میں کسی بات پہ ہم روٹھ گئے تھے۔　　اس دن سے اسی شہر میں ہیں گھر نہیں جاتے ●

منفرد آواز کا شاعر۔ منوّر رانا

پروفیسر نصرت جمیل

منوّر رانا آخر ہیں کون : اسٹیج آرٹسٹ، بزنس مین، ٹی وی آرٹسٹ، اناؤنسر یا شاعر۔ ؟
اس لسٹ میں ایک اور خوبی کا اضافہ ہوسکتا ہے۔ اور وہ خوبی ہے " ایک اچھا انسان "۔ جی ہاں! آدمی تو یوں ہم سب ہیں۔ پر آدمی کو انسان بننے کے لئے جانے کتنے پروسس سے گزرنا پڑتا ہے۔ بقول غالب مرحوم ؂

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا ۔۔۔ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

دنیا میں کتنے لوگ ایسے ملیں گے جنھیں مرتے دم تک انسان کہلانے کا شرف حاصل نہ ہوسکا۔ وہ تہذیب وشائستگی خوش خلقی، بلند اخلاقی اور شرافت نفسی کی دولت سے ہمیشہ محروم ہی رہے۔

منور ایک اچھے انسان ہیں اور ایک اچھے بلکہ بہت اچھے شاعر بھی ہیں۔ ان کی شخصیت کے کئی روپ ہیں۔ ہر روپ انوکھا، دلچسپ اور پرکشش۔

غریبوں، مجبوروں اور لاچاروں سے ہمدردی رکھنا، دوسروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھنا، قرابت داروں، عزیزوں، دوستوں، یہاں تک کہ دشمنوں کو بھی مدد کرکے خوش ہونا۔ ان کے آڑے وقت میں کام آنا ان کی شخصیت کا وہ عجیب وغریب پہلو ہے جو انہیں عام انسانوں سے مختلف بناکر پیش کرتا ہے۔ ہر وہ شخص جو انہیں قریب سے جانتا ہے ان کی خوبیوں کا مداح ضرور ہے۔ اور اگر اس سے ان کی خوبیوں کے بارے میں کچھ کہا جائے تو وہ کچھ بڑھائے بغیر نہیں رہے گا کہ آخر ان کی خوبیوں کا احاطہ کہاں سے کیا جائے۔ کم وبیش میں بھی اسی قسم کی کیفیت سے آج دوچار ہوں۔ ایک ایسے شخص کے بارے میں لکھنا جس میں معائب کم اور محاسن زیادہ ہوں تو مضمون کے توصیفی ہوجانے کا احتمال زیادہ رہتا ہے۔

کلکتہ کے تپتے ہوئے صحرا میں منور رانا کا وجود ابر باراں سے کم نہیں۔ یہاں کی اردو محفلوں، جلسوں اور انجمنوں کی تازگی، شوخی، طراری اور بانکپن، منور کے دم سے قائم ہے۔ ورنہ ان نیم مردہ ادبی سرکلوں میں دھرا ہی کیا تھا۔ یہاں کے سوشل اور کلچرل پروگراموں کو گنگناہٹ کرنے اور نیم مردہ ادبی سرکلوں میں پھر سے نئی جان ڈالنے

کے سلسلے میں اگر کوئی ایک نام لیا جائے تو وہ نام صرف منور رانا کا ہوگا۔ اردو کے سلسلے میں ٹی وی پر جتنے بھی کل پروگرام ہوتے ہیں۔ ان میں سے ۸۰ فیصد منور رانا ہی کے ذریعہ کنڈکٹ ہوتے ہیں۔ بڑے پیمانے پر گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں منعقد ہونے والا سالانہ جشن مشاعرہ بھی منور ہی کے اردو دوستی اور اردو سرپرستی کا ایک حصہ ہے۔

منور رانا کو میں کوئی کل یا پرسوں سے نہیں بلکہ برسوں سے جانتا ہوں۔ مگر اس وقت میں اسے ایک اسٹیج آرٹسٹ کی حیثیت سے جانتا تھا۔ منور رانا ایک باصلاحیت (TALENTED) فنکار ہے۔ ایک باکمال آرٹسٹ ہے۔ اس امر سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

وہ شاعری کو ایک آرٹ اور ایک فن سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک شاعری مرصع کاری سے کم نہیں۔ مگر اس نازک فن کے لئے جس طرح فنکار کا ماہر ہونا ضروری ہے اسی طرح شاعری کے فن کو برتنے کے لئے شاعر کو فن جاننے کی ضرورت ہے۔

شاعری زندگی کی عکاس ہوتی ہے۔ شاعری کا تعلق جذبات و احساسات سے ہے منور رانا شاعری کو خارجی و داخلی جذبات کے اظہار کا آلہ بناتے ہیں۔ کبھی جذبات نرم و نازک، سبک اور لطیف ہوتے ہیں تو کبھی تیز و تند و سرکش و باغی۔ منور کی شاعری کی جڑیں اس سماج کی مٹی میں پیوست ہیں۔ سماج کے فرسودہ رواجوں کے خلاف ظلم و استبداد اور استحصال کے خلاف منور کی شاعری ایک احتجاج (PROTEST) ہے۔ ایک آواز ہے جسے دبانے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ سماج کے خلاف ان کی یہ نفرت کسی خطرناک طوفان کا روپ نہیں دھارتی کیونکہ وہ فطرتاً ایک نرم دل شاعر ہیں۔ سماجی نابرابری، انسانی مجبوری، مظلومی اور محرومی پر ان کا دل کڑھتا ہے۔ حق و انصاف کے لئے لڑنا جانتے ہیں مگر انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ حق کے لئے آواز بلند کرنا اور حق کی راہ پر چلنا بڑا کٹھن ہے ؎

راہ حق میں منزل دار و رسن آنے تو دو   جو زباں رکھتا ہے وہ بھی بے زباں ہو جائیگا

سب کہتے ہیں یہ دیس ہمارا سونے کی اک چڑیا ہے   اس بات کو وہ کیسے مانے جسے بھوکا سونا پڑتا ہے

منور رانا کی شاعری میں طنز کو زیادہ دخل ہے اور شاید اسی وجہ سے ان کے کلام میں تیکھا پن موجود ہے ؎

ماں باپ کی بوڑھی آنکھوں میں اک فکر سی چھائی رہتی ہے
جس کمبل میں سب سوتے تھے اب وہ بھی چھوٹا پڑتا ہے

منور نے اس چھوٹی سی زندگی میں بڑے بڑے انقلابات دیکھے ہیں۔ بڑے دکھ جھیلے ہیں۔ زندگی کا گہرا اور بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ انسانی زندگی غم و آلام اور تشنہ کامی سے بے حال ہے۔ زندگی غم بخشتی ہے۔ پر غم سے ہراساں نہیں ہونا چاہئے۔ غم سے گذر کر ہی مسرت کی چھاؤں مل سکتی ہے ؎

غم کی صعوبت جو میرے دل کو دیا تھا تو نے   زندگی تیرا وہ احسان بہت یاد آیا۔

زندگی لاکھ غموں سے گھری ہی ہو اسے جینے کے لئے سلیقہ چاہئے۔ جنہیں سلیقہ نہیں انہیں زندگی کی راحتیں بھی نصیب بھی نہیں ہوتیں ؎

جو دھوپ میں چلنے کا سلیقہ نہیں رکھتے ان پیڑوں کو پتوں کی قبا بھی نہیں ملتی۔

لذت گریہ سے دل جب آشنا ہو جائے گا تجھ پہ ہر لمحہ مسرت کا سزا ہو جائے گا :

زندگی میں یوں تو حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ پر کبھی کبھی یہ حادثے اتنے اچانک اور اتنے شدید ہوتے ہیں کہ تمام پلاننگ دھری کے دھری رہ جاتی ہے۔ اور آدمی کو اتنی مہلت بھی نہیں ملتی کہ وہ جانے سے پہلے وصیت ہی کر سکے ؎

میں وصیت کر سکا کوئی نہ وعدہ کر سکا میں نے سوچا بھی نہیں تھا حادثہ ہو جائیگا

منور کی شاعری دھیمی دھیمی آنچ ہے جو احساس کو پگھلاتی ہے۔ ایک نشتر ہے جو سینے میں اترتا چلا جاتا ہے۔ زبان و بیان میں تازگی و چستی اور صفائی ہے۔ منور الفاظ کے استعمال پر عبور رکھتے ہیں۔ عام طور پر جو نئی پود میں غزلیں کہتے ہیں۔ مگر تاثیر میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ وہ ایک منفرد آواز کے شاعر ہیں۔ ان کا لب و لہجہ جدید ہے۔ ان کی آواز ایک منفرد آواز ہے۔ سارے ہندوستان میں جانی اور پہچانی آواز، اپنی طرز کی انوکھی۔ الی اور پرکشش۔ اور شاید اسی انفرادیت کی وجہ سے انہیں جو عزت و شہرت ملی ہے۔ اس نے ان کے حریفوں کو بھی م دیا ہے۔ حریف کیوں نہ ہوں۔ انہوں نے برسہا برس کی شاعری کے بعد بھی کوئی مقام نہ مل سکا۔ ان کی شہرت آج بنگال کی سرحد کو عبور نہیں کر سکی ہے۔

منور رانا اس شاعرانہ چشمک کو اپنے لئے ایک نیک فال سمجھتے ہیں۔ بلکہ اپنے بدخواہوں کے ساتھ تو ، کا رویہ اور بھی نرم ہوتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ایسے لوگ ہمدردی کے مستحق بھی ہیں۔ منور کی فطرت میں زندہ دلی، شوخی اور بے فکری پائی جاتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے وہ ہر دل عزیز بھی ہیں۔ صاف گو اور صاف باطن نص کسی سے ڈرتا نہیں ہے۔ خدا کی ذات پر اسے بھروسہ ہوتا ہے ؎

ہر وار اکیلے ہی سہا کرتے ہیں رانا ہم ساتھ میں لے کر کبھی لشکر نہیں جاتے

پنے حریفوں کے ہتھکنڈوں سے وہ واقف ہیں مگر وہ گھبراتے نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں۔ اور جو ما پر ہوتا ہے اس کا اللہ ساتھ دیتا ہے ؎

گھیرے ہوئے ہیں چاروں طرف سے مجھے حریف موسیٰ کے رہنما کوئی رستہ نکال دے

منور کو اپنی ماں سے بے انتہا محبت ہے۔ ان کی شاعری میں ماں کی ممتا اور اس کی دعاؤں کا جا بجا ذکر ہے۔ وہ اکثر کہتے ہیں کہ یہ عزت و شہرت، ترقی و خوشحالی نیز اسباب ظاہری سب اسی کی دعاؤں کا فیض ہے ؎

لبوں پہ اس کے کبھی بد دعا نہیں آتی — بس ایک ماں ہے جو مجھ سے خفا نہیں ہوتی

کیا جانے کہاں ہوتے میرے پھول سے بچے — ورثے میں اگر ماں کی دعا بھی نہیں آتی!

منور خود داری کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں وہ بچپن ہی سے بڑے خوددار واقع ہوئے ہیں ؎

بچپن میں کسی بات پہ ہم روٹھ گئے تھے — اس دن سے اسی شہر میں ہیں گھر نہیں جاتے

منور کی شاعری کا کینوس بڑا وسیع ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کا گہرا مطالعہ و مشاہدہ رکھتے ہیں۔ انسانی زندگی کی محرومی و بے چارگی اور بے سمتی انہیں بے چین و بے قرار رکھتی ہے۔ زندگی کے چھوٹے بڑے واقعات کا وہ اثر قبول کرتے ہیں۔ اور بالکل نئے انداز سے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں ؎

بڑی بے چارگی سے لوٹتی بارات تکتے ہیں — بہادر ہو کے بھی مجبور ہوتے ہیں دلہن والے

ہمارے ساتھ چل کر دیکھ لیں یہ بھی چمن والے — یہاں اب کوئلہ چنتے ہیں پھولوں سے بدن والے

منور رانا کی شاعری کی عمر کوئی زیادہ نہیں ہے۔ یہی کوئی لو یا دس سال سے مشق سخن جاری ہے۔ مگر ان کے کلام کو دیکھ کر ان کے کہنہ مشق ہونے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ ایک اچھے شاعر ہیں۔ فطرت نے انہیں ایک حساس دل عطا کیا ہے۔ شروع شروع میں انہوں نے غزلوں میں اصلاح لی۔ جہاں تک الفاظ کی بندش بحر اور وزن کا تعلق تھا۔ بعد میں اس کی بھی ضرورت نہ رہی۔ ملک کے نامور شاعر حضرت والی آسی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ ان کے استاد منور کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔ انہیں اس نوجوان شاعر پر فخر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ منور بہت آگے جائیں گے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں۔

یا

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

منور ذہین گو شاعر ہیں۔ وہ تحت میں پڑھتے ہیں۔ جب اپنا کلام سناتے ہیں۔ تو ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ اور شعر و نغمہ کی مسحور کن فضا قائم ہو جاتی ہے۔

منور کی شاعری چونکا دینے والی شاعری ہے۔ اس قلیل عرصے میں منور کی آواز کی انفرادیت کو سبھی نے محسوس کیا ہے۔ وہ شاعری میں دور کی کوڑی نہیں لاتے۔ نہ ہی غیر معقول اور غیر منطقی باتیں کہتے ہیں۔ انسانی

ماحول اور گرد و پیش کے معمولی سے معمولی واقعات سے متاثر ہوتے ہیں اور یہی واقعات ان کے لئے بھی عام طور پر (SOURCE OF INSPRATIONS) کا کام دیتے ہیں۔ وہ زندگی کے حقائق کو خوب سے خوب صورت اور دلآویز انداز میں پیش کرتے ہیں۔ زندگی کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے، پرکھا ہے، جانا ہے، اور سمجھا بھی ہے۔ اس لئے ان کے تجربات اور مشاہدات کو کون جھٹلا سکتا ہے

منور کے چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں ؎

زخم ماضی کے جھکنے لگے گیسو کی طرح ! — اب تری یاد بھی آتی ہے تو خوشبو کی طرح

ہو سکے تو دوسری کوئی جگہ دیدیجئے — آنکھ کا کاجل تو چند آنسو بہا لے جائیں گے

بے سبب آنکھ میں آنسو نہیں آیا کرتے — آپ سے ہوگا یقیناً مرا رشتہ کوئی !

ہمارے دوستوں نے ہم پہ پتھر تو بہت پھینکے — مگر پھر بھی ہماری خندہ پیشانی نہیں جاتی

گھر کی دہلیز پہ روشن ہیں وہ بجھتی آنکھیں — مجھکو مت روک مجھے لوٹ کے گھر جانا ہے

دلکشی بھی نظر آتی ہے دکھ بھی بہت ہیں — یہ زندگی نیبعار کی اترن کی طرح ہے

کیا چمن کیا فصل گل سب کچھ نہاں ہو جائیگا — بجھ گئی آنکھیں تو ہر منظر دھواں ہو جائے گا

گاؤں کی ٹیس کا شاعر۔ منور رانا

شکیل صدیقی

اردو شاعری کو عشق و شراب اور ساقی کی شاعری کہہ کر بہت بدنام کیا گیا ہے۔ غزل کی حیثیت چونکہ شاعری کی کمر کی سی رہی ہے اس لئے غزل کو عام طور پر لوگوں نے شاعری کو پرکھنے جاننے اور سمجھنے کا ذریعہ بنایا۔ یہ صحیح ہے یا غلط۔ اس بحث میں پڑے بغیر یہ تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ اس سے غزل کو بحث کا سب سے زیادہ نشانہ بننا پڑا۔ اسے "نیم وحشی صنف" کہا گیا۔ اور ایک مخصوص دور میں تو یہاں تک کہا گیا کہ جو غزل کہے وہ شاعر نہیں ہے۔ لیکن اس سے غزل کی صحت پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ غزل کا فن دن بدن ترقی کرتا گیا۔ اور بہت مقبول ہوا۔ اس مقبولیت کی مختلف وجہیں لوگ بتا سکتے ہیں لیکن اس سچائی سے انکار مشکل ہے کہ غزل نے مخصوص تہذیبی پس منظر کے باوجود عصری آگہی کا عکس ہمیشہ ابھارا اور کوزے میں دریا چھپانے کی روایت کو قائم رکھا۔ خاص دور اور خاص آدمی کی بات یہاں نہیں کی جا رہی ہے۔ کئی شاعروں نے زمانے بھر میں بدنام محبت کو جو اکثر آدمی (شاعر) کا بالکل ہی ذاتی مسئلہ ہوتا ہے جس طرح سماجی سطح پر پیش کیا اور اسے جس طرح باہری دباؤ کی عکاسی کا ذریعہ بنایا وہ یقیناً شاعری کی تاریخ کا اہم حادثہ ہے۔ منور رانا کی غزلوں کا پچھلے دنوں ناگری رسم خط میں مطبوعہ مجموعہ "غزل گاؤں" اس مخصوص روش کی ایک کڑی ہے۔

سعادت حسن منٹو نے کبھی دعویٰ کیا تھا کہ آج کے زمانے کو جاننا ہو تو ان کی کہانیاں پڑھ ڈالو۔ منور رانا بھی پورے اعتماد کے ساتھ نہ سہی مگر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ گاؤں سے بچھڑ کر شہر میں زندگی کی جدوجہد جاری رکھنے والے فرد کی کشمکش جاننی ہو تو ان کی غزلیں پڑھ لی جائیں ۔

آنکھیں کھول لی جائیں کہ سپنا ختم ہوتا ہے
تو اس گاؤں سے اب رشتہ ہمارا ختم ہوتا ہے

لیکن منور رانا کا رشتہ گاؤں سے ختم ہونے کے باوجود ختم نہیں ہوتا۔ رشتے کہیں توڑنے سے ٹوٹتے ہیں ۔

تمہارے شہر کی یہ رونقیں اچھی نہیں لگتیں
ہمیں جب گاؤں کے کچے گھروں کی یاد آتی ہے

ہر سہولت تھی میسر لیکن اس کے باوجود ماں کے ہاتھوں کی پکائی روٹیاں اچھی لگیں

سلاست اور سادگی رانا کی غزلوں کی خصوصیت ہے۔ ان کے یہاں گہرائی نہیں لیکن بانکپن ضرور ہے۔ ان کی غزلیں فکر کو کوئی دیا روشن نہیں کرتیں۔ لیکن تجربات کے کھرے پن کی روشنی ضرور پھیلاتی ہیں ؎

حالات نے چہرے کی چمک چھین لی ورنہ دو چار برس میں تو بڑھاپا نہیں آتا

سفیدی آ گئی بالوں میں اس کے وہ باعزت گھرانا چاہتا تھا

کسی بچے کا یہ جملہ ابھی تک یاد آتا ہے یتیموں کو پڑھانے کوئی استانی نہیں آتی

زندگی کی چھوٹی چھوٹی لیکن بڑی واضح ان سچائیوں کو تجربات و مشاہدات کا حصہ بنائے ہوئے رانا زندگی کی اس تلخ حقیقت کو الفاظ عطا کرتے ہیں۔ جو طبقاتی تضاد کی شکل میں ہمارے معاشرے میں موجود ہے۔ وہ الفاظ کے پیچھے نہیں بھاگتے۔ زبان کو اس کی حقیقی نوعیت میں قبول کرتے ہوئے وہ احساسات کو انفرادی طور پر پیش کرتے ہیں ؎

ہمارے ساتھ چل کر دیکھ لیں یہ بھی چمن والے یہاں اب کوئلہ چنتے ہیں پھولوں سے بدن والے

تم اس کی لاش کو دیکھو نہ یوں حقارت سے یہ شخص پہلے امیروں کے گھر بناتا تھا

حالانکہ طبقۂ غربا کی ہمدردی رانا کے تاثراتی رویہ کے پس منظر میں ملتی ہے۔ لیکن یہ تاثراتی کیفیت ہی کبھی کبھی شاعر سے بڑی بات کہلوا دیتی ہے۔ بہت سے ترقی پسند شاعروں کی بہترین نظمیں اسی تاثرات کی دین ہیں۔ اس تاثراتی کیفیت کو جب فکر کا مواد ملتا ہے تو شاعر بڑی سنجیدگی کے ساتھ گہری، کہیں اندر تک جھنجھوڑنے والی بات کہنے کی منزل تک پہونچ جاتا ہے۔ اور اس کی تخلیقات لازوال ہو جاتی ہیں۔ رانا کا یہ شعر ان کے سیاسی فکر کو دھندلی ہی سہی مگر پہچان ضرور بناتا ہے ؎

جگمگاتے ہوئے شہروں کو تباہی دے گا اور کیا ملک کو مغرور سپاہی دے گا

رانا کی غزلوں میں موضوعات کا تنوع اور فکر و تخیل دونوں ہیں۔ لیکن ان کے یہاں مشاہدات کا رنگا رنگ زیادہ ہے۔ اس میں گاؤں کا تازہ پن نظر آتا ہے۔ اس سے نئے امکانات روشن ہوتے ہیں ؎

ہمیں دن تاریخ تو یاد نہیں بس اتنا اندازہ کر لو ہم اس موسم میں بچھڑے تھے جب گاؤں میں جھولا پڑتا تھا

سب کہتے ہیں یہ دلکش ہار اس سونے کی اک چڑیا ہے اس بات کو وہ کیسے مانے جسے بھوکا سونا پڑتا ہے

رانا نے میر سے اپنا سلسلہ ملایا ہے اس لئے کہ دکھ ان کو بھی راس آئے ہیں۔ دکھ تو لکھنے والے کا مقدر ہے۔ دکھ راس آئے یا نہ آئے دکھوں سے بچ پانا تو ممکن نہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ شاعر غم و آلام کے تئیں کیا نقطۂ نظر اپناتا ہے وہ اس سے امید کی توانائی حاصل کرتا ہے مایوسی کی ظلمت پھیلاتا ہے یا فیض کی طرح غم کے گھپ اندھیرے میں امید کی نئی کرن ڈھونڈتا ہے۔ اور زندگی کو نئی طاقت دیتا ہے۔ بہر حال رانا کے دکھوں سے بے بسی نہیں جھلکتی۔ امید کا دیا ان کے یہاں بھی روشن ہے۔

بہت زخمی تھے اس کے ہونٹ لیکن
وہ بچہ مسکرانا چاہتا تھا

بقیہ منور رانا سے ایک ادبی ملاقات

ڈیفینیٹ کی وجہ سے کبھی کبھی ربڑ کا کام ثابت نہیں ہوتا ہے۔ سوکھے ہوئے پیڑوں کو نپلیں آنے لگتی ہیں آپ کہیے گا کہ وہ کلیں جو نرسنگ ہوم میں رہتے ہیں ان کی مدد لے لی جائے گی۔ میں کہوں گا کہ آپریشن میں موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ اور آپ پر مقدمۂ قتل بھی چل سکتا ہے۔ لہٰذا اپنی آبرو اور عاقبت کا خیال کیجئے۔ اس قسم کے گناہوں سے بچئے۔ اور اب یوں بھی آپ لوگوں کی عمر گناہ کرنے کی نہیں رہ گئی ہے۔ آپ صرف دیکھ کر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

قصیدہ نہ تنقید

مسعود عابدی

یقیناً یہی ہوتا ہے کہ جب قریبی، بہت قریبی شخص کے بارے میں کوئی رائے پیش کرنے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ تو سخت مشکل آن پڑتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ایک تو ایسے شخص کے بے شمار پہلو نظر میں ہوتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی لکھو" وہ بھی لکھو" الگ ایک مشکل۔ خیالات اس قدر ذہن میں شدت سے دوڑنا شروع کرتے ہیں کہ قلم چوکڑی بھولا ہوا آہو بن جاتا ہے۔ کچھ اس طرح کی پریشانی کا سامنا اس وقت ہوا۔ جب منور رانا پر بحیثیت شاعر، دوست، انسان کچھ بھی لکھنے کا موقع ملا۔ اب سوچئے ذرا کہ کیا لکھوں۔ —— یہ کہنا! کہ وہ بڑے اچھے شعر کہتے ہیں۔ یا میرے بہت قریبی دوست ہیں۔ یا یہ بڑے نیک انسان ہیں۔ ان کے سینے میں ایک دردمند دل ہے۔

اب اس کے آگے کیا لکھوں؟

سنئے! اس شہر میں بلکہ اس ملک میں شعر کہنے والوں کی بھیڑ ہے حد تو یہ ہے کہ میرے چھوٹے سے محلہ میں کتنے شعر گو ہیں پتہ نہیں۔ لیکن بے شمار ہوں گے۔ کیونکہ دس بیس کو تو میں جانتا ہوں۔ اب کون کھاتے بہی لے کر بیٹھے اور ناموں کا اندراج کرتا رہے۔ میں جس شہر کی بات کر رہا ہوں یعنی کلکتہ۔ تو اس میں شاعروں کی بہتات ہے یہاں بڑی شدت سے شاعری ہوتی ہے۔ بے تحاشہ شاعر بستے ہیں۔ لیکن اگر آپ سنجیدگی سے شاعروں کو تلاش کریں تو اچانک ایسا لگے گا کہ گویا قحط پڑ گیا ہے۔ شاعر دستیاب ہی نہیں۔ بڑی تلاش و جستجو کے بعد دو چار ہیں ڈھلے ڈھلائے مل جائیں گے۔ آئیے ان میں کہیں منور رانا کو تلاش کریں۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ قریب چار پانچ مہینوں تک منور رانا سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ اور اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے کسی مشاعرے میں ایک غزل اچھال دی۔ خبر میرے کانوں تک پہنچی۔ میں نے کہا۔ چلئے! بیکار مباش کچھ کیا کر" والا قول مولانا کو بھی کہیں سے مل گیا۔ اب میں اس قدر خوفزدہ ہو گیا کہ ان تمام راستوں سے حفظ ماتقدم کے تحت پرہیز کرنے لگا جہاں ان کے مل جانے کا ذرا بھی خطرہ تھا۔

ایک دن کسی نے ایک شعر سنایا۔ آپ بھی سنئے ؎

قتل بھی ہوگا ہمارا تو یہیں پر ہوگا! فیصلہ جو بھی ہو دشمن کی زمیں پر ہوگا

ظاہر ہے کہ بڑا اچھا شعر ہے اور ہر اچھا شعر سننے کے بعد میں جو کرتا ہوں وہی کیا یعنی عادتاً پوچھ لیا، کس کا شعر ہے؟

جواب ملا: "منور رانا کا"

جی ...... ی ...... ی ...... ی میں چونکنا ہو گیا۔ کچھ دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اٹھ کر چل پڑا

ــــــــ ان راستوں پر جہاں منور رانا کے مل جانے کا ذرا بھی امکان تھا۔ وہ ملے۔ اور آج تک ملتے ہیں۔ مشق سخن جاری ہے۔ شعر کم لوگوں کو سناتے ہیں۔ ادھر ادھر کی باتیں زیادہ کرتے ہیں۔ مجھے ضرور سناتے ہیں۔ تو سنانے کی گزارش کرتا ہوں۔ یہ سب انہیں کے اشعار ہیں ؎

چراغ دل بجھانا چاہتا تھا۔ وہ مجھکو بھول جانا چاہتا تھا
مجھے وہ چھوڑ جانا چاہتا تھا مگر کوئی بہانہ چاہتا تھا
بہت زخمی تھے اس کے ہونٹ لیکن وہ بچہ مسکرانا چاہتا تھا!!

پہلے دونوں شعر تو اپنی جگہ ہیں۔ آخری شعر اس عرصۂ محشر کا منظر پیش کر رہا ہے۔ جس میں شاعر بہ چشم خوں بستہ و دل برداشتہ خود موجود ہے۔ حقیقت کے تلخ گھونٹ حلق سے نیچے اتارے جا رہا ہے۔ اور منہ بھی بنائے جا رہا ہے۔ اگر کہیں اس شعر میں "بچہ" مسکرا دیا ہوتا تو منور رانا نہ ہوتے۔ نہ رانا منبر ہوتا۔ اور نہ میری یہ تحریر۔ لفظ "بچہ" ایسی علامت ہے جو اپنے اندر تہہ در تہہ مفہوم رکھتی ہے یہ مصرع یوں بھی ہو سکتا تھا۔

؎ وہ لڑکا مسکرانا چاہتا تھا
؎ وہ پھر بھی مسکرانا چاہتا تھا

وغیرہ وغیرہ۔ لیکن بات نہیں بنتی۔ وہ ہی خانہ پری والا شعر ہو جاتا۔ تک بندی ہو جاتی۔ "بچہ" انسانی فطرت کی اشار طرف اشارہ کرتا ہے۔ کسی کی ضد کا تصور ابھرتا ہے۔ اور معصومیت کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ ذرا سا اور آگے بڑھیے۔ تو زخمی ہونٹوں والا بچہ نظر آئے گا۔ الفاظ کی دھند چھنٹ جائے گی۔ منظر اور صاف ہو جائے گا۔ تو پورا ایک واقعہ، ایک سانحہ، ایک حادثہ کچھ بھی کہہ لیجئے۔ ذہن میں ابھر جائے گا کہ صدیوں کھرچ کھرچ کر مٹانے کی کوشش کے باوجود نہیں مٹے گا۔ اور اگر مٹا بھی تو فکر کی ایک پرت کو اس طرح زخمی کر دے گا کہ زخم کرنے کے بعد داغ ضرور رہ جائے گا۔

حالانکہ منور رانا کی باقاعدہ شاعری کی عمر وہی ہے۔ جو انگنائی میں بھرے ہوئے برساتی پانی میں کاغذ کی ڈونگیاں بنا بنا کر ڈالنے والے لڑکوں کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعروں میں بھی وہی اکڑ اور اڑیل موجود ہے یہ بچپن کی ضد ہی تو ہے کہ کسی بات پر روٹھ گئے تھے تو آج تک گھر نہیں جاتے جبکہ اسی شہر میں رہتے ہیں ؎

بچپن میں کسی بات پہ ہم روٹھ گئے تھے
اس دن سے اسی شہر میں ہیں گھر نہیں جاتے

اسے اکیلا پڑھوں کوئی ہم سبق نہ رہے　　　میں چاہتا ہوں کہ اس پر کسی کا حق نہ رہے

ان دونوں شعروں میں بچپن کی ضد ہے یا اور کوئی چاہے تو کہہ سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ وہی خودداری کے اثر سے پیدا ہونے والی بدوماغی ہے جس نے تیر کے تمام عمر کڑھایا۔ لکھنؤ سے نکلوایا۔

ہنگامہ دار شہر کی ہاؤ ہو سے اکتا کر منور رانا نے اپنا ایک گاؤں بسا لیا۔ اس کا نام رکھا "غزل گاؤں" غزل گاؤں میں کچے پکے مکانات ہیں۔ کھیت کھلیان باغ باغیچے، میٹر، تالاب، جھیل، سب کچھ ہے۔ جو آئے یہاں کی سیر کرے۔ کچھ روز رہے۔ طرح طرح کے لوگ ہیں بچے، بوڑھے، جوان سب ہیں۔ کچھ معشوق بھی بستے ہیں۔ بڑی گہرائی ہے جن کی خدوخال میں۔ ان کے حسن میں بھی وہی سادگی، سادگی میں پرکاری، غضب کی تیور، بلا کی جنون، لفظوں کے لباسوں میں خیالات کے پیکر۔ ہر پیکر ایک کردار، اور ہر کردار بجائے خود ایک کہانی، یہ غزل گاؤں ہے۔

ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ منور رانا اس قبیل کے شاعر ہیں۔ جو شاعری میں تکلف اور تصنع کے قائل نہیں ہوا کرتے۔ ان کی شاعری ان کی اپنی زندگی کا آئینہ ہے۔ اپنے ہی دل کے حادثات کا بیان اور اپنے ہی قلب کی واردات کی تشہیر۔ بالکل سیدھا سا انداز، صاف سی زبان، مختراً ستھرا لہجہ ———— نہ مبالغہ، نہ گورکھ دھندا، نہ بھول بھلیاں۔ ان کو تو صرف اپنی باتیں کہنا آتی ہیں۔ وہ بھی بڑی بے تکلفی اور بڑی سادگی سے۔ لیکن ان کے اشعار سنتے وقت اکثر ذہن میں یہ مصرع آجاتا ہے ؎

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

دراصل میں یہی ہے کہ منور اپنی ذات کو کسی فردِ واحد کی ذات نہیں سمجھتے۔ بلکہ وہ اپنے اندر کسی بھی امکانی ذات کا وجود محسوس کرتے رہتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہر تڑپتے ہوئے جسم میں اپنے جسم کے خدوخال دیکھتے ہیں۔ اور اپنے سینے میں دوسروں کے دلوں کی دھڑکنیں سنتے ہیں۔ ہر کراہ میں اپنی آواز محسوس کرتے ہیں۔ احساسات کی یہ گہرائی ان کی ذات کو کسی بھی ذی روح ذات سے بری طرح ATTACHEDE کر دیتی ہے۔ یہی وہ صورت ہے جس میں فرد کا کرب اجتماعی کرب بن جاتا ہے۔ اور اسی احساس کی بلاغت اپنی انتہا پر پہونچ کر وحدت الوجود کے فلسفے کو جنم دیتی ہے۔

GENERAL REMARKS OF FEELING نے JOHN MACQUARI کے بیان میں لکھا ہے

"PASSIONS ARE CLOSELY CONNETED WITH THE BODY AND ITS CHANGING TATES"

ہر واقعہ ذہن میں ایک تاثر اور تاثر اپنی نوعیت کے لحاظ سے جذبات میں ارتعاش پیدا کرتا ہے۔ جذبات مرتعش ہو کر اپنے ظہور کا ذریعہ تلاش کرتے ہیں۔ جذبات کے اظہار کے لیے جب PHYSICAL SYMTOMS متحرک ہونے ہیں۔ تو چہرے کی رنگت میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ آنکھوں کا انداز بدل جاتا ہے اعضا کا حرکات پر اثر آتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان جذبات کے اظہار میں اگر PHYSICAL SYMTOM فہم کنندہ

ہوں۔ تو ایک نفسیاتی مریض اپنے فنکار کی دنیا میں بھٹکنا شروع کر دیتا ہے۔ مختلف انداز سے اپنے دل کو مطمئن کرنے یا ان معاملات سے متعلق اپنے اعمال و افعال کو JUSTIFY کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے۔ در اصل یہ واقعات یا واردات کے مشاہدے کے بعد ذہنی REACTION ہوتا ہے اور یہی REAC-TION شاعر سے شعر کہلواتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں EMPRESSED کرنے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ شاعر کا معاملہ افراد تک پہونچتا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں ماہرین کی رائے یہ ہے کہ شعر جتنا سادہ اور DIRECT ہوگا۔ اتنا ہی پُر اثر ہوگا۔ اس رائے کی روشنی میں اگر منور رانا کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو میرا خیال ہے کہ دو چار اشعار کے علاوہ تمام اشعار اس معیار پر پورے اتریں گے اس دعوے کے ثبوت میں یہ اشعار ہیں۔

شہر اندر ہی اندر جل رہا ہے مگر سب منورت چل رہا ہے
وہ تو جتنا جا رہا ہے رو رہا ہے میرا چہرہ بھی کتبہ ہو رہا ہے!

مجھے بلاتا ہے مقتل میں کس طرح جاؤں کہ میری گود سے بچہ نہیں اترتا ہے!

الماری سے خط اس کے پرانے نکل آئے پھر سے میرے چہرے پہ یہ دانے نکل آئے!

میرے اسکول تری یاد ستاتی ہے مجھے گھنٹی بجتی ہے تو لگتا ہے بلاتی ہے مجھے!

کوئی جھونکا کسی بادل کو بہا لائے گا سوچتے سوچتے اک شاخ ہری سوکھ گئی

دن بھر کی مشقت سے بدن چور تھا لیکن ماں نے مجھے دیکھا تو تھکن بھول گئی ہے

بیل گاڑی، دوپٹہ، کچی سڑک، بھرتی کی گلکاری، چاپلوسی، ممکدی، افطاری، الماری، ماں، بچہ، وغیرہ جیسے الفاظ غزلوں میں استعمال کرنے کی بدعت کے سزاوار منور رانا ہی ہو سکتے ہیں۔ میں نے یہ جملہ کتنی آسانی سے لکھ دیا۔ شاید منٹ بھر بھی نہ لگا ہو۔ لیکن اس جملے کے کہے جانے کا سبب کتنی مشکلوں سے پیدا ہوا ہوگا۔ اس کا اندازہ مجھ جیسا سہل نگاروں کی فہم سے بعید ہے۔ کبھی اطمینان سے یہ بات منور رانا سے پوچھیے تو شاید وہ بتا دیں گے۔ میرے دوست ہیں۔ بہت عزیز دوست۔ جتنے عزیز دوست اتنے ہی پسندیدہ شاعر اور اتنے ہی نیک انسان، لوچ اور رنگین مزاج۔ گو کہ ابھی ان کے یہاں خیالات کی پیداوار اور معنوی آفرینی محدود ہے لیکن اس کا یہ

غزل گاؤں

(ہندی رسم الخط میں منور رانا کی غزلوں کا مجموعہ)

جاوید انور صابری

کون جانتا تھا کہ اس صدی کے کبیر کا ظہور اسی وقت ہو گیا تھا جب دنیا منور رانا کو منور علی آتش کے نام سے جانتی تھی۔ اور یہ کیسے معلوم تھا کہ محض دس سال کے اندر منور رانا کا نام صرف بنگال ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی سرحد کو بھی پار کرنے کے لیے پر تولنے لگے گا۔

منور رانا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہیں گھر سے بے گھر، وطن سے بے وطن، اور دلیس پردیس میں تنہا جینے والی مصیبتوں کا کبھی خوف نہیں ہوتا۔ آئے دن کی پریشانیوں سے، کن کربناک تجربوں سے گزرنا پڑتا ہے، منور رانا کی زبانی سنیے ؎

بربادکر دیا ہمیں پردیس نے مگر ماں سب سے کہہ رہی ہے کہ بیٹا مزے میں ہے

کھلے سر پر آسمان کی ننگی چھت، اور دہکتے ہوئے سورج کی تپش میں پلا ہوا مزدور بھی مزدوری کرنے سے کتراتا ہے۔ وہ دھوپ میں جس میں کسان ہل جوتنے کے بعد تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے سایہ دار درخت کے نیچے ٹھنڈی ہواؤں کا متلاشی ہوتا ہے۔ جہاں دو گھڑی کے لیے فرحت محسوس کر سکے۔ تب کہیں جا کر زندگی کی دوڑ میں پھر سے شامل ہونے کے لیے آپ نے آپ کو تیار کر پاتا ہے۔ لیکن اس جھلس کر رکھ دینے والی دھوپ میں بھی منور رانا کا سفر جاری رہتا ہے۔ اور ہر حالت میں وہ اپنی متعین منزل کی طرف رواں دواں نظر آتے ہیں ؎

جو دھوپ دھوپ میں گرم سفر نہیں رہتا تو میرے بچوں کی قسمت میں گھر نہیں رہتا

یا

اس وقت بھی اکثر تجھے ہم ڈھونڈنے نکلے جس دھوپ میں مزدور بھی چھت پر نہیں جاتے

منور رانا کے یہاں رشتے ناطے کی بھی اہمیت کم نہیں ہے۔ یا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ رشتے کی شاعری بہت زیادہ کرتے ہیں۔ ان کو ماں، باپ، بہن بھائی اور دوسرے رشتہ داروں سے بے پناہ محبت ہے۔ حالانکہ انہیں اپنوں کے ہاتھوں زک بھی اٹھانا پڑی ہے۔ ان کی زندگی میں ایسا موڑ بھی آیا ہے جہاں بھائی بہن اور دیگر رشتہ داروں کی پہچان ختم ہو جاتی ہے یا وہ بیگانے سے لگتے ہیں۔ زندگی کی مسافت اور طویل ہو جاتی ہے۔ جس کو تنہا طے کرنا پڑتا ہے۔ نا مساعد حالات میں

اپنے بیگانے ہو جاتے ہیں ۔ وہ بیگانوں کے حسن سلوک سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے کسی نہ کسی صورت اپنوں کے بے سلوکی کا سلسلہ جاری رہتا ہے ۔ اسی خوف و کرب کو منور رانا یوں بیان کرتے ہیں ؎

رات دیکھا ہے بہاروں میں خزاں کو ہنستے　　کوئی تحفہ مجھے شاید میرا بھائی دے گا

یا

میں اپنے بھائیوں کے ساتھ جب باہر نکلتا ہوں　　مجھے یوسف کی جانی دشمنوں کی یاد آتی ہے

اپنوں کے برتاؤ سے جب احساس کا زخم ناسور بن کر رستے لگتا ہے تو شاعر اپنی انا کی بھٹی میں اس وقت تک تپتا رہتا ہے جب تک وہ کندن نہیں بن جاتا ۔ احساس کی شدت، شاعر کو حوصلہ مند بناتی ہے ۔ اور ایک دن ایسا آتا ہے جب جہد مسلسل کامیابی کا راستہ دکھاتی ہے شاعر کامیابی کی پہلی سیڑھی پہ قدم رکھتا ہے ۔ لیکن منزل کا فاصلہ ہی کچھ اس قسم کا ہے کہ وہ یہاں بھی اپنے آپ کو تشنہ اور ادھورا محسوس کرتا ہے پھر کہتا ہے جاؤں ؎

حالات نے چہرے کی چمک چھین لی ورنہ !　　دو چار برس میں تو بڑھاپا نہیں آتا !

بلند و بالا حیرت انگیز ایرکنڈیشنڈ عمارتوں سے انسان کی سہمی ہوئی زندگی مدفون تمناؤں اور افلاس زدہ بوسیدہ تر مکانوں کا نظارہ تو کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن شفقت، محبت، اور ہمدردی، کا کوئی بھی راستہ وہاں تک نہیں آتا ۔ البتہ دن رات کی جی توڑ، محنت، اور مشقت غریب مزدور کو وہاں تک بہت جلد پہونچا دیتی ہے ۔ جہاں سے اس کا راستہ دوسری دنیا تک ضرور جاتا ہے ۔ ایک ہی طرح کے ماحول و معاشرے میں ایک ہی طرح کے زندگی گزارتے ہوئے وہ اس حد تک پہونچ جاتا ہے جہاں تمنائیں دفن ہو جاتی ہیں ۔ امنگیں دم توڑ دیتی ہیں ۔ اور ان خوابوں کا نظر آنا بند ہو جاتا ہے

آنکھوں میں کوئی خواب سنہرا نہیں آتا
اس جھیل پہ اب کوئی پرندا نہیں آتا

ادائیگی کا نیاپن، سادگی، تڑپ اور فکر و نظر کی بلندی، غزل کی کامیابی کی ضمانت ہے ۔ یہاں شاعر سادگی و متانت فطری احساسات و محسوسات کے تار کو جھنجوڑ دیتا ہے ۔ منور رانا کو غزل میں نئی معنویت، و نئی حسیت کی تلاش ہے مناسب ترتیب، مختلف رنگوں، سجاوٹوں اور آرائشوں کا اہتمام نہیں کرنا پڑتا ہے اور یہی خصوصیت انہیں ان کے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے ؎

جس میں صدیوں سے غریبوں کا لہو جلتا ہو　　وہ دیا روشنی کیا دے گا سیاہی دیگا

اور

نہ جانے کونسی مجبوریاں پردیس لائی تھیں !　　وہ جتنی دیر بھی زندہ رہا گھر یاد کرتا تھا

قدرتی طور پر ماں کو بیٹے سے والہانہ محبت ہوتی ہے ۔ اپنی مامتا نچھاور کرتے وقت بچے سے صدیوں کے خواب سجاتی اور وہ بچہ زندہ قوم کے معیار پر ماں کی نظروں میں اس وقت اترتا ہے جب وہ قرآن کا پہلا سیپارہ ختم کرتا ہے یہی وہ منزل ہے جہاں ماں کو بچے کی بلند کرداری کا خیال آتا ہے ۔ اسلامی طرز زندگی پر قائم رہنے کے لیے ماں بار

تلقین کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ خواب کی حسین تعبیر دیکھ کر مقدس ماں کے ہونٹوں پہ مقدس مسکراہٹیں دور تک پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ بقول منور رانا ؎

مقدس مسکراہٹ ماں کے ہونٹوں پر لرزتی ہے — کسی بچے کا جب پہلا سیپارہ ختم ہوتا ہے

منور رانا کی شاعری سستی شہرت اور خطابت سے پاک ہے۔ زبان و بیان کا حسین امتزاج، سیدھے سادے الفاظ کی خوبصورت پیکر تراشی، فکر کی گہرائی، اور انداز کی اٹھان میں اتنی بالیدگی ہے کہ ہندوستانی معاشرے کی پوری جھلک نظر آنے لگتی ہے ؎

کسی بچے کا یہ جملہ ابھی تک یاد ہے رانا! — یتیموں کو پڑھانے کوئی استانی نہیں جاتی

اگر حریفوں میں ہوتا تو بچ بھی سکتا تھا — غلط کیا جو اسے دوستوں میں چھوڑ آیا

بڑی بیچارگی لوٹتی بارات تکتے ہیں۔ — بہادر ہو کے بھی مجبور ہوتے ہیں دلہن والے

ذہنی طور پر آج کی نسل پرانی نسل سے بیزار نظر آتی ہے اور اس بیزاری کا سبب الٹا سیدھا معاشرہ اور بگڑا ہوا ماحول ہے جس کی وجہ سے ہر قدم پر بے اطمینانی اور بے چینی اور طرح طرح کے مسائل منہ کھولے آسمان کو تکتے رہتے ہیں۔ غربت اور افلاس کی زندگی ہم برسہا برس گزارنے پر مجبور رہے۔ اور پتہ نہیں یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔ یہاں نہ تنہا جینے کی مہلت ہے اور نہ ساتھ مرنے کی اجازت۔ ریاض مجید اسی کو یوں محسوس کرتے ہیں ؎

قربتوں کے شوق نے کس کس طرح رسوا کیا — تنہا رہ سکتے تو کیوں اتنی برائی دیکھتے

یہی جھلک آپ منور رانا کی شاعری میں پائیں گے اور محسوس ہوگا کہ وہ ریاض مجید سے کس قدر متاثر نظر آتے ہیں۔ اسی چیز کو سیدھی اور سلیس زبان میں اتنی آسانی سے پیش کرتے ہیں کہ ہم سمجھنے میں کسی طرح کی دقت محسوس نہیں کرتے۔ اور ساتھ ہی وہ بالکل الگ ہٹ کر ایک الگ پہچان بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں ؎

ہمیں بزرگوں کی شفقت کبھی نہ مل پائی — نتیجہ یہ ہے کہ ہم لو فروں میں لٹتے گئے

بزرگوں کی شفقت و محبت سے محرومی کا یہی نتیجہ ہے کہ ہم بے یار و مددگار اذیت ناک اور بغیر منصوبہ بند زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

وہی شاعر اکثر کامیاب ہوتا ہے جو زندگی کے نشیب و فراز سے ہو کر گزرتا ہوا اس وقت کی ذاتی اور غیر ذاتی قدروں کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ ایک کلچر پیش کرتا ہے۔ جس میں غم جاناں، غم دوراں کے علاوہ اپنے دور کے تہذیبی دستور کی پوری جھلک نظر آتی ہے۔ صدیاں بولتی ہیں۔ مایوسی اور افسردگی کی حالت میں تدبیر اور تلقین سے کام لیتا ہے تو وہی شاعر آگے چل کر قوم کا سرمایہ بن جاتا ہے۔

شاعری میں سموئی ہوئی اس کی آپ بیتی شاعر کو بہت دنوں تک زندہ رکھتی ہے۔ آپ بیتی کی شاعری سے زمانے کا نبض پکڑنے میں بہت آسانی بھی ہوتی ہے۔ شاعر کی آپ بیتی جگ بیتی کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ شاعر آپ بیتی کے ذریعہ قاری پر بھرپور تاثر چھوڑتا ہے۔ اور جگ بیتی محض ایک واقعہ ثابت ہوتی ہے۔ عام طور پر فنکاروں کے متعلق اس طرح کا خیال رکھنا صحیح نہیں ہوگا۔ کہ جگ بیتی کا خیال پہلے اور آپ بیتی کا خیال بعد میں آنے سے شاعر کی خود داری اور انا کی ذاتی کا پتہ چلتا ہے۔ دراصل آپ بیتی جگ بیتی کا ایک اہم حصہ ہے۔ شاعر جس آپ بیتی کو اپنے تجربوں کے ذریعہ شعری پیکر میں ڈھالتا ہے وہ عام طور پر جگ بیتی کا ہی حصہ سمجھی جانے لگتی ہے۔ اس لئے منور رانا جب آپ بیتی کو مخصوص انداز میں شعری الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔ تو لگتا ہے یہ جگ بیتی کا ہی حصہ ہے سے

نہ جانے جرم کیا ہم سے ہوا ہے
ہمیں قسطوں میں لوٹا جارہا ہے

آخر میں یہ نہ کہوں تو شاید بات ادھوری رہ جائے گی کہ منور رانا محض جسم سے دور نکل جانے کو موت نہیں کہتے بلکہ ان کے نزدیک آدمی مر اس وقت جاتا ہے جب اس کے احساسات مر جاتے ہیں۔

شرم آتی ہے مزدوری بتاتے ہوئے ہم کو   اتنے میں تو بچے کا غبارہ بھی نہیں ملتا

نہ جانے کون سی مجبوریاں پردیس لائی تھیں   وہ جتنی دیر بھی زندہ رہا گھر یاد کرتا تھا۔

بقیہ: قصیدہ تنقید

پرکوئی ASSESSMENT کر دینا حماقت ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی شعر گوئی کی رفتار ہی رہے۔ اور خیالات کے دائرے زیادہ وسیع نہ ہوں ______ ہو سکتا ہے کہ خیالات REPEAT ہونے لگیں۔ لیکن ایسی صورت میں بھی میرا یہ دعویٰ ہے کہ منور رانا کی شاعری میں THE END والی بات نہیں ہوگی بلکہ جب ان کی کل شاعری SELECTED COLLECTION شائع ہوگا۔ تو اس کی وہ حیثیت ہوگی کہ اس پر رائے دینا یا تبصرہ لکھنا مجھ جیسے نا فہم اور ان پڑھ شخص کی بساط سے باہر ہوگا۔

ابھی ان کی شاعری کسی بہتر راہ کی تلاش میں ہے۔ ایک صحیح سمت کی تعین میں کوشاں ہے۔ آگے کیا ہوگا۔ خدا جانے۔ ابھی تو سلفۂ صد گام ہنگ سرگرم عمل ہے لیکن وہ قطرہ جس کے مقدر میں گہر بننا ہے بن کر رہے گا ●

غزل گاؤں کا شہریار

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

فن کاری داخلی کیفیات کے اظہار کا نام ہے۔
لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ داخل کو خارج کی سطح
پر لانے کا پیچیدہ اور مرکب عمل ہی عمل تخلیق ہے۔ اندر
ہر فرد کی نجی اور شخصی دنیا ہے، اس کی وسعتیں اور
امکانات variable ہوتے رہتے ہیں، جس کے حدود
متعین نہیں کئے جا سکتے۔ ہر فرد اپنے میں ڈوب کر خود
کیفیات داخلی کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ تہذیب و
معاشرت، سیاسی و تمدنی حالات، شہر اور گاؤں کے فرق
کے تغیر، علوم و فنون کی اشاعت، مذہبی روایات،
اخلاقی قدروں کی تبدیلی سے یہ داخلی کائنات
پھیلتی اور سکڑتی رہتی ہے۔ کبھی اسے محیط بیکراں بن
جاتی ہے اور کبھی ذرا سی آب جو ہو جاتی ہے۔ کبھی اس میں
عمق کا احساس ہوتا ہے اور کبھی نظر آتی ہے۔
ایک اور غیر جامد و فعال دنیا کو داخل سے خارج میں
لانا اور تخصیص کو تعمیم کی سرحد میں لانا ایک نہایت
مشکل کام اور پیچیدہ تر مسئلہ ہے۔ یہی وہ منزل ہے جسے
غالب نے آفاق کی کارگہ شیشہ گری کا کام بتایا ہے اور
نفس بھی آہستہ" کی تاکید کی ہے۔ اس داخلی دنیا کو
خارج کی سطح پر لانے کا تخلیقی عمل شاعر سے ایک بے نام کیفیت
کو احساس، احساس کو فہم، فہم کو تخیل، تخیل کو فکر،
فکر کو لفظ اور الفاظ کو شعر کی منزلوں میں گذارنے کا

طالب ہوتا ہے

خشک سیوں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

یہ نادیدہ جہاں جو چشم شاعر میں روشن ہوتا ہے
اظہار کی سرحد میں آنے کے لئے لفظوں کا سہارا لیتا ہے۔
ایک طرف ایک جہانِ ناپیدا کنار ہے۔ اور دوسری طرف
لفظوں کی تنگ دامانی لیکن ذوقِ آفرینش اس فنکار کے
سامنے بھی ہاتھ پھیلانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لامحدود کو
محدود کرنا غالباً محدود کو لامحدود کرنے سے زیادہ دشوار
کام ہے۔ شاعر کو اس دشوار گذار منزل سے گذرنا
پڑتا ہے۔ یہ دشواری نئے فنکاروں کے سامنے اور بھی
کٹھن ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ ماقبل کے فنکار الفاظ کو
اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ذریعے متنوع انداز و اسلوب
میں استعمال کر چکے ہیں۔ تواتر استعمال الفاظ کو گھسا
بھی جاتا ہے اور اس کے نئے DIMENTIONS بھی
پیدا کرتا جاتا ہے۔ اگر لفظوں کے تخلیقی عمل میں انہیں
وسعتوں کے ساتھ استعمال کیا جائے جیسے متقدمین کرتے
رہے ہیں تو فن میں ندرت اور تابانی پیدا نہیں ہو سکتی۔
اور اگر مروج الفاظ سے نئے معنوی جہات پیدا کرلی جائیں
تو حسین تر اور جمیل تر شعری اور فنی نمونے سامنے آسکتے
ہیں۔ اس طرح تکرار استعمال کے منفی اور مثبت

اثرات برابر بڑھتے ہی جاتے ہیں۔

اچھا اور سچا فن کار تواتر و تکرار کے مثبت پہلوؤں پر زور دیتا ہے اور عام مروجہ نیز بار بار کے استعمال شدہ لفظوں سے اپنی تخلیقات کی بنیاد پر فن کے نئے امکانات پیدا کر دیتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں ایسے فن پاروں کا قاری استعجاب و انبساط کی کھلی کھلی سی دنیا میں پہنچے۔ انکشاف ہے ART LIES IN SURPRISE اسی تفصیل کا اجمال ہے۔ یہ استعجاب اور حیرت لفظوں کی کرتب بازی سے نہیں ہوتی۔ فن کار جادوگر نہیں ہوتا۔ وہ ہاتھ کی صفائی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ وہ نہ فریب کھاتا ہے اور نہ فریب دیتا ہے۔ اس کا خلوص، لگن، محنت و مطالعہ، تلاش و تجسس اور استغراق و انہماک امکانات کے نئے افق پیدا کر دیتا ہے۔ وہ جادوگر نہیں ہوتا مگر حیرت انگیز کارنامہ کا موجب ہوتا ہے۔ وہ آذر نہیں ہوتا مگر نئے پیکر تراش لیتا ہے۔ وہ عیسیٰ نہیں ہوتا مگر مردہ لفظوں میں جان ڈال دیتا ہے۔

اگر ناصر کاظمی، ظفر اقبال، شکیب جلال، بانی، خلیل الرحمن اعظمی، پروین شاکر، سلطان اختر، شاذ تمکنت نہ ہوتے تو غزل کب کی مرگئی ہوتی۔ یہ اس لئے کہ ان شعرائے الفاظ کو لغوی معنی سے نکال کر خالص تخلیقی مفاہیم میں استعمال کیا ہے، نہ جانے کتنے غلاموں کو آزاد کرنے کا ثواب ان کے اعمال نامہ میں لکھا ہوا ہے۔ جب تک الفاظ کو سید احمد دہلوی، بابائے اردو مولوی عبدالحق اور مہذب صاحب وغیرہ جیسے لوگوں کی صحبت سے نکال کر غالب و اقبال، انیس و آتش، نظیر و فیض اور جمیل و فراق کی محفلوں میں نہ لایا جائے اس وقت تک گونگے کو گویائی اور اندھے کو بینائی حاصل نہیں ہو سکتی۔

ہر دور میں اس اجتہاد کی ضرورت پڑتی ہے لفظوں کے مقررہ مفہوم کے جمود کو توڑنے سے ہی نئی شعری فضا پیدا ہوتی ہے۔ آج کی شعری فضا کی تعمیر میں چند دوسرے شعرا کے ساتھ منور رانا کے اجتہاد کو بھی دخل ہے۔

منور رانا بڑی شہرت کے حامل نہیں ہیں مگر محض شہرت سے کیا ہوتا ہے۔ اصل چیز تو وہ ہنر ہے جو پایہ مقبولیت اور شہرت کا ضامن ہوتا ہے۔ منور رانا ایک اجنبی کی طرح شعری ماحول میں آتے ہیں۔ مگر ایک کے بعد ایک یعنی ساری محفل کی نگاہیں ان کی طرف اٹھنے لگتی ہیں۔ یہ غزل کے شاعر ہیں۔ غزل کے سیکڑوں ہزاروں شعرا کی محفل میں اپنی منفرد آواز کے ذریعے قاری کی توجہ کو کھینچنے کی صلاحیت بہت کم شعرا میں ہوتی ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ اگر تجزیہ کیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ غزل کے بیشتر شعرا اردو غزل کی عظیم الشان دار روایت سے مرعوب ہیں۔ ان کے سامنے قدما میں میر، غالب، ذوق، داغ، انشا، مصحفی، مومن، آتش، شاد، فانی اور حسرت و فراق وغیرہ فن کاروں کے عظیم المرتبت کارنامے موجود ہیں، ان میں موضوع کی بلندی، احساس کی شدت، جذبہ کی گھلاوٹ، لہجہ کی ندرت، زبان کا حسن، مشاہدات کی وسعت، تجربات کی بوقلمونی، ایجاز و اختصار، تفصیل و اطناب، اطلاعات و اشارات، علم ذات اور علم کائنات غرض کیا ہے جو موجود نہیں، ظاہر ہے کہ اس مضبوط شعری روایت کے سامنے بونے پن کا احساس ایک فطری بات ہے، منور رانا کی سب سے بڑی فطری بات ہے کہ وہ جری اور بے باک ہیں۔ اور وہ مرعوب نہیں ہوتے اور اپنی تخلیقی دھن میں اتنے غرق رہتے ہیں کہ اردو غزل کے اس پورے سفر کو خاطر میں نہیں لاتے IGNORANCE ہی ان کے لئے BLISS ہے۔ ان کی یہ بے نیازی، بیباکی اور تخلیقی جرأت انھیں بالکل نئے راستوں پر لے جاتی ہے۔

منور رانا نے میرؔ سے اپنے تعلق کا اظہار کیا ہے۔
کہتے ہیں ؎

نہیں تو پھر یہ اداسی ہی راس کیوں آتی
ضرور میرؔ سے ملتا ہے سلسلہ میرا

عہدِ نو تیرے میرؔ ہیں ہم لوگ
آپ اپنی نظیر ہیں ہم لوگ

تذکرہ تھا تری آنکھوں کا سرِ بزم کہیں
اور مجھے میرؔ کا دیوان بہت یاد آیا

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے کلام میں میرؔ کا سوز و گداز ہے۔ ان کے لہجہ میں میرؔ کے لہجہ کی طرح گھلاوٹ ہے، وہ میرؔ ہی طرح اپنی آپ بیتی سناتے ہیں۔ وہی سچائی، وہی سادگیٔ اظہار، وہی فقر و استغنا، وہی موضوع کو احساس بنا دینے والی روش ــــ منور رانا کے یہاں یہ سبھی باتیں موجود ہیں لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ ان کے یہاں میرؔ کے احیا کی کوئی کوشش نہیں ملتی۔ جاں گدازی اور تمنا کی کے باوجود وہ میر کی طرح یا سرے بے نیاز ہوکر اپنی ذات کے نہاں خانے میں نہیں بیٹھتے، محسوسات کے اعتبار سے قربت کے باوجود منور رانا اپنے دور، اپنے عہدِ اقبال کے تغیرات و انقلابات کا ایک گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں، میں اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتا لیکن آپ کو اس نتیجہ تک لیجانا چاہتا ہوں کہ اپنے شعری رویہ میں وہ میرؔ کے مقابلے میں نظیرؔ سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ احساسات کی غیر معمولی شدت انہیں میرؔ سے قریب کرتی ہے اور مشاہدات و ماحول سے ناگزیر ربط نظیرؔ کی یاد دلاتا ہے۔ مگر اپنی شاعری کے مزاج، اپنے لب و لہجے کی ندرت اور اپنی انفرادیت کے لحاظ سے وہ اپنی ایک الگ پہچان بناتے ہیں۔

گاؤں، منور رانا کے شعری محرکات میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے متعدد اشعار میں گاؤں کی علامات و تلمیحات ملیں گی۔ گاؤں کے بچے، بوڑھے، عورتیں، کسان، پیڑ، پگڈنڈی، پنگھٹ، پرندے، جھیل اور بیل گاڑی ـــــ یہ سب کے سب راناؔ کے یہاں شعری علامات بن جاتے ہیں، ان علامتوں سے وہ ایک مکمل فضا کی تعمیر کرتے ہیں، وہ فضا جس میں ہمارے ماضی کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں، جہاں مٹی کا سوندھا پن ہے، جہاں غریب کنواریوں کا البیلا پن ہے، جہاں سادگی ہے اور بے ریائی ہے۔ منور رانا کلکتہ جیسے عظیم شہر میں رہتے ہیں مگر ذہنی طور پر گاؤں سے وابستہ ہیں۔ عظیم صنعتی شہر اور گاؤں کا تضاد اور تناؤ ان کے فن میں نئے موضوعات پیدا کرتا ہے۔ گاؤں کی بقا ان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اپنی پوری شاعری کو انہوں نے گاؤں کے کلچر کی واپسی کے لئے وقف کر دیا ہے۔ ان کی غزلوں کے مجموعہ کا نام "غزل گاؤں" ہے اور سچ مچ ایسا لگتا ہے مختلف اشعار گویا غریب کسانوں اور دیہاتوں کے چھوٹے چھوٹے سادہ اور سچے جھونپڑے ہیں۔ جہاں زندگی آسودہ ہوتی ہے۔ جہاں زندگی آسودہ ہوتی ہے۔ جہاں مسرتوں کے حصول کے لئے تلاش و وسائل کی کشمکش نہیں ہوتی۔ دیکھئے منور رانا ان جھونپڑوں کی زندگی، وہاں کے ماحول اور اس کی جزئیات کو کس طرح جزوِ شعر بناتے ہیں۔ ؎

تو اب اس گاؤں سے رشتہ ہمارا ختم ہوتا ہے
پھر آنکھیں کھول لی جائیں کہ سپنا ختم ہوتا ہے

سونے پنگھٹ کا کوئی درد بھرا گیت تھے ہم
شہر کے شور میں کیا تجھ کو سنائی دیتے

کبھی سڑکوں سے لپٹ کر بیل گاڑی رو پڑی ہوگی + غالباً پردیس کو کچھ گاؤں والے جائیں گے

یہ ماں گاؤں کی پگڈنڈیاں ہم کو بلاتی ہیں
مگر مشکل بہت ہے اب ہمارا لوٹ کر جانا

بڑے شہروں میں بھی رہ کر برابر یاد کرتا تھا
وہ اک چھوٹے سے اسٹیشن کا منظر یاد کرتا تھا

نہ جانے کون سی مجبوریاں پردیس لائی تھیں
وہ جتنی دیر بھی زندہ رہا گھر یاد کرتا تھا

بچپن میں کسی بات پہ ہم روٹھ گئے تھے
اس دن سے اسی شہر میں ہیں گھر نہیں جاتے

ابھی تک میرے قصبے میں کئی ایسے گھرانے ہیں
کبھی رمضان میں سحری افطاری نہیں لاتے

میں اس خیال سے جاتا نہیں ہوں گاؤں کبھی
وہاں کے لوگوں نے دیکھا ہے بچپنا میرا

جو اپنے گاؤں کی پگڈنڈیوں پہ چھوڑ آیا
چھپی ہوئی مری عظمت اسی کھڑاؤں میں ہے

یہ لہجہ اور بڑا صنعتی شہر میں رہ کر اپنے ماضی اپنی روایات اور اپنے تہذیبی اثاثے سے یہ روحانی رشتہ منور رانا کو دوسرے شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ اردو غزل میں یہ آواز بالکل نئی ہے یہ احساس اور اس کی یہ شدت دوسری جگہ نہیں ملتی۔

منور رانا نے غزل کو گاؤں میں پہونچا کر اس صنفِ سخن کو ایک نئی سمت بتائی ہے اور اسے ہماری ہندوستانی معاشرت سے زیادہ قریب کر دیا ہے۔ انہوں نے غزلوں میں گیت کا رنگ پیدا کر دیا ہے، رادھا، مرلی، بانسری، رام، سیتا اور اسی طرح کے دوسرے اشارات ہمیں اپنے ضمیات کی یاد دلاتے ہیں۔ ان کی رعایت سے رانا نے جو موضوعات بیان کئے ہیں ان میں ہمارے قدیم کلچر کا سکون اور رومان محسوس ہوتا ہے۔ رانا نے غزل میں جہاں وہ عناصر پیدا کر دیئے ہیں جو ایک طرف ہمیں ہندوستانی فضا کی نغمگی بخشتے ہیں تو دوسری طرف غزل کے وسیلہ سے پیش کردہ سابقہ رومانی محسوسات کو ارضی صداقت دے کر ایک لازوال توانائی مہیا کر دیتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایک روایت تو وہ ہے جو غزل کو قوالی تک پہونچاتی ہے اور دوسری یہ تازہ روش ہے جہاں غزل گیت بنتی ہے نظر آتی ہے۔ رانا کی ہنرمندی یہ ہے کہ وہ صوتی نغمگی معاشرتی پس منظر اور ہندوستان کی پرانی خوشدلی، طمانیت اور بشاشت کے اثرات پیدا کرتے ہوئے ہمیں نئے تقاضوں کا دھیان بھی دلاتے ہیں۔ عصرِ حاضر کا کرب ان کے بے تکلف اور سادہ لہجہ میں کچھ اور تیز و تند ہو کر سامنے آتا ہے۔ وہ تلخ کو شیریں بنا کر دکھانے کے قائل نہیں، وہ یہ جھوٹ کبھی برداشت نہیں کرتے۔ رنج کے دکھوں کو دکھ بھرے انداز میں ظاہر کر کے ہمیں حقیقت کا براہِ راست اور زیادہ تیکھا احساس دلانا چاہتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

اپنے چہرہ پہ تبسم کی نقابیں نہ لگا
آندھیاں تیز ہیں کمزور طنابیں نہ لگا

انہوں نے جگہ جگہ ان تیز آندھیوں سے ہمارے وجود کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے اور ہمیں عصری حسیت کی اس منزل میں پہونچا دیا ہے جہاں خود شاعر موجود ہے۔ رانا خود بھی صحرائے حیات میں ننگے پاؤں چلتے ہیں اور ہمیں بھی اس قیامت خیز منظر میں اسی طرح کھینچ لیتے ہیں، دیکھئے وہ یہ زہرِ حیات ہمیں کیوں پلاتے ہیں ؎

گذر گئی ہے کچلتے ہوئے یہ بس جس کو
وہ شخص لوٹ کے کل گاؤں جانے والا تھا

وہ اپنی پلکوں پہ خوابوں کے گھر بناتا تھا
ندی کے بیچ میں اینٹوں کے گھر بناتا تھا

ہم سایہ دار پیڑ زمانہ کے کام آئے
جب سوکھنے لگے تو جلانے کے کام آئے

سقراط جیسا شخص بھی جس کو نہ پی سکا
اس تلخیٔ حیات کو بھی ہم نے پی لیا

اپنے ہاتھوں کی لکیروں کی طرف کیا دیکھیں
ڈوبتے وقت جزیروں کی طرف کیا دیکھیں

بندھے ہوئے ہیں مرے ہاتھ پشت کی جانب
کہاں ہیں آئیں پرانی عداوتوں والے

ان اشعار میں آپ کو زندگی کے جبر اور اس کی تلخیوں کا شدید احساس ملے گا۔ آپ کو یہ بھی اندازہ ہوگا کہ منور رانا پیش پا افتادہ الفاظ یا گھسے پٹے انداز اظہار سے بالکل الگ الفاظ، علامات، اشارات اور شعری مزاج و رویہ کی ایک نئی کائنات تعمیر کرتے ہیں۔ جو اشعار مختلف موقعوں پر نمونہ کے طور پر بیان پیش کیے گئے ہیں کیا ان سے اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ انہوں نے غزل کو ایک نیا لہجہ دے کر مستقبل میں اس کے امکانات روشن کر دیے ہیں۔

جربول

اگر آپ خارش سے پریشان ہیں اور
راتوں کی نیند حرام ہے تو صرف دو
تین بار کی مالش سے آرام ہو جاتا ہے

میکسٹون

ہر موسم میں گھر بھر کے لئے یکساں طور
پر فائدہ بخش جنرل ٹانک

بالک جیون

بچّوں کی تندرستی اور
صحیح نشوونما کے لئے

موتی منجن

دانتوں کو صاف اور چمکدار
بناتا ہے۔ پائیریا کا دشمن ہے

اکسیر صدر

نزلہ۔ زکام اور کھانسی
کی بہترین دوا

نیشنل دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۱۳ کلکتہ ۱

ریزہ ریزہ اکائیاں

بیر رضوی

فارسی کی شاعرہ خانم فروغ فرخ زاد نے اپنی ایک نظم میں اپنے محبوب سے سرگوشی کے لہجے میں کہا تھا۔
تم موعودہ موسم میں جب میرے گھر کی جانب آنا تو اپنے ساتھ ایک دریچہ بھی لانا کہ میرے گھر کے در و دیوار میں
ئی دریچہ نہیں ہے کہ میں نہ جانے کب سے تازہ ہواؤں کے لمس کو ترس رہی ہوں۔ اردو کی نئی غزل کو پڑھتے ہوئے
ھے اس دریچے کی یاد آتی ہے۔

غزل جس نے میر سے شکیب جلالی تک مشاہدے تجربے اور جذبے کے ہزار ہا سرد و گرم دیکھے وہ منور
نا کے شعروں میں خود کو سنورتا اور سجتا ہوا پاکر ہاتھوں میں آئینہ اٹھا لیتی ہے۔ نئی غزل اپنی لفظیات، اندرونی
داداور لہجے کی نئی نرگسیت کی بنیاد پر ماضی قریب میں کہی گئی غزل سے کافی مختلف ہو چکی ہے۔ غزل کی اندرونی،
در بیرونی فضا میں پیدا ہونے والی خوشگوار تبدیلی کی ایک مثال منور رانا کی شاعری ہے۔ ان کی غزل کا کلیدی
موضوع ماں کا مقدس رشتہ اور اس کے بطن سے جنم لینے والے رشتوں کی وہ سچائیاں ہیں جو مادہ پرستی کے
زاروں میں بے قیمت رکھی ہوئی چشم خریدار کی منتظر ہیں۔ منور رانا نے اپنی غزل میں رشتوں کی شکست و ریخت
اپنے ہی تجربے اور مشاہدے کی آنکھ سے دیکھا ہے۔ اور اسی لئے ان کے یہاں ملک راج آنند کی کہانی "کھویا
ہوا بچہ" کی وہ پُراثر اور نمناک فضا ملتی ہے جو انہیں غزل گویوں کی ایک الگ صف میں ممتاز کر دیتی ہے۔ گاؤں
ے وہ کچے راستے جو شہر کی پکی سڑکوں سے ملنے کے بعد اپنی نرمی اور پہچان کھو دیتے ہیں اس کا جیسا اور جتنا ملال
منور رانا کی غزلوں میں نئے نئے انداز سے بیان ہوا ہے۔ وہ نئی غزلوں میں کہیں اور نہیں ملتا۔ ان کی غزل کا لہجہ
یں سفاک اور کہیں بے حد ملائم ہے۔ ان کی غزل گھروں کے آنگنوں میں رشتوں کی مہک پھیلائے رکھنے کی آرزو مند
ہے۔ وہ ننھے ہاتھوں میں کھلونا دے کر انہیں بہلانے سے گریز کرتی ہے۔ کہ کھلونا تو بچپن کا سب سے سنہرا خواب
ہے۔ منور رانا کی غزل اسی سنہرے خواب کو دیر تک آنکھوں میں محفوظ رکھنے کی کامیاب کوشش ہے۔

شبیر رسول

منور رانا، زندگی کی ایسی (بظاہر چھوٹی چھوٹی) سچائیوں کو بھی شعری روپ دیتا ہے۔ جو عام طور پر نظرانداز کردی جاتی ہیں۔ اور رانا کے یہاں یہی سچائیاں معنوی وصوتی کیفیات کے اثر سے تصویر کی شکل اختیار کرلیتی ہیں۔ نیز سامع و قاری کے ذہن و قلب پر اپنے نقوش مرتسم کیے بغیر نہیں رہتیں۔

منور رانا کے اشعار میں غیر ضروری توڑ پھوڑ اور تصنع نظر نہیں آتی۔ آٹھویں دہائی کی بلند و بالا اور پختہ دیوار سے سر ابھار کر ذات اور ذات کے حوالے سے کائنات کا اظہار کرنے والے شعراء میں ایسے اچھے اور تازہ کار شاعر کم ہیں۔ رانا کی چشم بینا آج کی روح میں گزرے ہوئے کل کے ناسور اور آنے والے کل کے زخم دیکھ لیتی ہے۔ وہ تہذیب کی شکست و ریخت کو (جس کا اظہار شاعری میں ایک مدت سے ہو رہا ہے) بالکل نئے زاویئے سے دیکھتا ہے۔ اور اس کو شعری پیرائے میں بیان کرنے کے لیے نئے استعارات، نئی تشبیہات اور نئی لفظیات اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنے قریب اور بالکل قریب ہی نئے جہان — DISCOVER کرتا ہے اسی لئے اس کی غزل کو عصری زندگی اور عصری زندگی کے روایتی متعلقات کا اظہار آشنا کہا جاسکتا ہے۔

رانا کا اسلوب تیکھا ہے۔ لیکن کہیں کہیں ادھ کچرا پن بھی نظر آتا ہے۔ البتہ ان کے یہاں انفرادیت کی ایسی دھیمی دھیمی گونج سنائی دیتی ہے جس میں معتبر آواز میں تبدیل ہو جانے کے امکانات بھی پنہاں ہیں۔

قیصر شمیم

نئی نسل کے جو شعراء مجھے پسند ہیں ان میں ایک نمایاں نام منور رانا کا ہے۔ منور ایک اچھے اور سچے شاعر ہیں۔ انہوں نے ایک قلیل مدت میں جو ادبی مرتبہ حاصل کیا ہے۔ ایک عمر گزارنے پر بھی بہتوں کو وہ نصیب نہیں ہوتا۔ ان کا لہجہ ان کا انتخاب الفاظ۔ ان کے موضوعات — سب ہی چونکاتے بھی ہیں۔ اور متاثر بھی کرتے ہیں۔

دعا کرتا ہوں کہ زبان و فن پر ان کی گرفت مضبوط ہو جائے۔ اور ان کی شاعری میں ہمیں جو شرارہ ملتا ہے اسے شعلہ بننے میں دیر نہ ہو۔

نیلوفر حسن (گیا)

منور رانا کی شاعری نئے شعری افق پر ایک منفرد اور دلکش رنگ بکھیرتی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اردو کے عام مروجہ الفاظ کو تخلیقی سطح دیتے ہوئے ایک بالکل سمت میں استعمال کیا ہے۔ یہ نیا سفر کہیں کہیں رانا کے یہاں قاری کے لیے اجنبیت کا دل خوش کن تاثر بھی پیدا کرتا ہے۔ منور رانا عام احساسات کو شعری روپ عطا کردیتے ہیں۔ انھوں نے اردو غزل میں بالکل نئے امکانات روشن کردیئے ہیں۔ زندگی کی لاحاصلیت منور رانا کی شاعری میں ایک مخصوص انداز سے پیش ہوئی ہے۔ یہ لب و لہجہ اردو شاعری کے روایتی

DICTION سے قطعی مختلف نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں ؎

ہم تو اک اخبار سے کاٹی ہوئی تصویر ہیں
جس کو کاغذ چننے والے کل اٹھالے جائیں گے

ایک دوسری جگہ بڑی سادگی اور بے تکلفی سے وہ یوں شعری فضا کی تعمیر کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

زندگی تاش کے پتّوں کی طرح ہے میری!
اور پتّوں کو بہرحال بکھر جانا ہے

سعید پریمی

کلکتہ کے نوجوان شعراء کی صف میں منور رانا ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ آج کے عہد کی تلخی ان کی شاعری کا مزاج ہے۔ بے باک لہجہ اور بے خوف انداز کے مالک ہیں۔ مصلحت پسندی ان کی سرشت سے باہر ہے۔ اور ان کا یہی بڑا پن بعض آنکھوں کی چبھن ہے۔ شاید نیرؔ جی نے ٹھیک ہی کہا ہے ؎

چیل، کوؤں کی عدالت میں ہے کوئل مجرم
آج کا وقت یوں ہی فن کا صلہ دیتا ہے

امرتا پریتم نے تاشقند کی ایک مشہور ازبک شاعرہ زلفیا خانم کے خلوص، محبت، اور مہمان نوازی سے متاثر ہوکر اپنی سوانح حیات "رسیدی ٹکٹ" میں ایک جگہ لکھا ہے:

"۔۔۔ کبھی میں نے گیت لکھا تھا کہ زندگی مجھے اپنے گھر بلا کر مہمان نوازی کرنا بھول گئی۔ آج میں اپنا یہ شکوہ واپس لیتی ہوں"

منور رانا سے متعلق امید قیاس کرتی ہے ایک وقت آئے گا جب انہیں ایسا شعر کہنے کی ضرورت نہیں رہے گی ؎

مرا مقام ترے شہر نے نہیں سمجھا
اگر میں دلّی میں رہتا تو میر ہو جاتا

فیروز عابد

منور رانا واقعی شاعر ہے۔

اس کی غزلوں میں خیالی خوبی معاملہ بندی نہیں ہوتی۔ وہ یہ خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ جگر کو کس طرح خون کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ میں ڈوب کر لکھتا ہے۔

وہ اپنے ہم عمروں سے آگے بڑھ گیا ہے۔ اس کا سبب اس کے خیال کی گہرائی اور اس کے STATEMENT (بیان) کی پہونچ ہے۔ منور سادگی پسند ہے۔ مگر خاموش طبیعت کا مالک نہیں۔ ہمارا ان کی معرفت میں شامل ہے لیکن جب دوسروں کے دکھ درد کی بات آتی ہے تو وہ بڑے خلوص اور

کے ساتھ ان کے دکھ درد کو سنتا ہے۔

زبانی جمع خرچ، لاف زنی اور خود ستائی کے بجائے وہ تندہی اور انہماک سے معروف عمل رہنے کا قائل ہے

ڈاکٹر طارق قاضی (لندن)

منور رانا مغربی بنگال کے ان گنے چنے شاعروں میں سے ایک ہیں جنھیں پورے ہندوستان میں اچھی طرح جانا پہچانا جاتا ہے۔ شوق سے پڑھا جاتا ہے اور پوری دلچسپی سے سنا جاتا ہے۔

منور رانا نہ صرف منفرد لب ولہجہ کے ایک اچھے شاعر ہیں بلکہ ان کی آواز اور انداز بیان بھی بہت دلکش ہے۔

منور رانا کو غزل خاص طور سے محبوب ہے۔ ان کے اشعار میں توازن و موزونیت ہے۔

منور رانا کی شاعری کی عمر زیادہ طویل نہیں۔ لیکن اس قلیل مدت میں انھوں نے اس میدان میں جو کامیابی اور شہرت حاصل کی ہے اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر روحی قاضی

اردو ادب میں منور رانا کا نام محتاج تعارف نہیں۔ پھر بھی جس طرح بہت سی حقیقتوں کا بار بار اعتراف کیا جاتا ہے اسی طرح اس حقیقت کو میں دہرا رہی ہوں کہ "منور رانا" سچے فنکار ہیں۔ وہ پیدائشی طور پر شاعری کے فن سے واقف ہیں۔ پیدائشی طور پر اس لیے کہ وہ متشاعر نہیں بلکہ شاعری سے ان کا فطری لگاؤ ہے الفاظ کی سادگی۔ بصیرت کی گہرائی اور انداز اظہار کی گیرائی نے انہیں بہت ہی کم عرصے میں ملک گیر شہرت اور ہر دلعزیزی بخش دی ہے۔

ظفر احمد ایڈوکیٹ

منور رانا اپنی کم عمری میں شاعری کی دنیا میں ایک مقام بنا چکے ہیں۔ حالات حاضرہ سے بہت زیادہ متاثر ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ مصلحت پسندی کی جھلک ان کی شاعری میں کہیں نہیں پائی جاتی ہے۔

منور رانا سے اہل کلکتہ کو بہت ساری امیدیں ہیں۔ میرا گمان نہیں بلکہ یقین ہے کہ مستقبل میں منور رانا کی شاعری میں مزید دھار آئے گی۔

فاروق شفق

منور رانا کی غزلوں میں جگہ جگہ غریب الوطنی کا ذکر بڑے ہی موثر اور کربناک انداز میں ملتا ہے۔ وطن عزیز سے بچھڑنے اور نتیجے میں دیہات اور شہر کی کشمکش اور اس کے داخلی ردعمل کو جس فنکارانہ انداز

میں پیش کیا ہے۔ وہ انہیں کا حصہ ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ منور رانا نے جدید غزل کی تاریخ میں اپنا نام محفوظ کرا لیا ہے۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ان کی آواز جدید غزل کی بھیڑ میں آسانی سے پہچانی جا سکتی ہے۔ اور میرے نزدیک یہ بڑی بات ہے۔ منور رانا کی غزلوں اور خود ان کے اظہار کے مابین مجھے کسی ایسے حجاب کا سراغ نہیں ملا۔ جسے ایک پوز سے تعبیر کیا جا سکے۔ انھوں نے روزمرہ کے تجربوں جس طرح اور جس عالم میں محسوس کیا اور دیکھا اسے بعینہٖ اسی صورت میں اور اسی بے تکلفی کے ساتھ بیان کر دیا۔ کسی بھی واقعہ کو خواہ وہ معمولی ہو یا بڑا۔ اہم ہو یا غیر اہم۔ اس طرح بیان کرنا کہ یوں محسوس ہو کہ گویا اس بیان میں شاعر کی تخلیقی شخصیت بھی ان واقعات۔ تجربوں اور واردات کی زد پر پوری طرح آتی ہے۔ ایک زبردست تخلیقی کارنامہ ہے۔ منور رانا جہاں روزمرہ کے ذاتی تجربوں کو شاہدے کی کرنچ میں تپا کر نکھارا ہے۔ وہاں ان کے شعر کھرا سونا معلوم ہوتے ہیں۔

یوسف نقوی۔

منور رانا کا شمار ان ابھرتے ہوئے شعرا میں ہے جنھوں نے اردو غزل کو نئی لفظیات عطا کی ہیں۔ مجھے منور رانا کو پڑھنے سے زیادہ سننے کا موقع ملا۔ اور میں نے جب بھی ان کو سنا ہے مجھے یہ احساس ہوا کہ ان کی شاعری اور گفتگو میں دونوں میں ایک چیز مشترک ہے۔ وہ ہے بے باکی۔ دونوں میں الفاظ کا بے باکانہ اور فنکارانہ انتخاب و استعمال ان کی شخصیت اور شاعری دونوں کو میری نظر میں محترم بنا دیتا ہے۔

راج کمار چندن

منور رانا اپنے شعروں میں جدید شاعری کی مروج علامتوں اور موضوعات سے پرہیز کرتے ہیں۔ اور عصری حسیت کا سیدھے سادے الفاظ میں دلوں میں اتر جانے والے انداز میں بیان کرتے ہیں ۔

بستے کی جگہ پیٹھ پر جو بوجھ لیے ہوں ۔۔۔۔ ان بچوں میں بچوں کی ادا بھی نہیں ملتی

کس دن کوئی رشتہ مری بہنوں کو ملیگا ۔۔۔۔ کب نیند کا موسم مری آنکھوں کو ملیگا

رانا کی شاعری کہیں کہیں تو روایت کی پاسداری کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور کہیں کہیں پہ روایت کی توسیع بھی۔ وہ روایتی علامتوں کو بھی نئے آہنگ اور نیا اسلوب بخشتے ہیں۔

ہمارے ساتھ چل کر دیکھ لیں یہ بھی چمن والے !
یہاں اب کوئلہ چھنتے ہیں پھولوں سے بدن والے !

جب یہ سنا کہ جنگ سے لوٹا ہوں ہار کر ۔۔۔۔ راکھی زمیں پہ پھینک کے بہنیں چلی گئیں

منور رانا کی شاعری حقیقت پسندانہ ، روزمرہ مسائل و مشاہدے ہماری زمین اور ہماری زندگی کی شاعری ہے
میں کہ فرہاد نہیں باپ ہوں اک بیٹے کا ــ صرف روزی کے لیے کوہ کنی آ جائے
منور رانا ایسے شعر بھی کہتے ہیں جو نئی نسل کی پسند بھی ہو سکتے ہیں ۔ اور نئی شاعری میں جو یہ کمی تھی
کہ وہ عوام کو براہ راست ساتھ لے کر نہیں چل سکتی ، اسے بھی دور کرنے کی سعی کرتے ہیں ۔

جو میرے ساتھ بھٹکتے تھے تتلیوں کے لیے ــ خریدلاتے ہیں وہ پھول گڑیوں کے لیے

منور رانا کی شاعری سے یہ امید ہے کہ وہ نئے شاعروں کو متاثر کرکے اور نئی شاعری کی کمیوں کو دور کرکے ایک خوشگوار فضا کرنے میں مدد دیں گے کہتے تجربے اور اسلوب کی تازہ کاری کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے ۔

وحید عرشی

"منور رانا کی غزلوں میں اسلوب اور انداز فکر کی انفرادیت کی وہ دھندلی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں جو آگے چل کر کسی زبان کے شعری ادب کو ایک نئی جہت سے روشناس کراتی ہیں ــــ"

کمال احمد

منور رانا ان دنوں اپنی منزل کی تلاش میں تیزی سے رواں دواں ہیں ۔ وہ اپنی اس تیز رفتاری میں اس قدر بے باک اور نڈر ہیں کہ انہیں یہ ہرگز گوارہ نہیں کہ کوئی ان کی منزل کی نشان دہی کرے کیونکہ وہ اپنا مقام خود پہچانتے ہیں ۔ اور اپنے راستے کا تعین خود کرتے ہیں ۔ بزرگ ہستیوں کی بنائی ہوئی دنیا تو سی تو گر کہ لنگے قدم نہیں رکھتے

میرے اجداد نے روندے ہیں سمندر سارے
مجھ سے طوفان میں لنگر نہیں پھینکا جاتا !

خالق عبداللہ غازی

سچ پوچھیے تو لب ولہجے کی تازگی اور تجربات کے اچھوتے پن کے ساتھ پیش کرنے کے لحاظ سے مغربی بنگال میں فی الوقت جدیدیت کے سب سے نمایاں شاعر منور رانا ہیں ۔ ان کی شاعری اشتعال انگیزی سے پاک ہے ۔ اکبرالہ آبادی کی طرح وہ بھی سماجی موضوعات اور عصری سیاست اور تہذیب نو پر کڑی تنقید کرتے ہیں ۔ لیکن چکماں لے کر ۔ ان کا طنز دلآزاری کی حد تک نہیں پہنچتا ۔ عام انسانی مشاہدات ان کی شاعری کے اجزائے لاینفک ہیں ۔ جن میں ایک منظم نظام فکر اور رچا ہوا شعور ملتا ہے ۔ جو سماج اور تہذیب میں ایک صحت مند تبدیلی کی جانب اشارہ کرتا ہے ۔ یقیناً ان کے ترکش میں طنز کے جو تیر ہیں وہ نئے ماڈل کے بنے ہوئے ہیں ۔ لیکن کمان پرانی ہے ۔

بدرالحسن

منور رانا کا شمار کلکتہ کے ان معدودے چند شاعروں میں ہوتا ہے جو نئی نسل اور نئی شاعری کی نمائندگی کا دعوا کر سکتے ہیں ۔

جدید شاعری کی آلودگیوں سے دامن بچا کر نئے رجحانات و میلانات کی ترجمانی قدرے دشوار کام ہے۔ مگر وہ اس کام کو قدرے سلیقے سے انجام دے رہے ہیں۔
رانا کی شاعری بے سمتی کا شکار نہیں۔ موجودہ دور کے کسی بھی شاعر کے لیے یہ ایک بڑی بات ہے۔

نورالہدیٰ

ان کی (منور رانا کی) شاعری جذب و کیف، سرور و غنا کی شاعری نہیں ہے بلکہ تجربات و حقائق کی شاعری ہے۔ زندگی کی نرم و گرم حقیقتوں کی شاعری ہے ؎

جو مصلحت کے قفس میں اسیر ہو جاتا مجھے یقین ہے میں بھی وزیر ہو جاتا

وہ اخلاقی ضابطوں اور انسانی قدروں کے شاعر ہیں ؎

یہ سوچ کر ماں باپ کی خدمت میں لگا ہوں اس پیڑ کا سایہ میرے بچوں کو ملے گا

بلا شبہ ان کی شاعری ابھی دور سے گذر رہی ہے۔ لیکن اتنی کم مدت میں جیسا شاعرانہ شعور ان میں پیدا ہوا ہے یہ ان کی افتاد طبیعت اور مطالعہ و مشاہدہ پر دلالت کرتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ تہذیبی اور اخلاقی طور پر عام انسانوں سے مختلف ہیں۔

شوکت ملیح آبادی

منور رانا کے یہاں فن میں سچائی، پاکیزگی، بانکپن، اور جو تیور نظر آتے ہیں وہ مجاہدانہ کردار کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔ منور رانا انہیں جذبات اور احساسات کے سفر میں آگے بڑھتے ہیں۔ تو کہیں درد و کرب کا احساس انہیں جھنجھوڑتا ہے تو کہیں مفلسی اور بدحالی پر ان کی روح تڑپتی نظر آتی ہے۔
منور رانا کی شاعری جہاں مقبولیت کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ وہیں دنیائے شعر و ادب کو ایسے جدید احساس اور البیلے روپ سے شناس کرا رہی ہے جو کم شعراء کے یہاں پایا جاتا ہے۔

اقبال جاوید

منور رانا نئے دور کی پیداوار ہیں۔ دیگر شاعروں کی طرح ان کی شاعری کی عمارت غزل گوئی کی بنیاد پر کھڑی ہوئی ہے۔ رانا غزل کے شاعر ہیں۔ اور ترقی پسند رجحان ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ حالات و حوادث اور زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے انہوں نے بھی اپنے ہم عصروں کی طرح جدید رجحانات کو اپنانے کی کوشش کی۔

کوئی بھی شاعر قاری کے ذہن پر اپنا گہرا نقش اس وقت تک مرتب نہیں کر پاتا جب تک اس کی شاعری میں فکری بہاؤ اور خیال کی روانی نہ ہو۔ رانا کی شاعری میں یہ دونوں خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اور ان کا شعور فکر اور جذبات سے گہرا تعلق ہے۔

حکیم بیت اللہ خادم

منور رانا نے تجریدی اور غیر مرئی انداز ترک کر کے اپنی شاعری کی ایک منفرد راہ خود نکالی ہے۔ ان کی غزلوں میں ارضیت، ہندوستانیت، مذہبیت اور آفاقیت کا شاعرانہ امتزاج ملتا ہے۔

درحقیقت رانا صاحب دورِ جدید کے ایک اچھے شاعر ہیں۔ ان کے شعروں میں واقعات، تجربات، لمحات، محسوسات، مشاہدات کے علاوہ تغزل بھی موجود ہے۔ اور سب سے بڑی خوبی تو ان کے یہاں یہ ہے کہ مرزا غالب کی طرح غزلوں اور نظموں میں ظرافت کا بھی رنگ جھلکتا ہے۔ منور رانا صاحب قابل تعریف ہیں کہ وہ اپنے اچھوتے اور منفرد خیال کے اظہار کے لیے اپنی نئی زبان اپنے ساتھ لائے ہیں۔

مشرف عالم ذوقی

منور رانا کے یہاں چند ایسی خصوصیتیں ہیں جس سے وہ اپنے ہم عصروں میں بالکل الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں بے حد تنوع ہے اور جو گھریلو فضا ہے، جو وابستگی ہے وہ ذہن پر اپنی چھاپ چھوڑ جاتی ہے۔ تنقید کا میزان ایسا بھی ہونا چاہیئے کہ عصرِ حاضر کے شاعروں کے کلام کو پرکھنے سے پہلے اس کی شخصیت کا بھی ہلکا سا مطالعہ کر لیا جائے۔ تو بات مزید کھلتی چلی جاتی ہے۔ منور رانا ایک مخلص شخص ہیں۔ ایک ذہین فنکار، موضوع سے انصاف کرنے والے شاعر۔ محض جدید نہیں۔ اس لئے ان کے کلام میں جو باریکی ہے جو گھریلو فضا ہے جو آس پاس کا ماحول ہے وہ بہت دیکھا بھالا اور بار بار دیکھا ہوا معلوم پڑتا ہے ؎

اسے بھی ہو گئی مدت کتابِ دل کھولے
مجھے بھی یاد پرانے کئی سبق نہ رہے

وہ ہم سے چھین کے ماضی بھی لے گیا رانا
ہم اس کو یاد بھی کرنے کے مستحق نہ رہے

ان کے یہاں زندگی ہے۔ اور زندگی کو کلام میں پرونے کا عشق جنون کی حد تک نظر آتا ہے۔ ●

انتخابِ کلام: منوّر رانا

کبھی خوشی سے خوشی کی طرف نہیں دیکھا
تمہارے بعد کسی کی طرف نہیں دیکھا

یہ سوچ کر کہ ترا انتظار لازم ہے
تمام عمر گھڑی کی طرف نہیں دیکھا

یہاں تو جو بھی ہے آبِ رواں کا عاشق ہے
کسی نے خشک ندی کی طرف نہیں دیکھا

وہ جس کے واسطے پردیس جا رہا ہوں میں
بچھڑتے وقت اسی کی طرف نہیں دیکھا

ہمیشہ اپنی ہی شرطوں پہ ہجرتیں کی ہیں
مسافروں نے قلی کی طرف نہیں دیکھا

روش بزرگوں کی شامل ہے میری گھٹی میں
ضرورتاً بھی سخی کی طرف نہیں دیکھا

ہم پر اب اس لیے خنجر نہیں پھینکا جاتا
خشک تالاب میں کنکر نہیں پھینکا جاتا

اس نے رکھا ہے حفاظت سے ہمارے غم کو
عورتوں سے کبھی زیور نہیں پھینکا جاتا

اس خرابے کو تو گلزار بناتا تھا اسے
ورنہ آدم کو زمیں پر نہیں پھینکا جاتا

میرے احباب نے روندے ہیں سمندر سارے
مجھ سے طوفان میں لنگر نہیں پھینکا جاتا

جو چھپا لیتا ہے دیوار کی عریانی کو
دوستو! ایسا کلنڈر نہیں پھینکا جاتا

لپٹی رہتی ہے تری یاد ہمیشہ ہم سے
کوئی موسم ہو یہ مفلر نہیں پھینکا جاتا

گفتگو فون پہ ہو جاتی ہے رانا صاحب
اب کسی چھت پہ کبوتر نہیں پھینکا جاتا

تجھے اکیلے پڑھوں کوئی ہم سبق نہ رہے
میں چاہتا ہوں کہ تجھ پر کسی کا حق نہ رہے

مجھے جدائی کے موسم پہ اعتراض نہیں
مری دعا ہے کہ اس کو بھی کچھ قلق نہ رہے

جو تیرا نام کسی اجنبی کے لب چومے
مری جبیں پہ یہ ممکن نہیں عرق نہ رہے

وہ مجھ کو چھوڑ نہ دیتا تو اور کیا کرتا
میں وہ کتاب ہوں جس کے کئی ورق نہ رہے

اسے بھی ہو گئی مدت کتابِ دل کھولے
مجھے بھی یاد پرانے کئی سبق نہ رہے

وہ ہم سے چھین کے آنکھیں بھی لے گیا رانا
ہم اس کو یاد بھی کرنے کے مستحق نہ رہے

ایک آس کی ماری ہوئی دلہن کی طرح ہے
یہ زندگی ٹوٹے ہوئے کنگن کی طرح ہے
ہر شخص میرے شہر میں دشمن کی طرح ہے
اب رام کا کردار بھی راون کی طرح ہے
دلکش کبھی نظر آتی ہے دھبے کبھی بہت ہیں
یہ زندگی زردار کی اترن کی طرح ہے
اس دورِ ترقی میں کبھی مفلس کی جوانی
بھٹی میں سلگتے ہوئے ایندھن کی طرح ہے
ممتا سے تپسیاؤں کی آہٹ سے ہے محروم
یہ دل بھی کسی بانجھ کے آنگن کی طرح ہے

ہمیں مزدوروں کی محنت کشوں کی یاد آتی ہے
عمارت دیکھ کر کاریگروں کی یاد آتی ہے
نمازیں پڑھ کے واپس لوٹتے بچوں سے مل کر
نہ جانے کیوں ہمیں پیغمبروں کی یاد آتی ہے
میں اپنے بھائیوں کے ساتھ جب باہر نکلتا ہوں
مجھے یوسف کے جانی دشمنوں کی یاد آتی ہے
تمہارے شہر کی یہ رونقیں اچھی نہیں لگتیں
ہمیں جب گاؤں کے کچے گھروں کی یاد آتی ہے
میرے بچے کبھی مجھ سے جو پانی مانگ لیتے ہیں
تو پہروں کربلا کے واقعوں کی یاد آتی ہے

خشک تھا جو پیڑ اس پر پتیاں اچھی لگیں
تیرے ہونٹوں پر لرزتی سسکیاں اچھی لگیں

ہر سہولت تھی میسر لیکن اس کے باوجود
ماں کے ہاتھوں کی پکائی روٹیاں اچھی لگیں

جس نے آزادی کے قصے بھی سنے ہوں قید میں
اس پرندے کو قفس کی تیلیاں اچھی لگیں

ہاتھ اٹھا کر وقتِ رخصت جب دعائیں اس نے دیں
اس کے ہاتھوں میں کھنکتی چوڑیاں اچھی لگیں

ہم بہت تھک ہار کر لوٹے تھے لیکن جانے کیوں
رینگتی، بڑھتی، سرکتی چیونٹیاں اچھی لگیں



خاندانی وراثت کے نیلام پر آپ اپنے کو تیار کرتے ہوئے
اس حویلی کے سارے مکیں رو دیے اس حویلی کو بازار کرتے ہوئے

دوستی دشمنی دونوں شامل رہیں دوستوں کی نوازش تھی کچھ اس طرح
کاٹ لے شوخ بچہ کوئی جس طرح ماں کے رخسار پر پیار کرتے ہوئے

دکھ بزرگوں نے کافی اٹھائے مگر میرا بچپن بہت ہی سہانا رہا
عمر بھر دھوپ میں پیڑ جلتے رہے اپنی شاخیں ثمردار کرتے ہوئے

ماں کی ممتا گھنے بادلوں کی طرح سر پہ سایہ کیے ساتھ چلتی رہی
ایک بچہ کتابیں لیے ہاتھ میں خامشی سے سڑک پار کرتے ہوئے

بھیگی پلکیں مگر مسکراتے ہوئے جیسے پانی برسنے لگے دھوپ میں
میں نے رانا مگر مڑ کے دیکھا نہیں گھر کی دہلیز کو پار کرتے ہوئے



صحرا میں رہ کے قیس زیادہ مزے میں ہے
دنیا سمجھ رہی ہے کہ لیلیٰ مزے میں ہے

برباد کر دیا ہمیں پردیس نے مگر!
ماں سب سے کہہ رہی ہے کہ بیٹا مزے میں ہے

ہے روح بے قرار ابھی تک یزید کی
وہ اس لیے کہ آج بھی پیاسا مزے میں ہے

دنیا اگر مذاق بدل دے تو اور بات
اب تک تو جھوٹ بولنے والا مزے میں ہے





مجھ کو گہرائی میں مٹی کی اتر جانا ہے
زندگی باندھ لے سامانِ سفر جانا ہے

گھر کی دہلیز پہ روشن ہیں وہ بجھتی آنکھیں
مجھ کو مت روک مجھے لوٹ کے گھر جانا ہے

میں وہ میلے میں بھٹکتا ہوا اک بچہ ہوں
جس کے ماں باپ کو روتے ہوئے مر جانا ہے

زندگی تاش کے پتوں کی طرح ہے میری
اور پتوں کو بہرحال بکھر جانا ہے

ایک بے نام سے رشتے کی تمنا لے کر
اس کبوتر کو کسی چھت پہ اتر جانا ہے



○

وفاداری کو پرکھا جا رہا ہے
ہمارا جسم دلغا جا رہا ہے

کسی بوڑھے کی لاٹھی چھن گئی ہے
وہ دیکھو اک جنازا جا رہا ہے

مری تہذیب ننگی ہو رہی ہے
یہ اڑ کر اک دوپٹا جا رہا ہے

نہ جانے جرم کیا ہم سے ہوا ہے
ہمیں ٹکڑوں میں تولا جا رہا ہے

قلم کچھ اور لکھنا چاہتا تھا
مگر کاغذ ہی بھیگا جا رہا ہے

دعا اس پر ہو گی کچھ مرہم نوازی
ہمارا زخم دھویا جا رہا ہے

○

○

ساتھ اپنے رونقیں شاید اٹھا لے جائیں گے
جب کبھی گاؤں سے کچھ لڑکے نکالے جائیں گے

کچی سڑکوں سے لپٹ کر بیل گاڑی رو پڑی
غالباً پردیس کو کچھ گاؤں والے جائیں گے

ہو سکے تو دوسری کوئی جگہ دے دیجئے
آنکھ کا کاجل تو چند آنسو بہالے جائیں گے

ہم تو اک اخبار سے کاٹی ہوئی تصویر ہیں
جسکو کاغذ چننے والے کل اٹھالے جائیں گے

حادثوں کی گرد سے خود کو بچانے کے لئے
ماں ہم اپنے ساتھ بس تیری دعا لے جائیں گے

○

○

رستے ہوئے زخموں کو دوا بھی نہیں ملتی
اب ہم کو بزرگوں سے سزا بھی نہیں ملتی

جو دھوپ میں جلنے کا سلیقہ نہیں رکھتے
ان پیڑوں کو پتوں کی قبا بھی نہیں ملتی

مدت سے تمہارا کوئی خط بھی نہیں آیا
رستے میں کہیں باد صبا بھی نہیں ملتی

بستے کی جگہ بیٹھ پہ جو بوجھ لئے ہوں
ان بچوں میں بچوں کی ادا بھی نہیں ملتی

کیا جانے کہاں ہوتے مرے پھول سے بچے
ورثے میں اگر ماں کی دعا بھی نہیں ملتی

○

آنکھوں میں کوئی خواب سنہرا نہیں آتا
اس جھیل پہ کوئی پرندہ نہیں آتا
حالات نے چہرے کی چمک چھین لی ورنہ
دو چار برس میں تو بڑھاپا نہیں آتا
مدت سے تمنائیں سجی بیٹھی ہیں دل میں
اس گھر میں بڑے لوگوں کا رشتہ نہیں آتا
اس درجہ مصائب کے جہنم میں جلا ہوں
اب کوئی بھی موسم ہو پسینہ نہیں آتا
میں ریل میں بیٹھا ہوا یہ سوچ رہا ہوں
اس دور میں آسانی سے پیسہ نہیں آتا
وہ قوم کی تقدیر بدلنے کو اٹھے ہیں
جن لوگوں کو جینے سے ہی گلہ نہیں آتا
بس تیری محبت میں چلا آیا ہوں ورنہ
یوں سب کے بلا لینے سے رانا نہیں آتا

جو اُس نے لکھے تھے خط کاپیوں میں چھوڑ آئے
ہم آج اس کو بڑی الجھنوں میں چھوڑ آئے
اگر حریفوں میں ہوتا تو بچ بھی سکتا تھا
غلط کیا جو اُسے دوستوں میں چھوڑ آئے
سفر کا شوق بھی کتنا عجیب ہوتا ہے
وہ چہرہ بھیگا ہوا آنسوؤں میں چھوڑ آئے
پھر اس کے بعد وہ آنکھیں کبھی نہیں روئیں
ہم اُن کو ایسی غلط فہمیوں میں چھوڑ آئے
محاذِ جنگ پہ جانا بہت ضروری تھا
بلکتے بچے ہم اپنے گھروں میں چھوڑ آئے
جب ایک واقعہ بچپن کا ہم کو یاد آیا
ہم ان پرندوں کو پھر گھونسلوں میں چھوڑ آئے

عہدِ نو تیرے میر ہیں ہم لوگ — آپ اپنی نظیر ہیں ہم لوگ
وقت پڑنے پہ جان تک دی ہے — یوں بظاہر فقیر ہیں ہم لوگ
موت کو مہ جبیں سمجھتے ہیں — کس بلا کے شریر ہیں ہم لوگ
وقت کی سیڑھیوں پہ لیٹے ہیں — اس صدی کے کبیر ہیں ہم لوگ

رکھ رہے ہیں ترے قفس کا بھرم
مت سمجھنا اسیر ہیں ہم لوگ

اڑے کبوتر اڑے خیال

ایک بوسیدہ سی مسجد میں
دیواروں، محرابوں پر
اور کبھی چھت کی جانب
میری آنکھیں گھوم رہی ہیں
جانے کس کو ڈھونڈ رہی ہیں
میری آنکھیں رک جاتی ہیں
لوہے کے اس خالی ہک پر
جو خالی خالی نظروں سے
ہر اک چہرہ دیکھ رہا ہے
کب سے رستہ دیکھ رہا ہے
ایسے اک انسان کا شاید
جو اک پنکھا لے آئے گا
لائے گا اور دور کرے گا
مسجد کی بے سامانی کو
خالی ہک کی ویرانی کو
میں نے جب اس ہک کو دیکھا
میری ننھی پھول سی بیٹی
میری آنکھوں میں در آئی
بھولی بھالی ماں نے اس کی
اپنی پیاری راج دلاری
بیٹی کے دونوں کانوں کو
اپنے ہاتھوں چھید دیا ہے
پھولوں جیسے کانوں میں پھر
نیم کے تنکے ڈال دیئے ہیں
دھیمی سی اک آس لگا کر
من ہی من میں سوچ رہی ہے
جب ہم کو اللہ ہمارا
تھوڑا بہت بھی پیسہ دے گا
بیٹی کے کانوں میں اس دن
بالیاں ہوں گی، بندے ہوں گے
میں نے انتھک محنت کر کے
پنکھا ایک خرید لیا ہے
مسجد کے اس خالی ہک کو
میں نے پنکھا سونپ دیا ہے
ہک میں پنکھا دیکھ کے مجھ کو
ہوتا ہے محسوس کہ جیسے
میری بیٹی [illegible]
گھر کی چھت پر گھوم رہی ہے۔





یوم آزادی ۱۵ اگست
برادرانِ وطن کو مبارک ہو
سالہا سال سے
مشہور و مقبول عام
گھریلو دوا
ہند سی۔ سی ورکس متوناتھ بھنجن یوپی

سُرمہ اصلی ممیرہ نمبر ۱۰

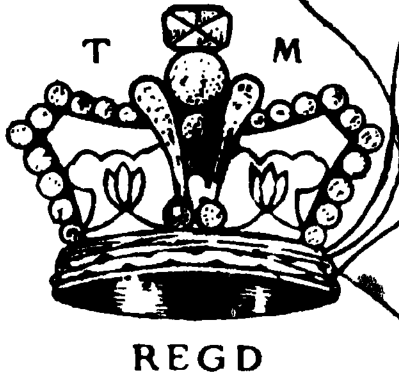
سُرمہ اصلی ممیرہ نمبر ۲۱

سُرمہ نورانی

کاجل نسیم

ہماری مصنوعات

تاج مارکہ



سُرمہ و کاجل

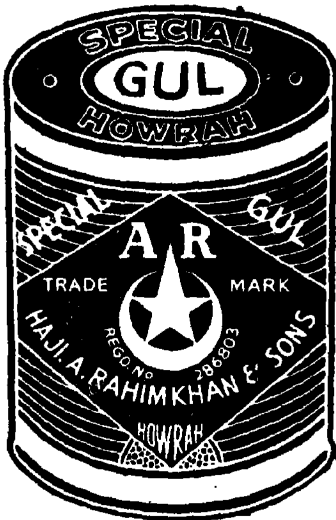
ایس مہر الٰہی محمد شفیع نمبر ۳/۱ رجیت پور روڈ کلکتہ

• • •

★ ★ ★

With best

Compliments from :—



مہربانی فرما کر نقالوں سے ہوشیار رہیں

سب سے زیادہ
فروخت ہونے والا
اے-آر-چاند تارا مارکہ
گُل
(رجسٹرڈ ٹریڈ مارک)
ہمیشہ استعمال کیجئے

تیار کردہ: حاجی اے۔ رحیم خان اینڈ سنس پوسٹ بکس نمبر ۹۷ ہوڑہ

۱۳۲ جی ٹی روڈ (ساؤتھ) شب پور، ہوڑہ • برانچ جڑ پکھنا ایچ۔ بی۔ روڈ رانچی





Munawwar Rana's Poetry makes the whole atmosphere Poetic

With best

compliments of

THE BENARES STATE BANK LTD.

Regd. Office : D[illegible]2/1, LUXA ROAD,

VARANASI - 221010

We transact all types of Banking Business including Foreign Exchange

(LOCKER FACILITY ALSO AVAILABLE)

We have various deposit schemes for different income groups

Please Contact at our Branches at :-

8, COLOOTOLA STREET, CALCUTTA - 700073

&

MOTIJHEEL, MUZAFFARPUR (BIHAR)

سُہیل





کیفی اعظمی

Rs. 1/50

Oct. 84

بانی: مولوی حافظ محمد عبدالرحمٰن صاحب بسمل سنسہاروی ○ بیادگار: مولوی محمد زین العابدین آخر سنسہاروی

ترقی پسند ادب کا ترجمان

ماہنامہ سہیل گیا

شمارہ: ۱۰ ○ اکتوبر ۱۹۸۴ء ○ جلد: ۴۶

مدیر موسس: ادریس سنسہاروی

بدل اشتراک

فی شمارہ: ایک روپے پچاس پیسے ○ سالانہ ۱۸ روپے ○ لائف ممبر: ۱۱۰ روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ سہیل، ریورسائڈ روڈ، گیا

فہرس

(نمود)

عظیم اکتوبر انقلاب

انسانی سماج کی ترقی کی تاریخ عجیب و غرایب واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ان میں زیادہ تر واقعات ایسے ہیں جن کی یاد وقت کے ساتھ دھندلے ہوتے جا رہے ہیں۔ کچھ واقعات ایسے بھی ہیں جن کی یاد حال کے تھپیڑوں سے ٹکرا کر اور زیادہ نکھرتی جاتی ہے۔ عظیم اکتوبر انقلاب ایسے واقعات میں سب سے اہم ہے۔ آج پورے انسانی سماج کی ترقی کے راستوں کو پہلے سے بھی زیادہ خوبصورتی کے ساتھ روشن کر رہی ہے۔

تقریباً ۷۰ سال قبل ۲۵ اکتوبر (نئے سوویت کلنڈر کے مطابق ۷ نومبر) کو روس میں ہوئے اس انقلاب کی سالگرہ آج صرف سوویت یونین میں اور سماج وادی ملکوں میں بلکہ زیادہ تر ملک میں بڑی دھوم دھام سے منائی جا رہی ہے۔ اور اس واقعہ کی بڑھتی مقبولیت کا یہی ثبوت ہے کہ اس کی سالگرہ منانے والوں کی دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی قطاریں ہر سال [illegible] لوگوں کی جماعت شامل ہوتی جا رہی ہے۔

شروع میں [illegible] انقلاب کی سالگرہ کی تقریب سرکاری طور پر صرف ایک ملک میں منائی جاتی تھی دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ تقریب ایک تہائی دنیا کے ایک درجن سے زیادہ ملکوں میں سرکاری طور پر منعقد ہونے لگی۔ اور آج یہ تقریب دو درجن سے زیادہ ملکوں میں سرکاری طور پر منعقد ہو رہی ہے۔ یہ اس عظیم واقعے کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا ثبوت ہے۔

اس عظیم انقلاب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت بے وجہ نہیں ہے۔ تاریخ کے پچھلے انقلاب نے طریقۂ کار تو بدلا تھا لیکن استحصال کے ایک طریقہ کی جگہ استحصال کا دوسرا طریقہ بھی قائم ہوتا آیا۔ پہلے سماج وادی انقلاب نے آدمی کے ذریعے آدمی کے استحصال کے طریقہ کو برابر کے لئے ختم کر استحصال کے بغیر سماج وادی نظام کی بنیاد ڈالا۔ اس عظیم انقلاب نے استحصال کے پونجی وادی طریقۂ کار سے الگ ایک نئے سماج وادی دور کا آغاز کیا۔ تاریخ کا یہ پہلا انقلاب تھا جس کی روپ ریکھا پہلے سے تیار کی گئی تھی۔ پونجی وادی طریقۂ کار کا پوری طرح سے مطالعہ کر کے مارکس اور اینگلز نے سماج وادی انقلاب اور سائنسی نقطۂ نظر کو مدنظر رکھ کر کمیونسٹ مینی فیسٹو کی شکل میں ۱۸۴۸ء میں پیش کیا۔ عظیم لینن کی رہنمائی میں روس کے مزدوروں نے کسانوں اور دوسری ترقی پسند طاقتوں کے ساتھ مل کر ۱۹۱۷ء میں اس خواب کو پورا کرنے میں ایک قدم آگے [illegible]

کمیونسٹ مینی فیسٹو میں مارکس نے نعرہ دیا "دنیا [illegible] ایک ہو"۔ پہلے سماج وادی انقلاب کی دنیا کے مزدوروں نے اپنی آزادی کی شکل میں [illegible]۔ اور جب نئے سماج وادی انقلاب کا گلا گھونٹ دینے کے لئے چاروں طرف سے [illegible] حکومتوں نے ایک ساتھ حملہ بول دیا۔ تب دنیا کے مزدوروں نے [illegible] حملے کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنی قربانیاں دیں۔ عظیم اکتوبر انقلاب کے [illegible] بحال سا آ گیا۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے لگی اور اب دنیا میں چاروں طرف سماج واد کا راستہ ہموار ہوتا جا رہا ہے۔

پونجی واد سے سماج واد میں تبدیلی کا دور ایک ایسے دور میں پہنچ چکا ہے جہاں ایک طرف اکتوبر انقلاب کا ملک سوویت یونین اور دنیا کا سماج واد' امن' ترقی اور زندگی کے محافظ کی شکل میں کھڑا ہے

دوسری جانب امریکی حکومت اور سامراج آزاد دنیا کو جنگ اور موت میں تبدیل کر دینے کے آمادہ ہے۔ ایسے وقت میں اکتوبر انقلاب کی سالگرہ جنگ کی مخالفت اور امن کی حفاظ کے لئے عہد کرنے کا موقع ہے۔

ہماری آزادی کی حفاظت اور معاشی ترقی کی لڑائی میں اکتوبر انقلاب کے ملک کی مدد خا اہمیت ہے۔ خود ہمارے ملک کا مستقبل امن کے مستقبل کے ساتھ جڑا ہے۔ ہمارے ملک کی تم امن پسند اور ترقی پسند طاقتیں اس دن امن کی حفاظت اور اکتوبر انقلاب کے مقاص کو آگے بڑھانے کا عہد کرتی ہیں۔

(جمیل منظر گسنہاردی)

پرنٹر، پبلیشر، ایم ادریس گسنہاردی نے ملت آرٹ پریس سلطان گنج۔ پٹنہ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ سہیل، ریور سائیڈ روڈ، گیا سے شائع کیا

ماہنامہ سہیل گیا

کے، کے کھلر

اُردو ادب میں طنز و مزاح

اگر دنیا میں کوئی ایسی زبان ہے جس نے غم میں بھی ہنسنا فراموش نہیں کیا تو وہ اردو زبان ہے۔ جو ہندوستانی زبانوں میں سب سے کم عمر ہونے کے باوجود حسن، مزاح اور ہجو و ظرافت سے مالا مال ہے۔ اردو میں مزاح نگاری پر کبھی پابندی نہیں رہی۔ اور نہ اس کا مزاج بے جان اور پھیکا ہے۔ یہی وہ واحد زبان ہے جو علاقائی حد بندیوں سے ماورا ہونے کے باعث ہندوستان کو لسانیاتی اور جغرافیائی وحدت عطا کرتی ہے یہی وہ زبان ہے جس نے ہندوستان کی جد و جہد آزادی میں اپنی بساط سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ جواہر لال نے اردو کو تمدن کی زبان کہا تھا اور گاندھی جی نے تو جنوبی افریقہ کے فونکس فارم میں ۱۹۰۴ء میں اردو پڑھائی بھی تھی۔ اپنے بولنے والوں کی تعداد کے اعتبار سے ہندوستان میں اردو چھٹے نمبر پر ہے۔ لیکن اردو بولنے والے دنیا کے ہر کونے میں پھیلے ہوئے ہیں سان فرانسسکو سے سنگاپور تک، اور کنیڈا سے کناڈا تک۔

ہندوستان اور ہندوستان سے باہر نا مساعد حالات سے دوچار ہونے کے باوجود یہ زبان ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی، جس کی وجہ اس زبان کی اندرونی لچک، اس کے روزمرہ کا حسن، اور اس کی ظرافت کا اعلیٰ معیار ہے۔

ہجو ایک صنف شاعری ہے، جس کے ذریعہ ہجو نگار سماج میں پھیلی ہوئی غیر متعلقہ اور غیر معمولی برائیوں کی بازیافت کر کے ان کا مذاق اڑاتا ہے۔ اس کا مولد یونان ہے۔ اگرچہ ماضی میں دنیا کے عظیم ترین ہجو نگار روم سے تعلق رکھتے تھے ہجو کے عناصر ترکیبی میں طنز، تمسخر، خاکہ اڑانا، اور پھکڑ گوئی تک شامل ہے۔ ڈاکٹر سموئل جانسن نے جو خود بھی اعلیٰ پایہ کے طنز نگار تھے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

> "ہجو دشنام طرازی اور خوشامد کے بین بین ہے اگرچہ ہجو ایک طرف طنز کے نشتروں سے گھائل کرتی ہے تو دوسری طرف ظرافت کے ذریعہ ان زخموں پر مرہم بھی رکھتی ہے۔"

ولیم جیمس نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

" یہ اپنے عہد کی برائیوں کی آئینہ دار ہوتی ہے یہ روایت کی طرح قدیم اور جدیدیت کی طرح جدید ہے "

" ہم آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے "

اگرچہ طنز سماج میں پائی جانے والی برائیوں اور تفاوت پر ضرب لگانے کے لیے وجود میں آتا ہے لیکن اس کی ابتدا اور پھکڑپن سے بہ آسانی ممتاز کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ اپنی نوعیت، اسلوب اور طرز بیان کی بنیاد پر صاف پہچانا جاسکتا ہے۔ سچا طنز غصہ سے ماورا ہوتا ہے۔ ابتذال اس کے لئے ہلاکت خیز ہے۔ اور طنز سماجی تبدیلی کا سب سے موثر آلہ رہا ہے۔ سچے طنز میں جو چیز سب سے زیادہ توجہ طلب ہے یہ نہیں ہے کہ طنز نگار نے کس چیز کو ہدف بنایا ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ کس طرح بنایا ہے۔

طنز نظم سے زیادہ نثر کے مزاج سے ہم آہنگ ہے اردو میں طنز نگاری کا آغاز احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کے درباروں میں ہوا۔ لیکن اس کی تکمیل اودھ کے نوابوں کے درباروں میں ہوئی۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں دہلی، آگرہ، حیدرآباد، لاہور، اور علی گڑھ طنز نگاری کے اہم مرکز رہے۔

اردو کے سب سے پہلے طنز نگار مرزا محمد رفیع سودا تھے (۱۷۱۳ تا ۱۷۸۰ء) انھوں نے ہجو نگاری میں جو شہرت پائی ہے وہ شاید ہی کسی دوسرے ہجو نگار کے حصے میں آئی ہو۔ اگرچہ ان کی ہجویات ادبی محاسن سے مالا مال ہے لیکن انھوں نے بعض ہجویات اپنے حریفوں سے حساب چکانے کی خاطر لکھی تھیں۔ فولاد خاں، ضاحطہ خاں، شاہ ولی اللہ دہلوی وغیرہ پر ان کی ہجویں اسی ذیل میں آتی ہیں۔ محمد حسین آزاد نے سودا کی ہجویات کو " زہر کے قطعے " کہا ہے اور بقول محمد حسین آزاد:

"ایک ایک مصرعہ ان کا قہقہوں کا منتر ہے لیکن اگرچہ ایسی ہجو آج اگر کوئی لکھ بھی دے تو عدالت یا انصاف میں مجرم ہو کر جواب دہی کرنی پڑتی ہے"

ولی محمد نظیر اکبرآبادی جو دہلی سے ہجرت کر کے آگرہ چلے گئے تھے اور وہیں ۹۰ سال کی عمر میں مرے اچھے طنز نگار تھے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں ان تمام کمزوریوں کو ہدف ملامت بنایا ہے جس کا وہ خود بھی شکار تھے۔ ان کی نظمیں پیسا اور آدمی، مفلسی اور فلسفہ، اور رجوع خوشامد کرے، ان کے عہد کے سماجی تضادات پر بھرپور طنز کرتی ہیں۔ وہ پہلے مسلمان شاعر ہیں، جنھوں نے اپنی نظموں میں برج بھاشا کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے ہیں۔

انشاء اللہ خاں انشاء کی زندگی ایسے معرکوں سے عبارت ہے جو ادبی سے زیادہ شخصی نوعیت رکھتے تھے۔ انشاء اپنے استادوں، سرپرستوں، ہم عصر شعراء، یہاں تک کہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں تک کے ساتھ بھی مسلسل معرکہ آرائی میں مصروف رہے۔ انشاء کی بذلہ سنجی، اور ظرافت ان کے زمانے میں ضرب المثل تھی۔ انشاء ہرزہ سرائی اور شوخی کا فطری ملکہ رکھتے تھے، اور ہر شخص ان کی صلاحیتوں کا معترف تھا۔ انشاء

کے طنز وظرافت میں ادبیت اور ذہانت کے فقدان ہونے کے باوجود تفنن طبع کا سامان موجود ہے۔ ان کی تحریروں سے قارئین اسی طرح لطف اندوز ہوتے ہیں جیسے خود انشا رہ بہترین طنز نگار بن سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے پوری طرح کام نہیں لیا۔ ان کے لطیفے اور طنز وظرافت سے بھرپور چٹکلے اب مزا نہیں دیتے۔ آج ان کی شہرت دریائے لطافت کی وجہ سے ہے جو ایک علمی کتاب ہے۔ اور طنز وظرافت سے عاری ہے۔

میر تقی میر اتنے شائستہ اور مہذب تھے کہ ان سے طنز نگاری کی توقع کرنا عبث ہے۔ لیکن دو ایک لطیفے ان سے بھی یادگار ہیں۔ ان لطیفوں میں میر کی شائستگی اور احساس تفاخر نے سطحیت اور اوچھا پن نہیں آنے دیا۔ ادبیت کے اعتبار سے میر تقی میر کی ذات انشا کی شخصیت کے بالکل متضاد تھی۔ ان کے بارے میں ایک نقاد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے :

"بلندش نہایت بلند و پستش نہایت پست"

مرزا غالب کی نثر نے اردو کو ایک نئے قسم کی ظرافت نگاری سے متعارف کرایا۔ ان کے خطوط مزاح سے بھرے ہیں۔ مجروح کے نام ۱۶ ستمبر ۱۸۶۲ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ مجھے برسات کا موسم بہت پسند ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹے بھر برسے۔ اسی طرح ۱۸۵۹ء میں دہلی میں وبا پھیلی میر مہدی مجروح اس وقت تک پانی پت ہی میں تھے۔ مرزا سے انھوں نے وبا کا حال دریافت کیا مرزا نے جواب دیا کہ وبا یہاں نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ لکھی :

"وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ۔ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد
اور چونسٹھ برس کی عورت ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ
ہاں وبا آئی تھی، تف بریں وبا"

انیسویں صدی کی سب سے زیادہ وسیع المشرب اور روشن خیال شخصیت ہونے کے ناطے ان کا طنز آج بھی ملتا ہے۔ وہ ایک ایسے سماج کا خواب دیکھ رہے تھے جہاں انسان واقعی انسان ہوگا۔

مرزا نے مذہبی معاملات میں بھی مزاح کا دامن نہیں چھوڑا۔ مرزا کے سامنے کسی نے شراب کی مذمت کی۔ مرزا نے کہا بھئی آخر اس میں کیا برائی ہے۔ انھوں نے کہا کہ حضرت پہلی برائی تو یہی ہے کہ شرابی کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ مرزا نے کہا ٹھیک ہے۔ مگر خدا یہ تو بتاؤ کہ جس کے پاس شراب موجود ہے پھر اس کو اور کون سی دعا کی ضرورت ہے۔ ایک اور موقع پر جب ان سے معلوم کیا گیا کہ کیا آپ مسلمان ہیں، جواب دیا کہ آدھا مسلمان ہوں۔ وضاحت کرنے پر مرزا نے کہا کہ شراب پیتا ہوں سور کا گوشت نہیں کھاتا ہوں۔
غالب کی نثر میں مزاح اور طبیعت میں شگفتگی ہے عبادت بریلوی اپنی کتاب "تنقیدی زاویئے" میں لکھتے ہیں

"[illegible] اس وقت کے سیاسی حالات [illegible] مزاح کے لیے کچھ زیادہ سازگار نہ تھے لیکن غالب کی [illegible]

خشگفتگی ان پر غالب آگئی چنانچہ ان تحریروں میں اکثر جگہ ظرافت کے بہت عمدہ نمونے ملتے ہیں جس کا سوا ہنسنے ہنسانے کے اور کچھ مطلب نہیں۔ غالب کی اس ظرافت میں ایک طرح کی تازگی اور بے ساختگی ہے جس کے پیدا کرنے میں کسی شعوری کوشش کو دخل نہیں۔ بات یہ ہے کہ غالب اس مزاج کو اپنے نجی خطوط میں پیدا کرتے ہیں۔ اور ان کو یہ خیال نہیں رہتا کہ ان کو کوئی ادبی حیثیت حاصل ہوگی۔ وہ تو خطوط کے ذریعہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کی دلچسپی کا سامان فراہم کرنا چاہتے ہیں۔

اس اثنا میں اردو صحافت میں ایک غیر متوقع انقلاب رونما ہوا۔ اور وہ تھا انگریزی کا مزاحیہ اور قہقہہ زار "پنچ" کے طور پر لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ کا اجرا اس اخبار کے ذریعہ اور آخری مدیر سجاد حسین تھے۔ اودھ پنچ میں طنز و مزاح کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ سجاد حسین کا خاص ہتھیار تھا کہ اڑاتا تھا سیاسی اعتبار سے انڈین نیشنل کانگریس کی پالیسیوں کے حامی ہونے کے باوجود یہ اخبار قدامت پسندی کا ترجمان تھا۔ پھر بھی اس نے اردو افسانہ ناول کی تشکیل و تعمیر میں بہت اہم رول ادا کیا۔ اردو میں اس اخبار نے وہی کارنامہ انجام دیا جو انگریزی میں RAMBLER' TATLER اور SPECTATOR نے انجام دیا تھا۔

دوسرا اردو اخبار "اودھ اخبار" کے نام سے ۴۴ صفحات پر مشتمل تھا۔ ۱۸۷۸ء میں فسانۂ آزاد کے مصنف سرشار نے اس کی ادارت سنبھالی۔ اس اخبار میں فسانۂ آزاد قسط وار شائع ہوا تھا۔ جس سے اس زمانے میں لکھنوی معاشرے کی کمزوری اور خامیاں بے نقاب کی گئی تھیں۔ پروفیسر صادق سرشار کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"سرشار اتنے ہنس مکھ اور نیک طبع تھے کہ وہ طنز نگار ہو ہی نہیں سکتے وہ مزاح نگار تھے اور اپنے زمانے کی خامیوں پر ہنستے تھے"

سرشار اپنے مزاحیہ کرداروں کی تصویر کشی کرتے ہوئے انھیں گلے لگاتے ہیں۔ ان کی حرکتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور ان کی خامیوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔

اقبال ۔ ۱۸۷۷ء تا ۱۹۳۸ء نے طنز نگاری کو ادبی صنف کے مرتبے سے اٹھا کر فن کی معراج تک پہونچا دیا۔ انھوں نے طنز کو خشکی و بے لطفی سے بچایا۔ اور اس کو عقلیت و متانت سے روشناس کرایا۔ اقبال نے نظریات اور افراد کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا وہ مشرقی تہذیب و تمدن کے بہت بڑے حامی تھے۔ اور انھوں نے مغربی تہذیب پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔ مغربی تہذیب پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ؎

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم — حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

شوکت تھانوی بھی سودیشی ہیں۔ ہندوستانیوں کی مغربیت اور وقت کے پابند نہ ہونے پر بھرپور طنز کرتے ہیں۔ ان کا یہ مضمون سیر گنگ خیال میں شائع ہوا اور اس کے بعد بیشتر ہندوستانی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا

سودیشی پولیس، سودیشی عدالت، اور سودیشی اسکول بھی اسی قبیل میں آتے ہیں۔ ان طنزیہ مضامین میں مضحکہ اڑانے سے زیادہ کوشش کی ہے کہ قارئین کو قہقہہ لگانے پر مجبور کیا جائے۔

پطرس بخاری طنز و مزاح میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ شاید ہی ادب کا کوئی طالب علم ایسا ہو جس نے "پطرس کے مضامین" نہ پڑھی ہو۔ ان کی طنز نگاری اعلیٰ فنی اقدار کی حامل ہے۔ 11 مزاحیہ مضامین پر مشتمل ان کی کتاب بے حد دلچسپ ہے۔ ان میں کچھ مضامین انگریزی اور فرانسیسی مزاح نگاروں سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں۔

"لیبل اور میں" میں تبصرہ لکھنے والوں کا مذاق اڑایا گیا ہے، نقادوں کو ننگا کیا گیا ہے اور ڈرامے نقل کرنے والوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ "سینما کا عشق" بھی ایک میٹھی طنز ہے۔

افسوس کہ آج نصاب والوں سے ہٹ کر پطرس کا کوئی نام لیوا نہیں ہے۔ یہ اپنے آپ میں ایک طنز ہے۔ مغربی رنگ کی یہ طنز انگریزی کے جانے کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔

کنھیا لال کپور کا مزاج اپنے بیشتر ہم عصر طنز نگاروں کے مقابلے میں کم عقیدت اور تیکھے پن کا حامل ہے "سنگ و خشت" اور "چنگ و رباب" ان کے مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے ہیں۔ یہ مضامین طنزیہ تحریروں سے زیادہ مزاحیہ قصوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا مضمون غالب جدید شعراء کی مجلس میں جدید اردو شعراء کے کھوکھلے پن اور ریاکاری پر ایک شاہکار تحریر کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے اردو پیروڈی کے سرمائے میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ نرم گرم، گستاخیاں، اور نازک خیالیاں ان کی اہم کتابیں ہیں۔ لمبی سیر کرنے میں، لمبی سانس لینے میں، لمبے قد اٹھانے میں کنھیا لال کے پاس طنز و مزاح کے فارمولے تھے۔ حالانکہ وہ انگریزی کے پروفیسر تھے۔ لیکن چٹنی، چورن بیچنا بھی خوب جانتے تھے۔ مجمع بھی لگاتے تھے۔ کالج کے اسٹاف روم میں ہنسنے ہنسانے کی ذمہ داری انھیں کی تھیں۔ مغربی ادب سے خوب واقف تھے لیکن آخری دم تک پنجابی کے پنجابی رہے۔ شاید انھیں کو دیکھ سن کر سعادت حسن منٹو نے لکھا تھا کہ جب کوئی پنجابی اردو بول رہا ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے کنھیا لال کپور اردو کے سب سے بڑے پیروڈی نگار ہیں۔

طنز نگاری کے ضمن میں اکبر الہ آبادی کا ذکر نہ کرنا بے انصافی ہوگی۔ جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہندوستانی معاشرہ کی مغرب زدگی کے خلاف جہاد کیا۔ طنزیہ شاعری میں ان کا مقام یوم میم شمی اور رجاجی ق سے بلند رہے گا۔ لیکن حالی کے مقابلے میں ان کا مرتبہ یقیناً کم ہے۔ جب سیاست پریشان کرتی ہے تو کوئی کوئی اکبر ضرور پیدا ہوتا ہے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں بھی مزاح پیدا کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ اور پھر دائیں ہاتھ وہ کرتا ہے۔ دائیں ہاتھ سے اسی مزاح سے طنز پیدا کرتا ہے۔ اکبر مسلمانوں کا بیربل ہے۔ ایسا استاد جس نے اپنی قوم کو اس کے نقائص سے ہنستے ہنستے ہلکی پھلکی تنقید کر کے آگاہ کیا۔ اکبر دراصل شبلی ور کرتے جنھوں نے سارا [illegible] طنزیہ شاعری سے سیکھا۔

طنز کا وار تلوار کے وار سے شدید ہوتا ہے۔ اس کا کاٹا ہوا پانی نہیں مانگتا، بقول شبلی:

"محمود غزنوی نے دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں مٹادیں، ملک کے ملک غارت کردیئے عالم کو زیروزبر کردیا۔ مگر فردوسی کی زبان سے جو لفظ نکل گئے آج تک قائم ہیں، اور قیامت تک نہیں مٹ سکتے"

طنز نگاری کا کوئی تذکرہ اس وقت تک مکمل نہیں لیا جائے گا جب تک اس میں رشید احمد صدیقی کا تذکرہ نہ ہو۔ ان کی تحریروں میں آج بھی وہی شگفتگی و شوخی محسوس ہوتی ہے۔ رشید صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ گزری ہوئی صحبتوں کا ماتم نہیں کرتے۔ بلکہ شدت جذبات اور فطری قوت اظہار سے ماضی کی محفلوں کو پھر سے آراستہ کرتے ہیں۔ وہ اپنی یادوں کے دریچے سے لطف اندوز ہوتے یا روحانی سکون حاصل کرنے کے لیے نہیں کھولتے۔ بلکہ یہ یادیں ان کے تخیل کی پرواز کے لیے سہارا بن جاتی ہیں۔ جس سے ان کے بیان میں ایک لطیف سوزوگداز پیدا ہوجاتا ہے۔ جسے ہم مزاح نگاری کی معراج کہہ سکتے ہیں۔ رشید صاحب کے انداز مزاح میں ایسی ایک لطیف حزنیہ کیفیت پوشیدہ ہے۔ جس میں خندان نیم شبی کے ساتھ ساتھ آہ سحرگاہی بھی موجود ہے۔ ان کے مضامین اردو ادب میں طنز نگاری کی بہترین نمونوں کے طور پر ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

کرشن چندر نے طنز کو سماجی اور سیاسی تبدیلی کے آنے کے طور پر استعمال کیا۔ ایک گدھے کی سرگزشت طنز نگاری کا بہترین نمونہ ہے اس ناول کا کینوس خاصہ وسیع ہے۔ اور اس میں موجودہ انتظام پر نہایت تیکھے وار کئے ہیں۔ اور ایسے خود ساختہ نام نہاد تہذیبی اداروں، اور جماعتوں کا پردہ فاش کیا ہے۔ جو تہذیب و تمدن کی ترقی میں کوئی کردار ادا نہیں کرتیں۔ اس ناول میں گدھے کو ایک اشارہ SYMBOL کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں گدھے کا کردار حقیقی بن گیا ہے وہ گھاس بھی کھاتا ہے اور گدھی سے عشق بھی کرتا ہے۔

کرشن چندر نے فلمی قاعدہ میں "ب سے بمبئی" عنوان سے لکھا ہے

"پھر ب سے بمبئی جو ہندوستانی فلمی صنعت کا مرکز ہے ب سے بنڈل ہے جو بمبئی کے فلمی عوام کا نعرہ ہے۔ یہ پکچر کیسا؟ بنڈل، یہ ڈائرکٹر کیسا؟ بنڈل! یہ گانا کیسا؟ بنڈل! یہ ایکٹر کیسا؟ بنڈل! الغرض جو پکچر آپ نا پسند فرمائیں، وہ بنڈل بلکہ بوگس ہے۔ بکواس ہے!......"

بنڈل بازی بمبئی کی خاص زبان ہے۔ کرشن چندر نے کچھ دنوں اسکول میں پڑھایا بھی تھا۔ لکھتے ہیں کہ ایک دن میں نے بچوں سے پوچھا:

بمبئی کا جغرافیہ بیان کرو۔ بولے، بمبئی کے مشرق میں چمبور ہے جہاں راجکپور رہتا ہے۔ مغرب میں وجینتی مالا کا مکان ہے، اور جنوب میں

جے شری کا۔ میں نے اسی دن سے اسکول سے استعفیٰ دیدیا اور گھر چلا آیا"

بمبئی جھچوں اور کاروں کا شہر ہے یہاں انسان کا رتبہ کاروں کی تعداد اور جھچوں کی لمبائی سے ناپا جاتا ہے
اردو طنز نگاری اس وقت بڑے نازک دور سے گزر رہی ہے۔ اور ہندوستان میں فکر تونسوی، اور
پاکستان میں مشتاق احمد یوسفی اس کی بجھی ہوئی شمع کو روشن رکھے ہوئے ہیں۔ چھوٹے موٹے طنز نگاروں میں رشید
قریشی (ہم نے بیوی کے ساتھ شاپنگ کی)، سلیمان خطیب (کیوڑے کا بن) اور تخلص بھوپالی (بھوپال پہنچے) کے نام
قابل ذکر ہیں۔ حضرت آوارہ نے بھی اردو طنز نگاری کو اپنی نگارشات کے ذریعہ جلا بخشی ہے۔ جن میں سے بعض
یہ ہیں۔ موتخصیص، چڑیل، اسرار ہندی، بے پرکی، اور آتشیں جزیرہ، لوگس حیدرآبادی، مجتبیٰ حسین، پاگل عادل
آبادی، ماچس لکھنوی، سگار لکھنوی، مزاح نگار تو ہیں لیکن طنز نہیں بن سکتے۔ پاکستان میں کرنل محمد خان نے
طنز نگاری کو ایک نئی جہت دی ہے۔ لیکن پاکستان کے سب سے محترم طنز نگاری کو ایک نئی جہت دی ہے۔ لیکن
پاکستان کے سب سے محترم طنز نگار مشتاق احمد یوسفی ہیں۔ ان کی خاکم بدہن، چراغ تلے طنزیہ تحریروں کے
بہترین مجموعے ہیں۔ کہا جاتا ہے کسی زبان کی خود اعتمادی کا اندازہ اس زبان کے طنزیہ ادب کے معیار سے کیا جا
سکتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے اردو پر نظر ڈالیں تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے حال ہی میں نظر برنی کا طنزیہ کلام
نظر سے گذرا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے، کتاب کا نام ہے "مجھے"۔

عروج احمقاں کو دیکھ کر ہم یہ سمجھتے ہیں !
لیاقت اک حماقت ہے نہ کام آتی ہیں تدبیریں،
اگر کچھ مرتبہ چاہو، چلم بھرنے کا گر سیکھو،
اس فن کی بدولت تو بدل جاتی ہیں تقدیریں

اردو طنز بڑی کڑی منزل سے گزر رہی ہے۔ گہرے سیاسی شعور، اقتصادی احساس، اور
اخلاقی مقصد کے بغیر اس فن کی تخلیق ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغلیہ خاندان کے زوال کے ساتھ ہی اردو میں
طنز نگاری کا آغاز ہوا۔ اور یہ حقیقت اپنے آپ میں خاصا وزن رکھتی ہے۔ کہ جدید ہندوستانی زبانوں میں اردو
ایک ایسی زبان ہے جس میں طنز کی روایت بے حد مضبوط اور گہری ہے۔ رتن ناتھ سرشار سے لے کر فکر تونسوی
تک اس روایت کی توسیع ملتی ہے۔ لیکن موجودہ عہد میں طنز نگار اپنے منصب سے گر گیا ہے۔ اس فن سے زیادہ
اپنے ذاتی مفادات عزیز ہیں۔ اس لئے وہ مصلحت کا شکار ہو گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ طنز نگار اس
مصلحت سے کنارہ کشی اختیار کریں۔ اور خوف و طمع سے گریز کر کے فن کی عظمت کو برقرار رکھنے کی سعی کریں۔ لیکن
ایک نام ایسا ضرور ہے جو موجودہ طنز نگاروں کی فہرست میں فٹ نہیں ہوتا۔ وہ ہے یوسف ناظم، جو طنز کے موجودہ
فیشنوں اور فارمولوں سے بے نیاز ہے۔ یوسف صاحب بمبئی میں رہتے ہیں لیکن ان کا دل حیدرآباد میں ہے۔ نو
کتابیں لکھ چکے ہیں۔ پہلی کتاب کا نام "کیفیت و کم" ہے اور نویں کا "البتہ"۔ بیچ میں "فٹ نوٹ" "دیوار بہ"

زیرِ غور، کاک ٹیل، سائے ہمسائے، نقطہ، ذکرِ خیر ہیں۔

یوسف ناظم خود ساختہ نام ہے۔ اصل نام سید محمد یوسف ہے۔ اور ناظم تخلص، ظاہر ہے کہ پہلے شاعر تھے۔ فکر تونسوی کی طرح۔ اور بعد میں طنز کی لائن میں پڑے۔ اور پھر ایسے پڑے کہ نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں ہنسنے کا رواج ذرا کم ہی ہے یہاں لوگ سنجیدہ ہی نہیں رہتے۔ دن رات منہ پھلائے پھرتے ہیں۔ اس دنیا میں دل کو ٹھیس پہنچانے والے بہت ہیں۔ لیکن ہنسانے والے کم۔

یوسف صاحب، اردو ادب کے محمد تغلق ہیں۔ جو اردو طنز کا دارالخلافہ اورنگ آباد سے حیدرآباد ہوتے ہوئے بمبئی لے آئے ہیں۔

عصرِ حاضر کے طنز نگاری میں فکر تونسوی کا نام سب سے اونچا ہے۔ ان کا طنز دو دھاری تلوار کے مانند ہے۔ حالانکہ ان کی عمر ساٹھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ لیکن وہ ایک روزنامہ اخبار میں باقاعدگی سے ایک کالم لکھتے ہیں۔ نقادوں کی چشم پوشی نے ان میں کسی غصے یا تلخ جذبات کو پیدا نہیں کیا۔ وہ ایک ناقابلِ اصلاح رجائی ہے جو ہر وقت پُر امید رہتا ہے اور اس بات کی امید کرتا ہے کہ اس کے زندگی کے دوران ہی غریبوں کے ساتھ بہتر سلوک کیا جانے لگے۔ مزاج کے اعتبار سے وہ ایک سوشلسٹ ہے۔ اور سماجی و سیاسی بصیرت کے حامل ہیں۔

ان کا اسلوب نثر طبع زاد اور فرحت بخش ہے ان کی انسانی دوستی نے انھیں سیاسی پروپیگنڈہ بازی سے محفوظ رکھا ہے۔ انھوں نے اردو طنز کو پُر جوش اور قابلِ قدر بنا دیا ہے۔ آج کل وہ "ملاپ" روزنامہ میں "پیاز کے چھلکے" کے عنوان سے روزانہ کالم لکھتے ہیں۔ وہ اپنا مواد عام لوگوں اور روزمرہ کے پیش آنے والے معمولی واقعات سے اخذ کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے "شاعر اور سیاست داں" کے مقابلے میں دلال اور طوائف زیادہ ایماندار ہوتے ہیں۔ فکر ایک ایسے سماج کی تشکیل کے خواہاں ہیں جہاں پر طاقت ایماندار لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ اور کمزور طبقے کو تحفظ حاصل ہو۔ وہ اپنے گاؤں کا ذکر کرتے ہیں جہاں زندگی سادہ اور آسان تھی۔ اور جہاں وہ اپنی زندگی کے ابتدائی زمانے میں ایک چرواہے کی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اور اس زمانے میں پہاڑی دنوں میں رجائیت کا راج تھا۔ اور اونٹوں کے قافلے "سسی پنوں" کے واقعات کے گیت گاتے گزرتے تھے اور فکر صاحب کا راجہ راج کرتا جا رہا ہے۔

اپنے طنزیہ مضامین کے ایک مجموعے کے پیش لفظ میں اپنے سوانحی حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"فکر تونسوی مصنف کا فرضی نام ہے اس کا اصل نام بڑا بے ہودہ ہے وہ پہلی جنگِ عظیم کے دوران پیدا ہوا اور تیسری جنگِ عظیم میں مرنے کی امید ہے

بکا یہ طنز و مزاح محاوروں کا سہارا لے کر آگے نہیں بڑھا۔ اور نہیں ہی وہ الفاظ کو طنز پر غالب ہونے دیتا ہے۔ اس کی طنز کا ماخذ سماجی شعور اور اقتصادی بے انصافیاں ہیں مجھے فکر تونسوی کے پیاز کے چھلکے کرافٹ ... [illegible]

میں کوئی گریز نہیں ہوگا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ فکر کی وہ طنز بہ سلت کی وہ ہوا ہے جو پانی میں آگ لگاتی ہے۔ فکر صاحب کہتے ہیں کہ ایکسی ڈینٹ اس واقعہ کا نام ہے جو ہمیشہ اس وقت پیش آتا ہے جب آپ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے ہوتے ہیں۔ ان کی طنز بھی کچھ ایسے ہی قسم کا واقعہ ہے جو پڑھنے والوں کو اس وقت پیش آتا ہے جب وہ پھونک پھونک کر پڑھ رہے ہوں۔ جیسے شراب کا مارا اس شرابی کو کہتے ہیں جو شراب پینے کے دوران بھی شراب پیتا رہا۔ فکر صاحب بھی طنز کے مارے ہوئے ہیں۔ وہ طنز لکھنے کے دوران بھی طنزیہ رہتے ہیں۔ فکر صاحب کی طنز کے خلاف کسی عدالت میں کوئی اپیل نہیں۔ ویسے بھی وہ عدالتی اپیل کو ایسا قانونی طریقہ بتاتے ہیں جس میں ایک عدالت دوسری عدالت کی توہین کر سکے۔

طنز میں توہین نہیں ہوتی، طنز میں تو تو میں میں بھی نہیں ہوتی۔ طنز ایک ایسی تعطب میار ہے جس کی زد میں آنے سے پگڑی والے کی پگڑی اور ٹوپی والے کی ٹوپی گرنے کا ہمیشہ خطرہ رہتا ہے اس کے باوجود طنز پگڑی اچھالنا یا ٹوپی اتارنا نہیں ہے اور نہ ہی یہ ادبی چاند ماری ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق ہجو کا مقصد یہ ہے کہ:

"کسی بے ہنگام یا مضحکہ خیز واقعہ یا حالت پر ہمارے جذبۂ تفریح یا نفرت کو تحریک ہو بشرطیکہ اس ہجو یا طنز میں ظرافت یا خوش طبعی کا عنصر نمایاں ہو اور اسے ادبی حیثیت بھی حاصل ہو اگر ان حیثیتوں کا فقدان ہوا تو پھر گالی گلوچ یا دو ہیائیوں کی طرح منہ چڑھانا ہوگا۔"

طنز کی اس تعریف کے زیر اثر تو شاید ہی اردو کا طنز نگار ثابت اترتا ہو۔ لیکن طنزیہ انداز تو کسی مزاج نگار کا ہے۔ طنز کی ترکیب اور معنی میں پیچیدگی نہیں ہونی چاہئے۔ ہر ایک طنز میں زبان کا اپنا کردار ہونا لازمی ہے۔ انگریزی طنز اور شئے ہے۔ اردو طنز ہے ایک اور چیز، سوئفٹ اور ٹھیکرے کی طنز ایک شئے ہے۔ سودا اور اقبال اور اقبال کی طنز ہے ایک اور چیز، برناڈ شاہ کی طنز اور فکر تونسوی ہے طنزیہ نظریہ کا فرق ہے معاشرتی فرق ہے اور سماجی امتیاز بھی ہے۔

ہر طنز نگار کا خواب ہے کہ وہ کسی دن ایک لغت بنائے، فکر تونسوی کا بھی یہی خواب ہے اس خواب کی تعبیر کے لیے وہ ساری عمر بھٹکتے رہتے ہیں۔ نئے نئے الفاظ بناتے ہیں۔ الفاظ میں نئے معنی نکالتے ہیں۔

"جادوگر" وہ ہے جو مجمع میں تو ایک روپئے کا نوٹ دس روپے کے نوٹ میں بدل دے اور تماشائیوں کو حیران کر دے۔ لیکن تماشے کے بعد زمین پر چادر پھیلا کر کہے "اللہ کے نام پر دس پیسے" فکر صاحب پرانے زمانے کے قائل ہیں۔ کہتے ہیں ہر نیاز مانہ ہے جو پرانے زمانے کے بعد آتا ہے۔ اخلاق وہ ہے جسے آپ ہاتھ پاؤں کا پورا زور لگا کر تیار کرتے ہیں۔ جبکہ آپ کا دماغ کہتا ہوتا ہے کہ بازار میں اس کی قیمت ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔

فکر صاحب نادر موقع کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ حالانکہ نادر موقع ان کے ہاتھ میں بہت کم آئے ہیں۔ مثال کے طور پر گیان پیٹھ والا موقع انہیں ملا۔ ساہتیہ اکیڈمی نے بھی انھیں کوئی چانس نہیں دیا۔ اردو اکیڈمیوں کو فکر صاحب خود چانس نہیں دیتے۔ لغت میں کہتے ہیں کہ نادر موقع وہ موقع ہے جس کے متعلق آپ کبھی سوچتے نہیں۔ لیکن جب وہ آتا ہے تو اسے پہچانتے ہیں۔ کئی دنوں سے میری یہ خواہش ہے کہ میں فکر صاحب کو موقع ملے جا کر ساری بات سمجھاؤں، تاکہ وہ سارا موقع اپنی شش سالہ آنکھوں سے دیکھ لیں، اور پھر کبھی شکایت نہ کریں۔

اور آج بھی اردو طنز کا یہ خادم نہایت طنزیہ انداز سے اپنے پڑھنے والوں سے پوچھ رہا ہے ؎

کس کے گھر جائے گا سیلاب طنز میرے بعد

اچھی اردو طنز ایسے ہے جیسے چمبل کی پہاڑیوں کے دامن میں پانی کا چشمہ۔ کسی زمانے میں یہ چشمہ ہر پیاسے کی پیاس بجھاتا تھا لیکن آج یہ چشمہ خود خشک پڑا ہے۔ کسی دوسرے کی پیاس کیا بجھائے گا اب تو طنز الفاظ کا الٹ پھیر ہو کر رہ گئی ہے۔ اب خواجہ حسن نظامی کی "چٹکیاں" اور "گدگدیاں" بھی نہ رہیں۔ طنز تو درکنار اب تو سستی ظرافت بھی بہت مہنگے داموں میں ملتی ہے۔ بیشک آج کا دور ملا رموزی کے دور سے بہت دور جا چکا ہے۔ پھر بھی بقول رشید احمد صدیقی ہر اچھی ظرافت ایک قسم کی خوشگوار طنز ہوتی ہے۔ اور ہر خوشگوار طنز خود ایک لطیف ظرافت ہے۔

ظرافت، مزاح اور طنز میں کیا فرق ہے۔ فن لطیفہ گوئی کب سے شروع ہوا۔ زوال کے بعد کون ادیب اس فن کو عطا ہوئے ہیں؟ ان تمام سوالات کا جواب خواجہ عبدالغفور نے اپنی کتاب "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ" میں دیا ہے۔ خواجہ عبدالغفور اردو طنز میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ ہر موضوع پر ان کے پاس نیا چٹکلا تیار ہے۔ اس کتاب میں تو انہوں نے طنز و مزاح کو ایک نئے زاویئے سے دیکھا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے بعد خواجہ صاحب ہی طنز و مزاح کے محافظ ٹھہرائے جائیں گے۔

خواجہ صاحب کی اچانک موت نے اردو ادب سے ایک بڑا مزاح نگار چھین لیا ہے۔ خواجہ صاحب کا انتقال ۲۵ اپریل ۱۹۸۲ء کو بمبئی میں ہوا۔ خواجہ صاحب نے اردو طنز و مزاح کی کئی محفلیں روشن کیں۔ کئی شمعیں جلائی، دل و جان سے اردو کی خدمت کی۔

ایک تاریخ طنز اور چند مزاحیہ خاکے
بعد مرنے کے یہ سامان میرے گھر سے نکلا

سہیل انجم

کیفی اعظمی "ایک سچا کمیونسٹ فن کار"

مخدوم محی الدین کی وفات کے بعد بعض غرض مند حلقوں میں یہ بحث چھیڑ دی گئی تھی کہ مخدوم بڑے شاعر تھے یا بڑے کمیونسٹ لیڈر، مگر یہ بحث جلد ہی اپنی موت آپ ہی مر گئی۔ کیوں کہ مخدوم کی شاعری اور سیاست میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ وہ ایک سچے اور بڑے شاعر تھے ـــــ ایک سچا کمیونسٹ فن کار عوام سے ہم آہنگی کو خیر ایماں سمجھتا ہے۔ وہ ان کی رہنمائی کرتا ہے اور ان سے سیکھتا بھی ہے۔ اسی لئے اس کے فن اور عملی سرگرمیوں میں کوئی تضاد نہیں ہوتا۔ عوام سے ہم آہنگی کی یہی تگ و دو ہمیں کیفی اعظمی کی زندگی اور شاعری میں ملتی ہے۔ "قومی جنگ" میں جب کیفی اعظمی کی پہلی نظم شائع ہوئی تو نہ صرف کیفی اعظمی کو اس اخبار کے کرتا دھرتاؤں کی تلاش تھی بلکہ خود قومی جنگ کے ایڈیٹر سجاد ظہیر دبنے بھائی اور اس وقت کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری [illegible] بھی عوام سے ہم آہنگی کے متمنی اس فن کار کی تلاش میں لگ گئے تھے۔ اس دو طرفہ خواہش کے نتیجے میں جب کیفی اعظمی بمبئی لائے گئے تو پھر کمیونسٹ تحریک سے وہ رشتہ قائم ہوا جو آج تک قائم ہے۔ کیفی کی شاعری ایک طرح سے کمیونسٹ تحریک کے اتار چڑھاؤ سے وابستہ ہے اور اسی لئے وہ زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ ہے۔ کیفی نے اگر کمیونسٹ تحریک کے بکھر جانے پر سجدوں کی آوارگی کا ماتم کیا تھا تو [illegible] کے اتحاد کے روشن امکانات پر انھوں نے "لیفٹ یونٹی" کی قصیدہ خوانی بھی کی۔ ـــــ مخدوم ایک عملی کمیونسٹ رہنما اور شاعر کا بہترین امتزاج تھے۔ وہی

> "لہجے کی کھنک، الفاظ کا بانکپن، رعنائی خیال اور وفورِ جذب شوق جسے [illegible] دیکھئے آج کے کیفی ہیں کیفی ہیں جنھیں ہم اور آپ ۲۵ برس سے جانتے ہیں، اپنے شاعرانہ مقام کے اعتبار سے [illegible] جوان اور نوجوان شعرا کی صف سے نکل کر بزرگانِ سخن کے دائرے میں شامل ہو چکے ہیں۔ لیکن [illegible] کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ تری قالب کا جو تصور وابستہ ہے اس کا کوئی شائبہ [illegible] کے کلام میں نہیں تھا۔ صرف اتنا ہے کہ اب اس آرائشِ خم کاکل کا بیان کم ہے اور [illegible] و دار سے رغبت زیادہ۔" (فیض احمد فیض)

[illegible] جاتے ہیں پچھلے سال مغربی بنگال کے چناؤ کی مہم میں کیفی اعظمی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اپنی

جب بنگال سے لوٹ کر آئے تو بہت خوش تھے کہ انھوں نے عوام سے بہت کچھ سیکھا ہے اور بنگال کے ساتھی شاداں تھے

کہ کیفی نے ایک نئی بیداری پیدا کی۔

کرشن چندر نے لکھا تھا: "کیفی عوامی جدوجہد میں انقلابی طاقتوں کی سرگرمیوں میں زندگی کے ہر سفر میں ترقی پسند قوتوں کے ہراول دستے میں رہے ہیں، ہمیشہ تلوار کی دھار پر چلے ہیں۔ یہی لہجہ انھوں نے اپنی شاعری کو بھی دیا ہے۔ کیفی کی شاعری دن کی شاعری ہے، سورج کی شاعری ہے؛ وہ ایک کامیاب اور فتحیاب شاعری ہے؛ اور قدر اوّل کی شاعری ہے۔"

کیفی اعظمی کی یہی کامیاب اور فتح یاب شاعری کا تازہ شاہکار ان کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" (دوسرا اجلاس) ہے۔ مارکسزم، لینن ازم، عصر حاضر کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور فتح مند نظریہ ہے۔ کیفی کی یہ نظم نظریاتی پختگی، اس فتح مند نظریہ کی کامیابی پر راسخ العقیدہ کی مثال ہے۔ نظم کئی پہلوؤں سے اہم ہے۔ اس لئے ہم اس شمارے میں ان کی اس نظم پر دو الگ الگ تبصرے شائع کر رہے ہیں جو اس سچے کمیونسٹ شاعر کی جدوجہد کے بعض الوکھے پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

ابلیس کی مجلس شوریٰ" ۱۹۳۶ء کے بعد ۱۹۸۲ء میں دوسرا اجلاس

عصرِ حاضر کا منظوم مارکسی تجزیہ

مشہور ترقی پسند اور کمیونسٹ شاعر کیفی اعظمی نے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ ـ دوسرا اجلاس" ایک طویل نظم کر ایک تاریخی فریضہ انجام دیا ہے ۔ زیرِ نظر کتاب میں علامہ اقبال کی نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" بھی چھاپی گئی دوسرے حصے میں کیفی کی نظم دوسرا اجلاس بھی شائع کی گئی ہے ۔

ب کے شروع میں ترقی پسند مصنفین کے کاروان
ـ اوّل کے رہنما سردار جعفری نے مقدمہ
کتاب ہندوپاک کے مشہور مارکسسٹ دانشور
کے نام معنون کیا ہے ۔
تو یہ کہ نظم کیفی نے لکھی ہے ۔ پھر سردار کا
سبطِ حسن کے نام معنونیت ۔ ان تینوں ناموں
خود کتاب کے ترقی پسند وقار کی ضمانت دیتا ہے
کے کلام میں ابلیس ایک خاص سماجی مقصد
ہے ۔ "ابلیس کی مجلس شوریٰ" نظم انھوں نے
لکھی اور ان کے مجموعے ارمغان حجاز میں
ـ لیکن اس سے پہلے بھی ان کے مجموعے "بالِ
جبریل و ابلیس" ، "ابلیس کی عرضداشت"
"جبریل و ابلیس" میں جبریل سے ابلیس مخاطب

قصۂ آدم کو رنگین کر گیا کس کا لہو
اور پھر اعتراف کرتا ہے کہ ؎
ہوں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
جب کہ جبریل محض "دما دم" کا وظیفہ پڑھتا ہے ۔ "ابلیس کی عرضداشت" میں اقبال ابلیس سے خدا کے حضور میں عرضی دلواتے ہیں کہ ؎

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

اقبال نے مغرب کی بورژوا جمہوریت دیکھی ہے جو ملوکیت کی علمبردار ہے ۔ قوموں کے استحصال پر اس کی عمارت کھڑی ہے ۔ اقبال ایک متبادل کی تلاش میں ہیں ۔

یہاں ایک بات سمجھنی ہو گی کہ اقبال جہاں مولانا روم سے متاثر ہیں ، قدیم ہندو تعلیمات خاص طور پر گیتا کی تعلیمات کی ان تاویلوں سے اتفاق کرتے ہیں جو تلک نے کی تھی ۔ وہیں وہ مغربی مفکرین میں جرمن فلسفیوں میں نیتشے اور گوئٹے سے متاثر ہیں اور برگساں سے فیضیاب نظر آتے ہیں

ہے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
قائم بہ ہم ' دریا بہ دریا ' جو بہ جو
[illegible]

اپنا رہبر بنا لیا گیا

گوئٹے کی طرح اقبال بھی مغرب کی مادی زندگی سے بیزار ہیں۔ وہ عقل کو کل نہیں سمجھتے "دل" کی برتری کے قائل ہیں ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

وہ عقل کو دل کا تابع رکھنا چاہتے ہیں۔ فکر و عمل کو عشق کے ماتحت رکھنا چاہتے ہیں۔ سائنس کو مذہب کا تابع سمجھتے ہیں۔ عشق تو نارِ نمرود میں کود گیا لیکن عقل محوِ تماشا ہی رہی۔

اسی طرح وہ مغرب کی سرمایہ دارانہ جمہوریت کو انسان دشمن اور قوموں کے استحصال کا ہتھیار قرار دیتے ہیں۔ گرجا سے بہتر ہیں بنکوں کی عمارات۔

ان کے پاس "فرد" کی اہمیت ہے اور وہ ایسے کامل فرد کی تلاش میں ہیں۔ مومن ان کا مثیل ہے۔

"مومن" کے متعلق اقبال کا تصور "ضربِ کلیم" میں ان کی نظم سے ظاہر ہے ؎

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

یا پھر ؎

کہتے ہیں فرشتے کہ دلآویز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

"کافر و مومن" میں کہتے ہیں۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

جمہوریت کے متعلق ضربِ کلیم میں کہتے ہیں ؎

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

یا پھر یہ بھی کہا کہ سو گدھے مل کر ایک دانا نہیں بنا سکتے وغیرہ

"ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں اقبال اسی قسم کی کشمکش میں ہیں۔ ایک طرف سوشلسٹ انقلاب نے نئی انقلوں سے روشناس کروایا ہے اور اقبال اسے تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ اس سامراجی پروپیگنڈے سے بھی متاثر ہیں کہ روس میں مذہب ختم کر دیا گیا ہے۔ اس لئے سوشلزم سے کچھ کھنچے کھنچے سے بھی ہیں۔

ابلیس تو دنیا میں بھیجا ہی اسی لئے گیا ہے کہ وہ انسان کو گمراہ رکھے۔ چنانچہ ابلیس کے مشیروں کی زبان سے اقبال نے جو کچھ کہلوایا ہے وہ اسی کشمکش کا غماز ہے۔

جمہوریت کی وجہ سے کہیں ابلیس کے نظام کو خطرہ تو نہیں۔ ؏ خیر ہے سلطانیِ جمہور کا غوغا کہ شر

دوسرا مشیر جواب دیتا ہے:

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس

اور ———

مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

تیسرا مشیر پوچھتا ہے "روحِ سلطانی" باقی ہے تو اضطراب کی گنجائش نہیں۔ لیکن اس "یہودی" کارل مارکس کی "شرارت" کا کیا جواب ہے؟

وہ کلیمِ بے تجلی، وہ مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

چونکہ مشیر کو یہ معلوم ہے کہ رُوسی الکبری کے ایوان "سے
مسولینی کا یہ فاشزم ابھر رہا ہے وہ "اشتراکیت" کا "توڑ" ہے
یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ پہلے اٹلی میں اور پھر ۱۹۳۳ء
میں جرمنی میں فاشزم ابھرا اور سوشلزم کو ختم کرنا
اس کے لئے رکنِ ایمان تھا۔ ابلیس کو فاشزم پر بھروسہ"
ہے' کہ وہ اس یہودی کارل مارکس" کے جگائے ہوئے فتنے"
کو ختم کر سکتا ہے۔

اور ابلیس کہتا ہے نہ جمہوریت سے خطرہ ہے نہ اشتراکیت
سے' اصل خطرہ (اور یہ اقبال کا ضمیر بول رہا ہے) سچے
مسلمان سے ہے' مرد مومن سے ہے۔ اس لئے ابلیسی نظام
کو باقی رکھنے کے لئے مسلمان کو مسلمان نہیں بننے دینا
ہے۔ اسے ترک دنیا کی تعلیم میں مست اور خانقاہوں میں
محبوس رکھنا ہے۔ اس پر جہاد کی مخالفت کر دینی ہے۔ اسے
غلامی کا عادی بنا دینا ہے۔ وہ رسوم و قیود کا پابند رہے
اور اجتہاد سے دور رہے۔

یہ اقبال ۱۹۳۶ء میں کہتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ
انہوں نے اشتراکیت اور انقلاب روس کا استقبال
بھی کیا ہے۔ اور کہا ہے ؎

گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا

اور ؎

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اقبال یہ بشارت دیتے ہیں کہ مشرق و مغرب میں
مزدور کے دور کا آغاز ہے۔ اور پھر خدا سے فرشتوں کو
یہ حکم دلواتے ہیں ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غریبوں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اقبال کی شاعرانہ روح نے اشتراکیت کے قد کو
محسوس تو کر لیا تھا لیکن روئے زمین پر انسانی سماج کو اس
نے جو بلند مقام عطا کیا ہے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں
تھا اور اسلامی تعلیمات اور اشتراکی اصولوں کی مطابقت
کو انہوں نے عمل میں کارگر نہیں دیکھا تھا۔

انقلاب روس سے بہت پہلے ایک مسلم اخبار "وقت"
نے اپنی پہلی جون ۱۹۰۶ء کی اشاعت میں "اسلام اور سوشلزم"
کے عنوان سے لکھا تھا۔

ہم مسلمان جو اپنے دین کے وفادار ہیں' اچھی
طرح جانتے ہیں کہ مساوات بھائی چارہ'
ایمانداری اور رحم' جو اسلام کے بنیادی
اصول ہیں' سوشلزم کا بھی حصہ ہیں'

اس لئے اسلام کی بنیادیں سوشلزم کی بنیادوں
سے مطابقت رکھتی ہیں۔"

"سوویتوں کی دھرتی میں اسلام
اور مسلمان" مصنفہ ضیاء الدین

(خانِ دین ایشان بابا خان۔ صفحہ ۶۔۶۹)

تفقاز کے ممتاز عالمِ دین میر ممتاز آغا نے ایک کانفرنس میں کہا:

حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے
اسلام کے آدرشوں کی عملی آوری کی راہ
دکھائی مگر ان کی تکمیل دوسرے آدرشوں
کی مدد سے کی گئی۔ آج ہمارے ملک میں عوام
آزادی، سکھ چین سے خوش حال زندگی
گذار رہے ہیں۔ آج خوش حال زندگی کا
وہ خواب ہمارے ملک میں حقیقت بن چکا
ہے جو ہمارے پیارے نبیؐ نے دیکھا تھا۔"

اقبالؒ کے پاس جہاں اسلام پر ایمان مستحکم تھا، وہیں سوشلزم کے تعلق سے ان کا ہمدردانہ رویہ بھی تھا۔

اور ۴۰ سال بعد کیفی اعظمی نے سوچا کہ اگر اقبالؒ ہوتے اور ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کا دوسرا اجلاس منعقد ہوتا .. تو ابلیس اور اس کے مشیروں کے درمیان کیا بات ہوتی؟ ابلیسی نظام کے برقرار رکھنے کے لئے ابلیس کے پاس اب کیا نئے ہتھیار ہوتے؟ سوشلزم پر اب کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اب وہ ایک تابدار حقیقت ہے۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت اپنی زوال کی منزلوں میں ہے۔ متبادل سوشلسٹ جمہوریت ہی ہے جو پروان چڑھ رہی ہے۔

کیفی کی نظم اگر ایک طرف اقبال کی نظم کا تسلسل ہے تو دوسری طرف ارتقا بھی ہے۔ کیفی نے اقبال کے بعد سے آج تک اشتراکیت کے ارتقا کی منزلوں کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ ابلیس اب ۱۹۸۳ء میں کہتا ہے:

ہو گیا کس طرح انساں ہم سے اتنا منحرف
اسکے کانوں میں نہ جانے کس نے پھونکا یہ فسوں

ابلیس کی بے بسی قابلِ ملاحظہ ہے۔ انسان نے ابلیسی نظام پر اپنی برتری ثبت کردی ہے۔ پہلا مشیر، ابلیس پر بڑی ہمت سے وار کرتا ہے ؎

تیری نخوت جس کو خاطر میں کبھی لائی نہیں
نا سمجھ یہ سب اسی مردِ یہودی کا ہے کام

فاشزم کو شکست فاش ہوئی اور اسی پہ اقبال کے ابلیس نے تکیہ کیا تھا۔ تیسرا مشیر دوسرے اجلاس میں کہتا ہے ؎ روس ایک کوہِ حقیقت ہے بساطِ ارض پر
ریزہ ریزہ ہو گیا ٹکرا کے جس سے تیرا خواب

ابلیس کو اب بھی "آزادی چین" اور امریکہ کے اٹمی ہتھیاروں پر بھروسہ ہے کہ وہ اشتراکیت پر بھرپور وار کرکے اسے تباہ کرسکتے ہیں۔

روس سے دست و گریباں ہاں آزادی چین ہے
دل لگا ہے بدگماں پولینڈ کی ہے آب جو
ہو رہا ہے آئے دن تازہ تضادوں کا ظہور
ہے زوال آمادہ لینن کا جہانِ آرزو

لیکن پانچواں مشیر منہ توڑ جواب دیتا ہے:

یہ تضادوں کا تصادم ہے ترقی کی دلیل
اپنی نافہمی سے سمجھا ہے جسے بحران تو
پہلے تنہا روس تھا اب اس کے ساتھی ہیں کئی
اور ہر ساتھی کو اپنی راہ کی ہے جستجو
کیوں فروغِ اشتراکیت سے تو ہے دردمند
اب ہی مسلم بھی اسی پرچم کے نیچے سربلند

اور ———

معرکو کیا دیکھتا ہے دیکھ سوئے تاشقند

اب ابلیس امریکہ کے ایٹمی گولوں کے ڈھیر کا حوالہ دیتا ہے اور پانچواں مشیر بول اٹھتا ہے :

ویتنامی جنگلوں میں جسکے ناخن رہ گئے
کیسے سمجھے جارہا ہے اب بھی تو اسکو دلیر
کاخِ واشنگٹن سے ٹکرانے لگا سیلابِ امن
اس سے زندہ پار اترسکتا نہیں کاغذ کا شیر

اور آخر میں غیب سے آواز آتی ہے :

مجلس آرائی کی فرصت بھی نہیں تجھکو اجازت بھی نہیں

اور پانچواں مشیر اعلان کرتا ہے :

وقت کا اعلان سن کر اس طرح تو منھ نہ پھیر
مجلسِ شوریٰ کو کر برخاست اس میں کر نہ دیر

کیفی نے یہ نظم لکھ کر ایک معنی میں اقبال نے جو بات شروع کی تھی اسے سماج عالم کے ارتقا کے پسِ منظر میں مکمل کیا ہے۔ اور یہ بڑا ادبی اور سماجی کارنامہ ہے۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر اقبال آج زندہ ہوتے اور اس دنیا کو اپنی نظروں سے دیکھتے تو کیا وہ بھی یہی بات نہ کہتے ؟

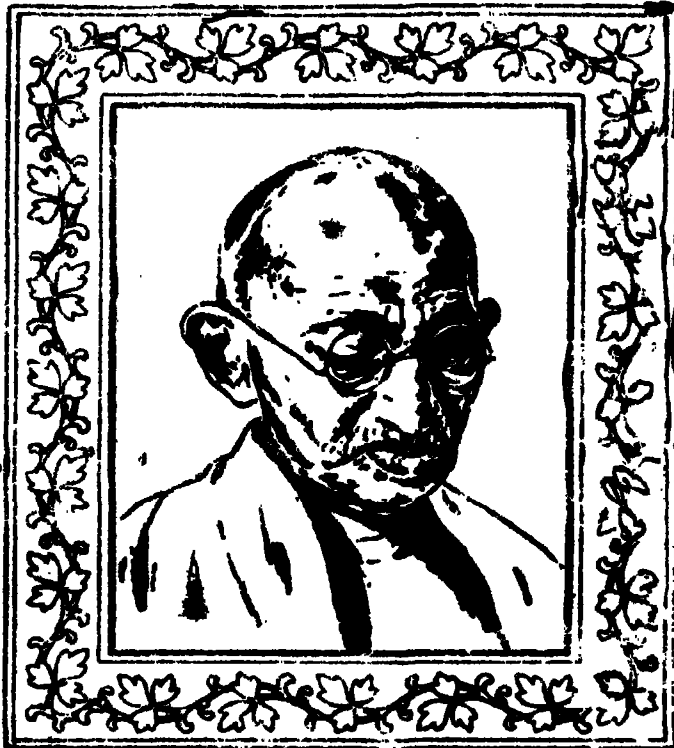
بقیہ :۔ **نظریاتی پختگی اور فنی مہارت کی مظہر**

واشنگٹن سے ٹکرانے لگا سیلابِ امن " لیکن ابلیس کو بھی یہ تسلی ہے کہ ایٹمی گولوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے جس پر واشنگٹن کا شیر بیٹھا دھاڑ رہا ہے۔ کیفی اعظمی نے لفظ " دھکارتا " استعمال کیا ہے جو غیر مانوس سا لگتا ہے۔

" ابلیس کی مجلسِ شوریٰ " دوسرا اجلاس " میں ڈاکٹر محمد اقبال کی " ابلیس کی مجلسِ شوریٰ " بھی چھاپی گئی ہے اور دوسرے اجلاس کا یہی تقاضہ بھی تھا۔ علی سردار جعفری کے پیش لفظ میں کیفی اعظمی کی نظم کا صحیح پسِ منظر دے دیا گیا ہے۔ جس نے پڑھنے والوں کی نگاہ کو وسعت عطا کردی ہے۔ لیکن علی سردار جعفری نے کیفی اعظمی کی نظم سے زیادہ ڈاکٹر اقبال پر لکھا ہے۔

نظم کی کتابت و طباعت خوبصورت ہے۔ جلد دیدہ زیب ہے۔ جلد پر کیفی اعظمی کا اسکیچ فن کاری کا خوبصورت نمونہ ہے۔ لیکن پہچاننے میں دقت بھی ہوتی ہے۔

اس نظم کو ہر صاحبِ نظر کے اتفاق و اختلاف کی گنجائش کے ساتھ ساتھ مقبولیت عام حاصل ہوگی۔ اردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے۔ اور یہ نظم پڑھنے والوں کے ذہنوں پر بہت واضح اور بہتر نقش ثبت کرے گی۔ خواہ وہ شاعر کے نظریے سے متفق ہوں یا اس سے اختلاف رکھتے ہوں۔ ▲▲



ہمارا خراجِ عقیدت — اتحاد

"ہم سب ایک ہی خدا کے بندے ہیں، جس کی بندگی ہم مختلف ناموں سے کیا کرتے ہیں۔ اس لئے، یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر اتحاد کو محسوس کریں اور انسانوں کے درمیان چھوت چھات اور برتری اور کمتری کے احساس کو ترک کر دیں۔"

ایسا کہا تھا مہاتما گاندھی نے جنہوں نے اپنی ہستی کمزوروں کے لئے مکمل طور پر وقف کر دی تھی۔ باپو "پورے سماج کی فلاح" کے علم بردار تھے۔ سماجی انصاف ہمارا قومی نصب العین ہے، جس کے حصول کے لئے ہم کئی ترقیاتی پروگراموں پر عمل کر رہے ہیں، خاص طور سے 20 نکاتی پروگرام پر۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے لفظوں میں، "ملک کی ترقی کے تمام منصوبوں کا مقصد، اقتصادی بنیاد کو مستحکم بنانا ہے، تاکہ ہم لوگ بتدریج، اور اگر ممکن ہو تو بتعجیل، اپنے ملک سے غربت کا خاتمہ کر دیں، اور اپنے سماج سے اقتصادی پسماندگی کو اکھاڑ پھینکیں۔"

ہمارا عزم — پسماندگی کا خاتمہ

نظریاتی پختگی اور فنی مہارت کی مظہر

انیس جلالی

بیروت (لبنان) میں فلسطین مجاہدوں کا ابلیسی طاقت اسرائیل کے ہاتھوں قتل عام "ابلیس کی مجلس شوریٰ" (دوسرا اجلاس) کا محرک بن گیا۔ کیفی اعظمی کے شعور کو فلسطینی مجاہدوں کی جانبازی و سرفروشی اور اسرائیلی ابلیسی قوتوں کی درندگی اور خون خواری نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اور انھوں نے یہ نظم لکھ دی۔ علی سردار جعفری نے اپنے "پیش لفظ" میں یہ کہہ کر کہ ان کی یہ نظم اقبال کی نظم کا جواب نہیں ہے بلکہ یہ نظم تو ان امکانات کا اظہار ہے جو اس تاریخی دور کے بطن میں پوشیدہ ہیں۔" کیفی کے ضمیر کی تڑپ کا سبب اور نظم کے محرک کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے اور اس تاریخی دور کی فیصلہ کن انقلابی قوت اور اس کے معجزات کی عمل پذیری کو بھی نشان زد کر دیا ہے جو ہمارے کرۂ ارض اور نوعِ انسانی کو یکسر تبدیل کئے دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اقبال نے اس دور کی انقلاب انگیز کیفیت اور اس کے سبب تاریخِ انسانیت کے اس بے نظیر نتیجے کے بارے میں کہا تھا:

دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا
قریب آ گئی شاید جہانِ پیر کی موت

ڈاکٹر محمد اقبال کی معدد بینی اور ژرف نگاہی نے جہانِ پیر کی موت قریب آنے کی پیش گوئی کر دی تھی لیکن لفظ "شاید" نے تذبذب کا اظہار بھی کیا تھا۔ کیوں کہ اس دور میں فاشی اور سامراجی قوتوں کا دُنیا کے دو تہائی سے زیادہ حصہ پر غلبہ تھا۔ لیکن روسی انقلاب کی کامیابی نے بھی پوری دُنیا میں ولولۂ انقلاب کو نمودار کر دیا ہے۔ جس نے ڈاکٹر محمد اقبال کو یہ محسوس کرایا تھا کہ کہیں یہ ولولۂ انقلاب جہان پیر کی موت کا سبب تو نہیں ہوگا۔ اور اب ہماری نگاہیں اس حقیقت کا نظارہ کر رہی ہیں کہ موجودہ تاریخی دور "جہان پیر" کو بتدریج موت کے منھ میں پہونچا رہا ہے اور ابلیس کی سب سے چہیتی اور خونخوار تخلیق درندہ صفت فاشی قوت مرتے مرتے بھی فلسطینی مجاہدوں، ویتنامی جیالوں اور دوسری انقلابی قوتوں کے قتل عام جیسے بھیانک اور انسانی ضمیر کو جھنجھوڑ دینے والے واقعات رونما کر رہی ہے۔ یہ فاشی قوتیں پے در پے شکستیں کھا کر خونخوار و ظالم اور انسان دشمن ہوتی جاتی ہیں اور اب تو وہ انسان اور انسانی تہذیب و تمدن کو ہی سرے سے مٹا دینے کے درپے ہو گئی ہیں۔ شکست کھا کر ان پر اور زیادہ جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ کیفی نے جس کی حقیقت پسندانہ اور کیسی خوبصورت تصویر کشی کی ہے ؎

اپنے پر چنتا ہے اپنے خونچکاں منقار میں
تملا کر روس پر جھپٹا تھا جو فاشی عقاب

اور دیکھئے ابلیس پیچ و تاب کھا کر کیسے دھمکاتا ہے اور یہ بات بھی کہہ رہا ہے:

جس بلندی پر ہے ناداں اشتراکیت تری
اس سے کچھ ہی پست ہوگا ایٹمی گودوں کا ڈھیر
بیٹھ کر ڈہکارتا ہے جس پہ واشنگٹن کا شیر
میری چٹکی میں ہے اس کی دم دبا دوں گا کبھی
کچھ نہیں کچھ بھی نہیں دنیا کی بربادی میں دیر

"میری چٹکی میں ہے اس کی دم" پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ نیوکلیائی میزائلوں کے جدید کمپیوٹر نظام پر ابلیس کی انگلی رکھی ہوئی ہے۔ اور جب کبھی وہ انگلی دبا دے گا تو دنیا کی بربادی میں دیر کچھ بھی نہیں رہے گی۔

"دنیا کی بربادی" کے بھیانک اور ہولناک تصور سے بھی آپ کانپ کانپ جائیں گے، آپکے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ لیکن اس بھیانک تصور سے ہی ابلیس لذت محسوس کر رہا ہے۔ اور اس لذت کے احساس کی آنکھوں میں دمک، آخری مصرع "کچھ نہیں کچھ بھی نہیں دنیا کی بربادی میں دیر"۔ تصور میں ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

"ابلیس کی مجلس شوریٰ" کے ۱۹۳۶ء کے اجلاس کے ۴۶ برس گزرنے کے بعد اس کا دوسرا اجلاس ۱۹۸۲ء میں منعقد ہوا۔ ان ۴۶ برسوں کی تاریخ ابلیسی طاقتوں کی شکست کی تاریخ ہے اور اس تاریخ نے ایسی زبردست کروٹ لی ہیں اور ہماری زمین پر ایسی بنیادی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں کہ مجلس شوریٰ کے دوسرے اجلاس کا افتتاح کرتے وقت ابلیس کی حیرت و استعجاب، کس مپرسی، بے چارگی اور لاعلمی کی حالت کی تصویر صاف ابھر آتی ہے ؎

الاماں والحذر گیتی کا یہ رقصِ جنوں
ڈھل چلا ہے ایک سانچے میں جہانِ کاف و نون
مشرق و مغرب میں پہلی سی نہیں بیگانگی
سرحدوں نے مل لیا رخسار پہ سمتوں کا خون
مٹ چلے تیزی سے رنگ و نسل کے سب تفرقے
جن کے ہاتھوں آج تک انساں رہا خوار و زبوں
مسجد و دیر و کلیسا آج اک مرکز پہ ہیں
گھومتی ہے آج ایک محور پہ دنیائے دوں
پرچمِ توحیدِ انساں تا ثریا ہے بلند
جس کو جھک کر چومتا ہے آسمانِ نیلگوں
ہوگیا کس طرح انساں ہم سے اتنا مخزوں
اسکے کانوں میں نہ جانے کس نے پھونکا یہ فسوں

جب کہ ۱۹۳۶ء کے اجلاس میں اس نے اپنے افتتاحیہ کے آخر میں دبدبہ و شانِ استغنا اور نخوت و کامرانی! میں محسوس ہوتا ہے کہ دنیا پہ ایک فاتحانہ نظر ڈالتے ہوئے" کہتا ہے ؎

کون کر سکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں
جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کر سکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں؟

یہ وہی ابلیس ہے جس کے بارے میں سردار جعفری نے لکھا ہے کہ:
کہ...... اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم والا نہیں وہ ابلیس ہے...... کہ آدم کو تخلیق خدا نے کیا لیکن وہ ابلیس کی گود میں پلا ہے اور اسی طرح ابلیس جنت...... کا رہنما ہے۔" اسی ابلیس نے ۱۹۳۶ء میں کس شان اور

خلیفۃ اللہ سے پوری کائنات کے بارے میں دعویٰ کیا تھا:

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بو
کیا زمیں کیا مہر و مہ، کیا آسمانِ تو بہ تو

اور حقارت آمیز اعلان کیا تھا:

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو

۱۹۸۳ء میں بھی اس کے وہی سب مشیر اکٹھے ہیں جو ۱۹۳۶ء کی مجلسِ شوریٰ میں شریک تھے۔ ۱۹۳۶ء والے ابلیس نے جب حقارت سے کہا تھا "یہ عناصر کا پرانا کھیل، یہ دُنیائے دوں"۔ اور پھر عناصر کے پُرانے کھیل اس دنیائے دوں کو ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خون بتایا تھا، لیکن ۸۳ء کا کایا پلٹ دیکھ کر حیرت زدہ ہے اور مایوسی کے عالم میں کہتا ہے:

کعبہ و کلیسا آج ایک مرکز پہ جمع
گھومتا ہے آج اک محور پہ یہ دُنیائے دوں

اور انسان کے اس بنیادی انحراف پر بے بسی محسوس کرتے ہوئے ابلیس بڑبڑاتا ہے اور کس مپرسی کے عالم میں پوچھتا ہے:

جانے کس طرح انساں ہم سے اتنا منحرف
دیکھ کانوں میں نہ جانے کس نے پھونکا یہ فسوں

آج انسان ان تمام لعنتوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے اور ان سے انحراف کرنے پر تلا ہوا ہے جو ابلیسی نظریہ و تعلیم کی پیداکردہ ہیں اور ان کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہا ہے۔ آج ہمارا گیتی رشعیرِ جنوں کی ایسی کیفیت میں مبتلا ہے کہ ہر ملک اور سمتوں کا خون ہو رہا ہے، رنگ و نسل کے تفرقے مٹتے جا رہے ہیں۔ "سب انسان ایک ہیں" کا نعرہ بلند کرنے والوں کا پرچم

انتہائی بلندیاں سر کرتا چلا جا رہا ہے۔ ۴۷ برسوں کے مختصر سے عرصہ میں یہ کیسے ہو گیا؟ ایسا جادو پھونکنے والا آخر کون ہے؟ ابلیس کی حیرانی، پریشانی اور تلملاہٹ بےسبب نہیں ہے لیکن شکست تسلیم کر لینا اس کی خو میں اور نہ اس کے ضمیر میں شامل ہے۔ وہ ہر شئے کو تباہ و برباد اور غارت کر دیگا اور یہی روح اس کی اپنی جبلی تخلیق فاشی قوت میں کارفرما ہے۔ وہ پوچھتا ہے ایسا فسوں کس نے پھونکا کہ انسان کی یہ مجال کہ وہ انحراف کرنے لگے، لیکن آج ابلیس بے چارگی محسوس کرتا ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال کی پیش گوئی قریب آ گئی شاید "جہانِ پیر کی موت" اب صاف نظر آنے لگی ہے۔

ابلیس کا پہلا مشیر جو خود کو ابلیس کی "صدائے بازگشت" بتایا تھا اب دوسرے اجلاس میں "حرفِ حق" کہنے پر آمادہ ہو چکا ہے جس کو ۱۹۳۶ء میں "ابلیسی نظام" کے محکم ہونے پر کوئی شک نہیں تھا۔ اب وہی انحراف کا فسوں پھونکنے والے کی طرف تیکھے اور باغیانہ انداز میں اشارہ کرتا ہے:

تیری قوت جس کو خاطر میں کبھی لائی نہیں
ناسمجھ یہ سب وہی مردِ مجاہد کا ہے کام

کیونکہ وہ ابلیسی نظام کے کھوکھلے پن اور اس کی بےثباتی کو پہچان چکا ہے۔

تیرے کہنے سے جسے محکم سمجھ بیٹھا تھا میں
نکلا تارِ عنکبوت آخر وہ ابلیسی نظام

دوسرا مشیر اس دوسرے اجلاس میں پہلے مشیر کی جگہ لیتا ہے اور نظام "تارِ عنکبوت" کی اس بنیاد کو آشکار کرتا ہے جو نوعِ انسانی کو ایک ہونے کی سمت گامزن بتاتا ہے۔ باوجود تقسیم کئے ہوئے تھے اور جس بنا پر [illegible] اور [illegible] کو

کو لوٹ رہے ہیں اور آجر و مزدور کا تضاد برقرار ہے اور یہی وہ تضاد ہے جو وحدتِ انسانی کو جھٹلاتا بھی ہے۔ اس طرح دوسرا ابلیسی ابلیسی نظام کے زندہ ہونے کا ٹھوس ثبوت فراہم کرتے ہوئے کہتا ہے:

آجر و مزدور کا جب تک رہے گا یہ تضاد
دعوئ وحدت ترا نا قابلِ تفہیم ہے

کیفی اعظمی کی اس نظم کا یہ سب سے زوردار حصہ ہے۔ یہاں وہ نوعِ انسانی کے اس آخری مرحلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ابلیسی نظام کی بنیادوں کے ان جمے ہوئے پتھروں کو جب تک اکھاڑ پھینکا نہیں جائے گا دعوئ وحدت یقیناً نا قابلِ تفہیم رہے گا۔ اور یہ کام پورا ہونے تک نوعِ انسانی کو ان گنت دوزخوں سے گذرنا پڑ سکتا ہے۔ ابلیس وہ دھمکی بھی عملی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ کچھ نہیں کچھ بھی نہیں دُنیا کی بربادی میں دیر۔ یعنی خود نوعِ انسانی ہی پوری دُنیا کی بقا کا سب سے بڑا اور بنیادی سوال بھی اس مرحلے کے پیدا ہونے کے دوران طے کر دیتا ہے اور ابلیسی قوتوں کی آخری شکست کا سامان مہیا کر دیتا ہے۔ نظم کا یہ ٹکڑا انجو دانیشہ ور د ورا زمیں بھی پڑھنے والوں کو مبتلا کر دے گا۔ بہتر ہے کہ ان چاروں اشعار کو نقل کر دیا جائے ؎

ہو رہی ہے نوعِ انساں ایک پرتسلیم ہے
یہ بھی دیکھو آدمی طبقات میں تقسیم ہے
لٹنے والے ہیں ہزاروں لوٹنے والے ہیں چند
زندگی کی کل جو کچھ اب تک رہی تنظیم ہے
یہ غبار وحدتِ انساں جو لے آیا ہے تو
اس میں جتنا پیچ کر دہ بھی لائق ترمیم ہے

آجر و مزدور کا جب تک رہے گا یہ تضاد
دعوئ وحدت ترا نا قابلِ تفہیم ہے

کیفی کمیٹڈ (COMMITTED) شاعر ہیں۔ اور آج دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اسکے محرکات اور اسباب کے سمجھنے میں ان کے ذہن میں کسی قسم کی دھندلاہٹ نہیں ہے۔ ان کی نظر یا تی جراحی جسم کو صحت مند بنانے کے لئے بد گوشت کو کاٹ کر پھینک دیتی ہے اور بیماری کو نشان زد کرتی ہے۔ "فلسطینی جگر داروں کا قتل" پر وہ اسی طرح کی جراحی کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں ؎

کیمپ ڈیوڈ سے زلیخا لوٹی یہ کہتی ہوئی
ماہ کنعاں کا نہیں سادات کا نیلام ہے

اور اپنوں کا یہ حال تھا کہ ؎

اپنے عالیشان حجروں سے نکل سکتے نہیں
جو سراپا انتظارِ صورِ اسرافیل ہیں
دیکھنے والوں فلسطینی جگر داروں کا قتل
اپنی اپنی خلوتوں میں محوِ قیل و قال ہیں
کر رہے ہیں تسبیح کے دانوں پہ جو ڈالر شمار
پیٹ ہیں کشکول ان کے داڑھیاں زنبیل ہیں

یہ اتنا ضرور محسوس ہوا کہ جو فلسطینیوں کے ساتھ تھے وہ بھی اسی زمرے میں آگئے ہیں کہ ان کا ذکر نہ آسکا۔ شام، جنوبی یمن، الجزائر وغیرہ کم از کم "خلوتوں میں محوِ قیل و قال" نہیں رہے۔

"ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔ دوسرا اجلاس" نظم کا ابلیس ایک شکستیں کھایا ہوا، پریشان حال، بے حس، بے اماں، الگ سا نظر آتا ہے، لیکن زندہ ہے اور پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ ابھی آجر و مزدور کا تضاد برقرار ہے اور دُنیا کے بڑے حصے میں ابلیس کی تخلیق اپنے مخصوص مفاد کرو رہا ہے اور آگے بھی کر سکتی ہے جو کا با

رونق شہری

خاموش ساعت کی ایک نظم

نیخ دہشت خوف، پہرا کرفیو
بڑھ رہا ہے لمحہ لمحہ کرفیو
شک کا خنجر ڈوبتے سورج تلک
صبح نے کھویا بھروسہ کرفیو
مرگئی پہچان کی خوشبو یہاں
اجنبی سارا علاقہ کرفیو
بھیڑ پانی کی طرح بہتی تھیں
رینگتا ہے صرف تنہا کرفیو
پر کٹے پنچھی کی ہے مانند شہر
ہانپتا سا زرد کٹتا کرفیو
وسعتِ دل میں سمٹتے حوصلے
اور کنوئیں کی طرح گہرا کرفیو
ڈھیل دیتے ہی منظم ہوگیا
رگوں سے اب کے زیادہ کرفیو
میری آنکھوں میں بلیک آوٹ ہے اب
نام پچھلی نسل کا سخت کرفیو
زینۂ اول ہمارے عزم کا
آخری اُن کا سہارا کرفیو
ذہن میں بیچینیاں دُبکی ہوئی
ہونٹ پر چسپاں ہے مردہ کرفیو

ایک بات

[illegible]

کبھی آئینہ اٹھ آئے تو اپنے آپ کو دیکھو
خراشیں چہرے پر اُبھریں تو چہرہ خود کو کھوتا ہے
تمہارے گیسو و لب اپنی رونق کھوتے جاتے ہیں
یہ محفل بجھتی جاتی ہے
یہ ڈھلتی دھوپ تو سورج کے ڈھلنے کی علامت ہے
حسن کا راز چاہت، اڑتی خوشبو، دھول اور سایہ
کوئی سایہ کہاں تک ساتھ چلتا ہے
تمہارا سایہ گہری تہ کے نیچے چھپتا جاتا ہے
تمہارے جسم کے شیشے پہ موٹی دھول کی تہ جمتی جاتی ہے
سلگتی آگ خواہش کے کھنڈر میں رقص کرتی ہے
کبھی تم خود کو پہچانو
تمہاری ذات بے پایاں سمندر میں بہی جائے
زمیں پر بانجھ موسم زردیوں کی قبر پر روتے
سرکتے لمحوں کی ساری عمارت گرنے والی ہے
تمہارے خال و خد پر زور تنہائی کا موسم ہے
بکھرتے لمحوں کے طوفان میں گم ہوگیا سب کچھ
مقدس یادیں کوہ عافیت میں سر چھپاتی ہیں
لہو کے ساحلوں پر سرد موسم کا جنازہ ہے
دلوں میں جنگ جاری ہے
تمہاری حسرتوں اور آرزوؤں نے کفن اوڑھا
تم اپنے ہاتھوں سے نازک بدن کو دفن کر جاؤ
زمیں ہے پاؤں کے نیچے
تمہارے "تم" کو یہ ایشیا بنانے لگی
ضرورت تیرے پرپیٹ کر تمہیں خود میں چھپا لے گی
مگر تم بھی اسے روشن کرو اپنے تقدس کو
محبت کے لیئے محبوب ہوتا تھا ضروری ہے

ELEXENDER PUSHKIN
محمد سلیم انصاری (ترجمہ)

قیدی

میں ایک قیدی ہوں
اور تاریک زنداں میں قیام کرتا ہوں
قبر جیسی اندھیری کوٹھری میں
باہر صحن میں ۔
چمن میں
محبت رقص کرتی ہے
میرا دوست ۔ ایک گدھ
اپنے شکار پر جھپٹتا ہے
خون کے قطرے چھوڑ کر
اپنی آنکھیں ۔ مجھ پر گاڑ دیتا ہے
ایک غصیلی چیخ کے ساتھ
چیخ جو مدتوں پہچانے جیسی ہے
اس وقت ۔ وہ کہہ رہا ہے
اس وقت ہم بھاگ چلیں
جہاں ہم دونوں آزاد رہ سکیں ۔
چلو ہم چلیں
جہاں طوفانی بادل
اکیلے حوصلہ مندی کے ساتھ بھٹکتے ہیں
جہاں لہریں مارتے سمندر
آسمان سے ملنے کے لئے لوٹتے ہیں
جہاں صرف آندھیاں ہی

حادثوں کا حوصلہ رکھتی ہیں
اور میں .....

وقت

اے وقت
میرے دوست ' اے وقت
دل سکون کا متلاشی ہے
ہر دن ۔
گذرے ہوئے دن کا تعاقب کرتا
وقت کی لڑھکتی ہوئی لہریں
وجود کے ساحلوں کو توڑتی ہیں
اور تم ۔
۔ اور میں
زندہ رہنے کی سوچتے تھے
پھر بھی دیکھو
ہم مر گئے
اور جب ۔
ہم ارمان سے پیار کرتے تھے
سکون کافی دیر کے لئے ٹھہرتا تھا
اب ۔
ایک تسلی ہو گیا ہے
ایک مظلوم غلام کی طرح
جو باغی ارمان کا منصوبہ بنانے کے لئے
نیک عمل اور حقیقی خوشی سے دور سب

ظہیر غازی پوری

رباعیات

(۱)

آنکھوں میں بھی اک سیل رواں ہوتا ہے
احساس بھی خوں نابہ فشاں ہوتا ہے
بے ساختہ جب لگتا ہے پتھر تو یہ دل
ٹوٹے ہوئے شیشے کی زباں ہوتا ہے

(۲)

اپنے ہی میں روپوش میں ہو جاتا ہوں
دانستہ سزا کوش میں ہو جاتا ہوں
حق بات پہ جب میری زباں کٹتی ہے
کچھ سوچ کے خاموش میں ہو جاتا ہوں

(۳)

دل داری و الطاف و عطا بھول گئے
عکاسیٔ تصویر وفا بھول گئے
احساس کے سینے میں لگا کر نشتر
کہتے ہیں وہ ہنسنے کی ادا بھول گئے

(۴)

ہم لفظ کو شاداب بنا دیتے ہیں
افکار کو زرتاب بنا دیتے ہیں
اک فن پہ مگر آپ کو بھی قدرت ہے
تریاق کو زہراب بنا دیتے ہیں

(۵)

شورش کو دلآویز بیاں کیسے کہوں
کانٹوں کو بہاروں کی زباں کیسے کہوں
شوکیس میں تم لاکھ سجا کر رکھو
پتھر کو میں ہیرے کی دکاں کیسے کہوں

(۶)

دعویٰ ہے کہ اندازِ انا تولتے ہیں
اخلاصِ فراواں کی ادا تولتے ہیں
ہیرے کی ترازو ہے انھیں ہاتھوں میں
جو ذائقۂ خونِ وفا تولتے ہیں

(۷)

دوگام بھی ہمراہ نہیں چل سکتے
ہر شکل و شباہت میں نہیں ڈھل سکتے
وہ سرد ہواؤں سے پگھل جاتے ہیں
ہم آگ بھی پی لیں تو نہیں گل سکتے

(۸)

افکار میں الفاظ میں تابندہ ہوں
احساس مشیت کی طرح زندہ ہوں
کیا چادرِ ظلمات چھپائے گی مجھے
میں خود ہی اجالوں کا نمائندہ ہوں

(۹)

لمحات جدھر مڑتے ہیں، مڑ جاتا ہوں
اقدارِ خوش آئند سے جڑ جاتا ہوں
چھا جاتا ہے افکار پہ جب گرد جمود
[illegible]

احسن رضوی دانا پوری (مرحوم)

غزل

جدھر سے وادیٔ حیرت میں ہم گذرتے ہیں — اُدھر تو اہلِ تمنّا بھی کم گذرتے ہیں
ترے حضور جو انفاسِ غم گذرتے ہیں — عجب حیات کے عالم سے ہم گذرتے ہیں
رواں ہے برق کا شعلہ سحابِ رحمت میں — نقاب ڈال کے اہلِ ستم گذرتے ہیں
حیات روک رہی ہے کوئی قدم نہ بڑھائے — کہ آج منزلِ ہستی سے ہم گذرتے ہیں
فلک بڑھا گئے فقط چند بوند برسا کے — رواں دواں سے سحابِ کرم گذرتے ہیں
تعجب ہے اُن کے لئے مرگِ ناگہانی کا — جو زندگی کے مراحل سے کم گذرتے ہیں
اِک اِک نگاہ میں قاتل نگاہوں کی سوگند — ہزار جلوۂ باغِ ارم گذرتے ہیں
گذرگہِ غم و آلام بن گیا ہے دل — جو حادثے ہیں یہیں دمبدم گذرتے ہیں

مخالفت ہے کھلی اب نہ دوستی احسن
گھٹی گھٹی سی فضاؤں سے ہم گذرتے ہیں

خالد رحیم

ساتھ اپنے لے چلے جو غم کا لشکر کون ہے
زندگی کے شہر میں ایسا دلاور کون ہے

ت کے اوراق پر بکھرا ہوا ہے کس کا فن
چاند کو جس نے تراشا تھا وہ آذر کون ہے

ں تو اپنے جسم کے باہر کھڑا ہوں دیر سے
سوچتا رہتا ہوں اکثر میرے اندر کون ہے

سے مت پوچھو مری آنکھوں میں کتنے خواب ہیں
جس سے ہے آباد میرے دل کا مندر کون ہے

بچا لے جان و دل سیلابِ غم سے اے رحیم
وقت کے دریا میں اب ایسا شناور کون ہے

شہپر رسول

کون ان کے بیاں سے چھوٹ گیا
جانے قصہ کہاں سے چھوٹ گیا

بچ کے جانے کا اب سوال کہاں
تیر اس کی زباں سے چھوٹ گیا

وہ ہے پتھریلے راستے کا نشاں
ساتھ سب کا وہاں سے چھوٹ گیا

گل ہوا جب سے آرزو کا دیا
میں لہو کے زیاں سے چھوٹ گیا

جنگلوں نے کیا ہے کیا جادو
شہر لالہ رخاں سے چھوٹ گیا

خالی آنے سے آخری لمحے کے
میں بھی شہپر گماں سے چھوٹ گیا

سعید روشن

اتار کر کسی کاغذ پہ سب گھٹن رکھ جا!!
جہاں کے سامنے اپنا عروجِ فن رکھ جا

ہر اک زوال کا منظر عزیز ہے مجھ کو
خزاں کے واسطے حاضر ہے یہ چمن رکھ جا

اندھیری رات بہر طور کاٹ ہی لوں گا
تو اپنی یاد کی دل میں کوئی کرن رکھ جا

نہیں ہے اس کے سوا کوئی صورتِ تسکین
کسی درخت کے سائے میں سب تھکن رکھ جا

بدیع الزّماں خاور

آگ ہی کاش لگ گئی ہوتی
دو گھڑی کو تو روشنی ہوتی
دن کے صحرا میں دھوپ لہراتی
شب کے جنگل میں چاندنی ہوتی
لوگ ملتے نہ جو نقابوں میں
کوئی صورت نہ اجنبی ہوتی
کون سے شغل کے لیے کافی
چار دن کی یہ زندگی ہوتی
کیا ہے جو گفتگو زمانے سے
تجھ سے ہوتی تو شاعری ہوتی
لکھ بھی دیتا تو داستاں میری
کب کسی شخص نے پڑھی ہوتی
ہجر کی رت کے بعد قسمت میں
وصل کی بھی کوئی گھڑی ہوتی
پوچھتے جس سے اپنا نام ایسی
شہر میں ایک تو گلی ہوتی
دشمنی سب سے ساتھ اگر کرتے
شہر میں کس سے دوستی ہوتی
بات کوئی کہاں خوشی کی تھی
دل کو کس بات کی خوشی ہوتی
کچھ تو آنکھوں کا نور بڑھ جاتا
کچھ تو منظر میں دلکشی ہوتی
موت جب تیرے اختیار میں ہے
میرے قابو میں زندگی ہوتی
ہمک اٹھتا نگر نگر خاور
دل کی خوشبو اگر اڑی ہوتی

شاهد میر

وہ اک چپ چاپ سا پیکر بولتا ہے — مرے شعروں میں ڈھل کر بولتا ہے
ہر اک قطرے کے اندر بولتا ہے — خلاؤں میں سمندر بولتا ہے
عجب فن کار صورت ہے وہ چہرہ — کئی خانوں میں بٹ کر بولتا ہے
تمہارا قرب پا کر دل جو دھڑکا — یقیں آیا کہ پتھر بولتا ہے
ملن کی ساعتیں نزدیک آئیں — منڈیروں پر کبوتر بولتا ہے
مسلسل گنگناتی ہیں فضائیں — وہ اپنے منہ سے پل بھر بولتا ہے
بلندی سر جھکا دیتی ہے آخر — پرندے کا جو شہپر بولتا ہے
گھرے بادل تو ان آنکھوں میں اکثر — کوئی پیاسا سمندر بولتا ہے
ستم پیشہ ہواؤں کی کہانی — مرا پامال چھپر بولتا ہے
مکیں اوڑھے ہیں چادر خامشی کی — مگر جلتا ہوا گھر بولتا ہے

جہاں حکم زباں بندی ہے ناقد
وہیں شاہد مکرر بولتا ہے

کامران نجمی

تلخیاں بھی نبات میں نہ ملا — زہر آبِ حیات میں نہ ملا
سیکھ آدابِ گفتگو بھی کچھ — بات اوروں کی بات میں نہ ملا
سب اسیرِ غمِ جہاں نکلے — کوئی بندہ نجات میں نہ ملا
خود نمائی کے ہو گئے قیدی — لطفِ عرفانِ ذات میں نہ ملا
اے خدا اتنی مہربانی کر! — صبحِ روشن کو رات میں نہ ملا
ہر جگہ نفرتوں کی دلداری — پیار مصر و ہرات میں نہ ملا
جان و دل بھی اسیر تھے دل کے — فرق دونوں کی ذات میں نہ ملا
سب کو جلدی تھی کامرانی کی — کوئی صبر و ثبات میں نہ ملا
ہم نے ہر ہر طرح سے جی دیکھا — لطف کوئی حیات میں نہ ملا
بجھ نہ پائے گی تشنگی نجمی — زہر نیل و فرات میں نہ ملا

[illegible] معتمد دکنو

بھٹک بھٹک گئے رستے جدھر [illegible] ہیں
یہ کیسے لوگ ہماری نظر سے گذرے ہیں

ترے خیال، تری دھن، تری تلاش میں ہم
تری گلی سے بہت بے خبر سے گذرے ہیں

اب ان کی راہ میں بیٹھے پڑے ہیں ارض و سما
جو لوگ عشق کی شام و سحر سے گذرے ہیں

متاعِ دل بھی لٹا اور جسم و جاں سے گئے
دورِ شوق میں ہم کس نگر سے گذرے ہیں

ہوئی ہے کیسی یہ صورت شکستگی کے طفیل
کہ اہلِ دل غمِ عرضِ ہنر سے گذرے ہیں

خلوص و مہر و وفا کا نہ درد ذکر کرو
گئے دنوں کے حسیں قصے نظر سے گذرے ہیں

ستارہ پروین

ہر دوا بے اثر ہو گئی
زندگی مختصر ہو گئی

کیا تصادم نگاہوں کا تھا
زیست زیر و زبر ہو گئی

کوئی بے موت مارا گیا
آپ کی ایک نظر ہو گئی

آپ کا دور بھی خوب ہے
ہر خطا میرے سر ہو گئی

داستاں تو مرے غم کی تھی
ان کی کیا آنکھ تر ہو گئی

ان کو پروین آنا نہ تھا
ایک دعا بکار گر ہو گئی

نکہت سروجی

کیا پوچھتے ہو درد کے ماروں کی زندگی
ہے [illegible] فلک کے ڈوبتے تاروں کی زندگی

پھیلائیں ہاتھ جاکے بھلا کس کے سامنے
ہم کو نہیں گوارا سہاروں کی زندگی

[illegible] کے موجِ تلاطم سے بارہا
برباد ہو گئی ہے ہزاروں کی زندگی

آئی ہے یاد کیوں مجھے [illegible] کے آج بھی
گلشن کے دل فریب نظاروں کی زندگی

ہے آندھیوں کا خوف نہ ہے ڈوبنے کا ڈر
مجھ کو نہیں پسند کناروں کی زندگی

کس درجہ خوش گوار ہے تنہائیوں میں آج
سیمیں چمکتے چاند ستاروں کی زندگی

یاس قریشی

طلسمِ دشت

عصر کی بھی اذانیں جب گھوڑوں پر سوار ہو کر فرار ہو
نے لگیں تو میں نے جیب کی طنابیں کاٹ کر کہا۔ وہ واقعہ بھی
عجیب تھا جب میں وہاں سے گزرا۔
اس نے چونک کر پوچھا۔ کب
میں نے فصیل جسم کے اندر جھانک کر خود سے پوچھا۔
ب ؟
جواب ملا' اپنے جن سے پوچھو۔
میں خود سے بولا۔ میں تو دمنا جوگی ہے اور پھر باہر
کر اس سے بولا پتہ نہیں کہ سارے جواب جن کے پاس ہیں
ین ہم سے جدا ہو گیا ہے۔
اس نے اداس ہو کر پوچھا ہم کب تک جدائی کی آگ
جلتے رہیں گے؟
پتہ نہیں اور پھر گویا ہوا جب میں وہاں سے گزرا تھا
شخص کھنڈر کی ٹوٹی دیوار پہ کھڑا کہہ رہا تھا۔ تو کہاں
ن کی آواز سنکر میں بے ساختہ بول پڑا میں یہاں ہوں۔
اس نے قہر آلود نگاہوں سے مجھے دیکھا اور کڑکتے
رخ جھلستی آواز میں بولا میں یہاں کہاں ہے۔
میں اسکی آواز کی ضرب سے تھرا کر بولا کیوں؟
وہ شخص روتی آواز میں بولا۔ وہ ہم سے بچھڑ گیا
سے جہاں ستارے ٹوٹتے رہتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ
مجھے اندھیرے کی گپھا میں غائب ہو گیا تو سوال
لے کھنڈر کی طرف لپکا۔
خاموش ہوتے ہی اس نے میری پلیٹ میں
سوال سرکا دیئے ہمارا اور زمانے کا آپس میں
کیا تعلق ہے؟

ہم اور زمانہ
نیلے مخملی تھان میں
لپٹے حالات میں
جو جدا ہونے کی چاہ میں
خواہش کی ڈالیوں سے
بالوں میں چھپے
زہریلے سانپوں کے سائے میں
ایک دوسرے کے ساتھ
جیسی کھیل رہے ہیں

کر جب میں کھنڈر کے اندر پہنچا۔ داستان
کے ایک سرے کو دوسرے سرے سے جوڑتے ہوئے بولا۔ تو وہ
کھلے آسمان سے لٹکے جھولے پر جھولا جھول رہا تھا۔ مجھے دیکھتے
ہی بولا۔ دیواروں پر ٹکی چھت سے زیادہ محفوظ کھلا آسمان
ہے جو دیواروں پر ٹکے بغیر چھت کا کام انجام دیتا ہے۔
میں نے سوال کا ایک دانہ اس کی طرف پھینکا تو
وہ بولا۔ دیواروں پر ٹکی چھتوں پر آدم خور دیو رہتے ہیں جو
کی کوکھ میں پلے بستی کے بچے گراتے ہیں اور بدلے میں فکر کے
بچوں کو کھا جاتے ہیں۔
زندگی کیا ہے؟ داستان کے درمیان میری
سماعت کی زنجیروں میں مرچ کی قلم لگاتے ہوئے اس نے
پوچھا:
میں اپنا سر سوچ کی کھڑکی کے باہر نکال کر منظر کو
آنکھوں میں بھر کر بولا زندگی پتھریلی زمین پر گڑے خیمے کی وہ

طلب ہے جسے ہوا تیز رفتاری سے کاٹتی رہتی ہے یا ——
یہ دھند اور ہوا کے درمیان کھیلے جانے والے میچ کی گیند ہے
جس کی پیشانی ٹھوکروں سے لہولہان ہے۔ جملوں کے درمیان
وہ چھلانگ لگاتے ہوئے بولا۔

میں بولا — ہو سکتا ہے کہ ہمارے یقین کا سورج
نہیں ہے جس کی آگ میں سوچ کو پگھلا کر دیکھ سکیں۔
وہ دکھ کے آنے میں جھکتے ہوئے بولا۔ تو اس کا سبب
یہ ہوا کہ ہم اب تک صرف قیاس آرائی ہی کرتے رہے ہیں اور
پھر رک کر کچھ دیر بعد بولا کیا وہ شخص بھی ہماری طرح زمانے
کے ہونٹوں سے نکلا بے معنی گیت ہے کیا وہ بھی ڈھلان
کے آخری سرے پر ہے۔

چہرے جب ہنڈولوں سے نکل کر
گیان کے ہنڈولوں پر دراز ہوتے ہیں۔
تو شتے
مسکراتے ہوئے سامنے آتے ہیں۔
اور پہچان کا کوڑا برساتے ہیں
تو چہرے اپنے اندر
اذیت کے کیڑوں سے بے چین ہو کر
بھاگنے کی سعی کرتے ہیں۔
تو آوارہ سورج
انہیں اپنی آگ میں بھون کر
پتھریلی وادی میں پھینک دیتا ہے۔
اچھا تو وہ بھی ہماری ہی طرح ہے وہ افسوس سے
ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔
میں نے کہا۔ شاید۔
اس نے پوچھا۔ کیوں کیا وہ وقت کی آنکھ سے
گرا آنسو نہیں ہے تو پھر وہ کیا ہے۔
میں نے فکر سے شانے اچکائے اور سوچ کی
کھڑکی پر آنکھیں ٹکا کر بولا۔
شاید وہ ہماری آنکھ کا گرا ہوا قطرہ ہے۔
ہم مان کے مرثیے کرتے ہیں۔

جذب ہو گیا ہے۔
اور آوازوں کے پنڈار کے سہارے
آزادی کے دیوتا کو تلاش کرتا پھر رہا ہے۔
جسے گھوڑوں نے اندھا کر کے
ہمارے حوالے کیا تھا
مگر اب وہ ہمارے درمیان کہاں ہے
اور ہم
پھسلتی ڈھلوان پر
سفلی صورت
کھوجتے پھر رہے ہیں
کہ شاید وہ بھی ہماری طرح
کہیں آس پاس پھسل رہا ہو
کہ اب تو سب کے پیروں میں
پھسلن چھپی ہے
پھر وہ چبوترے سے اتر کر سیڑھیاں طے کرتا ہوا نیچے
چلا گیا۔

پھر۔ اس نے پوچھا۔
پھر میں اندھیرے کی چادر چاک کرتا ہوا اس کے
پیچھے لپکا اور سیڑھیاں طے کر کے نیچے پہونچا۔ اندر خاموشی
کی چڑیلیں ناچ رہی تھیں چھن چھنا تھی۔
میں نے نگاہوں کے کبوتر اڑائے وہ ایک طاق
میں معصوم صورت آلتی پالتی مارے بیٹھا ٹک ٹک کر رو رہا(؟)
اس کی یہ حالت دیکھ کر میں جھٹک جھٹک کر رو پڑا۔ کچھ دیر
کے بعد وہ طاق سے نکلا اور مجھ سے بولا۔ آؤ میرے ساتھ
میں اس کے ہمراہ چل پڑا۔ ایک جگہ رک کر وہ بولا
وہ دیکھو اور میں نے دیکھا کہ ایک تابوت رکھا تھا اس نے
بتایا کہ یہ زمانے کے مہرے کے لئے ہے کہ جب اس کے پاس سانس
کے نام پر تھوڑی سی تھیلی بچے گی تو وہ یہاں آئے گا اور وقت
کے مرگھٹ پر اس سے سانس کی تھیلی چھین لیں گے اور پھر وہ
ختم ہو جائے گا۔ یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔
پھر اس نے تجسس سے پوچھا [illegible] باقی صفحہ [illegible]

خواجہ عبدالرزاق

دکھ سکھ

ریاض احمد نہایت خوش اخلاق اور دیانتدار آدمی تھے۔ اور اپنے اصول کے بڑے پابند تھے۔ قدرت کی عجیب مصلحت تھی کہ بیچارے بہت کم عرصہ میں سات بچوں کے باپ بن گئے۔ چار لڑکے اور تین لڑکیاں۔ سب سے بڑا جبار تھا۔ جب جبار کی عمر بارہ سال کی تھی تو اس کی امی جان کا ایک حادثہ میں انتقال ہو گیا۔ اس حادثہ کے بعد ریاض احمد ایک دم باؤلے سے ہو گئے۔ بچوں کی پریشانیوں سے گھبرا کر انھوں نے سب بچوں کو ان کی بڑی اماں کے گھر پہنچا دیا اور خود بھی وہیں رہنے لگے۔ چھ مہینے کا طویل عرصہ گذرنے کے بعد بھی ان کی ذہنی کشمکش اور الجھنوں میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ مصیبتوں کا ایک ریلا گھر میں چلا آیا۔ اور گھر کی حالت ناقابل برداشت ہو گئی۔

گھر کی چند جہاں دیدہ خواتین کی طرف سے اب ان پر دوسری شادی کرنے کا آہستہ آہستہ دباؤ پڑنے لگا لیکن وہ انکار کرتے رہے کیونکہ وہ خود اپنی زندگی میں سوتیلی ماں کا مزہ چکھ چکے تھے۔ علاوہ بریں ان کے دل میں کوئی تمنا، کوئی احساس باقی نہ تھا۔ انہیں اپنی آسائش سے زیادہ ان ساتوں معصوم بچوں کا مستقبل سنوارنے کی فکر لاحق تھی۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لئے انھوں نے وطن سے اپنی بیوہ چچازاد بہن کو بلا لیا۔ پھوپھی کو پا کر پریشان حال بچوں کے مرجھائے ہوئے چہروں پر مسرت و انبساط کی [illegible] عود کر آئی۔ اور [illegible] آہستہ آہستہ [illegible] فرحت بخش جھونکے چلنے لگے۔ بچوں کو جو پیار پھوپھی نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی بلکہ انہیں جتنا بھی پیار [illegible] کی امکانی کوشش کرتیں۔ بچے بھی انہیں اپنی ماں کی مانند عزت و احترام کرتے تھے۔

اس طرح دن رنگا رنگ گذرتے رہے۔ اب نہایت ہوشیار اور محنتی بیس برس کا ہو گیا تھا وہ ایک انجینئرنگ کمپنی میں کام بھی کرنے لگا تھا۔ عزیز و اقارب نے ریاض احمد کو رائے دی کہ کم از کم جبار کی شادی کر دیجئے گھر کی الجھنیں دور ہو جائیں گی۔ یہ سن کر وہ ایک عجیب الجھن میں پڑ گئے۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد انھوں نے جبار کی شادی کا فیصلہ کیا اور بہت جلد ایک شریف اور پڑھی لکھی [illegible] تھی۔ چند ہی روز میں نئی دلہن افسری نے گھر کی پریشانیوں کو بھانپ لیا اور گھر گرہستی کے کاموں میں پھوپھی کا ہاتھ بٹانے لگی۔ پھوپھی افسری کے کاموں سے کافی مطمئن تھیں۔ تھوڑے ہی دنوں بعد انھوں نے افسری کو گھر کی ساری ذمہ داریاں سونپ دیں۔ کیونکہ انہیں یہاں آئے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا اب وہ وطن جانا چاہتی تھیں۔ ریاض احمد نے بھی مصلحتاً کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وطن جانے سے کچھ دن پیشتر پھوپھی نے سب بچوں کو بڑے پیار سے اپنے پاس بلایا۔ سب بچے انہیں گھیر کر بیٹھ گئے۔ وہ سب کو سینے سے لگا کر بچیوں کی طرح بے ضبط ہو کر رونے لگیں۔ کچھ دیر بعد جب آنسوؤں کا طوفان تھما تو انھوں نے بچوں کو شفقت و محبت سے سمجھاتے ہوئے کہا "میرے بچو [illegible] اور جتنا پیار [illegible]

تو اب تمہاری بھابی ویسی ہی تمہاری دیکھ بھال کریں گی۔ تم بھی ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آؤ اور شکوے گلے نہ کرو۔"

پھر بڑے اعتماد سے وہ افسری سے مخاطب ہوکر بولیں۔ "بیٹا! میں تمہیں پہلے ہی ساری باتیں سمجھا چکی ہوں۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا وہی عورت اپنی زندگی میں کامیاب ہوتی ہے جو میکے کی بات سسرال میں اور سسرال کی بات میکے میں کبھی نہ کہے۔" پھر یک بیک ان کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے اور افسری بھی بے ضبط ہوکر ماں کی گود میں سر ڈال کر سسکیاں بھرنے لگی۔

جبار کا گھر بسانے کے باوجود ریاض احمد کو سکون و راحت میسر نہیں ہوئی ان کے پھوٹے نصیب کو سکون کہاں ملتا۔ اب بڑی لڑکی پروین کے رشتے بھی آنے لگے تھے لیکن انہیں کوئی بھی رشتہ پسند نہیں آتا۔ ایک دن ان کے پڑوس کی بڑی بی جو پروین کو بہت چاہتی تھیں اپنے بھتیجے احمدی کا پیغام لے کر آئیں۔ بڑی بی کی ساری باتیں ریاض احمد نے سنیں پھر کچھ سوچ کر بولے "خیر مجھے آپ کی باتوں پر بھروسہ ہے لیکن مجھے دو ماہ کا وقت دیا جائے۔"

بڑی بی بہت امیدیں لے کر خوشی خوشی چلی گئیں۔

دوسرے دن ریاض احمد نے بچوں کی بڑی اماں اور خالہ جان کو بلا کر بڑی بی کا پیغام سنایا۔ پھر چند دنوں کی تحقیقات کے بعد رشتہ منظور کر لیا گیا۔ شادی کا دن بھی آگیا۔ پروین دلہن بن کر منڈپ میں سسک سسک کر رو رہی تھی۔ سرخ زرتار گھونگھٹ کے اندر پلکیں لرز رہی تھیں۔ گلابی رخساروں پر آنسو چمک رہے تھے۔ اتنے میں خالہ جان اچانک گھر کے اندر آگئیں۔ اسے زار زار روتا دیکھ کر ان کے آنسو بھی چھلک پڑے۔ وہ پروین کو گلے سے لگا کر گلوگیر آواز میں کہنے لگیں: "بیٹا مت رو، ہر لڑکی جوان ہو کر پرائی ہو جاتی ہے اور پھر شادی کے بعد اپنے شوہر کی ہو جاتی ہے۔ اچھی اور نیک لڑکیاں وہی ہیں جو سسرال میں جا کر میکے کا نام روشن کرتی ہیں۔"

بیٹیاں تو اپنی سسرال چلی گئیں۔ ریاض احمد کو بڑے بیٹے جبار نے کافی تنگ کیا۔ وہ صدمے کی تاب نہ لا کر بستر پر گر گئے اور ایسے بیمار پڑے کہ چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا۔ آخر مجبور ہو کر انہوں نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ اور اپنے منجھلے لڑکے نجمی کو اپنی سروس میں بھرتی کروا دیا۔

نوکری چھوڑنے کے بعد وہ بجھے بجھے سے رہنے لگے، تھکے ہوئے مسافر کی طرح۔ شاید فکرات اور پریشانیوں کا دباؤ ان کے بڑھاپے پر اثر انداز ہونے لگا تھا۔ دن بدن ان کی صحت بھی گرتی جا رہی تھی۔ وہ چاہتے تھے اپنی زندگی میں جلد سے جلد اپنے تمام فرائض سے سبکدوش ہو جائیں۔ لاشعوری طور پر ان کے سطح دماغ پر مختلف خیالات ابھرنے لگے۔ نجمی برسر روزگار ہو چکا ہے اور بیٹی منی بھی جوانی کی دہلیز پار کر چکی ہے۔ کیوں نہ دونوں کی شادیاں یکے بعد دیگرے کر دی جائیں۔ لہذا اب رشتوں کی تلاش شروع ہو گئی۔ چند دن کے اندر اچھی طرح چھان پھٹک کر مناسب رشتے چن لئے اور نہایت سادگی اور خاموشی کے ساتھ دونوں کی شادیاں کر دیں۔ گھر میں دوسری بہو آتے ہی چند دن کے اندر طرح طرح کے شکوے اور شکایتیں شروع ہو گئیں۔ ریاض احمد مگر سنجیدہ اور دور اندیش آدمی تھے مسئلہ کو زیادہ طول ہونے نہیں دیا اور اپنے چھوٹے بیٹے کے سکون کو بگڑنے سے بچا لیا مگر بدنصیب نافرمان نجمی بیوی کے اکسانے پر اپنا سارا سامان لیکر کرایے کے مکان میں چلا گیا۔

اس واقعہ کے کچھ دن بعد ان کا تیسرا لڑکا نسیم عرب جانے کے چکر میں بمبئی گیا تو پھر واپس نہیں آیا۔ وہ بہت ذہین اور اچھا ریفریجریٹر میکانک تھا اس لئے بمبئی میں اسے ایک امریکن فیکٹری میں ملازمت مل گئی۔ کوئی چھ مہینہ بعد اس نے دس ہزار روپے کسی ایجنٹ کو دینے کے لئے منگائے۔ ریاض احمد بغیر تحقیق کے روپیہ بھیجنا نہیں چاہتے تھے لیکن جبار کی سفارش پر انہوں نے روپے بھیج دیئے۔ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ کچھ دن بعد ایجنٹ روپے لیکر بھاگ گیا۔ یہ منحوس خبر پاتے ہی ان کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا اور

آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔
کے بعد وہ بستر پر ایسا گرے کہ گھر سے گور میں جانے تک اٹھ نہیں پائے۔

ریاض احمد گئے تو جبار کے نحیف کندھوں پر ذمہ داریوں کا پہاڑ رکھ گئے۔ ابھی اسے فکرِ معیشت کا تجربہ ہی کیا تھا لیکن اللہ نے بڑا حوصلہ دیا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی مختار بی۔اے کر کے گھر میں بیکار بیٹھا تھا۔ اس کی ملازمت کے لئے وہ جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔ کل ہی شام کو بھرتی آفس کے بڑے بابو کے گھر جا کر اس سے بڑی منت سماجت کی اور اپنے گھر کی ساری پریشانیاں کھلی کتاب کی طرح اس کے سامنے رکھ دیں لیکن بڑا بابو پتھر کا دیوتا تھا۔ ایمان فروش غریب کی فریاد کا اس کے پتھر کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ساری رام کہانی سننے کے بعد بھی اس نے کھرا جواب دے دیا، بولا۔ "[illegible] ہزار روپے خرچ ہوں گے۔ اگر تم ہزار روپے دے سکتے ہو تو تمہارے بھائی کے کام کا کوئی بندوبست ہو سکتا ہے۔" یہ سن کر جبار یکدم سناٹے میں آ گیا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر پھر اپنی مجبوریاں دہرائیں۔ بڑا بابو خاموش سنتا رہا پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔

"ہم کیا کریں بھیا! بڑے صاحب کو خوش کرنا پڑتا ہے۔ بڑا صاحب نہیں مانتا۔ خیر تمہارے ساتھ اتنی مجبوریاں ہیں تو کم از کم پانچ سو روپے دے دو۔ بڑے صاحب کو ہم کسی طرح سمجھا لیں گے۔ اچھا جاؤ، اگلے منگل کو آ جاؤ۔ بھگوان نے چاہا تو تمہارا کام ہو جائے گا۔"

آخرکار جبار مایوس ہو کر چلا آیا۔ برآمدے میں سائیکل رکھ کر آرام کرسی پر بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ افسری بچوں کو سلام کر برآمدے میں آئی تو دیکھا وہ کسی گہری سوچ میں خاموش بیٹھا ہے۔ اس نے قریب آ کر ایک عجیب دلگداز مسکراہٹ سے کہا "کھانا کھا لیجئے ——— کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

ایک سرد آہ بھر کر اس نے بھیگی آواز میں کہا۔

"مختار کی نوکری کے لئے بڑے بابو کے پاس گیا تھا۔ حرام خور پانچ سو روپے رشوت مانگ رہا ہے۔ بتاؤ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی۔ کون قرض دے گا۔ سود پر بھی اگر ملا تو پانچ سو کے ہزار ادا کرنے پڑیں گے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں ———!"

"پانچ سو روپے مانگتا ہے؟" افسری ہکا بکا سی ہو گئی۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کا دل ٹوٹ کر حلق میں آ کر پھنس گیا ہو۔ اس کی حیرت زدہ نظریں جبار کے افسردہ چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ اور تمام ماحول پر عجیب پژمردگی چھا گئی۔ معاً وہ اس کشمکش سے چونک اٹھی اور سنجیدہ لہجہ میں بولی۔

"اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہیں، میری شادی کی دو انگوٹھیاں ہیں۔ انہیں بندھک رکھ دیجئے۔ مختار کا کام ہو جانے کے بعد چھڑا لی جائیں گی۔"

افسری کے حوصلہ افزا الفاظ سن کر جبار کا شکست خوردہ دل یکبارگی اچھل پڑا اور شدتِ جذبات سے بےضبط ہو کر وہ گویا چیخ اٹھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو افسری، کیا سچ کہہ رہی ہو؟"

"جی ہاں ——!" افسری کی وفا شعار نگاہیں جھک گئیں۔

"واقعی تم انسان نہیں فرشتہ ہو افسری" اس کے چہرے پر یکلخت بے پناہ مسرتوں کی شفق پھوٹ پڑی اور شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے افسری کے خوبصورت پیکر کو اپنی جذباتی بانہوں میں بھر لیا۔

ڈیوٹی سے آنے کے بعد جبار برآمدے میں اپنی سائیکل صاف کر رہا تھا۔ یک بیک اس کا خیال اپنے بچوں کی طرف دوڑ گیا۔ اس کے دونوں بچے شبانہ اور قیصر انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتے تھے۔ آج ان کے اسکول میں رزلٹ آؤٹ ہونے والا تھا۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ رکشا گیٹ پر پہونچا۔ رکشے سے اتر کر دونوں بچے فرطِ خوشی سے اچھلتے کودتے دوڑ کر باپ سے لپٹ گئے اور ایک [illegible]

لے :" ہم پاس ہوگئے ڈیڈی! ابا، ہم پاس ہوگئے" جبار نے بچوں کو فرطِ محبت سے اپنی باہوں میں لپیٹ کر شمار لیے۔ پھر دونوں پھلا نگتے ہوئے گھر کے اندر ماں کے پاس چلے گئے۔ جبار پھر سائیکل صاف کرنے میں مصروف ہو گیا لیکن اس کے دماغ میں مختلف خیالات مچلنے لگے۔ "بچے پاس ہو گئے ان کے لیے اب نئی کتابیں اور کاپیاں خریدنی ہونگی۔ نئے سال کے پہلے مہینے میں اسکول کی فیس بھی دگنی ادا کرنی پڑے گی...... وہ اسی ادھیڑبن میں کھویا ہوا تھا کہ کمرے کے اندر سے افسری نے آواز دی۔

"آپ بڑے بابو کے یہاں کب جاؤ گے؟"

جبار یکلخت چونک اٹھا اور جھٹ پٹ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور آدھی پیالی چائے پی کر چل دیا۔

رات وہ دیر سے لوٹا۔ بڑے بابو نے باتوں باتوں میں بہت دیر کر دی۔ پھر کافی پلانے کے لئے کچھ دیر اور روک لیا تھا وہ سائیکل رکھ کر بغیر کپڑے اتارے پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس کا یوں پلنگ پر لیٹ جانا افسری کو کچھ عجیب سا لگا۔ اس نے ٹوکا اور پوچھا۔

"کیا بات ہے، لیٹ کیوں گئے؟"

جبار تھکا ماندہ مسافر کی طرح کسمساتے ہوئے اٹھا اور سگریٹ کا کچھ دار دھواں نتھنوں سے چھوڑتے ہوئے ہلکے تبسم سے بولا۔

"کچھ نہیں جانِ وفا، سب ٹھیک ہے۔ اگر باز خاطر نہ ہو تو تھوڑی سی چائے پلا دو مجھے، بڑے بابو نے کافی پلا کر منہ کا مزہ خراب کر دیا۔"

"اچھا —— آج کافی بھی پلائی اس نے؟" افسری کی رسیلی آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں اور ہونٹوں پر رسیلی مسکراہٹ کی کرنیں چمک اٹھیں۔

"ہاں، شاید بہت خوش تھا آج۔" جبار دونوں ہاتھ اٹھا کر شوخ لہجہ میں بولا۔

افسری چائے بنانے چلی گئی اور وہ اپنی بوجھل آنکھیں بند کئے پلنگ پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ معاً اس کے سطحِ دماغ پر اس کی چھوٹی بہن نذرین کی شادی کا یادگار واقعہ رقص کرنے لگا۔ وہ سوچنے لگا۔

"ابا جان کا غم تازہ ہی تھا کہ نذرین کی شادی کا وقت قریب آ گیا۔ میرے کمزور کندھوں پر پہاڑ جیسی ذمہ داریاں آ گئیں۔ وہ واقعی میری آزمائش کے دن تھے بلکہ میرا فرض تھا۔ اس فرض کی ادائیگی کے لئے مجھے کمپنی سے قرض لینا پڑا تھا۔ اپنا اسکوٹر بیچ دیا لیکن پھر بھی پیسوں کی کمی ہو گئی تھی۔ اس آڑے وقت میں افسری نے بڑی دلیری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگر اس وقت وہ میری مدد نہیں کرتی تو دولہے کی تمام فرمائشیں پوری نہیں ہو پاتیں۔ پھر نہ جانے ہماری کتنی ذلت ہوتی۔ افسری نے مجھے دل برداشتہ دیکھ کر اپنے سونے کی دو چوڑیاں یہ کہہ کر دے دیں کہ انھیں بیچ کر دولہے کی فرمائش پوری کر دیجئے۔ میرے تمام جسم میں اس وقت ایک جھرجھری سی دوڑ گئی تھی، بے شک عورت ایثار اور قربانی کا پیکر ہے......"

اتنے میں افسری چائے لے کر آ گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اس کے ہاتھ سے چائے لے کر پینے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ چائے نہیں لافانی پیار و محبت کا دریا ہو۔

بقیہ طلسم دشت

پھر بھی تھا اور ثابت کر رہی تھیں انجام سے
وہ مایوسی سے بولا۔ "ڈرامہ کا کیسا انجام ہے"
میں بے یقینی کے طشت پر ہکتا ہوا بولا شاید ہم صرف حالات ہیں اور زمانہ اور ہوا تماشائی ہیں اور ہم جو یہ سب دیکھ رہے ہیں مگر کے پردے پر پہرہ لگائے ہوؤں کے دروازوں سے نکلنے والے جیالوں کی آنکھیں بتلا رہی ہیں کہ ہم صرف کردار ہیں۔

وہ مایوس ہو کر بولا۔ "ہاں ہم صرف کردار ہیں صرف کردار۔ تم اور ہم دونوں گلے لگ کر چیخ چیخ کر رونے لگے۔

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

شہرِ خیال

قارئین کے خطوط

برادرِ عزیز و مکرم! سلام و دعا
...نا نمبر نظر نواز ہوا۔ اس عطیۂ خاص کا شکریہ!
...پ جس سلیقہ اور محنت سے مختلف ادیبوں اور شاعروں
...ن شخصیت اور فن پر خصوصی نمبر شائع کئے ہیں وہ آپ
...حصہ ہیں۔ میں اطمینان و سکون سے اسے دیکھوں گا۔
ہنوز تو ہم لوگ ابتلا کے شدید مرحلہ سے گذر رہے ہیں۔
ہمارا یہ صنعتی قصبہ ہند و مسلم اتحاد کی روشن علامت تھا۔
...نہ آخر فرقہ پرستوں کی سازش کامیاب ہوگئی۔ اور
...یہ کرفیو کے سیاہ جہنم میں جھونک دیا گیا۔ حالاں کہ اس
...لم کے لئے کوئی جواز نہیں تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ۲۷ برسوں
سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ شاید پورے ہندوستان میں اتنی
...یل مسلسل کرفیو کی کوئی نظیر نہ مل سکے۔ بعض بعض
...وں میں مسلسل پندرہ روز کا کرفیو لگا رہا۔ اس اہمیت
تصور کیجئے۔ جانی نقصان بھی ہوا۔ مالی ساکھ... اور
...ئیداد کا بے پناہ نقصان ہوا۔ کئی کروڑ کے نقصان
اندازہ ہے۔ چار پانچ محلے تو بالکل نقصان ہو گئے۔
[illegible] نوجوان جیلوں میں بند ہیں۔ جنہیں پولس
نے مار پیٹ کر مفلوج کر دیا ہے۔ اگر یہ دلیس کا قاتل پولس
...فرقہ پرست [illegible] کی کہ ہمارا ملک اسی
...بستی سے [illegible] کہ زمین تنگ و آسمان تاریک
ہوگیا۔ خدا کا شکر ہے ہمارا علاقہ نقصان سے محفوظ رہا۔
رات کا کرفیو اب بھی جاری ہے۔ کشیدگی باقی ہے۔ اور خوف
و ہراس کا ماحول برقرار ہے۔ گو پہلا سا ماحول نہیں ہے۔
دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائیں۔ اور اپنی حفاظت میں
رکھیں۔ آمین

ذہن یکسو نہیں' حواس برہم ہیں۔ ایسا لگتا ہے ہمارے
لئے تمام راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ اب اس کے بعد برباد شدگان
کی بحالی اور راحت رسانی اور باز آباد کاری کا طویل و
پریشان کن سلسلہ سامنے ہے۔ اللہ تعالیٰ وسائل فراہم کرنے
کی توفیق بخشیں۔ حواس مجتمع کرکے یہ چند سطور لکھدی ہیں۔
زخموں کی نمائش کرتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔

فضا ابن فیضی مئو ناتھ بھنجن

ہمسین کا جون و جولائی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ یاد آوری
کے لئے شکریہ۔ ساتھ ہی شرمندہ بھی کہ ایک شمارہ حالی
کے نام' کی رسید تک نہیں بھیج سکا۔
سچ تو یہ ہے کہ میں اس شمارہ پر کچھ لکھنا چاہتا تھا مگر
نہیں لکھ پایا۔ کیوں کہ خط لکھنے کی شدید خواہش پر میری
مصروفیت غالب آگئی۔ اور آج جب یہ رسالہ ملا تو سوچا کہ
سب سے پہلے پرانا قرض ادا کردوں۔

بھائی حالی سے عرصہ تک بہت قریب رہا ہوں۔
مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کے سارے خیالات
سے اتفاق ہو ہی۔ منٹو کے متعلق ان کے خیالات پڑھ کر میں
سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ حالی نے شاید منٹو کو پڑھا نہیں۔
اگر پڑھا تو سمجھا نہیں' اگر سمجھا تو غلط سمجھا۔ منٹو کی ناجنتا
سنگھ [illegible] کا [illegible] نہیں ہے بھائی۔ حالی کا تاثر [illegible]

مگر کوئی قانونی بندش ۔ اور ذاتی رائے کے اظہار پر پابندی کب
ہے ؟ خود پر آپ نے بہار شریف کے فساد پر قلم اٹھایا
ہے۔ ایک بات کہوں ! فساد چاہے کہیں بھی ہو، مراد
آباد میں ہو، جمشید پور میں ہو یا بہار شریف میں۔ حیدر آباد
میں ہو یا مئو میں، آسام میں ہو یا پنجاب میں، سب کی نوعیت
ایک ہوتی ہے۔ سب میں ایک ہی ہاتھ شامل ہوتا ہے۔ صرف
شکل بدل جاتی ہے۔ نام بدل جاتے ہیں۔ اور منظر بدل جاتا ہے۔
نقصان کی نوعیت کبھی مالی اور کبھی جانی، وجہ ایک اور صرف
ایک ــــ اقلیت میں جوش اور اتحاد کی کمی۔

حکومت ایک سے بڑھ کر ایک مسئلہ حل کر سکتی ہے۔ بڑے
بڑے سرکش مجرموں کو سلاخوں کے پیچھے بند کر سکتی ہے۔ پولس
کم پڑے تو فوج کا سہارا لے سکتی ہے۔ مگر صرف اس وقت
جب وہ چاہے۔ اور اس چاہت کو بیدار کرتے کرتے ۳۶
سال گذر گئے۔ نتیجہ کیا رہا ؟ وہی ڈھاک کے تین پات !
کانگریس سرکار میں فساد کی ذمہ داری اپوزیشن پر ڈالی
گئی۔ اور جنتا میں کانگریس پر ــــ وجہ ــــ ؟ کون نہیں
جانتا ! یہ ہندوستان ہے۔ یہاں فسادات ہوتے رہیں گے۔
ہم آپ چیختے رہیں گے۔ کمیشن بحال کی جاتی رہے گی۔ انکوائری
ہوتی رہے گی۔ ایک زخم بھرے گا کہ دوسرا

"زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا"

زندگی کے روزانہ کے معمولات میں اب فساد کو جھیلنا
شامل ہو گیا ہے۔ وہ حکومت کہاں ہے ؟ وہ شخص کہاں
ہے ؟ جو اس درد کو سمجھے اور اس کا مداوا تلاش کرے۔

کس سے ہم جا کے غمِ دل کی شکایت کرتے
جو بھی نکلا وہ ترے شہر میں کچھ سا نکلا

"ایک وضاحت کی وضاحت" پڑھ کر خوب ہنسی آئی۔

لکڑی کے پاؤں لگا کر قد تھوڑا سا ہی اونچا کیا جا سکتا ہے
اور بچے ٹیلے پر چڑھ کر بونے پن کی نقاب پوشی نہیں کی جا سکتی
ــــ مگر آپ کر ہی کیا سکتے ہیں ؟ کسی کو خوش فہمی اور
خود فریبی کے جال سے نجات دلانا اتنا آسان تھوڑا ہی
ہے۔ ان پر مزید لکھنے کی خواہش تو ہو رہی ہے مگر وقت
برباد کرنے کے حق میں میں بھی نہیں رہا ــــ ! !

رسالہ کا موڈ بہتر ہے۔ مگر بھائی ! برا نہ مانیں تو ایک
بات کہوں، کتابت و طباعت اور سر ورق پر مزید توجہ
درکار ہے۔ آپ کی ذرا سی کاوش اس کے حسن میں نکھار
پیدا کر سکتی ہے۔

مشتاق احمد نوری، پورنیہ

سہیل کا اگست کا شمارہ ملا۔ شکریہ ! ڈاکٹر علیم اللہ
حالی سے عرض ہے کہ انہوں نے ان کے جن اشعار پر خاص
طور پر اظہار خیال فرماتے ہوئے رونق دکنی صاحب سے
ہدایت و وضاحت کی گذارش کی ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو
ضرور خیال فرماتے۔ مرحوم کی پُر خلوص اور پروقار شخصیت
تھی۔ شعر و شاعری کے متعلق وہ بڑی گہرائی میں اترے ہوئے
تھے۔ یہ گمان نہیں ہوتا تھا کہ وہ دکن کے تھے۔ ان سے
متعلق کچھ لکھ رہا ہوں جو آپ تک بھی پہونچے گا۔

گربچن سنگھ (جمشید پور)

اگست کا سہیل دیکھا تو بے اختیار آنکھیں نم ہو گئیں۔
خدا آپ کو حوصلہ دے اور آپ زندگی کی جستجو میں برابر
اپنا سفر جاری رکھیں۔

[illegible]

مشرق کا بہترین
عطر

اینڈ
بمبئی ۲

تیز رفتار ○ ملائم ○ پائیدار اور ارزاں

Bata
cushion

کلکتہ ۳۹

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے مضبوط ارادے

اور

وزیر اعلیٰ شری چندر شیکھر سنگھ کی سرپرستی میں

بہار میں

اَرتھک سادھن شروت جٹانے کی
کامیاب کوشش صوبے میں لاگو کٹھور
وِتّیہ انوشاسن صحیح وقت پر پروگراموں
کو پورا کرنے کا کام

۸۵-۱۹۸۴ء کے لئے سالانہ یوجنا
منظور
۷۸۱ کروڑ روپے

جو اب تک کی سب سے بڑی سالانہ یوجنا ہوگی

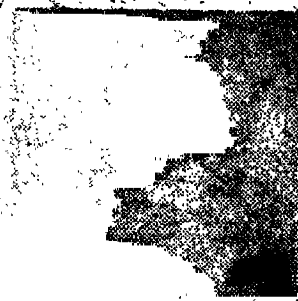
محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ بہار
پٹنہ

पू० सं० सं० पि-233-म(पू-205)84

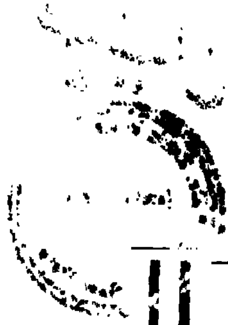
Regd. No. Gay—4 Regd. with the R. N. Pat. R. No. 3020/67
46 YEARS OF PUBLICATION
THE SOHAIL MONTHLY, River Side Road, Gaya - 823001

سہیل

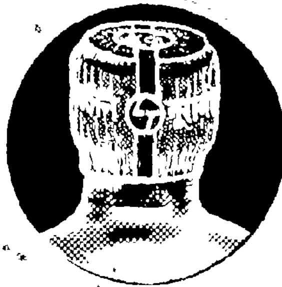








مئو کے اصلی نورانی تیل کی خاص پہچان



- لیبل پر مینوفیکچرنگ لائسنس نمبر U18/77 ضرور دیکھیں
- کیپسول پر (LT) مارکہ دیکھیں
- اگر لیبل پر مذکورہ لائسنس نمبر نہ ہو اور ایل ٹی مارکہ نہ ہو یا دوسرا مارکہ ہو تو ہرگز نہ خریدیں۔



نورانی تیل

درد، زخم، چوٹ، کٹنے، جلنے
کی مشہور دوا

انڈین کیمیکل کمپنی، مئوناتھ بھنجن، یوپی

ماہنامہ سہیل گیا
بانی: مولوی حافظ محمد عبدالرحمٰن صاحب بسمل سنہاروی
یادگار: مولوی محمد زین العابدین احمر سنہاروی

ترقی پسند ادب کا ترجمان

ماہنامہ سہیل گیا

نومبر ۱۹۸۴ء

شمارہ: ۱۱
جلد: ۶۴

مدیر: ادریس سنہاروی

چیف ایڈیٹر مسعود منظر سنہاروی

ایڈیٹر جمیل منظر سنہاروی



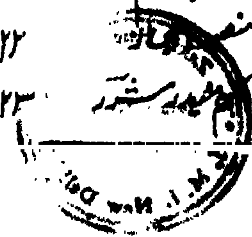
بدل اشتراک:

- فی شمارہ: ایک روپیہ پچاس پیسے
- سالانہ: ۱۸/- روپے
- لائف ممبری: ۱۱۰/- روپے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ سہیل، ریور سائڈ روڈ، گیا

فہرست



(منو د)

وزیر اعظم شریمتی گاندھی کا قتل

ہندوستان کی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کو قتل کر دیا گیا۔ یہ خبر ملک کے سارے عوام کے لئے ہی نہیں، پوری دنیا میں آزادی، امن اور انسانیت سے محبت کرنے والوں کے لئے بھی تکلیف دہ ہے۔

یہ اور بھی حیرت انگیز ہے کہ وزیر اعظم کی رہائش گاہ کے حفاظتی عملے ہی نے احاطے کے اندر ان کو قتل کیا۔ اس غیر انسانی حرکت کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ لیکن یہ سمجھنا بالکل غلط ہوگا کہ وزیر اعظم کا قتل صرف چند حفاظتی عملے کا پاگل پن ہے بلکہ اس غیر انسانی حرکت کو ان سامراجی طاقتوں کی سازش سے الگ نہیں کیا جا سکتا جو ہندوستان کی آزادی اور امن کے خلاف مستقل کام کرتی رہی ہیں۔

وزیر اعظم کے قتل سے ملک کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ جس کی تلافی مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بھیانک حادثے سے کانگریس کی لمبی تاریخ کو پھر ایک زبردست جھٹکا لگا ہے جسے سنبھالنا مشکل ہوگا۔ شریمتی گاندھی نے اپنے والد اور بیسویں صدی کے بین الاقوامی لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو کی موت کے دو سال بعد اور شری لال بہادر شاستری کی موت کے فوراً بعد ۱۹۶۶ء میں اس سب سے بڑے نئے آزادی ترقی یافتہ ملک کے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا تھا۔ ۱۹۷۷ء کے بعد لگ بھگ تین سال کے چھوٹے سے وقفہ کو چھوڑ کر ۱۹۶۶ء سے اب تک اس ملک کی حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں رہی۔ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں یہ سال اندرونی لڑائیوں اور اتار چڑھاؤ کے رہے ہیں۔ کئی موقعہ پر انھوں نے ہمت، صبر و استقلال اور پہل کا ثبوت دیا۔ مختلف طرح کی سیاسی، سماجی طاقتوں کے درمیان ان کے قدم کئی مختلف نظریئے سے اختلاف کا سبب بھی بنے ہیں۔ لیکن وہ اپنے راستے پر بے جھجک چلتی رہیں۔ انھوں نے کبھی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا اور آگے ہی آگے دیکھتی رہیں، بڑھتی رہیں اور ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتی رہیں۔

وزیر اعظم شریمتی گاندھی کے قتل نے ہم ہندوستانیوں کے بیچ ایسی خلا پیدا کر دی ہے جسے پر کرنے کا ایک ہی راستہ یہ ہے کہ ملک کی جمہوری، ترقی پسند اور سامراج دار مخالف وطن پرست طاقتیں یکجا ہوں تاکہ قومی ایکتا اور جمہوریت پر منڈلا رہے خطرے کا مقابلہ کیا جا سکے۔

(جمیل منظر شنہادی)

اُردو کے ممتاز ترقی پسند افسانہ نگار شری راجندر سنگھ بیدی کا پچھلے ۱۱ر نومبر کو طویل علالت کے بعد بمبئی میں انتقال ہوگیا۔ موصوف نہ صرف ایک لازوال افسانہ نگار تھے بلکہ انھوں نے اپنی پوری زندگی ترقی پسند تحریک کے لئے وقف کر دی تھی۔ انہوں نے کئی شاہکار افسانے لکھے ہیں جس کی وجہ کر انھیں رہتی دنیا تک یاد کیا جائیگا۔

ادارہ "سہیل" موصوف کی موت پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ اور ان کے پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

(ادارہ)



"اگر میں قوم کی خدمت کرتے ہوئے مر بھی جاؤں تو میرے لئے یہ بڑے فخر کی بات ہوگی۔
مجھے یقین ہے کہ میرے خون کا ہر قطرہ، اس قوم کے فروغ میں کام آئیگا، اور اسے
مستحکم اور متحرک بنانے میں کارآمد ثابت ہوگا"

30 اکتوبر 1984ء — شریمتی اندرا گاندھی

انجمن ترقی پسند مصنفین مرادآباد کا قابلِ قدر کارنامہ

ڈاکٹر ... بہادر کوٹی

کچھ لوگ ہیں اور ایسے کچھ اردو اخبار بھی ہیں جو سابق میں ترقی پسند رہنے کے گناہ کا کفارہ کچھ اس طرح ادا کر رہے ہیں کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کو ایک "بے گور و کفن لاش" کا نام دے کر اس کے سارے کارناموں پر پانی پھیرنا چاہتے ہیں اور اسی جنون میں بک رہے ہیں کہ انجمن نہ اب باقی ہے اور نہ ہی اب اس کی ضرورت ہے۔

یہ کچھ ایسی ہی بات ہوئی کہ "تاج محل" جیسی محبت کی نشانی بن جانے کے بعد اب نہ محبت کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کی نشانی کی۔

ترقی پسندی کسی زمانے میں محض ایک رجحان تھا پھر ایک تحریک بنی اور بالآخر ایک تنظیم کی شکل میں وجود میں آئی۔ اور یہ سب عصری سماجی تقاضوں کا تقاضہ تھا۔ جب محمد حسین آزاد اور حالی کو اردو شاعری میں نئی روح پھونکنی تھی۔ سماج کی مردنی پر تازیانہ لگانا تھا لوگوں کو بیدار کرنا تھا اور ادب میں جو ابتذال پیدا ہو چلا تھا اس سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا تو انھوں نے نہ صرف ایک تحریک چلائی بلکہ لاہور میں ایک تنظیم بھی کھڑی کر دی۔

ترقی پسند ادبی تحریک کو بھی ایک تنظیم کی ضرورت ہے اور رہے گی۔ انگور کی بیل میں خوشے نہ آئیں تو بیل تراشا جاتا ہے اسے جڑ پیڑ سے اکھاڑا نہیں جاتا۔

اور تنظیموں کی طرح ترقی پسند ادبی تہذیب میں بھی کچھ سقم نمودار ہوئے۔ کچھ منفی رجحانات بھی تھے۔ لیکن ترقی پسند تحریک و تنظیم نے ان پر قابو بھی حاصل کیا۔ اور رجحانات ایک لحاظ سے سماجی اتھل پتھل کی عکاسی بھی کرتے تھے۔

آزادی کے بعد اصل یلغار ایوانِ حکومت کی تھی۔ وابستگی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ جو وابستہ نہ ہونا چاہیں انہیں معتوب اور معاشی پریشانیوں کا شکار ہونا پڑتا تھا اس کی وجہ سے ایک انتہا پسند رجحان پیدا ہونا فطری تھا۔ ویسے ادب کا کون سا دور ہے جہاں مختلف رجحانات کا ٹکراؤ نہ ہوا ہے؟ کیا لوگوں نے سرسید کو بخشا؟ اور پھر جب سرسید کی تعلیمات کی کوتاہیاں ظاہر ہونے لگیں۔ اور شبلی آگے کی طرف چلنے لگے تو کیا شبلی کو بخشا گیا؟

اور پھر جب آج تو اگر ایک طرف "جدیدیت" کا رجحان ہے جو ایک طرح "وجودیت" کے فلسفے کا چربہ ہے۔ جو سیاسی اعتبار سے سوشلزم کا رجحان اور سماجی اعتبار سے زندگی سے بیزاری کا مظاہرہ کرتا ہے وہ اب کم ہوتا نظر آ رہا ہے۔

دوسرا وہ گروہ ہے جو اپنے آپ کو دلت ادب کا

علمبردار کہتا ہے اور براہ راست انداز میں انقلابی ادب کی تخلیق چاہتا ہے۔ ان کے پاس حالات سے ناآسودگی کا شدید احساس ضرور ہے لیکن مستقبل کا کوئی ایسا تصور نہیں جو منظم حرکت کی طرف راغب کر سکے۔

ایسے میں ترقی پسند مصنفین ہی ہیں جو اگر ایک طرف ماضی کی غلطیوں کا احساس رکھتے ہیں تو دوسری طرف مستقبل کی طرف بھی واضح نظر رکھتے ہیں۔ ایک طرف زبان اور فن کی طرف توجہ دیتے ہیں تو دوسری طرف محض بوٹ کے کرتب نہیں دکھاتے بلکہ زندگی کی حقیقتوں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ جہاں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ادب کا تفریحی پہلو اہم ہے وہیں یہ نہیں بھولتے کہ ادب پیغمبری کا فریضہ بھی ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین مرادآباد نہ صرف وقتاً فوقتاً مذاکرے اور مشاعرے منعقد کرتی ہے بلکہ اشاعتی فریضہ بھی انجام دیتی ہے۔ جب بیروت سامراجی اور صیہونی آگ میں جل رہا تھا۔ فلسطینیوں کا قتلِ عام ہو رہا تھا ایسے موقع پر انجمن ترقی پسند مصنفین مرادآباد نے ایک کتابچہ شائع کیا جس کا نام تھا۔

"حرفِ آخر تو نہیں موت ہے بیروت کا"

اسی عنوان کے تحت جس شاعر نے نظم کہی ہے اس کا ایک یہ شعر ہے ؎ اہلِ نخوت کو سبق تازہ سکھانے کے لئے

وقت کا ساز میں پھر نغمہ سنایا جائے گا

اور وہ تابش ہے۔ اسی انجمن نے جناب تابش حیدری مرادآبادی کا مجموعۂ کلام "زبانِ حال" شائع کیا ہے۔ اپنے مجموعے کے متعلق تابش خود کہتے ہیں ؎

یہ کتابِ زیست جب بھی کوئی پڑھے

تو ورق ورق تیرا زبانِ حال ہے

"زبانِ حال" کا یہ مطلب نہیں کہ وہ محض "زنجیر کی جھنکار" ہے۔ بلکہ اس میں ان زنجیروں کو توڑنے کی بشارت بھی ہے۔ اس کتاب میں جہاں تابش کے ۱۰ قطعات، ۱۰ غزلیں اور ۸ نظمیں ہیں وہیں سید حسن مہدی رضوی ایڈووکیٹ کا ایک اچھا جذباتی لیکن معلوماتی ابتدائیہ شامل ہے جو قاری کو اس پس منظر سے واقف کراتا ہے جو ایک مرادآبادی کو نامرادیوں سے لڑنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی نوجوان سیکریٹری صنعت صدر کماری دینا گپتا نے "حرفِ آخر" لکھا ہے جس میں انجمن اور تابش دونوں ہی کا تعارف کرایا ہے۔ پھر مولانا اسحٰق سنبھلی، سید ظہیر حسن نقوی ایڈووکیٹ اور زبیر گستاخ کے توصیفی کلمات بھی شامل ہیں۔

کچھ لوگ جان بوجھ کر یہ کفر پھیلاتے ہیں کہ "ترقی پسند" کو "عشق" سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ "گرفتارِ عشق" انقلاب کے لئے ایک عضوِ معطل کے برابر ہے وغیرہ۔

"عشق" وہ جذبہ ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتا ہے اور عشق نہ ہو تو انسان اپنی منزل کے تصور ہی سے محروم ہو جائے اور عشق ہی تو ہے جو سماج اور فکر سماجی کے ارتقا کے ساتھ جنس سے شروع ہوتا ہے اور اس مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ جہاں ؎

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق

معرکۂ حیات میں بدر و حنین بھی ہے عشق

کی منزل آجاتی ہے اور انسان ذاتِ یزداں کی تسخیر کے حوصلے پیدا کر لیتا ہے۔

چنانچہ تابش نے بھی عشق کیا ہے۔ اس کے بھی کچھ "رازِ عہدِ گذشتہ" ہیں۔ اس میں بھی کوشش اور تمنا

بزمِ الفت" لگا ہے۔ وہ کبھی اس حادثہ کا شکار رہا ہے
جو ہمتیں بڑھاتا ہے" عشق کے اس نئے اظہار پر نظر رکھیے۔
یہ اقبال کی دین ہے اور ترقی پسندوں نے اسے آگے بڑھایا۔
ہر ایک بات ذہن میں رہے۔ جیسا کہ رشید احمد صدیقی نے
کہا ہے کہ "جنس" کا ذکر شعر میں ممنوع نہیں "ارتکاب" ممنوع
ہے۔ ترقی پسند بھی یہیں لکیر کھینچ دیتے ہیں۔
تابش کے خالص عشقیہ شعر سنیئے ؎

نہ چھیڑو کوئی تارِ سازِ محبت
کہیں ماجرا عہدِ گذشتہ نہ کہہ دوں
زمانہ میرے حال پر خندہ زن ہے
اسے بھی تمہارا کرشمہ نہ کہہ دوں

وہ گلِ رنگ عارض، وہ شبِ رنگ گیسو، وہ بدمست
نظروں کا مبہم اشارہ ابھی تک نگاہوں میں رقصاں ہے
میری، ملاقاتِ اول کا دلکش نظارہ، کبھی صرف وحشت،
کبھی فکرِ ہستی، کبھی جوشِ فرحت، کبھی غرقِ مستی، جنونِ
محبت کی بندہ نوازی، نہ جینا گوارا نہ مرنا گوارا۔

خوش ہو کے تیرے غم کو گلے سے لگا لیا
ہم نے خرد کی زد سے جنوں کو بچا لیا
کچھ تو مبہم تھے اشارے اس نگاہِ ناز کے
اور کچھ ہم بھی نہیں سمجھے کہ کیا منظور ہے
کیا مقام آیا ہے تابش یہ بھی راہِ عشق میں
زندگی وقفِ الم ہے اور اجل مسرور ہے
کچھ تذبذب کچھ یقیں، کچھ خامشی، کچھ اضطراب
صبح ہونے تک کئی حصوں میں بٹ جائے گی رات
میرا مینا و جامِ بزمِ الفت کی
کوششِ ارتکاب ارے توبہ

اس حادثہ کو خدا کے لیے بُرا نہ کہو
وہ حادثہ جو مری ہمتیں بڑھاتا ہے
خاموش ہے زباں تو نگاہیں ہیں بے قرار
چھپتا نہیں جو دل کو تعلق کسی سے ہے
تبسمِ لبِ رنگیں کا کچھ جواب نہیں
مگر وہ اشک جو پلکوں پہ تھرتھراتا ہے

اب تابش کی وہ شاعری سنئے جو سیدھی سادی شاعری
ہے لیکن ادبی فضا پوری طرح برقرار ہے۔ ملک اور عوام کی
موجودہ حالت کا بیان سنئے :

وہی تیرگی، وہی زنداں، وہی دام آج بھی ہیں
ملک آزاد سہی، ذہن غلام آج بھی ہیں
انقلاب آکے بھی نقشہ نہیں بدلا تابش
تھا جو پہلے وہی بے ربط نظام آج بھی ہیں

"بے ربط" کی ترکیب توجہ چاہتی ہے۔ برتنوں کے کارخانوں
کے شہر میں سرمایہ داری کی "بے ربط" پیداواری قوتوں کا
ناچ تابش نے دیکھا ہے۔ یہاں اس مزاج اور بے ربطی
کی طرف بڑا بلیغ اشارہ ہے جو سرمایہ داری پیداواری
سسٹم کی خصوصیت ہے۔
پھر تابش کہتا ہے کہ انقلابی تحریکیں اندھا دھند
نہیں چل سکتیں ؎

حالتِ گردشِ ایام بدلنے کے لیے
مقصدِ گردشِ ایام سمجھنا ہوگا

"انقلاب" بلکہ "مکمل انقلاب" کا نعرہ جے پرکاش نرائن
نے بھی دیا تھا۔ لیکن تابش کی دور رس نظر حقیقت
کو دیکھ لیتی ہے ؎

رہ راہ قافلہ ہے مجھے سوچنا پڑے گا

مرا کون رہنما ہے مجھے سوچنا پڑے گا
مرے آئینے میں بیشک رُخِ انقلاب ہوگا
میں انقلاب کیا ہے مجھے سوچنا پڑے گا

لینن نے تعلیم دی ہے کہ انقلابیوں کو چاہیے کہ کسی تحریک کی طرف اپنے رویہ کا تعین کرنے سے قبل وہ اپنے آپ سے یہ سوال کریں کہ اس تحریک کے پیچھے کون طبقات ہیں۔ اور اس کا مقصد کن طبقات کو فیض پہنچانا ہے۔

تابش کا یہ قطعہ دیکھیے برتن کے کارخانوں سے نکلنے والے مزدوروں کی صورت نظر آتی ہے

میں نے جھلسے ہوئے چہروں کی دیکھی ہے
گرد آلود جبینوں پہ شکن دیکھی ہے
میں نے بیتا دوں کا جہاں کی تجوری کے ستم
میں نے ، دور کے سینے کی جلن دیکھی ہے

تابش کا ایک قطعہ بہت ہی معنی خیز ہے :

عہد و پیمان بیچ ڈالیں گے
ظرف انسان بیچ ڈالیں گے

یہ زمانہ اگر نہیں بدلا !
لوگ ایمان بیچ ڈالیں گے

منشی پریم چند کی کہانی "کفن" کی یاد تازہ کیجیے۔ سرمایہ داری سماج نے انسان کے ضمیر کو یہاں تک کچل ڈالا ہے کہ باپ کو بیٹے پر اور بیٹے کو باپ پر بھروسہ نہیں رہا۔ ہر ایک سمجھتا ہے کہ آلو کھا جائیگا اس لئے وہ وہاں سے کھسکتا نہیں اور اندر مادھو کی جوان بیوی مرنے کے قریب حالتِ نزع میں ہے اور گھیسو مادھو کا ۶۰ سالہ باپ ہے۔
مادھو کی بیوی مر جاتی ہے تو دونوں گاؤں میں گھوم پھر کر کفن کے لئے چندہ اکٹھا کرتے ہیں لیکن شراب خانے میں جا کر شراب پی کر پوریاں کھا کر ناچنے لگتے ہیں۔
استحصالی اور اکتسابی سماج نے انسان کو اتنا ... ہے۔ اس کا ضمیر مر گیا ہے۔ انسانی قدریں ختم ہو چکی ہیں۔
اسی طرح تابش بھی اپنے اوپر لگے ہوئے قطعے کرتے ہیں۔ اب زمانے کو اگر جلدی نہ بدلا گیا تو لوگ ا... گرتے جائیں گے اور اپنا ایمان تک بیچ ڈالیں گے۔"
تابش کو مزدور طبقہ پر بھرپور اعتماد ہے جو تحریک سے ان کی وابستگی کی دین ہے۔ کہتے ہیں :

حصارِ جبر و تکبر کو توڑ سکتے ہیں
مزاجِ گردشِ دوراں جھنجھوڑ سکتے ہیں
جو ہاتھ ان کے پرچم کو ہیں اٹھائے ہوئے !
وہ ہاتھ ظلم کا پنجہ مروڑ سکتے ہیں

تابش کے پاس اچھی نظمیں بھی ہیں لیکن ان کی ش... رہی ہے۔ "جہیز" میں کہتے ہیں :

بتائے کون وہ عید تھا کہ بزدل تھا
کہ جس نے جان تو دیدی جہیز دے نہ سکا
بھری برات میں ہنگامہ ہو گیا برپا
کسی عروس نے سہرے کے پھول نوچ دیئے

ان کی نظم "جواب دو" حکمرانوں کے لئے ایک چیلنج کا حکم رکھتی ہے :

کب تک گلوں کے خون میں کانٹے نہائیں گے
کب تک لہو سے ہوگا گلستاں جواب دو
چپ چاپ کس لئے ہو بزمِ سیاست کے شاطرو
کیوں ہے تمہاری چشمِ گریزاں جواب دو
سن لو اگر جواب نہ پائیں گے اہلِ قوم
اک حشر قبلِ حشر اٹھائیں گے اہلِ قوم

سائنسی نقطۂ نظر لسانیات میں

ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ
شعبۂ لسانیات علیگڑھ مسلم یونیورسیٹی۔ علیگڑھ

لسانیات زبان کے سائنسی مطالعے کا نام ہے زبان سے ارباب علم وادب کی دلچسپی قدیم زمانے سے چلی آئی ہے۔ لیکن سائنسی نقطۂ نظر سے زبان کے مطالعے کی ابتدا بیسویں صدی کے آغاز سے ہوتی ہے۔ یہ بات نہایت دلچسپ ہے کہ جدید لسانیات' کا ارتقا یورپ اور امریکا میں خودمختارانہ طور پر بیک وقت عمل میں آیا۔ لیکن ان دونوں مقامات پر لسانیات کے ارتقار کی نوعیت' نہج' سمت و رفتار اور اسکے تاریخی پس منظر میں نمایاں فرق موجود تھا۔

یوروپ میں فلسفیانہ غور وفکر کی ایک شاندار اور مسلسل روایت موجود رہی ہے جس کا سلسلہ کلاسیکی عہد سے جا ملتا ہے۔ علاوہ ازیں یورپ میں انیسویں صدی کے دوران زبانوں کے تاریخی اور تقابلی مطالعے کا وافر سرمایہ اکٹھا ہوگیا تھا جسے علم السنہ یعنی PHILOLOGY کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یورپ میں علم السنہ کی تمام تر بنیاد تحریری مواد پر رکھی گئی تھی اور زبان سے متعلق تمام مباحث کے لئے قدیم اور کلاسیکی متون کی تشریح وتوضیح کو بنیاد بنایا جاتا تھا۔ زندہ زبانوں کی حیثیت محض ثانوی تھی نیز زندہ زبانوں کا مطالعہ محض بولیوں کے علاقائی مطالعے تک محدود تھا۔ یورپ میں زبانوں کے مطالعے کی روایت اور نہج ونوعیت' امریکا میں زبان کے مطالعے کی صورت حال اور سمت و رفتار سے مختلف تھی۔

امریکا میں ریڈ انڈین زبانوں کا ایک کثیر ذخیرہ موجود تھا یہ زندہ زبانیں تھیں' ان میں تحریری مواد کا فقدان تھا۔ ان زبانوں کا مطالعہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ساخت اور ہیئت کے اعتبار سے بھی یہ زبانیں یورپ کی کلاسیکی زبانوں سے بالکل مختلف تھیں' لہٰذا ان کے مطالعے میں یورپ کے کلاسیکی طریق کار اور لسانی مصطلحات کا اطلاق ممکن نہیں تھا۔ امریکی ماہرین لسانیات نے اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے نئے طرز استدلال اور نئے طریق کار کے ساتھ ان زبانوں کی ساخت اور ہیئت کو اپنے مطالعے کی بنیاد قرار دیا۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے ان زبانوں کی انفرادی خصوصیات کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ امریکا میں لسانیاتی مطالعے کا آغاز ماہرین بشریات کی اوّلین کوششوں کا نتیجہ ہے امریکہ کی ریڈ انڈین قوموں کے بارے میں تحقیق اور مطالعے کے دوران ماہرین بشریات کو ریڈ انڈین زبانوں کے مطالعے سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی اس طرح ان زبانوں کے

مطالعے اور توضیح اور تجزیے کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا، جس نے رفتہ رفتہ ایک جدید شعبۂ علم کی حیثیت اختیار کرلی جسے آج ہم 'لسانیات' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ امریکا میں جدید لسانیات کے آغاز و ارتقا فرینز بواز، ایڈورڈ سپیر اور بلوم فیلڈ نے جو خدمات انجام دی ہیں، انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح یورپ میں فرڈی نینڈ ڈی سسیور کی کوششوں سے جدید لسانیات کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ بلوم فیلڈ اور فرڈی نینڈ ڈی سسیور نے لسانیات کو سائنسی طرزِ فکر سے بھی ہم آہنگ کیا۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ لسانیات سے نہ تو زبان کا سیکھنا اور سکھانا کافی حد تک آسان ہو جاتا ہے، لیکن زبان دانی یا زبان جاننا لسانیات کا مقصد نہیں، بلکہ اس کا مقصد زبان کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ کسی زبان کا جاننا اور بات ہے اور کسی زبان کے بارے میں جاننا اور بات۔ کسی زبان کا جاننا اکتسابی عمل کا نتیجہ ہے لیکن کسی زبان کے بارے میں جاننا ایک علم کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی زبان کے بارے میں جاننے کے لیے اس زبان کا جاننا چنداں ضروری نہیں۔ مثلاً فرانسیسی زبان نہ جانتے ہوئے بھی ایک شخص فرانسیسی زبان کے بارے میں بہت کچھ جان سکتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص اگر کوئی زبان جانتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ اس زبان کے بارے میں بھی سب کچھ جانتا ہو۔ ہم میں سے ہر شخص کوئی نہ کوئی زبان ضرور جانتا ہے۔ جسے وہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، بول سکتا ہے اور اسے عام طور پر لکھ پڑھ بھی سکتا ہے۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی زبان کے بارے میں بھی یہ جانتا ہو کہ اس کی

اصل و اساس کیا ہے، اس کا آغاز و ارتقا کب اور کیسے ہوا، اس نے کون کون سے ارتقائی مدارج طے کیے، کن کن زبانوں سے اخذ و استفادہ کیا، اس کی اصوات و علامات کا نظام اور اس کا مزاج کیسا ہے۔ اس کی صرفی و نحوی ساخت اور اس کی سرشت کیسی ہے نیز اس میں کس قسم کی لسانی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں، اِن تبدیلیوں کی نوعیت کیا ہے، دوسری زبانوں سے اس کا کیا رشتہ ہے، اس کے بولنے والے اس کا استعمال کن کن حیثیتوں سے کرتے ہیں، نیز اظہارِ مطالب اور ترسیل و ابلاغ کا کام یہ کس طور سے انجام دیتی ہے؟ ان تمام باتوں کا جواب عام جاننے والا فراہم نہیں کر سکتا ہے۔ ان کا جواب وہی شخص دے سکتا ہے جو اس زبان کے بارے میں علم رکھتا ہو۔ لسانیات ایک ایسا علم ہے جو زبانوں کے بارے میں اسی قسم کی معلومات بہم پہونچاتا ہے۔ یہ ایک جدید علم ہے جس کی بنیاد سائنسی اصول پر قائم ہے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے سائنس کی بنیاد علم پر قائم ہے۔ نہ کہ فن پر۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سائنس کا بنیادی مقصد کسی چیز کے بارے میں جاننا ہے۔ سائنس ہمیں چیزوں کا علم دیتی ہے، ان کے بارے میں معلومات بہم پہونچاتی ہے اور حقائق سے آگاہ کرتی ہے۔ اس کے برخلاف فن ہمیں متاثر کرتا ہے۔ فن سے جذبہ و احساس کا اظہار اور جذبہ و احساس کو بیدار کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ فن کو ایک سرگرمی اور عمل کا نام دیا جا سکتا ہے جس کا مقصد 'کرنا' ہے، نہ کہ 'جاننا'۔ چونکہ سائنس علم کی کھوج اور حقائق کی تلاش و جستجو کا نام ہے، اس لیے لسانیات کو زبان کی سائنس کہنا زیادہ درست ہے۔ سائنس کی وہ تمام خصوصیات جن سے دیگر سائنسی علوم متصف ہیں، لسانیاتی مطالعات میں

بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً سائنسی مطالعے کی سب سے بڑی خصوصیت معروضیت یعنی objectivity رہا ہے جو داخلیت کے بالکل برعکس ایک نظریہ ہے۔ داخلی نقطۂ نظر سے چیزوں کے مطالعے میں مطالعہ کرنے والے کے اپنے محسوسات، معتقدات، وجدان اور پسند و ناپسند کو بڑا دخل ہوتا ہے جس سے وہ مطالعہ نہایت مبہم، جانبدارانہ اور تاثراتی بن کر رہ جاتا ہے جو سائنسی طرزِ فکر کے بالکل منافی ہے۔ لسانیاتی مطالعہ و توضیح کی ہر سطح پر معروضی اندازِ فکر سے کام لیا جاتا ہے اور حقائق کا پتا لگانے کے لئے تجرباتی یعنی empirical طریقِ کار اختیار کیا جاتا ہے اور صرف مواد کے تجزیہ و تحلیل اور شواہد کی بنیاد پر نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ ان نتائج اور شواہد کا کھلے عام مشاہدہ کیا جاتا ہے اور انھیں جانچنے اور پرکھنے کے عمل سے غیر جانب دارانہ طور پر گزارا جا سکتا ہے۔ لسانیات کی ایک شاخ صوتیات کا مطالعہ تو اس حد تک معروضی ہے کہ اگر صوتیاتی مواد کو تجزیہ و تحلیل اور تجرباتی عمل سے دوسری یا تیسری بار بھی گزارا جائے تب بھی وہی نتائج اور فیصلے سامنے آئیں گے۔ لسانیات میں سائنسی بنیادوں پر اخذ کیے گئے نتائج کو پایۂ ثبوت تک پہنچایا جا سکتا ہے اور ان کی تصدیق فراہم کی جا سکتی ہے۔

لسانیات میں سائنسی نقطۂ نظر کی دوسری اہم خصوصیت باقاعدگی ہے۔ زبان کے مطالعے اور توضیح اور تحقیق و تفتیش میں ماہر لسانیات ایک قسم کی باقاعدگی اور نظم و ترتیب کو ہر لحظہ ملحوظ رکھتا ہے جو کسی بھی سائنسی مطالعے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ زبان ایک پیچیدہ مظہر ہے۔ اس کے پیچ در پیچ ڈھانچے کے مطالعے میں اگر باقاعدگی نہ برتی جائے اور نظم و ترتیب کا خیال نہ رکھا جائے تو اس مطالعے سے کسی عام نتیجے تک پہنچنے میں سخت دشواری پیش آ سکتی ہے۔ لسانیاتی مواد کے مطالعے و تجزیے میں باقاعدگی اور نظم و ترتیب کے اصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے، ایک ماہر لسانیات سب سے پہلے تکلمی آوازوں کی ادائگی، مصوتوں اور مصمتوں میں ان کی تقسیم اور درجہ بندی سے بحث کرتا ہے۔ پھر وہ مخصوص زبان کی ممیز آوازوں کی شناخت اور ان سے ترتیب پانے والی صوت رکنی ہیئتوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے بعد الفاظ کی ہیئت و ساخت کے مطالعے کا مرحلہ سامنے آتا ہے۔ پھر ان الفاظ کی ترکیب اور جملوں اور فقروں میں ان کی ترتیب و تنظیم پر غور کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد الفاظ اور ان کے باہمی ربط و تسلسل سے پیدا ہونے والے معانی و مطالب کو موضوعِ مطالعہ بنایا جاتا ہے۔ لسانیاتی مطالعے کے اس مطالعے اور توضیح و تجزیے کو علی الترتیب صوتیات، صوتیات، صرف و نحو اور معنیات کا نام دیا گیا ہے۔

لسانیاتی مطالعے کی ایک اور اہم خصوصیت جس نے اسے سائنسی نقطۂ نظر دیا ہے، زبان کے استعمال میں قطعیت ہے۔ لسانیات ایک ایسا علم ہے جس میں زبان کے مطالعے کے لئے زبان ہی کا سہارا لیا جاتا ہے۔ یعنی لسانیات کا مواد و موضوع بھی زبان ہے اور اس کے مطالعے کا ذریعہ یعنی میڈیم بھی زبان ہے۔ لسانیات میں زبان دوہرا کردار ادا کرتی ہے۔ اسی لئے اس کے استعمال میں نہایت احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔ سائنس کی زبان کی طرح لسانیات کی زبان بھی حد درجہ قطعی ہوتی ہے یعنی لفظ اور اس کے مفہوم میں ایک اور ایک کا رشتہ پایا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ادب کی زبان میں قطعیت تقریباً مفقود ہوتی ہے۔ ادب کی زبان علامتی

ہوتی ہے جس کے ہر ہر لفظ میں تہ در تہ معنی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ سائنس کی زبان کی طرح لسانیات کی زبان بھی معلومات بہم پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ نہ تو متاثر کرتی ہے اور نہ تخلیقی اظہار کے طور پر کام میں لائی جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سائنسی مطالعے کی طرح لسانیاتی مطالعے کی بنیاد بھی معروضیت، قطعیت، نظم اور باقاعدگی کے اصولوں پر رکھی گئی ہے اور سائنس کی طرح یہ مطالعہ بھی مشاہداتی، تجرباتی اور تجزیاتی طریقِ کار پر مبنی ہے۔ انہیں اصولوں نے لسانیات کو سائنسی نقطۂ نظر دیا ہے اور انہیں نظریات کی وجہ سے یہ علم آج "زبان کی سائنس" اور "لسانیاتی سائنس" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

بقیہ:- انجمن ترقی پسند مصنفین مرادآباد

ایلیا ایرن برگ نے کہا تھا کہ بعض لمحات قوموں کی زندگی میں ایسے آتے ہیں کہ اس ایک لمحے میں سماج بدل جاتا ہے تو وہ ادب جو ان لمحات کو اپنی گرفت میں لے لے "لمحاتی ادب" ہوتے ہوئے بھی ابدی ہوگا کیوں کہ تاریخ انقلاب میں اس کا مقام ہوگا۔

اسی طرح تابش کے یہاں بھی آپ کو ایسے "لمحاتی" شعر ملتے ہیں۔ بیروت کے جاں بازوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

صرف ہتھیار ہی نہیں سب کچھ
دشمنوں کو تباہ دیا تم نے
حوصلوں میں بھی جان ہوتی ہے
جنگ میں یہ دکھا دیا تم نے

اور پھر عرب ملک کے بادشاہوں سے مخاطب ہو کر تابش صرف ایک لمحے کو کس چابک دستی سے اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں:-

جلتی ریت پہ لبنان میں بچے تڑپتے ہیں!
حسین محلوں میں شاہانِ جہاں خاموش بیٹھے ہیں

یہ ستم رسیدہ مرادآباد کا تحفہ ہے جو کسی طرح مایوس نہیں ہے بلکہ ایک خوش آئند مستقبل کی طرف بڑھنے کے لئے بیتاب ہے۔

اگر یہ پروپیگنڈہ ہے تو تلسی کی رامائن بھی پروپیگنڈہ ہے۔ انیس کے مرثیے بھی پروپیگنڈہ ہیں۔ سورداس کا کلام بھی پروپیگنڈہ ہے۔ اور سارا ادب حسن و عشق کا تذکرہ کا پروپیگنڈہ ہی تو ہے۔

لیکن یہ پروپیگنڈہ وہ نہیں جسے عرفِ عام میں پروپیگنڈہ کہا جاتا ہے۔ یہ جمالیاتی تخلیق ہے اور اس میں انسانیت اپنی موجودہ حالت میں نظر آتی ہے۔ اور آگے بڑھنے کے لئے پر تولتی ہوئی بھی معلوم ہوتی ہے۔ یہاں جمالیاتی فضاؤں میں امید و بیم کا پیغام ملتا ہے۔ اور یہی ترقی پسندی ہے۔ ترقی پسندی ہی تو زندگی کے علمبردار پر اچھے ادب کی پہچان یہی ہے۔

بقیہ:- از بر غزل الغزلات سے پُر کلام حیرت

کچھ ہے وہ "از دل" سے عبارت ہے۔ لہٰذا اس میں "بر دل خیزد" کی صلاحیت بھی ہے۔ بقول غالب:

نازم فروغ بادہ ز عکس جمالِ دوست
گوئی فشردہ اند بہ جام آفتاب را

کلامِ حیرت میں ایسے آفتاب نظر آتے ہیں جو زندگی کے متعدد گوشوں کو شعری روشنی میں نہایت لطافت و نفاست پیش کرتے ہیں۔

اَذبَر: غزل الغزلاتِ پُر کلامِ حیرت

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

فروغِ بادۂ شعریت سے بھرپور کلامِ حیرت صنفِ غزل
میں نہایت قابلِ قدر اضافہ ہے۔ دہلی میں سکونت پذیر شعرا
میں حیرت کا مقام و مرتبہ خاصا بلند و رفیع ہے۔ سکّہ رسی، نغز گوئی
پختہ کلامی وغیرہ خصوصیات کا آئینہ دار ان کے کلام کا
انتخاب "اذبر" جس کی ترتیب و تہذیب جناب [illegible]
کی جمالیاتی سعی کی مرہونِ منت ہے، اُتر پردیش اُردو
اکادمی کے مالی اشتراک سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ
ان کی غزلیات و منظومات پر مشتمل ہے، معمولی تخلیقی کارنامہ
ہے۔ اس کی ہمہ جہتی اہمیت بھی ہے اور دلکش انفرادیت
ہے۔ آج کل مجموعہ ہائے کلام بالعموم طویل طویل مقدمات
سے شروع ہوتے ہیں۔ جن کی توصیف کے بعد وقت کی پابندی سے
کچھ نہیں ہوتی۔ مقدمہ نگار شعرا اور ادبی حیثیت کے خالی
غلط نگار حضرات یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ صحت مند ادبی ذوق
والے کلام کو دیکھتے ہیں۔ حیرت نے بیانِ اپنا کے تحت اس
کی واشگاف طور پر نشان دہی کی ہے کہ:

"اذبر" خدمت میں حاضر ہے۔ اس کے آغاز میں
کسی دوسرے ادیب کا دیباچہ یا مقدمہ
مجھے اس لئے گوارا نہ ہوا کہ ایسی تحریریں بالعموم
گمراہ کن حد تک تعریفی و یک رخی ہوتی ہیں۔
اور ایسی ایسی باتیں شاعر سے منسوب کر دی
جاتی ہیں جن کا سایہ بھی اس غریب پر نہ پڑا ہو۔"

حیرت کی یہ رائے در خورِ اعتنا ہے۔ شاعر و سامع یا شاعر و قاری
کو ایک سطح پر لانے کی صلاحیت و توانائی کلامِ حیرت میں مضمر
ہوتی ہے ؎

مقابلہ ہے زبردست لایقینی سے
میں اپنا جام اٹھاؤں تو اپنا جام اٹھا

جام کو جلوہ جلوہ کرنے والا بادۂ کلام اگر سازِ دل کو نہ چھیڑ
سکے تو فروغِ بادہ اور نغمہ سنجی دونوں معرضِ وجود میں
نہیں آ سکتے۔

حیرت کا کلام کسی تعریف کا محتاج نہیں ہے کیوں کہ وہ
"از دل خیزد بر دل ریزد" میں مضمر جملہ مفاہیم پر محیط ہے۔ مجموعۂ
کلام کا نام ہی توجہ طلب ہے۔ اذبر کے معروف معنی ہیں حفظ،
نوکِ زبان، زبانی یاد وغیرہ۔ بالاستیعاب نظر لفظ "بر" جس
کے معنی بلند، غالب، ثمر، سینہ ہیں، پر بھی مرکوز ہو جاتی
ہے۔ لہٰذا اس معنوی سیاق و سباق میں "اذبر" سے
مراد "از دل" بھی ہو سکتی ہے۔ میں مجموعۂ کلام کو اسی معنی
میں لیتا ہوں کیوں کہ اس میں پیش کردہ خیالات و تجربات
جو صدق و خلوصِ دل پر استوار ہوئے ہیں۔ دلی ساخت و
رفتار پر جمالیاتی توانائی سے مرتب ہو جاتے ہیں۔
شعرِ حیرت متعدد خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ مجموعتاً

محسوسات جو تہ در تہ فکریات سے عبارت نہ ہوں، اچھے اشعار ہی متصور نہیں ہو سکتے۔ جذبات کی فراوانی جگر تو پیدا کر سکتی ہے مگر یگانہ و فراق ایسے شاعر پیدا نہیں کر سکتی۔ فکری و نظریاتی نکات کو جذبات و محسوساتی اظہار کی لڑی میں کشید کئے بغیر اشعار فاعلاتن مفاعلن وغیرہ ارکان پر وضع ہونے کے باوجود عظمت و وقار کے افق و تخلیق شعری سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ سلسلہ در سلسلہ، مرحلہ بہ مرحلہ مشکلات سے بھرپور رو بہ نقطۂ عروج رواں دواں خیال کا جذبے میں غنائی و رعنائی سے نظم ہو جانا ہی کمالِ شعریت ہوتا ہے۔ بشری و سماجی مسائل کو جذبات و محسوسات ہی نہیں بلکہ ترغیبات و تشویقات وغیرہ کو جلو میں لئے شعری قلب و قالب سے متصف کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس سے صرف بڑا شاعر ہی عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ ذاتی حادثات و تجربات کا سماجی پس منظر میں اُتر جانا اور روحانی وجد و حال میں عروج پذیر ہونا ہی شعر کو سرچشمگی، مسرت و بصیرت سے آشنا کرتا ہے۔ اچھے شعر میں آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے۔ فرد پورے سماج کا نمائندہ ہو جاتا ہے۔ شاعر اور قاری یا سامع کے مابین کوئی دیوار نہیں رہتی۔ خود کلامی رفتہ رفتہ بدلتا ہوا ذہنی تناظر، تشکک و تیقن، ابہام و تفہیم، دنیا و مافیہا سے متعلق تاثرات، تخیلات، سماجی ماحول کی مرتب ہونے والے اثرات نیز ان سے زائدہ ردِ عمل وغیرہ کو بہ خلوص و اہتمام، مناسب و معقول در و بست فراہم کرنا وغیرہ شعری ضمیر و خمیر میں جذب ہو جاتے ہیں۔ فضائے شعر و سخن زماں و مکاں پر محیط ہوتی ہے۔ از بر کر بالا استیعاب دیکھنے کے لئے متذکرہ بالا مختصات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ملحوظ رہے کہ حیرت کی شاعری کا تخاطب عوام سے بھی ہے اور خواص سے بھی۔ اور اس میں کسی قسم کی ژولیدگی نہیں پائی جاتی ہے۔ ابہام و تفہیم کو کسی وقت ہے دو چار ہونا نہیں پڑتا۔ حیرت کی شاعری میں وہ شیشہ گری جو الفاظ کو مبہم علامات میں تبدیل کر کے سنگ باری کرنے لگے، نہیں ملتی۔ سیدھے سادے الفاظ میں گفتگو کرتی ہوئی یہ شاعری نقش ہائے رنگا رنگ سے خالی نہیں ہے۔ "چشم ما روشن دلِ ما شاد" کہتے ہوئے شاعر و سامع دونوں محو گفتگو ہو جاتے ہیں۔

ہزار منزلِ مقصود ایک ہو لیکن
ہماری راہ جدا ہے تمہاری راہ جدا

نکال اور ہی کچھ راہ خود نمائی کی
سجاوٹوں سے یہ پرہیز بھی سجاوٹ ہے ایک

تعلقات کو بُنیادِ زندگی نہ بنا
تعلقات بگڑتے سنورتے رہتے ہیں

حیرت کہاں تھے وست بدل دیکھتے اسے
بارش میں بھیگتا ہوا شعلہ بنا ہوا

پوچھ رہے ہو میرا حال
جیسے تمہیں معلوم نہیں

فقیہہ شہر ترے واسطے بچاؤ ہے ایک
عمل ہی ذلتِ کردار سے بچاؤ ہے ایک

اتنا لہولہان تو چہرہ کبھی نہ تھا
پتھر سے بھی ہیں سخت تمہاری ہنسی کھیل

تم اپنے ہو زماں اپنا مکاں ولا مکاں اپنے
یہ سب تسلیم لیکن دوستو ہم خود کہاں اپنے

شاعر کو محو گفتگو دیکھنے کے بعد ملاحظہ ہو اس کی خودکلامی جو خود احتسابی سے لیکر تجزیہ گرد و پیش کا احاطہ کرتی نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

یہاں، گیا

میں خود سے محوِ تکلم تھا بے محابا نہ
مجھے خبر بھی دُنیا بھی سُن رہی ہوگی

حیات میں وہ مقام آرہا ہے اب کہ جہاں
نہ اعتقاد معاون نہ آگہی ہوگی

یہ گھر بھی میرا ہے اس کی تمام چیزیں بھی
ہر ایک گوشے میں لیکن یہ ناشناس سے لوگ

مقام آہی گیا زندگی میں اب وہ جہاں
نہ کوئی خاک بہ سر ہے نہ کوئی مہ بہ جبیں!

اپنی بر خود سُپردگی کی قسم
میں جہاں تھا وہ میرا گھر تو نہ تھا

میں نے کب چاہا مرادوں کا سفر ایسا نہ ہو
بس مرے احساس کو جینے سے ڈر ایسا نہ ہو

غالباً ہم سب کی تقدیریں ہیں باہم منسلک
لیکن اس صورت میں کیا ہوگا اگر ایسا نہ ہو

آگے کا سفر تیری قیادت میں کریں گے
عقبیٰ سے پرے دیدۂ بینا نہیں جاتا

سست گامی کے لئے صرف شبِ غم ہی ملی
گردشِ وقت بالآخر ترا منشا کیا ہے

منزلوں کے باب میں رستوں سے مت کر مشورے
منزلیں اپنے مسائل خود کیا کرتی ہیں حل

اُمیدِ شام کے سورج سے کچھ نہ تھی لیکن
جب اس کو ڈوبتے دیکھا عجیب ڈر سا لگا

دکھا نہ ہو کہیں معراجِ زندگی حیرت
جہاں پہونچ کے مجھے عیب بھی ہنر سا لگا

خودکلامی و خود احتسابی سے متعلق مجولہ اشعار بطور نمونہ مشتے از خروارے ہی پیش کئے گئے ہیں۔ حیرت کے کلام میں فلسفیانہ نیز نفسیاتی نکات بھی کسی وقت کے بغیر مل سکتے ہیں۔ محض مبادٗ فلسفہ، حیات و کائنات سے متعلقہ اعتقادات و نظریات کو نہیں کہتے۔ فرد و ملت، کائنات و ماورائے کائنات پر بالاستیعاب نیز مسلسل نظر ڈالنے کو ہی فلسفیانہ نظر کہا جا سکتا ہے۔ جامِ شعر میں فلسفے کی پری کو اُتارنا معمولی بات نہیں ہے۔ اگر پیش کردہ فلسفیانہ نکتہ تغزل میں نہ ڈھلا تو وہ پند و موعظت ہو کر بے کیف و سرد رہے گا۔ حیرت نے فلسفہ پڑھا ہی نہیں بلکہ برتا بھی ہے۔ درجِ ذیل نوعیت کے اشعار ان کے ہاں بغیر تلاش ہی نظر آتے ہیں ؎

میں تو ازبر کر چکا حیرت کتابِ زندگی
زندگی کا ہر ورق بھی کیا مجھے پڑھتا گیا

لوگ سمجھیں یا نہ سمجھیں اس کا مطلب کیا خبر
اک عبارت پڑھنے والی تھی سو میں پڑھتا گیا

کیا کیا حسین جواز تراشے ہیں زیست نے
کم بخت لیکن اب بھی سراپا سوال ہے

گذرا ہے دل کچھ ایسے مراحل سے بھی جنہیں
الفاظ کی گرفت میں لانا محال ہے

ترک و طلب کے ہنگامے کو عشق سمجھنا حیرت ہے
عشق تحیر بے پایاں ہے، عشق مجسم حیرت ہے
فکر نہیں ہے اس عنصر کا نام محبت ہے شاید
جس سے تہذیبیں بنتی ہیں، جس سے زیست عبارت ہے

منزلوں کے باب میں رستوں سے مت کر مشورے
منزلیں اپنے مسائل خود کیا کرتی ہیں حل

غرض کہ فلسفیانہ نکات کو سمو کر کہے گئے اشعار ہر صفحے پر نظر آتے ہیں۔ عشق تحیر بے پایاں ہی نہیں، مجسم حیرت بھی ہے۔ محبت ہی وہ عنصر ہے جس سے زیست تو عبارت ہے ہی۔ تہذیب اور ثقافت بھی محبت ہی کی مرہونِ منت ہیں۔ مگر یہ حیات، یہ محبت "دل بہ یار، دست بہ کار" پر استوار ہو کر ہی حیات و محبت ہوتی ہے۔ عمل کئے بغیر مسائل حل نہیں کئے جا سکتے۔ حیرت کا فلسفۂ حیات و کائنات کے دائروں کو متعدد مقامات پر چھوتا ہے۔ ان کا شاعرانہ لہجہ نرم و نازک ہوتا ہے اور کسی پیش کردہ خیالات کے متعلقات و ملتزمات خود بہ خود پیدا کر دیتا ہے۔

حیرت کا کلام جذباتی توانائی، منطقیاتی قبولیت اور اخلاقی جرأت وغیرہ سے متصف ہونے کی وجہ سے خاص اہمیت و مقام رکھتا ہے۔ مزید براں کلاسیکی حسن و خوبی، بیدار آگہی، متوازن و معتدل محرکات، کارآگہانہ اظہار و ترسیل، مسرت سے بصیرت تک پرواز کرتے ہوئے خیالات و تصورات، خصوصیات کی در و بست، سب کچھ ان کے یہاں ملتا ہے۔ وہ لفظوں سے نہیں کھیلتے اور نہ ہی لفظ کو معنی سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جدیدیت کا مجنونانہ جوش و خروش جو اکثر و بیشتر اہمال سے اہمال تک ہی تگ و دو میں مصروف نظر آتا ہے، ازبر میں کہیں نہیں ملتا ؂

اہمال کے بھی ہم قائل ہیں اہمال اگر اہمال رہے
ابہام بھی خوبی ہے لیکن اہمال صفت ابہام نہ ہو

گرد و پیش، عصری تقاضے اور اقدار شکست و ریخت لمحہ بہ لمحہ بدلتے حالات سے حیرت متحیر ہو کر، دم بہ خود ہو کر دیوانہ وار ولنذیزیت پر نہیں اترتے۔ چستانی اظہار و بیان سے اپنی فضائے شعریت کو آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ حیرت کا کلام تعدد معنویت (PLURISINGNATION) سے معمور، اظہار و ترسیل کے صاف ستھرے ذرائع سے بھرپور اور تہ در تہ خیالات و محرکات سے پر نور ہے اور رہے گا۔ وہ ہنر شناس ہیں۔ اور ایسے ہنر شناس جو تحسین ناشناس سے دور، بہت دور رہتے ہیں۔ ازبر کو سرسری نظر سے دیکھئے یا بالاستیعاب آپ کو دلکش اشعار صفحہ صفحہ پر نظر آئیں گے۔ ہر شعر مزید توجہ کا تقاضا کرتا ملے گا ؂

قدم بیباک تر نہ در حریم جانِ مشتاقاں
تو صاحب خانہ آخر چرا دزدانہ می آئی

یعنی قاری ہو یا سامع، حیرت کے شعر شعر میں اپنے خیالات کی بازگشت سنے گا۔ ایوانِ کلامِ حیرت میں قاری خود کو بحیثیت صاحب خانہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ "ازبر" میں جو

مگر کب تک ......

بلراج حیرت

یہ بے ہنگم لکیریں
مرے کچھ وحشی بزرگوں کی کھینچی حدیں
میں جن کے درمیاں اِک شب کسی فٹ پاتھ کے سینے پہ بکھرے
چرمراتے زرد پتّوں میں ہوا پیدا
اُمیدیں مجھ سے رکھتی ہیں
کہ میں ان کے تحفظ میں
کچھ اپنے جیسے لوگوں کو فنا کر دوں
لہو اپنا بہا دوں جان بھی قربان کر دوں
اُن کی عزّت میری عزّت ہو
میں اُن کے واسطے زندہ رہوں فٹ پاتھ پر سو کر
برہنہ جسم ہر موسم سے لڑ کر
کوڑے دانوں میں پڑی جوٹھن کو کھا کر
اور آخرکار جب وقت آئے، ان پہ جان دے دوں
ان کا وعدہ ہے کہ فوراً میری قسمت کا ستارہ جاگ اُٹھے گا
بصد تعظیم میرا نام آئے گا وطن کے جاں نثاروں میں
مری تصویر ہر ایوان میں ہوگی
مری برسی پہ لنگر خانے کھولے جائیں گے، کپڑے دیئے جائیں گے بچّوں کو
مگر اس وقت تک میرا مقدر ہیں
یہی فٹ پاتھ، ننگا جسم، کوڑے دان کی جوٹھن
اسی صورت میں تب تک ایڑیاں رگڑوں
مزے کرتے رہیں وہ جن کے منھ سے یہ مجھے آواز دیتی ہیں
مگر کب تک؟

بے ٹکٹ مسافر

کیا آپ جانتے ہیں ؟

بے ٹکٹ سفر صرف سماج مخالف عمل ہی نہیں اسے سنگین جرم بھی مانا جاتا ہے۔

اگر پکڑے گئے تو نتیجہ بھی سنگین ہوتا ہے۔ ۵۰۰ روپے تک

جرمانہ ورنہ تین مہینے کی

سزائے قید

بے ٹکٹ سفر کے خاتمے کے لئے نگرانی بڑھائی جا رہی ہے۔

اب خود ہی سوچئے کہ کیا یہ اچھا ہے

بے ٹکٹ سفر قوم کے لئے، سماج کے لئے اور خود آپ کے لئے بھی مضر ہے۔

سفر کرنے سے پہلے ٹکٹ لینا ہرگز نہ بھولئے

پوربی ریلوے

دیوبند دھگوانتم

اعتماد

میں سمجھتا تھا کہ تم
میری مشعل کی روشنی کے لئے
اپنا ہمر ہوگے
لیکن تم نے دھیرے دھیرے میرے چاروں طرف
اندھیروں کا بیکراں جال بچھانا شروع کیا
اور چاہا کہ میں اپنے ہاتھوں کی مشعل کو پھینکدوں

اور

تمہارے نقشِ قدم پر چلتا ہوا
اسی جنگل میں روپوش ہوجاؤں
جس میں تمہاری عظمتوں کی بوسیدہ سی مہک جاگتی ہے
کھلتے ہوئے پھولوں کے نوخیز جسم کو
اپنے نوکیلے اور زہریلے ناخونوں سے کھرچ رہی ہے
تمہیں کیا پتہ تھا کہ اچانک میری مشعل سے ہزاروں چنگاریاں ابھریں گی
اور جو لہراتی ہوئی
تمہارے بچھائے ہوئے جال کی ہر گانٹھ سے جاکر الجھ جائیں گی
تم گھبراکر اپنے چاروں سمت نگاہیں دوڑاؤگے
اور دھیرے دھیرے اپنے قدموں کی زمین کو
کھسکتا ہوا پاؤگے ▲▲

پرانی نسلوں سے ....

سرخ اور زرد لمحوں کی کشمکش نے
جب جب تمہارے وجود کی اونچی عمارت کو
کھنڈروں میں تبدیل ہوگیا
اور جب جب تمہارے چہرے پہ
آڑی ترچھی ریکھاؤں کی سلطنت قائم ہوئی
تم ہمارے قریب آئے
اور اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے
ایک بوسیدہ سی گٹھری کو ہمارے نوخیز کندھے پر رکھ کر مطمئن ہوگئے
تم نے کہا " اس میں وہ لعل و گہر ہیں
جن کی چمک راستوں کے پیچ و خم کو
اب تک ہماری رہنمائی کرتی آئی ہے
اب تمہارے کام آئے گی
صدیاں گذر گئیں
ہم تم نہ جانے کتنی بار ملے
اور نہ جانے کتنی بار ہم نے تمہارے حکم کی تعمیل کی
لیکن دھیرے دھیرے تمہارے لعل و گہر
کھردرے پتھروں کی شکل اختیار کرنے لگے
اور ہر پتھر پر ثبت ہوتی گئی
غلامی کی ایک لمبی داستان
اب تو اس بوسیدہ گٹھری سے بدبو بھی آنے لگی ہے
اسی لئے اپنی رہنمائی کے لئے اس بار ہم نے
اپنے ہاتھوں میں اٹھالی ہے ایک جلتی ہوئی مشعل
اور اس مشعل کی روشنی کے سہارے ہم نے
اندھیروں کی طلسمی سستا کے خلاف بغاوت کا نعرہ بلند کیا ہے
ممکن ہو تو تم بھی
پرانی عظمتوں کے بوجھ کو
طاق پر رکھ دو
اور ہمارے ہاتھوں کی مشعل کی روشنی کے لئے
اپنا لہو دو ....

شاہد رحیم

آوارگی

یہ زندگی کے کر و فر
خاموش لوں کے سفر
بے خود اور کچھ تلخ تر لمبا سفر
جس کی تھکن : ملال نشہ : آوارگی

یہ ابتدا ۔ خوابوں میں گم ایک بحر و بر
بھیگی نظر، کچھ جلوہ گر تعبیر کے پیکر اگر
الفت کا گھر : گھر کا پتہ : آوارگی

وسط فضا ۔ رستے وہی، گلیاں وہی
پتے وہی، کلیاں وہی ۔ چہرے وہی
چہروں پہ تھا عکسِ وفا : آوارگی

پہلا قدم ۔ بالکل نیا، لیکن بھرا
عشق و وفا، جلوہ نما ۔ شرطِ وفا
ان کی ادا : میری خطا : آوارگی

اگلا قدم ۔ جور و جبر، دیوار میں
اور جا بجا افسانہ میں ۔ ماضی کا کیا
وہ تو گیا : اس کی چبھن : آوارگی

وہ انتہا ۔ کہ تیز تر، لمبا سفر
اور تیرا اک جائزہ ۔ اک تجزیہ
کچھ تجربہ اور تجربہ : آوارگی

منزل ملی ۔ چہرے ملے سب روبرو
کچھ تم کچھ ہم، کچھ کو بہ کو ۔ اک رنگ و بو
اک زندگی : اک دائرہ : آوارگی

اک سلسلہ ۔ چلتا رہا بس دو بہ دو
زیر و زبر گردش کا سفر ۔ ظلمت کے شب
شب بھر کا غم : عمر کی سزا : آوارگی

منصور اعجاز

موت

سنا ہے ایک دن ایسا بھی لمحہ آئے گا
ستارے، چاند، یہ سورج اور آسمان کے ساتھ
زمیں، پہاڑ، سمندر، چرند اور پرند
ہر ایک چیز کو مل جائے گی فنا سے نجات
میرے سرہانے کھڑے ہیں میری بیوی بچے
عزیز دوست، محبت کی ڈالے زنجیریں
یہ رشتے ناطوں کی مضبوط کتنی دیواریں
مگر یہ نبض کہ ہر لمحہ ڈوب جاتی ہے
اندھیرا ہے کہ جو بڑھتا ہی چلا آتا ہے
پھر ایسا لگتا ہے.....
یہ رشتے ناطوں کی دیواریں ساری زنجیریں
یہ بیوی بچے مرے، ڈاکٹر یہ سارے عزیز
سب میرے ساتھ فنا ہوتے جاتے ہیں جیسے
اسی کا ذکر کتابوں میں تھا پڑھا میں نے
یہ کیفیت ہی بزرگوں سے تھی سنی میں نے
"یہی وہ دن ہے قیامت کا جو تصور ہے"

وحشی نسل

آج سے دو تین برس کے پہلے بھی
بہت اونچی اڑان بھرتے ہوئے
اک پرندے کی خوشنما تصویر
میں نے کاغذ پہ جب بنائی تھی
میرے ہم عمر ساتھیوں نے اُسے
نوچ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا
آج پھر ۔ یونیورسٹی کے بعد بھی جب
حوصلے پھیلنے کو، رنگ بھرنے کو
زندگی کے حسین خاکوں میں
مجھ کو روکا گیا، رکوایا گیا.....
حوصلوں میں دراڑ ڈالی گئی.....
نیک مقصد میں آڑ لائی گئی.....
میری انسانیت، مری تعلیم :
رائیگاں جاتی دیکھ کر میں نے
چند پتھر اٹھائے اور پھینکے
شیشوں کے ٹوٹنے کی آوازیں
اور بکھرنے کے کرب سے مجھ کو
ذہن کو اور روح کو بھی میری
جیسے صدیوں کا چین ملتا تھا
مرے استاد رہنما میرے
کس قدر ڈانٹنے لگے مجھ کو
کیسی نفرت سے دیکھتے تھے مجھے
کہ میں وحشی ہوں، جانور ہوں کوئی

ہاں میں وحشی ہوں، جانور ہوں
اگر.......
مجھ کو تعمیر سے جو روکو گے
اس کا ردِ عمل ہے یہ تخریب
یہ تمہاری ہماری نادانی ..

علیم حیدر شررؔ

غزل

تہی سے خود مری حاجت قلیل تھی!
ہاتھوں میں جب کتاب دعائے جلیل تھی

اب ان میں پتھروں کے سوا کچھ نہیں رہا
جن وادیوں میں چاند نہاتا تھا جھیل تھی

یوں اپنا جائزہ بھی لیا ہم نے ایک عمر
اپنے تجربات کی مدت طویل تھی

سوتے رہے تو خواب کا عالم تھا رات بھر
آنکھیں کھلیں تو سر پہ انا کی فصیل تھی

کی پتنگ کٹ کے مری چھت پہ گر پڑی
کھینچا تھا اس نے جب مری ڈوروں میں ڈھیل تھی

کیسے کہوں کہ پیاس کی شدت سے مر گئے
وہ لوگ جن کے شہر میں جوئے سبیل تھی

عہد ہے کہ فکر کی روشن ہیں مشعلیں
دور تھا کہ صرفِ نظر خود کفیل تھی

جب "زندگی" کو آخری منزل سمجھ لیا
ہم پر کھلا کہ یہ تو فقط سنگِ میل تھی

میں اپنی زندگی کی سند دے گیا شررؔ
دنیا جہان پہ نبردِ ثبوت و دلیل تھی

بسمل قریشی

چند خوابوں کے گھروندے پھر بہا لیجائیگی
وقت کی سفاک ندی اور کیا لیجائیگی

خود کو کب بچائیگی ہواؤں سے کلی
صبح تک تو لوٹ کر خوشبو صبا لیجائیگی

آئینوں کی زد پہ آجائیگا جب عکسِ بدن
تک کی سب شوخیاں شرم و حیا لیجائیگی

زندگی محرومِ جاوید ہو جائے اگر
لامکانی ہونٹ سے حرفِ دعا لیجائیگی

ناگہاں کے دریا میں یہ پتوار جھوٹی آس کے
ناخدا کشتی کو تو ساحل پہ قضا لیجائیگی

نئی کونپل نکلنے کا زمانہ آگیا
نئی پتہ شجر کا جب ہوا لے جائیگی

نیاز اختر

کھائے ہیں ہم نے زخم جگر پر جگہ جگہ
ملتے نہیں ہیں ایسے ہنرور جگہ جگہ

ان کرچیوں کو پاؤں کے چھالے نگل گئے
شیشے پہ دل کے برسے تھے پتھر جگہ جگہ

زندہ توہمات کے نرغے میں ٹھہر کر
اُگنے لگے ہیں وہم کے خنجر جگہ جگہ

آنکھیں اجڑ گئیں تو کوئی بات بھی نہ تھی
ایکے جھلس کے رہ گئے منظر جگہ جگہ

اُس خوشنما پرند کی ملتی نہیں جھلک
جنکے بچھے ہوئے ملے شہپر جگہ جگہ

اختر سا کوئی پھر بھی نہیں ذہن تازہ کار
بوسیدہ ہو رہا ہوں میں اندر جگہ جگہ

عقیل گیاوی

شب گزیدہ خواب مجھکو آسماں لیجائیگا
یہ جنوں کا راستہ جانے کہاں لے جائیگا

بے حسی کی نذر ساری کشتیاں ہو جائینگی
وقت کا جھونکا اڑا کر بادباں لیجائیگا

زخم رہ جائیگا باقی اور دردِ زندگی
مسکراتی ساعتوں کا سائباں لیجائیگا

خوشبوؤں کے دوش پر خوابوں کا پیکر ہو جہاں
اس نگر تک کون اپنے جسم و جاں لیجائیگا

کچھ تو زخموں کے نشاں ہونگے بطور یادگار
وقت کا طوفان کیا سارا جہاں لیجائیگا

خود بخود ہو جائیگا قاتل کا چہرہ بے نقاب
خوف کی پرچھائیاں کوئی [illegible] لیجائیگا

علیم صبا نویدی

پاؤں گردوں پہ زمیں پہ سر رہا
چار سو برپا عجب محشر رہا
جس کی نورانی فضا ہے بے نظیر
شہر ایسا بھی مرے اندر رہا
آج لوٹا ہوں میں باطن کی طرف
اک زمانہ مجھ سے میں باہر رہا
مرے ہاتھوں آئینہ سچائی کا
اس کے ہاتھوں جھوٹ کا پتھر رہا
ہاتھ خالی، بھاگ میلا ہے مگر
مجھ میں پوشیدہ کوئی جوہر رہا
رات بھر میرے سفر کے جسم کا
چاندنی کی گود میں بستر رہا
پھول پتے پیڑ سے کیا جھڑ گئے
وحشتوں کا دور تک منظر رہا
جنبیت جس کو لے ڈوبی صبا
تذکرہ اس شخص کا گھر گھر رہا

قاضی انصار

اب تمہارے ہیں نہ یہ ہمارے ہیں
بھولے بسرے جو دن گذارے ہیں
دے کے ہم امتحان محبت کا
زندگی جیتنے کو ہارے ہیں
اس طرح کائنات پھیلی ہے
چند آنکھیں ہیں اور نظارے ہیں
درحقیقت ستم ظریفی ہے
ایک دریا کے دو کنارے ہیں
رشک سے آسماں پر نظر میں
ان گنت ان گنت ستارے ہیں
ہم نے جانِ سخن ترے دل میں
کاروانِ غزل اتارے ہیں
راز ہوتے گئے ہیں سب روشن
جب بھی گیسو ترے سنوارے ہیں
بخت انصار کا عروج پہ ہے
اسکے حق میں سبھی ستارے ہیں

سعید نعمانی

جتنی گنجان بستیاں ہونگی
کوچہ کوچہ اداسیاں ہونگی
یاد اس کو مری جب آئے گی
پھول ہوں گے کہ برچھیاں ہونگی
اور کیا ہوگا میرے نام کے ساتھ
اس کے ہونٹوں پہ تلخیاں ہونگی
آؤ ماضی کے سمت لوٹ چلیں
حال ہوگا نہ دوریاں ہونگی
ذہن میں ہوگا پھول سا چہرہ
ہر طرف میرے تتلیاں ہوں گی
چھپ سکیں گے نہ ان کے اجیارے
جن مکانوں میں کھڑکیاں ہونگی
کیا خبر تھی کہ جن درپچوں میں
پھول ہوتے تھے بجلیاں ہونگی
دوریوں میں بھی قربتیں ہوں گی اے سعید
قربتوں میں بھی دوریاں ہونگی

نسیم محمد جان

ایک پرانی کہانی

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ موتی اسی سڑک کے کنارے پیدا ہوا تھا اور اسی سڑک پر لوٹتے پوٹتے دوڑتے بھونکتے جوان ہوا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا پیٹ بھر کھا لینے کے بعد بھی کچھ روٹیاں میری رکابی میں بچ جاتیں۔ میں اس کے سامنے ڈال دیتا۔ وہ دم ہلا ہلا کر میرا شکریہ ادا کرتا۔ کبھی کبھی مخزون آنکھوں سے میری طرف دیکھتا ہوا اُن ہڈیوں کو توڑتا جو مجھ سے نہ ٹوٹتی تھیں۔ میری جانب جب بھی دیکھتا اس کی سفید آنکھیں مایوسی بھرے لہجے میں کہنے لگتیں۔ "یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ ساری زندگی پیدائش ——— موت تک ایک سڑک پر گذر جائے" یہی ایک جملہ سنتے سنتے میں اکتا گیا اور ایک دن جب وہ دم ہلا ہلا کر اپنی مایوس آنکھوں سے مخاطب ہوا تو میں نے کہہ دیا۔

"موتی! کیا ہوا اگر جوٹھے کھانے کے لئے تمہیں
دم ہلانے کی ضرورت پڑتی ہے
جب
چاہتے ہو....... آزادی سے بھونک لیتے ہو۔
اسے کم نہ سمجھو....... بھونکنے..... کی
آزادی پر جس قدر فخر کرو کم ہے۔ یہ تو جان سے
بھی زیادہ عزیز رکھنے کی چیز ہے۔"

موتی کھانا چھوڑ کر خوشی کے مارے اچھلتا بھونکتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا اور میں سوچ رہا تھا شاید موتی کی سمجھ میں میرا ہر لفظ آ گیا۔ شاید زندگی میں پہلی بار اس نے محسوس کیا کہ اس کے پاس بھی ایک بیش قیمت شے ہے جس پر وہ سر اٹھا کر بھونک سکتا ہے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ موتی کے بھونکنے کی آواز آنے لگی۔ دور سے آتی سڑک پر ایک ہاتھی جھومتا ہوا نظر آیا۔ موتی اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مستقل بھونکے جا رہا تھا۔ مگر نہ ہاتھی کی چال ہی میں کوئی فرق آیا۔ اور نہ اس نے نظریں اٹھا کر ہی دیکھا کہ یہ بھونکنے والے کون ہیں۔ بہرحال تک کر ہاتھی اور بھونکنے والا قافلہ میرے قریب سے گذر گیا کچھ دیر کے بعد موتی سر جھکائے میرے پاس آیا۔ بھونکتے بھونکتے شاید تھک گیا تھا۔ پچھلی ٹانگیں سمیٹتا ہوا۔ اگلی ٹانگیں سامنے پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اپنی لمبی زبان نکالے مجھے مستقل دیکھے جا رہا تھا جیسے پوچھ رہا ہو۔

"اس بھونکنے کی آزادی سے فائدہ؟"

مشرف عالم ذوقی
نہادیوار دلی۔ آمدہ

بھکاری نگر

(۱)

کہانی کی شروعات کہاں سے ہوئی۔ شاید تین چار روز پہلے۔ ہمارے حلقۂ احباب میں لیبن سیٹھ کا لڑکا بھی تھا جس کی کپڑے کی کئی میلیں تھیں۔ واقعہ شاید وہیں سے شروع ہوا ..... ایک دن معلوم ہوا لیبن سیٹھ کی کسی مل میں آگ لگ گئی اور کافی نقصان ہوا۔ بات جو بھی رہی ہو ..... گرمی کے اس جلتے موسم میں ہم اس کے ائرکنڈیشن کمرے میں بیٹھے اظہارِ افسوس کر رہے تھے اور اس کے شگفتہ قہقہے کمرے میں گونج رہے تھے کہ اچانک بھکاریوں کا ایک قافلہ برآمدے میں آکر ٹھہر گیا۔ ان میں ایک نوجوان بھی تھا جس کے داہنے پیر میں لنگ تھا جو ایک لاٹھی تھامے تھا اور اس قافلے کا سرغنہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی عجیب فرمائش کی اور معصوم لہجے میں لیبن سیٹھ کے لڑکے سے گویا ہوا ..... اسے کپڑوں کی تجارت کرنے والے! ہمیں بھی کچھ کپڑا عطا ہوا ..... کہ ہمارے پاس بھی دھوپ کو محسوس کرنے والا اور سردوں میں ٹھٹھرنے والا ایک بدن ہے جو کپڑوں کا محتاج ہے ..... اور اس کی آواز کا ٹھہراؤ اور لہجے کی مضبوطی اچانک ہی ہمیں گونگا کر گئی ..... اس قافلے میں کچھ عورتیں بھی تھیں ..... کچھ کمسن بھکاری بچے بھی کچھ بوڑھے بھی ..... اور کچھ جوان بھی ..... کچھ پہننے والے بھی تھے جنہیں ان کے عزیز تھامے ہوئے تھے اور یہ قافلہ لیبن سیٹھ کے عظیم الشان محل کے وسیع و عریض صحن میں ممتاز و نادر دیکھے جانے والا ایک بڑا عجیب منظر پیش کرتا معلوم ہو رہا تھا ..... لیبن سیٹھ کا لڑکا کچھ دیر تک فرمائش

انداز کی شیرینی میں ڈوبتا ابھرتا ہے یا پھر ہم سے دریافت کیا ..... تم لوگ اسے کیا نام دو گے؟"

"ایک خوبصورت آواز۔ ایک خاموش احتجاج" ہم آہستہ سے بولے ..... "تبدیلیاں بہرحال تبدیلیاں ہیں"۔

"یہ لوگ کسی کلچرل سوسائٹی کی بنیاد ڈالنے والے ہیں ایسا لگتا ہے" لیبن سیٹھ کا لڑکا ہنسا۔

"تجربوں نے زندگی کو معنی عطا کیا ہے ..... یہ لوگ بھی زندگی کے تجربوں میں داخل ہو کر تہ در تہ ہو گئے ہیں ....

"یعنی فلاسفر؟" لیبن سیٹھ کا لڑکا یکبارگی پھر ہنس پڑا۔

"زندگی کے بہت سارے فلسفوں کے درمیان ہم مجمع السوالات ہو گئے ہیں ..... اور یہ کسی کی کمزور پیٹھ پر پھینکے گئے بہت سارے پتھروں اور ان سے پیدا ہوئے بیشمار سوالوں کے درمیان فلسفہ ہو گئے ہیں ..... اور یہ فرمائش بھی انہی سوالوں کے کوکھ سے پیدا ہوئی ہے"

"یہ کورا فلسفہ ہے اور کچھ بھی نہیں" لیبن سیٹھ کا لڑکا بولا ..... ہم چپ ہو گئے۔ آگے کیا کہتے کہ دریوزہ گری سے پرے جھانک کر دیکھو کہ یہ آواز نہیں بلکہ احتجاج ہے کہ ہماری دھوپ تمہاری دھوپ سے سوا ہے۔ تمہارے ائرکنڈیشن کمرے کی ٹھنڈک ہماری جھونپڑیوں میں نہیں جاتی مگر تمہاری گاڑیوں کے شور اکثر ہمارے جھونپڑوں میں داخل ہو کر ہمارے بدن کی عمارت کو ہلا دیتے ہیں مگر نہیں ..... ہم نہیں کہہ سکے ..... اور اس درمیان بس اتنا ہوا کہ لیبن سیٹھ کا لڑکا آہستہ سے اٹھا پھر ان

کے قریب گیا اور اپنی چنگھاڑتی آواز سے گویا ہوا .....
"پہلے تم لوگ ایک روٹی کا خواب پورا کرو ...... پھر کپڑوں کے لئے آنا ...... پھر کپڑوں کے لئے آنا ......!!"

نوجوان کچھ دیر تک اپنی جگہ کھڑا رہا ——

اور جانے کیسے مجھے اس کی آنکھ میں ایک منجمد منظر آیا جس میں ایک لمبا قافلہ اٹھا ہوا تھا۔ سمندر کے بیچ و بیچ لیتیں سیٹھ کا ..... یہ عیش محل تھا اور ان کے کمزور ہاتھ اچانک مضبوط ہو کر سنگ باری پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس قافلے میں ایسے بھی کئی تھے جو چار پہیوں والی گاڑی کے ہمراہ تھے ...... ایسے بھی کئی تھے جن کے جسم زخموں سے بھرے تھے ......

اور شاہراہ سے گزرتے لوگوں نے زندگی میں شاید پہلی بار —— پہلی بار ایک بہت عجیب جلوس اور بہت عجیب منظر دیکھا تھا ......!"

(۲)

پھر مجھے وہ نوجوان بستی سے کچھ دور نظر آیا جہاں وہ اپنے قافلے کی آنکھوں میں زہر بھرا سوال بن کر داخل ہو رہا تھا ——

"مجھے حیرت ہوتی ہے ..... جب تم لوگ الگ الگ بٹ جاتے ہو ..... اور الگ الگ خونخوار انسانوں کی دلیل نفرت کو اپنے کمزور جسم میں پیوست کرتے ہو ..... میری طرف دیکھو ..... ان آنکھوں میں بے رحمی اُگ آئی ہے ..... کیونکہ یہ تمہاری ستائی ہوئی اور نفرت سے سوجی ہوئی آنکھیں بن گئی ہیں۔"

اور اس بے زبان مکالمے کے بعد وہ شخص دروازہ گر توم کی آنکھوں میں اترتا چلا گیا...

"تم میری بات سمجھے؟"

"شاید نہیں۔"

"میرے پیچھے پیچھے چل سکتے ہو؟"

"وہاں کیا ملے گا؟"

"روٹی کا خواب۔" نوجوان کا مضبوط جواب تھا

"اور ڈھیر سارے سکے۔"

اچانک آنکھوں میں چمک جاگ اٹھی اور پہیوں والی گاڑی پر بیٹھے ہوئے بہت سارے بھکاریوں نے محسوس کیا کہ ان کے گوشت لگے ہوئے ہاتھوں کی مٹھیاں اچانک

بہت سارے سسکتوں کو محسوس کرکے بند ہوگئی ہیں......
اور نوجوان کی آنکھوں میں ایک خواب لہرایا......
وسعت میں ایک ایسی خواب خواب بستی لہرائی جو دور دور تک آشنا لوگوں سے بھری پڑی تھی جہاں زخموں میں چور دریوزہ گر اپنوں میں سمٹے زندگی کی معنویت کا سراغ حاصل کر رہے تھے...... سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے ہی کنول تھے کہ اپنی اس الگ تھلگ بستی کا خواب آنکھوں میں جانے کب سے پک رہا تھا...... آہ سب کچھ کتنا اچھا لگ رہا ہے......

نوجوان! اس جنت کے حقدار تم ہو...... تم ہو......
مگر اس شور سے بے نیاز اُس کی آنکھوں میں کیسے کیسے خون آشام منظر رینگ گئے...... میرے وجود میں کیڑے رینگ گئے ہیں...... اللہ میں بس ایک تباہی کا منتظر ہوں......

(۳)

بستی بسے دن ہی کتنا ہوا مگر نوجوان نے اس قافلے میں شامل ہو کر ایک خواب دیکھا تھا۔ بھکاریوں کی ایک اپنی الگ بستی ہے...... بستی کا ایک الگ تھلگ ماحول ہے...... اور ماحول میں زندگی کے نام پر ہو رہے قہقہے، شور شرابے سے گونجتے بکھر رہے ہیں......
بستی بسنے سے قبل اس نے ایک کمسن بھکارن سے پوچھا تھا...... ہمارے یہاں زندگی کے نام پر ہونے والے رشک آمیز ہنگاموں کا فقدان کیوں ہے؟"
"تمہاری بات سمجھ میں نہیں آتی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی
اس کی مسکراہٹ اُسے بہت اچھی لگ گئی۔ وہ بولا......"تم اچھی لگتی ہو تو یہ بھی زندگی کے ہی صیغے میں آتا ہے۔"

نوجوان نے اُسے باہوں میں بھر لیا۔ وہ چلی آئی
بہت پہلے میرا بھی ایک گھر تھا مگر دہشت پسندوں نے اس گھر میں آگ لگا دی۔ گھر جل گیا۔ اور مرتے ہوئے باپ کی چیخیں الماری کے پاس چھپے بچے کے منہ سے جسم میں داخل ہوتی چلی گئی۔ تم نے کبھی کوئی ایسا خونی نظارہ دیکھا ہے...... شہر کو جلتے دیکھا ہے...... زندگی کو آگ میں جھونکتے ہوئے دیکھا ہے...... اگر نہیں...... تو تم نے زندگی کے نام پر کوئی سچ کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ میرا گھر شعلوں کی لپیٹ میں ماں باپ کی دلخراش چیخوں سے گونج رہا تھا۔ پھر میری کتابوں والی الماری جلتی ہوئی میرے وجود پر آگری...... چھتوں سے شعلے نکلے اور چھت بیٹھ گئی...... اور میری وحشیانہ چیخ، صبر آزما ماحول سے گزرتی ہوئی جانے کتنی چیخوں میں ضم ہوگئی......" میرا پیر......
نوجوان نے اپنے لنگ کو محسوس کیا...... آنکھوں میں دبیز کائی ابھر آئی...... سچ کے نام پر وحشت کا عجیب سلسلہ اور موت کا عجیب رقص شروع ہوتا ہے' خیر کاش کہ تم پڑھی لکھی ہوتیں تو ایک پڑھے لکھے کے جذبات کو سمجھ پاتی...... تمہارا قافلہ ایک لٹا ہوا اور بیزار قافلہ ہے۔ میں نے اسی لئے تمہارے قافلے کو پسند کیا اور شامل ہوگیا۔
"تم اور کیا کرتے......؟"
"اور کیا کرتا...... لنگڑا اور کیا کرتا...... ایک پاؤں کے سہارے پھر گھر تعمیر کرتا تو گھر میں پھر آگ لگا دی جاتی...... اس لئے زندگی کے نام پر ایک ہی بات سمجھ میں آئی کہ یہ زندگی اگر اوپر والے کی بھیک ہے تو ہم سب اس کی بھیک ہوئے۔ بس بھکاری کہلائے اس کی سلطنت کے...... کچھ بھکاریوں کو زیادہ رزق دیا کچھ کو کم...... اس لئے کون بھکاری قوم کے یہاں جن کے گھر سکوں کے اناج سے بھرے پڑے ہیں۔ کچھ کے بطور اطمینان بینا جرم نہیں...... اور بس یہ کاٹنے والی زندگی کاٹ دی جائے کہ کب وہ اپنی بھیک واپس لے لے گا...... کیا کہا نہیں جا سکتا......
بھکارن اُس کے مضبوط سینے میں سمٹ گئی......
بہت پہلے میں نے بھی ایک خواب دیکھا تھا۔ مگر وہ خواب تنگ کے ساتھ میرے اندر کے زخم میں بھی اسی سمندر میں گیا۔ اب خواب سے گھن آتی ہے"

ڈنڈا تھام لیا۔

شام ابھی آئی بھی نہیں تھی اور اس وسیع و عریض .... شہر کے دور دراز علاقے کے صحن کو جسے عرفِ عام میں بھکاری نگر کے نام سے شناخت کر لیا گیا تھا..... قافلے ایک ایک کر کے سمٹنے لگے تھے ...... کچھ جھونپڑیاں تعمیر ہو گئی تھیں .... کچھ پھٹے ہوئے خیمے بھی گڑے ہوئے تھے۔ کچھ چارپائیاں ادھر ادھر بچھی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ برتن چاروں جانب ادھر ادھر بکھرے تھے .... پہیے والی گاڑیاں ایک طرف رکھ دی گئیں۔ شام کے بستر پر تھکی ماندی زندگی سو گئی۔ اور نوجوان کی آنکھوں میں تہذیب کا یہ خوبصورت وقت کہنہ یادوں کا سیلاب لوٹتا چلا گیا..... اور یہ سلسلہ اس کی دکھتی کمر درد کا ایک حصہ ہو جاتا کہ وہ آہستہ سے اٹھا اور آئے بھکاریوں کی خیر و عافیت دریافت کرنے میں لگ گیا...

"تم مطمئن ہو کہ تمہیں ایک پیٹ فارم مل گیا ہے۔ اور تمہاری شکست خوردہ زندگی کو ایک سلیقہ عطا ہوا ہے ......"

"تم بڑی بڑی باتیں کہتے ہو نوجوان" پہیے دار اسے ایک بوڑھے نے گمبھیرتا سے کہا۔

"باتیں بڑی نہیں ہوتیں ..... تجربے بڑے ہوتے ہیں۔ گہرے ہوتے ہیں کاش کہ تم اپنے اندر اترنے کا اور باتیں کھینچ لانے کا سلیقہ جان رہے ہوتے ..... ؟"

"پھر کیا ہوتا؟"

"پھر؟"

نوجوان کے چہرے پر اچانک بدلی چھا گئی ہے ...

چہرے کا رنگ بدل گیا ہے.... عجیب سی بدلی چھا گئی ہے ...... ڈنڈا ٹیکتے ہوئے وہ اس قافلے سے بالکل الگ تھلگ جا رہا ہے ...... پھر کیا نہیں ہوتا ..... تمہاری جماعت کے ہمراہ میں دنیا والوں کو بتاتا کہ تم بھی بھکاری نگر سے الگ نہیں ہو سکتے ...... تم سب بھکاری ہو..... اور میرا جلتا ہوا گھر میری آنکھوں میں لہو لہو اتر جاتا ہے ...... ہم سب بھکاری ہیں ..... نگر سے الگ نہیں رہتے ...

تم سب بھکاری ہو ...... اور میرا جلتا ہوا گھر میری آنکھوں میں لہو لہو اتر جاتا ہے ...... ہم سب بھکاری ہیں ......

اور پھر ایک منظر رینگتا ہے ...... دنیا خوف میں سمٹ گئی ہے ...... آگ کے بڑے گولے سرزمین پر رقص کناں ہیں.. ...... پھر دھماکوں کے درمیان وہی لنگڑی نسلیں نوحہ کناں ہیں ...... کوئی گھر سلامت نہیں ہے ..... اور اس وسیع و عریض صحن کے باہر کا علاقہ بڑھتا جا رہا ہے .. .. ٹھنڈک بڑھ گئی ہے ...... اور بساط عالم پر خوف کے پہرے چھا گئے ہیں ...... اور شیو سینا کے سپاہی مورچے لے رہے ہیں ...... ایک جیکٹ دھاری چیخ رہا ہے مسلمان اس دیش کے لئے کینسر ہیں۔ آزادی سے پہلے یہ کینسر اس ملک میں اس قدر نہیں پھیلا تھا۔ اب پورے ملک میں چھا گیا ہے۔ آپریشن ضروری ہے .....

نوجوان ٹھہر گیا ہے ..... عبدل تم بھی کینسر ہو ....

جبرائی خیال ..... تم بھی کینسر ہو ......

اور شاید وہ بھی ......

اچانک بعورد بیجنے پر اسے نظر آیا..... یہ شخص وہی ہے جو برسوں پہلے اسے ایک زخم دے کر گیا تھا — شعلوں میں گھرے گھر کے اندر ایک بچے کو چھوڑ گیا تھا ...... بھکاری بننے کے لئے ......

(۴)

نوجوان خوش ہے ..... آج وہ شہر سے جلد ہی بھکاری نگر میں لوٹ آیا ہے ..... شاید سب ہی لوٹ رہے ہیں ..... فضا خراب ہو گئی ہے ... جانے کہاں سے سڑک پر پڑا ہوا ایک اخبار ہاتھ آ گیا ... صورت حال کے نام پر وہی لہو لہو سرخیاں اس کی آنکھوں تلے اندھیرا بن کر داخل ہو گئیں ..... چند انجانی طاقتیں اس ملک کی جانب بڑھتی ہی چلی آ رہی ہیں .. .. شعلوں نے سارے ملک کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے ...... اور اب بساط عالم پر بھی یہ شعلے پھیل

ہنا وہ سپی گیا

ے ہیں ...... ہم سب کینسر ہیں ...... نوجوان کے
لاک مشکلات شو رگونجے ...... شیو سینا کے سپاہیو ...
ہم سب کینسر ہیں ......
تم بھی کینسر ہو ......
میں ایک وسیع و عریض ...... دنیا کے نقشے پر
پھیلا ہوا صحن دیکھ رہا ہوں جہاں اس کے سارے بھکاری
ہی سطح پر ناچ رہے ہوں ......
جیمز آئی میاں ......
عبدل ......
آؤ ...... آؤ ...... آج میں ہوں والی گاڑی پر
... جتنا چاہو تمہیں گھمانے کے لئے تیار ہوں ...... مگر
.... کھہرنیں تو کر ایہ زیادہ ہے ......

(۵)

کرفیو اٹھ چکا ہے ......
ویران ویران سڑکوں پر بے وقت کے چہل پہل نظر
آ رہی ہے ......
نوجوان اداس ہے ...... دور تک پھیلی ویرانی
رعام کا ایک حصہ بن گئی ہے ...... چہل پہل کے
وجود چہروں پر ایک انجانا خوف طاری ہے ......
" بھائی صاحب ! یسین سیٹھ کا یہاں مکان ہوتا
تھا ...... اب ؟ "
یسین سیٹھ تو مکان کے جل گئے۔ فسادیوں نے سب
ختم کر دیا۔ صرف ان کا بیٹا زندہ رہ گیا ہے ......
پاگل پن کی حالت میں لوگوں کو کاٹنے پھرتا ہے ....
نوجوان کی آنکھیں جھک گئی ہیں ....
ٹھیک اسی وقت منظر کی آغوش میں پھر ایک نعرہ
ا...... ایک پاگل دوڑتا ہوا بھکاری نوجوان کے
با آ کو چھینے لگا ...... نوجوان کی آنکھیں پاگل کے پیچھے
ل سے جھانکنے ...... خون آلودہ جسم پر جھک گئیں ...
۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے کرتے کی جانب گیا ......
نے کیا ہوا کر دوڑتا ہوا ایک جگہ غائب سی گلی میں

داخل ہو گیا ...
پاگل اب بھی سڑک پر چیخ رہا تھا
اور سب کچھ معمول کی طرح تھا ——

نئی کتابوں کا تعارف

نوٹ : تبصرہ کے لئے کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔

نام کتاب : ۱۔ چلم نامہ ۲۔ دیوارِ قہقہہ

مصنف : محمد یوسف پاپا

ضخامت : (۱) ۸۰ صفحات (۲) ۱۲۸ صفحات

قیمت : ۱۔ دس روپے ۲۔ ۱۵ روپے

پتہ : اُردو سماج، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵ (۲) نئی آواز، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

محمد یوسف پاپا اُردو کے ایسے شعرا میں ہیں جو شہرت سے گھبراتے اور داد و تحسین سے بیزار رہتے ہیں۔ اسی لئے اتنی کامیاب مزاحیہ شاعری کرنے کے بعد بھی وہ ایک مخصوص و محدود حلقہ میں جانے پہچانے جاتے ہیں، وہ اسی اخفائے ذات کو اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ مگر وہ شاید یہ بھول گئے ہیں کہ "کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتّوں میں نہاں ہو کر"

کمالات جب تک ہماری بے پروائی اور بے توجہی سے چھپے رہیں، چھپے رہیں مگر جب ان کی تشہیر ہونے لگتی ہے تو بڑی تیزی کے ساتھ ہنرمندی اور شہرت کا سکہ دلوں پر بیٹھنے لگتا ہے۔ محمد یوسف پاپا کی شہرت اب پردۂ غیب سے ظہور میں آنے لگی ہے۔ اور مجھے توقع ہے کہ انھیں ادبی دنیا جلد ہی پورے طور پر پہچان جائے گی۔

چلم نامہ اس سے بہت پہلے چھپی تھی۔ [illegible] کا کوثری مرحوم نے نہایت دلچسپ اور دلنشیں انداز میں مصنف کتاب کا تعارف لکھا ہے۔ اس تعارف میں فن کار اور ان کے فن دونوں کو کامیابی کے ساتھ متعارف کیا گیا ہے۔ "چلم نامہ" دراصل ایک دل خوش کن طنز نامہ ہے۔ "چلم بھرنا" خوشامد، تملق اور چاپلوسی کے معنی میں ایک محاورہ ہے۔ یوسف پاپا کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے محاورہ کی بنیاد پر اپنی تخلیق کا مکمل ڈھانچہ تیار کر لیا ہے۔

چلم نامہ کا ڈھانچہ مثنوی کی طرح ہے، اور قدیم مثنوی کے اجزا کی طرح اس میں حمد، نعت، دعا وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔ اس بظاہر سنجیدہ پیکر میں شاعر نے طنز و مزاح کے شگوفے کھلائے ہیں۔ عام طور پر یوسف پاپا نے طنز و مزاح کے لئے سنجیدہ انداز اختیار کر کے اپنی باتوں کی تاثیر بڑھائی ہے۔ مزاح ان کے یہاں کھل کر سامنے نہیں آیا بلکہ اس پر ایسا پردہ حائل رہتا ہے جس پر طنز و مزاح کی کاٹ اور بڑھ جاتی ہے۔ شاعر نے برہنہ "حرفِ ناگفتنی" "کمالِ گویائی" [illegible] کا خوبصورت نمونہ پیش کیا ہے۔ اس طرح طنز یوسف پاپا کے کلام میں UNDER CURRENT کی طرح کام کرتا ہے۔ ان کی یہ خصوصیت انہیں بہت سے دوسرے مزاح نگاروں سے الگ رکھتی ہے۔ حمد و نعت کے بعد "چلمی فلسفۂ حیات"، "چلم کس کی بھری جائے؟"، "چلم بھرنے

سے کیا ہوگا؟"، "آخری ہدایت" اور "چیلم کا ترانہ" جیسے عنوانات کے تحت خوشامد پسندوں کی خوب خبر لی ہے۔ جو بات سنجیدگی سے بے کیف ہو جاتی ہے وہ مزاح و ظرافت سے دل نشیں ہو جاتی ہے۔ یوسف پاپا نے چلم نامہ لکھ کر ایک اہم تعمیری کام کیا ہے۔ اس ظرافت کے پس پردہ قوم و ملت بلکہ پوری انسانی آبادی کے نام جو مثبت اور اخلاقی پیغام ہے اس سے مصنف کے مقصد و ارادہ کا صاف اندازہ ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں مزاح و ظرافت کے پیرایہ میں معاشرہ کی صدہا خامیوں کو نشانۂ ملامت بنایا گیا ہے مگر معاشرہ کی کسی ایک خامی پر اس قدر بست و تفصیل سے چلم نامہ کے سوا دوسری مثال ملنی مشکل ہے۔

محمد یوسف پاپا کی دوسری کتاب "دیوارِ قہقہہ" تقریباً دو سال پہلے شائع ہوئی ہے۔ بہترین گٹ اپ کے ساتھ اس میں غزلیں، نظمیں اور کنڈلیاں ہیں۔ کنڈلی ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس پر عام طور پر اردو کے شاعروں نے طبع آزمائی نہیں کی ہے۔ یوسف پاپا نے تکنیکی اور تاثراتی دونوں حیثیتوں سے اس صنف میں ایسے فنی نمونے پیش کئے ہیں جن پر بلاشبہ ہندی والے بھی رشک کرنے لگیں گے۔ "دیوارِ قہقہہ" کا دیباچہ نریش کمار شاد نے لکھا ہے جو خود لب و لہجہ کی شگفتگی کی وجہ سے دامنِ دل کھینچتا ہے۔

محمد یوسف پاپا غیر معمولی تخلیقیت اور طباعی کے حامل ہیں۔ وہ ہر صنفِ سخن کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے لب و لہجہ کے خود موجد ہیں۔ اپنی غزلوں میں پاپا نے غزل کی بنیادی اور روایتی قدروں کا لحاظ قائم رکھتے ہوئے عہدِ جدید کے تاثرات و موضوعات کو مزاح کے انداز میں بیان کیا ہے۔ مزاحیہ شاعری میں ابتذال معیار کا ہمیشہ ڈر لگا رہتا ہے۔ زبان و بیان کی اتنی ترقی کے باوجود آج بھی متعدد ظرافت نگار اپنے آپ کو پورے طور پر اس زوالِ معیار سے نہیں بچا پاسکے ہیں۔ محمد یوسف پاپا کی شاعری اس لئے بھی ہم پر اچھا تاثر قائم کرتی ہے کہ وہ ایک خاص معیار سے نیچے نہیں آتے۔ نظموں میں وہ قدیم و جدید وضع میں اپنے موضوعات کو کامیابی کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔ انھوں نے بالعموم عہدِ حاضر کے دوالیہ پن کو طنز کا شکار بنالیا ہے۔ آج معاشرت کے مختلف امور میں فیشن کے تحت بے وضعی، بے ترتیبی اور مضحکہ خیزی کے جو نقوش پیدا ہو چکے ہیں۔ وہ ہمارے تہذیبی انحطاط کی خطرناک علامات ہیں۔ یوسف پاپا کی نظمیں زیادہ تر انہیں موضوعات و مسائل کا احاطہ کرتی ہیں۔ علامات کے پسِ منظر میں نقلی آنکھ، موڈرن شیریں، شوہرے آج .....، اور کیفِ حسن، ان موضوعات کو زیادہ اثر انگیزی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ یوسف پاپا نے ظریفانہ شاعری کرتے ہوئے عصری تقاضوں اور اظہارِ فن کے ان وسائل کو خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا ہے جن سے اردو کی ظریفانہ شاعری میں تازہ کاری پیدا ہو سکتی ہے۔

پاپا کو زبان اور اظہار پر قدرت حاصل ہے۔ مزاح و ظرافت ان کی طبع میں داخل ہے۔ شاعری ان کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ فکری اعتبار سے ان کا ذہن پختہ کار ہے۔ ان تمام اجزا کی موجودگی میں ان سے ایسی ہی بلکہ اس سے بہتر تخلیقات کی توقع کی جاسکتی ہے۔

(ڈاکٹر علیم اللہ حالی)

شہرِ خیال

قارئین کے خطوط

زیرِ نظر شمارہ، سہیل سلسلہ ادبی خدمات منور رانا بہت خوب ہے۔ عزیزم منور رانا کو میں ایامِ طفلی سے ہی جانتا ہوں، کیوں کہ آپ کے والد سید انور علی میرے محسنوں میں ہیں جس کی وجہ سے ان کی گھریلو زندگی سے بھی قدرے واقفیت ہے۔ منور رانا کی ادبی، سماجی اور عائلی زندگی سے متعلق ان کی بیگم نے جو نقشہ کھینچا ہے، وہ اظہر من الشمس ہے۔

میری ذاتی رائے ہے کہ اگر کسی خوش نصیب کی بیگم اس کے اخلاق و کردار سے متعلق تشفی بخش سرٹیفکیٹ دے دے تو پھر کسی قطعی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے منور رانا واقعی خوش قسمت ثابت ہوئے ہیں۔ اس کے لئے میں انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

جہاں تک منور رانا کے اخلاقِ سعید، اوصافِ حمیدہ کا تعلق ہے اس کی روشنی میں میں بلا خوف و خطر یہ کہہ سکتا ہوں کہ شاعری کی دنیا میں وہ جتنی بلندی پر پہنچے ہیں وہ بے شک قابلِ قدر ہے۔

سہیل گیا نے منور رانا نمبر شائع کرکے اس لئے نہ صرف ایک ابھرتے ہوئے کہنہ مشق شاعر کو اس کا جائز مقام دیا ہے بلکہ دنیائے شاعری میں ایک نیا باب کا اضافہ کیا ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا سہیل کو اس کے نیک مقاصد میں کامیابی عطا فرمائیں۔ آمین

کلیم الدین شمس۔ ڈپٹی اسپیکر مغربی بنگال اسمبلی۔ کلکتہ

سہیل کا تازہ شمارہ (ایک شمارہ ۔ منور رانا کے نام) موصول ہوا۔ اتنا ضخیم شمارہ آپ کے حوصلہ اور لگن کا مظہر ہے۔ منور رانا کو تفصیل سے پڑھنے کا پہلی مرتبہ موقع ملا۔ اس شمارہ میں آپ نے جو ان کا انٹرویو شائع کیا ہے وہ دلچسپ بھی ہے اور معنی خیز بھی۔ اپنے معاصرین کی چٹکیاں انھوں نے خوب لیں۔ تاہم کہیں کہیں معاصرین کے حق میں ان کی بیباکی بد تمیزی کی حدود میں داخل ہوگئی ہے۔ مثلاً اب تو میں الہ آباد جانے سے بھی ڈرتا ہوں کہ ساحل احمد مجھ سے کب فرمائش کردیں "زور لگانے کے لئے" (صفحہ ۱۵) اس قسم کے جملے بے تکلف احباب کی محفلوں میں یقیناً مزے دے جاتے ہیں۔ لیکن صفحات پر یہ ادبی متانت کو مجروح کردیتے ہیں۔

اسی طرح انھوں نے ایک جگہ کہا ہے "جب ہم شاعری کو کسی مقصد کے تحت استعمال کرتے ہیں، مقصد سے میری مراد لیبل ہے۔ لیبل سے میری مراد یہ ہے کہ علی گڑھ میں فساد ہوا تو مشاعروں میں اور رسائل میں جلی ہوئی لاشوں کو شاعری کے صحن میں سجاکر اپنی شہرت کے لئے پیش کرنا۔ ..... اس قسم کے موضوعات کو نشانہ بناکر آپ کو شہرت تو مل سکتی ہے لیکن ادب کو کوئی خاص فائدہ نہیں۔"

میں عرض کروں گا کہ اردو میں بعض اہم فن پارے وہی ہیں جو ایسے ہی واقعات سے متاثر ہوکر لکھے گئے ہیں مثلاً منٹو کا " " تقسیم ہند پر لکھا گیا اہم افسانہ ہے۔ اسی طرح جلیاں والا باغ میں پیش آنے والے واقعہ پر فانی کا یہ شعر ؎

زمینِ حشر فانی کیا قیامت ہے معاذ اللہ

مجھے اپنے وطن کی سی زمیں معلوم ہوتی ہے
سوال اس کا نہیں کہ روشن شہر کی سیاہ کہانی لکھنے سے ادب کا فائدہ ہے یا نہیں ؟ سوال یہ ہے کہ روشن شہر کی سیاہ کہانی کس طرح لکھی گئی ؟ کیا وہ تمام ادبی تقاضوں کو پورا کرتی ہے ؟ کہانی کی تکنیک یا شعر کے رموز و نکات شعر کا جمالیاتی احساس تو مقصود نہیں ہو گیا ۔ علی گڑھ جلے یا مراد آباد ، اسرائیل کی برائیاں ہوں یا فلسطین کی تباہی ۔ شاعر متاثر ہوتا ہے اور اسے انسانیت کی مٹتی ہوئی قدروں کو محسوس کرنا چاہیئے ۔ اور اس نے جو کچھ محسوس کیا ہے ۔ اسے اپنے قاری تک پہونچانا چاہیئے ۔

دراصل رانا صاحب ایک آسودہ زندگی گذار رہے ہیں ، اس لئے وہ ایسی بات کہہ گئے ۔

دیگر مضمون نگاروں میں عرفان صدیقی کا مضمون خوب ہے ۔ شہبر رسول کی رائے بھی بہتر ہے ۔

شمس بدایونی ، بدایوں

" ایک شمارہ منور رانا کے نام " کافی عمدہ گوشہ نکالا ہے آپ نے ۔ خاص کر آپ کا انٹرویو کافی لاجواب ہے ۔ صرف ایک بات کھل سی گئی ہے ۔ رانا صاحب کا اقبال کے بارے میں نظریہ اچھا نہیں ہے ۔ یہ ایک افسوسناک بات ہے ۔ ایک اچھے شاعر سے یہ توقع نہیں تھی ۔ علیم اللہ حالی اور دیگر نے محنت کی ہے ۔ قادری کا مضمون ایک دم پھیکا ہے ۔ وہ منور کی شاعری میں ذرا بھی جھانکنے کی کوشش کرتے تو یہ امر ان پر کھلتا کہ رانا صاحب ترقی پسند اور روایتی شاعری کی بیچ کی کڑی ہیں جبکہ انہوں نے رانا پر محض حسد کا الزام لگایا ہے ۔ نمبر بیحد خوبصورت اور جامع ہے ۔ ایک بار پھر مبارک باد قبول فرمائیں ۔

مشرف عالم ذوقی ۔ آرہ

اگست کا سہیل ملا ۔ بہت بہت شکریہ
سرورق پر محترم ادریس سنبھاروی کی تصویر دیکھ کر آنکھیں نم ہو گئیں ۔ موصوف کی وفات کا غم ساری اردو دنیا کا غم ہے ۔ انھوں نے جو چراغ جلایا ہے اسے روشن رکھ کر ہی ہم انہیں سچی خراجِ عقیدت پیش کر سکتے ہیں ۔
اس شمارہ میں محترمہ محبوبہ دانی صاحبہ کا مقالہ " اقبال بحیثیت رومانی شاعر " جامع اور بھرپور ہے ۔ سیف الدین انصاف صاحب کی نظم بہت اچھی ہے ، دیگر منظومات بھی بہتر ہے ۔ کہانیاں دونوں اچھی ہیں ۔ اگر کتابت کی طرف تھوڑی توجہ دی جائے تو رسالہ اور نکھر سکتا ہے ۔ نیلو فر رحمٰن ۔ گیا

اگست کے " سہیل " پر پچھلے دنوں نظر پڑی ۔ آپ نے اپنے والد کریم جناب ادریس سنبھاروی مرحوم کی رحلت کی اطلاع بڑی پُر سوز و دلگداز لہجہ میں دی ہے ۔ پڑھ کر دل خون ہو گیا ۔ آپ کے والد مرحوم سے خط و کتابت کا سلسلہ تو نہیں تھا لیکن ان سے میری ملاقات کلکتہ میں اس وقت ہوئی تھی جب ترقی پسند تحریک کے اثرات اپنا کام کر رہے تھے ۔ چونکہ میں بھی نظریاتی طور پر اشتراکی فکر کا شاعر تھا اور ہوں اس لئے اس ملاقات کے بعد اگرچہ مراسلت نہیں کے برابر ہوئی ۔ پھر بھی میرے دل میں ان کا زبردست احترام ہے اس لئے کہ وہ آخر آخر وقت تک ترقی پسند رہے ۔ صرف ہم

نہیں بلکہ جدیدیت کے دور میں بھی انھوں نے بے جا اور لغو، مہمل اور مجہول جدیدیت کو اپنے پرچہ "سہیل" میں کبھی راہ نہ دی۔ انھوں نے آپ کو اپنی زیر تربیت شعر و ادب کا رجائی نقطۂ نظر دیا۔ جس کا اظہار آنجہانی نے بھوند میں کیا ہے۔ بھوند میں آپ نے جہاں اپنے والد کی دائمی مفارقت کے غم کا پُر درد الفاظ میں اظہار فرمایا ہے وہیں آپ نے اپنے ذہن کی رجائیت اور بھرپور عزم کو بھی ظاہر کیا ہے کہ آپ آخری سانس تک "سہیل" کو زندہ رکھیں گے۔ اور اپنی ادبی کاوشوں کے ذریعے اپنے باپ کے نقش قدم کو اجاگر کریں گے۔ مجھے آپ کے اس پُر عزم، با وقار اور رجائیت سے بھرپور اعلان سے بے حد مسرت ہوئی۔ لیکن اس بات کا دلی صدمہ ہے کہ ادریس صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ ہیں نا؟ اگر ہیں تو میری طرف سے سوگواری کا اظہار کر دیجیے۔ مسعود منظر صاحب سے بھی کہیے کہ میں ان کے درد و غم میں برابر کا شریک ہوں۔

اگست کا سہیل اپنے وقیع اور ارفع مندرجات کی وجہ سے کافی پسند آیا۔ اقبال پر ڈاکٹر مجوب رانی کا مضمون خصوصی توجہ سے پڑھ لیا۔ فیضا ابن فیضی کی غزلیں لطف دے گئیں۔ بدیع الزماں خاور کی نظم نئی تہذیب اچھی لگی۔ ح۔ عامر کی نظم (بکاری کے نام) بھی پسند آئی۔ جناب ساور راہی، سید رونق رضا، اور سیدہ شان معراج کی غزلیں بھی خاصی پرکشش ہیں۔ شبیہہ عباس جارچوی (پاکستان) کی کہانی "... شہزادہ" اچھی لیکن بہت ... ہے۔

اُمید کہ آپ لوگوں کے قلب ناصبور کو اب صبر آچکا ہوگا۔ مگر ـــــ آپ نے روشنی کی جستجو کو مذہب بنا یا تھا۔ آپ کا یہ جملہ بہت ہی بلیغ اور معنی خیز ہے۔ مجھے اس جملہ سے بے پناہ خوشی حاصل ہوئی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اپنی آخری سانس تک روشنی کی تلاش کو مذہب بنائے رہیں گے۔

ادریس احمد دوران (در بھنگہ)

ہماری مصنوعات
تاج مارکہ

سُرمہ صحی نمبر ۱۰۰

سُرمہ صحی نمبر ۲۱

سُرمہ نورانی

REGD

سنبل نمبر (۱) سُرمہ و کاجل



★★

Regd. No. Gay—4 Regd. with the R. N. Pat. R. No. 3520/57
46 YEARS OF PUBLICATION
THE SOHAIL MONTHLY, River Side Road, Gaya - 823001

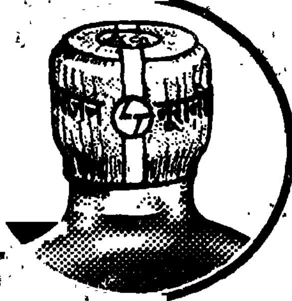
سہیل

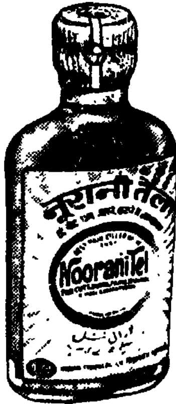


Rs. 1/50 Dec. 84

مئو کے اصلی نورانی تیل کی خاص پہچان

- لیبل پر مینو فیکچرنگ لائسنس نمبر U18/77 ضرور دیکھیں
- کیپسول پر (LT) مارک دیکھیں
- اگر لیبل پر مذکورہ لائسنس نمبر نہ ہو اور ایل ٹی مارک نہ ہو یا دوسرا مارک ہو تو ہرگز نہ خریدیں۔





نورانی تیل

درد، زخم، چوٹ، کٹنے، جلنے
کی مشہور دوا

انڈین کیمیکل کمپنی، مئوناتھ بھنجن، یوپی

ماہنامہ سہیل گیا عظیم پیش کش

(۱) "علامہ جمیل مظہری فن اور شخصیت"

ہند و پاک کے مشہور و معروف اہل قلم حضرات کے ذریعہ علامہ جمیل مظہری مرحوم کے فکر و فن، شاعرانہ عظمت اور مقام و مرتبے کا تعین وادبی خدمات کا اعتراف۔
معیاری کتابت، اعلیٰ و نفیس کاغذ اور خوشنما طباعت سے مزین۔ صفحات ۳۰۰، قیمت ۱۵ روپے

(۲) "ایک شمارہ۔ ڈاکٹر علیم اللہ حالی کے نام"

مشہور و معروف ناقدوں کے ذریعہ ڈاکٹر علیم اللہ حالی کی خدمات کا اعتراف۔
علیم اللہ حالی سے جمیل منظر سنہاروی کا تفصیلی انٹرویو۔ صفحات ۸۲، قیمت ۳ روپے

(۲) "ایک شمارہ۔ کلیم الدین احمد حقیقت کے آئینے میں"

ڈاکٹر سید محمد محسن نے کلیم الدین احمد مرحوم کی زندگی کی وہ وہ تمام گوشے کو اجاگر کیا ہے جو اب تک ناقدین کی نظروں سے اوجھل تھے۔
صفحات ۸۲، قیمت ۵ روپے

(۴) "ایک شمارہ۔ منور رانا کے نام"

منور رانا جدید لب ولہجہ کے بانکے شاعر ہیں ہندوستان کے چوٹی کے اہل قلم حضرات کے ذریعہ منور رانا کی شاعری کا بھرپور تجزیہ۔ جمیل منظر سنہاروی کا لیا ہوا ایک اچھوتا انٹرویو اور منور رانا کے بے باک جوابات جس نے ادبی حلقہ میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ صفحات ۱۵۲ - قیمت ۱۰ روپے

کاپیاں بہت کم تعداد میں بچی ہوئی ہیں۔ آج ہی اپنا آرڈر ارسال کریں۔ چاروں نمبروں کا سیٹ منگانے والوں کو خصوصی رعایت۔ ۳۵ روپے ارسال کر کے چاروں نمبر حاصل کریں۔

منیجر: ماہنامہ سہیل ریور سائیڈ روڈ گیا ۸۲۳۰۰۱

بانی: مولوی حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل شنسہاروی
بیادگار: مولوی محمد زین العابدین اختر شنسہاروی

ترقی پسند ادب کا ترجمان

ماہنامہ سہیل گیا

دسمبر سنہ ۱۹۸۴ء

جلد نمبر: ۳۶
شمارہ نمبر: ۱۲

بدل اشتراک
سالانہ ۱۸/- روپے۔ لائف ممبری ۲۵۰/- روپے

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ
ماہنامہ سہیل [illegible]

فہرست

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر ایم اے ادریس نے ملت آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ ۶ میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ سہیل گیا

(سنود)

آہ! فیض احمد فیض

برصغیر کے ممتاز ترقی پسند شاعر جناب فیض احمد فیض کا پچھلے دنوں ۷۳ سال کی عمر میں لاہور میں انتقال ہوگیا۔ فیض احمد فیض اپنی انقلابی شاعری کی وجہ سے اپنی زندگی میں ہی تاریخی انسان بن گئے تھے۔ آپ پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے۔ کافی عرصے تک آپ نے افرو ایشیائی ادیبوں کی انجمن کے مشہور و معروف رسالہ "لوٹس" کو بھی ایڈٹ کیا تھا۔ پورے ایشیائی ملکوں میں اس دور کی اردو شاعری میں فیض کا نام سب سے اونچا تھا۔ انھوں نے ہندو پاک میں برابر کی شہرت حاصل کی تھی۔

فیض نے پاکستان کے موجودہ حالات پر بھی اپنے خاص انداز میں بے باک قلم چلائی۔ جس کی وجہ سے پاکستان کی لیاقت علی حکومت میں انھیں ۱۹۵۳ء۔۵۴ء میں کافی دنوں تک جیل میں بھی رہنا پڑا۔ جیل کی سلاخوں کے اندر سے ہی انھوں نے لکھا تھا :

"نہ اُن سے ملے ہیں
نہ گل کھلے ہیں
نہ مے پی ہے
عجیب رنگ سے اب کے بہار گذری ہے"

انھوں نے یہ بھی لکھا تھا :

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

آج ان کی زندگی بھی ایک فسانہ بن کر رہ گئی ہے۔

فیض نہ صرف انقلابی شاعر تھے بلکہ امن، آزادی اور جمہوریت کے لئے ساری زندگی لڑتے رہے۔ ادارہ سہیل موصوف کی بے وقت موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

جمیل منظر مستفاروی

تاریخ کی ابجد

مستند تاریخیں	ا ——— اردو	باوجود کاغذ کی گرانی کے قیمت ،
نقشہ لاہم وخرچ	ب ——— بخشی	وہی فی جلد ۲۵ پیسے ، فی سیکڑہ ،
برسات کے نچھتر	ج ——— جنتری	۳۰ روپے ، فی ہزار ۲۸۰ روپے
اور دیگر دلچسپ مضامین	د ——— دیکھئے	(محصول فری)

جو نئے رنگ وروپ کے ساتھ شائع ہوگئی ہے

تاجران کتب کو چاہئے کہ پیشگی رقم کے ساتھ اپنی فرمائش نوٹ کرادیں۔ نوٹ: نمونہ کیلئے ایک روپے کا ڈاک ٹکٹ بھیجئے

اسٹاکسٹ

ربھنگہ — ظہیرالدین ململی گلکی بازار ، مکتبہ اسلامی لہریا سرائے۔

پٹنہ — سبزی باغ پروینز بک ڈپو ، کتاب منزل بک امپوریم ، آفتاب بک ڈپو

ظفرپور — معین الحق بک سیلر شمع بک اسٹال اسٹیشن روڈ ، محمد کریم بخش بک سیلر کمپنی باغ ، عبدالخالق دفتری ، وک بند حرلپ شالیہ چنک پور روڈ۔

مستی پور — کلپتی اسٹور، ہمی بک ڈپو اسٹیشن روڈ

دھوبنی — مولوی عبدالوہاب قاسمی مدھے پور

یتامڑھی — محمد توفیق بک سیلر ، محمد رفیق ڈھول چوک ، اقبال سینٹر

سیوان — نظام الدین بک سیلر چوک بازار ، دار ۃ اسٹور مدرسہ اسلامیہ احسانیہ گوپال گنج

گیا — ظفر بک ڈپو ، فضل بک ڈپو ، جی بی روڈ ، اسعد بک ڈپو گھسیار ٹولہ ، حنفیہ بک سینٹر اورنگ آباد

مپارن — بک امپوریم بیتیا ، شیام ساہتیہ سدن سکٹا ، یونیورسل بک ڈپو بیتیا ، محمد ابراہیم بک سیلر چوہیا ، عبدالرحمٰن بک سیلر رکسول ، دیسی کتاب گھر رام نگر۔

آرہ — ضیاالحسن ، حاجی شرف الدین چوک ، سوداگر سنگھ بہیا ، سہدیو پور

بیگوسرائے — کتابستان ، شمیم کتب خانہ نہوا ، وشالی نیشنل بک ڈپو حاجی پور

کٹیہار — اپنا کتاب گھر کٹیہار ، جنرل کتاب گھر ، ایم جی روڈ کٹیہار

پورنیہ — کپور چند رسالہ ، پیپر کارنر اررریہ کورٹ ، محمد اسماعیل اشرفی جوگبنی

کشن گنج — صادق کتاب گھر ، رمضان بک ڈپو ، جیوتسی پستک بھون ، شکتی بک ڈپو۔

بھاگل پور — حمیدیہ پستک بھنڈار ، سہنولا چوک ، اسلامیہ بک ڈپو ، کمالیہ بک ڈپو تاتار پور

ایس اے بی بخشی کمپنی ۔ ۳۳ مولانا شوکت علی (کولوٹولہ) اسٹریٹ کلکتہ ۔۔۔۔

ڈاکٹر گیل مینو
ترجمہ:۔ سید شہاب الدین دسنوی

اردو زنانہ پریس، سماجی تاریخ کا ماخذ

ڈاکٹر گیل مینو (GAIL MINAULT) امریکن انسٹی ٹیوٹ آف انڈین اسٹڈیز "حیدرآباد میں سینئر ریسرچ فیلو ہیں۔ ان کا مستقل تعلق ٹیکساز یونیورسٹی (امریکا) کے شعبۂ تاریخ سے ہے۔ ڈاکٹر مینو ہندوستانی مسلمان عورتوں کے سماجی مسائل پر تحقیق کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اردو میں عورتوں کے رسالوں کا بھی مطالعہ کیا۔ کچھ دن ہوئے وہ ہمدرد نگر (دلی) میں مجھ سے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی لائبریری میں تبادلہ خیال کرنے تشریف لائیں۔ تو میں نے ان کا ایک مقالہ دیکھا جو موضوع کے اعتبار سے مجھے نیا معلوم ہوا۔ ان کے ایما سے اس مقالے کا اردو ترجمہ پیش کر رہا ہوں۔

——— سید شہاب الدین دسنوی۔

غیر منقسم ہندوستان میں صحافت کی تاریخ خاصی متنوع اور دلچسپ رہی ہے۔ پریس کا سہارا لے کر مختلف مسائل پر خیال آرائی ہوتی رہی ہے۔ سیاسی تحریکوں، اور انتظامی ریفارم، کو کی مخصوص مصلح یا سیاسی رہنما کی تنظیم کے پرچار کے لیے جن روزناموں، ہفتہ وار، ماہناموں، یا سہ ماہی جریدوں کو ابلاغ کا ذریعہ بنایا گیا۔ بعض مورخوں نے ان کا مطالعہ کیا۔ اور بعض نے پریس سے حشرات الارض کی طرح نکلے ہوئے پمفلٹ، تقریروں کے کتابچے، ہینڈ بل، پوسٹر وغیرہ سے استفادہ کر کے اپنے تحقیقات کا مواد تیار کیا۔ عام طور سے سرکاری دستاویزوں، بیانوں اور مطبوعات کے مقابلے میں اس طرح کے مواد مورخ کے لیے زیادہ قابل قبول ہوتے ہیں

ایسی تاریخ نویسی میں انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کے شائع شدہ مواد کا تقابلی مطالعہ بھی کیا جاتا ہے۔
تقریروں اور مضامین کے علاوہ نظموں اور غزلوں کے اشعار کا تجزیہ اور ان کی علامتوں کی تفہیم کی بھی کوشش
کی جاتی رہی ہے۔ تاریخی شواہد سے متبادل تشریحات اخذ کرنا آج کی تاریخ نویسی کا مقبول طریقہ کار ہے۔ چنانچہ
خود میں نے بھی تحقیقات کے سلسلے میں اسی طرح تاریخی ارتقا سے متبادل حقیقتوں تک پہونچنے کی کوشش
کی ہے۔

میری تحقیق کا عنوان ہے "ہندوستانی مسلمان عورتوں میں انیسویں صدی کے آواخر اور بیسویں
صدی کے ابتدائی حصوں میں تعلیمی تحریکیں اور اس عہد کے ہندوستانی مسلمان کے سماج سے اس کا رشتہ" میرے
پیش نظر مسئلہ یہ تھا کہ مسلمان عورتوں کی تعلیم، پردہ، اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں اس عرصے میں جو بھی تبدیلی
آئی ہو یا نہ آئی ہو ان کے خیالات کیسے معلوم کیے جائیں ؟۔ اس کا جواب۔ صرف ایک ممکن حل مجھے اس میں نظر آیا کہ زنانہ
پریس کے مطبوعات کو کھنگالا جائے۔ ایسے رسالے جو خواتین کے لیے شائع کیے گئے اور جن میں نہ صرف مرد ریفارمر بلکہ
خود عورتوں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہو۔ ان کا مطالعہ کیا جائے۔

رسالوں اور اخباروں کے ذریعہ تحقیق کے بعد متبادل تشریحات پیش کرنے کا کام آسان نہ تھا۔
کیونکہ اس نوعیت کے شائع ہونے والے رسائل تو ریفارم کے حق میں ہوتے ہی تھے اور ریفارم کا پرچار کرنے
والے بھی ریفارمر کو حق بجانب سمجھتے تھے۔ اس طرح بات ایک طرفہ ہو جاتی ہے۔ کوئی شخص تعلیم نسواں کی حمایت لیے بغیر
رسالہ شائع کرنے کا خیال دل میں لایا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ رسالے کی کامیابی کے لیے عورتوں کا تعلیم
یافتہ ہونا ضروری تھا۔ دوسری طرف کوئی زنانہ رسالہ عوام کے جذبات کا لحاظ رکھے بغیر چند شماروں کے بعد
زندہ رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر ایک اور مسئلہ خریداروں کا تھا۔ عورتوں میں جو رسالہ کی خریدار بننا پسند کرتی تھیں
ان کی تعداد تھوڑی سی تھی۔ لیکن یہی خواتین رسالے کے لئے کہانیاں، مضامین اور ایڈیٹر کے نام خط بھی لکھتی
تھیں۔ سب سے مقبول رسالہ "عصمت" (دلی) تھا۔ جس کا میں خصوصیت کے ساتھ ذکر کروں گی۔ ۱۹۳۶ء میں اس
کی اشاعت ڈھائی ہزار کے قریب تھی۔ یہ درست ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم یافتہ خواتین صرف اونچے طبقے میں پائی
جاتی تھیں۔ لیکن اونچے طبقے میں بھی ان خواتین کا درجہ ماتحتی کا ہوتا۔ اور وہ ہندوستانی مسلمان سماج پر اس انداز
سے اظہار خیال کرتی تھیں جو پہلے نہیں دیکھا گیا۔ ان مسئلوں کی وجہ سے اپنی تحقیق کے سلسلے میں مجھے جو وسائل میسر
ہوئے وہ محدود ہونے کے باوجود اہم ہیں۔ ان کا احتیاط سے مطالعہ اور تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ ہندوستانی
تاریخ میں عورتوں کی زندگی جس طرح عہد ماضی میں گزرتی تھی۔ اس کی سماجی حقیقتوں کا مطالعہ نہیں کیا گیا ہے
اور اس کی خاطر محدودیت کے باوجود زنانہ رسائل و اخبار سے بہت کچھ مواد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میں اس
وقت صرف اردو زبان کے رسالوں کی بات کرنا چاہتی ہوں۔ ورنہ ویسے عورتوں کے رسالے ہندوستان
کی دوسری تمام زبانوں میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ حال ہی میں بنگالی زبان کا رسالہ "بام بودھنی پتریکا"

کے ذریعے ہم سماج عورتوں کا مطالعہ کیا جاچکا ہے۔ اس کے علاوہ گجراتی، مراٹھی، تیلگو وغیرہ میں بہت سے رسالے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان سب کو احتیاط سے اکٹھا کرکے رکھنا چاہئے۔ اور ان کا مطالعہ کیا جانا چاہئے۔ اردو کے زنانہ رسالوں میں عام مقبولیت کے متنوع مضامین ہوا کرتے تھے۔

مختصر افسانے (عموماً ناصحانہ طرز کے)، ناول کی مسلسل اشاعت، جس کا مواد حد درجہ روایتی ہوا کرتا تعلیم کے نصاب، پردہ کی موافقت اور مخالفت، عورتوں کے شرعی حقوق، شعر و شاعری کے صفحات، ایڈیٹر کے نام مکتوبات، اور ان سب کے ساتھ امور خانہ داری، دست کاری، بچوں کے علاج و معالجہ، پر بھی مضامین ہوتے تھے۔ ان عنوانات کے تحت شائع شدہ مضامین کا تجزیہ کرکے عورتوں کی ثقافت اور بدلتی ہوئی قدروں کا اچھا خاصا سماجی مطالعہ کا مواد حاصل ہوتا ہے۔

اس تمہید کے بعد میں اردو کے زنانہ پریس کے بارے میں کچھ لکھنا چاہوں گی۔ جس سے مجھے اپنے کام میں بڑی مدد ملی ہے۔ اردو پریس کی اچھی خاصی تاریخ ہے۔ سب سے پہلے زنانہ رسالہ "اخبار النساء" تھا۔ جسے سن ۱۸۸۶ء میں دلی سے سید احمد دہلوی نے نکالا تھا۔ سید احمد دہلوی زبان اور محاوروں اور بالخصوص اپنے مرتب کردہ لغت "فرہنگ آصفیہ" کی چار جلدوں کی وجہ سے کافی مشہور ہے۔ اخبار النساء ہفتہ میں دو بار نکلتا تھا۔ لیکن شدید مخالفت کی وجہ سے بہت دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ مجھے اس رسالے کا کوئی شمارہ دستیاب نہ ہوا۔ صرف ان صحافیوں کی تحریروں میں اس کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے سید احمد دہلوی کی اولین کوشش سے واقفیت حاصل کیا۔ سن ۱۸۸۷ء میں حیدرآباد سے مولوی محب حسین نے دوسرا رسالہ "معلم النسواں" جاری کیا۔ مولوی محب حسین ایک دوسرا رسالہ "معلم شفیق" کے بھی ایڈیٹر تھے۔ اور انہوں نے جمال الدین افغانی کے ہندوستانی مضامین بھی شائع کیا تھا۔ "معلم النسواں" ماہانہ رسالہ تھا۔ جو پندرہ سال تک نکلتا رہا۔ مولوی صاحب پردہ کے مخالف تھے۔ اور اپنے خیالات کا اظہار برملا کرتے تھے۔ اس پر لوگوں نے احتجاج کیا اور ان کا دباؤ اتنا پڑا کہ حیدرآباد کی حکومت اس رسالے کو بند کرانے پر مجبور ہو گئی۔ معلم النسواں کے شمارے ادارہ ادبیات اردو (حیدرآباد) کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

سن ۱۸۹۸ء میں سید ممتاز علی اور ان کی اہلیہ محمدی بیگم نے لاہور سے ایک نہایت مفید ہفتہ وار "تہذیب النسواں" کا اجرا کیا۔ جو سن ۱۹۵۰ء تک مسلسل نکلتا رہا۔ ایک سماجی مورخ کے نقطۂ نگاہ سے یہ رسالہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا نام علی گڈھ سے شائع ہونے والے سرسید احمد خاں کے "تہذیب الاخلاق" کے لحاظ سے "تہذیب النسواں" رکھا گیا۔ مگر سرسید احمد خاں اس رسالے کے خلاف تھے۔ انہوں نے ممتاز علی کو رسالہ نکالنے سے منع کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے عوام کی مخالفت ممتاز علی کو بہت نقصان پہونچائے گی۔ لیکن سرسید کے مشورے کے باوجود ان کے انتقال کے کچھ ہی عرصہ بعد یہ رسالہ شائع ہونے لگا۔ اور مسلسل اشاعت کے لحاظ سے یہ پہلا رسالہ ثابت ہوا۔ اس کے انتظامی امور سید ممتاز علی کے ذمے تھے۔ اور ادارت کے فرائض ان

کی بیگم کے ہاتھوں ہے۔ تہذیب النسواں میں عورتوں کے حقوق اور ان کی تعلیم کے مسائل پر ممتاز علی اپنے خیالات کی اشاعت کرتے رہے۔ محمدی بیگم ایڈیٹر کی حیثیت سے مضامین کے انتخاب میں خاصی احتیاط برتنے لگیں۔ جو خواتین اپنی نگارشات مستقل بھیجا کرتی تھیں ان میں بمبئی سے زہرہ اور عطیہ بیگم، سیالکوٹ سے بنت نذر الباقر (جو بعد کو بیگم سجاد حیدر یلدرم ہوئیں) کلکتہ سے نجستہ اختر سہروردی، اور ربیگم صاحب بھوپال قابل ذکر ہیں۔ خود محمدی بیگم نے امور خانہ داری، آداب و تہذیب پر کئی نصیحت آموز ناول لکھیں جن کی بدولت وہ مصنفہ کی حیثیت سے مقبول ہوئیں۔

سید ممتاز علی اسلامی اسکالر بھی مانے جاتے تھے۔ ان سب باتوں نے رسالوں کو خاصی تقویت اور استحکام پہونچایا۔ رسالے کی اشاعت چونکہ ان دونوں کی اپنی نوعیت کی پہلی کوشش تھی اس لئے انہیں ناشر کی تلاش میں دقت ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے خود اپنا ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ادارہ "دارالاشاعت پنجاب" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے ذریعے رسالے کے علاوہ دوسرے مفید لٹریچر بھی چھاپے جانے لگے۔ درسی کتابوں کی اشاعت سے ادارے کو خاصا منافع حاصل ہونے لگا۔ سن ۱۹۰۸ء یا سن ۱۹۱۰ء سے ممتاز علی نے بچوں کے لیے ایک ہفتہ وار رسالہ "پھول" نکالا، جس کی ایڈیٹر نذر سجاد حیدر تھیں۔ ۱۹۰۸ء میں محمدی بیگم کا جرانی کے عالم میں انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد تہذیب النسواں کی ادارت ان کی بیٹی وحیدہ بیگم نے سنبھالی۔ اور جب ان کی شادی ہوگئی تو پھر یہ فرض ممتاز علی کی بہو کو سپرد کر دیا گیا۔ تہذیب النسواں کے سن ۱۹۱۵ء کے شمارے نایاب ہیں البتہ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۴۷ء کے شمارے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ان فائلوں میں جو شمارے غائب تھے وہ میں نے حیدرآباد سے حاصل کر کے وہاں پہونچا دیئے ہیں۔

"تہذیب النسواں" کے مواد اور مضامین پر کسی قسم کا تبصرہ کرنے سے پہلے یہ بتادینا ضروری ہے کہ اس رسالے کی حیثیت کی تھی۔ اس لئے اس میں مختصر تحریریں، خبریں، جلسوں کے اطلاعات، تقریروں کی مختصر رپورٹیں، شعر و شاعری اور کچھ تخلیقی چیزیں شائع ہوتی تھیں۔ طویل مضامین قسط وار شائع کئے جاتے تھے۔ اس کی ہفتہ وار اشاعت کا تقاضا یہ تھا کہ قاری اور رسالے کے مابین ایک طرح کا ربط بھی قائم رہے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ کسی ہفتے میں کوئی مضمون شائع ہوا اور اس کا جواب اگلے ہفتے کے شمارے میں آگیا۔ ان تحریروں کی زبان عربی و فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ سے مبرا، سیدھی سادی بول چال کی زبان ہوا کرتی تھی۔ رسالے کا ایک مقبول فیچر "محفل تہذیب" کا صفحہ ہوا کرتا تھا۔ جس میں قارئین کے خطوط نہ صرف ایڈیٹر کے نام بلکہ کسی دوسرے قارئین کے نام بھی کسی مشورے، اطلاع، بچوں کی نگہداشت سے لے کر باغبانی کے مسائل، داغ دھبے دور کرنے کی ترکیبیں، وغیرہ معلوم کرنے کے لیے لکھے جاتے تھے۔ اسلامی قوانین اور شرعی مسائل پر ممتاز علی کے مضامین مسلسل قسطوں میں شائع ہوتے رہے۔ ابتدا میں (سن ۱۹۱۰ء سے قبل) اس کی کوشش رہی کہ پردہ نشین خواتین کی تعلیم ضروری ہے، روشن خیالی پیدا کرنے کی اہمیت بیرونی معاملات کے مطالعہ سے وسعت نظری پیدا کی جائے۔

مضامین کا تعلق زیادہ تر تعلیم، بچوں کی دیکھ بھال، امور خانہ داری، ساس بہو کے تعلقات خوشگوار رکھنے کے مشوروں پر ہوتا تھا۔ وقتاً فوقتاً مسلمان عورتوں کے شرعی حقوق کے حصول میں آسانیاں پیدا کرنے، زیورات اور فضول رسموں پر بےجا صرف جیسے موضوعات پر ممتاز علی کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ بعد کے شماروں میں تعلیم نسواں، اور گھر سے باہر کی دنیا کی سرگرمیوں پر تحریریں ملتی ہیں ——— عورتوں کی انجمنوں کے قیام کی اور جلسوں کی اطلاع، عورتوں کے جلسوں میں تقریروں کی رپورٹیں، مقامی بزم نسواں، شہروں اور محلوں میں لڑکیوں کے اسکول کھولے جانے کی خبریں۔ عالمی جنگ سے متعلق مضامین، سیاسی حالات حاضرہ پر تبصرہ، ترکی پر عالمی جنگ کے بعد کے اثرات، سیر و سیاحت اور حج کی روداد وغیرہ جیسے عنوانات رسالے میں جگہ پاتے رہے۔ مضمون نگاروں میں نوجوان نسل کے نام بھی دکھائی دینے لگے۔ انہوں نے پردے کے نقصانات، تعدد ازدواج، اور طلاق کے مروجہ طریقے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اب "تہذیب النسواں" کے قارئین کے ذہن میں کافی پیش رفت ہو چکی تھی۔ ۱۹۳۵ء میں سید ممتاز علی کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے امتیاز علی تاج اور ان کی بیگم حجاب (اسماعیل) نے سالہا سال تک تہذیب النسواں کو جاری رکھا۔

۱۹۰۴ء میں علی گڑھ سے شیخ عبداللہ نے ماہنامہ "خاتون" کا اجرا کیا۔ جس کی تعلیم نسواں کی تاریخ میں خاصی اہمیت ہے۔ شیخ صاحب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ تعلیم نسواں کے سکریٹری تھے ان کی زندگی کا مقصد (جوان کی شہرت کا باعث بھی ہوا) علی گڑھ گرلس اسکول کا قیام بن گیا تھا۔ (اب یہ اسکول علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ویمینس کالج بن چکا ہے) انہوں نے اسکول کا کام اپنی بیگم کے ساتھ مل کر کیا تھا۔ ۱۹۱۴ء میں اس کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس کا اضافہ کیا۔ رسالہ "خاتون" کے صفحات پر شیخ عبداللہ اور ان کی بیگم کے خیالات کا پرتو پوری طرح جھلکتا ہے۔ حقیقت میں یہ رسالہ علی گڑھ گرلس اسکول کی تحریک اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ نسواں کا ترجمان بن گیا تھا۔ چنانچہ اس کے صفحات پر نصاب تعلیم، بہتر درسی کتابوں کی اشاعت، شیخ صاحب کے مضامین، تقریریں، شعبۂ نسواں کے سالانہ جلسوں کی کارروائیاں، نئی انجمنوں کے قیام کی خبریں شائع ہوا کرتی تھیں۔ گرلس اسکول فنڈ میں عطیات دینے والوں کے نام بھی چھاپے جاتے تھے جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں تعلیم نسواں کی حمایت میں کون کون سی شخصیتیں تھیں۔ رسالے میں سرپرست اعلیٰ بیگم صاحبہ بھوپال کی تقریروں کی روداد بھی چھپا کرتی تھیں۔ لیکن اس طرح کا مواد "خاتون" کے ان قارئین پر گراں گزرتا تھا جو کشیدہ کاری، گھریلو علاج، اور چٹکلے جیسی عام مذاق کی چیزیں دیکھنے کی خواہش مند ہوتی تھیں۔ شیخ عبداللہ ایک پُرخلوص ریفارمر ضرور تھے لیکن تخلیقی تحریر کے قلم کار نہ تھے۔ ۱۹۱۴ء میں "خاتون" کا شائع ہونا بند ہو گیا اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسی سال میں علی گڑھ گرلس اسکول کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس کی سہولتیں مہیا ہوئیں۔ خاتون کا مقصد علی گڑھ کالج تحریک کے ایک تکمیلی جز کی حیثیت سے عورتوں میں تعلیم کی اشاعت پورا ہو گیا اور اس کے بعد شیخ عبداللہ نے اپنی پوری توجہ اور توانائی اپنے اسکول کو چلانے اور اس کو پھیلانے میں صرف کر دی

"خاتون" کی مکمل فائلیں ان کے خاندان میں علی گڑھ میں موجود ہیں۔

تجارتی نقطۂ نگاہ سے نسائی رسائل میں "عصمت" ماہنامہ سب سے کامیاب ادبی رسالہ تھا جو ۱۹۰۸ء سے راشد الخیری نے نکالنا شروع کیا تھا۔ راشد الخیری معمولی درجے کے سرکاری ملازم تھے اپنے پھوپھا مولوی نذیر احمد دہلوی کی طرح انہوں نے بھی سبق آموز ناول لکھے جن کی وجہ سے وہ کافی مشہور ہوئے۔ راشد الخیری ان دنوں کے مشہور ادبی رسالہ "مخزن" میں بھی لکھا کرتے تھے۔ غمناک اور دل سوز کہانیوں اور ناولوں کی وجہ سے وہ "مصورِ غم" کہلانے لگے۔ لوگ ان کی تخلیقات میں عورتوں پر سماج اور رسم و رواج کے مظالم پڑھتے اور آنکھوں سے آنسو گراتے۔ اس رسالے کے پہلے شمارے ہی میں کئی جانے پہچانے نام ملتے ہیں۔ بیگم عبداللہ (علی گڑھ) کا مضمون، "تہذیب النسواں" کی ایڈیٹر محمدی بیگم کی نظم ان کے علاوہ بنت نذر الباقر (جو بعد کو "پھول" کی ایڈیٹر بنیں)، منشی ذکاء اللہ دہلوی کی بہو) بیگم رضا اللہ، بیگم خجستہ اختر بالو (کلکتہ)، بمبئی کی دو نوں فیضی بہنیں۔ مردوں میں سید احمد دہلوی، مولوی نذیر احمد، خواجہ حسن نظامی، اور راشد الخیری کے نام نظر آتے ہیں۔ بعد کو راشد الخیری نے تسلیم کیا کہ ابتدائی شماروں میں بہت سی کہانیاں جو عورتوں کے نام سے شائع ہوئیں ہیں وہ حقیقت میں انہیں کی لکھی ہوئی تھیں۔ یہ بات یوں بھی دلچسپ ہے کہ اس کے برخلاف یورپ میں عورتیں مردوں کے نام سے لکھا کرتی تھیں۔

"عصمت" اور "تہذیب النسواں" اپنے مقاصد کے لحاظ سے ایک جیسے تھے یعنی پردہ نشیں خواتین کی علاحدہ پسندی کو ختم کرنا (بغیر پردہ کی رسم کو توڑے) ان کی روشن خیالی کو بڑھانا (خاندان میں کسی طرح کا تکدر پیدا کئے بغیر) اور انہیں بیوی اور ماں کی حیثیت سے بہتر بنانا، تعلیم نسواں کی حمایت کرنا، عورتوں کے لیے اور کے تخلیقی لٹریچر کو فروغ دینا۔ "تہذیب النسواں" کے مقابلے میں "عصمت" میں ادبی مضامین زیادہ اور خبریں کم ہوتی تھیں۔ تخلیقی ادب اور اصلاحی مضامین میں زیادہ تر مذہبی امور، تعلیم نسواں، بچوں کی تندرستی، اور عہد ماضی کی بعض مشہور خواتین کے سوانح حیات اور ان کی کارگزاریوں کا بیان ہوتا۔ مثلاً حضرت عائشہ، بی بی فاطمہ، سلطان رضیہ، شہزادی زیب النساء وغیرہ۔ پکوان کے نسخے، کشیدہ کاری اور آرائش کے نمونے اور کبھی کبھی تصویروں سے بھی "عصمت" کے صفحات مزین نظر آتے۔ "بزم عصمت" کا انداز "محفل تہذیب النساء" جیسا تھا۔ "عصمت" میں جن قدروں کی طرفداری کی جاتی وہ روایتی تھیں۔ ۱۹۲۲ء میں راشد الخیری کے بیٹے رازق الخیری نے اپنی نئی شادی شدہ دلہن خاتون اکرم کے ساتھ "عصمت" کی ادارت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ خاتون اکرم "تہذیب النسواں" کی مستقل مضمون نگار کی حیثیت سے پہلے سے ہی جانی پہچانی تھیں۔

"عصمت" کی تجارتی کامیابی کا راز راشد الخیری کی المیہ ناولوں کی مقبولیت میں پنہاں تھیں۔ ان ناولوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ رازق الخیری اپنے باپ کی طرح ادیب تو نہ تھے مگر ان سے زیادہ بہتر مالیاتی ناظم ثابت ہوئے۔ اپنے والد کی ساری کتابوں کو انہوں نے کئی جلدوں میں "عصمت بکڈپو" کی طرف سے

شائع کرکے ان کے جملہ حقوق محفوظ کرا لیے۔ اپنے والد کے مضامین جو عصمت اور دوسرے رسالوں میں شائع ہوئے تھے ان کے مجموعے شائع کیے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں باپ بیٹے نے مل کر دو اور رسالے شائع کیے۔ "بنات" جس کا اگلا زینہ تعلیم یافتہ خواتین کے لیے "عصمت" قرار پایا۔ اور دوسرا "جوہر نسواں" جس کا تعلق زیادہ تر دستکاری اور کشیدہ کاری سے تھا۔

سنہ ۱۹۲۰ اور سنہ ۱۹۳۰ کے درمیان عصمت کے مضامین کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے بہ اعتبار زبان، اسلوب و بیان اور لغت میں خاصی پیش رفت ہوئی تھی۔ اور طبقۂ نسواں میں ذہنی اور دیگر پہلو سے پختگی آرہی تھی۔ مضمون نگاروں میں خواتین اکثریت میں تھیں (مضمون نگاری کے سالانہ انعامات کے اعلان کو بھی اس میں دخل رہا ہو) اب مضامین کے عنوانات کچھ اس نوعیت کے ہونے لگے تھے۔ لڑکیاں انگریزی تعلیم کیوں حاصل کریں؟ شاردا ایکٹ کی حمایت (نابالغ لڑکیوں کے نکاح کی ممانعت) طلاق کا مسئلہ، تعدد ازدواج، ہندوستانی عورتوں میں اموات کا تناسب زیادہ کیوں ہے؟، وغیرہ۔ ایک ایسا بھی سلسلہ شروع کیا گیا جس میں غیر منقسم ہندوستان کے مختلف علاقوں سے مثلاً آگرہ، حیدرآباد، لاہور، کوئٹہ وغیرہ سے خواتین نے وہاں کی عورتوں کے حالات زندگی لکھے، جن میں ان کی تعلیم کی کیفیت، رسم و رواج، روایات، لباس، کھانا پینا وغیرہ کا ذکر ہوتا۔ ادبی نگارشات، ادبی تنقید بھی شائع ہونے لگی۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں کئی مضامین اس موضوع پر شائع ہوئے کہ حکومت کی طرف سے جو عورتوں کو حق رائے دہندگی دی جانے والی ہے، وہ مناسب ہے یا نہیں؟ بعض بیرونی ممالک مثلاً ترکی، مصر، جاپان اور مغرب میں عورتوں کا مقام کیا ہے؟۔

عصمت کی تاریخ خاصی مربوط ہے کیونکہ سنہ ۱۹۲۸ء میں بیسویں سالگرہ سن ۱۹۳۶ء میں راشد الخیری کے انتقال پر ، اور سنہ ۱۹۵۵ء میں پچاسویں سالگرہ کے موقعوں پر اس کے خصوصی نمبر نکالے گئے۔ رازق الخیری نے عصمت کی کہانی اور اپنے والد کی سوانح عمری لکھی۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں رازق الخیری اپنی فیملی کے ساتھ کراچی منتقل ہو گئے۔ اور جب سنہ ۱۹۷۷ء میں میرا ان کے دفتر میں جانا ہوا تو اس وقت اس رسالہ کی اشاعت جاری تھی۔ اس دفتر میں عصمت کی مکمل فائلیں محفوظ ہیں۔ راشد الخیری کی تصنیفات کے سالہ جلدوں میں اب بھی چھاپی جا رہی ہیں۔ عصمت کے شماروں کی بہت بڑی تعداد حیدرآباد، علی گڑھ اور پٹنہ کے کتب خانوں میں بھی موجود ہیں۔

"عصمت" "تہذیب النسواں" اور "خاتون" ان تین کے علاوہ جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اور کئی زنانہ رسالے شائع ہوتے رہے۔ "پیسہ اخبار" کے ایڈیٹر مولوی محبوب عالم کی صاحبزادی فاطمہ بیگم منشی فاضل نے لاہور سے "شریف بی بی" کے نام سے رسالہ نکالا۔ بعد میں فاطمہ بیگم نے بمبئی سے "خاتون" نام کا رسالہ نکالا۔ آگرہ سے مسز خاموش نے "پردہ نشین" جاری کیا جس میں گھریلو معاملات [illegible] ادب پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ بھوپال سے محمدی بیگم زہری کا رسالہ "ظل السلطان" [illegible]

بھوپال کے رسالہ "الحجاب" میں زیادہ تر بیگم صاحبہ بھوپال کے تعلیمی خیالات کی ترجمانی کی جاتی تھی۔ حیدرآباد کی بیگم صغرا ہمایوں مرزا اپنی ادبی اور سماجی زندگی کے دوران کئی رسالوں کی ایڈیٹر رہیں۔ حیدرآباد سے اختر نے میلاجرہ "النسا" شائع کیا۔ پھر لاہور سے "زیب النسا" نکالا۔ حیدرآباد سے عبدالرزاق بسمل "شباب" نامی ایک مشہور ادبی رسالہ شائع کرتے تھے۔ جس میں ایک حصہ خواتین کے مضامین اور اشعار کے لیے ہوا کرتا تھا۔ حیدرآباد سے شائع ہونے والے دوسرے زنانہ رسالوں کے نام یہ ہیں:

خادمہ، تجلی، سفینۃ النسواں، اور صدائے نسواں، اور رسالہ انجمن خواتین دکن، خواجہ حسن نظامی دہلوی بھی ایک زنانہ رسالہ "استانی" نکالتے تھے۔ دلی کے دوسرے زنانہ رسالوں کے نام یہ ہیں "خاتون مشرق" "نسوانی دنیا" "نور" "انیس نسواں" "آواز نسواں"۔ اور صدائے نسواں" پنجاب سے ڈاکٹر خدیجہ فیروزالدین کی سرپرستی میں نوشابہ خاتون نے امرت سر سے "سہیلی" کا اجرا کیا۔ ملتان سے "سرتاج" امتیاز فاطمہ عرف حاجیہ تاج بیگم۔ لاہور سے میر عزیز الرحمن کا رسالہ "نور جہاں" اور امرتسر سے مولانا عبداللہ منہاس کے ایک اور "نور جہاں" نامی رسالہ اس زمانے کے زنانہ رسالوں میں معروف نام ہیں۔ جالندھر سے "مدرسۃ البنات" کا "میگزین" "مسلم" شائع ہوتا تھا۔ جو ۱۹۲۲ء میں لاہور منتقل ہو گیا۔ یو پی کے شائع ہونے والے زنانہ رسالوں میں "حیا" "ضیا" اور "حریم" لکھنؤ سے "مستورات" کانپور سے اور "حرم" پیلی بھیت سے نکلتے تھے۔

ان زنانہ رسالوں کے مطالعہ کے بعد انہیں سماجی تاریخ کی بنیاد جن نتیجوں پر میں پہنچی ہوں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے

(الف) گو زنانہ رسالہ نکالنے والے زیادہ تر مرد ہی ہوتے تھے۔ مگر ایڈیٹر عورتیں ہوتی تھیں۔ اور وہ خواتین مضمون نگاروں کی ہر طرح ہمت افزائی کیا کرتی تھیں۔

(ب) زنانہ رسائل کی تعداد اشاعت زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ مگر ایڈیٹر کے نام خطوط کے صفحات اور مضمون نگاروں کی رائے قیام سے پتہ چلتا ہے کہ ان رسالوں کا حلقہ مقبولیت دور دور تک پھیلا ہوا تھا زنانہ رسالے خریداروں تک پردہ کی پابندی کی وجہ سے بذریعہ ڈاک بھیجے جاتے تھے۔ ان کے پتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شائع شدہ مضامین کے ملک گیر پیمانے پر اثر انداز ہوتے رہے ہوں گے۔

(ج) رسالوں میں جیسے جیسے وقت کے ساتھ پیش رفت ہوتی گئی۔ مضامین تنوع، مواد میں معیار اور اظہار میں بے باکی آتی گئی۔ چنانچہ معلوم طویل المدت شائع ہونے والے رسالوں کے مطالعہ سے طبقہ نسواں کے خیالات، بدلتے تقاضوں، ان میں سیاسی بصیرت، اور سماجی شعور کی بیداری کا پتہ چلتا ہے:

(د) جہاں تک ریفارم کے علمبرداروں کی اصلاحی کوششوں کو پیش کیے جانے کا تعلق ہے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اکثر و بیشتر ان رسالوں میں بعض اوقات مردوں اور عورتوں کے خیالات پہلو بہ پہلو شائع

ہوتے رہے۔ گفتار او ر کردار کا فرق غالباً یہاں بھی اتنا ہی نمایاں ہوتا تھا جتنا کہ اس قول و فعل کے فرق میں جس سے مردوں کی گھریلو زندگی متاثر ہوا کرتی تھی۔ عورتوں کے نقطۂ نظر تک اس کے بارے میں پہونچنا آسان ہو جاتا ہے۔ کیا عورت واقعی محسوس کرنے لگی تھی کہ اس کے طرزِ زندگی میں تبدیلی آ رہی تھی۔ اور جو ایسا ہو رہا تھا تو کیا یہ تبدیلی اس کی زندگی کے لیے خوشگوار نتیجے پیدا کر رہی تھی۔ یا ناخوشگوار۔ عورتوں کے ان احساسات کے ذریعہ مردوں کے دعوؤں اور ان کے عمل کی حقیقت بہتر طور سے سمجھی جا سکتی ہے

ایک ضروری اعلان

کاغذ، کتابت، طباعت کے دن بدن بڑھتے ہوئے اخراجات نے کمر توڑ کر رکھ دیا ہے اور نہیں چاہتے ہوئے بھی سہیل کی قیمت میں اضافہ کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑ رہا ہے جنوری ۸۵ء سے سہیل کی قیمت دو روپے ہوگی اور سالانہ چندہ مبلغ ۲۴ روپے، امید ہے کہ قارئین سہیل کا تعاون پہلے ہی کی طرح ملتا رہے گا۔

منیجر

گربچن سنگھ

رونق دکنی سیمابی مرحوم سے ایک ادبی ملاقات

جناب رونق دکنی سیمابی جنھیں علامہ سیماب اکبرآبادی سے تلمذ حاصل تھا۔ اردو کے کہنہ
ق شاعروں میں ان کا شمار تھا۔ عمر تقریباً اسّی سال، کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ آنکھوں کی بصارت کم
ہو گئی تھی۔ لیکن ناتوانی کا یہ عالم نہیں تھا کہ چل پھر نہ سکیں۔ اٹھ کر بیٹھ بھی نہ سکیں۔ روزمرّہ کی زندگی میں کم ہی
رق نمایاں تھا۔ شعر و شاعری کی لگن بدستور قائم تھی۔ ۳ ستمبر ۱۹۸۲ء کو وہ راہی ملک عدم ہوگئے۔ مرحوم
گذرنے سے پہلے بھی چند اشعار کہے تھے دل میں دورِ شباب کی سی تڑپ تھی۔ وہی بے قراری اور مسحور کر
ینے والا جذبہ۔ یہ حقیقت ہے کہ شعر کہنا آسان کام نہیں۔ مکمل غزل اور نظم تو درکنار ایک مصرع بھی صحیح
رکھنے کے لئے دن لگ جاتے ہیں۔ مگر میں نے دیکھا رونق صاحب کی سالہاسال کی ریاضت کے بعد قوت تخلیق
قدر جوان تھی کہ مہینہ میں تقریباً چار پانچ غزلیں اور دو تین نظمیں بلکہ کبھی زیادہ بھی بہ آسانی کہہ لیتے تھے۔ صحت
خرابی اور پیرانہ سالی کے باوجود معلوم ہوتا تھا کہ ذہن و دماغ صحت مند ہے یہ سچ ہے کہ لب پر گویائی تخلیق
نبہ داری کو کھو دیتی ہے۔ مگر ان کے ساتھ یہ بات نہیں تھی ہر شعر کو خوب سوچ سمجھ کر کہتے اور رسالے روزنامے بیشتر
ائل میں ان کی تخلیقات کا شائع ہونا ہی اس کا روشن ثبوت ہے۔

ابتدا میں رونق صاحب یاسیت کے شاعر کہلاتے تھے۔ فانی کی طرح وہ بھی ساری محرومیوں،
یوسیوں۔ ناکامیوں، محرومیوں اور رنج و آلام کا واحد علاج ایک موت ہی کو سمجھتے تھے اور کہتے جاتے تھے

سینے سے لگا لوں میں اے پیکر قضا تجھ کو
دے سکے بس اک تو ہی جینے کا سہارا ہے

ں شاعر وقت اور حالات و تجربات زندگی کے ساتھ بدلتا گیا۔ غم جاناں غم دوراں میں ڈھل گیا اور
[illegible] کے سانچے میں ڈھل گیا [illegible]

مشاعروں کا آغاز بھی انہیں کی ذات سے متعلق رکھتا ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے میری خواہش تھی کہ میں ان کی صحبت میں بیٹھ کر ان کی ذات اور خیالات سے متعلق چند خاص باتیں کروں۔ اور ان کا ادبی خاکہ میں ناظرین کے سامنے پیش کروں۔ ایک دن اسی ارادے سے میں ان کے یہاں پہونچ گیا۔ میرے ذہن میں چند سوالات تھے۔ جن کے جوابات ادب کی دنیا میں دلچسپی اور معلومات سے خالی نہیں ہیں۔ چند مجبوریوں اور پریشانیوں اور کئی ناگوار حالات کی وجہ سے میں یہ انٹرویو ان کی وفات سے چند ماہ قبل لیا گیا تھا کسی پرچے میں نہ بھیج سکا آج وہ نہیں ہیں۔ لیکن ان کی آواز ان کے دل کی دھڑکن اس انٹرویو میں اس مضمون کو پڑھنے والوں کو ضرور سنائی دے گی۔

س: رونق صاحب آپ کی شاعری کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟

ج: شاعری کا شوق مجھے اسکولی زندگی سے ہی تھا۔ یہی آغاز سمجھ لیا جائے۔ اس وقت میں وینگاک (آندھرا پردیش) میں طالب علم تھا تاہم تخلص رکھ چھوڑا تھا۔ دل بہلانے کے لئے ٹوٹی پھوٹی شاعری کر لیا کرتا تھا۔ گھر والوں کو میرا یہ شوق جو جنون کی حد تک تھا کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ میرے بڑے بھائی جناب عبدالرحیم خاں صاحب ٹاٹا کمپنی میں سروس کرتے تھے۔ میرے ذوق کو دیکھ کر انہوں نے جمشید پور کا ذکر کیا۔ جہاں ان کی قربت میں کچھ ایسے لوگ تھے جن کو شعر و شاعری کا شوق تھا۔ اور جن کی صحبت میں رہ کر میں کچھ فیضیاب ہو سکتا تھا۔ لہذا وہ مجھے اپنے ساتھ جمشید پور لے آئے۔ مجھے نوکری میں لگوا دیا۔ یہاں مجھے جناب محمد شریف عاشق جو عمر میں بھائی جان سے کافی بڑے تھے۔ ملاقات کا شرف حاصل ہوا عاشق صاحب بھی دکن (آندھرا پردیش) سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں شعر و شاعری سے رغبت تھی۔ خوب صورت شعر کہتے تھے۔ بڑے ہمدرد اور پرخلوص شخصیت تھی ان کی صحبت سے میری شعر و شاعری کا شوق مستقل بڑھتا گیا میری کوششوں اور ان کی مدد سے ہی اردو کا پہلا مشاعرہ جمشید پور میں مارچ ۱۹۲۳ء میں منعقد ہوا تھا۔ ان دنوں جمشید پور کی چند ایک سڑکوں کو باقی سڑکوں پر بجلی کی روشنی نہیں ہوتی تھی۔ انہیں دنوں میرے گھر کے قریب سڑک پر بجلی کے کھمبے لگے۔ اور روشنی ہوتی تھی۔ سڑک کے کنارے زمین پر چٹائیاں بچھائی گئی تھیں اس پر بیٹھ کر شاعروں نے اپنا کلام سنایا تھا۔ جمشید پور میں یہی سب سے اولین مشاعرہ تھا۔ جس میں جمشید پور کے پانچ لوکل شاعر شامل ہوئے تھے۔ مصرع طرح تھا۔

ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے

ج : فضا ابن فیضی، مظہر امام، احمد ندیم قاسمی وغیرہ۔

س : آپ نوکری پیشہ رہے ہیں شعر و شاعری کے لئے وقت کیسے نکال لیتے تھے؟

ج : فرصت کے ہر لمحے کو میں نے شعری تخلیق کی نذر کیا ہے۔ اس کے علاوہ میں اکثر رات کے وقت دن بھر کے کاموں سے فرصت پاکر اپنے ذوق کی تکمیل کے لیے کاغذ قلم لئے بیٹھا رہتا تھا۔

س : نوکری اور گھر کی ذمہ داریاں کیا تخلیق شعر و شاعری کے راستے حائل رہیں؟

ج : اس کا جواب میں آپ کے پہلے سوال کے جواب میں دے چکا ہوں۔ پھر بھی کہوں گا نہیں! گھر کی ذمہ داریاں اور نوکری میرے تخلیقی ادب میں حائل نہیں رہیں۔ گھر کا ماحول کچھ ایسا پرسکون تھا یا خوشگوار کہہ لیجئے کہ مجھے اس کی طرف کوئی زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

س : نوکری سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد کیا آپ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ شعر و شاعری کے لئے آپ کو زیادہ وقت ملتا ہے؟

ج : بالکل۔ میری روز کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس لئے وقت شعر و شاعری اور مطالعہ ادب میں کٹتا ہے۔ لیکن یہ تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ میری عمر ڈھل چکی ہے۔ میں چاہ کر بھی کتنا کر سکتا ہوں؟

س : آپ نے شعر و شاعری کے علاوہ ادب کے اور کس صنف پر توجہ دی؟

ج : میں نے انگریزی ادب کے کچھ ناول اردو میں ترجمے کئے ہیں۔ کچھ افسانے بھی لکھے تھے جو ادبی پرچوں میں شائع ہوئے تھے۔

س : کیا آپ نے کبھی کوئی ناول لکھنے کی کوشش نہیں کی؟

ج : نہیں! البتہ جارج ولیم رینالڈ کے ناول "رابرٹ میکری" کا ترجمہ آزاد کیا۔ جسے اردو پبلشر لکھنؤ نے "شیشہ ونگ" کے نام سے شائع کیا ہے۔ ایک اور ناول خاکسٹ کا مسودہ تبسم بک ڈپو لکھنؤ کے پاس ہے جو کہ عنقریب شائع ہوگا۔

س : پچھلے برسوں جمشید پور میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تھے آپ کا کافی مالی نقصان ہوا اور یہاں تک کہ آپ کا بہت سا تحریری کلام بھی ضائع ہو گیا تھا آپ کے ملنے جلنے والوں میں ہر ذات اور قوم کے لوگ ہیں آپ نے اس سلسلہ میں کچھ قلم بند کیا ہے؟

ج : کچھ نظمیں اور افسانہ تحریر کئے تھے۔ تخریبی کارروائیاں اکثر گمراہ لوگ ہی کرتے ہیں۔ عام انسان نہیں۔ انسان چاہے کسی قوم یا ملت کا کیوں نہ ہو وہ تو محبت اور خلوص کا بھوکا ہے دوران ملازمت میرا تعلق نوکری والے شعبے سے رہا ہے ہر قوم ملت کے

س: شاعری کیا آپ کو وراثت میں ملی ؟

ج: میرے دادا جان جناب محمد حسین خاں (دماغ پر زور دیتے ہوئے رونق صاحب نے کہا) تخلص یاد نہیں پڑتا۔ اردو میں شعر کہتے تھے میرے والد ماجد جناب شیر خاں اگرچہ شعر نہیں کہتے تھے لیکن انہیں ادبی ذوق بہت تھا فارسی کے بہت بڑے عالم تھے سرکار میں انہوں نے درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دئے تھے ایسے ادبی ماحول کا اثر تو مجھ پر ہونا لازمی تھا۔

س: آپ نے کن شعراء سے اصلاح لی۔؟

ج: میں نے جناب محمد ابراہیم خاں عار بارکپوری سے کو پہلے اپنا کلام دکھلایا۔ جناب عار بارک پوری حضرت شوکت میرٹھی کے شاگرد تھے جنھیں مرزا غالب سے تلمذ حاصل تھا۔ عار بارک پوری ایک پُرخلوص شخصیت تھی۔ ان کے انتقال کے بعد جناب عبدالرشید درد اکبر آبادی کی وساطت سے جناب سیماب اکبر آبادی سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ انہوں نے بڑی کٹھن مشق لیں رکھیں تھیں میرے سلسل ریاض ومشق کے بعد پہلی مرتبہ انہوں نے میرے تین شعر قبول فرمائے تھے۔ اور انہیں ماہنامہ "شاعر" میں جگہ دی تھی۔ مجھے میرا ادبی تخلص جناب منظیم الدین تاج جو تاج الدین بابا کے مرید خاص تھے عطا فرمایا تھا۔

س: آپ کا رجحان غزل گوئی کی طرف زیادہ رہا یا نظمیں تحریر کرنے کی طرف؟

ج: ہر شاعر عموماً پہلے غزل ہی کہتا ہے۔ جب کلام اور اظہار خیال میں زیادہ پختگی آ جائے تو قدرتاً نظم لکھنے کی طرف رجحان مبذول ہو جاتا ہے۔ میں نے سیماب صاحب کی تحریک سے نظم کہنا شروع کی تھی۔

س: آپ کن کن اساتذہ کے کلام سے متاثر ہوئے؟

ج: چونکہ میری زندگی کافی جدوجہد اور تگ ودو میں گزری ہے۔ اکثر مجھے مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس شکستگی کے دور میں لازم تھا فانی کا کلام میرے دل پر زیادہ تاثر چھوڑتا اس کے بعد سیماب صاحب سے متاثر ہوا۔

س: موجودہ دور کے آپ کے پسندیدہ شاعر کون ہیں ؟

اندرا گاندھی

کسے خبر تھی کہ تو اس طرح جُدا ہوگی
زمانے بھر کے لیے ایک سانحہ ہوگی
بجھا تو دی ہے ستم گر نے شمع راہ مگر
ترے لہو کے ہر اک بوند رہنما ہوگی

قیصر عثمانی

لوگوں کی میں نے حتی الوسع مدد کی ہے۔ عام لوگ ابھی بھی مجھے خلوص اور محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں ان کم ظرف لوگوں سے شکوہ کیسا، شکایت کیسی۔

س: آج تک آپ کا مجموعہ کلام سامنے نہ آسکا؟

(تب تک ان کا مجموعۂ کلام پریس میں تھا)

ج: (افسردہ لہجے میں) کیا کہوں اسے میرے مقدر کی بے مائیگی سمجھئے۔

س: جدید شاعری سے متعلق آپ کے کیا خیالات ہیں؟

ج: میں جدید شاعری کو وقت کی ضرورت سمجھتا ہوں۔ لیکن جدید شاعری کے نام پر فن شاعری مجروح ہو میں اس کے حق میں نہیں۔ روایت سے جدیدیت کا رشتہ توڑنا آسان نہیں۔ اگر جدید شاعری میں علامت پسندی پیکریت وغیرہ اگر زیادہ ہی پیچیدہ ہوں تو میرے خیال میں جذبہ اور خیالات مجروح ہو جاتے ہیں خواہ روایتی شاعری ہو یا جدید شاعری، مطلب تو یہ ہے کہ اس کا مفہوم واضح ہو۔

س: ان دنوں آپ کافی کچھ کہہ رہے ہیں کچھ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے کلام میں کہیں کہیں آپ کو شکستِ حیات کی جدائی اور اپنی تنہائی کا درد و کرب بھی لپٹا نظر آتا ہے۔ اس سے متعلق آپ کچھ عرض کرنا پسند کریں گے؟ میرے خیال میں [illegible] عنوان کہا جا سکتا ہے

ج: یہ قدرتی امر ہے کیونکہ میں سماج کا ایک فرد ہوں۔ سماج جن معاشی مجبوریوں اور عبوری دور سے گزر رہا ہے اس کا اثر میری ذات پر پڑنا لازمی ہے چونکہ میرے اظہارِ خیال کا ذریعہ شاعری ہے۔ اس لئے میری شاعری میں یہ نمایاں نظر آتا ہے

س: آپ کے خیال میں اردو اور اردو شاعری کا مستقبل کیسا ہے؟

ج: یوں تو اردو کا مستقبل روشن ہی سمجھنا چاہئے ماحول میں کافی تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ [illegible] کی شادابی سے کوئی کیونکر انکار کر سکتا ہے جہاں تک شاعری کا تعلق ہے شاید اس اعتبار سے یہ کمزور پڑتی جا رہی ہے اس کے لئے روشن تابناک لفظ استعمال کرنے سے پہلے مجھے ذرا کچھ سوچنا پڑتا ہے کہیں میں کوئی غلطی تو نہیں کر رہا ہوں۔

اس شام بلکہ رات گئے میں رونق صاحب کے پاس کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ ایک عمر رسیدہ شخص جس نے زندگی کی تقریباً اسی بہاریں دیکھی ہیں۔ دنیا کے کیسے کیسے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ وہ ایک ایسے چراغِ شب کی طرح جگمگا رہا تھا جس کے سینے میں بیتے ہوئے وقت کا درد، اس کی کہانی اس کے واقعات کا سوز پنہاں تھا۔ کاش یہ چراغ مدت تک جلتا رہتا اور [illegible] روشنی سے ہمیں فیضیاب کرتا رہتا۔ ●

حضرت رونق دکنی سیمابی (مرحوم) کی

چند غیر مطبوعہ غزلیں



تنہائی میں ماضی کو ہوا دیتی ہیں یادیں
خاموشی میں رہ رہ کے رُلا دیتی ہیں یادیں

اعجازِ تصوّر ہے کہ نقشِ کفِ پا سے
ویرانوں میں جو پھول کھلا دیتی ہیں یادیں

بیتے ہوئے ایّام خوش ہنگام کی رُو سے
تنہائی میں صحبت کا مزہ دیتی ہیں یادیں

پردہ سے تصوّر کے کوئی جھانک رہا ہے
یوں ضبط و تحمل کا صلا دیتی ہیں یادیں

نعمت ہے صلح جوئی باندازِ مروّت
بگڑی ہوئی باتوں کو بنا دیتی ہیں یادیں

مٹ جاتا ہے تفریقِ وجود اور تصوّر
جب بیچ کی دیوار کو ڈھا دیتی ہیں یادیں

رونق یہ بشارت ہے کہ وہ آن ملیں گے
بچھڑے ہوئے لوگوں کو ملا دیتی ہیں یادیں



مفہومِ زندگی کو ذرا سا بدل کے آ
آ محشرِ حجاب سے باہر نکل کے آ

ہر گام ہوگا موجبِ تابانیٔ حیات
موجِ ہوا پہ اب کے نہ آ، خود ہی چل کے آ

"مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو"
جامِ شراب میں نہ سہی، سَم میں ڈھل کے آ

ہے آدمی بقدرِ انا تنگ کائنات
انساں کے روپ میں کبھی کسی دن بدل کے آ

جہدِ عمل سے چاہیے پہلے مہم کی جانچ
واپس مہم سے دستِ تاسف نہ مل کے آ

ہر گام واجبات پہ ہے منحصر اے دوست
خوش آمدید! مونگ نہ سینے پہ دل کے آ

اِک پل صراط ہے جہدِ راہِ عشق بھی
لغزش نہ میرے پاؤں میں آئے سنبھل کے آ

کائی جمی ہوئی ہے رہِ انبساط پر
باہوں میں لے پناہ میرے اور پھسل کے آ

رونق کو ایک عرصے سے ہے میری جستجو
گمنامی کے حصار سے باہر نکل کے آ



نہ پرندہ نہ وہ چرندہ ہے
آدمی بدتر از درندہ ہے

وقت اور وقت کا ٹھکانا کیا
وقت ایک موسمی پرندہ ہے

بشرِ انسانیت نواز بھی ہے
وائے وحشت کبھی درندہ ہے

شہر کی بود و باش راس نہیں
اجنبی، پر کٹا پرندہ ہے

موجبِ غارتِ دل و دیدہ
حسن پائندہ اور زندہ ہے

چیز وہ معتبر! جو دیکھی گئی
غیر وقعت ہے جو شنیدہ ہے

ہوئی رونق کو چل بسے مدت
لوگ کہتے ہیں وہ تو زندہ ہے



ہو گئے اب بہت اپنے پرائے
آ گئے جیسی آپ کی رائے

ایسا بھی ایک وقت آیا ہے
وہ سمجھے اپنے ہم سمجھے پرائے

آنگن میں آسیب کے موجب
ہوتے ہیں قد آور سائے

ایسے رہو دنیا کے فن میں
کوئی تمہیں پہچان نہ پائے

بعد میں کیوں ہو افراتفری
شہر میں پہلے ڈھونڈ سرائے

بھینی بھینی قرب کی خوشبو
تنہائی میں دور سے آئے

پیاسی رت اور بادل تنہا
کس کی کس کی پیاس بجھائے

ضبط کے ٹانکے ٹوٹ رہے ہیں
کس کی یاد، انگڑائی آئے

اس کی کیا تعبیر ہو رونق
کوئی تھا دامن پھیلائے



موتی کھنگالو، یا کبھی گوہر سمیٹ لو
دریائے فکر و فن سے نہ کنکر سمیٹ لو

دہلیز سے نہ جھانکو، یہ تہذیب کے خلاف
خود اندرونِ خانہ کے منظر سمیٹ لو

اونچی اڑان ہے پر پرواز کا بھرم
کیوں مرغِ خوش نوا کی طرح پر سمیٹ لو

آئینہ کی دوکان کی رونق اسی سے ہے
ہرگز نہ چاروں سمت سے پتھر سمیٹ لو

پرچم بناؤ جس سے ہو ظاہر عزمِ حیات
مردہ کی طرح منھ پہ نہ چادر سمیٹ لو

رہنے دو دل کو شہر کی رعنائیوں میں گم
تم دامنِ نگاہ میں منظر سمیٹ لو

ہوتی ہے ہر حرام کی شے لذتِ نظر
رزقِ حلال جو ملے بڑھ کر سمیٹ لو

ابہام سے تو پاک نہ ہوگی کتابِ شوق
یہ کیا کہ صرف حرفِ مکرر سمیٹ لو

رونق ہے ہم مزاجی میں امکانِ اختلاف
باہر کی کوئی شے کبھی نہ اندر سمیٹ لو

نصر قریشی

دسمبر کی آخری رات، جنوری کی پہلی صبح.....

وقت چپ چاپ گزر جاتا ہے بے صوت و صدا
شاخِ گل، برگِ حنا، بادِ خزاں، زرد ہوا
مرثیہ پڑھتا ہوا گزرے ہے لمحہ لمحہ

زندگی ساز کی ٹوٹی ہوئی لے کی صورت
ہر گھڑی الوداع کہتی ہوئی ہوگی رخصت
حالِ ماضی کے دیاروں میں کرے گا ہجرت

موج در موج سفینوں کا نشاں کچھ بھی نہیں
بادباں چیختے طوفانوں میں کھوئے ہیں کہیں
زندگی خواب کی مانند کریں کس کا یقیں

یاد کی رہگزر، چاند ستاروں کا نزول
شاخِ دل پر ہے ابھی دردِ جدائی کی دھول
امتی ڈھونڈے شفاعت کے لئے اپنا رسول

—— آخری رات دسمبر کی سسکتی گزرے
اپنا شیرازہ لئے عمرِ دو روزہ بکھرے
رات کی وادی میں پھر صبح کی دیوی اترے

مرثیہ پڑھتی ہوئی رات، غزل خواں سورج
عہدِ ماضی کے جنازے پہ ہے گریاں سورج
روشنی لے کے اندھیروں میں درخشاں سورج

رات کے بطن سے اک صبح نمودار ہوئی !!
زندگی پھر سے سفر کے لئے تیار ہوئی !!

...سی رام نگری

...وق کے دیئے

...ر کے باغ میں لگا ہے آج
...ے میلہ سا گل عذاروں کا
...ہ زن جیسے ہو گیا ہو آج
...روان عنبریں بہاروں کا
...ہیں رنگیں غزل سے بھی رنگیں
... ان کے جواب کہاں
...ت انہیں پر شباب آیا ہے
...سی اور پر شباب کہاں
...ئیں میں بہار رقصاں ہے
...ا برسات گیت و رنگ لئے
...سی پروائی چل رہی ہے مگر
...ق کے جل رہے ہیں دل میں دیئے

اویس احمد دوراں

نہ پیاسوں کی ملیں قطاروں سے ملئے — نہ گلشن کے سینہ فگاروں سے ملئے
ہے جن کے لئے رقص میں راجدھانی — ان البیلے سرمایہ داروں سے ملئے
حضور آپ ہیں اس گلستاں کے مالک — نہ یوں جھک گئے ہم خاکساروں سے ملئے
جہاں تک ہو چھلکائیے جام زریں — شب و روز رنگیں بہاروں سے ملئے
زمیں رو رہی ہے تو رونے بلا سے — مگر آپ چاند اور ستاروں سے ملئے
بصد ناز سیمیں غزال آ رہے ہیں — جناب آئیے ماہ پاروں سے ملئے
یہ بد صورتوں کی ہے بستی یہاں پر — چلے جائیے گل عذاروں سے ملئے
میں شاعر ہوں زخمی گلوں سے ملوں گا — ہیں آپ اہل زر شہریاروں سے ملئے
یہ آگ آپ ہی کی لگائی ہوئی ہے — بجھ بوجھ کر شعلہ زاروں سے ملئے

مرے گاؤں کے دل فگاروں سے ملئے — ادھر آئیے بے قراروں سے ملئے
کلیجے سے جن کے دھواں اٹھ رہا ہے — کبھی آ کے ان سوگواروں سے ملئے
ندامت کی زنجیر ہے جن کی زد میں — نئی آگ کے ان شراروں سے ملئے
رفاقت کے جذبے لئے جو کھڑے ہیں — ذرا اپنے ان غم گساروں سے ملئے
یہ ہم بے نواؤں کی محفل ہے دوراں — بصد جان و دل اپنے پیاروں سے ملئے

ڈاکٹر [illegible]

گرمیٔ حشر سمٹ آئی ہے بازاروں میں — میں اکیلا نظر آتا ہوں گنہگاروں میں
گھر سے بکنے کو نکل آیا تو ارزاں ٹھہرا — جتنے کم ظرف تھے شامل ہیں خریداروں میں
ایک آواز بلاتی ہے خلاؤں سے پرے — ایک جادو لئے جاتا ہے مجھے تاروں میں
دفن ہونے کے لئے اپنی زمیں کافی ہے — خاک سے اٹھ کے کہاں جاتا ہوں سیاروں میں
راستہ راستہ اشجار کھڑے رہتے تھے — شاخ در شاخ مدھر گیت تھے گلزاروں میں
منتشر ہو گئی معصوم پرندوں کی قطار — اب کوئی گیت چہکتا نہیں منقاروں میں
جرأت عشق اگر تھی تو بچائے رکھئے — کس لئے پھینک دی ننھی سی کلی چاروں میں
ہم تو رہتے تھے کبھی چھاؤں میں بوندوں کی — آج کیوں سہم گئے خون کی بوچھاروں میں
زندگی اس قدر مایوس و ہراساں کیوں ہے — جیسے دوشیزۂ معصوم ہوس کاروں میں
کہکشاں میں نے بکھرتے ہوئے دیکھی تھی مگر — "گرد ہی گرد ہے اس شہر کے بازاروں میں"
[illegible] — اے مہربان اجل ! اپنے گرفتاروں میں

بدیع الزماں خاور

شوق کا اضطراب لکھوں گا
اک غزل انتخاب لکھوں گا

اپنا حالِ خراب لکھوں گا
اس کے خط کا جواب لکھوں گا

زخم ابھی بند ہے کلی کی طرح
کھل گیا تو گلاب لکھوں گا

مجھ سے مانگے اگر جواب اپنا
میں اسے لاجواب لکھوں گا

رات آجائے گی تو دن بھر کا
ڈائری میں حساب لکھوں گا

لاکھ تم نام دو سمندر کا
میں تو اس کو سراب لکھوں گا

وقت نے ساتھ اگر دیا خاور
اور کبھی اک کتاب لکھوں گا

ڈاکٹر ساقی سنبھلی شہری

گھر ہو یا کوچہ و بازار کہاں ملتے ہیں
اب صداقت کے طرفدار کہاں ملتے ہیں

جب ملے ہیں تو ذرا پیار کی باتیں کرلیں
روز مجھ سے مرے سرکار کہاں ملتے ہیں

ڈوبنے والا کنارے کی طرف کیا دیکھے
اس زمانے میں مددگار کہاں ملتے ہیں

ایسے نایاب تو دیوانے نہیں ہیں لیکن
آجکل وہ بھی سرِدار کہاں ملتے ہیں

تم بتا سکتے ہو تو مجھ کو بتا دو یارو
اہلِ دل صاحبِ کردار کہاں ملتے ہیں

اتفاقاً ہو سرِ راہ ملاقات، تو ہو
میرے گھر آکے مرے یار کہاں ملتے ہیں

اس ملاقات میں بھی ہے کوئی مقصد ساقی
بے غرض ہم سے یہ زردار کہاں ملتے ہیں



کہتا ہے کون میرا محلے میں گھر نہیں
یہ بات اور ہے کوئی دیوار و در نہیں

سر سے کفن کو باندھ کے نکلے تو یہ کھلا
کیا مرد آدمی ہے ہتھیلی پہ سر نہیں

لکھوا رہے ہیں پھر سے وہ تاریخ اس طرح
میری وفا کا ذکر کہیں اک سطر نہیں

آنکھیں عزیز ہیں تو تماشا نہ دیکھئے
سورج کا ناچ ہے کوئی رقصِ شرر نہیں

خود کو بھلا دیا تو تمھیں بھی بھلا سکے
لیکن غمِ جہان سے ہم کو مفر نہیں

صحرا بہ صحرا بھاگتے رہنا بجا نہ ہے
ٹھہریں کہاں کہ سائے کا کوئی شجر نہیں

عالم بہت سے مجھ سے کئی نور سال ہیں
میرا تمہارا فاصلہ کیا ہے خبر نہیں

پانی کا ایسا قحط نہ دیکھا کبھی سنا
دامن ہزاروں تر ہیں کوئی آنکھ تر نہیں

انجانی راہیں راستے تکتی رہیں اے غزل
معلوم منزلوں کا سفر کچھ سفر نہیں

ے LIGHT YEARS

علی عباس غزل



ہمیں باور کرایا تھا کہ فصلِ گل لگاتے ہیں
انھی کے دانت بوئے تھے جو خنجر لہلہاتے ہیں

وفورِ شہر یاری میں شہر ہی کر دیا ویران
ڈھنڈورا پیٹتے ہیں ہم نئی بستی بساتے ہیں

اہنسا کی سند تاریخ نے ہم کو صحیح دی ہے
کسی کا خون تھوڑی ہے فقط پانی بہاتے ہیں

چمن میں صرف چھت چھڑکی ہوا ہے سوکھے پتے ہیں
یہ میرے کان بجتے ہیں کہ بجنی چہچہاتے ہیں

سیاہ شب پر سفیدی پوتنے سے کیا سحر ہوگی
غضب ہے ماہرینِ صبح بھی یہی بتاتے ہیں

جو رہبری کو منزل مان بیٹھے کیا ہوا ان کا
کنارے راہ کے بکھرے ہوئے پنجر بتاتے ہیں

ہمیں تو جب بھی دیکھا ہی انہوں نے تیرے دیکھا
تاثر ایسا دیتے ہیں کہ گویا مسکراتے ہیں

تمہارے معبدوں سے میرا مے خانہ مقدس ہے
یہاں ہر جھوٹ باہر رکھ کے انسان اندر آتے ہیں

چلو یہ زندگی بھی نذر کر دیں ان ہلوسے کی
وہ گھر آئے ہمارے اور ہم آنکھیں بچھاتے ہیں

ے HALLUCINATION

[illegible] ہادی

حیات قافلۂ کائنات میں گم ہے — بشر تلاشِ شبیہِ حیات میں گم ہے
نظر تو گم ہے تری ظاہری چمک میں مگر — سمندِ فکر ترے معجزات میں گم ہے
کوئی چراغ تو ا ـــ کے سامنے رکھ دو — کہ دل تجوں سے رم وحل ذات میں گم ہے
ہوس بدوشِ صبا اس کو چھیڑتی کیوں ہے — کہ جو تصورِ روئے صفات میں گم ہے
جو بات ہوئی بھی وہ پہنچی مگر ابتک — ندیم تجزیۂ واردات میں گم ہے
یہ جان کر کہ حقیقت ہر صرف پرچھائیں — نگاہِ حسن رخِ نظریات میں گم ہے
سنائے بھی تو وہ کیسے کسی کو نغمۂ ضبط — کہ خود ہی زمزمۂ خواہشات میں گم ہے
مجھے جمیلِ معانی سے ہے شغف ہادی — مری غزل بھی اساسی نکات میں گم ہے

[illegible]

محبت روح کو سوز دروں سے بخشا ہے — چراغِ ظلم و استبداد پھونکوں سے بجھائے ہے
نہ جانے کون سی وادی میں اب پہنچے ہیں دیوانے — خیالِ صحنِ گلشن اُن کو رہ رہ کر ستائے ہے
عقیدت ہی بنا ہے پختگی قصرِ ایماں کی — عقیدت کو بدل دینے سے تو ایمان جائے ہے
نہ پوچھو باہمی الفت وطن میں رہنے والوں کی — پڑوسی خود ہمارا دشمن جاں بن کے آئے ہے
نہ اتراؤ اگر ساحل کی حد تک آ گئے ہو تم — کہ ساحل کے قریب آ کر بھی کشتی ڈوب جائے ہے
پیام شادمانی پر کوئی پھولے تو کیا پھولے — خوشی کے ساتھ ماضی کا الم بھی یاد آئے ہے
مگر اہلِ خرد سے کہہ دو آ کر پھول برسائیں — کہ اک دیوانہ ویرانے میں قندیلیں جلائے ہے

[illegible] طالب

کرب و بلا کا واقعہ گھر گھر ملا مجھے — چاروں طرف یزید کا لشکر ملا مجھے
پھر آسمانِ وقت پہ لالی سی چھا گئی — چھت پر لہولہان کبوتر ملا مجھے
جو پیٹھ پر گری تھی وہ دیوار گھر کی تھی — میرا حریف اپنے ہی اندر ملا مجھے
میں کا غذی وجود کہاں تک سنبھالتا — ہر گام خواہشوں کا سمندر ملا مجھے
سینے میں گھٹ کے رہ گئی پرواز کی طلب — ٹوٹا ہوا وجود کا شہپر ملا مجھے
ہر سمت سینہ تانے کھڑے تھے ابو جہل — کوئی ولی نہ کوئی پیمبر ملا مجھے
جس پر یقیں کے چودہ طبق تھے کھلے ہوئے — دشتِ گماں میں ایسا بھی منظر ملا مجھے
میں ہر قدم پہ سب کو کچلتا رہا طلب — گردن پہ خواہشوں کی وہی سر ملا مجھے

ڈاکٹر رادھے سرن ارمان بلاروی

بیوی کا سایہ

"ماتا کا کوئی بھی کیس لانے والے کو ایک
ہزار روپیہ نقد انعام"

اپنے مکان کے پچھواڑے گلی سے گزرتی ہوئی
دیوار پر لکھا ہوا منشی جی بہت دھیان سے پڑھ رہے
تھے۔ وہ تو ہندی اچھی خاصی جانتے تھے۔ اگر کوئی کم
پڑھنے والا بھی ہجے کر کے پڑھتا تو بھی اتنی دیر نہیں لگتی۔
ان کی نظر بار بار دیوار پر چپکی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا شاید
اشتہار میں کوئی غلطی رہ گئی ہوگی۔ جو اتنی دھیان سے دیکھ
رہے ہیں۔ مجھ سے رکا نہ گیا اور ان کے پاس جا کر پوچھ ہی
بیٹھا

"منشی جی بہت دھیان سے کیا پڑھ رہے ہو؟"

انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا اور سنبھل کر
کہنے لگے "سکسینہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان نے پلیگ
اور طاعون کی طرح چیچک پر بھی قبضہ پا لیا کتنی بڑی بات"

اتنی بات کہہ کر وہ خاموش ہو گئے اور چپ چاپ کچھ
سوچنے بچارنے لگے۔ میں چپ چاپ کھڑا تھا
منتظر تھا کہ کچھ نئی بات سننے کا۔ جب وہ کئی منٹ
نہیں بولے تو میں نے ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں
آنسو تھے۔ وہ رو رہے تھے [illegible]

ایکدم کیا سوچ کر رونے لگے۔ میں بولا۔

"منشی بلاوجہ کیوں رو رہے ہو؟"

انہوں نے آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا
"سکسینہ دنیا میں کوئی کام بلاوجہ نہیں ہوتا
ہے میرے رونے کی بھی ایک خاص وجہ ہے جسے کوئی
نہیں جانتا۔ اس ماتا نے میری بیوی کو مجھ سے چھین کر
میری زندگی ہی تباہ کر دی تھی۔ میرے تمام سکھوں پر
پانی پھیر دیا"

اتنا کہہ کر وہ پھر سسک سسک رونے لگے۔ میں
اب سمجھ گیا تھا کہ ان کی اس اشتہار سے اپنی گزری
ہوئی بیوی کی یاد آ گئی تھی۔ میں نے ان کو دھارمک
اپدیشوں کا سہارا لے کے طرح طرح سے سمجھایا دلاسا
دیا "تم ٹھیک کہتے ہو منشی جی بیوی کے مرنے کے
بعد آدمی کے تمام سکھوں کا انت ہو جاتا ہے" یہ میرے
الفاظ تھے۔ یہ سن کر منشی جی بولے۔

"سکسینہ بیوی کے مرنے کے بعد صرف سکھوں کا
انت ہی نہیں ہو جاتا بلکہ سماج کی نظر میں اس شخص کی
کوئی عزت بھی نہیں رہتی۔ ساری سماجی، گھریلو، شہرت
[illegible]

منشی جی کی ایک بات سے تو میں متفق تھا۔
یہ تمام باتیں بیوی کے مرنے کے بعد ختم ہو جاتی ہیں۔
مجھے اس پر شک تھا اور دل ہی دل میں ان سے نا اتفاقی
پنپ رہی تھی لیکن میں نے لب نہیں کھولے تھے اور چپ
چاپ سن رہا تھا۔ ان کا سلسلۂ کلام جاری تھا۔

"مجھے اپنی بیوی مرنے کے بعد اس کا تجربہ ہوا
ہے" اتنا کہہ کر وہ رکے میرے پاس بھی کوئی کام نہیں
تھا میں نے ان کے دل کو کریدا۔ انہوں نے آگے کہنا
شروع کیا۔

"جس وقت میری بیوی کا سورگ باس
ہوا تھا۔ اس وقت میرے پاس دو بچے تھے۔ ایک
ڈیڑھ سال کا، دوسرا تین ماہ کا۔ جب میں اس کو
شمشان تک وداع کرنے گیا تو ان بچوں کو بشیر کی
بیوی کریمن نے سنبھالا تھا۔ اسی نے اس کی بیماری
میں بھی ان بچوں کی دیکھ ریکھ کی تھی ورنہ زیادہ تر
عورتیں تو بیچ بچ کر نکل جاتی تھیں۔ کچھ بیماریاں ایسی
ہیں جن سے لوگ بھاگ ڈرتے ہیں۔ اب کریمن بھی اللہ
کو پیاری ہو چکی ہے۔ دو بچے بھی اس نے چھوڑے تھے
جو اب دونوں جوان ہو چکے ہیں۔ میری طرح بشیر نے
دوسری شادی نہیں کی۔ اور بچوں کو پالا پوسا۔
ایک بار بشیر کا لڑکا پتنگ اڑاتے ہوئے چھت سے نیچے
گر گیا۔ بشیر اس کو لے کر فوراً اسپتال چلے گئے چلتے
چلتے وہ مجھ سے صرف اتنا ہی کہہ گیا کہ محمودی تمہارے
ذمے ہے دھیان رکھنا۔ ان کے پیچھے [illegible]
تھے میں نے بھی حق ادا کرنے میں کوئی کسر نہ [illegible]

اپنے بچوں کی طرح حفاظت کے ساتھ اس کو رکھا۔
جب تک وہ گھر نہ لوٹے میں نے پل بھر کو اسے تنہا نہ
چھوڑا۔ اپنی بیٹی سے بھی زیادہ عزیز سمجھ کر رکھا۔ اللہ
بخوبی بہتر جانتا ہے مگر اس سماج نے کیا کیا
نہ کہا۔ اگر میری بیوی زندہ ہوتی تو سب لوگ ڈھک
جاتے کوئی انگشت نمائی نہ کرتا۔ مگر اس کے نہ ہونے
میری شرافت بھی شک کی نظروں سے دیکھی گئی۔
اور مجھے سب نے بدنام کیا۔

ایک بار چھنیا دھنوری کی لڑکی کی شادی
کے موقع پر اس کو کچھ روپیوں کی ضرورت پڑی۔ بچاری
چھنیا سارے گاؤں میں گھوم لی، مگر کسی نے کانی کوڑی
بھی نہ دی۔ کیونکہ اس کا شوہر اپاہج تھا۔ اس دنیا میں
قرض بھی اسی کو ملتا ہے جس سے واپسی کی امید
ہوتی ہے۔ ہار تھک کر آخر میرے پاس آئی۔ اور
ایک ہزار روپے کی طلب کی۔ میں نے فوراً نکال کر
دے دیئے۔ اور کہا کہ تم اس روپے کو آسانی
کے ساتھ ادا کرتے رہنا۔ میں تقاضہ نہیں کروں گا
اور نہ ہی سود لوں گا۔ کیونکہ یہ روپیہ لڑکی کی شادی
میں دیا جا رہا ہے۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئی اور
طرح طرح کی دعائیں دیتی چلی گئی۔ شادی ہو گئی۔ چھنیا
نے میری اس بھلمنساہت کی جگہ جگہ تعریف کرنی شروع
کی مگر کچھ لوگ تو اس کے منہ پر کہہ دیتے تھے کچھ اس
کے پیچھے کہتے سنے گئے کہ منشی جی نے اتنی بڑی رقم
یونہی [illegible] کے یوں ہی نہیں دے دی ہے۔ دال میں
ہے ایک کالا [illegible]

لے گا ۔ وہ بھی احسان سے دب گئی ہے انکار نہ کر سکے
۔ اس زمانے میں بے مطلب کوئی کسی کی مدد نہیں
کرتا ہے ۔ بستی کے لوگوں کی یہ ساری باتیں کسی
کسی طرح مجھ تک بھی پہونچ گئیں۔ بہت دکھ ہوا۔ کبھی
جی چاہتا تھا کہ گھر چھوڑ کر کہیں باہر چلا جاؤں
اور ان لوگوں کا منہ نہ دیکھوں۔ پھر دماغ میں آتا کہ
جہاں بھی کہیں جاؤں گا سماج ضرور بدلا ہوا ملے گا
سوچنے کا ڈھنگ اس سماج کو بھی یہی ہوگا۔ اس
لئے یہی ٹھیک ہے میں اپنے راستے پر ٹھیک ہوں۔
کتے دو بھونکنے والوں کا۔ ہاتھی جس راہ سے گزرتا ہے
بیکاروں کتے بھونکتے رہ جاتے ہیں۔ اس طرح میں نے
اپنے دل کو سمجھا لیا۔

ایک بار سکھن ! سوکھا آوٹی سی کا لڑکا سردی
مارے ٹھٹھر رہا تھا میں نے ترس کھا کر اپنے بچے کے
اترے ہوئے کپڑے اس کو دیئے جس سے اس
کا جسم ڈھک گیا۔ اور سردی دور ہوگئی۔ اس بچہ
کو مجھ سے پیار ہوگیا اور میرے گھر آنے جانے لگا۔
گھنٹوں میرے بچوں کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا۔ کبھی کبھار
میں اس کو کھانا بھی کھلا دیتا تھا۔ کبھی گڑ بھی دیدیتا تھا
میں ان باتوں کو اپنی ماں سے بھی بول دیتا تھا۔
وہ اپنی سہیلیوں میں بیٹھ کر یہ باتیں کھول دیتی تھی
عورتوں کی کاغذی زبان ہوتی ہے میری یہ باتیں کر
ساری بستی میں عام ہوگئیں۔ وہی عورتیں جو میری
تعریف کرتی تھیں بعد میں اپنا ریمارک بھی کس دیتی
تھیں کہ جینا وہ موا رنڈوا یوں ہی بچے سے پیار نہیں

ڈر سا آتا ہے۔ یوں ہی بچے کو کچھ نہیں چھپتا ہے۔ کسی عورت
کا دل موہنے والا پہلے اس کے بچے کو پیار کرتا ہے۔ گھوم
پھر کر یہ باتیں پھر میرے کانوں میں آگئیں میرے جھٹکا
سا لگ گیا۔ مگر میں نے پھر ضبط سے کام لیا اب میں
اس طرح کی باتیں سننے کا عادی ہوگیا تھا۔ اور کسی کی کوئی
پرواہ نہیں کرتا تھا۔ مجھے جو اچھا لگتا تھا کرتا تھا۔ میں
عادت سے مجبور تھا اور اپنی عادت کے مطابق جو بھی
بن پڑتا تھا لوگوں کی وقت ضرورت مدد کر دیتا تھا ایک
بار کی بات ہے بے چارہ ہنچل گنے کی گاڑی پر سے
نیچے گر گیا۔ ابھی اس کی شادی کو ایک ہی برس ہوا تھا
اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی، پلاسٹر چڑھایا گیا۔ اور پورے
چالیس دنوں تک بستر پر پڑا رہا۔ گاڑی بھرا کنبہ تھا
مگر کسی نے اس کا کام نہیں دیکھا۔ بیوی کو تنہا کھیت
کیاری میں دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ میں اس کا پڑوسی
تھا مجھ سے اس کی مجبوری میں بگڑتا ہوا کام نہیں
دیکھا گیا اس ہمدردی کا نتیجہ کیا نکلا ہے پتہ ہے ؟ میں
نے اس کے سوالیہ انداز بیان پر کہا کیا نتیجہ نکلا ؟

وہ بولے لوگ کہنے لگے منشی جی بہت ہوشیار
آدمی ہیں، ہنچل کی بیوی سے ملاقات کا کیا طریقہ نکالا ہے
کبھی کھیتوں پہ اپنا کام دیکھنے جائے گی ہی مجبوری بھی
سب کو ڈگا دیتی ہے۔ اس طرح یہ اپنا الو سیدھا
کر لیں گے۔ ان تمام باتوں سے تم نے کیا مطلب نکالا
سکھن، منشی جی نے ادھیر بھاؤ سے کہا۔

میں نے کہا منشی جی آپ نے شرافت کے
کسی کی حفاظت کی، کسی مجبور کی مدد کی، کسی غریب پہ

ترس کھا کر اس کو قرض دیا۔ کسی کے بچے کے ساتھ اپنا
بچہ سمجھ کر خلوص و پیار برسایا۔ اور کسی لاچار کے وقت
پر کام آئے۔ یہ سب بڑے اور اچھے پُرکھوں کی علامت
ہیں مگر سماج نے ان تمام باتوں کا ایک ہی مطلب
نکالا کیونکہ سب کے سوچنے کا ڈھنگ ایک ہی جیسا
ہے اگر آپ کی بیوی زندہ ہوتی تو یہی لوگ اور
طرح سے سوچتے اور آپ کی شرافت کو بدنام بھی
نہیں کرتے۔ سب سچ مچ آپ کے سب لگ بھی
جھک جاتے۔ منشی جی آپ نے جن لوگوں کے ساتھ
اچھائی کی ہے کیا وہ بھی آپ کو غلط سمجھتے ہیں ؟۔
میرے سوال پر منشی جی ایک دم چونک کر بولے نہیں
ان میں سے ایک بھی نہیں وہ سبھی میری تعریف
کرتے ہیں۔ بلکہ مجھے برا بتانے والے سے وہ لوگ لڑ

بھی بیٹھتے ہیں"
منشی جی بھگوان کا شکر ادا کرو کہ وہ س
لوگ آپ کے ممنون ہیں، مداح ہیں۔ پوری ب
آپ کی تعریف کرنے والے اور احسان ماننے و
جو لوگ ہیں تو سہی۔ دیکھتے جاؤ ایسا وقت بھی آ
ہے کہ کوئی کسی کا احسان ہی نہیں مانے گا۔ او
مناہت کی تعریف ہی نہیں کرے گا اچھا سوچ
اچھا کرنا اچھوں کا کام ہے۔ تم جانتے ہو کہ اچھے
گھٹتے جا رہے ہیں۔ اچھائی کم ہوتی جا رہی ہے"
میری بات سن کر منشی جی کے چہرے پر
خوشی کی لہر دوڑ گئی جیسے غموں سے بیزار کسی شخ
کے چہرے پر صبح کی روشنی دیکھ کر خوشی
جاتی ہے ●

کہانی

پناہ گاہ

ذکیہ صدا

"فری"
"ہوں"
"اگر میں تمہیں نہ پاسکا تو!"
"ہوں"
"فری"
"ہوں"
"کچھ تو کہو فری۔ اگر تمہاری زلفوں کی چھاؤں مجھ سے چھن گئی تو"
"تمہیں بہت زلفیں مل جائیں گی"
"خدا کے واسطے ایسا نہ کہو"
"ثاقب"
"میں تمہاری زلفوں کے حسن میں اتنا الجھ چکا ہوں کہ اب نکلنا مشکل ہے"
"ثاقب! دنیا میں اور بہت حسن ہے"
"مگر مجھے کسی اور حسن کی تمنا نہیں ہے"
"تم غلط کہتے ہو"
"مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"
"یہ باتیں افسانوی ہیں"
"آزما کر دیکھ لو"
"آزمانے کے لئے اپنی زندگی داؤ پہ لگانا پڑے گی کون جانے ہار ہو گی یا جیت"
"تم زندگی کی بازی ضرور جیتو گی"
"مجھے ڈر لگتا ہے"
"کیوں کیا میری محبت پہ اعتماد نہیں ہے؟"
"اگر محبت پر اعتماد کر بھی لوں تو وقت کا اعتبار ہے"
"وقت تم پہ ثابت کر دیگا کہ میری محبت کیا ہے"
"ہوں۔۔۔ تو کیا زندگی کا جوا کھیل جاؤں؟"
"ہاں فری! ہاں مجھے اپنی زلفوں کے گھنیرے میں پناہ دے دو۔ میری زندگی کو یوں ختم نہ کرو۔ میں جاؤں گا"
"تو میں تم پہ اعتبار کر لوں؟"
"ہاں فری"
"اچھا تو پھر ڈیڈی سے بات کرلو"

"فری"
"ہوں"
"فری میں کتنا خوش قسمت ہوں"
"مجھے یہ گھنا گھنا سایہ مل گیا ہے۔ اب ان زلفوں کی چھاؤں میں زندگی گزار دوں گا"

"ہوں"

"فری مجھ سے خوش تو ہو نا"

"ہوں"

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ آزما کر دیکھو"

"ہوں"

"دیکھو میں تمہاری آزمائش پہ پورا اترا ہوں نا"

"ہوں"

"تم نے جو اپنی زندگی کی بازی داؤ پہ لگا دی تھی اس میں تمہاری جیت ہو گئی نا"

"ہوں"

"دو زندگیاں تباہ ہونے سے بچ گئیں۔ تم بھی بچ گئیں اور میں بھی"

"ہوں"

"میں تمہیں پا کر کتنا خوش ہوں فری۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں"

"ہوں"

"اب زندگی کتنی حسین ہو گئی ہے"

"ہوں"

"زندگی کا سارا حسن ہماری جھولی میں آن گرا ہے"

"ہوں"

"ہم کتنے خوش قسمت ہیں فری! کتنے خوش قسمت ہیں"

"ہوں"

"آج مجھے دنیا کی اتنی بڑی دولت ملی ہے، اتنی بڑی دولت کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔"

"ہوں"

"ہاں فری۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے اپنی محبت اپنی چاہت، یوں مل جائے گی۔"

"ہوں"

"فری۔ خدا کرے یہ لمحے جاوداں ہو جائیں۔ اور ہماری ساری زندگی اس لمحے میں سما جائیں"

"ہوں"

"فری فری"

"ہوں"

"تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں"

"بس پانچ منٹ"

"پکچر کو دیر ہو رہی ہے"

"بیٹھیے میں تیار ہو گئی"

"اُف کتنی حسین لگ رہی ہو"

"مذاق نہ کیجئے"

"یقین کرو فری۔ آج لوگ پکچر کے بجائے تمہیں دیکھیں گے"

"دُنیا میں بہت حسن ہے ثاقب"

"میرے دل سے پوچھو میرے لئے کہاں حسن ہے۔ تو تمہارے علاوہ دُنیا میں کوئی چیز حسین نظر نہیں آتی"

"ارے جانے بھی دیجئے، کیا رکھا ہے ان باتوں میں"

"تم کبھی میری بات کا یقین نہیں کرتیں"

"یقین کرنے والی بات ہو تو کروں"

"کاش میں اپنا دل چیر کر دکھا سکتا۔ جس میں تم ہی تم

"آپ بہت باتیں کرتے ہیں"

"کبھی تو میری محبت کا تم یقین کر لو
کہیں نہ عمر گذر جائے آزمانے میں"

"محبت آزمانے کے لئے ایک عمر ہی درکار ہے"

"ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں"

"یونہی ہی ساری عمر پڑی ہے"

"دیکھ لینا تم مجھے ثابت قدم پاؤ گی۔"

"دیکھوں گی۔"

"جب میں اسّی سال کا ہو جاؤں گا اور تم پچھتر سال کی۔ پھر تم سے پوچھوں گا کہ میری محبت کتنی سچی ہے۔"

"اچھا اچھا۔ وہ وقت تو ابھی دُور ہے چلے پکچر کو دیر ہو رہی ہے۔"

"ثاقب! یہاں کتنا سناٹا ہے۔"

"کبھی کبھی دُنیا کے ہنگاموں سے دل گھبرا جاتا ہے۔ تو جی چاہتا ہے کہ ہم دونوں کسی الگ تھلگ گوشے میں بیٹھ جائیں جہاں کوئی نہ ہو۔"

"مگر اس سناٹے سے خوف آتا ہے۔"

"میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔"

"ہوں"

"میں زندگی بھر تمہارے ساتھ رہوں گا پھر تمہیں کبھی سناٹے سے خوف نہیں آئے گا۔"

"کاش ایسا ہی ہو۔ نہ معلوم کیوں مجھے کوئی انجانا سا خوف ستاتا رہتا ہے۔"

"فری ایسی باتیں نہ سوچا کرو۔ ہم یہاں اکیلے تو نہیں ہیں۔ دیکھو سامنے درخت پر دو پنچھی بھی ہماری طرح باتیں کر رہے ہیں۔"

"ہوں۔"

"دونوں ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔"

"ارے وہ دیکھو ثاقب ان میں سے ایک پرندہ تو اُڑ گیا۔ اور اپنی مادہ کو چھوڑ گیا۔"

"وہ تو پنچھی ہے اس کا کام ہی اُڑنا ہے۔"

"چلو اب گھر چلیں۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔"

"مجھے یہ سناٹے یہ تنہائی ڈسنے لگتے ہیں۔"

"تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تمہیں ہنگامے پسند ہیں۔"

"ہنگامے تو نہیں لیکن اتنا سناٹا بھی نہیں۔ وہ بھی تنہا ہی رہ گئی۔"

"ثاقب۔"

"ہوں۔"

"سنو۔"

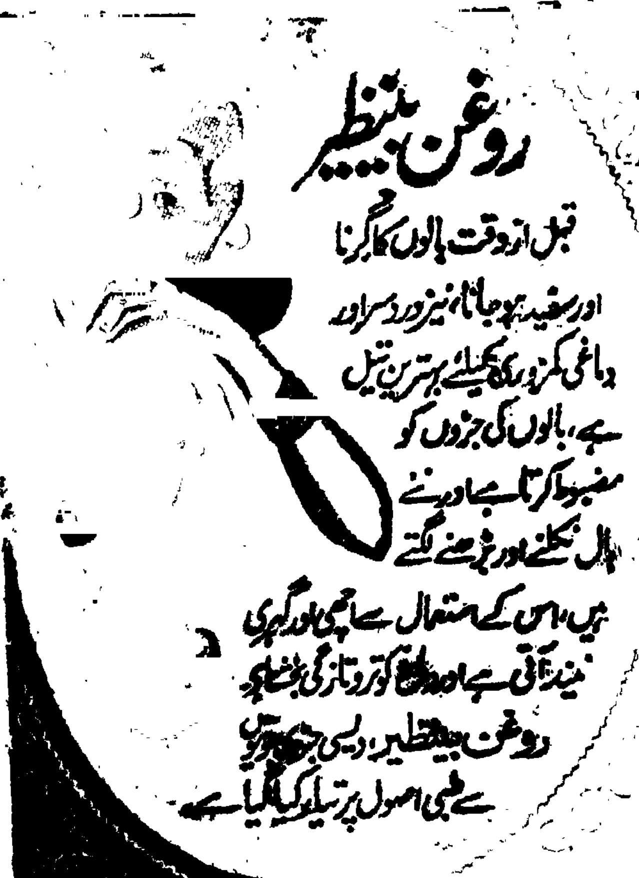
"کیا ہے بھئی۔"

"میری بات تو سنو۔"

"تم نے مجھے تنگ کر دیا ہے۔ کیا بات ہے؟"

"وہ ..... وہ .... میں .... یہ کہہ رہی تھی کہ ...."

"کہ ابھی چلو جلدی سے۔"



"وہ بات یہ ہے کہ ......"

"اُفوہ بھئی۔ لو گھڑی بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔"

"میں ..... اچھا کچھ نہیں۔"

"میرا اتنا وقت خراب کیا ہے اب تو تمہیں بتانا ہی پڑے گا کہ کیا بات ہے۔"

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ پکچر دیکھے ہوئے بہت دن ہو گئے آج پکچر چلیں۔"

"مجھے دُنیا کے اور بھی بہت کام ہیں، صرف تمہیں پکچر [illegible]اکر زندگی نہیں سکتا۔"

"میں نے تو ویسے ہی کہہ دیا تھا۔ کوئی بات نہیں۔"

"میں ابھی تھکا ہارا دفتر سے آیا ہوں۔ اب بیگم صاحبہ کو [illegible]انے چلوں۔"

"نہیں نہیں تم آرام کرو۔ نہ معلوم کیوں میرے منہ سے نکل گیا۔"

"اچھا جاؤ اب میرے کان نہ کھاؤ۔"

"ثاقب۔"

"وہ چپ رہا۔"

"ثاقب!"

"وہ اب بھی وہ چپ رہا۔"

"کیا بات ہے؟"

"اس بار بھی فری کو جواب نہ ملا۔"

"ثاقب۔"

"پھر میرے کان کھانے لگیں۔"

"میں پوچھ رہی تھی کہ کیا ناراض ہو؟"

"ناراض کیوں نہ ہوں۔ تمہاری فرمائش سے تنگ [illegible]

[illegible]

ہونہہ۔ غلطی سے نکل گیا تھا۔"

"اتنی سی بات کو اتنا طول نہ دو۔"

"یہ اتنی سی بات ہے؟"

"مجھے معاف کر دو۔ آئندہ کبھی نہ کہوں گی۔"

"تم کبھی فرمائش کرنے سے باز نہیں آؤ گی۔"

"نہیں ثاقب نہیں۔ مجھے موقع تو دو۔ میں نے تو زندگی میں پہلی مرتبہ کل تم سے پکچر دیکھنے کی فرمائش کی تھی۔"

تڑاخ۔

"بہت زبان چلانے لگی ہو۔ میں کسی کی بات سن نہیں سکتا۔ جاؤ یہاں سے۔"

"کھانا لاؤں؟"

"نہیں۔"

"تھوڑا سا کھا لیجیے۔"

"ایک مرتبہ کہہ دیا نہیں۔"

"میں نے خود اپنے ہاتھوں سے کباب بنائے ہیں۔ آپ کو میرے ہاتھ کے کباب بہت پسند ہیں نا۔"

"تمہیں کیا معلوم آج تک میں تمہارے ہاتھ کے کباب کس طرح زہر مار کرتا رہا ہوں۔"

فری سسکیوں سے رونے لگی۔

"یہ آدھی رات کو ٹسوے بہانے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ مجھے یہ ڈھکوسلہ پسند ہے کہ بارہ بجے رات تک میرے انتظار میں جاگو۔"

"آپ کا انتظار تو نہیں کر رہی تھی۔ خود ہی نیند نہیں آتی۔"

"ہاں ہاں! تم میرا انتظار کیا کرنے لگیں، جاؤ اپنی منحوس صورت لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

"ثاقب۔"

وہ چپ رہا۔

"ثاقب۔"

"کیا مصیبت ہے۔ تم نے میری زندگی عذاب کردی ہے"

"تعجب ! آج پورے چھ ماہ بعد تم سے بات کرنے کی نوبت آئی ہے۔ تم صبح جاتے ہو اور آدھی رات کو آتے ہو۔ کبھی مجھ سے بات نہیں کرتے ہو"

"بس بس۔ بکواس بند کرو۔ تم میرے آنے جانے کا حساب پوچھنے والی کون ہوتی ہو۔ میرا جب جی چاہے گا جاؤں گا جب جی چاہے گا آؤں گا۔ یہ میرا گھر ہے تمہارے باپ کا نہیں"

"میں اس کا حساب تو نہیں پوچھ رہی ہوں"

"پھر کیوں فضول بحث کر رہی ہو"

"میں کہہ رہی تھی کہ راتوں کو جاگنے سے تمہاری صحت پر اثر پڑ رہا ہے۔ اور...... اور......"

"اور کیا ؟"

"وہ...... میں...... اکیلی ہوتی ہوں نا...... مجھے...... سناٹے سے خوف آتا ہے"

"خوف آتا ہے تو اماں باوا کے یہاں چلی جاؤ۔ میں نے تمہاری چوکیداری کا ٹھیکہ لیا ہے۔ مکاری تو دیکھو صحت پر اثر پڑ رہا ہے۔ تمہیں میری صحت کی کیا پرواہ"

"میں سچ کہہ رہی ہوں تمہارا چہرہ اتر گیا ہے"

"بس بس رہنے دو۔ اگر تمہیں اس گھر میں رہنا ہے میرے اوپر تنقید کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"

"پرانی محبت کے ناطے کہہ رہی ہوں"

"کیسی محبت ؟ کہاں کی محبت ؟ اس دنیا میں محبت کوئی چیز نہیں ہے"

"تم تو محبت کے دعوے کرتے تھے"

اس نے زور کے ایک تھپڑ رسید کیا۔ آئندہ کوئی بات یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جیسی لڑکی سے محبت نہیں کرسکتا۔ میری زندگی عذاب ہے۔ ... ہے دن رات کا ... ہر وقت محبت کی رٹ لگائے جاتی ہے۔ ... کو دیدے گی۔ میں پیسہ کماتا ہوں کوئی مذاق نہیں کرتا۔ کیوں نہ اماں باوا نے اپنے پاس ہی تمہیں رکھ کر کھلا دیا"

"کہاں مرگئی تھیں ؟ کب سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں"

"جی...... وہ...... وہ......"

کیا وہ وہ لگا رکھی ہے یہ نہیں سوچتیں کہ باہر کتنی سردی ہے۔ رات کے تین بجے ہیں سردی میں ٹھٹھر رہا تھا اور بیگم صاحبہ آرام فرما رہی تھیں"

"...... مجھے بہت تیز بخار ہے۔ کھٹکھٹانے کی آواز سنائی نہیں دی"

"مجھے یہ بہانے بازی پسند نہیں ہے۔ یہ نخرے کسی اور کو دکھانا۔ بخار میں بہری بھی ہوگئی تھیں"

"آئندہ ایسا نہیں ہوگا"

"آئندہ نہیں ہوگا تو کیا ہوا۔ اب جو ہوگیا ہے اس کا خمیازہ کون بھگتے گا ؟"

"غلطی ہوگئی"

"مگر میں ایسی غلطیاں بھگتنے کا عادی نہیں ہوں"

"معافی چاہتی ہوں"

"تم جیسی عورت کو تو میں زندگی بھر معاف نہیں کرسکتا۔ جاؤ جاکر کھانا لاؤ"

"کھانا ؟"

"ہاں ہاں کھانا۔ میں نے فرانسیسی زبان کا لفظ نہیں بولا ہے۔ کیا میرے لئے اس گھر میں کھانا ختم ہوگیا ہے ؟"

"کھانا تو ہے۔ روز آپ نہیں کھاتے ہیں نا۔ بس ابھی پکا کر ابھی لاتی ہوں"

"میں زیادہ انتظار نہیں کرسکتا۔ جلدی لاؤ"

سسکیاں لینے لگی

"یہ گھر کی کیا حالت بنی ہوئی ہے۔"
وہ روتی رہی۔
"میری غیر موجودگی میں خوب گلچھرے اُڑائے گئے ہیں۔"
وہ اب بھی رو رہی تھی۔

"بولتی کیوں نہیں ہو؟ گھر کا سامان کیوں بکھرا پڑا ہے؟ تمہارے کپڑے کیوں پھٹے پڑے ہیں؟ تمہارے بال کیوں بکھرے پڑے ہیں؟ تمہارے دوستوں کو یہ بھی تمیز نہیں کہ شریفوں کے گھروں میں جانے کے کیا آداب ہیں؟"
"ایسا نہ کہیئے۔ دُنیا میں میرا دوست تو کیا کوئی بھی نہیں ہے۔"

"پھر یہ سب کیا تماشا ہے؟"
"چور آئے تھے۔"
"ہیں! چور آئے تھے۔ پھر میرا کیا کیا سامان لے گئے؟"
"بہت کچھ لے گئے۔"
"بہت کچھ لے گئے اور تو بیٹھی دیکھتی رہی؟"
"میں نے بچانے کی بہت کوشش کی۔ اسی کوشش میں میرے کپڑے پھٹ گئے۔ میں لہولہان ہو گئی۔"
"چاہے تیری جان بھی چلی جاتی لیکن تجھے سامان بچانا تھا۔"

"میں نے بہت کوشش کی۔"
"کوشش کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ تو نے زندگی بھر مجھے نقصان پہنچانے کے علاوہ اور کیا ہی کیا ہے۔ میری محنت سے کمائی ہوئی دولت کو یوں لٹا دیا۔"
"وہ تین چار آدمی تھے میں اکیلی تھی۔ مقابلہ نہ کر سکی۔"
"مجھے ایسی عورت نہیں چاہیئے جو میرے سامان کی حفاظت تک نہ کر سکے۔"

اور پھر اس نے پھر دو تین تھپڑ رسید کر دیئے۔
"جاؤ نکل جاؤ۔ ابھی میرے گھر سے نکل جاؤ۔"
"میں اس وقت تین بجے رات کو کہاں جاؤں؟ صبح چلی جاؤں گی۔"
"میں تجھے اس وقت ایک سکنڈ کے لئے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ابھی جا۔ میری نظروں سے دور ہو جا۔"

"قمری۔"
"وہ چپ رہی۔"
"قمری۔"
"اس مرتبہ بھی وہ خاموش رہی۔"
"کچھ تو بولو۔"
"کیا بولوں؟"
"جینا سیکھو۔"
"جینے میں کیا رکھا ہے نعیم؟"
"تمہیں جینا پڑے گا۔"
"کس کے لئے جیوں؟"
"نہیں نعیم نہیں۔ اب میں کسی کے لئے نہیں جی سکتی۔"
"تو کیا تمہیں میری زندگی عزیز نہیں۔"
"مجھے کچھ عزیز نہیں۔"
"تم زندگی کا یہ تنہا سفر کیسے طے کرو گے؟"
"یہ سفر — کبھی تو یہ سفر ختم ہو ہی جائے گا۔"
"مگر یہ تنہائی؟"
"ہاں مجھے تنہائی اور سناٹے سے خوف آتا تھا۔ لیکن اب یہ مقدر ہے۔"
"میں تمہیں اس سناٹے سے نکالنا چاہتا ہوں۔"
"نہیں نعیم اب مجھ میں سکت نہیں ہے۔"
"لیکن میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"
"یہ نہ کہو: ہر مرد یہی کہتا ہے اور خوب زندہ رہتا ہے۔"
"قمری ہر مرد تاحب نہیں ہوتا۔"
"نعیم اب مجھے تنہا رہنے دو۔ مجھے [illegible]"

زندگی گذار دے دو۔"

"فری میرے مضبوط بازوؤں کی پناہ میں آجاؤ۔ میں تمہیں دُنیا کے سرد و گرم سے بچاتا ہوا زندگی کے اس پار تک لے جاؤں گا۔"

"نہیں نعیم نہیں۔ دُنیا کا کوئی مرد کسی عورت کو پناہ نہیں دے سکتا۔"

"تم مجھے ثاقب کے پیمانے سے نہ ناپو۔"

"ثاقب بھی میری زلفوں کے سائے میں زندگی گذار دینا چاہتا تھا۔"

"لیکن فری غور تو کرو جو تمہاری زلفوں کے سائے میں زندگی گذار دینا چاہتا تھا۔ وہ تمہیں کیسے پناہ دے سکتا!"

"جس کو میں نے زلفوں کا سایہ دیا وہ میرا محافظ کبھی نہ بن سکا اور اس نے مجھ سے ناطہ توڑ لیا۔"

"وہ بزدل تھا۔ بزدل لوگ تحفظ نہیں دیتے۔ سہارے ڈھونڈتے ہیں۔ میرے بازوؤں میں اتنا دم ہے کہ میں تمہاری حفاظت کے لئے پہاڑوں سے ٹکرا سکتا ہوں۔ میں زلفوں کی کمزور چھاؤں نہیں ڈھونڈتا۔ میں مرد ہوں۔ میرے بازو سہارا دینے کے لئے ہیں سہارا لینے کے لئے نہیں۔ کوئی تمہاری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا فری۔ میں تمہارا محافظ ہوں۔ اب کوئی تمہیں مجھ سے نہیں چھین سکتا۔"

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

نئی کتابوں کا تعارف

نام کتاب : اقبال اور قومی یک جہتی
مصنف : سید مظفر حسین برنی
ضخامت : ۴۴ صفحات
قیمت : رقم درج نہیں ہے
پتہ/پبلشر: ہریانہ ساہتیہ اکادمی، چنڈی گڑھ

قومی یک جہتی آج ہمارے لئے ایک اہم موضوع ہے۔ موجودہ سیاسی و معاشرتی فضا میں یہ موضوع روز بروز ہمارے لئے اہم ہوتا جا رہا ہے۔ تحریر و تقریر اور تعلیم و تحریک ہر طرح سے ہمارے اہل قلم، مفکرین، مصلحین اور سیاسی قائدین قومی جذبہ کو بیدار کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ سیاسی اور سماجی حیثیت سے یہ موضوع اہم سے اہم تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے ہمارا دانشور طبقہ بھی اپنی بہترین صلاحیت سے کام لے کر قومی یک جہتی کے جذبہ کو ابھارنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔ نظیر اکبر آبادی، جوش، جمیل مظہری اور فیض وغیرہ کے یہاں اس قومی جذبہ کے نشان ڈھونڈیں تو خیر آسانی ہوتی ہے لیکن ہماری ضرورتوں نے ہمیں اس حد تک مجبور کر دیا ہے کہ ہم میر تقی میر، غالب، انیس اور اقبال وغیرہ کے یہاں بھی قومی یک جہتی اور یک سوئی کے تصورات ڈھونڈتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے سے کیا نہیں ملتا۔ سو ہمارے تنقید نگاروں کو اس میں بھی کامیابی مل ہی جاتی ہے؟ لیکن ہمیں اس حقیقت پر بھی غور کرنا چاہئے کہ اس تلاش و جستجو کی ضرورت آج کیوں اہمیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں تقسیم ہند کے بعد وہ کون سے اسباب و عوامل پیدا ہوئے ہیں جو قومی یک جہتی کے نعرے لگانے پر ہمیں مجبور کر رہے ہیں۔ ہمیں بدلے ہوئے حالات اور ملک کے مزاج کو سمجھنا ہوگا۔ آج قومی ایکتا NATION-AL INTEGERATION یک جہتی اور قومی سالمیت کا جتنا نعرہ ہندوستان میں لگ رہا ہے اتنا دنیا کے کسی خطہ میں نہیں لگتا۔ کیا ہمارے مفکرین کبھی اس مسئلہ پر بھی غور کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے؟ کیا ایسا اس لئے نہیں ہے کہ تقسیم ہند کے اثرات نے ہمارے ذہنوں میں سمیت پیدا کر دی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جب ملک اور میدان کا غالب مزاج رجعت پرستی، احیا پسندی اور جابرانہ اقتدار کی طرف مائل ہو گیا ہے۔ ہم اس سیلاب کی روک تھام میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن کیا میر و غالب اور انیس و اقبال کو قومی شاعروں کی طرح متعارف کر کے یا ان کی شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر کو ان کے فکر و احساس کا جزو اعظم قرار دے کر اسے

سیاسی مسئلہ کا دریافت کیا جا سکتا ہے یہ کام صحیح سیاسی نظام اور سیاسی فکر کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ سیلاب کے بڑھتے ہوئے پانی کو ہاتھوں نہیں روکا جا سکتا۔

میں یہ باتیں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ کام جس سطح پر ہونا چاہئے وہاں نہیں ہو رہا ہے۔ اور ہم اکثر و بیشتر شعر و ادب کی غلط سلط تفہیم کے ذریعہ قومی یکجہتی کے سلسلہ میں ذہنوں کی تعمیر میں مبتلا ہیں۔ غالب بیچارے کو خبر بھی نہ تھی کہ کبھی ان کے کلام سے قومی یکجہتی کے موضوعات تلاش کئے جائیں گے۔ وہ تو مکتب غم دل میں 'رفت گیا' اور 'بود تھا' سے آگے نہیں بڑھ سکے تھے۔ میر نے تو ساری رات روتے رہنے کو اپنا روزگار بنا لیا تھا۔ انہیں NATION INTE GERATION سے کیا واسطہ، ان کی زندگی تو خود DIFUSION اور DIFUTION کی شکار تھی۔ میر انیس تو زندگی بھر حصول ثواب کی فکر میں رہے۔ اور شبیر کے عالم تنہائی کی تفصیلات بیان کرتے رہے۔ ان بیچاروں کو قومی یکجہتی سے کیا مطلب؟ اس کی ضرورت ہی کیا تھی رہے اقبال تو ہاں ان کی فکری فلسفیانہ بساط سخن پر جہاں دوسرے بہت سے موضوعات نظر آتے ہیں تو وہاں ملکی و قومی تہذیبی و ثقافتی اور اتفاق و اتحاد کے موضوعات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ سید مظفر حسین برنی نے اچھا کیا کہ اس نیک کام کے لئے اقبال کا انتخاب کیا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خود اقبال کے ذہن میں قومی اتحاد کا وہ مفہوم نہیں تھا جسے آج ہم قومی ایکتا اور قومی یکجہتی وغیرہ کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ اقبال کا فلسفہ ایک بڑے تناظر میں ہمارے سامنے پیش ہوتا ہے۔ قومی ایکتا کا مسئلہ ایک عظیم الشان اور رفیع و وسیع احاطۂ فکر میں ایک جزو سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ اقبال ایک حرکی نظام فکر کے حامل تھے ان کے افکار و خیالات برابر ارتقا پذیر رہے ہیں۔ خارجی مشاہدہ، فطرت پسندی، وطن دوستی، انسان دوستی اور پھر بنی نوع آدم کی فلاح و نجات کے لئے ایک مکمل دستور حیات کی شیرازہ بندی —— یہ ہیں اقبال کے فکر و فن کی منزلیں۔ یہ بھی طے ہے کہ اقبال اپنے ذہنی سفر پر آگے بڑھتے ہوئے آخری دور میں ادوار ماقبل سے بہت حد تک مختلف ہو چکے تھے۔ اب ان کے کسی ایک عہد کے افکار و خیالات (خصوصاً اوائل اور درمیانی ادوار کے) کو ان کی صحیح ترجمانی نہیں سمجھا جا سکتا۔

بہرکیف! میں اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتا۔ اگر ہم اپنی ضرورت کے تحت اقبال کے کل سے کوئی "جزو" اخذ کر رہے ہیں تو یہ غلط بھی نہیں ہے۔ ہاں! یہ بات مد نظر رکھنی چاہئے کہ ہم ان اجزا کو پیش کرنے میں حق بجانب نہ ہوں گے جنہیں خود علامہ اقبال نے فلسفیانہ اور فکری سطح پر رد کر دیا تھا محدود قومیت کا تصور کس طرح اقبال کے یہاں پہلے پہلے [illegible]

کی سرحدوں کو چھو لیتا ہے۔ اسے پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

اب اس تمہید کے بعد جن مقاصد کے تحت جناب سید مظفر حسین برنی نے "اقبال اور قومی یک جہتی" لکھی ہے ہمیں امید ہے کہ مصنف اپنی ان کوششوں میں کامیاب رہیں گے۔ انہوں نے اقبال کے فکر و عمل کے ان گوشوں پر روشنی ڈالی ہے جن سے آج ہم قومی یک جہتی کی تبلیغ و تشہیر میں مدد لے سکتے ہیں۔ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے اور مصنف کتاب نے بار ثبوت کا خیال کرتے ہوئے مستند حوالہ جات سے کام لیا ہے۔ جناب برنی نے مختلف ذیلی عنوانات متعین کر کے اپنے مرکزی موضوع کو وسعت اور سلیقے سے پیش کیا ہے۔ انہوں نے اقبال کے فلسفہ و فکر کو ان کے اعمال و کردار کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ مادر وطن کی محبت، نااتفاقی پر غم و اندوہ، ہندوستانی سنتوں کا احترام، اقبال اور ہندوستانی مفکرین، نیز اقبال اور ہندوستان کی آزادی جیسے عنوانات مقرر کر کے مصنف کتاب نے اپنے مافی الضمیر کی وضاحت کی ہے۔

اس کتاب سے اقبال کی زندگی اور فکر کے ان گوشوں پر بھرپور انداز میں روشنی پڑتی ہے جو آج ہندوستان میں ہمارے ذہنوں کی تعمیر میں مددگار ہو سکتا ہے۔ مطالعہ اقبال کے سلسلہ میں یہ پیش کش اہمیت کی حامل ہے۔ (ڈاکٹر علیم اللہ حالی)

شہر خیال

سہیل اکتوبر ۱۹۹۴ء ملا۔ شکریہ!

سہیل کا اپنا ایک مزاج ہے ایک جادہ ہے اور یہ
بہت بڑی بات ہے۔ فیضی صاحب کے خط نے اداس کر دیا
کانگریس کا دعویٰ ہے کہ اس نے آزادی کی لڑائی عدم تشدد
اصولوں پر لڑی اور جیتی ہے لیکن آج یہ کھلی حقیقت ہے
یہ حکومت صرف تشدد کے سہارے قائم ہے سیکولرازم کے
پردے میں مذہبی عناد اور فرقہ پرستی کو مضبوط کیا جا رہا
ہے کیا کانگریس، کیا بی جے پی یا دوسری سیاسی جماعتیں
سب سرمایہ دارانہ نظام حکومت میں یقین رکھتی ہیں یہ ان
آپسی جھگڑے تو اندرونی تضاد کے عکاس ہیں۔ نہ داخلی
پسند پسند کے حکمران نہ موجودہ حاکم جماعت ہمیں کچھ دے سکے گی۔

پنجاب میں جو طاقت بائیں بازو کی سیاست کو
مضبوط کر سکتی تھی طے شدہ پروگرام کے تحت مذہب کی جنگ
میں جھونک دی گئی تا کہ وحدت تقسیم کیا جا سکے۔ اور یہ چال
کامیاب رہی۔ سرمایہ دار طاقتیں عوام سے بڑے سے بڑا
کھیل کھیل سکتی ہیں۔ ہم سمجھتے ہوئے بھی نہیں سمجھتے۔
علیحدگی پسند عناصر اور پولیس کی زیادتیوں سے آج ایک علاقہ
گیا۔ تو خوشی کا مقام نہیں۔ کل یہ بھی لپیٹ میں آئے گا
الیکشن کے موقع پر چکنے، خوبصورت، دلکش وعدے
کئے جاتے ہیں اور ہم ہر مرتبہ ان پر یقین کر لیتے ہیں۔ مذہب
برادری اور ذات کے نام پر ووٹ دیتے ہیں۔

وہ لوگ جو شرارت کرتے ہیں لوٹ مار قتل اور
آتش زنی۔ یہ سب کر کے کہاں غائب ہو جاتے ہیں ان
کی نشاندہی کیوں نہیں ہوتی۔ انہیں عبرتناک سزائیں کیوں
نہیں دی جاتیں؟ یہ لوگ تو استعمال ہوتے ہیں ان کے
پشت پر کوئی طاقت ہے۔ اور وہ ہے سرمایہ دارانہ نظام
حکومت۔ اس کی پرورش سے نکلنے کے لئے پورے سسٹم کو
بدلنا ہوگا۔ آج ہندوستان کو بائیں بازو کی جمہوری
حکومت کی ضرورت ہے یہ جتنی جلدی ہو جائے اچھا ہے
ورنہ ہم ذہنی طور پر مفلوج ہو جائیں گے پھر برداشت پیدا ہو
جائے گی۔ اب بات کمل کر ہی کہی جانی چاہئے یہ نظام عوام دشمن ہے
اسے ختم ہونا چاہئے اور اس کے لئے کسی آسمانی فرشتے کا
انتظار بے سود ہے یہ کام ہمیں خود کرنا ہے۔
معاف کیجئے بہت دکھی ہو گیا ہوں۔

——— شرون کمار ورما (امرتسر)

منور رانا نمبر ملا۔ یہ سلسلہ بہت اچھا ہے اس طرح
ہم ان فنکاروں سے بھی اچھی طرح واقف ہو جاتے ہیں جو
بہت زیادہ مشہور نہیں ہوتے۔ مبارکباد قبول کیجئے

——— قیصر عثمانی (ممبئی)

منور رانا پر سہیل کا خاص شمارہ بہت اچھا لگا
میں موصوف کے شعری مزاج سے بالکل ناواقف تھا۔ لیکن
اس نمبر نے کو تقویت دی کہ نہ جانے کہاں کہاں کیسے کیسے اچھے
شاعر پڑے ہوئے ہیں۔ بہائی شمارے کے لئے مبارکباد قبول
کیجئے۔ ——— رام پرکاش راہی (دہلی)

سہیل کا منور رانا نمبر دیکھا پسند آیا۔ آپ نے بڑی

مدیر آہنگ کے نام ایک کھلا خط

بھائی منظر صاحب !

سہیل کا منور رانا نمبر دیکھ کر آپ کو خط لکھنا چاہتا تھا مگر نہیں لکھ سکا۔ آج آہنگ کا تازہ شمارہ دیکھا تو بے ساختہ آپ کی یاد آ گئی۔ —— آہنگ کے مدیر محترم کو میں ایک سرمایہ دار کی حیثیت سے جانتا تھا۔ جو اپنے سرمایہ کو اپنی شخصیت کی تشہیر کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں۔ لیکن گذشتہ چند ماہ کے دوران یہ احساس بڑی شدت سے ہوا کہ موصوف تنگ ظرف اور ریاکار بھی ہیں۔ اردو اکیڈمی کی وائس چیرمین شپ کی حصول کی کوششیں اور ان کوششوں میں ناکامی کے بعد ارباب ادب پر لعن و طعن ان کی ہوس شہرت کے آئینہ دار ہیں۔ لیکن آہنگ کے تازہ شمارے میں آپ کے والد مرحوم کے تعلق سے ان کی دریدہ دہنی دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ انسان اس قدر بھی ذلیل ہو سکتا ہے۔

"ادریس پر بھی نوجوانی تھی اور بمبئی مشہور تھا۔"

"اس زمانے کے ساتھ بیٹھ ہزار ان کو کیسی وراثت میں ملے تھے"

"باقی روپے کے ساتھ بمبئی چلے گئے اور رداؤ [illegible]"

"وہ پتنگ بازیاں چھوڑنا اور لڈو لڑانا ادریس کا دلچسپ مشغلہ تھا"

حیرت یہ ہے کہ ایک طرف موصوف ادریس صاحب مرحوم کو اپنا دوست بھی کہتے ہیں اور دوسری طرف ان کے مرنے کے بعد ان کی ذلت پر کیچڑ اچھالنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا "انکشافات" کے بعد موصوف کا یہ کہنا کہ کبھی موقع ملا تو ادریس پر بھی کھول کر لکھوں گا۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ کہنا چاہتے ہیں کہ کبھی موقع ملا تو ادریس کو بھی کھول کر کے ننگا کر دوں گا۔ اور پھر ان کا یہ آخری جملہ کہ "ادریس کے مرنے کا غم کرنے والے اس کے لڑکے بھی نہیں ہیں اس لئے تعزیت بھی اپنے آپ ہی کو پیش کر رہا ہوں"۔ اول تو ادریس صاحب کے ایک نہیں ماشاءاللہ تین تین لڑکے ہیں اور باپ کی ناگہانی رحلت کا انہیں صدمہ ہے اس کا اندازہ ریاکار لوگوں کو کہاں ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود اگر موصوف کی بات مان لی جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان کو تعزیت خود اپنے آپ کو پیش کرنی تھی تو پھر اس دوسروں کو سنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اور کیا تعزیت کا یہی انداز ہے جو موصوف نے اختیار کیا ہے۔ خدارا کوئی بتائے کہ اس کا نام تعزیت ہے تو پھر سب و شتم کس کو کہتے ہیں؟۔

تعجب تو اس پر ہے کہ موصوف ایک جریدے کے مدیر یا مدیر ہیں لیکن نہ صحافتی ذمہ داریوں سے واقف ہیں اور نہ ادب کی حدود سے آگاہ۔ اور زبان دانی کا تو یہ عالم ہے کہ موصوف لڈو لڑایا کرتے ہیں۔ کیا وہ بتا سکیں گے کہ لڈو لڑانا کس زبان کا محاورہ ہے۔ اور کس لغت میں مل سکے گا۔ اگر وہ میری رہنمائی کر سکیں تو بہت ممنون ہوں گا۔

محمد عارف، خدا بخش لائبریری پٹنہ

نوٹ: عارف صاحب ! آہنگ کے تعزیتی نوٹ کے ذریعہ مدیر نے میرے والد کی شخصیت کو مجروح کرنے کی ناکام کوشش ضرور کیا ہے ویسے پوری اردو دنیا اچھی طرح جانتی ہے کہ مدیر آہنگ کتنا بڑا ریاکار اور مکار ہے اپنی اس ریاکاری اور مکاری سے وہ میرے والد کی شخصیت تو مجروح نہیں کر سکا۔ بلکہ اس کا اصلی چہرہ اردو دنیا کے سامنے ضرور آ گیا ہے۔

یہ میں آپ کے معلومات میں اور اضافہ کرتا چلوں کہ مدیر (ناصفلی) سرمایہ دار کیسے بنا اس کے والد محکمہ پولس میں کانسٹبل تھے۔ انہوں نے کسی طرح فاقہ کشی کر کے مدیر (ناصفلی) کو ایم اے کرایا اس کے بعد پورنیہ کے ایک پرائیویٹ کالج میں ۵۰ روپے ماہوار پر لکچرار بحال کرا دیا۔ اسی درمیان گیا میں ایک سرمایہ دار کو اپنی اکلوتی لڑکی کے لئے رشتہ مطلوب تھا۔ مدیر (ناصفلی) [illegible]

Regd. No. Gay—4 Regd. with the R. N. Pat. R. No. 3520/57

46 YEARS OF PUBLICATION

THE SOHAIL MONTHLY, River Side Road, Gaya - 823001